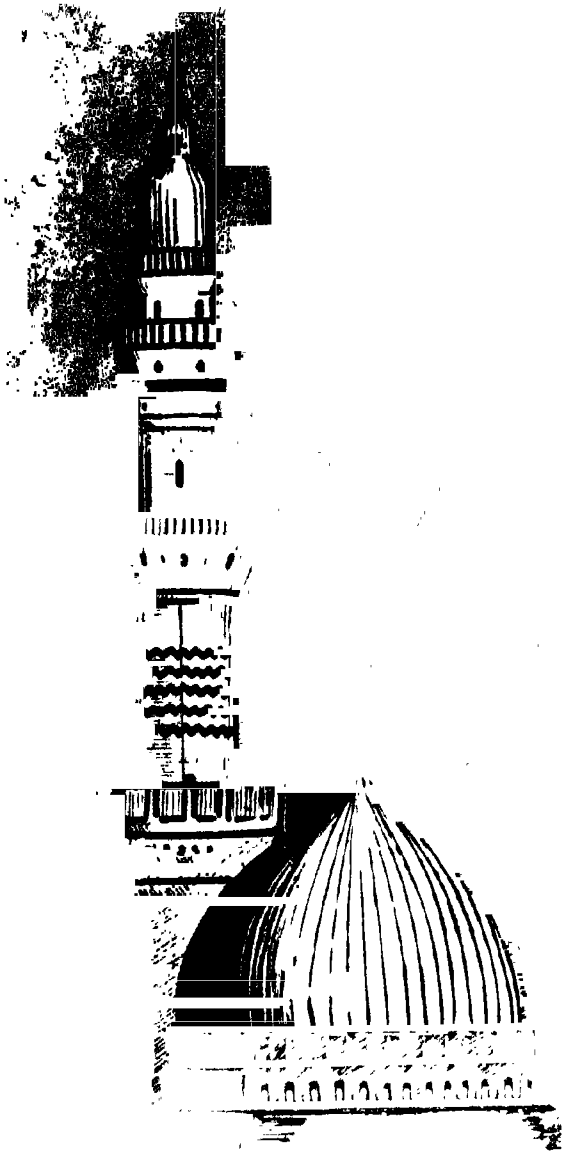


حلیۃ صلاۃ المؤمن

حلیت مومن کا ...

٭ مجلس ادارت ٭

٭ اغراض و مقاصد ٭

۱. جہل، رجعت پسندی اور خود فریبی کے خلاف جدوجہد، ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء. ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل کی دعوت، ۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت ۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اُردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش. ۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی. ۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا ۶. سائنس، فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت ۷. علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارنامے کا تعارف

٭ مقالہ نگاروں کیلیے ٭

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے.

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی.

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں.

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے.

مسودہ بڑے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو. کٹے پٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے.

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں. شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں. تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں اُنہیں لگانا ہو.

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے. باہر سے آنے والے صرف انہیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا معہ ٹکٹ لفافہ بھی ہو.

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۲

شمارہ ۱

جنوری ۹۱ء

* بانی: سرسید احمد خان

* سرپرست:

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

* مدیر:

کبیر احمد جائسی

* نائب مدیر:

احمد مجتبیٰ قریشی

* انتظامیہ سکریٹری:

شفیق احمد

* [illegible] : [illegible]

زر سالانہ:

انڈیا — Rs. 40-00

بیرونی ممالک — [illegible]

* [illegible]

ترسیل زر کا پتہ:

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق [illegible]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,

TAHZIBUL AKHLAQ &

[illegible]

ALIGARH MUSLIM

UNIVERSITY,

ALIGARH [illegible]

PHONE: [illegible]

مندرجات

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی [illegible] — پرنٹر پبلشر: اسرار احمد — مقام اشاعت: ماہنامہ تہذیب الاخلاق [illegible]
[illegible] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی [illegible] — پریس: [illegible]

فرمانِ الٰہی

"اور یاد رکھو (جس راہ میں تم نے قدم اٹھایا ہے، ناگزیر ہے کہ اس کی آزمائشوں سے گزرنا پڑے) یہ ضروری ہے کہ ہم تمہارے عزم و ثبات کا امتحان لیں خطرات کا خوف، بھوک کی تکلیف، مال و جان کا نقصان، پیداوار کی تباہی، وہ آزمائشیں ہیں جو کچھ نہ کچھ تمہیں بھی پیش آئیں گی۔ پھر جو لوگ ایسے ہیں کہ صبر کرنے والے ہیں، تو انھیں (فتح و کامرانی کی) بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی کوئی مصیبت اُن پر آپڑتی ہے تو (بے قرار اور بے ثبات ہونے کی جگہ ذکرِ الٰہی سے اپنی روح کو تقویت پہنچاتے ہیں اور اُن کے زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہماری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیاں جو کچھ بھی ہے، سب اللہ کے لیے ہے اور ہم سب کو بالآخر ہمیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے) سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کے الطاف و کرم ہیں اور جو اُس کی رحمت کا مورد ہوتے ہیں اور یہی ہیں جو (اپنے مقصد میں) کامیاب ہوتے ہیں۔"

بجنابِ سرورِ کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات

خواجہ الطاف حسین حالی

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
امّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جس دین کی حجّت سے سب ادیان تھے مغلوب
اب معترض اُس دین پہ ہر ہرزہ سرا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدّت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

فریاد ہے اے کشتیٔ امّت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

کر حق سے دعا اُمّتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آکے گھرا ہے

ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط

سید احمد خانؒ

جس قدر سوشل برتاؤ اور باہمی محبت اور ارتباط ہندو اور مسلمانوں میں ترقی پکڑتا جاوے۔ ہم کو نہایت خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی آریہ قومیں بھی خاص ہندوستان کی رہنے والی نہیں ہیں، دوسرے ملکوں سے آکر ہندوستان میں فتح مندی کے ساتھ آباد ہوئی ہیں۔ اُن کے ہندوستان میں آباد ہونے کو زمانہ کثیر گزر گیا جس کے سبب وہ ہندوستان کے متوطن اور ہندوستان کے رہنے والے ہندو کہلائے۔ مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں آئے ہوئے کچھ کم زمانہ نہیں ہوا۔ ان کی بھی متعدد پشتیں ہندوستان ہی کی زمین پر گزری ہیں۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا میل ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریہ کہلائے جا سکتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں، ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے جس طرح آریہ قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جا سکتے ہیں۔ ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہیں رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جاوے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جاوے گی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے، بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آگئی ہیں۔ پس جس قدر ان قوموں میں زیادہ قربت، زیادہ تر اخلاص، زیادہ تر ایک دوسرے کی امداد بڑھتی جاوے اور ایک دوسرے کو اصلی بھائی کے سمجھیں کیونکہ ہم وطنی بھائی ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں، اسی قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے۔

اس زمانہ میں تین باتوں سے محبت و اخلاص کا علانیہ ثبوت دیا گیا ہے۔

سب سے اول یہ بات ہے کہ ان دنوں میں سلطان روم کی یونان پر فتح ہونے کی اکثر جگہ مسلمانوں نے خوشی کی اور مجلسیں آراستہ کیں۔ شہر میں چراغاں روشن کئے۔ سلطان کو مبارکباد کے تار بھیجے۔ ہم نے سنا ہے کہ دکن کے ہندوؤں نے بھی اسی طرح خوشی منائی اور سلطان کو مبارکباد کے تار بھیجے، یہ کمال محبت دونوں میں اخوت کا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ بریلی میں ہندو مسلمانوں نے نہایت خلوص سے ایک دوسرے کی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی بقر عید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی بلکہ ہندوؤں کی خاطر سے بکرے اور بھیڑوں کی قربانی کی اور ہندوؤں نے بھی اس بات کا خیال اٹھایا کہ کوئی مسلمان گائے کی قربانی کا خیال کرتا ہے یا کرے گا نہیں کی۔ اور ہندوؤں نے محرم کے دنوں میں [illegible] اور مسلمانوں کے ساتھ [illegible] ہم [illegible]

ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا اس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ سول لائن ٹوٹیشن مانک پور گنج ضلع ڈھاکہ میں ایک مسجد بنانے کی ضرورت ہے اور اس مسجد کی تعمیر کے لیے روپیہ جمع کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں نے شامل ہو کر کمیٹی بنائی اور ہندو مسلمان مل کر اس کی تعمیر کے لیے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان زیادہ غریب اور زیادہ ذلیل ہیں، اس لیے ہندو اس مسجد کی تعمیر کے لیے زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس محبت اور ہمدردی اور باہمی بھائی چارہ پر جو ہندوؤں نے ظاہر کی، دونوں قوموں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں جس طرح کہ اختلاف مذہب جیسا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہے، سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پولیٹکل امور کا اختلاف بھی سوشل برتاو اور باہمی محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہے۔ اس زمانے میں ہندو اور مسلمان دونوں گورنمنٹ انگلشیہ کی رعایا ہیں اور اس کے سایۂ عاطفت میں ہر قسم کی خوشی اور امن و آزادی سے بسر کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ دونوں قوموں کے باہم پولیٹکل امور میں اختلاف رائے ہے۔ ہندو اس پولیٹکل پالیسی کے طرفدار ہیں جو کانگریس کے اصلی ممبروں یا اس کے حامیوں اور طرفداروں کی ہے اور جس کا ہر سال مختلف مقامات میں کانگریس کے نام سے اعلان کیا جاتا ہے اور اس پر زور دیا جاتا ہے۔ مسلمان اس پالیسی کے بخلاف ہیں۔ لوگ ان پر اتہام لگاتے ہیں کہ گورنمنٹ کے خوشامدی ہیں۔ لیکن یہ اتہام غلط ہے بلکہ مسلمانوں کے نزدیک ملک کے انتظام اور امن میں اس پالیسی سے خلل پڑنے کا اندیشہ ہے اور کسی طرح وہ پالیسی ہندوستان کی حالت کے مناسب نہیں ہے۔ بلاشبہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہم اختلاف مذہب سے قطع نظر کر کے ہندو مسلمانوں میں دوستی و محبت و یگانگت اور آپس میں ہمدردی کا برتاؤ چاہتے ہیں، اسی طرح پولیٹکل اختلاف رائے سے بھی قطع نظر کر کے سوشل امور میں باہم دوستی و محبت و ہمدردی و بھائی بندی کا برتاؤ چاہتے ہیں اور ہم یقین کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں جو غیر معمولی طریقے پر ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ بھائی بندی و ہمدردی کا اظہار کیا ہے وہ ایک دھوکا مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کا نہیں ہے بلکہ سچی بھائی بندی، سچی ہمدردی اور سچی ہم وطنی کا سبب ہے اور ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہو۔

"جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان ملتا ہے۔ جان لو! اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔"

رعد - رکوع ۴

کھیلوں کے ایوارڈ

سیّد حامد ٭

کھیل کوئی ہنسی کھیل نہیں ہیں۔ پڑھائی کی طرح کھیلوں میں بھی جان فشانی اور عرق ریزی کی ضرورت پڑتی ہے، بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ شروع سے ہی کھیل کے سانچے میں خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ جسم کو تندرست اور مضبوط بنایا جاتا ہے لیکن اس سے بھی کام نہیں چلتا۔ ذہن ہر پل بدن کا ساتھ نہ دے، حوصلہ اور ارادہ پشت پناہی کو نہ آئے اور اعصاب فولاد کو مات نہ دیں تو بھی بات نہیں بنتی۔ یہاں ذکر اُن کھیلوں کا ہو رہا ہے جہاں انسان خود سے اور دوسروں سے ہر آن مقابلہ کرتا رہتا ہے، جو کچھ اب تک کیا ہے اس سے بہتر کارگزاری دکھانی ہے۔ جو کچھ حریف کر رہے ہیں اس سے آگے نکلنا ہے۔

مقابلہ جسے کہتے ہیں وہ محنت، صحت اور حوصلہ کے علاوہ تربیت یا ٹریننگ بھی مانگتا ہے۔ کھیل بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ ٹیم گیم جیسے ہاکی، فٹ بال، کرکٹ، باسکٹ بال، والی بال اور ربولو وغیرہ جہاں ایک طرف کے کھلاڑیوں کی مقررہ تعداد دوسری طرف کے کھلاڑیوں کی اتنی تعداد کے خلاف زور آزمائی کرتی ہے داد شجاعت دیتی ہے، نتیجہ اسکور کی شکل میں نکل آتا ہے۔ اسکور کے تختے پر نظر ڈ‌الیے پتہ چل جائے گا کون ہار رہا ہے، کون جیت رہا ہے۔ اسی وضع کے کھیلوں سے ملتے ہوئے ٹینس اور بیڈمنٹن ہیں، ان میں دو پابندیوں کا اور اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ کھیل کے میدان (کورٹ) کو دو حصوں میں بانٹ دیتے ہیں، ٹیمیں اپنے اپنے حصوں میں مقیّد رہتی ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ایک ٹیم میں دو کھلاڑیوں سے زیادہ نہیں سما سکتے۔ مقابلہ کبھی دو کھلاڑیوں کی ٹیموں کے درمیان ہوتا ہے، کبھی ایک ایک کھلاڑی کے مابین۔

جن کھیلوں کا ابھی ذکر ہوا ہے، ان میں اشتراک عمل کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ پھر بڑی تعداد ایسے کھیلوں کی ہے جہاں مقابلہ کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ مثلاً خشکی اور پانی اور گھوڑے کی پیٹھ پر طرح طرح کی دوڑیں، اُن میں سے کچھ رسا وٹوں کو پھلانگتی ہیں۔ ایسے کھیلوں کا اپنا الگ لطف ہے، جہاں ایک ایک کھلاڑی سامنے آتا ہے اور اپنے جوہر دکھاتا ہے؛ مثال کے طور پر میدانی ڈسکس، شاٹ پٹ کو لیجیے، یا وزن برداری (ویٹ لفٹنگ) جمناسٹک کے مقابلوں کی دنیا ہی الگ ہے۔ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، لوچ اور لچک کا یہ عالم جیسے بدن میں ہڈی ہی نہ ہو۔ ان پر مستزاد وہ مقابلے جو پُر خطر اور جرأت طلب ہیں؛ کف بدہن سمندر اور برف پوش پہاڑوں کے سخت آزما کھیل۔ ہزاروں جرأت پیشہ انسان پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرنے میں کام آ گئے ہیں۔ خود ایورسٹ کی چوٹی نہ جانے کتنے مہم جو جانبازوں کے خون سے رنگین

٭ سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ——— ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

ہے۔ آرٹاٹک اور اختار کٹک پر بے شمار جیالے بلیدان دے چکے ہیں۔ کاروں، موٹر بوٹوں، موٹر سائیکلوں کی دوڑیں ہر سال انسانی زندگی سے اپنا خراج وصول کرتی رہی ہیں۔

کھیلوں سے دیوانہ وار شغف کا سبب کیا ہے؟ اچھا خاصا انسان گھر میں چین سے زندگی گزار رہا ہے؛ آسے کیا کتّے نے کاٹا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر شہر شہر بستی بستی کھیلوں کا کلہ پڑھتا پھرے؟ سمندروں کو کھنگال ڈالتا ہے، پہاڑوں کی جاں فرسا چوٹیوں کو سر کرتا ہے۔ اپنے کو طرح طرح کے جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ کہیں ٹھہرتا بھی نہیں، خوب سے خوب تر کی تلاش اُسے بے آرام، بے تاب، بے خواب رکھتی ہے۔ پہلا جواب اس سوال کا یہ ہے لیکن یہ پورا جواب نہیں ہے، کہ حرکت اور تبدیلی کے بغیر انسان کی زندگی بے کیف اور بے لطف رہتی ہے۔ ایک جگہ اور ایک حالت میں رہنا پڑے تو یہ چھوٹی سی زندگی پہاڑ ہو جاتی ہے۔ خزاں زندگی میں کھیل نمک کا کام کرتے ہیں۔ زندگی میں ملاحت اور لذّت کھیلوں سے آتی ہے۔ کھیلوں کا سہارا نہ ملے تو زندگی اجیرن ہو جائے۔

ہم اپنے ہم چشموں میں امتیاز حاصل کرنا چاہتے ہیں، امتیاز بھی ایسا کہ بیک وقت سب لوگوں کی نگاہیں ہم پر ہوں۔ کھیل کے علاوہ کہاں میسر ہوتی ہے یہ بات؟

ہم میں سے ہر ایک کے تحت الشعور میں یہ احساس موجود رہتا ہے کہ بالآخر ہمیں آرام کرنا ہے۔ اس مختصر زندگی کے بعد ہمارا سابقہ دائمی آرام سے ہوگا۔ آنکھیں ایک بار موند لیں تو پھر یک گونہ آرام ہی آرام ہے۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، محنت کرنا یہ سارے کھیل اسی وقت تک ہیں جب تک کہ انسان زمین کے اِس طرف ہے۔ جہاں دوسری طرف گیا طویل نیند، لگاتار سکوت اِس چھوٹی سی زندگی میں متحرک رہنے کا جو موقع ملا ہے، اس کا پورا فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے!

جن لوگوں کو ہم موٹے موٹے چشمے لگائے، گردن جھکائے، زرد رو اور بد قطع دیکھتے ہیں، وہ علامات ہیں عہدِ جدید میں بنی نوع انسان کی بے راہ روی کی۔ اوائلِ ایام میں انسان کو درندوں اور بھوک کا مقابلہ کرنے کے لیے دن بھر حرکت میں رہنا پڑتا تھا۔ وہ خوشی اور خطرہ کی زندگی گزارتا تھا۔ پھر ظالم عقل نے اس کی دستگیری کی۔ عقل کے سلسلے میں انسان اپنے محور اور اپنی ابتدا اور اصل سے ہٹتا چلا گیا۔ قدرت سے وہ دور ہو گیا، بہت دور۔ مکان بنانا، آگ جلانا، لکھنا پڑھنا، چھاپنا، بھاپ اور بجلی اور بے سیم سے نظامِ قدرت کو اُلٹ پلٹ کر ڈالنا، عقل اور علم، اختراع اور انکشاف نے انسان کے ہاتھوں کو بیکراں طاقت کے نت نئے ذخائر سے بھر دیا، لیکن زندگی خوف و خطر، جوش و خروش، ذوقِ عمل، فضل طلبی، مہم جوئی، ریاضت اور ورزش سے محروم ہو گئی۔ اس نے تنگ آکر، گھبرا کر کھیلوں کو آواز دی کہ آئین اور تہذیب اور مدنیت کی لائی ہوئی کمیوں، کوتاہیوں، ناتوانیوں، یکسانیوں اور بے کیفیوں کو دور کر دیں۔

یہ کھیل ہی تھے جو کرسی نشیں آدمی کی زندگی میں حرکت لائے، توازن لائے۔ انھوں نے اسے ان بیماریوں، کمزوریوں اور اداسیوں سے بچایا جو لکھنے پڑھنے اور دفتر میں کام کرنے والوں کی جھولیوں میں بطور تاوان کے ڈال دی جاتی ہیں۔ بات جب بہت آگے بڑھ جاتی ہے! بیماری جب لاعلاج ہو جاتی ہے، تب انھیں پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے سودا وہ کیا جو ٹوٹے کا تھا۔

انسان فطرتاً مہم جُو، خطر طلب اور عزائم بر دوش ہے۔ ہر وہ مہم جس میں خطرہ ہو، اسے بھاتی ہے۔ بلند حوصلہ انسان خطرات کی تلاش میں دیوانہ وار نکلتے ہیں۔ وہ خطرات جن میں جستجو ہو، انکشاف اور امتیاز کا امکان ہو اُس کو جہد کے لیے بے تاب کر دیتے ہیں۔ زندگی میں سے جستجو کو ہٹا دیجیے، مہم جوئی کو دور کر دیجیے، کھیلوں کو نکال دیجیے تو اس میں بچا کیا؟ ہاں، مقابلہ بند ہو تو بات ہے۔

ہمارے دور کی یہ انوکھی اُفتاد ہے کہ بے ایمانی ہر جگہ راہ پا جاتی ہے۔ کھیلوں میں ڈرگس یا نشیلی طاقت بخش دواؤں کا چلن ہو گیا ہے۔ اولمپک کھیلوں اور اس طرح کی دوسری رفتار

آزمائیوں میں کھلاڑیوں کے قاروزہ کی جانچ کی جاتی ہے، اگر انھوں نے وقتی توانائی حاصل کرنے کے لیے ڈرگس لیے ہیں تو وہ پکڑے جاتے ہیں۔ عروج و زوال ہم آمیز نظر آتے ہیں۔ کھیلوں کے میدان میں ایک طرف انسان کی جسمانی صلاحیتیں اپنے نقطۂ کمال پہنچ گئی ہیں۔ دوسری طرف اس کے اخلاق نے تحت الثریٰ کو چھولیا ہے۔ کھیلوں کی دنیا انصاف، راست روی اور حق شناسی کے لیے جانی جاتی تھی۔ اسپورٹس مین اسپرٹ کا مطلب تھا ناجائز فائدہ ہرگز نہ اٹھانا اور حریف کو دھوکہ زنہار نہ دینا۔ ہر شے، ہر عمل کھلی کتاب کی مانند ہوتا تھا۔ آج اسی کھیلوں کی دنیا میں شہرت کی ہوس نے اخلاق اور انصاف کو تاراج کردیا ہے۔ شہرت اور بدنامی کے درمیان خطِ فاصل مٹتا جارہا ہے۔

کھیلوں سے صحت بنتی ہے، کھیلوں سے انسان زندگی بسر کرنے اور سرد و گرم کا مقابلہ کرنے کے ڈھنگ سیکھتا ہے نہ جیت پر بغلیں بجاتا ہے، نہ ہار پر ملول ہوتا ہے۔ کھیل گویا بیماری کے ٹیکے کی طرح ہیں۔ اصل بیماری کے کمزور جراثیم ٹیکے کے ذریعے بدن میں داخل کیے جاتے ہیں تاکہ بدن اور اس میں دوڑتا ہوا لہو ان جراثیم کا عادی ہوجائے اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ۔ انسان کی زندگی کی بنا باہمی مقابلے، رقابت اور ہار جیت، کامیابی اور ناکامیابی کے تار و پود سے بنی ہوئی ہے۔ کھیل کی زندگی نقل اور اس کا ریہرسل ہوتے ہیں۔ وہ نفسیات کو توانا، اعصاب کو مضبوط اور برداشت کی قوت کو آہنی بناتے ہیں۔ وہ زندگی کے میدان کی ہار جیت اور تکلیفوں اور مصیبتوں کے لیے ہمیں تیار کردیتے ہیں۔ کھیلوں کی یہ سب سے بڑی دین ہے۔ تندرستی سے بھی بڑی دین۔

سورج پورب سے نکلتا ہے۔ عجیب ماجرا ہے کہ پورب میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ سورج تلے اندھیرا۔ پچھلے پانسو سال سے بیشتر مشرقی ممالک نے نہ علوم میں کوئی کارہائے نمایاں کیے نہ کھیلوں اور جرأت آزمائیوں میں۔ ہم ایسے ہوگئے جیسے مٹی کا ڈلہ ہوں، بے حرکت، بے حوصلہ، بے شعور۔ دنیا کی آبادی کا ساتواں حصّہ ہندوستان میں بستا ہے۔ کھیلوں میں امتیاز کا حساب لگایا جائے تو ہم ایک فیصد کو بھی نہیں چھوتے۔ حکومت کھیلوں کو بڑھاوا دے رہی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ جن افراد اور اداروں کے سپرد یہ کام کیا جاتا ہے، وہ اپنے ذاتی مفاد اور باہمی رنجشوں سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ ہاکی کا کھیل ہمارے لیے مایۂ ناز تھا، نہ رہا۔ کرکٹ میں کبھی کبھی ہم زور باندھ لیتے ہیں۔ بلیرڈ میں ہم نے امتیاز حاصل کیا ہے۔ یہی ہے ہماری کل کائنات، اللہ اللہ خیر سلا۔

اور اگر یہ تلاش کرنا ہو کہ ہندوستانیوں میں اس اعتبار سے کون سا طبقہ سب سے پسماندہ ہے تو مسلمانوں پر نظرِ انتخاب ڈالیے۔ پڑھنے لکھنے میں تو یہ سب سے پیچھے تھے ہی، کھیلوں میں البتہ ان کا ذکر آتا تھا۔ آنسو پونچھ جاتے تھے۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ کھیلوں کو فروغ دینے کے لیے قومی سطح پر تین طرح کے ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ کھلاڑیوں کو ارجن ایوارڈ، سکھانے والوں کو دروناچاریہ ایوارڈ، اور اس یونیورسٹی کو جو کھیلوں میں سب سے اچھی ہو، مولانا ابوالکلام آزاد ٹرافی۔

ابھی کچھ عرصہ ہوا ۱۹۹۰ء کے ایوارڈ راشٹرپتی جی نے جگمگاتے ہوئے اشوکا ہال میں تقسیم کیے۔ مختلف کھیلوں میں تیرہ ایوارڈ دیے گئے۔ ایتھلیٹکس، شطرنج، ہاکی، کبڈی، تیراکی، اسکواش، ٹینس، ٹیبل ٹینس، والی بال، وزن برداری، کشتی، بادبانی۔ آنکھیں ترستی رہیں کہ ان میں کوئی مسلمان بھی ہوتا۔

آگے چل کر جب کوچوں (تربیت دینے والوں) کی باری آئی تو قدرے اشک شوئی ہوگئی۔ ایوارڈ پانے والوں میں فٹ بال کے کوچ سید نعیم الدین شامل تھے۔ انھیں دروناچاریہ ایوارڈ ملا۔

مولانا آزاد ٹرافی، دہلی یونیورسٹی کو ملی۔ ۷-۵-۱۹۵۶ء سے یہ ٹرافی شروع ہوئی۔ آج تک دہلی یونیورسٹی کو یہ تیرہ بار

مل چکی ہے۔ گرونانک دیو یونیورسٹی کو دو بار، پنجاب یونیورسٹی کو بھی نو بار، بمبئی یونیورسٹی کو تین بار، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو، جو کبھی کھیلوں کے لیے مشہور تھی، گزشتہ ۳۵ سال میں ایک بار بھی یہ ٹرافی نہیں ملی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تو خیر اس ضمن میں ذکر ہی بے محل ہوگا۔

۱۹۶۱ء سے ۱۹۹۰ء تک جملہ کھیلوں میں ۴۰۸ ایوارڈ دیے گئے، جن میں سے مسلمان کھلاڑیوں کو صرف بیس ایوارڈ ملے۔ یعنی ۵ فی صد سے بھی کچھ کم۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں کی ضمن میں پڑھائی کی کمی کھیلوں سے پوری کر دی جائے گی۔ ایسا بھی نہ ہو سکا۔ آپ ہی بتائیے ہمارے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ نہیں۔ ان لوگوں کے نام سن لیجیے جنھوں نے تھوڑی بہت لاج اس انحطاط پذیر ملت کی رکھی۔

سال	کھیل	نام
۱۹۶۲ء	بیڈ منٹن	کماری میناشاہ
۱۹۶۹ء	ٹیبل ٹینس	میر قاسم علی
۱۹۷۰ء	باسکٹ بال	عباس منتظر
	فٹ بال	سید نعیم الدین
۱۹۷۲ء	بال بیڈمنٹن	اے۔ کریم
	شہ سواری	دفعدار خان محمد خاں
	بادبانی (یاٹنگ)	افسر حسین
۱۹۷۸-۷۹	نیچے کا دھڑ مفلوج (وہیل چیئر، جیولن۔ ٹیبل ٹینس ۔ تیراکی)	کماری شہناز کرمانی
۱۹۸۰-۸۱	بیڈمنٹن	سید مودی
	کرکٹ	سید کرمانی
	فٹ بال	محمد حبیب
	ہاکی	محمد شاہد
۱۹۸۱ء	ایتھلیٹکس	صابر علی
۱۹۸۳ء	ہاکی	ظفر اقبال
۱۹۸۴ء	شہ سواری	کیپٹن غلام محمد خاں
	کشتی رانی (روانگ)	کیپٹن محمد امین نایک
	کرکٹ	محمد اظہر الدین
۱۹۸۹ء	والی بال	عبدالباسط

یہ کھلاڑی ہمارے احترام اور امتنان کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے نوخیز کھلاڑیوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جہاں تک اُس ٹرافی کا تعلق ہے جو مولانا آزاد کے نام سے منسوب ہے، یہ دیکھ کر کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے

ہمارے وسائل حاصل ہیں اور جیسے کھیلوں میں امتیاز پر سدا ناز رہا ہے، ایک بار بھی اس ٹرافی کو نہیں اُٹھا سکی، ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ جواں مردی کا تقاضہ ہے کہ ہم کھیلوں میں دادِ شجاعت دیں اور خطرات سے دامن نہ بچائیں۔ کبھی سوچا ہم نے کہ اب ہیں ہم کس قطار میں؟ زندگی کے کس شعبے میں ہم نے امتیاز حاصل کیا ہے؟ محنت کرنے اور پسینہ بہانے سے ہم کب تک گریز کریں گے؟ لگن سے ہمیں چڑ کیوں ہے؟ سرسری انداز کو آخر ہم کیوں اپنائے ہوئے ہیں؟

" اے مسلمانو! اس بات کا بھی تم خیال کرو کہ اگر اس وقت تم نے ہمت نہ کی اور سعی و کوشش میں کوتاہی کی اور خدانخواستہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو پھر کبھی تمہاری بھلائی اور تمہاری بہبودی کی توقع نہ ہوگی۔

کہاں سے یہ وقت پھر ہاتھ آوے جو اس وقت ہاتھ میں ہے؟

کہاں سے یہ موقع باقی رہے گا جو اس وقت ہے؟

کون تمہارے لیے اپنی جان اپنا مال اپنا وقت اپنا آرام تم پر فدا کرنے والا پیدا ہوگا جو پھر تمہارے لیے کوشش و سعی کرے گا۔

کسی کو ایسی ہمت و جرأت ہوگی کہ اس کوشش کو خدانخواستہ ناکامیاب دیکھ کر پھر آئندہ کسی قسم کی سعی و کوشش کرنے کی ہمت کرے۔

سرسید"

انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — قیام و مقاصد

قسط اول

محمد نعیم جیراجپوری▽

سرسید احمد خاںؒ کی دوراندیشی اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (M.A.O. College) کی بنیاد ڈالی جس نے بعد میں ۱۹۲۰ء میں مکمل یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلی اور یہ سب کچھ گورنمنٹ آف انڈیا کی ایک پارلیمنٹ ایکٹ کے ذریعے ہوا۔ یہ یونیورسٹی جب سے قائم ہوئی ہے اس میں تمام دنیا سے ونیز پورے ہندوستان سے لڑکے و لڑکیاں بلا لحاظ مذہب و ملت، فرقہ وجماعت یگانگت اور خلوص ومحبت کے جذبات سے سرشار ہوکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھتے آرہے ہیں۔

اقامتی کردار کی حامل یہ تعلیمی درسگاہ دراصل لندن کی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے نمونے پر بنائی گئی۔ کیونکہ سرسید احمد خاں جب انگلینڈ سے واپس آئے تو انھوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور تعمیر شروع کی۔ اس میں بڑے بڑے ہوسٹل مع ڈائننگ ہالوں کے بنائے گئے، تاکہ طلباء سکون و آرام سے یکسو ہوکر اور تعلیم حاصل کرکے ملک وملت کی خدمت کرسکیں۔

اس یونیورسٹی میں درس و تدریس میں ہر علم کی الگ الگ ہدایت اور علمی قابلیت وتحقیقات کے مواقع حاصل ہیں۔ متعدد تعلیمی ادارے مختلف فیکلٹیوں میں مختلف قسم کے علوم وفنون کی تعلیم مہیا کرتے ہیں مثال کے طور پر "لائف سائنس"، "سوشل سائنس"، "انجینئرنگ وٹیکنالوجی"، "میڈیسن" وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ایک اچھی خاصی تعداد ایڈوانس اسٹڈیز سینٹرس کی ہے۔ مزید یہ کہ کچھ اداروں میں خاص ریسرچ (تحقیق) کے پروگرام جو یو۔جی۔سی کے تعاون اور مالی امداد سے چلائے جارہے ہیں۔ مثلاً شعبۂ تاریخ جغرافیہ، ریاضی، فزکس، جیولوجی، باٹنی اور زولوجی وغیرہ ہیں۔ اس طرح اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دنیا کی یونیورسٹیوں میں اور خاص طور پر اپنے ملک میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے اور لوگ اپنے بچوں کو اس میں تعلیم دلوانا فخر سمجھتے ہیں مگر اس کو کیا کہیے کہ ابھی تک یونیورسٹی میں زراعتی تعلیم کی کمی ہے۔ یعنی کہ ایگریکلچرل انسٹی ٹیوٹ جسے وہ ابھی تک حاصل نہ کرسکی ہے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو مگر وقت کا تقاضا ہے کہ ان اداروں کو یونیورسٹی جلد از جلد کھولے جس کا مکمل جواز بھی موجود ہے۔ مثلاً یونیورسٹی کا اپنا ذاتی فارم ہے جس میں طرح طرح کے پھل دار درخت لگے ہیں۔ ربیع اور خریف کی فصلیں اگائی جاتی ہیں، اپنا ذاتی بوٹانیکل گارڈن اور گلاس ہاؤس ہے، اپنی سورتی کالانی ہے جس کا باقاعدہ پروسسنگ پلانٹ (Processing Plant) ہے۔

▽ کوآرڈی نیٹر ایگری کلچر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بہرحال اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یونیورسٹی نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مرحوم سابق وائس چانسلر نے ۱۹۳۵ء میں یو پی گورنمنٹ کا اگریکلچر فارم جس کا رقبہ ۶۳٫۵ ایکڑ تھا اور جو علی گڑھ ہی میں رام گھاٹ روڈ پر واقع ہے صرف ۱۰۰/ روپے سالانہ تیس برس کے پٹے پر لیا تھا۔ کیونکہ یونیورسٹی نے ہائی اسکول تک اگریکلچر کا مضمون شامل کیا تھا اور ہائی اسکول تک کی پریکٹیکل کلاسز فارم پر ہونے لگیں تھیں۔ پھر ۱۹۴۵ء میں یونیورسٹی نے یو۔ پی گورنمنٹ سے اگریکلچر فارم کی رہائشی، اسٹور دفاتر کی بلڈنگ لے لیں۔ اس طرح گورنمنٹ کا یہ فارم مع زمین اور بلڈنگ کے یونیورسٹی کے پاس آگیا۔ ادھر یونیورسٹی نے سینٹرل گورنمنٹ سے اگریکلچر کالج کے لیے منسٹری آف اگریکلچر سے Recurring اور Non-recurring گرانٹ منظور کروا کر حاصل کر لی اور اس طرح یونیورسٹی نے اگریکلچر میں پہلا تعلیمی سیشن ۴۶-۱۹۴۵ء میں فرسٹ ایر سے شروع کیا اور لڑکوں کو فارم پر ہی رہائشی بلڈنگ میں رکھا گیا اور یہ اگریکلچر ہوسٹل کے نام سے پرووسٹ ایس ایس ہال سے منسلک کر دیا گیا۔ دوسرے سال یعنی ۴۷-۱۹۴۶ء میں لڑکوں کو ایس ایس ہال تبدیل کر دیا گیا اور فارم پر مکمل پرنسپل اگریکلچر کالج کا دفتر، اسٹاف روم، کامن روم، لائبریری کا کمرہ اور کلاس روم بنا دیے گئے۔ مگر بدقسمتی کہ ہندوستان کے بٹوارے کے بعد اپریل ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ آف انڈیا منسٹری آف اگریکلچر نے ایک حکم نامہ یونیورسٹی کو بھیجا کہ ۳۱ مئی ۱۹۴۸ء کے بعد کوئی بھی گرانٹ یونیورسٹی اگریکلچر کالج کو نہیں دی جا سکے گی۔ کیونکہ گورنمنٹ نے یہ طے کیا ہے کہ ۱۰۰ میل کے اندر جتنے بھی اگریکلچر کالجز ہیں بند کر دیے جائیں۔ ہماری یونیورسٹی کا اگریکلچرل کالج اسی فارمولے کے تحت آتا تھا لہٰذا پورے اسٹاف کو نوٹس جاری کر دیے گئے کہ ۳۱ مئی ۱۹۴۸ء سے اگریکلچر کالج ختم کر دیا گیا اور اس وقت کے [illegible] ہادی مرزا نے حکم دیا کہ:

مندرجہ ذیل اگریکلچر کالج اسٹاف کی سروسز ۳۱ مئی ۱۹۴۸ء کے بعد درکار نہیں ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر سید الدین صالح صاحب۔ پرنسپل اگریکلچر کالج
۲۔ ڈاکٹر وحید اختر صاحب۔ اگریکلچر کے فل ٹائم لیکچرر
۳۔ " اشرف علی " "
۴ " حامد صاحب " "
۵۔ سید محمد صاحب ڈیمانسٹریٹر فل ٹائم
پارٹ ٹائم
۶ پروفیسر ابرار مصطفیٰ خاں صاحب باٹنی پارٹ ٹائم
۷ عبدالبصیر خاں صاحب۔ فزکس "

اور فارم کا مکمل چارج جس میں کھیت، باغ، بلڈنگ، بیل (Bullocks) اگریکلچر آلات ڈاکٹر افضال حسین قادری صاحب کو کہا گیا کہ وہ چارج لیں۔ لہٰذا چارج ان کو دیا گیا اس دفتر کا سامان، فرنیچر، ٹائپ رائٹر، فائل وغیرہ ڈین فیکلٹی آف سائنس کے دفتر یعنی مسٹر الیاس احمد کو سونپا گیا جو اس وقت پرانی بلڈنگ فزکس میں تھا۔ اس طرح یہ اگریکلچر کالج ختم ہوا۔

ان ۴۵ سالوں کے عرصے میں کس طرح بھی اگریکلچر کالج بن نہ سکا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر ہو کر ۱۹۴۹ء میں آگئے تھے۔ انھوں نے بڑی کوشش کی اور ایک اسکیم تیار ہوئی تھی مگر وہ یونیورسٹی دیگر دیگر بہت ہی ضروری کاموں میں مشغول رہے اور پھر بہار کے گورنر ہو کر چلے گئے۔ ان کے بعد پھر کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وائس چانسلر ہو کر یہاں آئے۔ مگر وہ اور دیگر تعمیراتی کاموں میں مشغول رہے۔ اور انھوں نے یونیورسٹی میں اپنے عہد میں اسٹاف کلب، لائبریری کینٹین [illegible] فیکلٹی آف آرٹس، ہال جی، کشمیر ہاؤس [illegible] ہوسٹل [illegible]

سب سے اہم میڈیکل کالج بنوایا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے ایگریکلچر کالج کو کوئی اہمیت نہ ملی۔ جب بدرالدین طیب جی صاحب وائس چانسلر ہو کر آئے تو انھوں نے چاہا کہ کم از کم ایگریکلچر کا ڈپلوما ہی مکمل ہو جائے۔ اس غرض سے انھوں نے جرمنی سے کسی نہ کسی ۳۵ لاکھ روپیے کی گرانٹ حاصل کر لی، جس کی بدولت فارم پر ایک تین کمروں کا دفتر، ایک ورکشاپ، چار بڑے گودام، تین چھوٹے اسٹاف کوارٹر اور ایک بیرک لیبر کے رہنے کے لیے بنوا دی اور پھر اسی دوران جرمنی کی طرف سے ایک ایکسپرٹ بھی آیا تھا جس نے پورے فارم کا سروے کیا۔ اس کا نام ڈاکٹر شنوبل (Dr. S[illegible]) تھا۔ اسی کی سفارش پر روپیہ ملا۔ پھر بدرالدین طیب جی نے زراعتی کالجوں اور رودرپور یونیورسٹی سے کچھ ڈیٹا (Data) اکٹھا کروانا چاہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے طیب جی کو دو سال کے اندر ہی واپس بلا لیا۔ کیونکہ طیب جی پنڈت نہرو کے بہت قریب تھے۔ ان کے انتقال کے فوراً بعد طیب جی کو واپس دہلی بلا لیا گیا۔ بہرحال ۱۹۸۴ء سے یونیورسٹی نے پوسٹ گریجویٹ کلاسز ایگریکلچر ایم۔ایس سی (M.Sc. Agriculture) لیول کی شروع کیں جن کو یونیورسٹی خود اپنے مالی وسائل کی بنا پر جاری رکھے ہوئے ہے مگر اب یہ محسوس ہوا کہ یونیورسٹی میں زرعی تحقیقاتی کام کافی ہو چکا ہے اور شعبہ جاتی سہولتیں اور وسائل موجود ہیں۔ کیوں نہ ایگریکلچر سینٹر کھول دیا جائے تاکہ ملک اور قوم دونوں کو فائدہ پہنچے۔ لہذا بوٹنی اور زوولوجی ڈپارٹمنٹ کے باہمی اشتراک اور تعاون سے ۱۹۸۴ء سے برابر باقاعدہ تعلیم اس میدان میں شروع کر دی گئی جو کہ جاری ہے۔ اصل یونیورسٹی [illegible] کا ماضی اور حال بہت [illegible] شاندار اور [illegible] ہے تھا۔

متعلق بہت ہی کم مضامین میں تحقیقاتی کام ہو رہا ہے جب کہ شعبہ جاتی سہولتیں اور ہر قسم کی آسانیاں موجود ہیں۔ زرعی تعلیم میں صرف نیماٹولوجی، اینٹامولوجی اور پلانٹ پیتھالوجی وغیرہ پر تحقیق اور تعلیم برابر جاری ہے بلکہ ایگریکلچر مائیکرو بائیولوجی اور لینڈ یوز (Land Use) اور پانی کی سپلائی کا انتظام (Water Management) کی تعلیم بھی دی جاتی رہی ہے۔

اب یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ ایگریکلچر سینٹر کا یونیورسٹی میں ایک خاص مقام ہے۔ یونیورسٹی کی تین بڑی کلیات لائف سائنس، فیکلٹی آف سائنس اور فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی آپس میں مل کر اپنے اپنے ذرائع اور وسائل استعمال کرتے ہوئے ایگریکلچر سینٹر کو بھرپور تعاون دے رہی ہیں۔ نیز ان شعبوں کی کارکردگی اور اساتذہ و دیگر اسٹاف کی دلچسپی کے باعث ہر مشکل سے مشکل تعلیمی میدان اور زرعی تحقیقاتی کام میں مدد کی ہے اور ہر طرح کی اڑچنیں اور مشکلات پر قابو پاتے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے کو تیار رہیں جو قابلِ ستائش ہے۔

مزید یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ یونیورسٹی میں کافی سہولتیں اور ضروری اشیاء یعنی انفرا اسٹرکچر (Infra-Structural facilities) جو ایگریکلچر تحقیقاتی کام کے لیے درکار ہیں وہ یہاں موجود ہیں۔

ایگریکلچر سینٹر کا مندرجہ بالا سطور میں جو حوالہ دیا گیا ہے کہ پوسٹ گریجویٹ تعلیم نیماٹولوجی (Nema-tology) اور اینٹومولوجی (Entomology) جو کہ کیڑوں مکوڑوں سے متعلق ہیں۔ پلانٹ پیتھالوجی (Plant [illegible] ایگریکلچر مائیکرو بائیولوجی (Agric- [illegible]

ڈگری ان مضامین میں حاصل کرلی ہے۔ ایم۔فل (M.Phil) اور پی ایچ۔ڈی (Ph.D.) کی ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے سبھی کافی وسائل اور آسانیاں موجود ہیں بلکہ ایک درجن سے زائد طلبا کو ایم۔فل دیا جا چکا ہے اور بالکل ابھی حال ہی میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری انگریکلچر میں دو طالب علموں کو نیماٹولوجی میں عطا کی گئی ہے۔ ان طلبا کو روزگار کے مواقع بھی خوب تر حاصل ہیں اور چند کو ان میں سے وظائف اور متفرق مالی امداد بھی ملتی ہیں۔ علاوہ اس کے ان لڑکوں کے اس نہایت ہی اہم زرعی تحقیقاتی کام کی تعریف پورے ہندوستان و نیز بین الاقوامی سطح پر اور دیگر ممالک کے شعبوں میں کی جا چکی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو زرعی تحقیقاتی کام ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

اگریکلچر سینٹر کے بعد اگریکلچر انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد کے لیے خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کی سطح پر جد و جہد جاری رکھنی چاہیے تاکہ یونیورسٹی کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ازالہ ہو۔ اسی صورت میں ممکن ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا جلد از جلد اگریکلچر انسٹی ٹیوٹ کھولنے کی منظوری دے اور ساتھ ہی گرانٹ فراہم کرے۔ تاکہ یونیورسٹی زرعی میدان میں اپنی توقعات پر پوری اتر سکے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زرعی تحقیقات

تقریباً چار پانچ دہائیوں سے یونیورسٹی کے بہت سے شعبے مثال کے طور پر زوولوجی، باٹنی، کیمسٹری، بائیو کیمسٹری اور جغرافیہ وغیرہ زرعی تحقیقاتی مسئلوں پر کام کرتے رہے ہیں اور یہ بات بالکل صاف ظاہر ہو چکی ہے کہ ان شعبوں نے قابل تعریف کام انجام دیے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر "نیماٹولوجی"، "اینٹامولوجی" اور "پلانٹ پیتھالوجی" کا ذکر کرنا

شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

یونیورسٹی سائنس دانوں کی قدر افزائی اور انعامات

یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے ملک اور بیرون ملک میں زرعی تحقیقات کے میدان میں اپنی ایک الگ شناخت بنالی ہے۔ مثلاً انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی (INSA) نے قابل تعریف تحقیقاتی کاموں کو سراہتے ہوئے یونیورسٹی کے دو "نیماٹولوجسٹ" کا تقرر بحیثیت FNA کیا اور ایک اعلیٰ باعزت مقام و جگہ پر تقرر یعنی ڈائرکٹر آف دی زولوجیکل سروے آف انڈیا (Director of the Zoological Survey of India) کیا اور ہیڈ (Head) آف ڈویژنس آف اینٹامولوجی اور نیماٹولوجی آف IARI میں بھی علی گڑھ کے ہی سائنس داں رہے۔ رفیع احمد قدوائی میموریل انعام اگریکلچر میں اور ہیرا لال چکرورتی انعام اور گولڈ میڈل زولوجیکل سوسائٹی آف انڈیا بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے "نیماٹولوجسٹ" نے حاصل کیا۔ کیوں کہ انھوں نے غیر معمولی اور قابل تعریف تحقیقاتی کام کیا ہے۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کے بہت سے سائنسداں بحیثیت ممبر یا چیرمین ICAR پینل (Panel) میں کام کر رہے ہیں جس میں نیماٹولوجی اور اینٹامولوجی یا محکمہ جات جو بائیو ٹیکنولوجی، سائنس اور ٹیکنولوجی وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی مشاورتی کمیٹیوں کے پروگرام میں شامل ہیں۔ نیماٹولوجیکل سوسائٹی آف انڈیا کا پہلا اور پانچواں صدر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نیماٹولوجسٹ (Nematologist) ہی تھے اور IARI کے باہر سے پہلی بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا چیف ایڈیٹر آف انڈین جرنل آف نیماٹولوجی تھا۔

بین الاقوامی حیثیت سے سب سے باوقار اور اعلیٰ ترین مقام پر پرنسل نیماٹولوجسٹ کا جو کام ملتا [illegible]

ی گریجویٹ کو ملا۔ مسلم یونیورسٹی کے بہی سائنسداں قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں، سیمیناروں میں، سمپوزیموں اور ورکشاپ وغیرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اور لیتے چلے آرہے ہیں اور کئی مرتبہ انھیں چیرمین شپ اور چیف گیسٹ کی حیثیت سے نوازا گیا۔ کچھ ایسی ہی انٹرنیشنل کانفرنسوں کی لسٹ مندرجہ ذیل میں دی جارہی ہے۔

۱۔ انٹرنیشنل کانگریس آف پلانٹ پیتھالوجی
۲۔ انٹرنیشنل کانگریس آف نیماٹولوجی
۳۔ انٹرنیشنل نیماٹولوجی سمپوزیم وغیرہ
۴۔ انٹرنیشنل سمپوزیم آن کروپ (Crop) پروٹیکشن (فصلوں کے بچاؤ پر)
۵۔ میڈیٹیرینین (Mediterranean) کانگریس آف پلانٹ پروٹیکشن وغیرہ۔

تحقیقاتی اشاعت

زرعی تحقیقاتی اشاعت کے بارے میں کافی کام ہوا ہے اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ نیماٹولوجی، اینٹامولوجی اور پلانٹ پیتھالوجی میں ابھی تک تقریباً پندرہ سو سے زائد تحقیقاتی مقالے اچھی ساکھ رکھنے والے مشہور معروف رسالوں اور جرنلوں میں چھپ چکے ہیں اور دو سو سے بھی زیادہ طلباء نے پی ایچ۔ ڈی اور ایم۔فل کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور دس طلباء نے سب سے اہم تحقیقاتی کام کیے ہیں اور ڈی ایس سی (D.Sc.) کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اسی ریسرچ کی شائع شدہ کتابوں کا شمار اول درجہ میں ہے۔ تجرباتی ہے اور متعلقہ مضامین سے متعلق ہے اور یہ سب یونیورسٹی کے لیے فتح و نصرت کا سہرا ہے اور ان شائع شدہ کتابوں کی کوالیٹی بھی بہترین ہے۔ ان کی سراہنا زیادہ تر اچھی ساکھ رکھنے والے ہندوستان اور ۱۰،۰۰۰ اک [illegible] ٹالوجی، زوالوجی جرنلز میں ہوا ہے

کچھ مخصوص زرعی تحقیقاتی ریسرچ تو ایسے انداز میں ہوئی ہے کہ اُن کا دوسرا کوئی ثانی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ٹیکسونومی (Taxonomy) مارفولوجی (Morphology) جس میں الٹرا اسٹکچر (Ultra-structure) بھی شامل ہے غیر معمولی کام ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بایولوجی، ایکولوجی، بائیولوجیکل کنٹرول، بی ہیویر، کیمیکل کنٹرول، آرگینک امینڈمینٹس، پلانٹ بریڈنگ، پلانٹ فزیالوجی، وائرولوجی، انٹرایکشن وغیرہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

جو کتابیں معرضِ تعزد کے شائع ہوئیں

ابھی چند سالوں کے دوران یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے کافی اچھی اور معلوماتی قیمتی کتابیں نشر کی ہیں جن میں کچھ بیش بہا اور قابل ستائش ہیں۔ ابھی حال میں زرعی خصوصیات اور تحقیقاتی ریسرچ پر کچھ کتابیں شائع ہوئیں جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ ڈوری لیمیڈا (DORYLAIMIDA)
۲۔ ٹائی لین کیڈا (TYLENCHIDA)
اور
۳۔ مونونکیڈا (MONONCHIDA)

ہیں۔ جنھیں یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے اپنی کاوشوں اور اہلیت کی بنا پر نشر و اشاعت کا کام انجام دیا۔ Tylenchida پر کتاب سی۔ اے۔ بی۔ انٹرنیشنل یو۔ کے (CAB International U.K.) نے ۱۹۸۶ء میں شائع کی اور دوسری کتاب ڈوری لیمیڈا (Dorylaimida) پر ۱۹۹۲ء میں ای۔جے۔ برل لیڈن نیدرلینڈ (E.J. Brill, The Netherlands) نے شائع کی۔ نیماٹوڈس (Nematodes) پر یہ کتابیں ایک اہم بنیادی ذریعہ ہیں اور بہت ہی کارآمد اور معلوماتی قرار دی جا رہی ہیں۔

اس کے علاوہ جو تحقیقات ہندوستانی کیڑے مکوڑوں کی نسل پر ہو رہی ہیں، اینٹامولوجی میں

ایک اہم معلوماتی کتاب On "Indian Insect Types" ہے اور دوسری کتابیں جن کا ذکر یہاں کرنا ضروری ہے وہ ہیں "نیماٹوڈ - بائیو کنٹرول"۔ اس کتاب کو صحیح وقت پر اور کارآمد قرار دیا گیا ہے۔ نیماٹوڈ پیسٹ آئی ڈینٹی فیکیشن (Nematode Pest Identification) نیماٹوڈ پیسٹس آف رائس (Nematode Pests of Rice) اور پروگریس ان پلانٹ نیماٹولوجی (Progress in Plant Nematology) وغیرہ وغیرہ ہیں جو نہایت کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔

تحقیقاتی منصوبے

گورنمنٹ آف انڈیا کے نہایت ہی اہم محکموں نے مثلاً ICAR, CSIR, UGC اور DST وغیرہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے ترقیاتی اور تحقیقاتی منصوبوں کے لیے کافی رقمیں منظور کی ہیں۔ ان کے علاوہ PL-480 کے منصوبے کو بڑی اہمیت حاصل ہے جن کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا نے کافی روپیے یونیورسٹی کو دیا ہے۔ ان تمام منصوبوں پر جو کام ہوا ہے۔ وہ متعلقہ محکموں نے اپنے سائنس دانوں کے ذریعے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا جسے ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے اور یونیورسٹی کے لیے ایک فال نیک ہے اور قابلِ تعریف ہے۔

زرعی تحقیقاتی کام PL-480 پر باٹنی میں اور زولوجی میں "نیماٹوڈس آف سبزیات (Nematodes of Vegetables) ہائی مینوپیٹرن پیراسائٹس (Hymenopteran Parasites) پاؤڈری ملڈیو (Powdery Mildew) آرگینک امینڈمینٹس (Organic Amendments) وغیرہ پر ہوا ہے اور متفرق بیجوں اور تلہن پر کیمسٹری میں کام ہوا ہے۔ ان منصوبوں پر تحقیقاتی کام قابلِ فخر اور قابلِ تعریف ہے جس کا یہاں پر ذکر کرنا ضروری ہے۔ یونیورسٹی نے فصلوں کی وبائی بیماری بوجہ کیڑے مکوڑوں کے ICAR کے ملکی سطح کے منصوبوں میں بھی شمولیت کی ہے۔ ICAR نے اور دیگر منصوبے بھی منظور کیے ہیں جن کا تعلق نیماٹولوجی (Nematology) اینٹامولوجی (Entomology) پلانٹ پیتھالوجی (Plant Pathology) وائرولوجی (Virology) وغیرہ سے رہا ہے یہ سارے منصوبے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے گزشتہ تین دہائیوں کے درمیان منظور کیے گئے۔

اسی طرح ایک اچھی خاصی تعداد زرعی منصوبوں کی یو۔جی سی (UGC) سی۔ ایس۔ آئی۔ آر (CSIR) اور ڈی۔ ایس۔ ٹی (DST) وغیرہ نے منظوری دی تاکہ یونیورسٹی سائنس دانوں کو موقع فراہم ہو کہ وہ اپنی قابلیت اور تحقیقاتی وفنی مہارت دکھا سکیں۔ ان منصوبوں کی منظوری سے ایک موقع فراہم ہوا کہ متفرق دیگر محکموں کو تحقیقاتی آسانیاں پیدا ہوں تاکہ وہ اپنی تحقیقاتی اہلیت میں مزید اضافہ کر سکیں اور اپنے تحقیقاتی کاموں کی کارکردگی معلوم ہو گی اور دوسری طرف پی ایچ۔ ڈی کے طلبا کو ایک اچھی خاصی رقم نقدی کی شکل میں بطور امداد فراہم ہو گی۔ تاکہ محکمے اور طلباء دونوں پوری دلچسپی لیں اور پی ایچ۔ ڈی کے پروگراموں کو ان منصوبوں کے تحت کامیاب بنایا جائے۔

(جاری ہے)

"ہم تم کو کچھ چیزوں کے ساتھ آزمائیں گے، ڈر اور بھوک سے مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصانات سے اور خوشخبری دو صبر کرنے والوں کو" (سورہ بقرہ ۱۵۵)

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے

اردو مخطوطات کے ہندو کاتب

الطاف حسین خاں شیروانی ▽

اردو زبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ حالانکہ ہندو اور مسلمان دونوں نے اس زبان کی پرورش و پرداخت میں حصہ لیا ہے۔ آج بھی سیکڑوں ایسے اردو و فارسی مخطوطات ہندوستان اور باہر کے ملکوں میں محفوظ ہیں جن کے کاتب ہندو ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو و فارسی مخطوطات کے کاتبوں کے سلسلے میں کوئی تحقیقی کام اب تک نہیں کیا گیا ہے لئے میں اس موقع پر مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے اردو مخطوطات کے ہندو کاتبوں کے تذکرے سے اس کام کا آغاز کرتا ہوں۔ اللہ تعالی میری مدد فرمائے۔

ذیل میں، مولانا آزاد لائبریری کے اردو مخطوطات کے ہندو کاتبوں کی فہرست پیش ہے۔

نمبر شمار	کاتب	تصنیف	مصنف
۱	بنسی دھر	رامائن	×
۲	بنسی دھر ماتھر	پوتھی رامائن	×
۳	برج لعل سنگھ ولد منور سنگھ	پدماوت	مولوی عبرت و غلام علی عشرت
۴	بھجی لعل	مثنوی	لالہ موتی لال
۵	بھجن لال کاستھ	سراپا معشوق	محمد تقی خاں عاشق
۶	پھوندی لال	مثنوی سحر البیان	میر حسن
۷	بیرن لال کاستھ	کلیات مومن	حکیم مومن خاں مومن
۸	جبتی لعل	ات سندر کرت سندر سنگار رہاسا	×

▽ ڈائرکٹر ڈاکٹر تاراچند میموریل ریسرچ سینٹر، ۳۰ بیتی - فتح پور - یو۔ پی

نمبر شمار	کاتب	تصنیف	مصنف
۹	چنی لعل	پوتھی رشک پریا	کیشو داس کبیر
۱۰	"	پوتھی روپ منجری	×
۱۱	"	ات رس منجری بھاکھا کرت	سوامی نند داس
۱۲	"	ات چترسئی لکھتی	×
۱۳	"	ست سیا بہاری	لال بہاری
۱۴	چین سنگھ	رامائن	صاحب رائے ولد نرائن داس
۱۵	خوشوقت رائے	سولہیہ تتھیہ	سہجو بائی
۱۶	خوشوقت رائے	گیان سرودے	سری چرنداس
۱۷	"	ہفت روز	سہجو بائی
۱۸	"	مثنوی گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم
۱۹	دھرم نرائن (مترجم بھی)	اصول کسب دولت	×
۲۰	دولت رام ولد بخشی رام	عشق نامہ عرف قصہ سیاہ پوش	خلیفہ شکوہ علی
۲۱	دونند لعل	پوتھی ست سی	بہاری لعل
۲۲	رام چندر	رسالہ سریع الفہم	رام چندر
۲۳	رادھا کشن (مترجم بھی)	رسالہ علم ہیئت	×
۲۴	زور آور سنگھ	مثنوی گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم
۲۵	سندر لعل ساکستھ	معنی آیت قرآن	×
۲۶	"	قصہ شاہ جمجمہ	فتح اللہ
۲۷	شیام سنگھ	لطائف ہندی	×
۲۸	شیو لعل سہائے ولد نند لعل	بھاگوتی مہاپران	×
۲۹	شیام سنگھ	پوتھی گن ساگر	طاہر
۳۰	شیو راج سنگھ	مثنوی سحر البیان	میر حسن
۳۱	سلامی لعل ولد شیو لعل ولد نند لعل	منتخب ادھیای مرکا بھاگوت	×
۳۲	مجانب رائے ولد مہتاب رائے	سور منجری یعنی انتخاب سور ساگر	×
۳۳	کنہیا لال	مہا پران دسم اسکند	×
۳۴	"	احوال نہر گنگا جی	×
۳۵	"	مناجات الزر	×
۳۶	"	نور و بستمل	بستمل

نمبر شمار	کاتب	تصنیف	مصنف
۳۷	کنہیالال	مسدس	تاباں
۳۸	〃	〃	دوست
۳۹	〃	〃	عیشی
۴۰	〃	〃	فدوی
۴۱	〃	جوگی نامہ	نظیر اکبرآبادی
۴۲	〃	مسافر نامہ	〃
۴۳	〃	مجموعہ متفرقات نظیر	〃
۴۴	〃	مسدس	مرزا محمد رضا برق
۴۵	〃	قصہ منصور	احمد
۴۶	〃	ترجیع بند	امانت
۴۷	〃	بارہ ماسہ	وہاب
۴۸	〃	مثنوی اعجاز عشق	میر تقی میر
۴۹	〃	مثنوی شعلہ عشق	〃
۵۰	کلیان رائے	حدائق البلاغہ	امام بخش صہبائی
۵۱	کیسری سنگھ	سپاہی زادہ	خوش دل کرتپوری
۵۲	گلاب سنگھ	ساقی نامہ	ولی
۵۳	گنیش رائے	رامائن	〃
۵۴	گھاسی رام	دیوان ولی دکھنی	〃
۵۵	لعل چند کایستھ	پوتھی گیتا جی	〃
۵۶	لچھمی نرائن	کلیات میر	میر تقی میر
۵۷	موتی لعل بن بہادر سنگھ	سری رام گیتا ولی	
۵۸	مولچند ولد منشی بہاری لال سہوانی	پوتھی رامائن	موہن داس
۵۹	نرائن سنگھ	پوتھی گیتا جی	〃
۶۰	نرائن سہائے	لطائف شاکری وسوال وجواب ملاد بیر	علاء الدین شاکر
۶۱	〃	قادر نامہ	〃
۶۲	〃	مثنوی دلسوز	مظہر
۶۳	ہرچرن داس	رامائن	صاحب رام کایستھ

حواشی

۱؎ کاتبوں کے سلسلے میں تحقیق کی ابتدا یوں ہوئی کہ میں علی گڑھ میں ایک مرتبہ ٹونک کی لائبریری کے مخطوطات کی فہرست (خزینۃ المخطوطات جلد دوم مرتبہ محمد عمران خاں) دیکھ رہا تھا۔ ایک مخطوطہ "المسوّی فی شرح الموطا" مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کاتب مینڈو خاں مکتوبہ ۱۸۷۵ء پر نظر پڑی نمبر- ۶۱)۔ مینڈو خاں (م ۱۹۱۹ء) کا وطن فتحپور ہے۔ کتاب فتح پور ہی میں لکھی گئی جو حسب فرمائش مولوی حافظ سید عبداللہ (ڈرامہ نویس) تھی۔ مینڈو خاں کا لکھا ایک اور مخطوطہ "ملفوظات حضرت خواجہ شاہ سلیمان تونسویؒ" مکتوبہ ۱۸۷۰ء میرے پاس تھا جو علی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح مینڈو خاں کاتب کے سلسلے میں اور دوسرے کاتبوں پر غور و فکر کی ابتدا ہوئی اور یوں تحقیق کا راستہ کھلا۔ انشاء اللہ کاتبوں پر کام کرتا رہوں گا۔

۲؎ پچھلے فارسی داں کائستھ اپنے نام خوش بخت رائے رکھا کرتے تھے۔ میرے علم میں ایک فارسی داں لالہ خوش بخت رائے اپنی برادری کی شادی کے موقع پر فارسی کی ایک تحریر پڑھا کرتے تھے جو انشاپردازی کا ایک نمونہ ہوتی تھی۔ یہ تحریر ہر ایک کائستھ کی شادی کے موقع پر پڑھی جاتی تھی۔

"کاش اگر ہندوستان کے لوگ عقل رکھتے ہوتے اور
جوش جہالت ان پر غالب نہ ہوتا تو بجائے اس نفاق
کے ان کے دلوں میں ایک عام ہمدردی اور محبت ہوتی
اور جو خراب نتیجہ اب ان کو اس نفاق کا ملتا ہے، بجائے
اس کے ان کو اتفاق کا نتیجہ ملتا جس کے سبب سے
ان کی آبرو جان و مال سب محفوظ و مصئون ہوتا۔"

سرسیدؒ

اردو بُک کلب

سلطانہ حیات▽

اردو صرف ایک زبان ہی نہیں ہے بلکہ اس کا اپنا ایک مکمل کلچر ہے جس کی اپنی انفرادیت ہے جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں۔ اس کے باوجود اردو کو اپنے وطن ہندوستان میں ہی موت و زیست کی لڑائی لڑنی پڑ رہی ہے۔ اگر اہلِ اردو نے اردو کی بقا کی اس جد و جہد میں اردو کا ساتھ نہیں دیا تو اردو خود اپنے وطن میں بے اثر ہو جائے گی اور اس کی یہاں کوئی قابلِ ذکر جگہ باقی نہیں رہے گی۔

اردو کی بقا کی جد و جہد کے بہت سے رُخ ہیں جن پر علیحدہ علیحدہ غور کرکے مثبت قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت صرف اردو کی کتابوں، اخبارات اور رسایل وغیرہ کی اشاعت اور خرید و فروخت کے مسئلے پر غور کر کے ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہم سب اردو والوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہونا چاہیے کہ اردو اخبارات، رسایل اور کتابوں کی خرید و فروخت کا حلقہ محدود ہوتا جا رہا ہے پہلے اردو کے ایڈیشن اگر ایک ہزار شائع ہوتے تھے تو اب اچھے سے اچھے مصنف کی کتابوں کا ایڈیشن پانچ سو سے بھی کم چھاپا جاتا ہے اور یہ کتابیں بھی اکثر رکھی رہ جاتی ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو اردو کتابوں کا حلقہ محدود سے محدود تر ہوتا چلا جائے گا۔ نتیجہ میں اچھے مصنف، ناشر اور ادیب بھی پیدا نہیں ہوں گے اور یہ اردو زبان کی تحریری موت ہوگی۔

اسی طرح اردو اخبارات کی حالت ہے۔ اخبارات اور رسایل وغیرہ کسی زبان کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اگر آج کی دنیا میں وہ چند ہزار چھپنے لگیں تو اس زبان کی ملک میں کیا وقعت رہ جائے گی؟ زندہ زبانوں کے ایک دو نہیں کئی کئی اخبارات روزانہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ خرید لیے جاتے ہیں۔ ان اخبارات کی رائے پر حکومتِ وقت بھی غور کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اردو اخبارات کی اشاعت اگر محدود ہو جاتی ہے تو اردو کی کوئی آواز نہیں رہے گی میں اس وقت اردو اخبارات کے معیار کا ذکر نہیں کر رہی ہوں وہ تو تیزی سے گر رہا ہے۔ موجودہ اردو اخبارات کو عموماً ماضی کی داستانوں اور نعروں سے بھر دیا جاتا ہے جو اس بات کا آئینہ ہے کہ اردو کلچر مایل بہ زوال ہے اور اس زوال کی خاص وجہ ایک یہ بھی ہے کہ اردو بازار محدود ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اردو کے حلقہ کو وسیع کرنے کے لیے باقاعدہ تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۸۳ء میں میں نے "اردو کلب" کی تجویز اخبارات میں پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اردو کا ہر ہمدرد اردو کلب کا ممبر بنے اور عہد کرے کہ وہ کم از کم ۵ روپے ماہانہ یا حسبِ استعداد نثر کی کتابیں، اخبارات یا رسایل

▽ ادارہ اردو کلب، بی ۱۲ ریور بینک کالونی، لکھنؤ۔

وغیرہ ہر ماہ جس جگہ اور جہاں سے چاہے، خریدیے اور عہد نامہ بھر کر ہمیں بھیج دے اور اس کے عوض ہم ان کی فرمائش کے بموجب کتابوں کی فہرست بھیجیں گے۔ اس تجویز کا عوام نیز ناشروں اور کتب فروشوں نے بہت جوش سے خیر مقدم کیا تھا۔ اور چاروں طرف سے مجھے کتابوں کے بنڈل بھی موصول ہونے لگے تھے۔

چند وجوہ کی بنا پر یہ تحریک انجمن کی طرف سے نہیں چلائی جا سکتی تھی کیونکہ انجمن کو سرکار جو رقم دیتی تھی (اب تو ڈھائی سال سے گرانٹ بند ہے) اس میں سے ایک پیسہ بھی اس تحریک پر خرچ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری الجھنیں بھی تھیں جس کی وجہ سے اس تحریک کی ذمّہ داری خود مجھے ہی اٹھانا پڑی اور کام ایک دو ماہ میں اتنا بڑھ گیا کہ کم از کم ایک یا دو ہمہ وقت کارکنوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی تو میں نے اردو کلب نوجوان طبقہ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ اردو کلب مع عہد ناموں اور کتابوں کے دہلی چلا گیا اور ختم ہو گیا۔ اب بھی بھولے بھٹکے لوگ دریافت کرتے رہتے ہیں کہ وہ اردو کلب میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ وغیرہ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک اردو کتابوں اور جریدوں کی خریداری وسیع پیمانہ پر نہیں ہوگی تو اردو اخبارات کا معیار بھی بلند نہیں ہوگا اور نہ اس میں زمانے کے ساتھ چلنے کی اہلیت پیدا ہوگی وغیرہ۔ اس لیے اردو کی بقا اور رفتار آمد بقا کے لیے ضروری ہے کہ اردو کتابوں اور اخباروں کی خریداری وسیع پیمانے پر کی جائے۔ دراصل اس کے لیے منظم تنظیم کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک قابل تقلید مثال پیش کرتی ہوں۔

پنجابی ایک محدود حلقے میں بولی اور لکھی جاتی ہے اور جو پنجابی گورمکھی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اس کا حلقہ نسبتاً کچھ اور بھی چھوٹا ہے لیکن جب پنجابی صوبے کی مانگ کا خیال پیدا ہوا تو اس کی نشر و اشاعت وغیرہ پر غور کیا گیا اور سردار صاحبان کی ایک دانش ور جماعت نے طے کیا کہ وہ ہر ماہ کم از کم ۲۵ روپے کی گورمکھی میں لکھی کتابیں خریدیں گے۔ جن لوگوں نے اس کا عہد کیا تھا وہ اس کو پورا بھی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ سنا ہے کہ عام طور پر گورمکھی کی کتابوں کے پانچ پانچ ہزار کے ایڈیشن نکل رہے ہیں جو عموماً سال کے اندر اندر ختم ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس اردو کی کتابوں کی حالت یہ ہے کہ اس کی اچھی سے اچھی کتابیں شائع ہوتی ہیں مگر مصنفین کے پاس پڑی رہتی ہیں۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اردو بک کلب کی تجویز دوبارہ پیش کی جارہی ہے اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ:

۱۔ اردو کتابوں، اخبارات اور رسائل کی خریداری بڑھائی جائے تاکہ اردو میں معیاری ادب تخلیق ہوتا رہے اور اس میں زمانے کے ساتھ چلنے کی اہلیت پیدا ہوتی رہے۔

۲۔ اردو کتابوں کی پبلسٹی کی جائے تاکہ سب کو معلوم ہو کہ اردو میں کتنی نایاب کتابیں شائع ہو چکی ہیں یا چھپ رہی ہیں۔

۳۔ اردو کتابوں اور رسائل وغیرہ کو عوام تک پہنچایا جائے۔

۴۔ اس تحریک کو منظم طریقے پر چلایا جائے یعنی اردو سے شغف رکھنے والے ہر فرد کو بغیر قید مذہب و ملت اردو کلب کا ممبر بنایا جائے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنی آمدنی کا صرف ۱۔فی صد حصّہ، یعنی اگر ایک شخص کی ایک ہزار ماہانہ آمدنی ہوگی تو وہ کم از کم دس روپے ماہانہ اردو کتابوں اور رسائل وغیرہ خریدنے پر صرف کرے۔ ظاہر ہے کہ دس روپے میں آج کل کوئی قابل ذکر کتاب نہیں خریدی جا سکتی۔ تو وہ اگر ساٹھ روپے کی کتابیں خریدے تو اس طرح اس نے چھ ماہ کی رقم اردو کی خدمت کے لیے خرچ کر دی۔

جن لوگوں کی آمدنی ایک ہزار سے زیادہ ہے وہ اسی نسبت سے اردو کی کتابیں وغیرہ یہ کہہ کر خریدیں کہ ان کی یہ خریداری اردو کو آب حیات پلا رہی ہے اور

یہ عہد کریں کہ وہ ہر ماہ اپنے وعدے کو پورا کریں گے اور مندرجہ ذیل عہد نامہ لکھ کر بھیج دیں۔ نیز دیگر خواتین و حضرات کو بھی ممبر بنائیں۔

عہد نامہ

مرکزی دفتر میں ممبر اردو کلب کا نمبر۔۔۔

" میں عہد کرتا ہوں / کرتی ہوں کہ ہر ماہ کم از کم اپنی کل آمدنی کا ایک فی صد حصہ یا اس سے زیادہ مبلغ ..... روپے ماہانہ اردو کتابیں یا اخبارات وغیرہ خریدنے میں خرچ کروں گا / کروں گی۔ کیونکہ میں اردو زبان کی بقا کو انتہائی اہم اور ضروری سمجھتا / سمجھتی ہوں۔ مجھے اردو کلب کا ممبر بنائیے۔ نیز اردو تحریک سے باخبر رکھیے۔

زحمت کا شکریہ"

یہ عہد نامہ پُر کروانے والے کا نام

دستخط و نام ممبر ______ مکمل پتہ ______

مکمل پتہ ______ ولدیت ______

تاریخ ______

یہ عہد نامہ کارڈ پر بھی لکھ کر بھیجا جا سکتا ہے۔

نوٹ: یہ عہد نامہ تو اردو کے بہت سے بہی خواہ بھر دیں گے اور شاید جوش میں ایک دو ماہ عمل بھی کر لیں۔ اس کے بعد کام کی زیادتی شروع ہو جائے گی، بھولنے لگیں گے۔ اس کے بعد یاد بھی نہیں رہے گا اور اگر خدانہ کرے اردو ختم ہو گئی تو آرام سے کرسی پر بیٹھ کر فرمائیں گے " دیکھیے ختم کر دیا نہ اردو کو"!

میری ان سے بس اتنی درخواست ہے کہ جب وہ حکومت اور اردو کی بقا کی جدّوجہد میں شریک انجمنوں اور جماعتوں کو برا بھلا کہیں تو یہ بھی یاد کر لیں کہ خود انھوں نے اردو کی مثبت خدمت اپنی زندگی میں کیا کی تھی؟

اردو کارکن

اردو اور اس سے ملحق کلچر کو اگر باقی رکھنا ہے تو اردو کارکنوں کی ایک جماعت بنائی جائے جو گھر گھر جا کر عوام کو بتلائے کہ:

۱۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ بچے کی ترقی اور ذہنی نشوو نما کے لیے مادری زبان کو نہ صرف جاننا بلکہ اس میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی اہلیت پیدا ہونا ضروری ہے، تب ہی وہ دوسری زبانوں پر بھی عبور حاصل کر سکتا ہے۔ نیز یہ کہ لکھنا پڑھنا آنے کے بعد ہی دوسرے علوم سیکھے جا سکتے ہیں۔

۲۔ سائنس کا دور تیزی سے آرہا ہے اس کو سمجھنے اور سیکھنے کے لیے انگریزی ضروری ہے۔ اور انگریزی کا تلفظ بغیر اردو پڑھے کسی شکل میں بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا ہے۔ فزکس کو پھِکس۔ جغرافیہ کو جگ راپھیا۔ اسی طرح سیکڑوں الفاظ کی آواز بدل جائے گی جو آگے کی ترقی میں مانع ہو گی۔

۳۔ اردو پڑھنا اب آسان ہو گیا ہے۔ اگر ممکن ہو تو کوئی آسان طریقے پر اردو پڑھانے کا قاعدہ اپنے ساتھ رکھیں کیونکہ بہت لوگ اردو پڑھنا چاہتے ہیں مگر اردو پڑھنے اور لکھنے کو مشکل سمجھتے ہیں۔ ان کا ڈر بھی دور کرنا ہے۔ ساتھ ساتھ والدین کو بھی یہ بتانا ہے کہ بچّہ کو اگر دیگر اسکولی مضامین کے ساتھ اردو کا ایک لفظ روز بتایا اور لکھایا جائے گا تو وہ آسانی سے اردو سیکھ لے گا مثلاً قاعدہ لالا' تالا یا دس دن میں اردو ہے۔ اس میں الف۔ ب۔ ت پڑھانی نہیں پڑتی۔ پہلے دن ایک لفظ لا بغیر لام اور الف اور ہجے بتائے ایک جزو کی طرح پڑھایا جاتا ہے صرف لا فعل ہے اور لالا اسم بن جاتا ہے۔ اس طرح طالب علم پہلے ہی دن بامعنی جملہ یعنی

لالا لا پڑھ اور لکھ سکتا ہے۔ اگلا سبق تالا ہے
لا پڑھایا جا چکا ہے۔ تالا کی تصویر ہے۔ طالب علم
بغیر استاد کی مدد کے تالا پڑھ سکتا ہے۔ اسی
طرح پوری کتاب ہے۔ ۴۶ ویں دن وہ سارے
جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا جیسی معیاری
اردو پڑھ لے گا۔

یہ فرض نہیں ہے کہ یہی قاعدہ پڑھایا جائے۔ یہ تو صرف مثال دی گئی ہے جو بھی جس کو آسان طریقہ معلوم ہو، وہی قاعدہ ساتھ میں رکھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اردو کارکنوں کو اکثر گھروں میں اردو پڑھانے کے ٹیوشن بھی مل جائیں یا پورے محلے میں اردو پڑھانے کی کلاس کھولنے کا موقع مل جائے جو کہ آمدنی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

کتابوں پر کمیشن

کتابیں اور مختلف جریدے چھاپنے والے یا ناشر عموماً ۲۵ فی صد سے لے کر ۶۰ فی صد تک کمیشن کتب فروش کو دیتے ہیں اور کتب فروش زیادہ کتابیں خریدنے پر ۱۰ فی صد سے لے کر ۲۵ فی صد اور کبھی زیادہ تعداد میں کتابیں خریدنے پر اس سے بھی زیادہ کمیشن دیتے ہیں۔

اردو کارکن اپنے شہر یا قصبے وغیرہ کے ناشروں یا کتب فروشوں سے اپنا کمیشن طے کر لیں۔ نیز یہ بھی یاد رکھیں کہ عموماً ایک کتاب خریدنے پر کوئی کمیشن نہیں دیا جاتا ہے مگر اردو کارکن ہمارا تصدیق نامہ لے کر ان کے پاس جائیں نیز ان کو اس پوری تحریک سے وابستہ کریں۔ چوں کہ اس میں ان کا بھی فائدہ ہے اور ان کی خریداری کئی سو گنا بڑھ سکتی ہے۔ اس لیے توقع ہے کہ وہ ایک کتاب پر بھی اردو کارکنوں کو کمیشن دے دیں گے۔

دراصل یہ تحریک صرف اردو کارکنوں کے خلوص اور محبت پر مبنی ہے۔ اگر ہمیں اپنی زبان کے تئیں محبت ہے تو اردو کلب کی تحریک کو ہندوستان کے طول و عرض میں چلایا جا سکتا ہے۔

ممبران کلب اپنے کوٹے کی کتابیں یا رسائل وغیرہ کو خرید نا ضروری سمجھ کر کوئی بھی اردو کتاب جریدہ وغیرہ خواہ ابتدا میں وہ اُن کو پسند آئے یا نہ آئے مگر خرید لیں اور آئندہ مہینوں کے لیے کتابوں کا آرڈر دے دیں۔ مطلب یہ ہے کہ مطلوبہ کتابوں کے انتظار میں ایک ماہ گزرنے نہ دیں۔ ناپسندیدہ کتاب خرید لیں چاہے اس کو پھاڑ کر پھینک دیں بلکہ ہر ماہ کتابوں کی خریداری اپنا اخلاقی فرض سمجھیں۔ تاکہ اردو کتابوں کے بازار میں جو جمود آ گیا ہے وہ ٹوٹ جائے۔ ذرا غور فرمائیے کہ دیگر زبانوں خصوصاً ہندی اور انگریزی کے مصنفین کو تو رہنے کے لیے بنگلے تک مل جاتے ہیں اور اردو کے لکھنے والوں کو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی ہے۔

اس صورتِ حال کو اس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے کہ ہم سب مل کر پورے ہندوستان میں کم از کم ۵۰ لاکھ اردو کلب کے بنیادی ممبر بنا لیں جو کہ صرف دس روپے (۱۰ روپیے) کی اردو کتابیں یا رسالے وغیرہ ضرور خرید لیں۔ تو اردو کسی حکومت کی محتاج نہیں رہے گی۔ اس کی نفاست اور شیرینی سب کا دل موہ لے گی۔ اور تعصب کے بادل خود بخود چھٹ جائیں گے بشرطیکہ بنیادی ممبر سازی میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو شامل کیا گیا ہو۔

کام کیسے شروع کیا جائے۔

اگر آپ اردو اور اردو سے متعلق کلچر کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو خود یہ کام کیجیے اور کچھ بیکار خواتین و حضرات کو ساتھ لے کر کسی بھی علم کا ذوق رکھنے والے کے گھر جا کر دریافت کیجیے کہ اس گھر میں کتنے اخبارات، رسالے اور کتابیں ایک ماہ میں خریدی جاتی ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہو کر حیرت ہو جائے گی کہ اخبارات رسالے وغیرہ بڑی تعداد میں خریدے جاتے ہیں مگر اس میں اردو کے صرف ایک دو ہی ہوتے ہیں اور زیادہ انگریزی اور تو شیرے ہنس کر بہت او نچے سے بتا دیں گے کہ ان کے پاس

اردو کا کوئی اخبار وغیرہ نہیں آتا ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ ان کو اردو کے تئیں ایک مبہم سا لگاؤ ضرور باقی ہے۔ اسی بنا پر آپ ان سے گفتگو فرمایئے اور اردو عہد نامے پر دستخط لیجیے اس طرح وہ اردو کتابیں خریدنے کے پابند تو ہو ہی جائیں گے مگر اس پر عمل درآمد کرانے میں بھی ان کی مدد کرنا پڑے گی اور وہ اس طرح کہ ایک صاحبہ یا صاحب جو اس علاقے میں کام کرنے کا وعدہ کریں وہ بطور یادداشت اپنی ایک کاپی بنالیں اور اس میں خانے وغیرہ اس طرح بنائے جاسکتے ہیں۔

نمبر شمار: ______ تاریخ: ______

ممبر کا نام و پتہ: ______

اردو کے لیے رقم کا وعدہ: ______

کتابیں خریدیں: ______

باقی: ______

تاکہ اس نقشے کی مدد سے آئندہ ماہ اردو کتابیں ان کے ہاتھ فروخت کی جائیں۔

اس طرح پورے محلے میں کم از کم دس گھروں کو ممبر بنالیجیے۔ ایک گھر میں جس قدر روپیہ کمانے والے ہوں ان سب کو ممبر بنانا چاہیے۔ چاہے وہ ۵ روپے یا اس سے بھی کم ماہانہ خرچ کرنے کے لیے ہی کیوں نہ تیار ہوں۔

دوسرا قدم یہ ہوگا کہ ان کو کتابیں مہیا کروائی جائیں۔ وہ اگر کچھ کتابوں کا آرڈر دیں تو وہ اگلے ماہ تک مہیا کرنے کا وعدہ کیجیے اور جو کتابیں وہاں موجود ہوں ان میں ہی سے خریداری کرائی جائے تو اچھا ہے۔

بعض گھروں میں یہ بھی کہا جائے گا کہ ان کو اردو کتابیں پڑھنے کا وقت نہیں ہے تو ان سے کہیے کہ اپنے کسی گاؤں، قصبہ یا خود اپنے محلے کے کسی پرائمری اسکول کی اس طرح مدد کریں کہ ان کو بچوں کی کتابیں خرید کر دے دیں۔ ان کا عہد پورا ہوگا اور بچوں کو کتابیں پڑھنے کے لیے مل جائیں گی۔ بچے ہی نہیں علم کا ذوق رکھنے والے بعض بڑے بھی کتابوں کے لیے ترستے ہیں ان کی مدد ہو جائے گی۔ دراصل ان کا اس طرح کتابیں خریدنا اور مکتبوں وغیرہ کو دینا ثواب جاریہ بن جائے گا۔ بچوں کے لیے کتابیں بہت سے ادارے شائع کر رہے ہیں مگر مکتبہ جامعہ لمٹڈ دہلی کی کتابیں صاف ستھری اور معیاری ہوتی ہیں۔

اگر کسی صاحب کو کسی مکتب کا نام نہ معلوم ہو تو مجھ سے دریافت کرلیں۔ کوشش کروں گی کہ ان کے گھر کے آس پاس ہی کسی مکتب کا نام و پتہ بتادیا جائے۔ تاکہ جب بھی موقع ملے وہ دیکھ لیں کہ ان کی کتابوں کو کس طرح استعمال کیا جارہا ہے۔

اگر ایک بار محنت کرکے ایک صاحبہ یا صاحب اردو کلب کے سَو ممبر بنالیتے ہیں جو کم از کم دس روپے کی کتابیں خریدنے کا عہد کرتے ہیں تو اردو کتابیں تو مبلغ ایک ہزار کی فروخت ہوں گی اور ان کو ہر ماہ بطور کمیشن کم و بیش سَو روپے اس محنت کا معاوضہ مل جائے گا۔

جو خواتین و حضرات اردو کارکن بننا چاہتے ہیں وہ ہمیں اپنے ارادے سے مطلع کریں ان کو اردو کارکن نامزد کردیا جائے گا۔ اس کارڈ کو لے کر وہ کسی بھی اردو کی کتابیں چھاپنے والے کے پاس جاکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان کو ایک کتاب کی خریداری پر بھی

"جو رسومات کہ بہ سبب حالت ترقی یا تنزل کسی قوم کے اندر پیدا ہوتی ہیں وہ رسمیں ٹھیک ٹھیک اس قوم کی ترقی اور تنزل یا عزت اور ذلت کی نشانی ہوتی ہیں"

سر سید احمد

کمیشن دیں۔ ہم سے اردو کارکن کا سرٹیفکیٹ لینے سے فائدہ یہ ہوگا کہ ہم مختلف ناشروں کی نشان دہی کرتے رہیں گے۔ نیز یہ کہ تنظیم منظم طریقے پر چل سکے گی۔ ابھی اس تنظیم میں نئے نئے اور گوشوں کو بھی اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ توقع ہے کہ ناشر حضرات ہمیں اپنی فہرست کتب بھیجنے کی زحمت کریں گے۔

جن لوگوں نے اپنی ایک یا دو کتابیں شائع کی ہیں وہ کتاب کا نام، اس کے صفحات، موضوع اور قیمت نیز یہ کہ کس قدر کمیشن دیں گے، لکھ دیں۔ تاکہ فہرستِ کتب میں ان کی کتاب کو شامل کر لیا جائے اور جو چاہے ان سے براہ راست منگا لے۔

براہ کرم کوئی بھی صاحب یا صاحبہ مجھے کتاب بھیجنے کی زحمت نہ کریں۔

آخر میں میری اردو اور وطن نواز ہر فرد سے درخواست ہے کہ وہ خود بھی اردو کلب کے ممبر بنیں اور دوسروں کو بھی ممبر بنائیں۔ آیئے عملی قدم اٹھا کر اردو کو بچائیے۔ یہ ہماری مادری زبان ہے اور وطن کی بیش بہا دولت ہے۔

"مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کہلانے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اسی لیے میری خواہش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم و فضل اور ہنر و کمال کے اعلیٰ درجے کی عزت کو پہنچیں"

سرسید احمد

مولانا ابوالکلام آزاد

رئیس احمد جعفری کی نظر میں

ابوعلی ▽

صحافتی حلقہ کا شاید ہی کوئی شخص ہو، جو مولانا رئیس احمد جعفری سے واقف نہ ہو، وہ اپنے دور کے بہت اچھے صحافی بھی تھے اور بہت زود نویس مصنف و مترجم بھی ۔ ان کی صحافتی سرگرمیوں کا مرکز بمبئی تھا اور وہ ایک صحافی ہی کی حیثیت سے نہ صرف بمبئی کے سیاسی حلقے میں روشناس تھے بلکہ ہر شعبۂ زندگی کے نمایاں اور ممتاز افراد سے ان کے وسیع تعلقات بھی تھے اور وہ ان کو اپنی تقریبوں میں خاص طور سے مدعو کرتے تھے لیکن ان کا زیادہ ربط وضبط وہاں کے سیاسی آدمیوں سے تھا اور وہ ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ آزادی کے بعد جب بمبئی کے حالات ان کے حق میں ناساز گار ہو گئے اور ان کا وہاں رہنا دو بھر ہو گیا تو وہ پاکستان منتقل ہو گئے اور وہاں بھی انھوں نے اپنے سحر حاصل قلم کی بدولت وہی اہمیت، مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی جو اُن کو بمبئی میں حاصل تھی اور مختلف موضوع پر بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔

وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دوران تعلیم ہی میں علی برادران اور تحریک خلافت سے متاثر ہو گئے تھے اور اسی زمانے میں اپنی زندگی کی پہلی تصنیف "سیرت محمد علی" قلم بند کی ۔ طالب علمی کی یہ کاوش محمد علی پر استناد کا درجہ رکھتی ہے اور محمد علی کا مطالعہ اس کے بغیر اب بھی جب کہ محمد علی پر بہت ساری کتابیں انگریزی اور اردو میں لکھی جا چکی ہیں، جن میں ایک اہم کتاب مولانا محمد علی کے سب سے بڑے عقیدت مند اور پرستار مولانا عبدالماجد دریابادی کی دو جلدوں میں 'محمد علی۔ ذاتی ڈائری' بھی ہے، مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ رئیس احمد جعفری کی طالب علمی کے زمانے کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اس کے بعد تو مختلف موضوع پر سیکڑوں کتابوں کے مصنف ہو گئے۔

رئیس احمد جعفری تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آل انڈیا خلافت کمیٹی کے آرگن روزنامہ 'خلافت' کے ایڈیٹر ہو گئے جو مولانا شوکت علی کے اہتمام میں بمبئی سے نکلتا تھا۔ پھر ۱۹۴۰ء میں خود اپنا اخبار 'انقلاب' جاری کیا جو بہت مقبول ہوا۔ ان دونوں اخباروں کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا بمبئی کی پبلک اور سیاسی زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہو گیا تھا اور بمبئی کے ہر عقیدے و مسلک کے اکابر سے اُن کو آئے دن ملاقات کا اتفاق ہوتا تھا، جن میں ایک آزادی کے بعد کانگریسی حکومت کے وزیر اعلیٰ مرارجی ڈیسائی بھی تھے، جن سے ان کی بڑی بے تکلفانہ ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اسی

▽ معرفت کالج اسٹور ـ چوک ـ اعظم گڑھ ـ یو۔پی

طرح کی ایک ملاقات میں ایک مرتبہ مذاقاً یا سنجیدگی سے کبھی انھوں نے جعفری صاحب سے کہہ دیا کہ بھائی تمہاری اس وقت کی جو سرگرمیاں ہیں ان کے لحاظ سے تمہاری اصلی جگہ ہندوستان نہیں، پاکستان ہے اور جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے بوریا بستر باندھ کر پاکستان روانہ ہو جاؤ۔ ان کی یہ بات جعفری صاحب کے دل میں تیر کی طرح لگ گئی اور اس کو انھوں نے بہت ہی بُرا مانا۔ وہ مرارجی کے کہنے سے یا خود ان کے لیے بمبئی میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ انھوں نے بمبئی کو جہاں ان کی صحافتی نشوونما ہوئی تھی اور ہر طرح کی علمی و ذہنی ترقی کی تھی اور وہاں کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی کے ایک ضروری جزو ہو گئے تھے جن کے بغیر پوری مجلس سونی ہو جاتی تھی، کو خیرباد کہہ کر کراچی چلے گئے، اور وہیں رہ گئے اور وہاں کے باقاعدہ شہری ہو گئے۔ وہاں بھی ان کا محبوب مشغلہ تصنیف و تالیف اور اخبار نویسی تھا۔ وہاں پہنچ کر بھی انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے دو تو شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک تو 'بہادر شاہ کا عہد' اور دوسری 'واجد علی شاہ کا عہد' یہ دونوں کتابیں مسلمانوں کے عہد زوال کے ان دونوں حکمرانوں پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد ان کی خودنوشت سوانح عمری جس کو ہمایوں کبیر صاحب نے "انڈیا ونس فریڈم" کے نام سے انگریزی میں لکھا تھا، شائع ہوئی تو رئیس احمد جعفری کو اس کے بعض حصوں سے اختلاف ہو گیا۔ انھوں نے اس کے ترجمے کے ساتھ اس پر بہت ہی تفصیلی اور ناقدانہ تبصرہ بھی لکھا اور اس ترجمے و تبصرے کو کتابی شکل میں شائع کیا تو اس کو انھوں نے مرارجی ڈیسائی کے نام معنون کیا جن کے کہنے سے انھوں نے بمبئی چھوڑا تھا۔ اس کتاب کے جو مباحث اور بیانات ان کو محل نظر آئے ان کو اپنی واقفیت کی روشنی میں صحیح شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کا اندازِ بیان اتنا دلچسپ، دل آویز اور مؤثر ہے کہ ختم کیے بغیر سیری نہیں ہوتی۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا تجزیہ بھی بہت عمدہ طریقے سے کیا ہے۔

ان میں جو غیر معمولی انانیت تھی، خودداری تھی، خوداعتمادی تھی اور آگاہی تھی، خودشناسی تھی، بصیرت تھی، تدبر تھا، معاملہ فہمی تھی، اپنے موقف پر قائم رہنے کا جو عزم تھا، مصائب پر صبر کا جو مادہ تھا۔ ان میں جو تمکنت اور جاہ و جلال تھا، حالات [illegible] کی جو انرجی تھی ان سب اوصاف اور محامد کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے 'کوئٹ انڈیا' "ہندوستان چھوڑ دو" کے ریزولیشن پاس ہو جانے کے بعد ان کو بمبئی میں گرفتار کرنے کے لیے جب پولس آئی ہے اور میزبان نے اس کی اطلاع دی ہے تو ان کے سکون کے عالم کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

ذرا غور تو کیجیے کہ ایک نہایت نازک زمانے میں جب انگریز زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہیں، بغاوت کے الزام میں بمبئی کا ڈپٹی کمشنر وارنٹ گرفتاری لیے آپ کے دردولت پر کھڑا ہے اور اذنِ باریابی طلب کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"اس سے کہہ دو، مجھے تیار ہونے میں ذرا دیر لگے گی"

پھر نہایت اہتمام سے چائے پیتے ہیں، بعض خطوط مکمل کرتے ہیں، غسل کرتے ہیں، کپڑے بدلتے ہیں، پھر باہزاراں جاہ و تمکین برآمد ہوتے ہیں۔

اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا

اور ڈپٹی کمشنر سے جو اب تک کھڑا تھا اور مولانا کے میزبان سے وقت گزاری کے لیے باتیں کر رہا تھا، فرماتے ہیں:

"میں تیار ہوں"

مولانا کا انا صرف یہ کہ ظاہر تھا، بلکہ خود سر تھا، خود بین تھا مغرور تھا لیکن اتنا ہی دلچسپ، دلکش دل آویز کہ

؎ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

جب تک وہ زندہ رہے کسی نے ان کی انا کو چیلنج نہیں کیا۔ گاندھی جی ہوں، جواہر لال نہرو ہوں یا سردار پٹیل ہوں یا اور دوسرے بڑے بڑے لیڈر ان سے ملنے کے لیے ان کی اجازت کے منتظر رہا کرتے تھے اور ان کے عظمت کدۂ امامت میں کسی کو بھی مخل ہونے

کی جات نہیں ہوئی۔

اس اعتراف میں بھی تبصرہ نگار نے بخل نہیں کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ملی زندگی اور سیاسی بیداری میں جن تین بزرگوں کا حصہ ہے ان میں ایک ابوالکلام آزاد بھی ہیں۔ الہلال کی آواز ایک جادو تھی جس سے قبروں کے مردے تک زندہ ہوگئے۔

مولانا نے اپنی خودی/انا کو کانگریس کے کابینہ میں بھی جا کر برقرار رکھا اور کسی موقع پر بھی اسے ٹھیس پہنچنے نہیں دی حالانکہ کابینہ کے بعض افراد کا انا بھی کچھ کم نہ تھا۔ خصوصاً پنڈت جواہر لال اور ولبھ بھائی پٹیل کا، موخر الذکر تو اسی انا کی وجہ سے کانگریس کے مرد آہن سمجھے جاتے تھے، جس بات کا فیصلہ کر لیتے تھے، دنیا کی کوئی طاقت اس کے بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ وہ گاندھی جی کے دل و دماغ تک پر چھا گئے تھے اور جو چاہتے تھے ان سے کرا لیتے تھے۔ سی۔ پی کے شریف، بمبئی کے نریمان، بنگال کے سبھاش چندر بوس جو دو بار کانگریس کے صدر تھے اور جواہر لال کے بعد کانگریس میں سب سے زیادہ مقبول اور ہر دل عزیز تھے، ان کی انا کے شکار ہوگئے، لیکن مولانا کے سامنے ان کی انا نے بھی سپر ڈال دی۔ کانگریس کے بعض حلقوں میں مولانا کو مغل اعظم کہا جاتا تھا اور بلا شبہ ان کا فطری رعب و داب، تدبر و سیاست، شان و شکوہ اسی کا غماز بھی تھا۔ ان کی تیزی و طراری و چرب زبانی کے سامنے سب دم بخود رہتے تھے۔ کسی کو مجال گفتگو نہیں ہوتی تھی۔

اس کا مشاہدہ میں نے ۱۹۲۸ء میں کیا تھا۔ تھیٹر روڈ کلکتہ کی جس وسیع و عریض اور لق و دق عمارت میں صدر کانگریس پنڈت موتی لال نہرو اپنے بہت سے نہرو رپورٹ کے مسلم حامیوں کے ساتھ جو مختلف صوبوں سے تعلق رکھتے تھے ٹھہرے ہوئے تھے کبھی کبھی ایک میزبان کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان معزز مہمانوں سے ملنے آیا کرتے تھے۔ وہ جب آتے تھے تو اس عمارت کے تمام مکین شوق زیارت اور آرزوے ملاقات میں اپنے اپنے کمروں سے نکل پڑتے تھے۔ اسی عمارت میں مولانا مسعود علی ندوی منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ بھی پنڈت جی کے ایک معزز دوست کی حیثیت سے قیام فرما تھے۔ مولانا نے ان کو دیکھا تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور اپنے رفیق راہ سے یہ کہہ کر مولانا مسعود علی ندوی کا تعارف کرایا کہ یہی ہیں جنہوں نے کنانور میں دار المصنفین قایم ہے۔ یہ ادارہ علم و فن اور اردو زبان و ادب کی خدمت کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں کانگریس کی بھی مدد کر رہا ہے کنانور کے کہنے سے حاضر الوقت تمام اشخاص کا ذہن اعظم گڑھ کی طرف منتقل ہوگیا جس کے دو بڑے قصبات یعنی مئو اور مبارک پور علی الترتیب سوتی و ریشمی کپڑوں کی صنعت کے بہت بڑے مرکز ہیں۔ گویا کہ لنکاشائر اور مانچسٹر ہیں۔

ندوی برادری میں یوں تو ایک سے ایک بڑھ کر مصنف، ادیب صحافی، مترجم اور شاعر ہوئے اور انھوں نے علمی دنیا میں خوب شہرت بھی حاصل کی اور بڑے بڑے علمی و تحقیقی کارنامے بھی انجام دیے لیکن جعفری صاحب ایسا قادر القلم اور زود نویس مصنف اور مضمون نگار شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ اس حیثیت سے اپنی پوری برادری میں منفرد تھے اور اس کو ان کی ذات پر ناز بھی تھا۔ پاکستان کے زمانۂ قیام میں اکتوبر ۶۹ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال سے نہ صرف ندوی برادری بلکہ ہندوستان اور پاکستان کا پورا ادبی حلقہ ایک بہت بڑے مصنف اور بے بہا مترجم سے محروم ہوگیا اللہ تعالیٰ ان کی علمی و ادبی خدمات کے طفیل میں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے تمام پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے۔

تصحیح

جناب محمد مظاہر عالم اعظمی کے مقالے میں کتابت کی غلطی کی بنا پر "تربیت" کی جگہ "قومیت" شائع ہوگیا ہے۔ ان کے مقالے کے عنوان کو اس طرح پڑھا جائے۔

"طب یونانی میں جدید ذرائع تشخیص کی شمولیت و تربیت"

ادارہ

اسکولوں اور کالجوں میں رہنمائی کی ضرورت

امان اللہ خاں شروانی ▽

اسکولوں اور کالجوں میں "رہنمائی" کا مطلب کسی طالب علم کی نفسیاتی الجھنوں میں اس کی مدد کرنا، اس کو کسی با مقصد کام کرنے کے لیے تقویت پہنچانا، اس کو زندگی میں ذریعۂ معاش اور پیشہ اختیار کرنے میں مدد کرنا یا اس پیشے کے لیے مزید تعلیم حاصل کرنے کے واسطے معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ہر طالب علم انفرادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور اس کے نفسیاتی سماجی، جذباتی اور معاشی مسایل دوسروں سے الگ ہو سکتے ہیں۔ یہ مسایل تعلیم کے سلسلے میں بھی ہو سکتے ہیں اور آئندہ زندگی میں ذریعۂ معاش اور پیشہ اختیار کرنے کے سلسلے میں بھی۔ کچھ مسایل بالکل ذاتی اور نجی بھی ہو سکتے ہیں جنھیں ہم نفسیاتی یا جذباتی مسایل بھی کہتے ہیں۔ درس و تدریس کے ساتھ اساتذہ کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے ان مسایل کو سلجھانے میں مدد کریں۔ آج کل یہ مسایل اتنے پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے سلجھانے کے لیے وقت بھی درکار ہوتا ہے اور معلومات بھی رکھنی پڑتی ہیں۔ اچھے اچھے تعلیمی اداروں میں اس کام کے لیے علیحدہ سے ایک شعبہ ہوتا ہے اور اسے 'شعبۂ رہنمائی' Guidance Bureau کہتے ہیں۔ ایک ماہر جو ان کاموں کے لیے تربیت یافتہ ہوتا ہے، اس شعبے کا انچارج ہوتا ہے۔ اس کے پاس رہنمائی کی تربیت کے علاوہ معلومات کے لیے کتابیں، میگزین اور اخبار بھی ہوتے ہیں۔ اس کا رابطہ صنعت و حرفت، حکومت کے شعبۂ روزگار اور دوسری اعلیٰ پیشہ ورانہ درس گاہوں سے ہوتا ہے۔

عام اور روایتی اداروں میں اس قسم کا کوئی شعبہ نہیں ہوتا اور ایک پرنسپل یا اساتذہ کے فرائض میں 'رہنمائی' یا 'مشورہ' جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اداروں میں تعلیم کا تصور ہی بہت محدود ہوتا ہے۔ درس و تدریس کا کام اور امتحان لے کر طلبا کو پاس فیل کر دینا ہی تعلیمی فرائض سمجھے جاتے ہیں لیکن تعلیم کے جدید نظریات کے مطابق تعلیم دیے جانے کے ساتھ طلبا کی رہنمائی اور ان کی زندگی کے مختلف مسایل سلجھانے میں مدد کرنا اور انھیں صحیح اور ماہرانہ مشورہ دینا بھی تعلیم میں شامل ہے۔ اس لیے 'رہنمائی اور مشورہ' اب تعلیم کا لازمی جزو بن گیا ہے۔

رہنمائی اور مشورہ تین قسم کا ہوتا ہے۔

۱۔ پیشہ ورانہ رہنمائی۔
۲۔ تعلیمی رہنمائی اور
۳۔ ذاتی رہنمائی۔

▽ سابق پرنسپل [illegible]، ڈگی روڈ، علی گڑھ

پیشہ ورانہ رہنمائی:

تعلیم سے عام مطلب 'لکھنا پڑھنا' ہوتا ہے۔ یا عام آنا دانہ تعلیم جس سے نوجوان بورڈ یا یونیورسٹی کے امتحانات پاس کرلیں جس سے 'تعلیم یافتہ' کہلائیں۔ اس طرح کے تعلیم یافتہ کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ایک نوجوان ادبی، ثقافتی اور تہذیبی طور پر ترقی کر گیا ہے اور تعلیم حاصل کر کے اسے سماج اور تمدن میں ایک مقام حاصل ہو گیا ہے۔ اب تک اسکولوں اور عام تعلیمی درسگاہوں کا کام بچوں اور نوجوانوں کو اس قسم کا تعلیم یافتہ بنا دینا ہوتا تھا۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد کرنے، کسی ذریعۂ معاش کو اختیار کروانے یا کسی پیشے کی تربیت دینے سے عام تعلیمی درسگاہوں کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ ماضی میں وہ پیشہ اپنے خاندانی ذرائع سے سیکھ لیتا تھا اور تعلیم پا کر کوئی ذریعۂ معاش خود تلاش کر لیا کرتا تھا۔ اسکولوں کی ابتدائی یا ثانوی تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ وہ طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرتے تھے۔ ان مقاصد کے تحت سماج کے صرف تھوڑی صد لوگ جنہیں کوئی پیشہ اختیار کر کے کمانے کمانے کی طرف سے پورا اطمینان ہوتا تھا، اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ عام لوگ اپنے خاندان کے ذریعے اور ان کے اختیار کیے ہوئے پیشے کو اپنا کر ہی زندگی گزار لیتے تھے لیکن اب نئے دور میں ثانوی تعلیم سب ہی کے لیے ضروری ہوتی جا رہی ہے اور اس کا حلقہ زیادہ سے زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سب ہی نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرتے، صرف ان کا ایک چھوٹا حصہ ہی اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب ہوتا ہے۔ باقی ذرائع کے محدود ہونے یا جلد سے جلد کمانے کے قابل ہونے کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر پاتے۔ سماجی ضرورتوں کے لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے تو سب ہی نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کر بھی نہیں سکتے۔ اس لیے ثانوی تعلیم کے بعد نوجوانوں کی بڑی تعداد کھانے کمانے کے کاموں میں لگ جاتی ہے۔ اب یہ نظریہ زور پکڑتا جا رہا ہے کہ ثانوی تعلیم کے اداروں میں بھی یا ثانوی تعلیم کے فوراً بعد ان نوجوانوں کو جو اعلیٰ تعلیمی اداروں یا اعلیٰ تربیتی اداروں میں نہیں جا سکتے پیشہ ورانہ تعلیم دی جائے تاکہ تعلیم کا ایک اہم مقصد "نوجوانوں کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد کرنا" پورا ہو سکے چنانچہ ثانوی اسکولوں میں پیشہ ورانہ رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ نوجوانوں کو پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنے کے لیے اداروں کی پہچان کرائی جائے یا ان ہی اداروں میں پیشہ ورانہ تربیت دی جائے اور اس طرح انھیں ذریعۂ معاش تلاش کرنے میں مدد پہنچائی جائے۔

زندگی کے لیے کسی پیشہ کا انتخاب ایک بڑا ہی اہم اور دور رس فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کرتے وقت کتنے ہی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا جانا پڑتا ہے۔ جیسے خاندان کے لیے روزی روٹی کمانا، زندگی میں مسرت اور اطمینان حاصل کرنا اور سماج کی خدمت اور اپنے کام میں فخر محسوس کرنا وغیرہ۔ ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھ کر ہی صحیح پیشے کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ ایک اسکول یا کوئی تعلیمی ادارہ اس انتخاب میں طالب علموں اور ان کے سرپرستوں کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔ یقینی طور پر پیشہ اختیار کرنے میں طالب علم اور اس کے سرپرستوں کی خواہش ایک کلیدی رول ادا کر سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس خواہش کو پورا کرنے کی صلاحیت، اہلیت اور اس کے لیے لیے ذرائع کی موجودگی بھی مہیا ہو۔ اسکول یا کالج کو ان لوگوں کی خواہش کے ساتھ ان باتوں پر بھی غور کرنا پڑتا ہے اور ایک ڈاکٹر کی طرح صحیح مشورہ دینا ان کا کام ہے۔ کبھی کبھی یہ مشورہ طالب علم اور اس کے سرپرستوں کی خواہش کے خلاف بھی ہو سکتا ہے لیکن صحیح رہنمائی کے لیے مشورہ دینے والا استاد رہنمائی کے کام میں ماہر یا تربیت یافتہ ہونا چاہیے اور اس کے پاس طالب علم کے بارے میں 'مجموعی ریکارڈ' ہونا بھی لازمی ہے تاکہ وہ صحیح طور پر طالب علم کی صلاحیت اور اہلیت کو پرکھ سکے۔ اس لیے ہر اسکول میں ایک یا دو رہنمائی کے صلاح کار اساتذہ علیحدہ سے ہوں تو بہتر ہے ورنہ ایک یا دو اساتذہ کو اس

کام کی خصوصی تربیت دی گئی ہو اور ان کے درس وتدریس کے ٹائم ٹیبل سے کچھ وقت نکال کر اس کام کے لیے وقف کردیا جائے۔

رہنمائی کے ٹیچرز کو طلبا کی پیشہ ورانہ رہنمائی کے لیے مندرجہ ذیل طریقے استعمال میں لانے چاہئیں:

۱۔ ان کے ذمہ باقاعدگی سے سب سے چھوٹی کلاس سے لے کر سب سے اونچی کلاس تک طلبا کی رہنمائی کی خدمت انجام دینے کا کام سپرد ہو اور اس کے لیے ہر کلاس میں سال میں چند گھنٹے وقف ہوں۔

۲۔ وقتاً فوقتاً مختلف پیشوں کے متعلق تصویروں، پمفلٹس، سلائڈز اور فلموں کے دکھلائے جانے کا انتظام کیا جائے۔

۳۔ ضلع یا شہر کے روزگار افسر اور اس کے دفتر سے مستقل رابطہ قایم رہنا چاہیے اور روزگار افسر کو کبھی کبھی ادارے میں مدعو کرتے رہنا چاہیے۔

۴۔ اسکول یا کالج میں روزگار یا پیشوں سے متعلق ایک گوشہ ہونا چاہیے جہاں مختلف روزگاروں کی معلومات فراہم کرنے والے رسالے، اخبار اور کتابیں رکھی ہوں تاکہ طلبا اپنے خالی گھنٹوں میں انھیں پڑھ کر روزگار اور پیشہ ورانہ تربیت کے اداروں اور صنعت وحرفت میں ضرورتوں کے لیے معلومات حاصل کر سکیں۔

۵۔ اس کام میں والدین اور سرپرستوں کا تعاون بھی ملنا چاہیے اور رہنمائی کے استاد کو ان سے مشورہ کرتے رہنا چاہیے۔

۶۔ صنعت وحرفت کے اداروں سے بھی تعاون لیا جائے اور ان سے مسلسل ربط رکھا جائے۔

۷۔ اگر کالج یا اسکول میں کیریر منتخب کرنے کے سلسلے میں ایک ورکشاپ کا انتظام ہو سکے تو یہ طلبا کے کام میں بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

پیشہ ورانہ رہنمائی آج کل ہر تعلیمی ادارے کے لیے لازمی اور ضروری کام ہے۔ بدقسمتی سے ابھی ہمارے اداروں میں اس طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ حکومت اور عوام دونوں کو اس طرف توجہ دینا چاہیے۔

تعلیمی رہنمائی

رہنمائی کے سلسلے میں صرف ذریعۂ معاش، پیشہ اور روزگار ہی کے متعلق طلبا کو بتانا اور انھیں راستہ دکھانا ہی کافی نہیں ہے۔ انھیں آئندہ اور اعلیٰ تعلیم وتربیت کے لیے بھی ایسے اداروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ضروری ہے جو ان کو صلاحیت کے مطابق تربیت دے سکیں۔ ایسے ادارے کہاں واقع ہیں؟ ان میں داخلے کے لیے کیا اصول اور قواعد ہیں اور ان میں داخلہ لینے میں کیا اخراجات ہوتے ہیں؟ وغیرہ یہ سب باتیں بھی طلبا کو جاننا ضروری ہوتی ہیں۔

اس قسم کی رہنمائی کے لیے طلبا کی اہلیت اور صلاحیت کی جانچ بھی ضروری ہوتی ہے۔ انھیں ان کی صلاحیت، اہلیت اور رجحان و میلانِ طبع کی بنا پر ہی صحیح صلاح ومشورہ دیا جا سکتا ہے اور مناسب پیشہ کے لیے ان کی صحیح رہنمائی کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں طلبا کا مجموعی ریکارڈ تو معاون ہوتا ہی ہے جدید تحقیق کے مطابق ایسے جانچ اور پرکھ کے طریقے (Guidance Tests) تیار کیے ہیں، جن سے طلبا کے رجحان، میلانِ طبع، صلاحیت اور اہلیت کے متعلق ایک اچھی معلومات فراہم ہو جاتی ہے۔ رہنمائی کے اساتذہ اور ادارے کے پرنسپل کو ان تمام جدید ٹیسٹس سے بخوبی واقف ہونا چاہیے۔

ان سب باتوں کے ساتھ طالب علم کو رہنمائی کی اس وقت بھی ضرورت ہوتی ہے جب وہ اختیاری مضامین کا انتخاب کرتے ہیں۔ عام طور پر بغیر سوچے سمجھے صرف دوستوں کا ساتھ دینے یا دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی بہت سے بچے اپنی طرف کے خلاف غلط مضامین کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ مثلاً اچھے بھی

سائنس لے لیتے ہیں جن کا ذہن اور میلان طبع سائنس کے لیے بالکل مناسب نہیں ہوتا۔ ان کے لیے تو ادب یا آرٹ زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے طلبا سائنس میں دلچسپی نہیں لے پاتے اور کلاس میں پچھڑے رہتے ہیں اور پھر مایوسی اور بے بسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کئی کئی سال تک امتحان پاس نہیں کر پاتے اور وقت اور پیسہ دونوں برباد ہوتے ہیں۔ اسی لیے اسکولوں میں اس وقت بھی تعلیمی رہنمائی کی ضرورت ہے جب کہ بچے ثانوی اسٹیج پر پہونچتے ہیں اور مضامین کا انتخاب کرتے ہیں۔ انگلستان کے طریقۂ تعلیم میں پرائمری اسٹیج کے بعد تمام بچوں کی ایک "رجحانی جانچ" (Aptitude Test) ہوتی ہے اور اس کے بعد انھیں تین حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اسی لیے وہاں ثانوی طریقۂ تعلیم کو (Tripartite) تین طرف بہنے والا طریقۂ تعلیم کہا جاتا ہے۔ کچھ بچے جو ذہین بھی ہوتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے موزوں انھیں گرامر اسکولوں میں بھیجا جاتا ہے۔ ان اسکولوں میں یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بچوں کو تیار کیا جاتا ہے اس لیے انھیں اعلیٰ سطح تعلیم دی جاتی ہے۔ کچھ بچے ٹیکنیکل اسکولوں میں جاتے ہیں جن میں ٹیکنیکل تعلیم کا انتظام ہے اور ان ہی اسکولوں سے ذہین بچے اعلیٰ ٹکنیکل تعلیم کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ باقی سب بچے عام موڈرن اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان اسکولوں میں عام لازمی تعلیم دی جاتی ہے۔ کیونکہ انگلستان میں سب ہی بچوں کے لیے ثانوی سطح تک تعلیم لازمی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو بچے ایک مرتبہ اعلیٰ تعلیم یا ٹکنیکل تعلیم کے لیے منتخب نہیں ہو سکے وہ کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ اگر دوران تعلیم وہ اس کے لیے اپنی صلاحیت اور اہلیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو درمیان میں بھی ان اسکولوں اور ان کورسز کے لیے ان کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک میں سب ہی بچے ایک ہی طرح کے اسکولوں میں جاتے ہیں اور ایک ہی طرح کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

ذاتی رہنمائی

آج کے نوجوان اور بچے اپنے پیش رو کے مقابلے میں زیادہ ذہنی اور سماجی دباؤ میں رہتے ہیں۔ زندگی کی پیچیدگیوں سائنس کی فنی تبدیلیوں اور سماجی الجھنوں نے زندگی کے لیے کچھ بوجھ پیدا کر دیتے ہیں اور خوشی اور شادمانی کی جگہ بے چینیوں اور پریشانیوں نے لے لی ہے۔ آسانیاں اور آرام کی زندگی تو ہو گئی ہے لیکن ذہنی اضطراب (ٹینشن) بڑھ گیا ہے۔ معیارِ زندگی میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کے مطابق کچھ پیشوں کو چھوڑ کر عام طریقے پر آمدنی نہیں بڑھ رہی ہے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر نوجوانوں میں اضطراب اور بے بسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں بھی طلبا کے معیارِ زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے اور غریب طالب علم اکثر احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ گھر میں کبھی کبھی والدین کے آپسی جھگڑے، دوسری خاندانی گتھیاں، بیماری اور پڑوس اور محلوں کے مسایل بھی نوجوانوں کے ذہنوں کو گھیرے رہتے ہیں جن سے بہت سے طلبا اپنی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دے پاتے غرض کہ اس طرح ہر طالب علم کے اپنے ذاتی اور جذباتی مسایل ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان پر کچھ صلاح و مشورہ کریں اور کسی کی مدد سے ان گتھیوں کو سلجھا سکیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں طلبا کے لیے

انھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے
ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دے
کبھی گاہِ بازیِ دوراں دکھا دے
جو ہونا ہے کل آج اُن کو سمجھا دے
چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

مولانا حالیؔ

ہیں۔ گھر میں کبھی کبھی والدین کے آپسی جھگڑے، دوسری خاندانی گتھیاں، بیماری اور پڑوس اور محلوں کے مسایل بھی نوجوانوں کے ذہنوں کو گھیرے رہتے ہیں جن سے بہت سے طلبا اپنی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دے پاتے۔ غرض کہ اس طرح ہر طالب علم کے اپنے ذاتی اور جذباتی مسایل ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان پر بھی صلاح ومشورہ کریں اور کسی کی مدد سے ان گتھیوں کو سلجھا سکیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں طلبا کے لیے اس قسم کی رہنمائی کا کام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کام کے لیے "رہنمائی ٹیچر" کو انسانی نفسیات اور نوجوانوں خاص طور پر Adolescents کی سائیکلوجی پر پوری طرح عبور حاصل ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ ایسے طلبا کی جو اس قسم کی الجھنوں کا شکار ہیں صحیح رہنمائی کر سکے۔ ایسے معاملات میں رہنمائی ٹیچر ایک ڈاکٹر کی طرح ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مریض کا جسمانی تجزیہ کرتا ہے تو رہنمائی ٹیچر یا گائڈ نفسیاتی اور جذباتی تجزیہ کر کے بچّے کے جذباتی اور نفسیاتی مسایل پر مشورہ دے سکتا ہے۔

رہنمائی کے ان طریقوں کو کامیابی سے کام میں لانے کے لیے رہنمائی ٹیچر یا گائڈ کو نہ صرف طلبا اور ان کے سرپرستوں سے تعاون ملنا ضروری نہیں ہے اسے اپنے ساتھی اساتذہ کی بھی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرنسپل صاحبان کا بھی یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ رہنمائی کے کاموں کی طرف بھی توجہ دیں اور اپنی درس گاہوں میں رہنمائی کے کاموں کی ہمت افزائی کریں اور ان کاموں کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیں۔

"تنظیم، اتحاد اور شعور کسی جماعت کے پاس نہ ہو تو حکومت اس سے صرف وعدے کرتی ہے اور کچھ نہیں کرتی۔ لیکن اس سے بڑی نادانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی جہالت کو دور کرنے کے لیے اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے حکومت پر تکیہ کریں اور اس زریں اصول سے جو جلی حروف میں آفاق پر لکھا ہوا ہے یعنی جو اپنی مدد آپ نہیں کرتا خدا بھی اس کی مدد نہیں کرتا، عملاً گریز کرتے رہیں۔ یاد رکھیے حکومت، اس کا رنگ خواہ کچھ بھی ہو، کبھی خود سے ہماری مدد نہیں کرے گی۔ ہم خود اٹھیں گے تو وہ بھی ہماری مدد کے لیے آئے گی، ہماری مدد پر خود کو مجبور پائے گی۔"

سید حامد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲ - شمارہ ۱ - (جنوری ۱۹۹۳ء)

ایران میں تاریخ طب کی عالمی کانگریس

سید ظل الرحمٰن ▽

اسلامی علوم و ثقافت کی تاریخ میں ایران کو ابتدا سے ایک عظیم گہوارہ کا درجہ حاصل رہا۔ سقوط اندلس کے بعد غرناطہ، قرطبہ، اشبیلیہ اسی طرح وسط ایشیا کی سلطنتوں کی تباہی کے ساتھ بلخ و بخارا اور تاشقند و سمرقند کی ضوفشانی زیادہ عرصہ باقی نہیں رہی لیکن اسلام کے ہر دور میں ایران میں ایسے دانش ور اور صاحبانِ کمال پیدا ہوتے رہے جنھوں نے نہ صرف ایرانی علم و ادب کی تاریخ میں اپنی جگہ بنائی بلکہ پوری اسلامی دنیا کے لیے وہ نازش و افتخار کا باعث ہوئے۔ اسلامیان عالم پر ایرانی علم و تہذیب نے جو اثرات مرتب کیے ہیں ان کا مطالعہ دراصل اسلام کی علمی و تہذیبی تاریخ کا مطالعہ ہے۔ طب یونانی کو خصوصیت کے ساتھ ایران سے نسبت حاصل ہے۔ ایرانی اطبا کے طبی کارنامے اضافات و اختراعات اسلامی طب کی تاریخ کا سب سے درخشاں باب ہیں۔ اسلامی عہد میں دورِ ترجمہ کے بعد طبع زاد مصنفین کی صف اول میں جن طبیبوں کا شمار ہے۔ ان کا سرمایہ اگرچہ عربی زبان میں ہے مگر وہ سب ایرانی نژاد تھے۔ ایران کے وہ سیکڑوں مشاہیر فن جنھوں نے مہتم بالشان ورثہ بطور یادگار چھوڑا ہے آج بھی برصغیر کے طبی حلقوں میں زندہ ہیں اور یہاں ان کی وراثت اور کاموں پر مطالعہ و تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔

اسلامی انقلاب کے بعد جمہوری اسلامی ایران میں اسلامی علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ ان کی اشاعت و فروغ اور کھوئی ہوئی اقدار کی بازیافت سے خاص دلچسپی لی جا رہی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں بین الملی معیار کے جو متعدد مذاکرے وہاں منعقد ہوئے وہ اس دلچسپی اور شغف کا بہترین اظہار ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں وہاں طب پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا گیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں "تاریخ طب در اسلام و ایران" کے موضوع پر وہاں ایک اور عالمی کانگریس کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ کانگریس محمد بن زکریا رازی کی وفات کی بارہویں صدی کے آغاز کی مناسبت سے منعقد کی گئی تھی — ہندوستان سے جناب حکیم عبد الحمید صاحب، طبیبہ ام الفضل، حکیم غلام مہدی، پروفیسر رضا اللہ انصاری اور راقم الحروف کو شرکت کا موقع ملا۔ اس بین الملی کانگریس میں جس میں ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے ۲۹ ممالک کے مندوبین شریک تھے۔ سب سے بڑا وفد ہندوستان کا تھا۔

ہم لوگ ۲۔ اکتوبر کو صبح نو بجے ایربس سے دہلی سے بمبئی روانہ ہوئے۔ بمبئی ایرپورٹ پر حکیم محمد مختار اصلاحی، حکیم فیاض عالم، حکیم محمد طارق، حکیم مسز نجمہ ارشد، حکیم رضا اور بعض دیگر حضرات خاص طور پر حکیم عبد الحمید صاحب کو خوش آمدید کہنے کے واسطے موجود تھے۔ ایرپورٹ پر حکیم محمد سعید صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ کراچی سے اس روز براہ راست پرواز نہ ہونے کی وجہ سے وہ

▽ پروفیسر شعبۂ علم الادویہ۔ اجمل خاں طبیہ کالج۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

پارلیمنٹ تہران جا رہے تھے۔ ½ ۹ بجے شب بمبئی سے ایران ایرویز سے روانگی ہوئی۔ تہران پہنچے پر ہماری گھڑیوں میں ڈیڑھ بج رہا تھا اور ایران میں یہ ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔ دو گھنٹے ہندوستانی وقت سے پیچھے۔ تہران ایرپورٹ "فرودگاہ مہرآباد" پر کانگریس کے کارکنوں کے علاوہ ہندوستانی سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری عزیز الدین عثمانی صاحب بھی ازراہ عنایت موجود تھے۔ ہوٹل لالہ انٹرنیشنل میں دوسرے مندوبین کے ساتھ قیام کا انتظام تھا۔

۳۰ اکتوبر کو ۸ بجے صبح تہران یونیورسٹی کے وسیع و عریض ہال میں کانگریس کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ پس منظر میں خوش الحانی سے تلاوت کلام کے بعد قومی ترانہ (سرود ملی) گایا گیا۔ ترانہ ٹیم تیس افراد پر مشتمل تھی۔ اکبر ہاشمی رفسنجانی رئیس جمہوری اسلامی ایران کا پیغام پڑھا گیا۔ اس پیغام میں اسلام میں طب کی اہمیت اور مسلمانوں کی طبی خدمات پر مختصر روشنی اور جدید طبی ترقیات اور انسانی زندگی کے واسطے ان کی ضرورت کے تذکرے کے ساتھ کانگریس کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار تھا۔ امام خمینی کی ایک مختصر تقریر کا ٹیپ ریکارڈ بھی سنایا گیا۔ کانگریس کے روح رواں اور اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد فرہادی نے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ طب اور سائنس نے اگرچہ بہت ترقی کی ہے اور ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے جا رہے ہیں لیکن ارسطو اور ابن سینا کے نظریات کی اہمیت آج بھی برقرار ہے اور ان کی حکمت و دانش سے موجودہ زمانہ میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اطباءِ قدیم جامع علوم ہوتے تھے۔ وہ انسان کو کُل کا ایک جز سمجھتے تھے۔ ایسے عالم اصغر اور کائنات کو عالم اکبر مانتے تھے اور ان دونوں عالموں کے درمیان ایک رابطہ کے قائل تھے۔ آج کل تخصیص کی وجہ سے مریض سے زیادہ مرض کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے علاج میں بڑی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ الحاوی اور القانون کے صفحات سے ان طبیبوں کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ ان مصادر کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے [illegible]

اور طریقۂ علاج سے دلچسپی نہیں لی جاتی ہے۔ اسلامی ثقافت اور اسلامی طب کی ایران میں اور اسلامی دنیا میں اہمیت واضح کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایران میں جلد ہی ایک اسلامی نیشنل اکاڈمی قائم کی جائے گی جس کے تحت ایک ریسرچ سینٹر اور میوزیم بھی ہوگا۔ کانگریس کے تعلق سے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ کل ۲۹۴ مقالے موصول ہوئے تھے ان میں ۲۶۷ مقالے وقت پر اور باقی مقررہ وقت کے بعد ملے ۱۴۰ مقالے ملکی اور ۱۳۰ مقالے بیرون ملک ایرانیوں کے تھے ۲۹ ملکوں پر مشتمل غیر ملکی مقالوں کی تعداد ۱۱۴ تھی۔ ۲۶۷ مقالوں میں سے ۱۴۰ مقالے بصورت سخنرانی اور ساٹھ مقالے پوسٹر کی شکل میں منتخب کیے گئے (اس طرح چار روزہ کانگریس میں دو متوازی سیشن میں تقریباً ۹۰ مقالے پیش ہوئے)۔

ڈاکٹر مصطفیٰ معین وزیر ثقافت اور اعلیٰ تعلیم نے کانگریس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں علم الابدان کو علم الادیان پر فوقیت دی گئی ہے۔ فضائی آلودگی دور کرنے اور ماحول کی صفائی کا بہت اہتمام کیا گیا ہے۔ انھوں نے ابتدائی اسلامی عہد میں جندیشاپور کے طبی کالج اور ایرانی اطباء کی سربلندی کا خاص طور پر ذکر کیا اور زکریا رازی اور ابن سینا کے ساتھ قطب الدین شیرازی اور بہاء الدولہ کے کاموں کو سراہا۔ تقریب کی ساری کارروائی فارسی میں انجام پائی لیکن مائیکروفون پر انگریزی ترجمہ کا انتظام کیا گیا تھا۔

افتتاحی تقریب کے فوراً بعد طبی مخطوطات اور مطبوعات کی نمائش مندوبین کی دلچسپی کا باعث تھی۔ نمائش کتب کا انتظام وزارت ارشاد کی جانب سے تھا۔ ایران کے مختلف کتب خانوں مثلاً آستان قدس رضوی کتاب خانہ، [illegible] دانش گاہ تہران دانش گاہ [illegible] کی تقریباً ۵۰۰ قلمی اور قدیم مطبوعہ کتابیں [illegible] تھیں۔ اہم کتابوں میں [illegible]

مقالوں کا اصطفن بن بسیل نے اور آخری دو مقالوں کا حنین بن اسحٰق نے یونانی سے سریانی میں ترجمہ کیا تھا۔ عربی میں اس کے دو ترجمے ہیں۔ ایک ترجمہ سالم ملیلی نے حاکم دیار بکر "شلخ ابن نخ" کے حکم سے کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ جو سریانی سے عربی میں کیا گیا ہے وہ مہران بن منصور کا ہے۔ اس کی تاریخ کتابت چھٹی صدی ہجری ہے۔ یہاں یہی نسخہ موجود تھا۔ یہ نسخہ آستانہ قدس کی امانت ہے۔ دوسری کتابوں میں مفید الخاص محمد بن زکریا رازی، زبدۃ الطب زین الدین اسمٰعیل بن حسین حسینی گرگانی (وفات ۵۳۱ھ یا ۵۳۵ھ) جامع بیان کا عباسی مرزا قاضی یزدی، اصلاح الادویۃ المسہلۃ ونفی مضارہا حبیش بن حسن دمشقی، مراۃ الصحت غیاث بن محمد اصفہانی، زینت الطب کاظم تبریزی متخلص بہ حاذق، شفاء الامراض محمد بن ہبت اللہ سبزواری، راحت الانسان محمد علی بن عبدالکریم طباطبائی اصفہانی، تحفہ شاہیہ عباسیہ (شرح رسالہ رضویہ و ذہبیہ منسوب بہ امام رضا) از محمد نصیرالدین بن قاضی بن کاشف الدین یزدی، خلاصۃ التجارب بہاء الدولہ دیلمی طرشی رازی، حاشیۃ القانون غیاث الدین دشتکی (چند صفحات پر ہے) رسالہ فی الخواص محمد بن زکریا رازی، الادویۃ المفردۃ حسن بن یونس بغدادی (مکتوبہ ۲۱۳ھ) مالا یسع الطبیب جہلہ یوسف بن اسمٰعیل خوئی مشہور بہ ابن الکبیر (یہ کتاب مفردات ابن بیطار کا اختصار ہے جس میں بعض دواؤں کا اضافہ ہے۔ ایک حصہ مفردات، دوسرا حصہ مرکبات کے بیان میں ہے) مکتوبہ ۱۱ھ اور ہندوستانی مصنفین میں شرح قانون علی گیلانی، تشریح الابدان منصور بن محمد، خلاصۃ الحکمۃ حکیم ہادی خاں علوی شیرازی قابل ذکر ہیں۔

نمایش گاہ میں ایران میں پائی جانے والی جڑی بوٹیاں تازہ اور خشک حالت میں رکھی تھیں۔ ترنجبین، انگور، بنفشہ، مرزنجوش، کاسنی، زعفران، مورد، بابونہ، کاکنج، انیسون، زیرہ وغیرہ۔ اس نمایش کا اہتمام دانشکدہ داروسازی (فارمیسی کالج)، دانشگاہ علوم پزشکی تہران نے باغ گیاہ شناسی وابستہ بہ وزارت زراعت کے تعاون سے کیا تھا۔ اس موقع پر دو یادگاری ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیے گئے۔ ایک ٹکٹ میں زکریا رازی کو بچہ کا معائنہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور دوسرے میں طبی آلات کی تصویر پیش کی گئی ہے۔

ظہرانہ دانشگاہ تہران میں ہوا۔ مجلس مقالات میں شرکت رہی۔ ثقافت و اعلیٰ تعلیم کے وزیر ڈاکٹر مصطفیٰ معین کی جانب سے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں مندوبین کے اعزاز میں پر تکلف عشائیہ دیا گیا۔ وزیر موصوف سے تمام مندوبین کا تعارف ہوا۔ اس موقع پر حکیم محمد سعید صاحب نے آن حضرت کے مکتوب مبارک کا عکس ایک نہایت خوب صورت کیس میں وزیر موصوف کو پیش کیا۔

۴ اکتوبر کی صبح ڈاکٹر حسن عباس سے ملاقات ہوئی۔ یہ بہت تعلق اور تپاک سے ملے۔ حسن عباس صاحب مظفر پور بہار کے رہنے والے ہیں۔ وہاں سے اردو میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اب دانشگاہ تہران سے فارسی میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ان کی وسعت نظر اور ذوق مطالعہ سے خوشی ہوئی۔ آزاد بلگرامی ان کی تحقیق کا موضوع ہے۔ دائرۃ المعارف میں عارف نوشاہی سے ملا۔ مخطوطات پر اپنے کام کی وجہ سے علمی حلقوں میں ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے مخطوطات کی فہرست مرتب کی ہے۔ فہرست کتاب ہائی چاپ سنگی و کمیاب بھی دو جلدوں پر مشتمل ان کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب خانہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد میں موجود قدیم و کمیاب مطبوعہ کتابوں کی فہرست ہے۔ انھوں نے شرح مثنوی مولانا روم از شاہ داعی الی اللہ شیرازی دو جلدوں میں مرتب کی ہے۔ مرتضیٰ مطہری کی کتاب ایران و مصر میں کتب سوزی کا انھوں نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ کتاب شناسی کے نام سے اسلام آباد سے ایک موقر علمی و تحقیقاتی مجلہ بھی شائع کرتے رہے ہیں۔ ان کے خالہ زاد بھائی محمد نوشاہی ہمدرد پاکستان

کے شعبۂ معلومات سے وابستہ ہیں۔ ان کی بھی معلومات کی کئی فہرستیں چھپ چکی ہیں۔ دائرۃ المعارف ہی میں ہوشنگ اعلم سے ملنا ہوا۔ یہ بہت لائق اور صاحب علم لوگوں میں ہیں۔ انھوں نے دائرۃ المعارف اسلامی کی طرف سے شایع کردہ دانش نامہ جہان اسلام کا حصہ اول عنایت کیا۔ ابھی یہی پہلی جلد طبع ہوئی ہے یہ حرف ب پر مشتمل ہے۔ اس میں باد، باداورد بادام، بادرنگ بادرنجبویہ، بادروج، بادنجان پر ہوشنگ اعلم نے بہت عمدہ معلومات پیش کی ہیں۔ مقالات میں شرکت اور ظہرانہ کے بعد ام الفضل اور حکیم غلام مہدی کے ہمراہ ری کے لیے روانگی ہوئی۔ ری ایران کا وہ مردم خیز علاقہ ہے جس کی خاک سے صدہا نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں اور آسمان علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں۔ امام فخرالدین رازی اور محمد بن زکریا رازی وہ برگزیدہ نام ہیں جو ہماری علمی تاریخ میں ہمیشہ قابلِ احترام رہیں گے۔ طب کے ایک طالب علم کے لیے ری کعبۂ فن ہے۔ میں ری کی گلیوں کا طواف کر رہا تھا اور طبی تاریخ کا وہ دور میرے سامنے تھا جب اس شہر کو ایسی مرکزیت حاصل تھی کہ دور دور سے طلبا تحصیل فن کے لیے یہاں کا رخ کرتے تھے۔ یہاں کے شاندار شفاخانے، صحت افزا مطب اور درس کی پر وقار مجلسیں، تصنیف و تالیف کی ایسی روایت جو الحاوی جیسی کتاب کی شکل میں ہمارے لیے ایک قیمتی متاع ہے۔ ری کی عظمتوں کو سلام، زکریا رازی کی فنی رفعتوں کو سلام۔

ری تہران سے ۵ اکلومیٹر کے فاصلے پر اب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ تہران کی وسعتیں بڑھ کر اس قصبے تک پہنچ رہی ہیں۔ زکریا رازی کا نشانِ قبر یا کوئی یادگار وہاں موجود نہیں ہے۔ سب سے اہم اور قابلِ دید آستانہ شاہ عبدالعظیم ہے۔ شاہ عبدالعظیم حضرت حسن کے احفاد میں پانچویں پشت میں ہیں۔ سلسلہ اس طرح ہے۔ عبدالعظیم بن عبداللہ بن علی بن حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب۔ آستانہ کے گنبد کا بالائی حصہ سونے کا اور اندرونی حصہ کاشی کاری اور سرامک کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ہال کی چھت دیواروں اور دروازوں کی آئینہ بندی نہایت دیدہ زیب ہے۔ قیمتی جھاڑ اور فانوس آویزاں ہیں۔ مزار قیمتی چادر سے ڈھکا ہوا ہے۔ لوگ عقیدت سے جالیوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔ جالی کے اندر ہزاروں روپے کے نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ یہ عقیدت کا اظہار تھا۔ بکثرت لوگ زیارت، نماز اور تلاوت کلام پاک میں معروف تھے۔ شاہ عبدالعظیم کے مزار کے عقب میں امام زادہ حمزہ بن امام موسیٰ کاظم کا مزار ہے۔ آستانہ کے بیرونی حصے میں امام زادہ طاہر بن امام زین العابدین کا مقبرہ ہے ری سے شام کو واپسی ہوئی۔ رات کا کھانا ہوٹل میں کھایا۔

۵ اکتوبر کی صبح دانش گاہ کے مرکزی ہال میں جس میں افتتاحی تقریب منعقد ہوئی تھی، میرا مقالہ ہوا۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجلس صدارت علی اکبر ولایتی (وزیر خارجہ ایران) ایران کے ممتاز عالم سید محمود مرعشی نجفی اور مشہور دانش ور مہدی محقق پر مشتمل تھی۔ مقالہ کا عنوان تھا "ایرانی اطباء کا ہندوستان میں طب کی ترقی میں حصہ"۔ میں نے یہ مقالہ فارسی میں پڑھا۔ مقالہ فارسی اور انگریزی میں مطبوعہ شکل میں تقسیم بھی کیا گیا۔ علی اکبر ولایتی نے مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے "زبان فارسی در لہجہ شیریں ہندی" بھی کہا۔ اسی روز پریس کے لوگوں نے میرا انٹرویو لیا۔ حکیم عبدالحمید صاحب، حکیم محمد سعید صاحب اور دوسرے ہندوستانی مقالے انٹرویو مکمل ہو چکے تھے۔

۶ بجے شام عباس میوزیم (موزہ رضا عباسی) میں طبی نمائش گیلری کے افتتاح میں شرکت کی۔ اعلیٰ تعلیم کے وزیر ڈاکٹر مصطفیٰ معین نے افتتاح کی رسم انجام دی۔ نمائش گاہ کے ذمہ دار ابتدا نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور مصطفیٰ معین نے اسلام اور ایران میں علم اور طب کی اہمیت پر مبسوط تقریر کی۔ یہ قیمتی میوزیم تہران یونیورسٹی سے کافی فاصلے پر علاقہ سعید خندان میں واقع ہے اور سازمان میراث فرہنگی کے زیر اہتمام ہے۔ اس موقع پر

میوزیم میں مصر کی مخطوطات کی فہرست بھی شائع کی گئی تھی۔ اس کے مطابق یہاں الکیمیا علمی کتابیں موجود ہیں۔ لیکن ان کے نسخے اس کثرت سے ہیں کہ دوسری جگہ اتنی تعداد میں دیکھنے کو نہیں ملتے چنانچہ ذخیرہ خوارزم شاہی کے ۸۸، اختیارات بدیعی کے ۴۴، تشریح منصوری کے ۳، تحفۃ المومنین کے ۵۹، قرابادین مظفر شفائی کے ۶۲ اور عجائب المخلوقات کے ۲۱ نسخے موجود ہیں، جن سے ایران میں ان کتابوں کی اشاعت و مقبولیت کا اظہار ہوتا ہے

حوزہ رضا عباسی سے تمام مندوبین کرج کے لیے روانہ ہوئے۔ کرج تہران سے تقریباً ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک صنعتی مقام ہے جہاں ایران کا اہم ادارہ رازی انسٹی ٹیوٹ واقع ہے۔ اس ادارے میں سیرم اور ویکسین تیار کی جاتی ہے۔ ادارے کے خیر مقدمی جلسے میں تلاوت کلام پاک کے بعد آقائی ایمانی نے ایک نظم پیش کی۔ اس کے بعد آقای مجدی ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ نے ادارے کا تعارف کرایا اور رازی کی شخصیت اور علم کیمیا اور طب میں اس کی خصوصی مہارت پر روشنی ڈالی۔ کتابوں کی نمائش کا بھی اہتمام تھا اور برائے فروخت بھی کافی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس موقع پر ایک "یادگاری لوح "مجسمہ رازی کی نقاب کشائی محترم جناب حکیم عبد الحمید صاحب کے ہاتھوں انجام پائی۔ یہ حکیم صاحب کی شخصیت کا اعتراف اور ہم ہندوستانیوں کے لیے فخر کے اعزاز کی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر طب یونانی کو متعارف کرانے کا سہرا ان دو ہمدرد برادران کے سر ہے۔ انھوں نے بیرون برصغیر ہندو پاک طب یونانی کی اشاعت اور اسے تسلیم کرانے کے سلسلے میں جو قابلِ ستائش کوششیں کی ہیں، ان کے نتائج سامنے آرہے ہیں۔ ان کے مساعی سے ماہر طب یونانی کے مطالعے سے دلچسپی بڑھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب یہ دونوں بھائی حکیم عبد الحمید صاحب اور حکیم محمد سعید صاحب بین الاقوامی سطح پر طب یونانی کی پہچان اور اس کی شناخت بن گئے ہیں۔

کرج پہنچ کر میں نے ڈاکٹر فرشید فر کو ٹیلی فون سے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ ان سے اب تک ملنا نہیں ہو سکا تھا۔ فرشید فر نے علی گڑھ میں ایک زمانہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ ۱۹۹۰ء میں علم الادویہ پر منعقدہ بین الاقوامی سمینار میں شرکت کے واسطے بھی علی گڑھ آئے تھے۔ بہت محبت اور تپاک سے ملے اور مہمان بنانے پر اصرار کیا۔ ادارے کی طرف سے پر تکلف عشائیہ کے بعد ۱۲ بجے شب کے قریب تہران واپسی ہوئی۔

۶ر اکتوبر صبح ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک مجلس مقالات میں شرکت رہی۔ ۱۱ بجے تہران یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رحیمیان سے ان کے دفتر میں ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ حکیم عبد الحمید صاحب اور حکیم محمد سعید صاحب کی سربراہی میں ملاقات ہوئی۔ رئیس دانش گاہ کے علاوہ ڈاکٹر محمد تقی خانی پرو وائس چانسلر (تعلیمات) ڈاکٹر جعفر عبادی پرو وائس چانسلر (پلاننگ) اور دانش گاہ کے دوسرے ذمہ دار موجود تھے۔ ان لوگوں سے طب یونانی کو ایران میں سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے اور اس کی تعلیم کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ دانش گاہ کی طرف سے رئیس جامعہ نے "سیاہی رستم در شاہ نامہ" کا ایک دیدہ زیب مصور نسخہ ہم سب کو عنایت کیا۔ ہمدرد دہلی، ہمدرد کراچی، سی سی آر یو ایم دہلی اور راقم الحروف کی مطبوعات انھیں پیش کی گئیں۔ ایک بجے میں نے ٹی۔ وی کو انٹرویو دیا۔ ہمارے دوسرے رفقا کے بھی ٹی۔ وی پر انٹرویو ہوئے۔

ظہرانہ کے فوراً بعد قم کے لیے روانگی عمل میں آئی۔ طبیبہ ام الفضل اور حکیم غلام مہدی ہمراہ تھے۔ قم خواہر امام علی رضا کے روضہ، حوزہ علمیہ اور عظیم الشان کتاب خانہ کی وجہ سے بڑی شہرت کا حامل شہر ہے۔ کتاب خانہ کے روح رواں آیت اللہ مرعشی نجفی کے عالی قدر صاحبزادے سید محمود مرعشی نجفی ہیں۔ ان ہی کی دعوت پر مندوبین کے لیے قم کے سفر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس عظیم الشان کتاب خانہ کا ملاحظہ لینے

انوکھی مخطوطات کے باعث دنیا کے بہترین کتاب خانوں میں کیا جاتا ہے۔ اس میں پچیس ہزار مخطوطات ہیں۔ طب مخطوطات کی تعداد ایک ہزار ہے۔ بعض مخطوطات دوسری اور تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ منابع و ذخائرِ اسلامی کے بڑے آثار یہاں محفوظ ہیں۔ یہ کتاب خانہ آیت اللہ مرعشی نجفی نے قائم کیا تھا۔ وہ ایران کے نامور عالم تھے۔ بکثرت کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے مسودات بھی محفوظ ہیں۔ انھوں نے بیحد شوق اور تلاش سے نوادرات حاصل کیے اور اس کے لیے منھ مانگی قیمت ادا کی اس کتاب خانے کی بیش قدری کے سلسلے میں اس کے متولی سید محمود مرعشی نجفی کے اس جملے سے میں محظوظ ہوا کہ اگر میں یہ کتاب خانہ فروخت کردوں تو راک فیلر سے زیادہ دولت کا مالک بن سکتا ہوں۔ کتاب خانے کی پہلی تاسیس ۱۳۸۵ھ میں عمل میں آئی تھی۔ بعد میں ۱۳۹۴ھ کو اسے مزید وسعت دی گئی۔ آیت اللہ مرعشیؒ ۱۳۱۵ھ کو نجف اشرف میں خانوادۂ علم وفضیلت میں پیدا ہوئے تھے، ۹۶ برس کی عمر میں ۱۴۱۱ھ میں قم میں وفات پائی۔ انھوں نے تقریباً ۸۰ برس قم کے حوزۂ علمیہ میں اور اس سے قبل نجف میں تدریس کی تھی۔ یہ کتاب خانہ تمام جدید ترین سہولتوں سے آراستہ ہے۔ جدید طریقوں کے مطابق جلد سازی، ورق داری (Lamination) درجۂ حرارت کو کنٹرول کرنے کے علاوہ اس کے مائکروفلمنگ ڈویژن میں وہ قیمتی اور نازک مشینیں موجود ہیں جو یورپ کی کسی بڑی سے بڑی لائبریری میں ہو سکتی ہیں۔ مخطوطات کی مائکروفلمیں تیار کی جا رہی ہیں اور رسائی کا کام اس سلسلے میں ہو چکا ہے۔ ۲۱ جلدوں پر مشتمل مخطوطات کا کیٹلاگ طبع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ سو سے زیادہ اعلیٰ مذہبی و دینی کتابیں اس کتاب خانے نے شایع کی ہیں۔ دوسری شایع کردہ کتابوں میں الشفا ابن سینا (۱۰ جلد) الفہرست شیخ منتجب الدین رازی (۱ جلد عربی، فارسی۔ رجال) تاریخ التراث العربی فواد سیزگین (۱۰ جلد ترجمہ عربی) شامل ہیں۔

سید محمود مرعشی نجفی ایران کے سرکردہ علماء میں ہیں،

وہاں کے دینی اور سیاسی حلقوں میں ان کی شخصیت کا بڑا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ایران کے لوگوں کی غالب اکثریت طب سنتی Traditional Medicine کی طرف دار ہے۔ انھوں نے بتایا کہ علماء قدیم اصولاً اس طب کی بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ خود ان کے دادا اور ان کے والد آیت اللہ مرعشی نجفی نے طب سنتی کی تعلیم پائی تھی۔ انھوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ قانون ابن سینا روم میں ۱۵۹۳ء میں چھپا ہے۔ ایران میں اس اشاعت کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا۔ ہم نے اس کی طرف سے بڑی غفلت برتی ہے۔ راقم سطور کا یہ احساس ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد ایران میں میراث اسلامی کی حفاظت پر جو توجہ دی جا رہی ہے اور اسلامی علوم و ثقافت کے تحفظ کی طرف جو عام رجحان ہے وہ طب اسلامی کے سلسلے میں نہایت خوش آیند ہے۔

کتاب خانہ میں مندوبین کو بے تکلف عصرانہ دیا گیا۔ قم کی مشہور مٹھائی گز شیریں بہت شوق سے کھائی۔ محترم محمود مرعشی نے ایک کتاب "کتاب خانہ عمومی آیت اللہ العظمیٰ مرعشی نجفی (یک نگاہ)" کا ایک نسخہ عنایت کیا۔ ان کے والد کی یاد میں جو ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا تھا وہ بھی ایک مائکروفلم میں مزین مندوبین کو تحفہ میں پیش کیا گیا۔ محمود مرعشی کی مہمان نوازی اور حسن اخلاق سے میں بہت متاثر ہوا۔ انھوں نے ہندوستان آنے پر ازراہ کرم مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا۔ ان کا بیٹا عشا کے بعد مسجد قم حرم امام رضا کے مزار پر حاضری ہوئی۔ یہ مزار آرائش و زیبائش اور رفعت و شوکت میں آستانہ شاہ عبد العظیم سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ایرانی نقاشی اور ہنر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہاں عقیدت مندوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔ قم ایک زمانے سے اہل علم کا مرکز رہا ہے۔ نجف اشرف کے بعد یہ مذہبی مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کی حیثیت پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ الحوزۃ العلمیہ

کے حصول کی خاطر دور دور سے طالبان علم وہاں پہنچتے ہیں۔ ہندوستان کے بھی کافی طلبا وہاں زیر تعلیم ہیں۔ قم تہران سے تقریباً ڈیڑھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ واپسی میں شاہراہ پر تہران سے تقریباً پچیس کلو میٹر پہلے عام بڑا قبرستان بہشت زہرا کے نام سے واقع ہے۔ اسی بہشت زہرا میں امام خمینی کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ جو اگرچہ ابھی زیر تعمیر ہے، لیکن مکمل ہونے پر یہ ایران کی ایک نہایت شاندار یادگار ہوگا۔ بڑی وسعت اور اہتمام سے اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ بہت سے لوگوں کو وہاں زیارت اور عبادت میں مشغول پایا۔ تہران پہنچے تو شب کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

۷ اکتوبر ۱ بجے صبح کی فلائٹ سے تہران سے روانہ ہوکر ۱۰ بجے کرمان شاہ پہنچے۔ چھوٹا جہاز فوکر تھا۔ ایرپورٹ سے براہ راست دانش گاہ رازی جانا ہوا۔ رازی کی وفات کی بارھویں صدی کے آغاز کی مناسبت سے رازی کے نام سے موسوم اس یونیورسٹی میں خصوصی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ۱۱ بجے جلسہ کا افتتاح ہوا۔ قرآن خوانی اور سرود ملی کے بعد ڈاکٹر علی اکبر رہبی رئیس دانش گاہ رازی اور لفٹننٹ گورنر کی تقریریں ہوئی۔ تقاریر میں رازی کی علمی، طبی اور تاریخی منزلت کا ذکر کیا گیا۔ بعد میں رئیس دانش گاہ نے رازی کے پورٹریٹ کی نقاب کشائی کی۔ یہ پورٹریٹ پینٹنگ کا تھا۔ بید دیدہ زیب اور منقش۔ اسی درمیان روزنامہ اطلاعات تہران کے نامہ نگار نے میرا انٹرویو لیا۔ اس موقع پر کتابوں کی نمائش بھی آراستہ کی گئی تھی۔ میں نے چند کتابیں بھی خریدیں۔ خوابگاہ دانش گاہ کے کینٹین میں لنچ ہوا۔ یونیورسٹی کے مہمان خانے میں کچھ دیر آرام کیا۔ مہمان خانہ ہی میں میرا اور بعض دوسرے مندوبین اور دونوں رفقا طبیبہ ام الفضل اور حکیم غلام مہدی کا ٹی۔ وی انٹرویو ہوا۔ دانش گاہ کے مرکزی ہال میں ۳ بجے سے ۵ بجے تک مجلس مقالات میں شرکت رہی۔ مقررین نے رازی کی حیات و کارناموں پر اور بالخصوص طب و کیمیا میں اس کے فضل و کمال پر اظہار خیال کیا۔ ۵ بجے کے بعد تاریخی مقامات کی سیر کے لیے نکلے۔ طاق بستان گئے۔ کرمان شاہ کے جنوب میں واقع ساسانی عہد کے اس صوبے کی یہ بہت وسیع یادگار ہے۔ دو غاروں میں سنگ تراشی اور نقاشی کی گئی ہے۔ یہ مقام طاق بستان کہلاتا ہے۔ ایک سنگ تراشی میں ساسانی بادشاہ اردشیر دوم (۳۸۳ — ۳۸۰ء) کی تخت نشینی کا منظر اہورامزدا اور بہرام کی موجودگی میں دکھایا گیا ہے۔ دوسرے غار میں ساسانی بادشاہ شاپور دوم اور شاپور سوم کے بت ہیں۔ عہد عتیق کی اس یادگار کی اہمیت خاص طور پر دو کتبوں کی وجہ سے ہے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاپور سوم (۳۸۸ — ۳۸۳ء) کے حکم سے بنائی گئی تھی۔ پہاڑ کو کاٹ کر جس طرح سنگ تراشی کی گئی ہے وہ ہندوستان کے اجنتا اور ایلورا کے غاروں کی یاد دلاتی ہے۔

ایران میں زور آزمائی اور پہلوانی کی روایت بہت قدیم ہے۔ ہر شہر میں زور خانے قایم ہیں۔ کرمان شاہ میں بھی ایک قدیم زور خانہ ہے۔ ہماری آمد کی پہلے سے اطلاع تھی۔ زور خانہ میں کئی لوگوں نے اپنے فن کا روایتی طور پر مظاہرہ کیا۔ دانش کدہ کشاورزی (ایگری کلچر کالج) میں عشائیہ دیا گیا۔ عشائیہ کے فوراً بعد دانش کدہ ادبیات وعلوم انسانی میں میوزک پروگرام میں شرکت کی۔ جس میں سازندوں نے نغمہ آرائی کی اور موسیقی اور ساز و آواز کا جادو جگایا۔ رسالت ہوٹل میں قیام کا انتظام تھا۔

۸ اکتوبر کی صبح یونیورسٹی کینٹین میں ناشتہ کے بعد کوہ بی ستون کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ کرمان شاہ سے تقریباً تیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ کوہ بی ستون میں دو ہزار برس پرانا ہرکلس کا مجسمہ نصب ہے۔ یونانی تصویری رسم الخط میں اشکانی دور کا کتبہ ہے۔ صفوی عہد کا ایک کتبہ عربی میں بھی نصب ہے۔ ڈھائی ہزار برس پہلے کا داریوس کا مجسمہ بھی ہے۔ سنگ تراشی کے ذریعہ ساسانی بادشاہ کے سامنے نو

قیدیوں کو پیش کیا گیا ہے، جو اس سے معافی کے خواستگار رہیں لیکن بادشاہ نے معاف نہیں کیا اور وہ سزا کے مستحق قرار پائے۔

منسٹری آف ہاؤسنگ اینڈ ڈیولپمنٹ کے میوزیم کی طرف سے ہم لوگوں کو استقبالیہ دیا گیا۔ اس کی طرف سے بین الاقوامی ہفتہ کی مناسبت سے تعمیرات سے متعلق نمائش بھی لگائی گئی تھی۔ اس درمیان ہم لوگوں نے خریداری بھی کی اور وہاں کے بازاروں میں گھومے۔

کرمان شاہ ایران کا مغربی صوبہ ہے۔ اس کا پرانا نام باختران ہے۔ اب بھی بعض جگہ باختران کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ اس کے شمال میں کردستان، جنوب میں لورستان، مغرب میں عراق اور مشرق میں ہمدان واقع ہے۔ ہمدان یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ بی ستون سے صرف ڈیڑھ سو کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ ہم طالبان طب کے لیے اس میں کشش کے کتنے ہی سامان ہیں۔ کیا بتاؤں، کس طرح دل بے چین ہوا۔ طبی تاریخ کے کیا کیا منظر نگاہوں کے سامنے آئے۔ ابن سینا کا مدتوں قیام رہا۔ قانون کی تکمیل اسی شہر تمنا میں ہوئی۔ اس کی آخری آرام گاہ کا شرف بھی اس کو حاصل ہوا۔ یہاں کی شاندار علمی روایت سے برصغیر کے طبی حلقے آج بھی منور ہیں۔

عراق سے جنگ میں اس شہر کو خاص طور پر نقصان پہنچا تھا مگر اب اس نقصان کی تلافی کر دی گئی ہے اور اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا ہے۔ ۲ بجے کے جہاز سے روانہ ہو کر ۳ بجے تہران واپس ہوئے۔ شام کو امام خمینی کا مکان دیکھا اور تہران کی سیر کی۔ تہران کی قابل دید جگہوں میں شاہی محل اور جواہرات کے میوزیم کے علاوہ وہاں کی دانش گاہیں اور کتاب خانے ہیں۔

کوہ البرز کے دامن میں واقع تہران جدید انداز کا نہایت صاف ستھرا شہر ہے۔ چوڑی کشادہ شاہراہیں، میدان، پارک، کاروں کی وہ بہتات ہے کہ وہ فضائی آلودگی کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ جن اہل علم سے ملاقاتیں رہیں ان میں ڈاکٹر محمود مہدوی رئیس مرکز مطالعات سیاسی بین المللی، یہ امام خمینی کے داماد بھی ہیں۔ برصغیر ہند و پاک کے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود نجم آبادی تاریخ طب کی گرامی منزلت شخصیت ہیں۔ تاریخ طب ایران اور مشاہیر الاطباء پر اپنے کاموں کی وجہ سے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ شاہ کے زمانے میں بھی انھیں اعتبار حاصل تھا اور آج بھی علمی لحاظ سے ایران کی برگزیدہ شخصیت سمجھے جاتے ہیں۔ میری ایک زمانے میں ان سے مراسلت رہی ہے۔ انھوں نے مجھے اپنی بعض تصانیف تحفہ میں ارسال کی تھیں۔ ۱۹۶۸ء میں الحکمت دہلی میں ان پر میں نے ایک تعارفی مضمون لکھا تھا۔ ڈاکٹر محمود رحمانی نے اپنی تالیف المعجم الاحصائی کا ایک نسخہ عنایت کیا۔ قرآن کریم کے الفاظ کی فہرست، جداول اور فرہنگ پران کا یہ بڑا تحقیقی اور قابل ستائش کام ہے اس میں قرآن کریم کے ہر لفظ کے بارے میں تفصیل دی گئی ہے کہ وہ کتنی مرتبہ کس سورۃ اور کس آیت میں آیا ہے۔ وہ سورہ مکی ہے یا مدنی اور یہ کہ اس لفظ کا مادہ کیا ہے۔

عزیز الدین عثمانی صاحب ہندوستان کے سفارت خانے میں فرسٹ سکریٹری ہیں۔ بہت سادہ، خلیق اور بامروت۔ لطف و محبت سے ملے اور طبیعت پر اثر چھوڑا۔ ہندوستان کے جن دوسرے حضرات سے ملنا ہوا ان میں غلام محمد صاحب سینٹرل لائبریری تہران یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ عبدالقادر ہاشمی صاحب، خلیل الرحمن صاحب، ان کی بیگم فوزیہ صدیقی یہ ریڈیو اسٹیشن میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ علی گڑھ کی پڑھی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر شیخ اسمٰعیل قادری صاحب میڈیکل آفیسر ہیں۔ انھوں نے مجھے بعض کتابیں عنایت کیں۔ پاکستان کے ڈاکٹر افتخار علی راجہ پروفیسر نیورو سرجری نشتر میڈیکل کالج ملتان، ڈاکٹر مسز وائیلن کینیا، ڈاکٹر عبدالنامر کعدان سیریا، ڈاکٹر غلام محمد کریم جنوبی افریقہ، ڈاکٹر صفدر حسین چڈھا نیویارک، ڈاکٹر مسز سٹویانکا کینڈیووا بلغاریہ، ڈاکٹر ایچ جوناس الدین انڈونیشیا سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ ڈاکٹر سامی خلف حمرنا سے ملاقات میرے لیے سب سے زیادہ مسرت کا باعث تھی۔ ان کے تاریخی مضامین اور

تصانیف کو میں قدر کی نگاہ سے پڑھتا رہا ہوں۔ وہ نامور طبی مورخ ہیں طب اسلامی کے تعارف میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں

ایران غالبًا وہ واحد ملک ہے جس کا ہر شہر اور قریہ ایک تابناک تاریخ رکھتا ہے۔ کوئی قریہ وہاں ایسا نہیں ہے جس کی خاک کا ذرہ شہرت کا آفتاب بن کر نہ چمکا ہو۔ کتابوں کا ذوق جیسے وراثت میں منتقل ہوا ہے۔ ہر پڑھے لکھے آدمی کے پاس کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہوتا ہے۔ کثرت سے لوگ کتابیں خریدتے ہیں اور کسی بھی نئی کتاب کا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل جاتا ہے۔ اسلامی انقلاب کے بعد پوری قوم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی سرکاری سطح پر بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے نتائج واضح طور پر نمایاں ہیں۔ حجاب پر بہت زور ہے مجھے کوئی خاتون بے حجاب نظر نہیں آئی۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی حجاب کی پابندی کرتی ہیں۔

ہندوستان میں اسلام براہ راست عرب سے نہیں آیا۔ یہاں اسلام ایران اور وسط ایشیا کی سلطنتوں کا رہین منت ہے اور اسلامیان ہند کا رشتہ بلاواسطہ ان سے قائم ہے۔ ان کے نفوذ کا سلسلہ ہندوستان میں ابتدائی مسلم عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ عہد سلطنت ہی سے معاشرتی آداب، تہذیبی اقدار، زبان اور علوم پر وسطِ ایشیا اور خصوصیت کے ساتھ ایرانی اثرات کا غلبہ رہا۔ فارسی زبان و ادب کی طرح تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کے سلسلے میں اسے سند و اعتبار کا درجہ حاصل ہوا اسلامی علوم میں طب یونانی کی ترقی میں بالخصوص ایرانی محققین کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ ایرانی اساتذہ اور مصنفین کی کتابیں آج بھی برصغیر کے طبی حلقوں میں مقبول و محترم ہیں۔ ایران سے اس تہذیبی و فنی نسبت کا اثر تھا کہ مجھے وہاں کے چپے چپے سے محبت و عقیدت اور ایسی ذہنی و فکری مناسبت محسوس ہوئی جو یورپ اور امریکہ کے کسی ملک کی سیاحت سے نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ اپنائیت کے اس شعور اور تعلق کے اس ادراک کے پیچھے کتنی ہی رشتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔

اس کانگریس کی وجہ سے یونانی اسلامی طب کے تعلق سے وہاں جس دلچسپی کا اظہار ہوا اور ایران اور بیرونی ممالک کے مندوبین نے یونانی طب کی اہمیت و افادیت اور ایک متبادل نظام طب کی حیثیت سے اس کی ضرورت پر جس طرح زور دیا اس سے ایک نفنا مثبتی نظر آئی ہے۔ ایران میں انشاء اللہ اس کانگریس کے دوررس اثرات برآمد ہوں گے اور جمہوری اسلامی ایران میں طب اسلامی کو سرکاری سطح پر تسلیم کیا جائے گا۔

" یہ سچ ہے کہ زمانہ کبھی یکساں نہیں رہتا۔ کبھی خوش نصیبوں کو بدنصیب کر دیتا ہے اور کبھی بدنصیبوں کو خوش نصیب۔
مگر ہر ایک تغیر و تبدّل کے آثار شروع ہو جاتے ہیں جس سے آئندہ کے نتیجے کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے "

سر سید رح

وسایل آرایش اور طبِ یونانی

نعیم احمد خاں٭

طب یونانی میں جہاں امراض و علاج کی تفصیلات ہیں وہیں اطباء قدیم نے ایسی دواؤں کی تفصیلات پیش کی ہیں جن کے داخلی اور خارجی استعمال سے جسم کے مختلف اعضاء کے حسن وجمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر انسان ایسی تمام طبی اور غیر طبی تدابیر اختیار کرتا ہے جس سے اس کی شخصیت میں جاذبیت اور کشش پیدا ہوجائے خصوصاً صنف نازک ہمیشہ سے ایسی تدابیر کی متلاشی رہی ہیں جو ان کے رنگ وروپ کو نکھار کر پرکشش اور جاذب نظر بنا سکے۔ خواہ اس میں مضرت کا پہلو ہی کیوں نہ ہو۔ دور حاضر میں مستعمل مصنوعی وسایل آرایش (Synthetic cosmetics) کے مستقل استعمال سے ان کے مضر اثرات پورے طور پر عیاں ہیں چنانچہ لوگ اب (Herbal cosmetic) کی طرف متوجہ ہیں۔ طب یونانی کے ذخیرہ میں ایسی تدابیر اور ادویہ موجود ہیں جو وسایل آرایش کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں اور ان میں مضرت کا پہلو بھی نہیں ہے۔

زمانۂ قدیم سے ہی لوگ ایسی اشیا اور ادویہ آرایش کی تلاش میں رہے ہیں جو ان کے حسن میں اضافے کا باعث بن سکے۔ چنانچہ ایک دوا "Atropa Belladonna" کا نام ایک لڑکی "Belladona" کے نام پر رکھ دیا گیا جس کو وہ اپنی آنکھوں میں استعمال کر کے محفل میں جاتی تھی جس سے اس کی پتلی پھیل جاتی تھی اور آنکھوں کی خوب صورتی اور کشش بڑھ جاتی تھی۔

انسانوں کی خوب صورتی کی جملہ اقسام کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلی قسم وہ ہے جو کہ حقیقی خوب صورتی کہلاتی ہے اور وہ بغیر کسی بناؤ سنگھار کے خوب صورت لگتا ہے۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو کہ مختلف تدابیر کے ذریعے اپنے جسم کو خوب صورت بنائے رکھتے ہیں جس کو ہم کسبی حسن کہتے ہیں۔ چنانچہ ایسی تمام ادویہ یا اشیاء جو کہ انسان کے جسم کو خوب صورت بنانے میں یا پھر خوب صورتی میں اضافے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ "وسایل آرایش" یا جدید اصطلاح میں cosmetics کہلاتے ہیں۔ اطبا نے بہت سے ایسے مرکبات اور ادویہ کا ذکر کیا ہے جو انھیں مقاصد کے لیے استعمال ہوتے تھے اور آج بھی رائج ہیں۔ جیسے غازہ، غالیہ، نورہ، صبغ، خضاب، مہندی، سرمہ، کاجل اور مسّی وغیرہ۔

افلاطون (۴۲۹ — ۳۴۶ ق م) کا خیال ہے کہ قدرت سے انسان کو دو بڑی نعمتیں حاصل ہوئی ہیں۔ ایک دانش مندی دوسرا حسن۔ دنیا کے معاملات میں شخصیت کا حسن وجمال اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چہرے کے خط وخال، آنکھ ناک کی موزونیت کو ہی حسن کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ بالوں کی اہمیت بھی اپنی جگہ

٭ ریڈر، شعبۂ علم الادویہ، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلم ہے۔ چنانچہ بعض چہرے بالوں کی خوب صورتی کی وجہ سے نہایت پرکشش اور اچھے لگتے ہیں۔

چہرے کے حسن اور خوب صورتی میں طبیعت کا بھی بڑا دخل ہے۔ کیونکہ چہرہ طبیعت (مزاج) کا آئینہ دار ہے جو ہمارے دلی خیالات کا عکس ہوتا ہے۔ چہرے کو خوشنما بنانے کے لیے غذائے لطیف کا استعمال پھلوں کی کثرت اور آلات ہضم کی بہتر حالت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

خوب صورتی میں جلد کی صفائی اور آراستگی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ چہرے پر دماغ کی حرکات کا بھی خاصا اثر ہوتا ہے۔ ذہنی تفکرات، کرب بے چینی، غم وغصہ خوشی اور مسرت نیز اضطرابی کیفیت کے اثرات کی عکاسی چہرے سے ہو جاتی ہے جیسے غم وغصہ کی حالت میں تمتمایا ہوا چہرہ ہوتا ہے تو خوشی کے لمحات میں چہرہ کھل جاتا ہے۔ اسی طرح ذہنی پریشانی کے نقوش بھی چہرے پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ تمام حرکات وسکنات جس سے دماغ متاثر ہوتا ہے۔ چہرہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا بلکہ اس کے اثرات جلد پر بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔

وسایل آرایش کا تاریخی پس منظر:

غازہ زمانۂ قدیم سے ہی استعمال میں رہا ہے۔ ہومر (نویں صدی قبل مسیح) چہرے کی صفائی کا ذکر کرتے ہوئے ایک عبارت "روغن مالیدہ رخسار" لکھا ہے۔ فارس میں چہرے پر رنگ کی مالش مرد بھی کیا کرتے تھے اور ان کے بادشاہ اشناجز نے اپنی آنکھوں پر رنگ کیا اور چہرے پر غازہ ملا تھا۔ سر پہ مصنوعی بال جمائے تھے۔ لندن کے اخبار "Family Doctor" کے مطابق قدیم مصر میں زیبائش کا رواج عروج پر تھا۔ خوشبو، عطر، سرخی اور سفید پاؤڈر رایج تھے کحل، سرمہ اور کاجل کا بھی رواج تھا۔ اہل فارس میں بھی مصنوعی طریقوں سے چہرے کی خوب صورتی کو بڑھانے کا طریقہ رایج تھا۔

زمانہ کی رفتار ترقی کے ساتھ وسایل آرایش کی طرف خصوصی توجہ رہی۔ بناؤ سنگار کی اشیا کا چلن بڑھتا گیا اور ہر روز نئی مصنوعات سامنے آنے لگیں لیکن ان کے استعمال کے بعد خراب اثرات کو دیکھتے ہوئے پھر ایک بار ان قدرتی اشیا کی طرف توجہ کی جارہی ہے جو رنگ روپ کو نکھارنے کے لیے ان روایتی طبوں Traditional System of Medicine میں موجود ہیں۔

اب یہاں کچھ ایسے مرکبات اور ادویہ کی تفصیل پیش ہے جو ان مقاصد کے لیے طب یونانی میں مستعمل ہیں۔

جلد کی خوب صورتی میں استعمال ہونے والے مرکبات

۱۔ گندھک مصفیٰ ایک چمچہ تھوڑا شہد ملاکر ہر صبح ایک ہفتہ تک چہرے پر لگائیں۔ پھر تین دن ناغہ دے کر پھر ایک ہفتہ استعمال کریں۔ حیرت انگیز اثر رکھتا ہے۔ چہرہ سرخ اور جلد صاف ستھری ہو کر نکھر آتی ہے۔

۲۔ بیرونی طور پر آب لیموں کاغذی، عرق گلاب، زعفران اور گلیسرین باہم ملاکر رکھ لیں اور چہرے پر مالش کر کے تولیہ سے چہرے کو خوب رگڑ کر صاف کریں۔ جلد کو تحریک ملتی ہے۔ چہرے کی رنگت صاف ہو جاتی ہے داغ دھبے ختم ہو جاتے ہیں۔ چہرے کی خشکی دور کر کے شگفتگی پیدا کرتا ہے۔

۳۔ روغن زیتون اور بالائی سرد کو ملاکر چہرے پر لیپ کریں۔ چہرے کے کھردرا پن نیز خشکی کو ختم کر کے جلد کو ملایم اور چمک دار بناتا ہے۔

۴۔ شیلرج کو سرکہ میں ڈال کر دو مرتبہ جوش دیں پھر چھان لیں۔ پھر اس میں ململ کو کئی مرتبہ بھگو دیں سکھا کر چہرے پر ملیں۔ چہرے پر نمایاں سرخی پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۔ زعفران، کندر، مصطگی ہموزن آب پیاز کے ساتھ ملاکر رکھ لیں اور تھوڑا سا گرم پانی ملاکر چہرے پر مالش کریں۔ پھر تین گھنٹے کے بعد چہرہ دھو ڈالیں۔ چہرے پر نمایاں سرخی ہوگی۔

۶۔ بالائی اور بیسن کو باہم ملا کر چہرے پر ملیں کریں۔ چہرے کو ملایم اور چمک دار بناتا ہے۔

۷۔ ستاور کو ایک شب پانی میں بھگوئیں، صبح کو اُبال کر اس پانی سے چہرہ پابندی سے دھوئیں۔ چہرے پر شگفتگی اور نکھار آجاتا ہے۔

۸۔ سنگترے کا چھلکا چہرے پر ملنے سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔

۹۔ آب انگور کو چہرے پر لگائیں اور اسے خشک ہوجانے دیں۔ پھر گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔ چہرے کی رنگت میں نکھار آجائے گا۔

۱۰۔ آردجو، آرد باقلہ، آرد گندم یا نشاستہ باہم ملا کر چہرے پر لیپ کریں۔ چہرے کی رنگت کی صفائی کے لیے مفید ہے۔

۱۱۔ آردجو، ہلدی اور ابلی ہوئی سرسوں کا ابٹن زمانۂ قدیم سے جلد کی صفائی کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔

۱۲۔ ہلدی اور صندل کا استعمال جنوبی ہند کی عورتیں اپنے چہرے کی صفائی کے لیے بکثرت کرتی ہیں۔

۱۳۔ آب کھیرا اور الکوحل ہم وزن ملا کر چہرے پر مالش کریں۔ چہرے کے رنگ کو نکھارنے کے لیے بے حد مفید ہے۔

ابٹن برائے کلف ونمش

۱۔ تخم ترب۔ تخم خربزہ۔ آرد باقلا (سرکہ میں بھگو کر خشک کیا ہوا)۔ مغز بادام مقشر، قسط شیریں، اکلیل الملک کتیرا۔ ہم وزن لے کر نہایت باریک پیس لیں اور دودھ میں ملا کر دن میں دو یا تین بار لگائیں۔

۲۔ آرد باقلا، پوست بیضۂ مرغ، مکی، بورۂ ارمنی، زراوند طویل، نشاستہ، برادۂ دندان فیل، آرد نخود۔ ہر ایک ۵ گرام بیخ سوسن، قسط تلخ، برادۂ قرن الایل ہر ایک ۱۰ گرام۔ مغز بادام تلخ ۲ گرام کوٹ کر سفوف بنائیں اور سرکہ میں ملا کر کلف ونمش پر لیپ کریں۔

۳۔ مغز بادام۔ بورہ ارمنی، تخم ترب ہم وزن کوٹ کر سفوف بنائیں اور لعاب حلبہ (میتھی) میں ملا کر لگائیں پھر گرم پانی سے دھوڈالیں۔

زیبائش حسن کے واسطے مصنوعی تل (وشم)

وشم مصنوعی تل کو کہتے ہیں۔ اس کا رواج بھی زمانۂ قدیم سے رہا۔ عورتیں اضافۂ حسن کے لیے رخسار یا ٹھوڑی کے نیچے مصنوعی تل بنالیتی ہیں۔

ابٹن یا ابٹنہ

۱۔ آردجو۔ آرد باقلا مقشر۔ آرد کرسنہ۔ آرد ترمس آرد نخود نشاستہ۔ آرد عدس ہر ایک ۵ گرام مغز تخم خربزہ ۱۰ گرام۔ کتیرا ۱۰ گرام باریک پیس کر پانی میں ملا کر استعمال کریں۔ یہ ابٹنہ چہرے اور جلد کی صفائی اور شگفتگی کے لیے مستعمل ہے۔

۲۔ آردجو۔ آرد برنج۔ مغز تخم خربزہ۔ حب البان قسط شیریں ہم وزن باریک پیس کر لعاب تخم السی میں گوندھ کر رات کو لگائیں اور بوقت صبح جوشاندہ گل بابونہ اور گل بنفشہ سے دھوئیں۔

رخسار کی صفائی اور نقش آبلہ کو دور کرنے کے لیے مجرب ہے۔

۳۔ آرد نخود۔ آرد عدس۔ برگ خارخسک، مغز بادام ہر ایک ۱۲ گرام۔ زعفران ۱۰ گرام باریک پیس کر پانی میں گوندھ کر چہرے پر لگائیں۔ چہرے کی رنگت کو نکھارنے کے لیے استعمال میں لائیں۔

۴۔ کھل سرسوں ۲۵۰ گرام۔ نوشادر، جو اکھار، سہاگہ ہر ایک ۵ گرام سب کو باریک پیس کر روغن تلخ سے چرب کریں اور بوقت ضرورت آب لیموں میں ملا کر چہرے پر لگائیں اور تھوڑی دیر بعد دھولیں۔ چہرے کی جھائیاں دور کرنے اور رنگ روپ کو نکھارنے

کے لیے استعمال کریں۔

۵۔ برادۂ صندل، چھڑیلہ، ناگرموتھا، کافور، لونگ، دانۂ الائچی کلاں، جاوتری، دارچینی ہر ایک ۱۲ گرام۔ پوست نارنج خشک ۲۵ گرام۔ آردجو ۵۰۰ گرام باریک پیس کر رکھ لیں اور بوقت ضرورت پانی میں گوندھ کر لگائیں۔ چہرے کی صفائی اور جسم کو خوشبودار بنانے کے لیے استعمال میں لائیں۔

۶۔ شہد خالص اور عرق لیموں باہم ملا کر چہرے پر سوتے وقت مالش کریں اور ۱۵ منٹ بعد دھو ڈالیں۔ چہرے پر کی خشکی اور جھرّی پڑنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ چہرے پر پڑی جھرّیاں کم ہو جاتی ہیں۔

صبغ:

ایسے مرکبات بھی وضع کیے گئے جو جلد کو رنگین کرنے کے کام میں آتے ہیں۔ اس کا استعمال وقتی طور پر جلد کو خوب صورت اور دلکش بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔

غالیہ:

وہ مرکبات جو اشیائے عطریہ سے تیار کر کے تمام جسم پر لگائے جاتے ہیں، غالیہ کہلاتے ہیں۔ یہ جلد کو نکھارتے ہیں اور خوشبودار بناتے ہیں۔

غازہ:

باریک خوشبودار سفوف جو چہرے کو خوبصورت بنانے کے لیے ہوتا ہے۔

خضاب:

ایسی سیال جس کے ذریعے بالوں کو سیاہ یا دوسرے رنگ میں تبدیل کر لیا جائے۔

مہندی:

بالوں کو سنہرا اور چمک دار بنانے کے لیے مستعمل ہے۔

"بڑے افسوس اور رنج کی بات ہے کہ ہندوستان کی قوموں میں صلح و اتفاق کا مادہ نہایت ہی کم ہے۔ ان کا ہر فعل ہے گویا ایک نفاق کا سامان ہے۔ ہر چند اس باب میں کوشش کی جاتی ہے کہ یہاں کے باشندے بھی محبت اور یک جہتی کے عادی ہوں اور صلح کا رنگ جمائیں مگر جب دیکھو ایک نیا سامان فساد کا پیدا ہوتا ہے اور اگر ایک حصہ اتفاق کی ترغیب دی جاتی ہے تو دس حصہ نااتفاقی کے سبب موجود ہوتے ہیں۔"

سر سید احمدؒ

مولانا امینی چند یادیں، چند باتیں

(مولانا کی دوسری برسی کے موقع پر)

خالدہ حسینی ▽

اتوار ۲۷ر جنوری ۱۹۹۱ء کی دوپہر تھی۔ حسب معمول ہم لوگ مطب سے اباجی (مولانا حکیم محمد زماں حسینی) کی آمد کے منتظر تھے۔ چھڑی کی کھٹ کھٹ اور السلام علیکم کی آواز نے ان کی آمد سے مطلع کیا۔ انھوں نے ہم لوگوں سے خیر وعافیت پوچھی اور مجھ سے مخاطب ہوئے ——— "بیٹا! مولانا امینی کا ۲۱ر جنوری کو انتقال ہوگیا۔ یہ خبر مجھے آج کے اخبار سے ملی ہے۔ اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے، اُن کی تین بچیاں باقی ہیں۔ جن کا ابھی کوئی انتظام نہیں ہوا" ——— اباجی بہت غمزدہ تھے۔

اس بری خبر نے مجھے بے جان کردیا۔ اُس دن کے معمولات اچانک ایک بھونچال میں گم ہوگئے۔ خیالات فضا میں پرواز کرنے لگے اور میں اس فضا کی خنکی میں غلطاں ہوگئی۔

مولانا تقی امینی دنیائے علم وادب میں محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ ایک درخشندہ آفتاب تھے جس نے ایک عالم کو زندگی اور معرفت بخشی تھی۔ یہ آفتاب ۲۱ر جنوری ۱۹۹۱ء بروز پیر کو غروب ہوگیا۔

میں اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد مولانا سے کئی سال تک صرف غائبانہ متعارف رہی۔ وہ یوں کہ ہمارے غریب خانے میں ایک چھوٹی سی لائبریری ہے جس میں بہت سے عظیم مصنفین کی تصانیف موجود ہیں جن سے علم کی پیاس بجھائی جاتی ہے۔ والد محترم کو جب کسی کتاب کی ضرورت پڑتی ہے تو اس لائبریری کی الماری سے نکال کر وہ کتاب دینے کا شرف مجھ ہی کو حاصل ہے۔ اس خدمت کے صلے میں والد محترم مجھے اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مصنف کی شخصیت و عظمت سے آگاہ فرماتے ہیں۔ مولانا تقی امینی کے نام اور کام سے میرا غائبانہ تعارف اسی وسیلے سے ہوا تھا۔

علی گڑھ میں تحصیلِ علم کے دوران خدا نے مولانا کی زیارت بھی کرادی۔ اسی زمانے میں مجھے اس کا علم ہوا کہ ان کی اہلیہ محترمہ کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے جس کی وجہ سے مولانا پریشان رہتے ہیں۔ خواہش ہوئی کہ کبھی ان کی مزاج پرسی کر آؤں۔ اسی بہانے مولانا کے اہل خانہ سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔

خدا نے یہ خواہش پوری کی۔ ایک دن میرے بھتیا (مولانا حکیم محمد عرفان حسینی) دودھ پور میں مولانا کے دولتکدہ پر لے گئے۔ اُن دنوں ان کے مکان کے ایک حصے کی تعمیر ہو رہی

▽ معرفت قاضی دواخانہ، ۔۔ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳

تھی۔ مولانا کی بڑی صاحبزادی سیدہ پڑوس میں تھیں۔ ہم لوگوں کی آمد کی خبر سن کر بھاگی ہوئی آئیں اور اپنے مکان کے دوسرے حصے میں لے گئیں۔ مولانا بھی تشریف فرما تھے۔ بے انتہا شفقت و محبت سے پیش آئے۔ ہم لوگوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ میں دل ہی دل میں کچھ پشیمان بھی ہو رہی تھی کہ ہم لوگ بے وقت آگئے اور خواہ مخواہ ان لوگوں کو زحمت میں ڈالا۔
سیدہ نے اپنی والدہ محترمہ سے ملاقات کرائی جو سبھوں سے الگ تھلگ بالکل خاموش ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں سلام کیا۔ وہ زور سے ہنسیں سیدہ نے کہا،

"یہ کلکتے سے آئی ہیں، آپ سے ملنے۔"

والدہ محترمہ مجھے صرف تکتی رہیں۔ زبان سے کچھ نہیں کہا مجھے ان پر بہت رحم آیا۔ سیدہ کو بھی ان کے سلسلے میں غمگین پایا۔ یہ تھی مولانا اور ان کے اہل خانہ سے میری پہلی ملاقات۔

اس کے بعد کالج میں سیدہ سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ سیدہ اس زمانے میں سادگی پسند، شگفتہ مزاج، حساس اور جذباتی نظر آتی تھیں۔ وہ مولانا کی اسم بامسمّیٰ صاحبزادی ہیں۔ ہم لوگ بہت جلد ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔ انھیں ہمارا پردیسی پن بہت کھلتا تھا۔ یہ ان کی شدید محبت تھی اور وہ اس کا اظہار بھی کیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی میرے لیے خاص طور سے کھانا پکاتیں اور ٹفن کیریر میں رکھ کر کالج کے لان میں لڑکیوں کے بیچ میری منتظر رہتیں۔ جب میں کالج کے گیٹ پر آتی تو مجھے دیکھتے ہی سبھوں کو چھوڑ کر میری طرف دوڑ پڑتیں،

"آج میں آپ کے لیے کھانا لے آئی ہوں،
آپ ضرور کھالیجیے۔"

اور وہیں لان کے ایک گوشے میں زبردستی مجھے کھلاتیں اور خود بھی میرے ساتھ کھاتیں۔

بھیا کے ساتھ ایک شام میں پھر مولانا کے گھر گئی۔ سیدہ اور ان کی بہنوں سے بھیا کا پردہ نہیں تھا۔ ان لوگوں سے خیر و عافیت کی باتیں ہوئیں اور بھیا مولانا کے ساتھ ان کے اسٹڈی روم میں بیٹھ گئے۔ سیدہ نے مجھ سے چائے کے لیے کہا۔ میرے منھ سے برجستہ نکلا "مجھے علی گڑھ کی چائے نہیں پینی ہے اس کے بجائے پانی پی لوں گی۔ معاف کرنا یہاں تو دودھ والی خوشبودار چائے آپ کو ترسے ہے!" وہ ہنسیں اور کہا۔ "یہ بالکل صحیح ہے لیکن آپ کو میں دودھ والی اور خوشبودار چائے ہی پلاؤں گی۔ میرے ابا (مولانا امینی) بھی اسی طرح کی چائے پیتے ہیں، ان کے لیے میں الگ چائے بناتی ہوں۔" ان کی یقین دہانی کے باوجود بھی مجھے یقین نہیں تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک پیالی چائے میرے لیے لے آئیں۔ اس کی شکل و صورت دیکھتے ہی کشش پیدا ہوئی۔ میں نے ایک چسکی لی تو آنکھیں روشن ہوگئیں۔ واقعی بہت عمدہ اور خوش ذائقہ چائے تھی میری خوشی دیکھ کر انھیں بھی بہت خوشی ہوئی۔ میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اس پہلی چائے سے ان کو مجھ پر فتح یابی حاصل ہوگئی۔
اس کے بعد اسی عنوان سے مجھے کھینچ تان کر اور اپنے خفا ہوجانے کی دھمکی دے کر وہ وقتاً فوقتاً اپنے گھر لے جاتیں اور اپنے ہاتھوں سے وہی خاص چائے بنا کر پلاتیں اور یہ سوال بھی کرتیں۔ "علی گڑھ کی لگ رہی ہے یا کلکتے کی؟"

اس آمد و رفت کا یہ فائدہ ہوا کہ میں نے مولانا اور ان کے اہل خانہ کو بہت قریب سے دیکھا۔ مولانا اپنی بچیوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو ماں اور باپ دونوں کی شفقت و محبت سے نوازتے تھے اور ان کے حسین مستقبل کی تمنائیں اور آرزوئیں ان کے دل میں شام و سحر کروٹیں لیتی رہتی تھیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے میں اور سیدہ دونوں باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی تھیں، مولانا اپنے ریڈنگ روم میں تھے، وہاں سے انھوں نے پکارا ——— "سیدی!" سیدہ ان کے پاس گئیں۔ سرگوشی میں انھوں نے کچھ فرمایا۔ وہ سرگوشی بھی عجیب و غریب تھی کیونکہ ان کی آواز میں کرختگی ہونے کی وجہ سے صاف سنائی دے رہی تھی۔ سیدہ واپس آئیں۔ میرے قریب آکر کہنے لگیں، "ابا نے وہی کہنے کے لیے بلایا تھا جو کالج میں میں نے آپ کو بتایا ہے۔ کہہ رہے تھے ——"تمہارا رشتہ بہت اچھی جگہ لگا ہے۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ میں اپنے ملنے والوں سے کہتا ہوں تو وہ بھی اس کی تاکید کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر ہنسنے لگیں۔ ان دنوں مولانا محفوظ الرحمن نامیؔ کے تیسرے صاحب زادے تقی الرحمن صاحب سے سیدہ کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ مولانا محفوظ الرحمنؒ کے یہ صاحبزادے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی۔ یو۔ ایم۔ ایس کی تعلیم مکمل کر رہے تھے اور اب تو ماشاء اللہ علی گڑھ ہی میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ بالآخر مولانا کی خواہش کے مطابق سیدہ کی شادی انھیں سے ہوئی۔

عارفہ مولانا کی سنجھلی صاحبزادی ہیں۔ مجھے بہت ہی شوخ اور حاضر جواب لگیں۔ علی گیرین لب و لہجہ ان پر غالب ہے عارفہ کے سلسلے میں مولانا کا ایک بہت ہی دلچسپ اور پدرانہ محبت سے لبریز جملہ مجھے اکثر یاد آتا ہے اور جب بھی یاد آتا ہے تو ہنسی آتی ہے۔ بیچارے صحن میں کھڑے ہو کر کہتے تھے ——"ارے عرفی! چند روٹیاں ڈال دے میں تجھے چار آنے پیسے دوں گا۔"

مولانا کی اہلیہ محترمہ کی دماغی حالت کا ذکر آچکا ہے میں نے انھیں ہمیشہ گھر میں چکر لگاتے ہوئے دیکھا۔ غرارہ جمپر اور دوپٹہ ان کا خاص لباس ہے۔ ویسے ایک دو بار شلوار جمپر میں بھی انھیں دیکھا۔ غرارے کے پائنچے ہر کرے اور صحن کو بہارتے رہتے۔ بیچاری کیا کرتیں؟ ان کی دماغی حالت ایسی رہتی ہی نہیں تھی کہ انھیں اپنے کپڑوں کا ہوش رہتا۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز، بہت تیز رفتاری کے ساتھ ٹہلنے میں مشغول رہتیں۔ پان سے بہت شوق رکھتی تھیں۔ دالان میں ایک طرف چارپائی بچھی رہتی تھی، اسی پر ایک کونے میں پاندان رکھا رہتا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر چارپائی پر بیٹھ جاتیں اور خود ہی پان بنا کر کھاتیں۔ کبھی تمباکو کی مقدار بڑھ جانے کی وجہ سے اسی چارپائی پر قے ہو جاتی۔ سیدہ فوراً اس کی صفائی کر دیتی تھیں۔

قابلِ قدر اور احترام کی بات یہ ہے کہ مولانا کی طبیعت میں نفاست پسندی تھی لیکن میں نے مولانا کو دیکھا کہ اسی چارپائی پر دسترخوان بچھاتے، ایک طرف اپنی اہلیہ محترمہ کو بٹھاتے دوسری طرف خود تشریف رکھتے اور اپنے ساتھ انھیں کھلاتے تھے۔ یہ منظر اس وقت بھی میرے دل پر نقش ہے۔ موصوف اہلیہ محترمہ کی دواؤں پر بھی خاص توجہ فرماتے اور اس سلسلے میں اپنی بچیوں کو باقاعدگی سے یاد دہانی کراتے تھے۔

مجھے اپنی تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ کا سفر سال میں دو تین بار کرنا پڑتا تھا۔ ایک سفر اپنی بڑی بھابی جان (اہلیہ محترمہ مولانا حکیم محمد عرفان حسینی) اور اپنے بھتیجے ریحان کے ساتھ بھی ہوا۔ اس وقت سیدہ کی شادی ہو چکی تھی لیکن مولانا کے ساتھ تھیں۔ ہم لوگ اسٹیشن سے براہ راست مولانا کے دولت خانے پر گئے۔ سیدہ اور بھابی جان کا رشتہ نند بھاوج کا تھا۔ اس مناسبت سے انھیں وہیں قیام کرنا تھا صبح کو میں اپنی قیام گاہ پر جانے لگی تو بھابی جان نے یہ کہہ کر روک لیا کہ تم ہم سے الگ کہاں رہو گی، اس دفعہ میں جتنے دن یہاں رہوں تم ہمارے ساتھ رہنا۔ یہ ان کی محبت تھی جس کا مجھے احترام کرنا تھا۔ بھیا نے بھی اس مسئلے پر صاد کیا اور خود لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ میں رک تو گئی لیکن میرا ذہن منتشر منتشر سا تھا۔

مولانا رشتے ناطے کی نزاکتوں سے بے نیاز رہتے چنانچہ

موقعوں سے گفتگو کے دوران کبھی کبھی اُن کا لہجہ درشت ہو جاتا تھا، جس سے اُن کے مزاج کی سختی ظاہر ہوتی تھی۔ اپنی اِس بشری کمزوری کا احساس مولانا کو خود ہو جاتا تھا اور وہ اس کی تلافی اپنے حسنِ اخلاق سے کر ڈالتے تھے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ مولانا کے دولت خانے پر ہمارے قیام کے دوران ہماری بھابی جان کی والدہ محترمہ اور بڑے بھائی ولی الرحمٰن نامی، جو بے انتہا منکسر المزاج اور خوش طبع انسان ہیں ہم لوگوں سے ملنے لکھنؤ سے تشریف لائے۔ دوسرے دن ہی موصوف اور میرے بھیّا بہ سلسلۂ کاروبار لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ واپسی فجر کے وقت ہوئی۔ غنودگی کے عالم میں بھی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مولانا نماز کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ بھیّا رسمیات سے کوسوں دور اور اپنائیت کو گلے لگائے ہوئے سادہ مزاج انسان ہیں۔ دونوں بھائی صحن سے گزر کر سامنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہاں صرف بھابی جان اور ان کی والدہ محترمہ تھیں۔ اچانک مولانا کی کرخت آواز فضا میں گونج اٹھی ــــ

"ارے یہ لوگ بغیر آواز دیئے اندر گھس پڑے"۔ ان کی زبان سے اور بھی چند الفاظ نکلے۔ خدا مغفرت کرے میں حیران و پریشان تھی کہ مولانا کو کیا ہو گیا۔ بھائیوں کی کوئی آواز نہیں آئی۔ میں بے جان سی ہو کر بستر پر لیٹ گئی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی۔ جب گھڑی میں سات بجے تو کسی طرح اٹھ کر کالج جانے کی تیاری میں لگ گئی۔ بھابی جان اور والدہ محترمہ کو بہت غمگین پایا۔ دونوں کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ خاموش بیٹھی تھیں۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"آپ لوگ اس قدر غمگین کیوں ہیں ؟"

بھابی جان نے واقعے کی پوری روداد سنائی اور کہا، بھیّا وغیرہ بہت خاموش اور سکتے کے عالم میں بیٹھے رہے، پھر چلے گئے۔ تمہیں کالج بھیجنے کے لیے آتے ہوں گے۔

بہرکیف مولانا بھیّا کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ بھیّا کے ساتھ کالج سے واپس آئی تو دیکھا کہ مولانا کے چہرے پر کوئی ناگواری نہیں تھی۔ حسبِ معمول بھیّا اور مولانا صوفے پر بیٹھے اور شیر و شکر ہو کر گفتگو میں محو ہو گئے۔

اس طرح کا ایک اور واقعہ والد محترم کے ساتھ پیش آیا۔ اس کا علم مجھے اُن کے بعض ذاتی خطوط سے ہوا ہے۔ والد محترم اپنے خطوط کبھی وقتاً فوقتاً مجھے پڑھنے کے لیے دیتے ہیں۔ جن خطوط سے مجھے دلچسپی ہوتی ہے، میں انھیں اجازت لے کر رکھ لیتی ہوں۔ انہی میں سے مولانا کے بھی دو خطوط ہیں۔ ایک خط ۶ر جولائی ۸۶ء کا ہے، جس کے حرف حرف سے ان کی سخت برہمی نمایاں ہے۔ قصہ یہ تھا کہ انھیں ندوۃ المصنفین کے بعض دفتری معاملات کی وجہ سے ایک موقع پر ذہنی تکلیف پہنچ گئی تھی، جس کی وجہ سے مولانا بہت دلگیر تھے اور ناخوشی کی حالت میں میرے والد محترم کو ایک طویل ذاتی خط لکھا، جس میں والد محترم کو کچھ پند و موعظت کی تھی۔ اس خط سے اباجی بہت غمگین ہوئے مگر اس کے بعد ہی مولانا کا ایک دوسرا خط آیا جو ۲۰ر رمضان المبارک (۱۰ر جولائی ۸۶ء) کا ہے۔ یعنی اس خط کے چار دن کے بعد

"تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصے تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اس وقت مسدود ہوتی ہے جب کہ اس قوم میں سے وہ قوت اٹھ جاتی ہے، جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔"

سرسیداحمدؒ

ہی کا لکھا ہوا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جلد ہی مولانا کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا اور اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ مولانا میرے والد محترم سے کس طرح کا تعلق رکھتے تھے۔ اس خط سے ان کی رحم دلی اور نرمیٔ مزاج کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ خط مختصر ہے۔ اس لیے نقل کر رہی ہوں:

"مخلصم ومکرم زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ،

عرصہ سے خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ شبِ قدر میں آپ خاص طور سے یاد آئے۔ خیریت کی دریافت کے لیے یہ عریضہ روانہ ہے۔ براہِ کرم لوالبی خیریت سے (اپنی اور بچوں کی) مطلع فرمائیں۔ عثمان میاں سلمہ کو دعائیں۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

والسلام
محمد تقی امینی

۲۷ رمضان المبارک

مولانا کے مزاج کی نرمی اور گرمی کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے یہی محسوس کیا ہے کہ گرمی وقتی تھی اور نرمی ہمیشہ کی۔ اگر نرمی نہ ہوتی تو اُن کی ذاتِ بابرکات سے ایک عالم کو فیض نہ پہنچتا۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات کے یا تمہارے والدین اور تمہارے رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیرخواہ ہے۔ اور اپنے خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔"

سورۃ النساء

مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی رح

محمد صہیب صدیقی ▽

سرزمینِ ہند ازل ہی سے ناموران علم وفضل، بزرگانِ دین ومشائخ طریقت کا گہوارہ رہی ہے۔ سرزمینِ ہند کی مادرِ گیتی سے ایسے ایسے فضلاء اور علماء پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کے علمی کارناموں، تحقیقی کاوشوں کو دیکھ کر عصرِ حاضر کے لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور ان شخصیات کی بلند ہمتی پر آفریں کہتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ایسے ہی افراد قوم وملت کی تاریخ بناتے ہیں اور تاریخ کے وسیع کینوس پر اپنے زندہ وتابندہ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ تاریخ ان کا ذکر اقوام وملل کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کرتی ہے کہ آؤ دیکھو میرے دامن میں کیسے کیسے لعل وگہر اور آبدار موتی ہیں جن کا کوئی مثیل نہیں اور جن کی ضیاپاشیوں سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔

مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم کی شخصیت بھی ان ہی بلند پایہ عالی ہمت اور بلند مقام شخصیات میں شمار ہوتی ہے جو اپنے زورِ قلم سے قوم وملت کی تاریخ رقم کرتے ہیں اور جن کے لیے تاریخ اپنی وسیع آغوش و دامن کو وا کر دیتی ہے اور ان کے علمی کارناموں کو اپنے سینے میں جگہ دے کر ان کو زندہ و تابندہ بنا دیتی ہے۔

انیسویں صدی کا زمانہ ہندوستان کی علمی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن اور تابناک باب ہے۔ اسی زمانے میں مادرِ ہند کی آغوش میں ایسے ایسے پھول کھلے جن کی عطر بیزیوں سے ایک زمانہ مستفید ہوتا رہا۔ زبان وادب کے افق پر ایسے ایسے روشن ستارے چمکے کہ ان پر کہکشانِ علم وادب کا گمان ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں آسمانِ علم وادب بلند پایہ شعرا وادبا سے جگمگا اٹھا۔ تحقیق وتاریخ کا خزاں رسیدہ چمن ایک بار پھر لہلہا اٹھا اور اس کی سنگلاخ وادی ایک مرتبہ پھر ان بلند ہمت اشخاص کی آماجگاہ اور رہ گزر بن گئی۔ زہد وتقویٰ کی پُرسکون سطح میں تموج پیدا ہوا اور سرزمینِ ہند کے گوشے گوشے میں زہد وتقویٰ، تصوف وسلوک اور آخرت طلبی کا بازار گرم ہوگیا اور مشائخ طریقت وبزرگانِ دین کے فیوض وبرکات کا خشک سرچشمہ ایک مرتبہ پھر جاری وساری ہوگیا۔ مغرب کے سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے جا بجا دینی و تعلیمی تحریکوں کا غلغلہ بلند ہوا جس نے جلد ہی ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اسی زرخیز عہد میں مولانا سید عبدالحئی نے ایک عالی مقام خاندان میں اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے خاندان کے نامور ومشہور بزرگوں کی آغوش میں پروان چڑھے اور جلد ہی دنیا کے سامنے ایک مثالی عالم و مصنف ایک مصلح دین کی شکل میں جلوہ گر ہوئے۔ مولانا سید

▽ ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، اے ایم یو۔ علی گڑھ۔

عبدالحئی کی شخصیت متنوع اور کثیرالجہت ہے۔ وہ بیک وقت عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں اپنے قلم کے رشحات بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں نزہۃ الخواطر اور گلِ رعنا جیسی تصانیف منصۂ شہود پر نظر آتی ہیں اور کبھی تاریخ و تحقیق کی پُرخار و سنگلاخ وادی میں خوشہ چینیوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے رواں قلم سے الہند فی العہد الاسلامی، الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند اور یادِ ایام جیسی لازوال کتابیں وجود میں آتی ہیں۔ کبھی وہ ندوۃ العلما کے دفتری امور میں مصروف نظر آتے ہیں تو کہیں ندوۃ العلماء کے بلند پایہ ناظم کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ کبھی ایک طبیب حاذق کی صورت میں نظر آتے ہیں تو کبھی ایک شفیق باپ اور مربیٔ خاندان کی صورت میں کبھی قوم و ملت کی ناچاقیوں پر آنسو بہاتے ہیں تو کبھی قوم و ملت کی اصلاح اور اس کی سربلندی کے سرگرداں و پریشان اور کبھی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مشغول نظر آتے ہیں۔

اُن کی شخصیت کا سب سے زیادہ متاثر کرنے والا پہلو اُن کی مستقل مزاجی بلند ہمتی اور تصنیف و تالیف میں ہمہ وقت مصروفیت ہے۔ اُن کی سیرت نگاری کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف دنیا میں تصنیف و تالیف کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہ کوئی مبالغہ یا مدح سرائی نہیں ہے بلکہ روزِ روشن کی طرح عیاں اور ایک حقیقت ہے جس پر اُن کی بلند پایہ تصانیف دال ہیں اور اس دعوے کی دلیل ان کے وہ علمی کارنامے ہیں جو انھوں نے تنِ تنہا بے سروسامانی اور رسل و رسائل کی عدم فراہمی کے باوجود انجام دیئے جن کی تکمیل اور انجام دہی سے عصرِ حاضر کی اکیڈمیاں بھی قاصر نظر آتی ہیں۔

"الٰہی تو اپنے بندوں مسلمانوں کو توفیقِ نیک دے اور ان کے دل کی آنکھوں کو روشن کر تاکہ وہ موجودہ حالت کو دیکھیں اور آئندہ کی حالت کو سمجھیں۔ سچ ہے

تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

(اے خدا! تو جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کردے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

محمد سعید"

شمارہ
۲

THE
MOHAMMEDAN
SOCIAL REFORMER
تهذیب الاخلاق

جلد
۱۲

فروری ۹۳ء

زر سالانہ :

انڈیا	...	RS. 45·00
بیرونی ممالک	...	US $ 20.00 ہوائی ڈاک
		US $ 8·00 عام ڈاک

بانی :
سر سید احمد خاںؒ

سرپرست :
پروفیسر محمد نسیم فاروقی
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر :
کبیر احمد جائسی

نائب مدیر :
احمد مجتبیٰ قریشی

انچارج سرکولیشن :
شفیق احمد

تزئین : سرفراز

ترسیل زر کا پتہ :
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,
TAHZIBUL AKHLAQ &
NISHANT,
ALIGARH MUSLIM
UNIVERSITY,
ALIGARH. 202002

PHONE : 24627

مندرجات

YOUR SUBSCRIPTION
VALID UPTO Dec-92 دسمبر
PLEASE RENEW IT

مالک۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔ پریس۔ اے ایم یو پریس۔ علی گڑھ

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

اداریہ

جس طوفان کا خدشہ مدتوں سے تھا وہ چھ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اپنی تمام سنگینیوں کے ساتھ آیا اور وہ سب کچھ اڑا لے گیا جس سے ایک زندہ انسانی معاشرہ عبارت ہے۔ ابھی اس طوفان کی شدت میں کچھ بھی نہ آئی تھی کہ ہندوستان گیر خونی سیلاب کی آفت نازل ہوگئی اور جو تھوڑا بہت بچا کھچا اثاثہ تھا وہ اس خونی سیلاب کی نذر ہوگیا۔ طوفان تھم چکا ہے، بظاہر ہر معمول کے مطابق چل رہا ہے۔ سیلاب، جیسے کم آب بن کر سمٹ چکا ہے مگر ہر طرف تباہی و بربادی کا منظر نظر کے سامنے ہے۔ جلی ہوئی عمارتیں، کٹی پھٹی لاشیں، بلکتے بچے، سہمی ہوئی بوڑھیاں، زخم خوردہ جوان و نوجوان، چوڑیوں اور افشاں سے محروم لڑکیاں سب ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی "انسانیت کے علم بردار" کا سکتے کے عالم میں منہ تک رہی ہیں مگر "انسانیت کے علمبردار" ہیں کہ زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے نمک پاشی میں مصروف ہیں —

ممکن ہے وقت زخموں کو بھر دے، کراہوں کا علاج کر دے، جلے ہوئے مکانات، لوٹی ہوئی دکانیں دوبارہ بن جائیں۔ اتنا مال و متاع مل جائے کہ لٹے ہوئے مال و اسباب کا غم باقی نہ رہے مگر جو اعتماد ٹوٹا ہے، قدروں پر سے جو یقین اٹھا ہے، دماغوں اور دلوں میں جو وسیع خلیج پیدا ہوئی ہے کیا وقت اور زمانے کی تیز رفتاری اس کا مداوا کر سکے گی، اس میں شبہ ہی شبہ ہے۔

ہنگامی حالات میں انتہائی صبر و ضبط اور ہوش مندی کا جو مظاہرہ انتظامیہ اور امن و قانون بحال رکھنے والے اداروں کے افراد کو کرنا چاہیے تھا، اس میں یکسر ناکامی ہوئی ہے اور دو معیاروں کو سامنے رکھ کر حالات پر قابو پانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک معیار تو یہ اپنایا گیا ہے کہ جب ایک غیر قانونی بھیڑ غیر قانونی حرکت کر کے دیکھتے دیکھتے چار سو پینسٹھ سال کی ایک قدیم عبادت گاہ کو ڈھا دیتی ہے تو امن و قانون بحال رکھنے والے اداروں کے افراد سر بہ درگلو ہو کر اپنی اپنی جگہوں پر پتھر کے مجسمے بن جاتے ہیں۔ جو افراد ببانگ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ کام ہم نے کیا ہے، عبادت گاہ ہم نے ڈھائی ہے ان کے دامن سے امن و قانون بحال رکھنے والے اداروں کے افراد کے کالروں تک نہیں پہنچتے اور تمام شری اور فسادی لوگ آج بھی دندناتے گھوم رہے ہیں۔ جن افراد نے ہندوستان کے آئین اور عدلیہ کی توہین کی ہے اور اس کے پرزے پرزے اڑا کر رکھ دیے ہیں ان پر نہ تو بغاوت کا مقدمہ

چلتا ہے اور نہ ہی ان کی زبان بندی ہوتی ہے۔ دوسرا "معیار" یہ ہے کہ جو لوگ اپنی عبادت گاہ کے شہید کیے جانے پر اپنے غم و غصّہ کا اظہار کرتے ہیں، جمہوری طریقے سے احتجاج کرتے ہیں، اپنی آواز، بہرے اربابِ اقتدار کے کانوں تک پہنچانے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں ان کا استقبال گولیوں سے کیا جاتا ہے اور نشانہ اس طرح لیا جاتا ہے کہ ساری گولیاں ناف سے اوپر کے حصّے میں لگیں۔ قومی اخبارات بالخصوص انگریزی اخبارات نے بربریت کی جو اطلاع بہم پہنچائی ہے، اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جس فرقے کی عبادت گاہ شہید کی گئی اس کو بلوائیوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا ہے جتنا کہ امن و قانون بحال رکھنے والے اداروں کے افراد سے پہنچا ہے نیشنل پریس کی اطلاعات کے مطابق حالیہ خونی ہنگاموں میں جتنی جانیں ضایع ہوئی ہیں اُن میں پچانوے فیصد جانیں اس فرقے کے لوگوں کی ہیں جن کی عبادت گاہ شہید کی گئی ہے اور ان پچانوے فی صد موتوں میں سے صرف پانچ فی صد موتیں بلوائیوں کے ہاتھوں ہوئی ہیں بقیہ نوے فی صد موتیں اُن کے ہاتھوں ہوئی ہیں جو امن و قانون بحال رکھنے کے ذمّہ دار قرار دیے جاتے ہیں۔ شانِ منصفی اسی کو کہتے ہیں کہ دو لاکھ کی غیر قانونی بھیڑ کو خراش تک نہ آئے اور سڑکوں پر احتجاج کرتے یا گھروں میں بیٹھے لوگ موت کے گھاٹ اُتار دیے جائیں اور ان کے پس ماندگان کو یہ کہہ کر معاوضہ بھی نہ دیا جائے کہ یہ تو "فسادی" تھے "سرکاری گولی" سے مرے ہیں۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس فرقہ کو جس کی عبادت گاہ شہید کی گئی ہے ان لوگوں سے شکایت نہ ہونی چاہیے جن کے ہاتھوں سے یہ کام عمل پذیر ہوا۔ وہ تو برسوں سے اپنے ارادوں کا اظہار بہ بانگ دہل کر رہے تھے، ہر ہر گاؤں سے اینٹ لا رہے تھے، رتھ یاترا نکال رہے تھے "دھرم سمیلن" کر کے اپنے عزائم کا اظہار کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے تو وہی کیا جو وہ کہتے اور بہ بانگ دہل کہتے تھے۔ شکایت تو اُن لوگوں سے ہونی چاہیے جو ہندوستان کے آئین، عدلیہ اور انتظامیہ کے محافظ ہیں۔ جن کے اشارۂ چشم و ابرو سے حکومتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں جن کے ایک اعلان سے برسوں کا کیا ہوا معاہدہ آنِ واحد میں کالعدم قرار پاتا ہے وہ جو کچھ کہتے تھے، جو یقین دہانیاں کراتے تھے، جن باتوں کا انہوں نے وعدہ کر رکھا تھا اُن کا انہوں نے کوئی پاس لحاظ نہیں کیا اور بانس کی بلّی کے نیچے مدھم سی آگ جلا کر کھچڑی پکاتے رہے کہ مریض کو اس طرح بچا لیں گے، کھچڑی تو نہ پک پائی مگر مریض ضرور ملکِ عدم کو سدھار گیا۔ آئین، عدلیہ اور انتظامیہ کے محافظوں نے وہی کچھ کیا جس کو ایک مزاحیہ شاعر نے اِن الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

عدو سے پٹوایا خوب پہلے اور اب گلے مل کے رو رہے ہیں
ستم کی بھی انتہا نہیں ہے کرم کی بھی انتہا نہیں ہے

اب یہ ہماری دانشمندی پر منحصر ہے کہ "ہم پٹوانے والوں" کو اپنے گلے لگنے دیں یا نہ لگنے دیں۔

سرسید نے فرمایا

”غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شیکسپیر نے جو کہ مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ میں اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔“

ایودھیا کے بعد کیا؟

سید حامد

۶ر دسمبر کو جو قیامت برپا ہوئی اس نے ہندوستان کو ہلا ڈالا اور مسلمانوں کے سکون، ان کی سلامتی اور ان کے حقوق کو تہس نہس کر دیا۔ مسلمانوں کو اپنی اوقات معلوم ہو گئی۔ وہ سوچنے لگے کیا اپنے وطن میں ہم عزت کے ساتھ رہ سکیں گے۔ کیا یہاں ہم آزادی کا سانس لے سکیں گے۔ کیا ہمیں عبادت کی اجازت ہوگی۔ کیا ہمارے مذہب، ثقافت اور روایات بالآخر محفوظ رہ سکیں گی یا جس طرح ان کی مسجد منہدم کی گئی ہے اسی طرح وہ سب کچھ جو انھیں عزیز ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں مسمار کر دیا جائے گا۔ کیا تعداد کو قانون پر بالادستی حاصل ہو گئی ہے؟ کیا اکثریت کو یہ اختیار ہے کہ وہ اقلیت کو روندتی چلی جائے۔ آئین کو بالائے طاق رکھے، قانون کی دھجیاں بکھیر دے، عدالتوں کی حکم عدولی برملا اور علی الاعلان کرے۔ کیا ہندوستان کے ہر باشندے کو ہندویت (ہندتو) کے آگے سربسجود ہونا پڑے گا؟ کیا اس ملک میں حکومت جمہوری نہیں ہے، اکثریت کی ہے اور اقلیتیں اکثریت کی رعایا ہیں اور ان کے رحم و کرم پر یہاں زندگی گزار رہی ہیں۔ کیا رواداری کی پرمپرا ایک سراب ہے، کیا سیکولرزم کا ڈھونگ ایک فریب ہے۔ کیا ہندوستان ایک دھارمک ریاست ہے جہاں ہندو دھرم کو فضیلت حاصل ہے اور باقی سب دھرم ریاست کے دھرم کے تابع فرمان ہیں۔ کیا مساوات کے یہ سارے دعوے باطل ہیں؟ کیا جمہوریت کا ایوان دھوکے کی ٹٹی ہے؟

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

بابری مسجد کیا شہید ہوئی، مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے، پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جگن ناتھ آزاد کہنے لگے "ہم آپ کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے"۔ مسلمان سرنگوں ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب سر اٹھا کر کیسے چلیں گے۔ وہ خدا کے گھر کی حفاظت نہ کر سکے، وہ نامراد اب کس لیے جئیں گے۔ ان کے سینے کھوکھلے ہو گئے ہیں۔ جن سے رہا نہیں گیا وہ کفن باندھ کر سڑکوں پر آگئے، اور نہ معلوم کتنوں نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ جن میں نکلنے کا یارانہ تھا۔ وہ گڑھ رہے ہیں سلگ رہے ہیں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ مسجد کو روئیں کہ شہیدوں کو (شہید دونوں ہی ہوئے)۔

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

لوگ کہیں گے کہ مسلمان تنہا نہیں ہیں وہ بے یار و مددگار نہیں ہیں، ان کے ہم وطن ان کے ساتھ ہیں۔ یہ شکست مسلمانوں کی،

سابق وائس چانسلر، اے ایم یو۔ علی گڑھ۔ —— بلاک اے، ہمدرد نگر، نزد تغلق آباد، نئی دہلی۔

نکے مذہب کی شکست نہیں ہے۔ یہ شکست اعلا انسانی قدروں
کی شکست ہے، جمہوریت اور سیکولرزم اور مساوات اور انصاف
کی شکست ہے۔ بی جے پی، وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس
ہندوستان پر کوئی اجارہ نہیں۔ سیاسی پارٹیوں کو دیکھیے تو
بھاجپا کے علاوہ ساری پارٹیاں کھل کے آتیا چار سے تلملا اٹھی ہیں،
مظلوم اقلیت کا ساتھ دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ انھیں فکر ہے کہیں
ہندوستان جمہوری اور سیکولر قدروں کو ترک نہ کر دے۔ یہاں
ہر بلندہ کا بول بالا نہ ہو جائے، یہاں مذہبی ریاست وجود میں
آجائے۔ زخم خوردہ مسلمان جو خاک چاٹ رہے ہیں یہ تسلیم کرتے
ہیں کہ بھاجپا کو چھوڑ کر سارا ہندوستان ان کا ہمدرد اور غم گسار
ہے اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ لیکن وہ ایک بات بھول رہے ہیں
بھاجپا کے پاس "کارڈ" ہے، منصوبہ ہے، پروگرام ہے اور یہ
منصوبہ ہے کہ سارے ہندوستان کو ہندو رنگ میں رنگ دیا
جائے اور جو یہ رنگ قبول کرنے سے انکار کرے اُسے نکال باہر
کیا جائے۔ اب یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آر ایس ایس اور بی جے
پی کا اثر شہروں تک محدود ہے اور دیہات انتہا پسندی کے
زہر سے پاک ہیں۔ یہ زہر تو ہندوستان بھر میں پھیل گیا ہے، ایک
بڑی کثیر تعداد کی رگِ جاں میں پیوست ہو گیا ہے۔ اکثریت کے
بیشتر افراد چاہے وہ شہر میں رہتے ہوں چاہے دیہات میں،
وہی سوچتے ہیں جو بھاجپا چاہتی ہے۔ یاتراؤں نے اور رسا دھو لیلا
پورے ملک کی فضا کو مسموم کر دیا ہے۔ راجستھان اور
جنوبی ہند کی ریاستیں فرقہ پرستی سے پاک تھیں۔ آر ایس ایس
کی کوششوں کی بدولت اکثریتی فرقہ پرستی کا چلن وہاں بھی ہو گیا
ہے۔ دوسری سیاسی پارٹیوں نے جہاں تک تنظیم، توسیع اور
تبلیغ کا تعلق ہے بھاجپا کو ایک عرصہ سے واک اوور دے رکھا ہے
مسلمانوں کو دوسری پارٹیوں کے مثبت ردِّ عمل کی پذیرائی ضرور
کرنا چاہیے لیکن ایک پل کے لیے بھی یہ سوچنا مہلک ہو گا کہ یہ پارٹیاں
مل کر بھی بی جے پی کا مقابلہ کر سکتی ہیں یا یہ آڑے وقت میں
مسلمانوں کا دفاع یا ان کی دستگیری کے لیے کمر کس پائیں گی۔

بی جے پی کو ہندوؤں کی اکثریت زبان سے یا دل سے اپنا ترجمان
مانتی ہے۔ ساری پارٹیاں سالوں سے یہ دیکھ رہی تھیں کہ بھاجپا
اور اس کی ہم رنگ جماعتیں روشنی کو پسپا اور ذہنوں کو مسموم کر رہی
ہیں۔ شاکھاؤں، یاتراؤں، تحریروں، تقریروں اور کیسٹوں کے ذریعے
مسلمان بھی یہ دیکھ رہے تھے لیکن نہ ان سیاسی پارٹیوں نے، نہ خود
مسلمانوں نے ہندو انتہا پسندی کی روک تھام کا کوئی سر و سامان
کیا۔ زہر بھرے پروپیگنڈے اور نفرت بھرے دروغ کا جواب
دینے، اس کا ازالہ کرنے کی کوئی کوشش بھی کسی نے نہیں کی جمہوریت
آزادیِ رائے، سیکولرزم، رواداری اور احترامِ عقاید و مذاہب
کے خلاف ہندو عوام کی عدالت میں فیصلہ یک طرفہ کر دیا گیا۔
بنی نوعِ انسان نے جب سے اینٹیں ایجاد کیں اور شہر بسائے
اینٹیں آبادی کے ہی کام آتی رہیں۔ بربادی کے کام کبھی نہیں
آئیں۔ لیکن وشو ہندو پریشد اور بھاجپا نے اینٹوں کے طریق
استعمال کو بالکل اُلٹ دیا۔ شیلانیاس یعنی بظاہر رام مندر
کے تعمیر کے لیے ہندوستان بھر سے پوجی ہوئی اینٹوں کو ایودھیا
میں جمع کیا گیا۔ یہ ساری تیاریاں بابری مسجد کی اینٹ سے
اینٹ بجانے اور اسے منہدم کرنے کے لیے تھیں۔

صفائی کے طور پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ "یہ سب کچھ بی جے
پی کے ارادوں اور منصوبے کے خلاف اچانک عمل میں آگیا
دیکھیے کلیان سنگھ نے فوراً استعفیٰ دے دیا اور بی جے پی
کے سب سے بڑے رہنما شری اڈوانی ایوان میں حزبِ مخالف
کی لیڈری سے مستعفی ہو گئے۔" سوچیے ان دکھاوٹی استعفوں
کی اہمیت ہی کیا ہے۔ یہ تو کام کو انجام دینے کے بعد کمر کھول
دینے کا سا انداز ہے۔ ابھی رات گئے دور درشن میں اس مسئلے
پر گفتگو کے دوران ڈاکٹر مہیپ سنگھ نے ہندی کے ایک ممتاز
مصنف اور ممبر ہیں پینل کے ایک دوسرے رکن سے کہا کہ
"پچھتاوے اور پشیمانی کی حکایت کو زیادہ نہ بڑھائیے۔ اگر یہ
صاحبان واقعی پشیماں ہیں تو انھیں اجتماعی طور پر اس کا اظہار
کرنا چاہیے اور مسلمانوں سے معافی مانگنی چاہیے۔ آپریشن بلیو اسٹار

کے بعد اگر سکھوں سے معافی مانگ لی جاتی تو پنجاب کی کیفیت آج بالکل مختلف ہوتی۔ بھاجپا کی منفصل قیادت مسجد کو اسی جگہ پر بنانے کی ذمہ داری کیوں نہیں لیتی۔" ڈاکٹر مہیپ سنگھ کی بات سے یہ اندازہ لگائیے کہ ہندوستان میں اقلیتیں خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہیں، باوجود اس کے کہ یہ گوتم بدھ اور گاندھی کا ملک ہے اور اہنسا پیار کی پرمپرا ہے۔ ہندوؤں کو اور اربابِ اقتدار کو ٹھنڈے دل کے ساتھ اس صورتِ حالات پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ اپنی پیٹھ ہم ہندوستانی ایک عرصے سے ٹھونکتے چلے آئے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے گریبان میں منہ ڈالنے اور دل کو ٹٹولنے کا۔ رواداری کی روایت کا ذکر کر کے (جو اب متروک ہو چکی ہے) ہم خود کو دھوکا دے سکتے ہیں دوسروں کو مطمئن نہیں کر سکتے ان کی نگاہ میں تو یہ زخموں پر نمک پاشی کا عمل ہے۔

ہندوؤں کی انتہا پسند جماعتوں کے بعد اس شرمناک حادثے اس راکشسی فعل کی ذمہ داری سرکار پر جاتی ہے۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالیے۔ جو شخص فیصلہ نہ کر سکے، جو وعدوں پر ٹالتا رہے، کیا سماج میں اس کی کوئی ساکھ بن پاتی ہے؟ لوگ اُسے ڈھلمل یقین، کمزور اور بے ریڑھیا سمجھتے ہیں۔ خواہ ایسا شخص کتنا ہی عالم فاضل ودّوان ہو کوئی اُسے گردانتا ہی نہیں، نہ کسی اجتماعی کام میں لے شریک کرتا ہے۔ جب افراد کا یہ حال ہو تو کیا ایسی حکومت کی ذرہ برابر بھی ساکھ ہو گی جو ٹال مٹول کرتی رہے۔ فیصلے سے جی چرائے اور یہ سوچا کرے کہ وقت خود مسائل کو حل کر دے گا۔ ایودھیا کے سلسلے میں ہماری حکومت نے یہی کیا۔ شخصی اور اجتماعی مذاکرات کا جال بچھا دیا گیا۔ گویا مذاکرات سے لوگ تھک جائیں گے تو اپنے موقف میں نرمی لے آئیں گے یا اسے سرے سے ترک ہی کر دیں گے۔ اس طرح یہ سمسیا حل ہو جائے گی۔ ہمارے اربابِ اختیار کو یہ چھوٹی سی بات بھی نہیں معلوم کہ حکومتیں محکم فیصلوں اور جرأت مندانہ اقدامات اور دلیر قیادت سے چلا کرتی ہیں التوا اور معاملات کو کھٹائی میں ڈالنے سے نہیں چلتیں۔ ہندوستان جیسا عظیم اور وسیع اور گوناگوں اور پیچیدہ ملک تقاضا کرتا ہے۔ ایک برّاق ذہن اور ایک جرأت مند دل اور ایک پیش رفت آمادہ نقطۂ نظر کا۔ گھوڑا اسوار کو پہچانتا ہے۔ بھاجپا نے اندازہ لگایا تھا کہ سوار میں کتنا دم ہے۔ اس کے گھٹنوں میں کتنی گرفت ہے۔ چنانچہ اولین فرصت میں اس نے اسے دے پٹخا اور اس کے ماتھے پر ناتوانی اور بے عملی کا کلنک لگا دیا۔

ہمارے اکابرین اور دانش ور مشورہ دینے کے لیے جاتے تھے اور حکمتِ عملی کے قصیدے پڑھ کر چلے آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی تک ہم بادشاہوں اور مہاراجاؤں کے دور میں ہیں اور اس ملک کو جمہوریت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ فرد کابینہ کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں بھی لوگ صدر کا رخ دیکھتے ہیں۔ برملا اختلافِ رائے کی جہاں بغاوت سے تعبیر کی جاتی ہو وہاں مسئلے کے بیشتر رخ ڈھکے چھپے رہتے ہیں۔ ان پر سے پردہ اٹھانا جسارتِ بیجا ہے اور اس کا مرتکب گردن زدنی۔ عافیت اسی میں ہے کہ اپنی رائے کو سربراہ کی رائے کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرو۔ وہ بھی خوش تم بھی خوش۔

ایودھیا کانڈ پر جو بیانات نکلے ان میں سب سے درد بھرا بیان صدرِ جمہوریہ کا تھا۔ سارے اختلاف اور سیاسی مصالح سے بالاتر۔ لگتا تھا کہ دل پر چوٹ لگی ہے۔ ہر لفظ میں درد کی کراہ تھی۔ اتفاق ہے کہ دوسرا قابلِ ذکر و احترام بیان نائب صدر کا تھا جو انھوں نے راجیہ سبھا میں دیا۔ انھوں نے کہا کہ

"آزادی کے بعد ملک میں دو بڑے سانحے ہوئے
ایک گاندھی جی کی شہادت، دوسرا بابری مسجد کا شہید
ہونا۔"

گاندھی جی کی شہادت نے نفرت اور ظلمت کی امڈتی ہوئی قوت کو شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا تھا۔ کیا بابری مسجد کی شہادت کا بھی کچھ ایسا ہی اثر ہوگا؟ رجائیت کہتی ہے ہاں۔ قنوطیت کہتی ہے نہیں۔ سوال یہ ہے کہ پشیمانی پوری قوم کو ہے یا چند لیڈروں اور دانش وروں کو۔ فتح اور خوشی کے جشن کئی جگہ منائے گئے قیاس یہ کہتا ہے کہ جن شہروں میں ردِّ عمل نے ہنسا کی شکل اختیار

کی وہاں اس کا نقطۂ آغاز فاتحانہ طنز رہا ہوگا لیکن قیاس بھی کیوں کیا جائے۔ یہ بات کم دکھ کی نہیں کہ ایک دن کے اندر مختلف شہروں میں کم سے کم دو سو انسان خاک و خون میں تڑپتے نظر آرہے ہیں۔ ان کے گھروں میں ماتم کی صفیں بچھی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ خاندانوں کے سربراہ تھے یا ان کے چشم و چراغ۔ ان کے گھر اُجڑ گئے، بے چراغ ہو گئے۔ نفرت اور عداوت کا جو بیج بھاجپا، وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس نے بویا تھا اُس کی فصل ہم سب کاٹ رہے ہیں اور نہ جانے کب تک کاٹتے رہیں گے۔

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ ابھی دور درشن نے بتایا کہ حکومت نے جفا سے توبہ کرلی اور اہم فیصلے کرلیے۔ مسجد اُسی جگہ پر پھر بنائی جائے گی، مجرموں کو سزا ملے گی۔ فرقہ پرست پارٹیوں پر قدغن لگے گی۔ مندر کی تعمیر کے بارے میں فیصلہ جلد کیا جائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ نفاذ کتنی جلد اور کس طرح ہوتا ہے۔

یہ تو سب تمہید ہی تمہید تھی۔ بات جو کہنے کی تھی وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اس بڑے سانحے سے عبرت کے تازیانے کا کام لیں۔ اس موقع پر بلکہ گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے ان کی قیادت نے ہوش و گوش اور صبر و ضبط سے کام لیا ہے لیکن کچھ رنگ کے اب بھی نہیں دکھایا۔ جب تک کہ وہ شہر شہر جا کر مسلمانوں کو نظم و نسق کا سبق نہیں دیتی۔ انھیں یہ نہیں سمجھاتی کہ اچانک مشتعل ہوجانے سے کام نہیں چلتا، نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ ہمیں تعمیر اور تنظیم ہی کے لیے خود کو وقف کردینا چاہیے۔ تعلیم کی طرف سے جو غفلت ہم نے برتی ہے وہ ہمیں بہت مہنگی پڑی ہے۔ جب تک کہ ہماری قیادت مسلمانوں کو یہ نہیں سمجھاتی کہ ان کی بقا بہ یک وقت مقابلہ اور تعاون خود نگہداری اور خوش ہمسایگی میں ہے وہ اپنے فرض کو انجام نہیں دے گی۔ ہمیں ہندوستان کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز کرنا ہے۔ شکوے شکایت بہت ہوچکے۔ شکوہ کوئی سنتا نہیں۔ ہمیں بقائے باہم کے انداز سیکھنے چاہیں اور یہ بات منوانی چاہیے کہ ملک کی پیش رفت اور فلاح میں ہم بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ ہندوستان کی چھاتی پر ہم بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتے ہم اس کے دست و بازو ہیں۔ ہم سے ہندوستان کی طاقت ہے ہندوستان کے لیے ہم سرمایۂ بصیرت ہیں۔ ہندوستان ہم سے وسعت نظر اخذ کرتا ہے۔ اس کی اقدار کو ہم نے استوار کیا ہے۔ ہماری نگاہ ملک کے ماضی پر نہیں، اس کے مستقبل پر ہے۔ ہم ترقی کی شاہراہ پر اہلِ وطن کے ساتھ شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں۔ یہاں کی خوش حالی اور خوش اندیشی میں ہمارا حصہ ہے"! یہ ساری باتیں جب تک ہم عمل سے ثابت نہ کردیں اور اہلِ وطن سے اپنے بارے میں منوا نہ لیں، چین سے نہ بیٹھیں۔

ہمیں اپنے اہلِ وطن کے ساتھ بیٹھ کر بہت سی باتوں کی وضاحت بہت سے شبہات کا ازالہ کرنا چاہیے۔ ہم اکثریت سے کیا چاہتے ہیں۔ وہ ہم سے کیا توقع رکھتی ہے۔ ہماری خواہش اور اس کی توقع کس طرح پوری ہوگی، اس کی تکمیل کے لیے عملی اقدامات کیا ہوں گے۔ روزمرہ کے جھگڑوں کو چھوڑ کر اب ہمیں دوسروں کے ساتھ مل کر ایک روشن مستقبل کی تشکیل کرنی چاہیے۔ خود ہمارے اندر کیا کمیاں، کیا کمزوریاں اور وطن اور اہلِ وطن کے تئیں کیا بے مہریاں ہیں۔ ہمیں ان کا احتساب کرنا ہوگا، انھیں تسلیم کرنا ہوگا تاکہ ہم اپنے نقطۂ نظر اور رویے کو نئے خوابوں اور نئے مشترک عزائم کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ ایودھیا کے بہت بڑے سانحے نے ملک کو ہلا ڈالا ہے۔ یہ ہمارے ہوش و گوش پر منحصر ہے کہ ہم اس زبردست تخریب سے ایک بڑی تعمیر کا سر و سامان کرسکیں۔ پہلا قدم تو یہی ہوگا مل کر بیٹھنا، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا، اس کی رعایت کرنا باہمی داد و ستد سے ایک قابلِ عمل رابطہ، رشتہ اور ہم کاری کو بڑھانا۔ ہمیں اپنی سمت نظر میں انقلاب آفریں تبدیلی کرنی چاہیے۔ مسلمان بچوں کو نئے ڈھنگ سے اُٹھانا چاہیے۔ انھیں مذہب، انسانیت اور وطن دوستی اور مسئولیت کے سبق پڑھانے چاہیں، ہزار جتن کرکے انھیں جہالت سے چھٹکارا دلانا سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ جمہوریت کی بنیاد انصاف پر رکھی جاتی ہے ہم سب کو ساری نفلی اور قانونی موشگافیوں سے اوپر اُٹھ کر اپنی صورت حالات، اپنی کیفیت پر نظرثانی کرنی چاہیے۔ کیا ہم گزشتہ ۴۵ سال کی مدت میں ایک منصفانہ اور مساوات پر مبنی سماج کو وجود میں لا سکے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا ہمارے یہاں اونچی ذاتوں کا تسلط ہنوز قایم ہے؟ کیا آئین کا منشا اور حکومت کی بہت سی فلاحی اسکیمیں ملازمین حکومت کی بے مہری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کیا اس کا کوئی علاج نہیں؟ کیا وہ خلیج جو سرکار کے قول و فعل کے درمیان خندۂ دنداں نما بنی ہوئی ہے اسی طرح چوڑی ہوتی چلی جائے گی۔ کیا یہ بات قرین قیاس ہے کہ ترقی یافتوں اور پسماندوں کو مقابلے کے میدان میں ایک ساتھ کھڑا کر دیا جائے تاکہ اول الذکر کی حرکت تسلسل اور ان کی پیش آغازی انھیں پسماندوں سے اور زیادہ آگے کر دے۔ کیا یہ سب کچھ کر کے ملک کا ضمیر مطمئن ہو سکتا ہے کہ مقابلے کی آزادی اور روزگار کے مواقع ہر ہندوستانی شہری کی دسترس میں ہیں؟ ایسا مقابلہ انصاف پر نہیں، انصاف دشمنی پر مبنی ہے۔ نابرابروں کے درمیان مقابلہ کیسا؟ منڈل کمیشن کی سفارشات منظور کی گئیں تاکہ پسماندوں کے لیے کچھ تلافیٔ مافات ہو سکے تو ایک ہنگامہ اور توڑ پھوڑ کا ایک دشمن بپا ہو گیا۔ مسلمان پیچھے رہ گئے ہیں۔ اپنے ملک کے انتظام میں ان کا عمل دخل برائے نام ہے۔ پسپائی کی رفتار زور پکڑ رہی ہے انھیں میعاد بستہ ریزرویشن دینے ہوں گے تاکہ ترقی کی دوڑ میں وہ بھی حصہ لے سکیں۔ اس حادثے کے بعد اگر عادلانہ سماج قایم نہ ہوا اور اقلیتوں اور کمزوروں کی دستگیری نہ کی گئی تو عداوت، نفرت اور نفاق اسی طرح بنے رہیں گے بلکہ زور پکڑتے رہیں گے یاد رکھیے اگر قوم، نظام اور انتظامیہ کے انصاف پر کسی ایک فرقے یا جماعت کو بھی اعتماد نہ ہوا تو فتنہ و فساد برابر سر اُٹھاتے رہیں گے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انصاف کے بغیر کسی نظام کو ثبات نہیں ہوتی۔ انصاف کرنا اور اسے ثابت بھی کرنا حکومت اور معاشرے دونوں کا فرض ہے۔ ساری جماعتوں کو مل بیٹھ کر طے کرنا چاہیے کہ انصاف کو صدا میں کس طرح ڈھالا جائے گا۔ ہزاروں سال اور آزادی کے بعد کی ناانصافیوں کو دور کیوں کر کیا جائے گا۔ اکثریت اپنے میں جذب ہونے، اپنے گرد طواف کرنے اور دوسروں کے جذبات اور ضروریات کو نظر انداز کرنے کے بجائے اقلیتوں کی تالیف قلب کس طرح کرے گی؟

تعلیم کا نصاب کسی قوم کی تشکیل اور اس کے نقطۂ نظر اور سمتِ سفر کے تعین میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُسے نفرت اور تنگ نظری اور بے بصری سے پاک ہو جانا چاہیے اسے اس طرح ڈھالا جائے کہ اعلا اخلاقی اقدار بچپن سے طلبا کے ذہن نشین ہو جائیں اور وہ عالمگیر انسانیت کے مفادات و مصالح، عزایم اور منصوبوں سے روشناس ہو جائیں۔

ان سب امور کو نئی روشنی میں دیکھنا ہو گا ورنہ عداوت کا سارا کاروبار ہمارے پانو کی بیڑی بن جائے گا اور نصاب اور گھروں اور جلسوں اور اخباروں کے صفحوں میں بوئے ہوئے نفرت اور دشمنی کے بیج تباہی کے برگ و بار لائیں گے۔

یہ مضمون کل مکمل نہیں ہو پایا۔ آج یعنی ۸ر دسمبر(۹۲ء) کی خبروں نے امید کی اس مشعل کو بجھا دیا جو تخریب کی راکھ سے تعمیر کو اُٹھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں نے مندروں کو جلانا شروع کر دیا اور ہندوؤں پر حملے بھی ہونے لگے۔ لندن میں ایک مندر کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اب یہ آگ برصغیر کے تینوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ شری اڈوانی، شری جوشی اور شری سنگھل بھی آج گرفتار کر لیے گئے۔ پوچھے گئے سوال کا جواب شری اڈوانی نے جس انداز سے دیا اس میں پشیمانی شمہ بھر بھی نہ تھی بلکہ سرکشی کے تیور نمایاں تھے۔ انھوں نے ساری خرابی کا ذمہ دار سرکار کو ٹھہرایا۔

سرکار نے کل جو فیصلے کیے تھے شاید وہ انھیں عمل میں نہ لا سکے۔ مسجد کی تعمیر تو اب دشوار نظر آتی ہے۔ آج کی خبر یہ ہے کہ کارسیوکوں نے میدان کارزار چھوڑنے سے پہلے مسجد کی جگہ چبوترہ بنا کر اس پر مورتی استھاپت کر دی تھی۔ پیرا ملٹری فورسز کے بعض جوانوں نے اس چبوترے کو ستمان دیا اور مورتی کی پوجا کی۔ اب مورتی کو وہاں سے کون ہٹائے گا؟

لوگ پوچھ رہے ہیں کہ کارسیوکوں کو اس کام کی مہلت دی ہی کیوں گئی۔ انھیں مرکزی حکومت کی نیت پر شبہ ہے۔ انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اربابِ اختیار کی کمزوری اور فیصلہ کرنے میں تاخیر اور کوتاہی ہے۔ ہماری تردد پیشہ اور تاخیر پیکر مرکزی حکومت ابھی یہ سوچ رہی ہے کہ مسجد کس ادارے کے ذریعے بنوائی جائے۔ جب تک وہ کسی فیصلے کو پہنچے گی ملک میں ایک بڑی مہم بھاجپا اور وشو ہندو پریشد مسجد کی تعمیر کے خلاف شروع کر دیں گی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بابری مسجد کے شہید ہونے کا جو ردِ عمل ہوا اور مندروں کی جس طرح بے حرمتی کی گئی یا بے حرمتی کی کوشش ہوئی اور کئی مندر نذرِ آتش کیے گئے، اس نے معاملے کو اور الجھا دیا ہے اور اس وقت عام بدگمانی اور باہمی عداوت کے ماحول میں اس گتھی کو سلجھانا ممکن نظر نہیں آتا۔

اس مضمون میں مسلم قیادت کے ہوش و گوش کی تعریف کی گئی تھی کہ اس نے عوام کو ضبط کی تلقین کی۔ اب ایسا لگتا ہے کہ عوام تک یا تو یہ پیغام پہنچا ہی نہیں، یا وہ تنگ آ کر جنگ پر آمادہ ہو گئے ہیں، اور اب وہ اپنے رہنماؤں کی بات نہیں سنیں گے۔ یہ بات پُرخطر ہے۔ اچھا ہوتا اگر مسلم رہنما دور درشن اور آکاش وانی پر مسلم عوام سے مخاطب ہوئے ہوتے اور انھیں ضبط کی تاکید کرتے۔ یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلم رہنما عوام سے کٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اور عوام کے درمیان وہ زندہ رابطہ ہے ہی نہیں جو خدمت اور خیر اندیشی اور فلاحی اور ارتقائی کاموں کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ رابطہ قائم نہ ہوا تو پھر عوام انتشار سے دوچار رہیں گے۔ تنظیم کے کام میں تاخیر بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حالات اب کیا کروٹ لیں گے۔ ایسے میں منظم، متحد اور باخبر اور منسلک رہنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

آگ ٹھنڈی جب ہی ہو گی جب انتقام کے "چکر" کو توڑا جائے۔ ہمارے مسلم رہنماؤں کو پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرنی چاہیے کہ "خدارا، اس بنا پر کہ ہندوستان میں بابری مسجد شہید کر دی گئی ہے، اپنے یہاں نہ مندروں کو نقصان پہنچایئے نہ ایسے بے گناہ ہندو شہریوں پر حملہ کیجیے۔ ان معصوم انسانوں کا کیا قصور ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ اس طرح بدلہ لیں گے تو ہندوستان میں اس وقت جو ہمدردی مظلوم مسلمانوں کے ساتھ عام طور پر پیدا ہوئی ہے اسے عداوت میں بدلتے دیر نہیں لگے گی۔ اپنے ملک کے ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کیجیے۔" اگر بی بی سی نیوز سروس سے درخواست کی جائے تو شاید وہ خوشی سے ہمارے دو ایک معروف مسلم رہنماؤں کو پاکستان اور بنگلہ دیش اور انگلستان کے مسلمانوں سے خطاب کرنے کا موقع دے دے۔

اس مضمون کے آخر میں راقم سطور اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرے گا۔ اس نے آج سے تقریباً سال بھر پہلے تک مسلم قیادت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "بھاجپا کے رہنماؤں کے ساتھ بات کریں اور ان سے پوچھیں کہ وہ مسلمانوں سے چاہتے کیا ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح مفاہمت کے باب وا ہو جائیں۔" اسے اب پتہ چلا ہے کہ اس کا مشورہ خوش فہمی پر مبنی اور غلط تھا۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے دور درشن پر اہلِ ہند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بی جے پی اور وشو ہندو پریشد نے ملک کو دھوکا دیا ہے، اس کے ساتھ عہد شکنی کی ہے۔ جو جماعت اپنے قول سے پھر جائے جس کے نزدیک حصولِ مقصد کے لیے ہر طرح کے ذرائع کا استعمال کرنا جائز ہو، جو نہ اپنے پیمان کا پاس کرے نہ عدالت کے احکام کی تعمیل۔ بظاہر اس سے بات کر کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ فسطائی طریقِ کار کی ایک نشانی ہے۔ فسطائی طاقتیں جمہوری روایات اور اخلاقی اقدار کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ وہ کبھی اپنے مقصد کی راہ میں ایک پل کے لیے بھی حایل نہیں ہونے دیتیں۔ بھاجپا نے طے کر لیا ہے کہ وہ ہندوستان میں ہندو راج استھاپت کرے گی۔ ایسا کرنے کے لیے وہ کہیں رُکے گی نہیں۔ انصاف کے تقاضے اور جمہوریت کے

آداب اس کے سدِ راہ نہیں بن پائیں گے۔ جس پارٹی کا سیاسی فلسفہ کدورت، عداوت اور تنگ نظری سے پھوٹتا ہو، وہ رواداری اور انصاف کی بات سنے گی ہی کیوں؟ لیکن راقم پھر بھی اتنا کہے گا کہ موقع پڑے تو اس سے گفتگو ضرور کی جا سکتی ہے۔ اس کے عہد و پیمان پر اعتبار کیے بغیر۔ ممکن ہے کہ خود اس کے مصالح اسے کسی وقت ہماری بات پر غور کرنے کے لیے مجبور کریں۔ حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں۔ لائحہ عمل اور نقطۂ نظر ابھی مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ضرورت ہے حزم و احتیاط اور نظم و ضبط کی، عوام سے روابط استوار کرنے کی، انھیں اشتعال کے خلاف آگاہ کرنے کی، انھیں خاموشی، سنجیدگی اور صلح کوشی کے ساتھ اپنی اپنی بستیوں میں دفاع کے لیے تیاری کی۔ اتنا ہی اہم ہے سیکولر اور انصاف پسند سیاسی پارٹیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے قدرتی یاور اور ہمدرد ساری اقلیتیں، درج فہرست ذاتیں، قبیلے اور دوسرے پسماندہ اور کمزور طبقات ہیں۔ ان کے ساتھ عہد وفا باندھنا چاہیے۔ الغرض ہمارے رہنماؤں کو نئے پس منظر میں ان سارے مسایل پر غور کرنا اور مسلمانوں کی حفاظت کرنا ان کے استحکام اور فلاح و ترقی کی کوشش کرنا ہوگا۔

بہر حال مسلمانوں کو ضعیفی کے جرم اور بدنظمی کے گناہ کی سزا مل گئی۔ وہ ملنا ہی تھی اور غافل رہیں وہ اپنے مفادات اور مصالح سے اور جھگڑتے رہیں وہ اسی طرح بے مصرف اور نا اہم باتوں پر، اور بے خبر رہیں وہ بدخواہوں کی چالوں اور ارادوں سے۔

مسلمانوں کے خیرخواہ ان کی تالیفِ قلب کے لیے اور ارباب اختیار کھسیانا پن مٹانے اور عالمی رسوائی کے داغ کو دھونے کے لیے اعلان کر رہے ہیں کہ بابری مسجد نئے سرے سے تعمیر کرائی جائے گی۔ یہ کوئی بھی نہیں بتاتا کہاں اور کب اور کس وضع پر۔ تعمیر نو کا مفہوم تو یہ ہوا کہ جس جگہ اسے توڑا گیا ٹھیک وہیں بنائی جائے گی۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا مرکزی حکومت کی کچھ اچھال نے اس جگہ جو چبوترہ بنوا دیا اور جو مورتی وہاں رکھوا دی۔ کیا اس کا ارادہ ایک کو تڑوانے اور دوسری کو ہٹوانے کا ہے۔ کیا اس بے ریڑھ حکومت میں اتنا دم ہے کہ وہ ایسا کر سکے۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ سرکار کے پھیپھڑوں میں آکسیجن بھر دی گئی اور اس نے یہ فیصلہ کر بھی لیا تو بھی کیا اس طرح ملک گیر فتنہ و فساد کا ایک نیا دروازہ نہ کھل جائے گا؟ کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے بھی سنائی دیے کہ انہدام کے اثرات کو مٹانے کے لیے اور سابقہ کیفیت کو بحال کرنے کے لیے مسجد اسی جگہ پر بنے گی اور جب وہ بن جائے گی تو اس میں مورتی اسی طرح سے رکھ دی جائے گی جیسے وہ انہدام سے پہلے رکھی ہوئی تھی۔ سبحان اللہ! قیامت رفتہ کو آواز دینے کی اس سے انوکھی مثال عمل درکنار، تخیل کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ مسلمان ایک بل سے کتنی بار ڈسا جائے گا۔ اگر ایسا کیا گیا تو بھارت اس طویل اور الم ناک جھگڑے کا ری پلے دیکھے گا جس کی نمائش کی ذمے دار ایک بار پھر بھارت سرکار ہوگی۔ تکنیکی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو "ری پلے" میں کیا مضایقہ ہے۔ ریہرسل تو پہلے ہی (۵ دسمبر کو قریب ہی ایک جگہ پر) کار سیوکوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کیا تھا اور بھارت سرکار کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ لوگ اب بھی اس کی سلامتی ہوش و حواس کی بات کرتے ہیں حکومت کی ایوان ایک ستون باقی ہے اور یہاں یہ ستون سرے سے غائب۔

ایک تجویز یہ بھی سننے میں آ رہی ہے کہ مسجد قریب ہی کسی دوسری جگہ بنا دی جائے۔ نمک پاشی کی یہ نئی ترکیب نکالی گئی۔ کیا اس پرانی تجویز کو مسلمان اب اس لیے قبول کر لیں گے کہ اس اثنا میں وہ خاک و خون اور دھواں و آتش سے گزر چکے ہیں:

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا   کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

ہمدردوں اور بے دردوں سے مسلمان یہی کہیں گے کہ خدارا اب ان کے زخموں کو نہ کریدیں، مسجد بنانا چاہیں بنائیں، نہ بنانا چاہیں نہ بنائیں۔ بنانا چاہیں تو جس جگہ بنانا چاہیں بنا ڈالیں بمسلمان بھرپائے انھیں اب اس قضیہ میں نہ الجھائیں۔ ان کے زخموں کو نہ کریدیں۔ ہماری جمہوریت میں اقلیت ہونا سب سے بڑا پاپ ہے۔ اس پاپ کی سزا انھیں کب تک دی جائے گی، سزا کی بھی تو کوئی میعاد ہوتی ہے۔ جس عداوت اور نفرت کے چہرے سے نقاب اس تزک و احتشام کے ساتھ اٹھا دی گئی اب وہ سات پردوں کے پیچھے چلی جائے تو بھی نگاہوں کو دھوکا نہ دے سکے گی۔ وہ کروڑوں کدورت پیشہ دل جنھیں گھٹا ٹوپ اندھیروں نے گھیر لیا ہے روشنی کی کرنوں کو آئندہ برداشت کیسے کر سکیں گے۔ بابری مسجد کی شہادت سے مظلوموں کے دل ٹوٹ گئے۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ کیونکہ دل زندہ پر ہی حوصلہ اور اعتماد کا انحصار ہوتا ہے۔ ہمارے آنسو رک بھی جاتے۔ جہاں دل ٹوٹے ہیں وہاں آنکھیں کھل جاتیں، وہ دوست اور دشمن، عارضی اور دائمی، حقیقی اور سیاسی میں فرق کرنے لگتے۔

آپ نے دیکھا جہاں ایک کے علاوہ ساری سیاسی پارٹیاں مسجد کی حفاظت کے حق میں تھیں اور زیادہ تر اہلِ علم و دانش ان کے ہم نوا تھے۔ وہاں پھر بھی مسجد محفوظ نہ رہ سکی۔ اس سے نتیجہ کیا نکلا۔ یہ پارٹیاں اور یہ اہلِ دانش عوام کی اکثریت کے ترجمان نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو یہ سانحہ نہ ہوتا۔ ہمیں ہندو عوام کے پاس جانا پڑے گا۔ ابھی نہیں کہ اس وقت اس کا غلط مفہوم نکالا جائے گا۔ جب نفرت کی آگ ٹھنڈی ہونے لگے تو ہمیں ان کے سامنے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کر کے رکھنا ہوگا۔ فاصلہ سے بدگمانیاں دن دونی رات چوگنی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ کیوں نہ ہم عہد کر لیں کہ ہم فاصلے کو حائل نہ ہونے دیں گے لیکن "ہم" سے مراد کیا ہے۔ ہماری نمائندگی کون انجام دے گا۔ ہماری طرف سے عہد کون کرے گا، جہاں تنظیم نہ ہو، اتحاد نہ ہو، اعتماد نہ ہو وہاں ترجمانی کون کر سکتا ہے وہاں اہلِ وطن ہماری بات کیوں سننے لگے۔ جنھیں وہ حقارت سے دیکھتے ہیں ان کی بات کو وہ وزن کیوں دینے لگے۔

بہرحال اگر ہمیں زندہ رہنا ہے، عزتِ نفس کے ساتھ، سر اٹھا کر، سینہ تان کر، بالا قدمی کے ساتھ تو ہمیں اپنا گھر پہلے درست کرنا پڑے گا۔ جس گھر سے آئے دن جھگڑے، مار پیٹ اور الزام و دشنام کی صدائیں آتی ہوں۔ ہمسایے اس گھر کے مکینوں کو منہ نہیں لگاتے۔ اب ہم سے یہ اطمینان چھین لیا گیا ہے کہ سیکولر جمہوریت میں، وقتی حادثوں سے قطعِ نظر، ہم امن و چین سے رہ پائیں گے۔ اب تو ہمیں نگرانی، چوکسی اور نگہبانی کا طریقہ اپنانا پڑے گا۔ غنیم گھات میں ہو تو ایک لمحے کی غفلت گھاتک بن جاتی ہے۔ ہم کسی کو غنیم نہیں سمجھتے تاوقتیکہ وہ اپنے برتاؤ سے یہ ثابت نہ کر دے۔ ہماری حالت ہے کیا ایک ادارہ بھی ہم ڈھنگ سے نہیں چلا پاتے۔ ہمارے اداروں اور انجمنوں میں خانہ جنگی کا سکہ چلتا ہے۔ ہم کو مسلمانوں کی خامیوں اور ان کے فرائض کا احساس ہے لیکن اسی وقت تک جب کہ ہم خود کو مستثنا کر دیں۔ ہم اپنی ذات کو ملت کے مفاد سے بالاتر، کہیں بالاتر سمجھتے ہیں۔ مسلکوں کی لڑائیاں ہم میں ہوتی ہیں عیب اور بہتان کا کاروبار ہمارے ہاتھوں فروغ پاتا ہے جہالت ہماری رفیقِ راہ بن گئی ہے۔ وقت ضائع کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر ہم ترقی کریں تو کیوں کر۔

وقت آگیا ہے کہ ہمارے بڑے مل بیٹھیں اور باہمی مشورے کے بعد سمتِ نظر اور سمتِ سفر دونوں متعین کر دیں۔ اقلیت کی صورتِ حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ اکثریت سے بہت زیادہ محنت کر کے مہارت، فضیلت اور امتیاز حاصل کرے ہندوستان میں جہاں اکثریت اقلیتوں اور پسماندوں کے استحصال کو ایک فنِ لطیف کی طرح برتتی چلی آئی ہے، اس بات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اکثریت کے ایک طبقے نے اس وقت کھل کر جو حملہ ہم پر کیا ہے اس میں سے ہمارے

یہ بھلائی کی راہ نکلتی ہو۔ ہمیں خطرے کا پہلی بار سچا احساس ہو جائے اور ہم اس کے لیے ڈھال وضع کریں۔

اس اثنا میں ہمارے وزیر اعظم نے اپنے اعلان کے ایفا کی کوشش کی ہے۔ پارٹیوں پر جو قدغن لگائی ہے، اس میں سے نکلنے کے لیے چور دروازے بہت ہیں، خصوصاً ایسی پارٹیوں کے لیے جو تنظیم کی لڑی میں پروئی ہوئی ہوں اور ایسی حکومت کے زیر سایہ جو خوش خرام اور نرم لگام اور کمزور ہو۔ یہ بات البتہ انوکھی ہے کہ جب کوئی تادیبی کارروائی کی جاتی ہے تو مسلمانوں کو ان کا حق حصہ امید سے کچھ زیادہ ہی ملتا ہے چنانچہ ہندوؤں کی تین پارٹیوں کو ممنوع قرار دیا گیا تو مسلمانوں کی دو پارٹیوں کو بھی زیر قدغن لے آئی۔ اسلامک سیوک سنگھ کو بند کرنے کا تو جواز تھا لیکن جماعت اسلامی نے کیا قصور کیا تھا۔ تعلیم، اخلاقی، رہنمائی اور راحت رسانی کے علاوہ یہ بیچارے کرتے ہی کیا ہیں۔ آندھرا پردیش میں سائیکلون آیا تو جماعت نے بغیر امتیاز مذہب راحت رسانی کا کام بڑی جانفشانی اور سلیقے سے انجام دیا جس کا اعتراف متعلقہ حکام نے بھی کیا۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ ایک پاکستانی اور ایک کشمیری انجمن کے ہم نام ہیں اور ان انجمنوں کا طرزِ عمل جارحانہ رہا ہے۔ یہ فیصلہ نظرِ ثانی کا مستحق ہے۔

جو کام فوراً انجام دینا ہے وہ ہے ریلیف یا راحت رسانی کا کام۔ یہ کام بھی تنظیم چاہتا ہے۔ پھر مظلوموں کی فریاد سننا ان کی بات اہلِ اقتدار تک پہنچانا، ان کی دادرسی کرنا۔ ان کے زخموں پر پھاہے رکھنا۔ پولیس اور آرمڈ پولیس کی زیادتیوں کو دستاویزی روپ میں پیش کرنا۔ اب کے تو فسادات ملک گیر ہو گئے، ورنہ کچھ شہر ایسے ہیں جو ہر وقت فساد آمادہ رہتے ہیں۔ وہاں بلوؤں سے نبرد آزما ہونے کے لیے منصوبے تیار رہنے چاہیں۔ اگر فسادات ہمارا مقدر بن گئے ہیں تو ہمیں اپنے مقدر کا پاس رکھنا چاہیے۔ ہمت اور تنظیم کے ساتھ مقسوم کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ دوستی اور محبت کا ہاتھ ہم برابر بڑھائیں لیکن ہر بار احتیاط کے ساتھ، اعتماد کے ساتھ اور طاقت کے ساتھ۔ رفاقت دوستی، تعاون، خیر اندیشی، بجا آور برحق، سپر اندازی، نیازمندی، سرنگوئی، بے جا اور باطل مظلوموں کی مدد اس طرح کیجیے کہ جو لوگ آگے آجائیں وہ زیادہ پا جائیں اور جن لوگوں کی غیرت اور تامّل انھیں آگے نہ بڑھنے دے وہ محروم رہ جائیں۔ ریلیف یا راحت رسانی کے کام میں جو مجلس ماتم میں کیا جا رہا ہے بزمِ مے کا سا سماں نہ ہونا چاہیے ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یہ بھی نہ ہو کہ بعض ظلم رسیدوں پر بہ یک وقت کئی امدادی انجمنوں کی نظرِ التفات پڑے اور دوسروں تک کوئی پہنچنے نہ پائے مناسب ڈھنگ تو یہ ہوگا کہ ہر آفت زدہ شہر میں تقسیم کا کام صرف ایک ایجنسی یا ادارہ کرے۔ یہ اعلان کرنا اسی کی اخلاقی اور ضابطہ کی ذمہ داری ہوگی کہ ان اداروں، انجمنوں یا ایجنسیوں کے ناموں کا شہر یا قصبے یا گاؤں میں اعلان کر دے جنھوں نے وہاں کے لیے روپیا اور اشیا، فراہم کی ہیں اور فراہمی کی مقدار بھی کھول کر بیان کر دی جائے۔ مسلمان جن میں غیرتِ ملی اور انسانی ہمدردی زندہ ہے، ایسے موقعوں پر دل کھول کر مدد کرتے ہیں۔ جب تک برباد شدہ لوگ نئے سرے سے آباد نہیں ہوتے ان کے لیے کھانے بھیجے جاتے ہیں! یہاں بھی تال میل اور احتیاط ضروری ہے تاکہ رزق ضایع نہ ہو۔

امداد کی رقوم کا ایک اچھا مصرف باز آبادکاری ہے مکان پھر سے بنائے جائیں۔ مکانوں اور دکانوں میں سامانِ رہائش اور سامانِ تجارت پہنچایا جائے۔ زخمیوں کا علاج اور بیواؤں اور یتیموں کے لیے پرورش کا مستقل انتظام، یہ سب خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ ان کے لیے معقول اقدامات ضروری ہیں۔ یتیم بچوں کی تعلیم کو راحت رسانی کے کام میں ترجیح دینی چاہیے۔

اگر ایک محلے میں ہندو اور مسلمان دونوں مجروح ہوئے

ہیں تو ہماری ریلیف پارٹیوں کو امداد کرتے ہوئے مذہب کی بنا پر کوئی امتیاز نہ کرنا چاہیے۔ ہمارے دل انسانیت اور اخلاق کا جو خون ہو رہا ہے، اس پر دکھے ہیں۔ علاوہ بریں ہمیں جلے ہوئے مکانوں کی راکھ سے ایک ایسی عمارت کو تعمیر کرنا ہے جو عقیدہ بھاؤ سے بالاتر ہو۔

تازہ ترین اطلاعات بتا رہی ہیں کہ شہید صرف بابری مسجد کو نہیں کیا گیا۔ دیپ آشیش مکرجی نے ۷ر دسمبر کو جو کچھ دیکھا اس کی رپورٹ انھوں نے ایودھیا سے روانہ کی۔ اس کا ترجمہ قومی آواز نے ۱۵ر دسمبر کے شمارے میں شائع کیا ہے اس کو پڑھ کر آنکھیں اور کھل گئیں۔ ایودھیا شہر کی دوسری مسجدیں بھی نذر آتش کر دی گئیں اور چن چن کر مسلمانوں کے مکان جس کی آبادی پانچ ہزار تھی جلا دیے گئے۔ شریمتی بلکہ سادھوی اوما بھارتی نے اس وقت جو تقریر کی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آتش زنی اور قتل و غارت گری کی یہ ساری جا[illegible]ائی سوچے سمجھے منصوبے کے تابع تھی۔ کیا ایودھیا کی دس مسجدیں بھی، جن کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے، رام جنم بھومی۔ مندروں کو توڑ کر بنائی گئی تھیں؟ اسی رپورٹ میں ایک اور حادثہ کا ذکر بھی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بھاجپا اقتدار میں آگئی، اگر اس نے زمام اقتدار ہاتھوں میں لے لی تو وہ مسلمانوں سے کیا مطالبہ کرے گی کیا چاہے گی۔ بھاجپا کا رکن بن جانا اس کے سیاسی مسلک کا اتباع کرنا یا اس کی قصیدہ سرائی کرنا کافی نہیں ہوگا۔ اس کی مانگ صرف یہ ہوگی کہ اپنی شناخت بھول جاؤ اپنے مذہب کو ترک کر دو اور ہندویت کے رنگ میں خود کو رنگ لو۔ ورنہ تم پر جو بیتے گی اس کے ذمہ دار تم ہی ہوگے۔ قارئین حسن حیدر پر جو بیتی اس سے اندازہ لگائیں۔ دیپ آشیش لکھتے ہیں:

"یہ (حسن حیدر) بھی ایودھیا میں بڑی آراضی کے مالکوں میں شامل ہیں، ہندوؤں سے ان کے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی آراضیوں پر بہت سے بے گھر ہندوؤں کو آباد کیا ہے۔ ایک شخص نے یہ بھی بتایا کہ مسٹر حسن حیدر بھارتیہ جنتا پارٹی ایودھیا کے صدر بھی تھے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہیں کسی بھی طرح کا تحفظ حاصل کرنے سے (انھوں نے) انکار کر دیا تھا لیکن آج صبح کارسیوکوں کے ایک جتھے نے ان کے گھر میں گھس کر لاٹھیوں سے ان کی پٹائی کر کے اس حال کو پہنچا دیا... حاجی محبوب نے اپنے ہی علاقے کے چھ افراد کے نام بتائے جنھیں ۶ر دسمبر کی شام کو تباہ اور تاراج کرنے والے ہجوموں نے ہلاک کر دیا تھا"

ایک سو آدمیوں نے تھانے میں پناہ لی تھی... ہر چند کہ ایودھیا کے مسلمانوں کے تعلقات مقامی ہندوؤں سے بہت اچھے تھے مسلمانوں کے مکانوں کی نشان دہی تو مقامی ہندوؤں نے ہی کی ہوگی۔

> "ہم کو عدم تشدد پر پوری طرح عمل کرنا چاہیے لیکن بے بسی کے ساتھ نہیں۔ علی برادران نے جو فارمولا سپاہیوں کے فرض کے بارے میں بتلایا ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور قید خانے کی دعوت دینا چاہیے۔ ہم کو یہ نہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے بہترین آدمیوں کے بغیر تحریک جاری نہیں رہ سکتی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم سوراج کے قابل نہیں ہیں اور نہ خلافت کے اور پنجاب کے ساتھ جو مظالم ہوئے ہیں ان کا مداوا کر سکتے ہیں۔"
>
> مہاتما گاندھی

آج (۱۶ر دسمبر) کی اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ

مرکزی سرکار نے اب مضبوط قدم اٹھانے کی ٹھان لی ہے۔ تینوں بچی ہوئی ریاستوں کی بھاجپائی حکومتوں کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ سیکولر پارٹیوں اور خود کانگریس کے سیکولر عناصر کا دباؤ اکارت نہیں ہوا۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ سیکولر عناصر کی مدد کریں اور سارے صحت مند اقدامات میں حکومت کا ساتھ دیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم بھول جائیں کہ حکومت نے کیا نہیں کیا۔ اس وقت دھیان صرف اس طرف دیں کہ سرکار کیا کرنے جا رہی ہے۔ اس کا ہاتھ بٹائیں۔ اس نے جو غلطیاں کیں اس کی مذمت نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہمارے روشن خیال ہندو بھائیوں نے کی۔ اب وہ بعد از خرابیٔ بسیار راہِ راست پر آئی ہے۔ ہمیں اس کی منزل کو آسان کرنا چاہیے۔ اس گئی گزری حالت میں بھی ہندوستان میں ایسے ہندو نظر آتے ہیں جو بھید بھاؤ سے بہت اوپر اٹھ کر انسان دوستی، مسلمان پسندی اور وطن پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے اور ان کے ہاتھوں اور ارادوں کو مضبوط کرے۔ اسٹیٹسمین میں حال ہی میں دو لڑکیوں ورشا ڈیکیشن اور پونم کا ۱۲ر دسمبر کا خط شری اڈوانی کے نام چھپا ہے جسے اڈیٹر نے سرخی دی ہے کہ

"ہندوستان کے مستقبل کی آواز سنیے۔"

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل کے بعض بچے اور بچیاں تعصب کے زہر سے بفضلہٖ تعالیٰ محفوظ ہیں۔ وہ ایک ایسے بھارت کے خواب دیکھ رہے ہیں جو نفرت اور عداوت سے پاک ہو۔ نئی نسل کے ایسے نونہالوں سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں لیکن ہمیں بھول کر بھی مستقبل کی طرف سے مطمئن نہ ہونا چاہیے ہندوستان اگر بے تعصب اور روشن خیال اور سلامت رو اور انسان دوست رہتا ہے تو اس میں فائدہ سب سے زیادہ مسلمانوں کا ہے۔ اس لیے ایسے بھارت کی تعمیر میں ان کا یوگ دان بھی سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔

مولانا عبدالباری نے ۱۹۱۹ء میں دلی کی ایک مشہور درس گاہ سید حسن رسولنما میں چند علماء کو جمع کر کے وقت کی نزاکت و ضرورت کے پیش نظر اتفاق و اتحاد کی اہم ضرورت بتلائی اور سب نے حسب ذیل عہد کیا:

"ہم سب دلی کے مشہور و مقدس بزرگ کے مزار کے سامنے اللہ کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ مشترک قومی و ملی مسایل میں ہم سب آپس میں متحد و متفق رہیں گے اور فروعی و اختلافی مسایل کی وجہ سے لیے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہیں کریں گے نیز قومی و ملکی جدو جہد کے سلسلے میں گورنمنٹ کی طرف سے جو سختی اور تشدد ہوگا اس کو صبر و رضا کے ساتھ برداشت کریں گے اور ثابت قدم رہیں گے۔ جماعت کے معاملے میں پوری پوری رازداری اور امانت سے کام لیں گے۔"

(تحریک خلافت۔ ص ۲۹)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۲ (فروری ۹۳ء) ۱۷

خوش خبری

انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر کو گورنمنٹ کی منظوری

میرے لکھے ہوئے مضمون کی پہلی قسط تہذیب الاخلاق کے جنوری ۹۳ء کے شمارے میں شایع ہو چکی ہے اور دوسری اور آخری قسط اس شمارے میں شایع ہو رہی ہے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ان دونوں قسطوں کے شایع ہونے کے درمیان ہی انڈین کونسل آف ایگریکلچر ریسرچ (ICAR) جو کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی منسٹری آف ایگریکلچر کا ایک ادارہ ہے اور اس طرح کے منصوبوں کی جانچ کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس یونیورسٹی سے پیش کیا تھا۔ یونیورسٹی کو ایک آفیشل خط مورخہ ۱۸ر جنوری نمبر II Edn/91(2) کے ذریعے اطلاع دی ہے کہ یونیورسٹی نے ہمارے منصوبے کو منظور کر لیا ہے اور پہلی قسط کے طور پر 2.60 کروڑ روپے کی منظوری بھی دے دی ہے اور ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل چار پوسٹ گریجویٹ شعبے کھولنے کی اجازت بھی دی ہے

1. Post Harvest Engg & Technology.
2. Plant Protection
3. Agric. Economics & Agric Business.
4. Agric Microbiology.

میں تمام علی گڑھ برادری کو اس شاندار کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج کی طرح ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ بھی ایک حقیقت بن گیا۔ ابھی چند دن پہلے جب میں ۱۸ر جنوری کے خط ملنے کے بعد ICAR کے ڈائرکٹر جنرل جناب وی۔ ایل۔ چوپڑا سے ملنے اور ان کا شکریہ ادا کرنے دہلی گیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ شمیم صاحب یہ تو آپکا حق تھا اسے تو آپ کو ملنا ہی تھا۔ اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی۔ کاش کہ دنیا میں ہمیشہ یہی ہو تا کہ حق دار کو اس کا حق مل جائے تو پھر اس سے بہتر بات ہو ہی کیا سکتی ہے۔ پہلے تو ہماری خواہش تھی کہ ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ قائم ہو۔ گورنمنٹ کی منظوری کے بعد اب یہ ہماری ذمہ داری ہو گئی ہے کہ اس کام کو بہتر سے بہتر طریقے سے انجام دیں۔ اس میں آپ سب کے تعاون و نیک خواہشات کی بہت ضرورت ہوگی۔ آخر میں میں اپنے وائس چانسلر جناب پروفیسر محمد نسیم فاروقی صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کی غیر معمولی دلچسپی اور تگ و دو سے یہ خواب حقیقت بنا۔

محمد شمیم جیراج پوری

۲۸ر جنوری ۱۹۹۳ء

انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر

(آخری قسط)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — قیام و مقاصد

محمد شمیم جیراجپوری*

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہر لحاظ سے تعلیمی اور تحقیقی میدان میں ایک مکمل یونیورسٹی ہے۔ یہاں ایگریکلچر سے متعلق تحقیقاتی کاموں کے بارے میں کافی مستحکم روایات قایم ہیں جن کو موجودہ دور میں مزید مضبوط اور اضافے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زرعی میدان میں نئے نئے اور پائیدار منصوبے تیار کیے جائیں اور ان کو گورنمنٹ آف انڈیا سے منظور کرانے کے بعد ان منصوبوں کی کامیابی کے لیے لائحۂ عمل حکمت عملی تیار کی جاوے۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ یونیورسٹی میں نیا ادارہ کھولا جائے بلکہ موجودہ زرعی تحقیقی نظام کو اور مزید پھیلایا جائے۔ تاکہ ملک کی ترقی اور بے روزگاری کے مواقع حاصل ہوں اور اس مسئلے میں کچھ یونیورسٹی کی جانب سے پہل ہو کیونکہ مسلم یونیورسٹی کی طرح ملک میں دوسری زرعی تحقیقاتی ادارے موجود ہیں۔

دراصل یونیورسٹی ایک خاص قسم کی زرعی تحقیقی مضامین میں خصوصی اور قطعی شکل میں کام کرنا چاہتی ہے جس سے گریجویٹس کے لیے بین الاقوامی روزگار کی صورت حال پیدا ہو۔ چونکہ یونیورسٹی کی کوشش ملکی و قومی مفاد میں ایک قابل ستائش کوشش ہے۔ لہذا یہ اسکیم مکمل حمایت اور بڑھاوے کی مستحق ہے۔ چونکہ یونیورسٹی کے پاس اپنے ذاتی مناسب مادی اور تعمیری ذرایع اور وسایل موجود ہیں و نیز یہاں کے شعبے اس کام کے اہل بھی ہیں بس ان کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے اور موجودہ ذرایع کو مزید مضبوط اور مستحکم کرنے والوں کی ترقی کی دیکھ بھال کی طرف دھیان دینا ہوگا تاکہ روزگار کے مواقع یونیورسٹی میں، اندرون ملک اور بیرون ملک حاصل ہوں۔

ہمارا صوبہ یو۔ پی جو رقبے میں بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ آبادی کے لحاظ سے بھی بڑا ہے۔ اس میں جغرافیائی اعتبار سے چار خطوں میں منقسم ہے۔ مشرقی اضلاع، درمیانی اضلاع پہاڑی اضلاع اور مغربی اضلاع کے علاقے جات بنتے ہیں سوائے مغربی خطے کے باقی تین حصوں میں وہاں ایگریکلچر یونیورسٹی اور زرعی تحقیقاتی ادارے اپنے اپنے علاقوں کو آسانیاں بہم پہنچانے میں مصروف ہیں۔ مثلاً پہاڑی اور ترائی کے علاقوں کو پنت نگر ایگریکلچر یونیورسٹی وہاں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور سی ایس آزاد یونیورسٹی کانپور سینٹرل زون کو دیکھتی ہیں۔ اسی طرح سب سے پسماندہ مشرقی یو۔ پی کو این۔ ڈی ایگریکلچر یونیورسٹی فیض آباد اور انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر سائنس بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس مکمل سہارا اور تعاون پہنچایا جا رہا ہے۔ مغربی یو۔ پی کا علاقہ جو دو دریاؤں یعنی

---

* کوآرڈی نیٹر ایگریکلچر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

گنگا اور جمنا کے درمیان واقع ہے اور خوش قسمتی سے نہایت
زرخیز اور زیادہ پیداوار دینے والا علاقہ ہے لیکن اس کو
کیا کہا جائے کہ دوسرے تین حصوں کو دیکھتے ہوئے اِس
مغربی یو۔ پی کے خطے کو نظر انداز کیا گیا اور اب یہ طے شدہ امر
ہے کہ بغیر کسی زرعی تحقیقی ادارے کے موجودہ وقت کی نئی نئی
زرعی ایجادات کا فائدہ بغیر کسی ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ کے ممکن نہیں
اور کسان بھی ان سے فائدہ اُٹھانے سے محروم رہے گا
جو کہ ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لہذا اب ضرورت
اس امر کی ہے کہ اس مغربی علاقے یعنی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
میں ایک ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ کھولا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ
پیداوار زراعت اور باغبانی میں حاصل ہو جو کہ موجودہ
وقت کی اہم ضرورت ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نئے زراعتی
تحقیقاتی منصوبے سے پیداوار اور بڑھے گی اور اس علاقے
کے بازاروں کی منڈیاں زرعی اور باغبانی کی پیداوار سے
خاص طور پر مستفید ہوں گی اور پھر ملک کے ان علاقوں
کو فائدہ ہوگا جہاں زرعی پیداوار کی کمی محسوس کی جا رہی ہو۔

مذکورہ بالا تذکرے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ
گئی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ کی کمی ہے۔ اسکی
اہمیت ہے اور یہ وقت کی ضرورت بھی ہے۔ کیونکہ یونیورسٹی
کے پاس یہ انسٹی ٹیوٹ کھولنے کے لیے کافی وسایل اور ذرائع
موجود ہیں اس لیے یہ تجویز کافی اہم اور فائدہ مند ہے
لہذا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جس کا شمار سینٹرل گورنمنٹ
کی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ کھولنے
کے لیے مزید جواز پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے
انسٹی ٹیوٹ کی سہولتیں پہلے ہی سے بنارس ہندو یونیورسٹی
وشوابھارتی اور شمال مشرقی پہاڑی یونیورسٹیوں کو حاصل
ہیں۔

اے ایم یو میں دستیاب وسایل

اپنے ملک کے پرانے تعلیمی اداروں میں سے ایک
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی ہے۔ جس میں ٹیکنیکی معیار کی
مضبوط ترین فیکلٹیاں ہیں۔ مثلاً فیکلٹی آف سائنس، لائف
سائنس اور انجینرنگ اینڈ ٹیکنولوجی ہیں جن میں ایک بہت
بڑی تعداد نہایت ہی قابل تجربے کار اساتذہ کی ہے۔ بشمول
پروفیسر، ریڈر اور لیکچرار۔ درس وتدریس کے شعبے میں لائف
سائنس نے خاص طور پر اپنا ایک اعلیٰ مقام زرعی تحقیق پر،
قومی سطح پر اور بین الاقوامی طور پر حاصل کر لیا ہے اور اب
وہ اس مقام پر ہے کہ زرعی مسئلے کیسے بھی کیوں نہ ہوں وہ
ان کے حل کرنے کی اہل ہے۔ کیمسٹری اور جغرافیہ کے محکمے بھی
اس سلسلے میں کافی مددگار ثابت ہوں گے۔ کیونکہ جو کچھ
بھی وہ کریں گے اس پر انہیں عبور حاصل ہے۔ اس کے
علاوہ فیکلٹی آف انجینرنگ اینڈ ٹیکنالوجی جن کے پاس اپنے
کافی ذرائع اور اسٹاف ہے وہ ایگریکلچر سے متعلق ہر قسم
کی مشین و آلات جو بھی درکار ہوں گے بہ آسانی بنا سکیں
گے تاکہ فصل بونے سے قبل اور بعد کے لیے جتنے بھی ایسے
آلات درکار ہوں بن سکیں۔ ان کے علاوہ ڈپارٹمنٹ
آف اکانومکس، ڈپارٹمنٹ آف کامرس اور ڈپارٹمنٹ
آف ایم۔ بی۔ اے (M.B.A) بڑی آسانی سے ایگریکلچر
اکونامکس کے کورس کو پڑھا سکیں گے

فی الحال اس مجوزہ زرعی ادارے کے لیے یونیورسٹی
کے پاس ہر طرح کی ضرورت کے لیے ورکشاپ اور لیباریٹریز
موجود ہیں جن سے اس مجوزہ انسٹی ٹیوٹ کی ابتدائی ضروریات
بہ آسانی پوری ہو سکتی ہیں اور پھر یہ کہ انسٹی ٹیوٹ آہستہ آہستہ
ترقی کی منزل طے کرتا ہوا خود کفیل ہو جائے گا۔ یہ بات
بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ یونیورسٹی کے پاس [illegible]
(Microcomp[illegible]) کی آسانی (Family [illegible]) بھی وجہ
ہے اور نہایت ہی نازک اور با اثر کمپیوٹر نظام بھی ہے۔
اس کے علاوہ یونیورسٹی کے پاس اپنا ذاتی ایگریکلچر فارم
موجود ہے جس کا رقبہ تقریباً ۴۰۰ ہیکٹیر ہے اور اس علاقے

ہر قسم کی فصل چاہے زرعی ہو یا باغبانی کی ہو بڑی آسانی سے لگائی جاسکتی ہے۔ مزید یہ کہ قریب ۵۰ ہیکٹیر کا رقبہ یونیورسٹی اور قلعہ کے درمیان واقع ہے تجرباتی اور زرعی تحقیق کاموں کے لیے نہایت مناسب ہے اور اندرون قلعہ ۵۰ ایکٹر رقبہ ہے جو چاروں طرف کھائی اور اونچی فصیل سے گھرا ہوا ہے اور صرف ایک دروازہ ہے جو نہایت ہی مضبوط اور محفوظ ہے یہ اندرون قلعہ کی زمین بہترین زرعی تجربہ گاہ متوقع انسٹی ٹیوٹ کے لیے ہوگی اور باہری حصے میں ایگریکلچر فارم کی زمین اور باغات بھی مددگار ثابت ہوں گے۔ اس لیے اندرون قلعہ بطور زرعی تحقیقاتی کام اور تجربہ گاہ استعمال ہو سکتا ہے۔

یونیورسٹی نے ایگریکلچر سینٹر کے لیے ایک اچھی پرانی عمارت دی ہے جو ابتدائی مرحلے میں انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر کی بنیاد ہوگی۔ بہرحال یہ عمارت تھوڑی بہت تبدیلی اور مرمت کے بعد نئی شکل دے کر ابتدائی شروعات انسٹی ٹیوٹ کی ہو جائے اس عمارت کو ٹھیک اور اچھی شکل میں لانے کے لیے تقریباً دس لاکھ روپیہ خرچ ہوگا جس کی فوری ضرورت ہے۔

مجوزہ انسٹی ٹیوٹ کے مقاصد

غذائی محاذ پر درپیش چیلنجوں کا کامیابی کے ساتھ سامنا کرنے کے بعد اب وقت آگیا ہے کہ ہم زراعت کو ایک نیا موڑ دیں۔ زرعی فصلیں کٹائی کے بعد کئی مرحلوں سے گزر کر صحیح شکل میں استعمال کے قابل ملتی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مرحلے پر کچھ نہ کچھ نقصان ہوتا ہے اور پیداوار کا صحیح اور مناسب استعمال و فائدہ نہیں مل رہا ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ موجودہ وقت کی نئی نئی تحقیقات کا ہم استعمال نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے قیمت بھی زیادہ نہیں ملتی اور خرچہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور یہ بات ترقی پذیر ملک کے لیے بالکل ٹھیک ثابت ہوگی۔ لہذا زیادہ سے زیادہ پیداوار لینے اور کم سے کم خرچ پر جب تک ہم نئی نئی زرعی ترکیبیں اور ٹیکنک نئے نئے آلات کا استعمال نہیں کریں گے تو ہم زیادہ سے زیادہ فائدہ زرعی محاذ پر حاصل نہ کر سکیں گے۔

مسلم یونیورسٹی کے لیے ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ کی تجویز کا اصل مقصد یہ ہے کہ طلباء کو زرعی میدان میں نئی نئی تحقیقات کرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور پھر اس کا فائدہ کاشت کار و کسان اٹھائیں۔ لوگوں کو روزگار مہیا ہو اور پھر اس کا فائدہ تجربہ کار زراعتی ماہر دستیاب ہوں۔ تو ظاہر ہے اس کا فائدہ پروڈیوسر (Producer) اور کنزیومر (Consumer) دونوں کو ملے گا۔

ہر قسم کا اناج یا غلہ، دالیں، تلہن، پھل اور سبزیاں یہ سب چیزیں پودوں کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا بہت کافی حصہ کھانے کی پیداوار میں شامل ہے اگرچہ ان اشیاء کا ہماری غذا میں استعمال نسبتاً کم ہے مگر نئی نئی تحقیق اور جدید ٹکنالوجی کے ذریعے اور بہتر طور پر ان کا استعمال ہو سکتا ہے۔

ہمارے ملک ہندوستان میں تقریباً بیس لاکھ ٹن ایگریکلچر سے متعلق بچی کچی پیداوار اور زیادہ تر روایتی انداز میں چارے میں، ایندھن کے طور پر یا پھر کھاد کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دھان کا پیال یا بھوسی کو لے لیں تو اس کا استعمال بھٹیوں کے گرم کرنے و نیز جانوروں کے نیچے بچھانے اور بطور چارہ ہوتا ہے۔ اگر اس کا بہتر استعمال جدید ٹکنالوجی کے فروغ کے بعد White Ash سلیکا (Silica) ساؤنڈ بورڈ اور سیمنٹ وغیرہ کے بنانے میں مددگار ہوگا۔ اسی طرح دوسری چیزیں ہیں جن کا جدید استعمال ممکن ہے۔

ابھی حال میں جو توجہ اور کوشش غلہ کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں کی گئی تھیں۔ ان کا خاطر خواہ نتیجہ گزشتہ چار دہائیوں میں پیداوار کی بڑھوتری ہوئی ہے۔ بہرحال پیداوار کی ترقی اپنے عروج تک پہنچ گئی ہے اور یہ صرف

زرعی تحقیقاتی پروگراموں کی بدولت ہی ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ فصل کی کٹائی اور گہائی سے پہلے اور بعد کے فارم کی پیداوار کے نقصانات کسان کو ہی نہیں ہوتے بلکہ پوری قوم کا اجتماعی نقصان ہے جس سے پیداوار میں بٹہ لگ جائے گا۔ پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار میں نقصانات کا فقدان تقریباً ۴۰ فیصد تک دیکھنے میں آیا ہے۔ ہندوستان میں فصل کٹنے کے بعد کی مشینی اور فنی تحقیقاتی کام اناجوں پر کافی ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے خاص طور پر دھان پر۔ ورنہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ شروع سے آخر تک کے درجات میں نقصان ہی نقصان ہے۔ یعنی کوانٹیٹی اور کوالیٹی دونوں کا۔ ان پیداواروں میں سے بہت سی ایسی ہیں جو اپنے ملک سے باہر بھیج دی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر پھل اور سبزیاں دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی ہیں۔ ملک سے جو چیزیں باہر جاتی ہیں ان کی پیداوار کے بارے میں پوری پوری جانکاری عرصے سے ہے کہ کون سی چیزیں پیدا کی جائیں جن کی کھپت دوسرے ملکوں میں زیادہ ہو۔ لہذا زرعی تحقیقاتی کام کے ذریعے اس امر کی ضرورت ہے کہ غذائی محاذ میں ترقی ہو اور پیداوار بڑھے اور ہمارے ملک کی اشیاء کا استعمال زیادہ عمدگی سے ہو اور دوسرے سے بہتر ہو اور بازار سے منافع بھی زیادہ حاصل ہو۔ یہ سب چیزیں جبھی ممکن ہیں کہ زرعی تحقیقاتی کام میں دلچسپی لی جائے۔ پیداوار کے اسباب میں ایک سب سے بڑا اہم سبب کسان کی سطح پر۔ یا پروسیسنگ لیول (Processing level) پر غیر ضروری فصلی کیڑوں کا لگنا اور ان میں طرح طرح کی بیماری کا پیدا ہونا۔ اس طرح سے فصل کا بھاری نقصان ہوتا ہے۔ باوجودیکہ کیڑے مار دوائیں پیسٹی سائڈ (Pesticides) اور فنجی سائڈ (Fungicides) دونوں کا استعمال ہوتا ہے لیکن نقصان سے فصل کا بچنا نہایت ہی کٹھن اور محال ہے۔ بچی کچی دواؤں کا استعمال (Pesticides) بھی ایک مسئلہ ہے جو پیداوار پر اثرانداز ہوتا ہے اور بیماریاں و کیڑے مکوڑے فصلوں کو پنپنے نہیں دیتے۔ دوسرے یہ کہ ان کیڑے مکوڑوں میں چند دنوں میں قوت برداشت پیدا ہو جاتی ہے اور دوائیں اثر نہیں کرپاتیں اور یہ زرعی میدان میں نئی نئی بیماریاں پھیلا دیتے ہیں اور ان دواؤں میں سے کچھ بائیولوجیکل کنٹرول میں کھرپتوار اور وبائی کیڑے وغیرہ مددگار ثابت ہوتی ہے اور اس طرح ان کا کنٹرول کھیتوں کی فصلوں میں بیماری پھیلنے کی روک تھام ہو جاتی ہے۔

زرعی میدان میں جو نقصانات بشکل بربادی (Waste) رڈی کوڑا کرکٹ بھوسہ و بھوسی پیال وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کے بہتر استعمال کے لیے زرعی تحقیقاتی کام نہایت ضروری ہے۔ ہم اس کا بہتر سے بہتر کیا استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ بات سائنس کی تحقیقات اور جدید ٹکنالوجی ہی بتا سکتی ہے اور اس کی ہمارے ملک میں ہر سطح پر اور ہر یونیورسٹی میں یہ تحقیقات ملکی مفاد میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھے گی اور ملک کی خوش حالی میں مددگار ثابت ہوگی اور یہ موجودہ ایگریکلچر کے انقلاب میں ہی ممکن ہے۔

جب ہم زرعی پیداوار کے استعمال کی بات کرتے ہیں تو پہلے ہمیں زراعتی اداروں، فارموں اور کاشت کاروں سے سمپرک استھاپت کرنا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ ہم اس میدان میں کس طرح کامیاب ہوں اور تحقیقاتی کاموں میں جو دقتیں حائل ہوں اُن پر کیسے عبور حاصل کیا جائے۔ لہذا یہ بات بالکل کھل کر سامنے آئی کہ زرعی معاشیات اور اقتصادیات و متفرق زرعی مراحل اور ضروری عنصر ہیں جن پر ہمیں غور کرنا ہوگا اور سب سے نازک مسئلہ یہ ہے کہ جو تحقیق زرعی میدان میں ہو وہ لیبارٹریز میں ہوگی وہ کاشت کار تک کیسے ہم پہنچائی جائے۔ اس لیے اس سلسلے میں کافی توجہ کی توجہ کی ضرورت ہوگی اور اس میدان میں زرعی تحقیقات کے معاشی فائدوں کے لیے ایگرو۔ بائیولوجیکل سائنس والوں

کو اور پالیسی بنانے والوں کو مدد کرنی ہوگی۔ کیونکہ یہ نیو ایج
(New Age) آف دی بائیولوجیکل انقلاب کی ہے۔

متوقع تعلیمی کورس

فصل لینے یا کٹنے کے بعد کے طریق کار اور اس میں ہونے والے نقصانات بشکل بیماری، فصل بربادی، فصل کے بارے میں ایک زور دار تعلیمی پروگرام شروع ہو جیسا کہ اوپر بیان کیے مقاصد اور جواز پیش کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ فصلوں کو بیماریوں سے نجات دلانا اور زرعی معاشی سدھار پر جدید تحقیقات کی تعلیم شروع کی جائے جس کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر مسلم یونیورسٹی میں قائم ہو جس پر تقریباً ۵،۹۶ کروڑ روپیے کی لاگت آئے گی۔

انسٹی ٹیوٹ پوسٹ گریجویٹ لیول کی تعلیم زرعی میدان میں دے گا اور یہ تعلیم ماسٹر لیول کی مندرجہ ذیل مضامین پر ہوگی۔

1. Post - Harvest Engg. & Tech.
2. Agriculture Waste Utilisation
3. Plant Protection
4. Agriculture Economics and Management
5. Agricultural Microbiology

"اگر آپ اس عجیب اور دردناک انقلاب کو جو مسلمانوں کی تاریخ زندگی میں برابر پیدا ہوتا گیا ہے، ذرا بھی غور کی نگاہ سے دیکھیں گے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہماری یہ حالت صرف اس وجہ سے ہے کہ ہماری قوم نے اب تک اعلیٰ تعلیم کی ضرورتوں کو بخوبی نہیں سمجھا یا اس سے دانستہ بے اعتنائی کی۔

علامہ شبلی نعمانیؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۲، شمارہ ۲ (فروری ۱۹۹۳ء)

دینی اور عصری تعلیم کا امتزاج

(ایک بامقصد کامیاب تجربہ)

محمد فضل الرحیم مجددی *

آج ہندوستان کے مسلمان ابتلا کے جس نازک دور سے گزر رہے ہیں، ایسا سخت اور آزمائش کا دور آزادی کے بعد سے آج تک مسلمانوں پر نہیں آیا۔ حالات دگرگوں ہیں اور مسلمان گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ ان کا حال تشویش ناک ہے اور مستقبل بھی زیادہ پُرامید نہیں۔ ایسے شدید اور خطرناک حالات میں ضرورت ہے ایک ایسی جامع اور ہمہ گیر تحریک کی جو سب سے پہلے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرے اور اس کے بعد ہر جہت اور ہر سمت میں ان کی ترقی کے لیے قدم اٹھائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حقیقی اور پائیدار ترقی کے لیے سب سے زیادہ جس شعبے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ تعلیم کا شعبہ ہے۔ اس لیے کہ تعلیم ہمیشہ سے مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کا سرمایۂ افتخار اور طرۂ امتیاز رہی ہے۔ لہٰذا ہماری اولین کوشش یہی ہونی چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم پر ہماری توجہ پوری طرح مرکوز ہو لیکن ہمیں اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہم تعلیم کے سلسلے میں چاہے جو بھی نصاب مقرر کریں اس میں دینی تعلیم کا عنصر غالب رہے اور اس کی بنیادی طور پر دو وجوہ ہیں۔ اوّلاً تو یہ کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، وہ محض چند رسوم و عقاید کا نام نہیں، بلکہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ تمام احکام و اوامر کو عملاً نافذ کیا جائے اور یہ چیز دینی علم حاصل کیے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا مسلمان ہونے کے ناطے دینی علوم بہرحال ہم کو حاصل کرنا ہیں محض عصری علوم ہماری اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ اس ضمن کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور کوششوں کو ناکام بنانے، اپنی آنے والی نسلوں کے اسلام کو محفوظ کرنے اور آج کے بدلتے ہوئے حالات اور سنگین مسایل کا مقابلہ کرنے کا صرف ایک ہی موثر طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ مذہبی تعلیم دلوائیں تاکہ مذہب سے ان کی وابستگی پختہ سے پختہ تر ہو سکے۔

لیکن ہمیں اپنے زمانے کی ضرورتوں کو مدِّ نظر رکھنا ہے۔ لہٰذا ہمارا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم ایسا جامع ہونا چاہیے کہ جس میں غالب حصہ دینی علوم اور عربی زبان و ادب کے لیے مخصوص ہو اور اسی کے ساتھ اس میں معتدبہ شکل میں عصری و تکنیکی علوم بھی شامل کیے گئے ہوں۔

اگر ہم دینی نصاب و نظام تعلیم کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ ہمارے اسلاف کرام نے ہر دور میں نظام تعلیم میں وقت کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا ہے اور وقتی ضرورتوں اور مصالح کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انہیں

---

* نائب شیخ الجامعہ، جامعۃ الہدایۃ، جے پور

تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں۔ آپ زیادہ دور نہ جائیں۔ حالیہ صدی کے دوران رائج دو مشہور دینی نظامہائے تعلیم ہی کو لے لیجیے۔ ایک وہ جو درس نظامی کے نام سے مشہور ہے اور جس کا سب سے بڑا مرکز دارالعلوم دیوبند ہے اور جو اس وقت ہندوستان کے اکثر دینی مدارس میں رائج ہے۔ دوسرا جو اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں رائج ہے۔ دونوں نظامہائے تعلیم میں اپنے زمانے کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جہاں تک درس نظامی کا تعلق ہے تو اس نصاب کی خصوصیت یہ رہی کہ اس میں منقولات کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ معقولات پر بھی زور دیا گیا جب کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں دینیات کے ساتھ عربی زبان و ادب کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس طرح کہ اس نصاب کے پڑھنے والے طلبا، عربی زبان میں فہم معانی وادراکِ مطالب پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ فصیح عربی میں اپنے مافی الضمیر کو کتابت و خطابت کے ذریعے ادا کر سکیں۔ تاکہ وہ فارغین نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ خود اہلِ زبان (عرب) کے سامنے دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے سکیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں نظام ہائے تعلیم نے ان مقاصد کو بہت بڑی حد تک پورا کیا ان عظیم مقاصد کی تکمیل کے لیے ان نظام ہائے تعلیم کی ترتیب وتعیین عمل میں آئی تھی۔

لیکن اگر ہم گزشتہ ربع صدی کی علمی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ تلخ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہمارے دینی مدارس کے فضلاء وفارغین زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے کو نہ ڈھال سکے اور ان کی سرگرمیاں منبر ومحراب تک محدود ہو کر رہ گئیں اور ایسے بھی ان گنت واقعات پیش آئے کہ دینی مدارس کے فارغین کو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے علمی لائن تیاگنی پڑی۔ اس تلخ حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اور پھر اس امر کا لحاظ کرتے ہوئے کہ آج کے اس بدلتے ہوئے دور میں جب کہ سائنس کی ترقی اپنے عروج پر ہے اور ٹیکنالوجی زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ دینی نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی جائے اور موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر ایک ایسا جامع نصاب ترتیب دیا جائے جو عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور مسلمانوں کا ایک ایسا ملی ادارہ ہو جس میں ایک طرف تو علوم دینیہ کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست ہو تاکہ نئی نسلیں اپنے مذہب سے وابستگی کو پختہ کر سکیں اور دینی علوم میں کامل دستگاہ ان کو حاصل ہو۔ اسی کے ساتھ دوسری طرف موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق سائنس اور جدید ٹیکنالوجی سے بھی ضروری حد تک واقفیت ہی نہیں بلکہ اس میں مہارت حاصل کر سکیں۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو موجودہ زمانے کے ہم آہنگ بنا سکیں اور اس طرح ان میں جہاں ایک طرف خود اعتمادی پیدا ہوگی وہیں دوسری طرف وہ اپنے اس عظیم فرض کو بھی بخوبی ادا کر سکیں گے جو ان کا اصل مقصد ہے یعنی فریضۂ دعوت اور نشر وتبلیغ علم۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا اور وہ بھی حکومت کی مالی امداد کے بغیر محض اللہ کے بھروسے پر اور عام مسلمانوں کے تعاون سے اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے ایک معیاری ادارے کا قیام گو کہ یہ ایسا خواب تھا جو ملتِ اسلامیہ کے احساسات کا ترجمان تو بن سکتا تھا مگر بظاہر اس کا شرمندۂ تعبیر ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

لیکن خدا کے فضل سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور اس تعبیر کے ظہور کا مرکز بنا شہر جے پور جہاں "جامعۃ الہدایۃ" کے نام سے ایک ایسے عظیم ادارے کا قیام عمل میں آیا ہے جو حقیقی معنی میں قدیم صالح اور جدید نافع کا سنگم اور نتیجہ خیز امتزاج ہے۔

سرزمین راجستھان کے گلابی شہر جے پور میں ۸ر دسمبر ۱۹۸۵ء کا دن شمع علم کے پروانوں اور اردو عربی زبان و ادب کے پرستاروں کے لیے ایک صبح نو کا پیغام لے کر آیا۔ اور مدارسِ اسلامیہ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ایک ایسے ادارے نے فکر وتصور کی حدوں سے نکل کر

حقیقت کا روپ لیا جسے وجود میں لانا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ 'جامعۃ الہدایہ' ایک ایسے خواب کی تعبیر ہے جو اپنے عظیم مقاصد اور جامعیت کے لحاظ سے ایک ایسے عظیم اور ہمہ گیر ادارے کا نام ہے جو مذہبی تعلیم، اسلامی ثقافت، تہذیب و معاشرت اور صنعت و حرفت کی تعلیم و تربیت کا آئینہ دار ہے۔

شہر جے پور سے آٹھ کلومیٹر دور، رام گڑھ روڈ پر واقع ایک وادی کا اس کے لیے انتخاب کیا گیا اور سالہا سال سے سنسان اور خاموشی میں ڈوبا یہ خطہ علم و ہنر کا مرکز اور وادیٔ ہدایت بن گیا۔ چاروں طرف کھڑی خوب صورت پہاڑیاں اور ان کے دامن میں پھیلے سبزہ زار اور نخلستان کے درمیان جامعۃ الہدایہ کی حسین و پر وقار عمارت دیکھنے والوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی مگر یہ محض عمارت کا حسن نہیں اس کی بنیاد کا مقصد ہے جو عظیم ہے کیونکہ ؏

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

" جامعۃ الہدایہ " کے بانی نے آئینِ نو سے ڈرنے کے بجائے آئینِ نو کے چیلنج کو قبول کیا اور میدانِ عمل میں عزم جمانے کے لیے اسلامی نظامِ حیات، دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلنے والی تعلیم اور تربیت کا منصوبہ بنایا۔

" جامعۃ الہدایہ " کے قیام کا بنیادی مقصد ایک باشعور قوم تیار کرنا ہے۔ جو اپنی علمی صلاحیت کے ساتھ عملی توانائی سے بھی سرفراز ہو اور جذبۂ خدا شناسی کے احساس سے بھی جن کا دل معمور ہے۔ ملتِ بیضا کے سپوت ہونہار بن کر یہاں سے نکلیں۔ وہ ایک اچھا ذہن لے کر اور تعمیری انسان بن کر رہ جائیں ایک روشن مستقبل کے علمبرداروں اور صبحِ نو کے پیامبر بنیں۔

" جامعۃ الہدایہ محض ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ وہ دراصل ایک تحریک ہے جس کا مقصد اسلامی اقدار و روایات کی حفاظت اور دینی علوم کی تعلیم و اشاعت نیز صنعتی و تکنیکی تربیت کے ساتھ ہر جہت اور ہر سمت میں مسلمانوں کی ترقی کے لیے قدم اٹھانا ہے۔

" جامعۃ الہدایہ " کا انتساب ایک ایسی عظیم ہستی کی طرف ہے جن کی مذہبی و تعلیمی خدمات، قومی و ملی احساسات اور روحانی تصرفات کی عظیم روایات سے یہ ادارہ وابستہ ہے۔

جامعۃ الہدایہ اصلاً حضرت مولانا شاہ محمد ہدایت علی صاحب نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مقدس مشن کی تکمیل کا مظہر ہے جو حضرت موصوف نے تقریباً ستر سال قبل سرزمین جے پور میں شروع کیا تھا اور جو ۱۹۵۱ء میں ان کی وفات کے سبب پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا تھا، لیکن فضلِ ایزدی سے آپ کے سعادت مند پوتے حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرحیم صاحب مجددی دامت برکاتہم نے ۔۔ جو جامعۃ الہدایہ کے بانی اور امیر الجامعہ ہیں ۔۔۔ اپنے عظیم المرتبت دادا کی جانشینی کا شرف حاصل کرنے کے بعد اس عظیم منصوبے کو جامعہ کی شکل دی۔

"جامعۃ الہدایہ" کا سنگ بنیاد ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دستِ مبارک سے رکھا گیا اور اس میں تعلیم کا آغاز ستمبر ۱۹۸۶ء سے ہوا۔

" جامعۃ الہدایہ" کا نصابِ تعلیم قدیم صالح اور جدید نافع کا ایسا مثالی اور معتدل امتزاج ہے جو دینی و دنیوی علم و ہنر کو متناسب معیار کے ساتھ پورا کرتا ہے۔ جامعہ کے بنیادی نصاب کی ترتیب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور این-سی-ای-آر-ٹی کے نصابات کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

" جامعۃ الہدایہ " کا نصابِ تعلیم یوں تو تعلیم کے ہر مرحلے (ابتدائی، ثانوی، فوقانی و اعلیٰ تعلیم) کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے لیکن جامعہ نے جو بنیادی نصاب تیار کیا ہے اور جس کی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ ستمبر ۱۹۸۶ء مطابق محرم ۱۴۰۷ھ کو شروع ہوا۔ اس کا معیار ہائر سیکنڈری سے شروع ہو کر گریجویشن کی سطح تک گیا ہے اور اس نصاب کو "عالی" کے نام

سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کی کل مدت تعلیم ۵ سال ہے۔
یہ نصاب دینی علوم، تکنیکی تعلیم نیز عصری مضامین کا حامل ہے۔
اس وقت جامعہ میں تعلیم کا سلسلہ تین مرحلوں پر منقسم ہے۔

۱/ اعدادیہ: یہ ایک دو سالہ عارضی نصاب تعلیم ہے یہ کورس عصری تعلیم گاہوں سے آنے والے طلبا کو جامعہ کے نصاب (عالی) میں داخلے کے لیے اہل بنانے کے واسطے نافذ کیا گیا ہے۔

۲/ ثانوی: یعنی درجۂ ششم سے درجۂ نہم تک۔ اس نصاب کی تیاری میں دو بنیادی امور خاص طور پر مدّنظر رکھے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کورس کو پورا کرنے پر طلبا لازمی دینی معلومات رکھنے کے ساتھ ساتھ عربی زبان سے بھی واقف ہو چکے ہوں اور دوسرے یہ کہ وہ عصری علوم میں بھی اپنے معاصر اسکولی طلبا سے پیچھے نہ رہیں۔ اگر کسی وجہ سے وہ جامعہ میں اپنا سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکیں تو دیگر مدارس یا اسکولوں میں بہ آسانی داخلہ لے سکیں۔

۳/ عالی۔ یہ پانچ سالہ کورس ہے جس کے اندر مندرجہ ذیل مضامین کی تعلیم ہوتی ہے

الف۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ اصول برائے ہر سہ علوم، عقاید و کلام۔ علم الفرائض

ب۔ عربی زبان و ادب۔

ج۔ انگلش۔ ہندی۔ علوم ثقافیہ و اجتماعیہ

د۔ تکنیکی تعلیم۔ جس میں اس وقت مندرجہ ذیل تین ٹریڈس چل رہی ہیں۔

۱۔ کمپیوٹر ایپلی کیشن۔
۲۔ ویلڈر کم فٹر۔
۳۔ الیکٹریشن کم وائر مین۔

(اس میں ٹیکنیکل تعلیم سرٹیفکٹ معیار کی ہے جب کہ دیگر علوم و فنون گریجویشن کے مساوی ہیں)۔

ٹیکنیکل شعبہ کی دو ٹریڈ یعنی "ویلڈر کم فٹر" اور "الیکٹریشن کم وائر مین" کی عملی تعلیم کے لیے چار وسیع ہالوں پر مشتمل ایک ورکشاپ قائم کیا گیا ہے۔ جہاں تمام ضروری مشینیں اور آلات فراہم کیے گئے ہیں۔ اس کا شمار ملک کے ممتاز ٹیکنیکل اداروں میں کیا جا سکتا ہے جہاں تجربہ کار اساتذوں کی نگرانی میں طلبا کام سیکھتے ہیں۔

اسی طرح کمپیوٹر ٹریڈ میں دو کورس چل رہے ہیں۔

الف Certificate course in computer applications.

ب Deploma Graduation Course in compular Applications

(یہ کورس دینی مدارس کے فارغین کے لیے مخصوص ہے جس کی مدت ایک سالہ ہے)[1]

اور اس طرح بانیٔ جامعہ حضرت مولانا محمد عبد الرحیم مجددی کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری و جدید ٹیکنیکل تعلیم کو شامل کیا جائے۔

۴۔ درجۂ حفظ و تجوید قرآن،

حفظ و تجوید میں خصوصی رجحان رکھنے والے طلبا کے لیے ایک الگ شعبہ قایم ہے جس کی مدت ۳ سالہ ہے۔

ابتدائی تعلیم یعنی پہلی کلاس سے پانچویں کلاس

---

[1] یہاں اس امر کی وضاحت ضروری و برمحل ہوگی کہ جامعہ میں ٹیکنیکل ٹریڈ کے سالانہ امتحانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پالی ٹیکنیک کے شعبہ کی نگرانی میں ہوتے ہیں اور وہیں کے اساتذہ آکر امتحان لیتے ہیں۔

تک کی تعلیم کا انتظام جامعہ میں نہیں ہے۔ البتہ اس کے لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ اندرونِ ملک قایم معیاری ابتدائی مدارس یا اسکولوں کو جامعہ سے ملحق کر دیا جائے۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ ہمارا نصاب پڑھائیں۔

جامعہ میں دینی و عصری علوم حاصل کرانے کے ساتھ ساتھ طلبا میں تقریری اور تحریری ذوق اور قابلیت پیدا کرنے نیز فکر و نظر کو وسیع کرنے کے لیے طلبا کی انجمنیں ہیں جن کے سربراہ خود طلبا ہوتے ہیں۔ ان میں عربی، اردو اور انگلش تینوں زبانوں میں تحریر و تقریر کی مشق کرائی جاتی ہے۔ کیونکہ ایک مکمل شخصیت کے اوصاف کا اہم جزو ایک اچھا مقرر اور صاحب قلم ہونا بھی ہے۔

جامعہ میں اساتذہ اور طلبا کی سہولت کے لیے ایک معیاری لائبریری قایم کی گئی ہے، جس میں سردست تقریباً ۲۵ ہزار کتابیں عربی، اردو، فارسی، انگریزی، ہندی اور گجراتی میں موجود ہیں اور منصوبے کے تحت جس لائبریری کا قیام عمل میں آئے گا اس میں ۱ر لاکھ کتابوں کا ذخیرہ ہوگا۔ اس کے علاوہ "مکتبۃ الشباب" کے نام سے بھی ایک اور لائبریری اس وقت جامعہ میں موجود ہے۔ جس کا انتظام خود طلبا ہی کرتے ہیں۔ اور یہاں بھی کافی کتابیں موجود ہیں۔

درس گاہ عبادت گاہ ہے اور جس طرح عبادت گاہ میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ امیر غریب نہیں۔ اسی طرح یہ فرق درس گاہ میں بھی نہ رہے۔ اس کے لیے سبھی طلبا یہاں جامعہ کے مقرر لباس کالی شیروانی، ٹوپی اور سفید پاجامہ میں نظر آئیں گے۔ یہ لباس جہاں ایک طرف احساس یگانگت پیدا کرتا ہے۔ وہیں دوسری طرف احساس خودداری بھی پیدا کرتا ہے۔

جامعہ کے مکمل بجٹ کا تخمینہ اس وقت تقریباً پچاس کروڑ روپیہ کا ہے۔ اس عظیم منصوبے کی تکمیل کے لیے ایک وسیع رقبہ (دو سو نوے بیگہ) خرید لیا گیا ہے۔ اس وقت دو بلڈنگس (ایک جامعہ کی مین بلڈنگ اور دوسری وہ بلڈنگ جو اس وقت ہاسٹل کے بطور استعمال ہو رہی ہے) مکمل ہو چکی ہیں تیری منصوبے کے تحت مندرجۂ ذیل بلڈنگس تعمیر ہونا ہیں۔

۱۔ مسجد۔ ۲۔ مدرسہ ثانویہ ۳۔ کرافٹ ٹیکنیکل اینڈ انڈسٹریل ٹریننگ کالج۔ ۴۔ سینٹرل لائبریری۔ ۵۔ ہاسٹل ۶۔ ہاسپٹل۔ ۷۔ آڈیٹوریم۔ ۸۔ اسٹاف کوارٹرز۔ ۹۔ پرنٹنگ پریس۔ ۱۰۔ جمنازیم۔ ۱۱۔ سوئمنگ پول ۱۲۔ گیسٹ ہاؤس۔

دینی تعلیم کے ساتھ عصری و صنعتی تعلیم اور بالخصوص ٹیکنیکل و ڈپلوما کورسز ان کمپیوٹر ایپلی کیشن ان کورسز کا دینی مدرسہ کے ماحول میں اجراء یقیناً ایک تاریخی قدم ہے اور یہ صرف جامعہ ہی کے لیے نہیں بلکہ مدارس اسلامیہ میں ترقی چاہنے والے اور دنیاوی ضرورتوں کے شانہ بہ شانہ چلنے والے مسافروں کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس طرح جامعہ نے دینی و عصری علوم کے امتزاج کی جو آواز اٹھائی تھی اور پھر محض خدا کے فضل سے بڑے منظم انداز سے اسے جس طرح عملی شکل دی۔ وہ اگرچہ شروع میں صدا بصحرا ثابت ہوئی لیکن اب الحمدللہ ملک کے مختلف گوشوں میں اس کی گونج سنائی دے رہی ہے اور دینی تعلیم کا ایک معتدبہ حلقہ اس طرف مایل نظر آتا ہے۔ وللہ الحمد اولاً و آخراً

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس پودے کو تناور درخت بنائے اور اسے ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے۔ اس نے مختصر عرصے میں جو ترقیاں کی ہیں وہ اس کے روشن مستقبل کی نشان دہی کرتی ہیں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲، شمارہ ۲، (فروری ۱۹۹۳)

نظریۂ ڈارون اور سماجی کیڑے

جاوید نہال حشمی★

ارتقا کے متعلق اب تک جتنے بھی نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں فرانس کے لیمارک اور برطانیہ کے چارلس ڈارون کے نظریات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ باقی جتنے بھی نظریات ہیں وہ سب اب صرف تاریخی اہمیت کے حامل رہ گئے ہیں۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ارتقا کا تصور ہی مذہب اسلام، عیسائیت، ہندوازم اور دوسرے مذاہب کے بنیادی عقاید کے خلاف ہے۔ ہمارے مذہب کے مطابق خدا نے انسان کو آدم اور حوّا سے پیدا کیا۔ یعنی انسان آج جس شکل میں ہے کروڑوں برس پہلے اپنے وجود کے ابتدا کے وقت بھی اسی شکل میں تھا۔ اسی طرح دوسرے تمام جاندار بھی جس شکل میں پیدا ہوئے تھے آج بھی اسی شکل وصورت میں موجود ہیں۔ لیکن سائنس کہتی ہے کہ تمام جاندار خواہ پودے ہوں یا جانور، انسان، ہاتھی چیونٹی، تلچٹا سب کے آباو اجداد ایک تھے۔ ایک ہی جاندار کی مختلف اولادیں کسی وجہ سے جب مختلف ماحول میں پھیل گئیں تو اپنے ماحول کے مطابق ان کی شکلوں میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں اور اس طرح آج ہم روئے زمین پر جانداروں کے اتنے مختلف اقسام دیکھتے ہیں۔ موجودہ دور کے مختلف تجربات اور دریافتوں سے بھی ارتقا کے نظریئے کو تقویت ملتی ہے۔

ارتقا کی حمایت میں سب سے ٹھوس ثبوت کھدائی سے ملے۔ ہزاروں برس پرانے جانداروں کے باقیات (Fossils) مثلاً ہڈیاں وغیرہ ہیں۔ ان فوسلس میں سب سے مکمل سیریز گھوڑے کی ہے جو گھوڑے کے ارتقا کا ایسا ثبوت پیش کرتی ہے جسے جھٹلانا بہت مشکل ہے۔ ارتقا کے نظریئے کی حمایت کرنے والے جہاں بجا طور پر اس نظریئے کے صحیح ثابت ہونے پر فخر کرتے ہیں وہیں اپنی ایک کمزوری کا بھی اعتراف کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ان ہی کے نظریئے کے مطابق وہ پہلا جاندار جس نے موجودہ تمام جانداروں کو جنم دیا خود کیسے پیدا ہوا؟ —— گرچہ ہالڈین، اوپارن، اسٹنلے اور میلر وغیرہ نامی سائنسدانوں نے تجربہ گاہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کا آغاز coecervate سے ہوا جو آج سے کروڑوں برس پہلے مختلف گیسوں کے کیمیائی تعمل سے بنا تھا لیکن یہ نظریہ ابھی بہت پھسپھسا ہے۔ ویسے آج بھی امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ کے سائنس داں تجربہ گاہوں میں مختلف کیمیائی مادوں سے "زندگی" پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔

ارتقا کا ہر نظریہ جدید سائنسی دریافتوں کی روشنی

★ ۲۸- بی۔ ایل ۲، کانکی نارہ، کلکتہ ۷۴۳۱۲۶- (مغربی بنگال)

میں غلط ثابت ہوتا گیا۔ یہ سلسلہ برسوں تک چلتا رہا۔ ارتقا کا وہ پہلا نظریہ جو کچھ سائنسی بنیاد رکھتا ہے اور تھوڑی بہت حقیقت پر مبنی ہے وہ لیمارک کا نظریہ ہے جسے لیمارکزم کہتے ہیں لیکن بعد کی دریافتوں اور تجربات نے اس نظریئے کی صحت پر بھی ایک بڑا سوالیہ نشان چھوڑ دیا ـــــ اور تب برطانیہ کے چارلس ڈارون نے ۱۸۵۹ء میں Origin of Species by Means of Natural Selection نامی کتاب میں اپنا مشہور "قدرتی انتخاب کا نظریہ" پیش کیا جس نے منظرِ عام پر آتے ہی سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ پوری دنیا کے سائنسی حلقوں میں بڑی گرم جوشی سے اس نظریئے کا استقبال کیا گیا کیونکہ یہ نظریہ ہر کسوٹی پر پورا اترتا نظر آیا۔ اس نظریئے نے ارتقائی اور قدرتی سائنس میں انقلابی تبدیلیاں لائیں لیکن یہ نظریہ بھی خامیوں سے یکسر خالی نہ تھا۔ ڈارون کا نظریہ چار اہم نکات پر مشتمل ہے۔

(الف) کثرتِ پیدائش۔ (ب) زندہ رہنے کے لیے جدوجہد (ج) اختلافات کی موجودگی اور (د) موزوں ترین جاندار کی بقا یا قدرتی انتخاب۔ مختصراً اس نظریئے کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ

ہر جاندار میں اولاد پیدا کرنے کی بے انتہا صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ایک مچھلی ایک بار میں لاکھوں انڈے دیتی ہے۔ مکھی، مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے بھی سیکڑوں انڈے دیتے ہیں۔ ایک درخت سے بھی ہزاروں اسپورس (SPORES) پیدا ہوتے ہیں لیکن سب کے سب تناور درخت نہیں بن پاتے ورنہ آج روئے زمین پر سوائے جنگلات کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح مچھلیوں کے تمام انڈوں سے بچے نکل کر بالغ ہو جائیں تو دریاؤں اور سمندروں میں پانی کی جگہ صرف اور صرف مچھلیاں ہوں گی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ جانداروں کی تعداد جتنی زیادہ بڑھے گی ان کے رہنے کی جگہ اتنی ہی تنگ ہوتی جائے گی اور دستیاب غذا بھی کم پڑنے لگے گی کیونکہ جگہ اور غذا دونوں کی مقدار محدود ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں جگہ اور غذا کے لیے جانداروں میں جدوجہد شروع ہو جائے گی جو اس جدوجہد میں کامیاب ہو جائے گا وہ زندہ رہے گا اور اپنی اولاد پیدا کر کے اپنی نسل کو برقرار رکھے گا اور جو ناکام ہوگا وہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ یہ قدرت کا بنیادی قانون ہے جس کا اطلاق کائنات میں ہر جگہ ہر وقت اور ہر جاندار بشمول انسان پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیائی ملکوں میں جہاں شرحِ پیدائش زیادہ ہے وہاں زیادہ آبادی اور محدود قدرتی وسائل کی وجہ سے پیدا شدہ جدوجہد کے نتیجے میں شرحِ اموات بھی زیادہ ہے۔

یہاں ایک اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ اس جدوجہد میں کسی بھی جاندار کی کامیابی اور اس کی نسل کی بقا کا سارا دارومدار اس جاندار میں پائے جانے والے اختلافات۔ (Variations) پر ہوتا ہے جو زندگی کی جدوجہد میں معاون ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں کوئی بھی دو جاندار بالکل ایک جیسے نہیں ہیں۔ ہر جاندار دوسرے سے تھوڑا یا بہت مختلف ضرور ہوتا ہے۔ یہ اختلافات اس جاندار کے لیے کسی مخصوص ماحول میں یا تو معاون ہوتے ہیں یا پھر نقصان دہ۔ معاون اختلافات کسی مخصوص ماحول میں اس جاندار کی زندگی کی بقا کی ضمانت ہوتے ہیں۔ اس اہم نکتے کو ہم ایک سادہ سی مثال سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے ایک افریقی سیاہ فام اور ایک برطانوی سفید فام ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ اچانک ماحول میں تبدیلی پیدا ہو جائے اور وہاں کے موسم کا درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہو جائے کہ گرمی برداشت سے باہر ہونے لگے تو ایسی صورت میں گورا شخص زیادہ دنوں تک اس قدرتی آفت سے نہیں لڑ سکتا اور جلد ہی بیمار پڑ کر مر جائے گا لیکن سیاہ فام اس تبدیلیٔ ماحول کا مقابلہ گورے شخص کے برعکس زیادہ دنوں تک کر پائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں افراد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک کی

جلد پتلی، گوری اور نازک ہے جب کہ دوسرے کی موٹی اور سیاہ۔ پہلے کی جلد سرد ممالک میں رہنے کی وجہ سے گرمی برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی لیکن دوسرے کی جلد افریقہ کی شدید گرمی برداشت کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیاہ فام میں پائے جانے والے اختلافات اس مخصوص ماحول میں اس کے لیے مفید ثابت ہوئے اور اس نے اس تبدیلیٔ ماحول سے نپٹنے کی جدّوجہد میں کامیاب ہو کر اولاد پیدا کر کے اپنی نسل کو برقرار رکھا۔ اس کے برعکس سفید فام میں پائے جانے والے اختلافات اس ماحول میں اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے اور اس کی نسل وہیں ختم ہو گئی۔

ڈارون نے اپنے نظریے کے آخری نکتے کا نام "قدرتی انتخاب" دیا ہے کیونکہ اس کے مطابق جو جاندار زندگی کی اس جدّوجہد میں کامیاب ہو جاتا ہے، اسے قدرت گویا منتخب کر لیتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اولاد پیدا کرے اور اپنی نسل کو آگے بڑھائے۔ ہر اگلی نسل میں مسلسل بدلتے ماحول کی وجہ سے اختلافات میں تھوڑا سا اضافہ ہوتا ہے۔ نتیجتاً کئی نسلوں کے بعد جاندار اپنے آباؤاجداد سے اس قدر مختلف ہو جاتا ہے کہ اسے ایک نئی نسل کی جماعت میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس طرح ارتقا کی وجہ سے آج اس قدر مختلف جاندار روئے زمین پر موجود ہیں۔

ڈارون کا یہ نظریہ جہاں برسوں سے موجود ارتقا کے متعلق بہت سے پریشان کن سوالات کے اطمینان بخش جواب دینے میں کامیاب ہوا اور کئی مسائل کا حل پیش کیا وہیں اپنے پیچھے چند سوالات بھی چھوڑ گیا۔ اس نظریئے میں موجود کئی خامیوں میں سے سب سے اہم خامی یہ تھی کہ ڈارون نے اس میں جانداروں میں موجود اختلافات کا ذکر تو کیا ہے لیکن یہ اختلافات ان میں کہاں سے آئے اُن کی شروعات کہاں سے ہوئی اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ دوسری خامی موزوں ترین جانور کی تعریف ہے۔ ڈارون کے مطابق جو جاندار کسی ماحول کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوتا ہے وہی زندہ رہتا ہے اور اس کی نسل آگے بڑھتی ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ عملی طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو جاندار اپنے ماحول کے ساتھ مکمل طور سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے وہ پھر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں کہیں بھی ماحول زیادہ عرصے تک ایک جیسا نہیں رہتا۔ اس میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہتی ہے لہٰذا اگر کوئی جاندار کسی مخصوص ماحول سے مکمل طور سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کے تمام اعضا اس ماحول کی ضروریات کے تحت تبدیل ہو کر اس ماحول سے مکمل مطابقت پیدا کر لیتے ہیں تو ایسی صورت میں ماحول میں اچانک تبدیلی جاندار کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ نئے ماحول کی ضروریات کے مطابق اپنے آپ کو فوراً تبدیل نہیں کر پاتا اور اس نئے ماحول میں زندگی کی جدّوجہد میں بُری طرح ناکام ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ دراصل اعضا میں تبدیلی چند برسوں کا نہیں بلکہ کئی نسلوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کی سب سے آسان مثال ہم مچھلیوں اور بطخوں سے دیں گے۔ ان دونوں کی جسمانی بناوٹ اور عادات و اطوار آبی ماحول سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن مچھلی کی جسمانی بناوٹ جتنا مکمل طریقے سے آبی ماحول سے ہم آہنگ ہوتی ہے اتنا بطخ کی نہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آبی ماحول کے لیے اگر بطخ موزوں تر ہے تو مچھلی موزوں ترین۔ اب فرض کیجیے دریا کا پانی خشک ہو جاتا ہے ایسی صورت میں ہم دیکھیں گے کہ مچھلیاں فوراً مر جائیں گی لیکن بطخیں خشکی پر بھی زندہ رہیں گی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آبی ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے مقصد سے بطخوں کی جسمانی بناوٹ میں ہونے والی تبدیلیاں ابھی ابتدائی یا درمیانی مرحلے میں ہوتی ہیں۔ لہٰذا ماحول میں تبدیلی ہوتے دیکھ کر وہ اُن تبدیلیوں کا رُخ بھی موڑ کر اس نئے ماحول کی طرف کر سکتی ہیں۔ اس طرح وہ اس نئے ماحول سے بھی مطابقت پیدا کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس مچھلیاں مکمل طور سے آبی ماحول سے مطابقت پیدا کر لیتی ہیں

نتیجتاً ماحول تبدیل ہونے پر وہ اپنے آپ کو بدل نہیں پاتیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ڈارون کے نظریئے میں "موزوں ترین جاندار" کی جگہ "موزوں تر جاندار" ہونا چاہیے۔

ڈارون کے نظریئے میں ان سب خامیوں کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت جب ڈارون نے یہ نظریہ پیش کیا تھا، جینیٹکس اور مائیکرو بائیولوجی وغیرہ جیسی سائنس کی شاخوں میں زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا ان میدانوں میں جدید دریافتوں کی روشنی میں تھوڑی ترمیم و اضافے کے بعد اس نظریئے کو نئی شکل دی گئی جو نیو ڈارونزم (Neo-Darwinism) کہلاتا ہے۔

گرچہ یہ نظریہ ہر نسل، ہر جاندار کی ارتقائی تاریخ کی مکمل طور سے تشریح کرتا ہے لیکن ایک اڑچن جو ڈارون کے وقت بھی تھی آج بھی موجود ہے ——— اور وہ ہے سماجی کیڑوں میں مزدور طبقوں کی موجودگی ——— سماجی کیڑوں کی ہر نسل میں ان مزدور طبقوں کی موجودگی کبھی بھی ڈارون کے نظریئے میں فٹ نہیں ہوئی۔ ان کی موجودگی تقریباً ایک سو برس تک قدرتی اور ارتقائی سائنس والوں کے لیے معمّہ بنی رہی۔ وہ معمّہ جس نے ڈارون جیسے قدرتی سائنس کے عظیم ترین دماغ کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو ڈارون کو ایسا لگا جیسے اس کی برسوں کی جان توڑ محنت، دنیا کے کونے کونے کی سیاحت اور مسلسل تحقیق صفر ہو کر رہ جائیں گی۔ سماجی کیڑوں کا یہ طبقہ اس کے نظریئے کے لیے سب سے بڑا چیلنج تھا۔ ڈارون کی زندگی بھر کی کوششوں سے ایک سے بڑھ کر ایک شاندار نتائج برآمد ہوئے سوائے اس ایک الجھن کے ڈارون نے فوراً اقرار بھی کر لیا کہ یہ کیڑے اس کے "قدرتی انتخاب" کے نظریئے کے لیے ایک معمّہ ہیں۔

یہ معمّہ کیا ہے؟ یہ جاننے کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم پہلے سماجی کیڑوں کے متعلق مختصراً کچھ جان لیں۔

اشرف المخلوقات انسان اور جانور کی زندگیوں میں جو ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ ہے انسان کی سماجی زندگی۔ جانور

اکیلا زندگی گزارتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی پہلو دوسرے جانور کی زندگی سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے رہن سہن کا انداز دوسرے جانور پر قطعی منحصر نہیں ہوتا لیکن انسانوں میں پلنے چلنے والے معاشرتی سسٹم میں ہر انسان ایک دوسرے پر کم و بیش انحصار کرتا ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسانی معاشرتی سسٹم میں "کام کی تقسیم" (Division of Labour) پایا جاتا ہے یعنی ہر الگ الگ کام کے لیے مخصوص طبقے ہوتے ہیں اور ہر طبقہ اپنے مخصوص کام میں دوسرے طبقے سے زیادہ ماہر ہوتا ہے اور اپنا کام بخوبی انجام دیتا رہتا ہے۔ اب ایسے میں اس سسٹم کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ہر طبقہ دوسرے طبقے کی سہولت کو مدّنظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرے۔

ظاہر ہے ایسی صورت میں انسانی زندگی کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ انسانوں میں معاشرتی سسٹم کیسے پیدا ہوا۔ اس کا جواب نہایت آسان ہے۔ ہر انسان ظاہر ہے ہر کام میں ماہر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ زندگی کی تمام سہولتیں بھی اپنے لیے خود سے فراہم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا فطری طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر مختلف کاموں کے لیے مختلف طبقے قائم کیے جائیں تو وہ سب باہمی تعاون سے زندگی کی زیادہ سے زیادہ سہولتوں کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس باہمی تعاون کے خیال نے معاشرتی سسٹم کو جنم دیا۔ اب یہ سوچا جا سکتا ہے کہ ——— چوں کہ جانور دماغی نشوونما اور ذہنی صلاحیتوں میں انسانوں سے کافی پیچھے ہیں۔ اس لیے ان میں معاشرتی سسٹم کا خیال اب تک نہیں پیدا ہو سکا ہے۔ لیکن یہاں کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے کہ جانوروں میں بھی کچھ کیڑوں مثلاً چیونٹی، شہد کی مکھی، دیمک وغیرہ میں ایسا پیچیدہ معاشرتی نظام پایا جاتا ہے جو بہت حد تک انسانی معاشرتی نظام سے ملتا جلتا ہے۔

یہ کیڑے جس سماج کی تشکیل کرتے ہیں اسے سائنسی

اصطلاح میں "کالونی" کا نام دیا جاتا ہے۔ شہد کی مکھیوں میں
ایک کالونی ۳۵ ہزار سے ۵۰ ہزار شہد کی مکھیوں پر مشتمل ہوتی ہے
جب کہ چیونٹیوں میں یہ تعداد چھ لاکھ تک ہوتی ہے اور دیمک میں
تو یہ تعداد کروڑ تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک حیرت انگیز بات یہ ہوتی ہے
کہ ہر کالونی کے تمام ممبر ایک ہی مادہ کے جنے ہوتے ہیں۔ پوری
کالونی میں عموماً صرف ایک رانی ہوتی ہے (سوائے چیونٹیوں کے
جہاں ایک سے زیادہ رانیاں ہوتی ہیں) اپنی ساری عمر ایک ہی
جگہ بیٹھے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں بچے جن کر ایک مکمل کالونی
کی تشکیل کرنا ہی ان کا واحد کام ہے۔ ہر کالونی کی شروعات صرف
ایک رانی سے ہوتی ہے۔ ان کیڑوں کی افزائش نسل کے طریقے
میں ایک سب سے حیرت انگیز اور منفرد بات یہ ہوتی ہے کہ ایک مادہ
(رانی) بغیر زرخیزی کے بھی اپنے انڈوں سے بچے پیدا کرسکتی ہے
جسے Haplodiploidy کہتے ہیں۔ بغیر زرخیزی کے
(Unfertilized) انڈوں سے نکلنے والے بچے نر ہوتے
ہیں جو صرف عمل تولید کرکے مرجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان
کا اور کوئی رول نہیں ہوتا۔ اس لیے انھیں کالونی کا جز ولاینفک
نہیں کہا جاسکتا جب کہ (Fertilized) انڈوں سے مادہ
بچے پیدا ہوتے ہیں جن میں ۹۹٪ بانجھ ہوتی ہیں۔ یہ بانجھ مادائیں
ہی مختلف طبقوں میں بٹ جاتی ہیں۔ مزدور طبقے کی مادائیں
قد و قامت میں سب سے چھوٹی ہوتی ہیں اور ان کے کام دور
دراز کے مقامات سے غذا لاکر کالونی کے چیمبروں میں جمع کرنا،
چیمبروں میں موجود باغوں میں کالونی کی غذا یعنی فنگی اگانا، رانی
کے انڈوں کی دیکھ بھال کرنا، اس کے بچوں کی پرورش کرنا وغیرہ
ہیں۔ دوسرے طبقے کی ماداؤں کے سر تقابلتاً بڑے، جبڑے تیز اور
نوکیلے ہوتے ہیں۔ یہ سپاہی ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ مختلف
چیمبروں کے دروازوں پر، رانی کے گرد گارڈ کا رول ادا کرتی ہیں
بقیہ کالونی کی فوجیں ہوتی ہیں جن کا کام کالونی کو دشمنوں کے
حملوں سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی اور طبقے
ہوتے ہیں اور ہر طبقہ پھر کئی چھوٹے طبقوں میں بٹا ہوتا ہے غرض کہ
ان کا پورا معاشرتی نظام پیچیدہ اور انسانی معاشرتی نظام سے
کافی حد تک مماثلت رکھتا ہے اور سب سے دلچسپ بات تو
یہ ہے کہ یہ نظام لاکھوں برس پہلے اس وقت سے ان میں پایا
جاتا ہے جب انسان نامی کوئی مخلوق وجود میں بھی نہیں آئی تھی یعنی جہاں
تک معاشرتی نظام کے ارتقا کا تعلق ہے، یہ انسانوں سے کافی
سینیئر ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈارونزم کے مطابق ان
بانجھ طبقے کے کیڑوں کو تو ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ جانا چاہیے
تھا کیونکہ وہ افزائش نسل کی صلاحیت سے محروم ہونے کے باعث
اپنی نسل جاری رکھ ہی نہیں سکتے۔ پھر بھی یہ ہر کالونی اور ہر نسل
میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نظر آتے ہیں اور اپنی ساری
عمر غلاموں کی سی زندگی بسر کرکے کالونی کی دیکھ بھال میں گزار دیتے
ہیں۔ نظریۂ ڈارون کے مطابق اگر ایک مخصوص ماحول میں
کسی نسل کے جانور کی موزونیت کی پیمائش اس نسل کے ذریعے
پیدا کی گئی اولادوں کی تعداد ہوتی ہے تو کیڑوں میں غلام طبقہ
کب کا فنا ہوچکا ہوتا۔ کیوں کہ اس طبقے کے کیڑے اپنی اولاد
پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ مخصوص الجھن ڈارون کے
نظریے کے لیے مہلک ثابت ہو رہی تھی جس نے خود ڈارون اور
بعد کے دوسرے ارتقائی سائنس دانوں کے دماغ کی چولیں
ہلاکر رکھ دی تھیں۔ خود ڈارون نے اس مسئلے کا کچھ حد تک
اطمینان بخش جواب یوں دینے کی کوشش کی ہے کہ قدرتی
انتخاب کے نظریے کا اطلاق سماجی کیڑوں کے معاملے میں ان کی
انفرادی حیثیت پر نہیں بلکہ مجموعی طور سے پوری کالونی پر
ہوتا ہے۔ یعنی اس نظریے کے نکتے ''موزوں ترین جانور کی
بقا'' کو سماجی کیڑوں کے معاملے میں ''موزوں ترین کالونی کی بقا''
خیال کیا جانا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں
کہ اگر ایک پوری کالونی کو ایک جانور مان لیا جائے اور اس
کے مختلف طبقوں کو اس جانور کے مختلف اعضاء ـــــ جیسے
مزدور طبقہ جو دور دراز سے غذا ڈھونڈکر کالونی کے چیمبر میں

لاکر علم کرتا ہے اس جانور کے ہاتھ کی مانند ہے جو غذا جانور کے منہ تک لے جاتا ہے ---- تو یہ مسئلہ کچھ حد تک آسان ہوجاتا ہے۔ ایڈمنڈ ولسن نے بھی جو دنیا کے مشہور ترین ارتقائی سائنس دانوں میں سے ایک ہیں ڈارون کی اس دلیل کی حمایت کی ہے۔

سماجی کیڑوں میں بانجھ غلاموں کی موجودگی کی معقول وجہ کی تشریح کے لیے اب تک تین نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ ایک کے مطابق، غلام طبقہ بانجھ نہیں ہوتا بلکہ کالونی کا طاقتور طبقہ اسے زبردستی بانجھ اور غلاموں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ دوسرے کے مطابق، غلام طبقہ مکمل طور سے بانجھ نہیں ہوتا۔ یہ جانور اس لیے کالونی میں ساتھ رہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے باہمی تعاون سے وہ فائدے اٹھا سکیں جو وہ اکیلی زندگی گزار کر نہیں اٹھا سکتے۔ تیسرا نظریہ جسے ہیملٹن نے پیش کیا تھا انتخاب اقارب کا نظریہ (Theory of kin selection) کہلاتا ہے۔ یہ نظریہ سب سے معقول مانا جاتا ہے۔ اس کے مطابق Haplodiploidy کی وجہ سے ایک والدین کی تمام اولادیں اپنے والدین سے جتنی قریب ہوتی ہیں اس سے کہیں زیادہ یہ ایک دوسرے کے قریب ہوتی ہیں۔ اسے ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ چونکہ نر Unfertilized انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے ان میں ماں کے کروموزوم کے دو سیٹوں میں سے ایک سیٹ ہوتا ہے جب کہ باپ کا ایک بھی سیٹ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مادائیں جو Fertilized انڈوں سے پیدا ہوتی ہیں ماں کے کروموزوم کے دو سیٹوں میں سے ایک اور باپ کے کروموزوم کا واحد سیٹ پورا کا پورا لیتی ہیں جس کے نتیجے میں بہنوں کے درمیان ۷۵ فیصد کروموزوم مشترک ہوتے ہیں۔ جب کہ ہر مادہ اور اس کے ماں یا باپ کے درمیان ۵۰ فی صد کروموزوم مشترک ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے دو جانوروں کے درمیان جتنی مماثلت جتنی زیادہ مشترک ہوگی ان دونوں میں اتنی ہی زیادہ قربت ہوگی۔ لہٰذا ان میں اولاد اپنے والدین سے جتنی قریب ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اپنی بہن سے قریب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مادہ اپنی اولاد پیدا کرنے کے بجائے جو اس سے زیادہ قریب نہیں ہوتی، اپنی بہن کی پرورش کرنے کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دیتی ہے جو اس سے اس کی اپنی اولاد سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اپنی اولاد سے زیادہ اپنی بہن کی قربت ہی ایک مادہ کو اپنی تولیدی صلاحیت ختم کر کے بانجھ بن کر غلاموں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

حال ہی میں ایک ہندوستانی محقق ڈاکٹر رگھوویندر گدآگکر کی ان سماجی کیڑوں کے متعلق کچھ نئی دریافتوں کے بعد ہندوستان کے مختلف اخبارات میں یہ قیاس آرائی کی گئی تھی کہ بہت ممکن ہے ان کا نظریہ جو ابھی تکمیل کے مرحلے میں ہے، ڈارون کے اس الجھن کا حل دریافت کر دے جو پچھلے ۱۳۰ برسوں سے ساری دنیا کے ارتقائی سائنس دانوں کے لیے معمہ بنی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر گدآگکر نے سماجی کیڑوں میں بانجھ غلاموں کی موجودگی کے متعلق مذکورہ بالا تینوں نظریات کو یکسر تو رد نہیں کیا ہے لیکن ان کے مطابق یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ انھوں نے ہیملٹن کا نظریہ یہ کہہ کر ماننے سے انکار کیا ہے کہ رانی اپنی زندگی کے دوران کئی نروں سے جنسی ملاپ کرتی ہے۔ کیونکہ ایک نر صرف ایک بار جنسی ملاپ کے بعد مر جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے بطن سے پیدا شدہ مادائیں ایک دوسرے کی سگی بہن ہونے کے بجائے سوتیلی بہن ہوتی ہیں لہٰذا ان میں اتنی قربت نہیں ہو سکتی کہ یہ اپنی اولاد سے زیادہ اپنی بہنوں کو ترجیح دیں۔ دوسرے کالونی کا کوئی ممبر اس قابل نہیں ہوتا کہ سگی بہن اور سوتیلی بہن میں تمیز کر سکے۔ ڈاکٹر گدآگکر پچھلے دس برسوں سے بنگلور میں ایک سماجی کیڑے (wasp) پر تجربات کر رہے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق ان کیڑوں میں بانجھ غلاموں کی موجودگی کی وجہ صرف

یوں بیان کی جاسکتی ہے۔

اکیلے زندگی بسر کرنے والے Solitary جانور جب ایک دوسرے کے قریب آکر ایک ساتھ زندگی بسر کرنا شروع کرتے ہیں تو اس کا مقصد باہمی تعاون سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ہوتا ہے اور اسی طرح معاشرتی نظام کی شروعات ہوتی ہے۔ جب ان کی کالونی بڑھنے لگتی ہے تو ان میں کچھ "دھوکے باز" بھی پیدا ہونے لگتے ہیں جو اس معاشرتی نظام سے اپنے حصے سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ غذا میں کمی وبیشی یا کچھ دوسری وجوہات کی بنا پر کچھ جانوروں (کیڑوں) کی تولیدی صلاحیت گڑبڑ جاتی ہے جس سے فائدہ اٹھاکر یہ "دھوکے باز" ان کا استعمال کرتے ہیں اور طاقت کے بل پر انھیں زبردستی مستقل طور پر غلاموں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ ایسے ہی مایوس کن حالات میں جب انھیں یقین ہوجاتا ہے کہ اب انھیں اولاد پیدا کرنے کے مواقع نہیں مل سکتے تو وہ اپنی رہی سہی زندگی اور سب کچھ اپنی قریبی بہنوں کی پرورش اور بھلائی کے لیے وقف کردیتی ہیں۔

ڈاکٹر گڈاگکر کے مطابق وہ اس نکتے پر بھی غور کر رہے ہیں کہ جب کوئی اکیلا زندگی بسر کرنے والا جانور زچہ جنتا ہے تو بچوں کے انڈوں سے نکلنے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے تک اس کا زندہ رہنا ضروری ہوتا ہے لیکن کالونی کی شکل میں رہنے پر یہ مسئلہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اسے کچھ ہو بھی جائے تو اس کے بچوں کے تئیں اس کے فرائض کالونی کے دوسرے ممبر اٹھالیتے ہیں۔ دوسرے، رانی کی زندگی کی میعاد پوری ہوجانے پر اسے جان سے مار دیا جاتا ہے یا اسے نکال باہر کیا جاتا ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسری مادہ رانی مقرر کی جاتی ہے۔ لہٰذا غلام مادائیں اس امید پر کالونی کا ساتھ نہیں چھوڑتیں کہ شاید کبھی انہیں رانی بننے کا موقع نصیب ہو۔ آج کل ڈاکٹر گڈاگکر اپنی دریافتوں کو نظریاتی شکل دینے کے لیے Mathematical Model تیار کرنے میں مصروف ہیں۔

بقیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۴۳

میر تقی میر کے اس شعر کی تفسیر ہوتی ہے ؎

ہارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

(سید الطاف علی بریلوی کی چھٹی برسی کے موقع پر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا۔)

بقیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۳۹

دستور کی کتنی ہی دہائیاں دی گئیں مگر کسی نے سنا نہیں۔ تعلیمی فضا جو اتحاد اور اتفاق کی اجارہ داری تھی۔ یکایک آندھیوں کی زد میں آگئی۔ حق ناحق ہوگیا اور فرض اپنے بنیادی کردار سے دست بردار ہوگیا۔

ہماری قومی تعلیمی پالیسی کاغذات کا ایک پلندہ ہے، عمل درآمد میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ نئے نئے تعلیمی منصوبے اُبل رہے ہیں۔ بادل بن کر اوپر اٹھتے ہیں اور کھنڈرات پر برس کر چلے جاتے ہیں۔ کیسی کیسی کلیاں ان چٹانوں میں نمودار ہوئیں مگر سب کی سب مرجھاکر رہ گئیں۔

نئی تعلیم اور پرانے کھنڈر

ریاض الدین احمد *

گزشتہ چار دہائیوں میں مغربی طریقۂ تعلیم گھوم گھوم کر ہمارے سروں پر منڈلایا کیا لیکن ہر جگہ زمیں شور پائی اور نامراد واپس گیا اچھے اچھے منصوبے آئے۔ ہمارے ماہرین تعلیم نے انھیں لبیک کہا گوشٹیاں اور ٹریننگ کیمپ لگائے گئے۔ لاکھوں کا وارا نیارا ہوا۔ مفت کی دولت لٹتی دیکھی۔ مگر قوم ترقی کی راہ پر چلنے سے صاف انکار کرتی رہی۔ قوم کو کیوں الزام لگائیں۔ حکومت نے بھی کبھی یہ نہیں سوچا کہ بیج ڈالنے سے پہلے زمین تیار کرنا چاہیے آیئے دیکھیں یہ زمین کیسی ہے۔ ایک نامور لڑکیوں کے اسکول میں چلتے ہیں۔ یہاں پرنسپل نے ایک نوٹس جاری کیا ہے کہ تعلیم کے اوقات میں کوئی لڑکی کلاس کے باہر نہ دکھائی دے۔ اساتذہ نے دہائی دی کہ کلاس تو اسی وجہ سے چل رہا ہے کہ آدھی لڑکیاں باہر ہیں۔ کلاس روم میں نہ بیٹھنے کی جگہ ہے نہ کھڑے ہونے کی۔

ایک مدرسے کے کسی ناراض اساتذہ کے گروپ نے یہ طے کر لیا کہ کلاس میں نہیں جائیں گے، نہ پڑھائیں گے۔ پورا مہینہ گزر گیا۔ منیجر نے انسپکٹر سے پوچھا "جناب! اب کیا کریں؟" حکم ہوا "سخت کارروائی کی جائے"۔ منیجر نے ماہانہ تنخواہ کے بل میں ان کا نام شامل نہیں کیا۔ اب انسپکٹر صاحب کی یہ بہت کمائی تھی کہ بغیر ان ناموں کے بل پاس کر دیتے کیونکہ پھر یونینیں ان کے بال نوچ لیتیں۔ مجبوراً منتظمہ کو ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ یہاں فیصلہ تو کئی سال لے سکتا ہے۔ مگر عدالت نے یہ اجازت دے دی کہ متاثرہ اساتذہ کے بغیر بل پاس کر لیا جائے۔ اب متاثرہ گروپ نے اصلاح کے بجائے تخریب کا رخ اختیار کر لیا اور ان کی پوری حکمتِ عملی منتظمہ کو گرانے میں لگ گئی۔

اب ایک سرکاری جونیر ہائی اسکول کی طرف چلتے ہیں یہ اسکول ایک کافی بڑے کھلے ہوئے میدان میں تعمیر ہوا ہے لیکن اس کی چہار دیواری جو ابھی حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کی ایک ایک اینٹ اہلِ حاجت اٹھالے گئے ہیں۔ کمپاؤنڈ میں بالو والوں نے بالو کے ٹیلے جما دیے ہیں۔ ایک حصے میں پتھر کی گٹیوں کا ڈھیر لگا ہے۔ کونے میں ایک جھونپڑی ہے جو شاید ان کاروباریوں کا دفتر ہوگا۔ کھیل کا یہ میدان گزار کر اسکول کی عمارت بنی ہے۔ اگرچہ بہت اچھی عمارت ہے مگر اس کی سب کھڑکیاں اور دروازے مجروح ہیں۔ سفیدی کی کوئی یادگار باقی نہیں ہے۔ بچوں کے بیٹھنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ تختہ سیاہ تختۂ سفید میں تبدیل ہو گیا ہے۔ آپریشن بلیک بورڈ (Operation — Black Board) کے مسائل میں اساتذہ کے پاس چاک کی ایک کرلی بھی نہیں ہے۔

ایک اور بہت بڑے نامی گرامی ادارے میں چلتے ہیں۔ یہاں طالب علموں کی تعداد آٹھ ہزار بتائی جاتی ہے۔ ہر سیکشن میں دو سو یا اس سے زیادہ بچے ہیں۔ یہاں کا پرنسپل کوئی تعلیمی کام نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے پاس تنظیمی اور ڈسپلن کے مسائل کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ لیے

* سابق پرنسپل، نورالشمس روڈ، ارم آباد۔

[illegible] اساتذہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ پاس نہیں ہو جاتے۔

ایک اقلیتی اسکول میں چلتے ہیں۔ یہاں دو بجے سہپر کے بعد آدھا اسکول خالی ہو جاتا ہے۔ بچے اپنے اپنے گھر اور اساتذہ اپنے زیادہ ضروری مشاغل کے لیے فارغ۔ قانوناً یہاں کے مسائل میں منتظم نسبتاً آزاد ہے مگر عملاً مفلوج ہے۔ یہاں تقرریوں کے خلاف رٹ کا عام رواج ہے۔ اگر رٹ سے بچ گئے تو انسپکٹر کا دفتر دخیل ہے۔ یا تو منظوری (Approval) رکی پڑی ہے یا اعتراضات کی بھرمار ہے۔ ایک معمولی اسامی کی تقرری میں اس اسکول کو تین سال لگ گئے۔ وہ بھی معاملہ اس وقت طے ہوا جب ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ یہاں اساتذہ کی یونین غالب اور والدین کی تنظیم غائب ہے۔ اساتذہ اپنے حق سے زیادہ لینا چاہتے ہیں۔ شاگردوں کو ان کا صحیح حق بھی میسر نہیں ہے۔

اور آئیے ذرا اس پرائمری اسکول کو دیکھتے چلیں۔ اسے بیسک شکشا پریشد چلا رہا ہے۔ یہ ایک چار مدرسوں کا مدرسہ ہے۔ بچوں کی تعداد تو خاصی ہوگی مگر آسٹھ حاضر ہیں۔ ہر مدرس باری باری سے آجاتے ہیں۔ دو کی درخواستیں میز پر پڑی ہیں۔ اگر حادثاتی طور پر کوئی افسر آ نکلا تو درخواست کام آئے گی۔ ورنہ پھاڑ کر پھینک دی جائے گی۔ ایک بچوں کا پرائمری اسکول بھی دیکھ لیجیے۔ یہ مدرسہ ایک پرائیویٹ مکان میں لگا ہوا ہے۔ لب سڑک دو کمرے نظر آ رہے ہیں۔ استانیاں راہ گیروں کی نظر سے بچ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ کمروں کے سامنے ایک ٹوٹا پھوٹا چبوترا ہے۔ اس پر کچھ بکریاں پلتھا مارے بیٹھی ہیں اور ان کی مینگنیاں بکھری ہیں۔ شاید جب سے یہاں اسکول قائم ہوا ہے کبھی نہ اس کی مرمت ہوئی ہے نہ سفیدی۔ ممکن ہے کرایہ اتنا قلیل ہو کہ مالک مکان اس سے مرمت بھی نہ کروا سکے۔

ایک ہمارے اردو ٹیچر کی داستان بھی سن لیجیے۔ میں اردو ٹیچر ہوں۔ زیادہ تر ہندی کے کلاس پڑھاتا ہوں۔ پانچ درجوں میں اردو کے بچے کم ہی کم ہیں۔ اس لیے سب کو ساتھ ہی پڑھا دیتا ہوں۔ اگر یہ کوشش کروں کہ اردو والے بچوں کی تعداد بڑھ جائے تو میرا تبادلہ کسی ایسے مدرسے میں ہو جائے گا جہاں ایک بچہ بھی اردو پڑھنے والا نہیں ملے گا۔ اردو کے لیے کوئی باقاعدہ درسی کتاب نہیں ہے۔ عارضی طور پر بیسک ریڈر کو پڑھانے کا حکم ہوا تھا وہی برسوں سے جاری ہے۔ اردو طالب علم کو اپنا معیار بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اردو کے مارکس امتحان میں اس کی پوزیشن پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ نہ اردو استاد کو محنت کرنے سے کوئی فائدہ ہے کیونکہ آئندہ ترقی کے راستے اس پر کھلے ہوئے نہیں ہیں۔"

غیر سرکاری پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں مالی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے جن اسکولوں میں تنخواہیں سرکار دیتی ہے وہاں اسکول کی ٪۸۰ فیصد آمدنی سرکاری کوش میں داخل کرنا پڑتی ہے۔ اس کے بھی دو حصے ہیں منظور شدہ مدات اور نامنظور مدات۔ اس طرح ہر نئے خرچ پر پوری ناکہ بندی ہے۔

دراصل ہمارا پورا تعلیمی محاذ عدم اعتمادی کا شکار ہے بعد آزادی عدم اعتمادی کو زیادہ سے زیادہ فروغ ہوا۔ جو ہے کے پیے بلّی اور بلّی کے لیے کتّے کی پالیسی چلنے لگی۔ اب اختیار اور تنظیم افسر شاہی کے پاس ہے۔ ضلع انسپکٹر کے بغیر اسکول سانس نہیں لے سکتا۔ انسپکٹر قانون کا بادشاہ ہے۔ معاملات کو سمجھنا بابو کا کام ہے۔ دستخط انسپکٹر کرتا ہے۔ اکثر اسے دستخط کرنے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ اس کے بابو برائے انسپکٹر (For Inspector) کر کے گاڑی چلا دیتا ہے مگر گاڑی کا پہیا بلا تیل پانی کے نہیں چلتا۔ پہلے مشین تیل کم کھاتی تھی سیکڑوں میں کام چل جاتا تھا۔ اب ہزاروں کی بات ہوتی ہے۔ تیل کی مشین اب اوپر سے نیچے تک پھیلنے لگی ہے۔ جس کے ہاتھ میں جہاں ہوتی ہے بیٹھ جاتا ہے

چکتا۔ فارم داخلہ سے لے کر تاجائزہ پر موشن تک وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو سوچا نہیں جا سکتا تھا۔ اوپری سطح پر پرچے اب پہلے سے زیادہ آوٹ (Out) ہو رہے ہیں۔ امتحان سرکاری ہاتھوں میں پہنچتے پہنچتے نقل کے بازار میں تبدیل ہوگیا امتحان کے اندر غنڈہ گردی کا عمل دخل ہوگیا۔ امتحان پولس کی حراست میں ہونے لگا۔ نقل بازاری میں افسر شاہی اور پولس سب ملوث ہوگئے۔ قلم پنسل کی جگہ چھرے چاقو نے لی۔ استادوں نے پڑھانے کے بجائے نقل کرانے کی مشق شروع کردی۔ اگر ہماری یادداشت خطا نہیں کرتی تو اسکولوں کے زیر اہتمام جو امتحانات ہوتے تھے وہ ان امتحانات سے کہیں زیادہ پاک صاف ہوتے تھے جو اب سرکاری پہرہ داری میں ہو رہے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک مفلوج تعلیمی معاشرے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہاں ترقیاتی پروگرام کی بات ایسی ہے کہ "مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر" اس کے مقابلے میں ذرا سعودیہ یا امارات خلیج کے ہندوستانی اسکولوں کو دیکھیے وہی اساتذہ ہیں، وہی بچے ہیں، وہی نصاب تعلیم ہے۔ اسکول عرب میں ہے۔ امتحان ہندوستان کا ہے۔ کسی اسکول کا نتیجہ ۸۰ فیصد سے کم نہیں۔ بیشتر کا سو فیصدی ہے۔ کامیاب طلبا کی تعداد زیادہ تر فرسٹ ڈویژن کے خانے میں ہے۔ نہ یہاں کوئی انسپکٹر کا دفتر ہے نہ کہیں پولس لگی ہے۔ اسکول ایک با اختیار اور ذمہ دار ادارہ ہے۔ پرنسپل ایک عظیم اور با اختیار کرسی پر بیٹھتا ہے۔ تجربہ اور صلاحیت میں وہ اپنے تمام ساتھیوں کے مقابلے میں افضل ہے جب کہ ہمارے یہاں پرنسپل کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں۔ اور تجربہ اور صلاحیت اور قابلیت میں اپنے ساتھیوں سے کمتر ہو سکتا ہے۔ اساتذہ کے تقرر میں بھی وہاں پوری احتیاط برتی جاتی ہے جب کہ ہمارے یہاں صلاحیت پر سفارش ایک غالب ہوجاتی ہے۔ امریکی اسکولوں میں تقرری کا پیمانہ پہلے سے قبل استاد کو کم سے کم ایک ہفتہ کلاس میں جاکر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اور بچوں کا تاثر اس کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہوتا ہے۔ اگر ہم ایسا ہی یہاں کرتے تو کیا کوئی بڑی بات ہوتی؟ یا کوئی مالی رکاوٹ حائل ہوجاتی؟

دوسری اہم چیز وہاں والدین اور اسکول کے درمیان قریبی رابطہ ہے۔ ایک برٹش اسکول میں دیکھا گیا کہ استادوں سے ملاقات کے لیے والدین کے پاس ایک باقاعدہ ٹائم ٹیبل بھیجا جاتا ہے اور وہ اس پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض وقت استاد کے کمرے پر کیو (Q) لگ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے یہاں والدین کا اسکول سے نہ کوئی رابطہ ہے نہ یہاں والدین کی کوئی جماعت ہے۔ حالانکہ اساتذہ کی جماعتی بے راہ روی کے لیے والدین کی ایک طاقتور تنظیم وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ وہاں کے اسکولوں میں استاد مکمل جواب دہ ہے۔ وہاں ڈسپلن بھی سخت ہے۔ لیٹ اسکول پہنچنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ نہ استاد لیٹ ہوتا ہے نہ بچے لیٹ آتے ہیں۔ چھٹیاں محدود ہیں۔ سالانہ تعطیلات کے علاوہ صرف ایمرجنسی چھٹی (Emergency Leave) ہے۔ احتجاج اور اسٹرائک کا وہاں کوئی سوال نہیں ہے (نہ اس کی ضرورت ہے) خلیجی جنگ کے زمانے میں جو تعلیمی دن ضائع ہوئے تھے وہ بعد میں پورے کیے گئے۔ یہاں کم سے کم ایک چوتھائی تعلیمی سال ضرور ضائع ہوجاتا ہے مگر اس کو پورا کرنے کا کوئی نظم نہیں ہے یہاں استاد ایک بار مستقل ہوجانے کے بعد کارکردگی اور صلاحیت کے کسی پیمانے کا محتاج نہیں رہتا۔ بلکہ سالانہ ترقی اور پنشن باوجود Permanency (Efficiency) بھی بلا کارکردگی کی ناپ تول کے گزارتا چلا جاتا ہے۔

ہر ترقی پسند ملک میں بچوں کی، اساتذہ اور اچھے اسکولوں کی ہمت افزائی کے لیے بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ قطر میں حاکم کبھی کبھی ایسی ماؤں کے کسی کلب میں اکٹھا ہوتی ہیں۔ ہر ایک کو کوئی تحفہ پہنچاتی ہے اور انھیں کو تقسیم کردیا جاتا ہے

دوبئی میں انڈین اسکولوں کے ٹاپرس (Toppers) کے لیے [illegible] ٹائمس خاص نمبر نکالتا ہے۔ اس میں بچوں کی اور ان کے خاندان والوں کی رنگین تصاویر ہوتی ہیں اور ان کے حالاتِ زندگی پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک برٹش اسکول میں بچوں کا ڈرامہ ہوا اس میں ۲۰۰ بچوں بچیوں نے بلی کا پارٹ ادا کیا۔ اسے ٹی وی پر دکھایا گیا اور بلیوں کی لیڈر کانی بلی سماٹی۔ وی انٹرویو نشر ہوا۔ بچے اپنے برتھ ڈے (یوم ولادت) کا اعلان ریڈیو پر سن کر خوش ہو جاتے ہیں۔ امریکہ میں ایک چھٹے گریڈ کی طالبہ کو صلاحیت (Merit) کا سرٹیفکیٹ صدر امریکہ کے ہاتھ کی دستخط سے جاری ہوا۔ یہاں کی ڈیوک یونیورسٹی (Duke University) ریاضی - میتھمیٹکس (Mathematics) کے باصلاحیت بچوں کی تلاش کا ایک پروگرام چلاتی ہے۔ ایک بچی کو ڈیوک یونیورسٹی نے جو سرٹیفکیٹ دیا ہے اس میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے ۵۵ ہزار باصلاحیت طلبا اور طالبات میں مقابلہ کرکے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ ایک پرائیویٹ ایجنسی Who's who Among American Highschool Student امریکہ بھر کے باصلاحیت بچوں کی تلاش کرکے انھیں انعام و اکرام سے نوازتی ہے۔ اس طرح یونیورسٹی گریڈ والے اپنا خام مال نیچے کی سطح سے تیار کرتے ہیں۔

یہ سب چیزیں تعلیمی کردار کی تربیت کے لیے ضروری ہیں اس لیے وہاں جو نئے نئے منصوبے آتے رہتے ہیں وہ بنجر زمین پر ضائع نہیں ہوتے۔ اپنے یہاں استاد کسی نئے پروجیکٹ پر مشق کرکے واپس آتا ہے تو اس کی نہ ہمت افزائی ہوتی ہے نہ اس کو کوئی عملی سہولت فراہم ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بابائے امتحانات ڈاکٹر بلوم (Dr. Bloom) تشریف لائے اور بہت سے اساتذہ کو Objective Type سوالات بنانے کے اصول بتائے اور مشق کرائی مگر ہمارے انٹرمیڈیٹ بورڈ نے ان کو استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس لیے آج تک یہاں ناقص Objective سوالوں کا سلسلہ جاری ہے۔

مختصر یہ کہ ہم قیمتی منصوبے بنجر زمین پر پٹکنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اسے مختصراً پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ یہاں تعلیمات پر سیاسی اجارہ داری تقریباً ۴۰ سال سے چلی آ رہی ہے۔ اس لیے کوئی تعلیمی منصوبہ اپنی فطری جوانی کو نہیں پہنچ پاتا۔ ہر نئی حکومت تعلیمی ڈھانچے کو اپنے سیاسی مقاصد کے لحاظ سے تبدیل کر دیتی ہے اور مالی امانت میں اسے آخری درجہ دیتی ہے۔

۲۔ تعلیم کا ہر شعبہ عدم اعتمادی کی زد میں ہے۔ اس لیے تعلیمی عملیات اور تعلیمی تنظیمات میں کوئی جوڑ باقی نہیں ہے۔ مدرسے کو کتنے اور کیسے اساتذہ کی ضرورت ہے اس کا فیصلہ اوپر سے ہوتا ہے۔ درسیات کیا ہوں گے اس کا فیصلہ غیر درسی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ تعلیمی گھنٹوں کی ترتیب اوپر سے لکھ کر آتی ہے۔ ٹائم ٹیبل کی ترتیب میں گورنمنٹ آرڈر کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ امتحان کی دیکھ ریکھ پولس کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا پبلک امتحان دنیا کا وہ واحد امتحان ہے جو پولس کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں جہاں اور جتنے جتنے اختیارات اسکول سے لے لیے گئے ہیں وہیں حالات بد سے بدتر ہیں۔ بدنظمی جتنی تھی اس سے سو گنا زیادہ ہے، کرپشن جتنا تھا اس سے سو گنا زیادہ ہو گیا ہے۔ نقل بازی جتنی چلتی تھی اس سے ہزار گنا زیادہ ہے۔ استاد جتنا غیر ذمہ دار تھا اس سے سو گنا زیادہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مالیات کا جو حصہ تعلیمی ترتیبات پر خرچ ہونا چاہیے تھا وہ دو سفید ہاتھیوں پر خرچ ہو رہا ہے۔ ایک ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ دوسرے انٹرمیڈیٹ بورڈ۔ اس بورڈ کی اب واحد افادیت یہ ہے کہ کئی لاکھ اساتذہ اور تعلیمی عملے کو ممنونِ احسان کیا جاتا ہے تاکہ ووٹ بکس محفوظ رہے۔ ورنہ

اس وقت بورڈ کا سرٹیفکیٹ کسی بھی کالج یا یونیورسٹی میں داخلے کا مستحق نہیں بناتا اور ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ کی جو شاخیں اضلاع میں کام کر رہی ہیں۔ انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ شہر کے کتنے تعلیمی ادارے دن بھر کھلے رہتے ہیں۔ نا اہل اداروں کے خلاف وہ کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ایک کارگزاری پینل انسپکشن۔ (Panel Inspection) کے نام سے ہوا کرتی تھی۔ اب وہ بھی برائے نام اور بے اثر ہے۔ اوّل تو پینل کے ممبران آتے ہی نہیں کیونکہ ٹی۔ اے بل برسوں نہیں پاس ہوتا۔ مقامی لوگوں کو دھر پکڑ کر جو معائنہ کرا دیا جاتا ہے اس کا نہ وقار ہے نہ اہمیت۔ نہ اس کی رپورٹ آتی اور آئی بھی تو اس پر نہ عمل ہے نہ تادیبی کارروائی۔ دفتروں میں لال فیتے اور کرپشن کا راج ہے ایسے دفتروں پر جو کثیر رقم خرچ ہو رہی ہے۔ اس کی صحیح جگہ تعلیمی ادارے ہیں۔ جہاں اچھے سے اچھے تعلیمی پروجیکٹ بھوک کی موت مر رہے ہیں۔

٣۔ افسر شاہی: تعلیمی محکموں کے افسران مشیر کار کم ہیں حکمراں زیادہ۔ نئی تعلیمات کی دوڑ میں وہ ذہنی طور پر بہت پیچھے ہیں۔ وہ صرف حکم کے بندے ہیں۔ تعلیمی ترقی کے حق میں وہ کوئی فیصلہ لینے کے نہ مجاز ہیں نہ اہل۔ معمولی سے اسکولی معاملات جو اسکول کی سطح پر حل ہو سکتے ہیں وہ سیڑھی در سیڑھی ضلع انسپکٹر کے یہاں سے گزرتے گزرتے ہائی کورٹ چلے جاتے ہیں۔ جس افسر کے یہاں چلے جائیے وہاں کیو (Q) لگا ہوا ہے۔ اسکول کو اتنا بھی اختیار نہیں ہے کہ وہ منظور شدہ فہرست اخراجات میں اتنی ترمیم کرلے کہ پاؤڈر روشنائی کے بجائے فونٹین پین کی روشنائی منگوا لے۔ کیونکہ بچے اب نب والے قلم کا استعمال نہیں کرتے۔ ایک استاد جو کسی ہنگامی پریشانی کی وجہ سے اپنے پراوڈنٹ فنڈ سے کچھ قرض لینا چاہے تو اس کے پیچھے اعتراضات کی لائن لگ جائے۔ یہاں تک کہ رقم ملتے ملتے اس کی افادیت یا ضرورت ختم ہو جائے۔ الّا یہ کہ اس نے حق داروں کا حق ادا کر دیا ہے۔

٤۔ حقوق اور فرائض میں عدم توازن

ہمارے پورے تعلیمی نظام سے فرائض کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اسکولی خاندان کے عناصر میں استاد، طالب علم، والدین اور منتظمہ شامل ہیں۔ استاد اپنے حق سے زیادہ پا جانے پر بھی مطمئن نہیں ہے۔ طالب علم اپنے تمام تعلیمی حقوق سلب ہو جانے پر بھی مطمئن ہے۔ والدین کے لیے یہی بات کافی قابل اطمینان ہے کہ بچے گھر کے بجائے اسکول میں فتنہ پھیلا رہے ہیں۔ منتظمہ گویا کہ ایک روٹھی ہوئی ماں ہے کہ "جاؤ ہم بھی کچھ نہیں کریں گے۔ کیوں کہ ہمارے سب اختیارات پر غیروں کا قبضہ ہے۔" آزادی کے بعد اسکولوں کو سیکولرزم کے نام پر اقلیتی اور اکثریتی (دو حصوں) پر تقسیم کر لیا گیا۔ حالانکہ بلا اس تقسیم کے مسلمان، عیسائی، سکھ سبھی کے اسکول چل رہے تھے اور ان سب میں رقابت نہیں تھی مسابقت تھی۔ جس نے اسکول قایم کیا اس کا اسکول ہے۔ لیکن اب نقشہ پلٹ گیا۔ بنیادی طور پہ سب اسکول سرکار کے ہیں۔ اس لیے جو اقلیتی ہیں وہ ثابت کریں کہ کس طرح اقلیتی ہیں۔ سنا یہ گیا ہے کہ سیکڑوں سال پرانے عربی فارسی مدارس سے بھی اب یہ پوچھا جا رہا ہے کہ تم اقلیتی کیسے ہو؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکول اسکول میں تفرقہ ہو گیا۔ سرکاری عملے کا مزاج بدل گیا اور اساتذہ میں لوٹ پھوٹ پیدا ہو گئی ہے اور کتنے ہی اسکول جو اقلیتوں نے قایم کیے تھے ان پر حکومت وقت نے قبضہ جما لیا ہے۔

باقی صفحہ نمبر ٣٤ پر ملاحظہ فرمائیے

سید الطاف علی بریلوی

غفار راشدی *

سید الطاف علی بریلوی تحریک آزادی کے ایک مخلص رہنما تحریک اردو کے زبردست حامی، ماہر تعلیم، مصلح قوم اور یادگار سلف بزرگ تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے سید صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری اور رسالہ منصف کے ایڈیٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ سید صاحب نے متحدہ ہند کی قومی تحریکات میں جو اہم کردار ادا کیا اور سرسید کی علی گڑھ تحریک کو کامیاب بنانے میں جس انداز سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ ہماری قومی تاریخ کا ناقابل فراموش باب ہے۔ اس سلسلے میں خود سید صاحب کی یادگار کتاب علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں (مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۷۰ء) ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں صرف قومی نظمیں نہیں ہیں بلکہ اُن تمام اجلاس کی تفصیلی روئدادیں ہیں جو جا بجا ہندوستان کے کونے کونے میں منعقد ہوتے رہے۔ اُن اکابر قوم، مشاہیر اردو کا تذکرہ بھی ہے جنھوں نے ملک کے ہر گوشے سے آکر اُن اجلاس میں شرکت کی۔ اُن سب کے حالات و خطبات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔

جس لگن اور مشن کے ساتھ سرسید احمد خاںؒ نے ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی جذبۂ اخلاص و ایثار کے ساتھ سید الطاف علی بریلوی نے ۱۹۵۱ء میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کی داغ بیل ڈالی۔ سرسید گرلز کالج ناظم آباد کراچی کے بانیوں میں بھی ان کا نام سرفہرست ہے۔ اس کالج کا قیام ایجوکیشنل کانفرنس کا بڑا کارنامہ ہے۔ سرسید گرلز کالج نے قومی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں تعلیم نسواں کا معیار جس انداز سے بلند کیا ہے۔ قوم کی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت اور تہذیبی، ثقافتی ارتقاء میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ ملت اسلامیہ کے لیے باعث افتخار رہیں۔

سید الطاف علی بریلوی نے جولائی ۱۹۵۱ء میں کراچی سے رسالہ العلم کا اجرا کیا۔ وہ تاحیات اس کے مدیر اعلیٰ رہے۔ بحیثیت مدیر انھوں نے جو اداریے رقم کیے وہ پاک و ہند کے قومی، سیاسی، تعلیمی، تہذیبی، ادبی، تاریخی احوال و مسائل کے کسی نہ کسی پہلو پر حاوی ہوتے تھے۔ انہی افادیت کی بنا پر فکر انگیز و لائق توجہ بھی۔ اس علمی و ادبی رسالے کا ہر شمارہ مضامین کے تنوع اور مواد کے توازن کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ سید صاحب کی ادارت میں العلم کے متعدد خصوصی شمارے شائع ہوئے جن میں غالب نمبر، جنگِ آزادی نمبر، سلور جوبلی نمبر اور اقبال نمبر وغیرہ آج بھی ملک و قوم کے لیے اہم دستاویز سے کم نہیں۔

* بی ۴۴، شاہ فیصل ٹاؤن، ملیر ہالٹ، کراچی، پاکستان

سید صاحب کی وفات حسرت آیات کے بعد سے ملک کے معروف
اسکالر، دانش ور اور تاریخ داں سید مصطفیٰ علی بریلوی سکریٹری
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے زیرِ ادارت العلم باقاعدگی
سے چھپ رہا ہے۔ سید مصطفیٰ علی نے اپنی پرخلوص سرگرمیوں
شب و روز کی محنت شاقہ اور حسنِ کارکردگی سے ثابت کر دیا ہے
کہ وہ سید الطاف بریلوی کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی بھرپور
صلاحیتوں سے لیس ہیں۔

سید الطاف علی بریلوی نے ایجوکیشنل کانفرنس کے
تحت وسیع کتب خانہ، دارالمطالعہ، میوزیم کی تنظیم و تشکیل کے
علاوہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے نام سے ایک شعبۂ
تصنیف و تالیف و ترجمہ کا بھی احیا کیا جو اپنی افادیت اور اعلیٰ
مقاصد کے لحاظ سے تحقیقی و اشاعتی ادارے کی سی اہمیت
رکھتا ہے۔ اس ادارۂ تحقیق و اشاعت نے سید صاحب
کی نگرانی میں تواریخِ اسلام، تواریخِ اقوام، اسلاف کے کارنامے
نئی نسل کے روشن مستقبل کے امکانات سے علم و آگہی کا یوں
اہتمام کیا کہ تواریخ، تعلیمات، نفسیات، عمرانیات، اخلاقیات
ادبیات، سیرت، سوانح، تذکرے اور سائنس جیسے قدیم و
جدید موضوعات سے متعلق درجنوں کتابیں لکھوا کر شائع کیں
جن میں خود سید صاحب کی متعدد تصنیفات اور تالیفات
شامل ہیں۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی ترقی و توسیع
ان کی زندگی کا آخری مقصد تھا۔ اس کے انتظامی امور،
نئی عمارت کی تعمیر، علمی و تعلیمی منصوبہ بندی کی تکمیل میں ہمہ وقت
استغراق و مصروفیات کے باوجود سید صاحب نے جو کتابیں
تصنیف و تالیف کیں ان میں حیاتِ حافظ رحمت خاں، طالبِ علم
کی ڈائری، تعلیمی مسایل پس منظر و پیش منظر، تعلیم و تعلم،
راہی و رہنما، چند محسن چند دوست، حاصلِ مطالعہ، مقالاتِ
بریلوی، علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، نامہ ہائے صدق و
صفا، تاریخ اور شخصیات، مسلمانوں کی تعلیمی
جدوجہد (انگریزی)، صوبۂ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم،
مسلمانوں کی دنیا، رباعیاتِ عرشی فاروقی، نواب دوندے خاں،
غلام قادر روہیلہ، خطوط و مقالات مع حواشی پروفیسر عبدالمجید
قریشی، برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تعلیم کا ارتقا (انگریزی
مقالہ) اور تخلیقات و نگارشات۔ آخرالذکر کتاب ان کی آخری
تصنیف ہے جو ۱۹۸۵ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ اسی سال
میں اس کتاب کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی تھی۔

اس عاجز راقم السطور کو اس تقریب میں
مقالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ سید صاحب راقم سے
بے حد شفقت فرماتے تھے اور اس کے علمی و ادبی کام کو سراہتے
تھے۔ تخلیقات و نگارشات کے مطالعے سے سید صاحب کے
ایام طالب علمی سے پیرانہ سالی تک کے حالات، علمی و ادبی لگن،
اکابرِ ملت ارباب علم و دانش سے ان کی معاصرانہ راہ و رسم کا
بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے عہد کے علمی و تعلیمی ماحول،
تہذیبی اقدار اور علی گڑھ تحریک میں ان کی سرگرمیوں سے
بھی آگہی ہوتی ہے۔

سید صاحب نے اپنی جاندار تحریروں میں جہاں اپنے
ہم عصر بزرگوں کا حال نہایت عقیدت و احترام سے بیان کیا
ہے وہاں ہم عمر و کم عمر معاصرین کا ذکر بھی بے حد اخلاص و
محبت اور شگفتگی و اپنائیت سے کیا ہے۔ سید صاحب کی نگارشات
ان کی سیرت، کردار، شخصیت اور فکر و عمل کے مختلف زاویوں
کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہ کسی کے اعلیٰ عہدے سے مرعوب
نہیں ہوتے تھے۔ ان کے نزدیک علم و ہنر والے کی بے حد قدر و
عزت تھی۔ وہ کسی کے اسٹیٹس (Status) کی تفریق
کے بغیر ہر ایک کا مقام ملحوظ رکھتے۔ کام کرنے والوں کی خدمت
کا دل سے اعتراف کرتے۔ اس کا اظہار بھی کیا کرتے کہ کیا
چھوٹا کیا بڑا سب کی کوئی نہ کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ سب
کے سب لائقِ توجہ ہوتے ہیں۔ امتیازی سلوک اخلاق و شرافت
کے منافی ہے بلکہ ننگِ انسانیت۔ طبقاتی قسم کے نام نہاد

آج کل کے بڑے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کی خدمات کو سراہنے یا اپنے سے چھوٹوں کو اہمیت دینے سے اپنی اہمیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ سید صاحب وسیع القلب، وسیع النظر اور عالی ظرف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ دوسروں کی خدمت و اہمیت کے اعتراف سے اپنا مرتبہ گھٹتا نہیں بڑھتا ہے۔ سوچ کا یہ انداز سید صاحب کی شخصیت کو اور قابلِ احترام اور اُن کی عظمت کو مزید بڑھا دیتا تھا۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اور تحریک اردو، ایک ہی تحریک کے تین نام ہیں۔ یہ تحریک بھی علی گڑھ تحریک سے مربوط ہے۔ بابائے اردو بھی سر سید احمد خاںؒ کے اسکول کے تربیت یافتہ اور الطاف حسین حالی کے ہم عصر تھے۔ اس اعتبار سے بھی بابائے اردو اور الطاف بریلوی کے مابین گہرا فکری و تہذیبی رشتہ پایا جاتا ہے۔ سید صاحب بابائے اردو کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے خدمات و کمالات کے بے پناہ مداح و معترف تھے۔ ان کے سارے ناموں کا تذکرہ انتہائی عقیدت و محبت اور والہانہ شیفتگی و شگفتگی سے کرتے تھے۔ سید صاحب بابائے اردو کے کس قدر قریب تھے اور بابائے اردو اُن سے بحوالہ انجمن ترقی اردو کس اپنائیت سے اپنا حال سناتے تھے، اس کی جھلکیاں صرف دو خطوط کے ان اقتباسات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

"انجمن اب بھی مقروض ہے۔ اگر اس کام کو جو ہم کرنا چاہتے ہیں اور جو کام تیار رکھا ہے اور بوجہ تہی دستی شائع نہیں کر سکتے۔ پیشِ نظر رکھا جائے تو ہماری مالی حالت بہت ہی سقیم ہے۔
میں ایک غریب آدمی ہوں۔ آمدنی بہت ہی کم اور محدود ہے۔ میں نے اپنے تمام اخراجات کم کر دیے ہیں۔ یہاں تک کہ حقہ اور چائے بھی ترک کر دی ہے۔ باورچی موقوف اور باورچی خانہ بند ہے۔ اس طرح میں اپنا پیٹ کاٹ کر انجمن کو مدد دے رہا ہوں ...."

دستخط عبدالحق

(بنام سید الطاف علی بریلوی
مورخہ ۵ر فروری ۱۹۵۳ء کراچی)

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"انجمن کو نہ تو حکومت کی جانب سے کوئی امدادی رقم مل رہی ہے نہ باہر سے کوئی امداد کی کوئی صورت ہے۔ کام بہر نہج چل رہا ہے ......
.... کوشش کر رہا ہوں کہ ایک بڑا پریس قایم ہو جائے کہ انجمن کے اخراجات پورے ہو سکیں۔"

دستخط عبدالحق

(بنام سید الطاف علی بریلوی
مورخہ ۱۶ر فروری ۱۹۵۳ء)

سید الطاف علی بریلوی تو تاریخ اسلاف، ملی تحریکات سیاسی انقلابات، قومی و سماجی مسایل گرد و پیش کے واقعات و حالات، جد و جہد آزادی کے عوامل و نتائج ماحول و معاشرے کی افراط و تفریط، قوموں کے اذکار و افکار پر بھی وسیع و گہری نظر رکھتے تھے جس کی شہادت ان کی فکر انگیز و بصیرت افروز تخلیقات و نگارشات، عہد خلفائے راشدین کی تعلیم، حیاتِ حافظ رحمت خاں، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی قومی و ملی نظموں سے ملتی ہے۔

سید صاحب کے سیرت و کردار کے تمام اوصاف اُن کی تحریروں میں صاف و شفاف آئینے کی طرح نظر آتے ہیں۔ اُن کا ذہن صاف، دل صاف، کردار صاف۔ اُن کے خیالات میں کوئی پیچیدگی، کوئی الجھاؤ نہیں۔ اُن کا اظہار اُن کے عرفانِ ذات کا مظہر ہے۔ وہ بلا تکلف، بلا تصنع سچائی کے ساتھ صاف اور سادہ الفاظ، نرم لہجے دھیمی آواز میں گفتگو فرماتے۔ یہی روش اپنی تحریروں میں بھی اپناتے۔ ان کا اسلوبِ نگارش ایسا

دلپذیر و دل نشین ہے کہ جس مضمون کو پڑھیے، علم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ سر سید نے اردو میں جس جدید نثر کی بنیاد رکھی تھی حالی اور عبدالحق کے بعد سید الطاف علی بریلوی نے اس نثر کو اپنے مخصوص اسٹایل میں سنوارا۔

اس دورِ نفسا نفسی میں جہاں احترام آدمیت تو کیا تصورِ انسانیت بھی محال ہے۔ سید صاحب جیسے عالی دماغ، بالغ نظر روشن ضمیر، با وضع، اخلاص اور بامروت شخص کا دم بہت غنیمت تھا۔ اُن کی بڑائی اِس بات میں تھی کہ وہ جس حال میں جس سے بھی ملتے بلا امتیاز خورد و کلاں (باعتبار سن و مقام) حسبِ معمول تپاک سے ملتے۔ خندہ پیشانی سے حال احوال معلوم کرتے۔ دلوں میں اُن کی بزرگانہ شفقت و عظمت کی روشنی اور پھیل جاتی۔ ان کی یہ انکساری، سادگی اور منکسر المزاجی دلوں کو موہ لیتی۔

سیّد صاحب اپنی عمر عزیز کے اسی سال پورے کر چکے تھے آئے دن خون کے دباؤ اور دل کے دورے کا شکار رہتے جوان بیٹے خالد علی بریلوی کی ناگہانی موت نے اُن کی کمر توڑ دی تھی۔ مرحوم کے دورانِ علالت اُن کی اذیتناک کیفیتیں راقم سے دیکھی نہ جاتی تھیں۔ اس کی وجہ سے سیّد صاحب کس درد و کرب سے دوچار تھے اسے الفاظ میں بیان کرنے کی تاب نہیں۔ سیّد صاحب اس لختِ جگر کی جواں مرگی سے اور ٹوٹ پھوٹ چکے تھے

حالات کیسے ہی ہوتے سید صاحب کا پائے استقلال نہ کبھی ڈگمگاتا نہ ہی اُن کی وضع داری و دلداری میں کوئی فرق آتا۔ کام۔ کام۔ کام اُن کی زندگی کا نصب العین رہا۔ اکبر الٰہ آبادی نے سر سید احمد خاں کے بارے میں کہا تھا۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے

اب یہی قول سید ثانی الطاف بریلوی پر بھی صادق آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی پیرانہ سالی و خستہ حالی میں جواں مردی، تن دہی اور مستعدی سے کام کرتے تھے اور آخر دم تک کام کرتے رہے۔ ایسے جذبۂ کار و ایثار کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ سید صاحب کی بھرپور، کار آمد و با مقصد زندگی فکر و عمل کی راہ میں ایک ایسا روشن مینار تھی جو برسوں نئی نسل کو روشنی دکھائی دے گی۔

سید صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں کئی اعلیٰ منصوبے زیرِ تکمیل تھے۔ جانے اللہ کو اُن کی کون سی ادا بھا گئی کہ اُن کا بلاوا آ گیا۔ آخری بار دل کا شدید دورہ پڑا۔ چند روز ڈاکٹر بقائی کے اسپتال میں زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ ۲۴ ستمبر ۸۶ ۱۹ء کو اس جہانِ رنگ و بو سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے ؏

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

دوسروں کے لیے جینے والے اوروں کو اخوت و محبت، اخلاص و ایثار کی چھاؤں فراہم کر جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف رحمتِ حق کی آغوش میں جگہ پاتے ہیں بلکہ حیاتِ ابدی کی نعمتوں کی آغوش میں امر ہو جاتے ہیں۔ سیّد الطاف علی بریلوی کی بے پناہ و بے مثال خدمات و تصنیفات کے علاوہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور سر سید گرلز کالج اُن کی زندہ جاوید یادگاریں ہیں۔ زندہ قومیں کبھی اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کرتیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس کی سامنے والی سڑک "شاہراہ سید الطاف علی بریلوی" کے نام سے منسوب ہے۔ یہ سید صاحب کی عدیم المثال خدمات و کمالات کا ایک اعتراف ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے اس شاہراہ کا ہر رہ گزر سید صاحب کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرتا رہے گا۔ سچ ہے سیّد صاحب جیسے لوگ عزم ہمت، محبت، محنت، اخلاص اور قومی یک جہتی کی علامت ہوتے ہیں۔ ان کی علم و دانش، فکر و عمل سے بھرپور زندگی

باقی صفحہ نمبر ۳۴ پر

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۲ (فروری ۱۹۹۳ء)

سیرتِ پاک اور مصطفیٰ صادق الرافعی

ابوسفیان اصلاحی*

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع الصفات اور جوامع الکلم شخصیت کے بارے میں قرآن کریم نے بڑے واضح الفاظ میں اعلان کیا:

"وانک لعلیٰ خلق عظیم"

اور اسی وجہ سے دوسری جگہ قرآن کریم نے امت مسلمہ سے کہا:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

خاتم النبیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے مذہب اسلام نے اس کی تائید کی ہے کہ آپ کا نامِ نامی آئے تو آپؐ پر درود بھیجا جائے۔ احادیث شریف کی کتب میں شمائل النبیؐ پر پورا پورا باب ہے جن میں آپؐ کی سیرت پاک پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ امتِ مسلمہ کے ساتھ ساتھ دشمنانِ اسلام مستشرقین نے بھی آپؐ کو دنیا کا سب سے عظیم ترین انسان قرار دیا۔ اب تک دنیا کی مختلف زبانوں میں آپؐ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں آچکی ہیں اور آرہی ہیں لیکن پھر بھی آپؐ کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ باقی ہے۔ رہتی دنیا تک آپؐ کی زندگی کے نئے نئے پہلو دنیائے انسانیت کے سامنے آتے رہیں گے۔

بیسویں صدی کے مصر میں بھی کئی کتابیں اور مقالات محسن انسانیت اور درِ یتیم پر لکھے گئے۔ اس سلسلے میں حسین ہیکل کی "حیات محمد" طٰہٰ حسین کی "علی ھامش السیرۃ" عقاد کی "عبقریۃ محمد" اور رشید رضا کی "الوحی المحمدی" منفرد اہمیت کی حامل ہیں۔ مصطفیٰ صادق رافعی نے بھی سیرت پاک کے کئی پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ یہاں ان ہی مقالات کی روشنی میں سیرت پاک پر اظہار خیال کیا جائے گا۔ لیکن اس سے قبل مناسب ہے کہ رافعی کے بارے میں بتا دیا جائے کہ ان کی نشوونما کس ماحول میں ہوئی۔ وہ اپنے ماحول سے کس حد تک متاثر ہوئے، ان کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے والدین کا کیا رول رہا۔

مصطفیٰ صادق الرافعی ۱۸۸۰ء میں مصر میں پیدا ہوئے اصلاً وہ شامی النسل تھے۔ آپ کے والد عبد الرزاق الرافعی مختلف شرعی عدالتوں کے صدر رہے۔ رافعی کا خاندان تمام اعلیٰ قدروں اور اچھی روایات کا حامل تھا۔ خاندان میں زہد و تقویٰ اور مذہبی کا ماحول پہلے سے چلا آرہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رافعی کے رگ و پے میں مذہب اسلام کا خون موجزن تھا۔ عربی زبان کے علاوہ تھوڑی بہت فرانسیسی بھی جانتے تھے۔ انھیں مطالعے کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت کتب بینی میں غرق رہتے۔ اسلام سے دلچسپی پیدا کرنے والے ان کے والدین ہیں۔ چنانچہ انھیں کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ وہ شعار اسلام کی سختی سے پابندی کرتے۔ انھیں

---

* شعبۂ عربی۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام سے بڑی سچی عقیدت تھی۔ ان کی تصانیف میں اسلام کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ رافعی تقریباً سولہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے نثر نگاری کے ساتھ شاعری بھی کی ہے[۱] اور مختلف موضوعات پر مقالات تحریر کیے۔ آپ کے مقالات وحی القلم کے نام سے تین جلدوں میں اہلِ علم کے سامنے آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے بہت سے مقالات مختلف جراید و رسایل میں بکھرے پڑے ہیں ان مقالات میں جہاں مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے وہیں بہت سے مقالات ایسے بھی ہیں جن کا تعلق اسلام کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔ کچھ مقالات سرورِ کونین آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ہیں۔ آیئے دیکھا جائے کہ وہ اس محسنِ انسانیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

سیرتِ پاک کے موضوع پر اُن کا ایک مقالہ "الاشراق الالٰہی وفلسفۃ الاسلام" ہے۔ یہ مقالہ زبان و بیان اور موضوع کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اسلوبِ تحریر سے ایسا لگتا ہے کہ ان کے اندر عشقِ رسول رواں دواں ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ سورج آتے ہی اپنی کرنوں سے سارے عالم کو روشن کر دیتا ہے، رات کی تاریکی کافور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک نبی خیر و فلاح کی کرنوں کے ساتھ مبعوث ہوتا ہے۔ دن جس طرح زندگی کی علامت ہے اسی طرح ایک نبی کے آنے سے جہالت و دنائت اور فحاشی دور ہو جاتی ہے اور معاشرہ اچھائیوں اور اخلاقیات کی روشنیوں سے پُر نور ہو جاتا ہے[۲]۔ اسی مقالے میں مزید یہ کہتے ہیں کہ علم تاریخ کا موضوع زندگی ہے۔ انبیائے کرام کے اقوال و افعال سے زندگی کا ایک صحیح رخ متعین ہوتا ہے۔ نبی معاشرے کے لیے چراغِ ہدایت اور الہامی روشنی ہے۔ نبی معاشرے کو اخلاقیات کی بلندیوں پر فائز کرنا چاہتا ہے[۳]۔ نبی اپنے ساتھ حقایقِ خداوندی لاتا ہے۔ اس کی زبان فصاحت و بلاغت کی نقیب ہوتی ہے [illegible] اتر سکیں۔ اس کی گفتگو تفصیلِ [illegible] ہے۔ اس کے اقوال اور افعال میں تضاد [illegible]

نبی کا ایک عمومی تعارف کرانے کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام حکماء و فضلاء کے فضایل و خصوصیات یکجا کر دی جائیں پھر بھی وہ صفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ دنیا کی تمام عظیم شخصیات آپؐ کے مقام تک پہنچنے سے قاصر تھیں اور رہیں گی۔ آپؐ انسانیت کے سب سے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو تا قیامت لوگوں کے لیے مینارۂ نور رہے گا۔ آپؐ کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ خاتم النبیین ہیں اور آپؐ کی لائی ہوئی شریعت بھی آخری ہے۔ شریعتِ محمدی میں کوئی کمی باقی نہیں، آیندہ بھی کسی نقص کی امید نہیں۔ تاقیامت یہ شریعت بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہے گی[۴]۔ احکام صرف غور و خوض کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں میں اترنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ احکام اسلام تمام عالم کے لیے ہیں۔ اسلامی احکامات حکمتوں سے پُر اور ساری دنیا کی اساس ہیں۔ اسلام نے وہ اخلاقی نظام برپا کیا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر رحمت پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ صراطِ مستقیم کا پابند ہو جاتا ہے۔ اسلامی احکامات فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان کے اندر ایک بیداری جنم لیتی ہے۔

انھی چیزوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رافعی نے امتِ مسلمہ سے اپیل کی کہ وہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیں، آپؐ کے بتائے ہوئے راستوں پر گامزن رہیں۔ آپؐ کا ذکر نہایت ادب و احترام کے ساتھ کیا جائے[۵]۔

سیرتِ پاک پر رافعی کا دوسرا مقالہ "وحی الہجرہ" ہے۔ اسی مقالے میں انھوں نے بتایا کہ ہجرت سے قبل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا۔ آپؐ کی ہر طرح سے اہانت کی گئی۔ کفارِ مکہ آپؐ کے دشمن بن گئے۔ آپؐ سے تمام رشتے منقطع کر لیے لیکن قدم قدم پر اللہ کی مدد آتی تھی۔ آپؐ اپنی قوم میں اس یتیم کے مانند ہو گئے جو والدین کی زندگی ہی

میں تیم ہو جائے۔

کفارِ مکہ کی ہر ممکن کوشش رہی کہ آپؐ کا قصہ تمام کر دیا جائے آپؐ کے چچا ابوطالب کے پاس گئے اور کہا کہ آپؐ کا بھتیجہ ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہہ رہا ہے۔ آپ اسے ان حرکتوں سے روک دیں۔ چنانچہ انھوں نے آپؐ کو بُلا کر قوم کے جذبات کو بتانے کے بعد کہا کہ "بیٹا! میرا اور اپنا خیال رکھو۔ مجھے اتنی زحمت نہ دو کہ جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چچا کی فکرمندی کو دیکھتے ہوئے کہا کہ "چچا جان اگر میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے پھر بھی میں اپنے مشن سے باز نہیں آسکتا۔ اب خدا چاہے مجھے ہلاک کرے یا مجھے نصرتوں سے نوازے۔ یہ کہنے کے بعد آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں[9]۔

آگے رافعی کہتے ہیں کہ ایک نبی کو تائید غیبی حاصل ہوتی ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ کی طرف سے مدد ملی۔ قرآن نے اسی کو اس طرح بیان کیا ہے: "ورأیت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا۔" رافعی نے اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ ہجرت سے قبل تمام پیش آنے والے واقعات کے پیچھے یہ چیز موجود تھی کہ یہ ایک نبی کا زمانہ ہے۔ اس کا کسی بادشاہ، سیاستداں یا کسی قاید سے کوئی تعلق نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کا اعلان اس قدر واضح تھا کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات پوری طرح راسخ ہو چکی تھی[10]۔

آنحضور صلی اللہ وسلم کی حیات مبارکہ سے متعلق تیسرا مقالہ "فلسفۃ قصۃ" ہے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رافعی نے بتایا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ذات آپؐ کے لیے بہت بڑا سہارا تھی اور اسی طرح ابوطالب کی ذات بھی آپؐ کے لیے ڈھال ثابت ہوئی۔ دونوں ہی شخصیتیں موقع پر آپؐ کو تسلی دیتیں۔

ابوطالب نے آپؐ کو قریش کی اذیتوں سے بچایا اور حضرت خدیجہؓ ہر موقع پر آپؐ کو ذہنی سکون عطا کرتیں۔ آپ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر بڑھ کر لبیک کہا[11]۔ رافعی نے آپؐ کے اس واقعہ کو بھی بیان کیا کہ ایک بار قریش نے آپؐ کے سر پر مٹی ڈال دی تو اس کو دیکھ کر آپؐ کی صاحبزادی کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ آپؐ نے کہا کہ بیٹی رومت یہ خود رسوا ہوں گے۔ یہ اذیت چند دنوں کی ہے[12]۔ اس مقالے میں اور بھی بہت سے آپؐ کے واقعات کو بیان کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپؐ کفار و مشرکین کی تکالیف کو برداشت کرتے رہے اور اپنی منزل کی طرف سرگرم سفر رہے۔

اسی موضوع پر رافعی کا ایک اور مقالہ "فوق الآدمیۃ الاسراء والمعراج" ہے۔ جس میں انھوں نے بتایا کہ معراج کا واقعہ عام انسانی فطرت سے بالاتر ہے۔ معراج آپؐ کی خصوصیات میں سے ہے اس سے آپؐ کی عظمت میں اضافہ ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معراج جسمانی ہوئی تھی اور یہی علمائے جمہور کا مسلک بھی ہے۔ انھوں نے سورہ النجم کی آیت "اذ یغشی السدرۃ ما یغشی ٥ ما زاغ البصر وما طغیٰ" سے یہ بات نکالی کہ بغیر جسم کے آنکھ کا بہکنا اور تجاوز کرنا بعید از عقل ہے۔ "وما طغیٰ" میں جو اعجازی شان پوشیدہ ہے، مفسرین نے اس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ آپؐ جسمانی حیثیت سے موجود ہوتے ہوئے تمام چیزوں کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ آپؐ کی ذات عام انسانی صلاحیتوں سے بالاتر تھی۔ معراج کے وقت آپؐ کے اندر فطرتِ انسانی کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ نگاہ اس شخص کی تجاوز کرے گی جس کے اندر عام فطری تقاضے موجود ہوں۔ ما زاغ اور ما طغیٰ سے یہ بات نکلتی ہے کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ فطری اشیاء کے برخلاف بھی کسی شی کا ظہور کر دیتا ہے[13]۔

جسمانی معراج ہونے کے سلسلے میں انھوں نے ایک دلیل یہ بھی دی کہ قصہ معراج میں جبرئیلؑ اور براق بنیادی حیثیت کے حامل ہیں اور یہ دونوں فرشتہ اور انسان دونوں کی صفتوں سے متصف تھے۔ براق کو اشارۃً جانور صرف اس لیے کہا گیا کہ

یہ واقعہ عربوں کے ذہن کی گرفت میں آسکے۔ براق دراصل برق سے ہے اور برق کا مطلب بجلی ہے اور یہی اس سے مراد بھی ہے یہ ایک کہربائی قوت ہے جو ایک جست میں تمام عالم کا دورہ کرسکتی ہے۔ آیت اسرا میں اسی حکمت کے پیش نظر ذکر نہیں کیا گیا کہ آپ جس چیز پر سوار تھے۔ کیوں کہ آپ کسی چیز پر سوار نہیں تھے بلکہ گھوڑے کی روح پر سوار تھے

اس کے بعد رافعی کا ایک مقالہ "الانسانیۃ العلیا" ملاحظہ کریں۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ کتب احادیث میں آپؐ کے جو فضایل وشمایل بیان کیے گئے۔ ان کا کسی ایک شخص کی ذات میں جمع ہوجانا بعید از قیاس ہے۔ یہ بلندی، وقار اور شان وشوکت صرف اسی ذات عالیہ کے لیے ہے جو ساری انسانیت کے لیے مبعوث کیا گیا۔ آپ کو حق وباطل میں تمیز پیدا کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا نیز آپؐ بنی نوع انسان کو بتاسکیں کہ ان پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں [16]

تمام صفات آپ کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھے۔ آپؐ کی ذات تمام نقوص وعیوب سے بالا تر تھی۔ آپ کا ہر کلمہ صداقت و دیانت کا علم بردار تھا۔ آپؐ نے اپنی ذات کے متعلق خود اعلان کیا کہ میری تربیت اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک بلند ترین تربیت ہے۔ آپؐ کے اس اعلان کے بعد کسی شبہ کی گنجایش نہیں کہ آپؐ کی ذات کسی پہلو سے کمتر تھی [17]

ایک دوسرا مقالہ "السمو الروحی الاعظم والجمال الفنی فی البلاغۃ النبویہ" ہے، جس میں احادیث نبوی کے سلسلے میں بتایا کہ یہ معنوی اسلوبیاتی اعتبار سے تمام فنی محاسن پر مبنی ہیں۔ آپؐ کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات فصاحت و بلاغت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے۔ فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپؐ کی باتیں افکار ومعانی کی گنجینہ ہوتیں۔ آپ نے نہ صرف کہا بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔ آپؐ کے تمام اقوال دینی اور تعلیمی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان میں روحانیت، قوت اور زندگی ہوتی ہے۔ کلام رسول حسن وپاکیزگی کا مرقع ہے اور اس میں تمام ادبی معاییر موجود ہوتے ہیں۔ رافعی کی اس تحریر نے کہ "ان یکون ہذا الکلام صلاۃ وصیاما من الالفاظ" کلام رسول کی کس قدر اچھی تصویر کشی کی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلوب بیان میں شریعت اسلامی کی روح اور ایک مستحکم نظام کا عنصر موجود ہے۔ نظام مصطفیٰ میں نافذ ہونے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ہزار ہا جتن کے بعد اسے نافذ کیا۔ آپؐ کے دہن مبارک سے حکمت ودانائی کے موتی جھڑتے، باتیں اسرار ورموز کا مجموعہ ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا نے آپؐ کی باتوں کو اپنے دلوں میں بسالیا اور کھلے دل سے اعتراف کیا کہ آپؐ کا پیغام تمام دنیا کے لیے رشد وہدایت کا سنگ میل ہے۔ آپؐ اخلاق وعادات کے نقطۂ نظر سے نہایت بلند ترین مقام پر فائز تھے [18]

رافعی آپؐ کے کلام کے بارے میں مزید رقم طراز ہیں کہ دنیا کے تمام ادبا، آپؐ کی بلاغت کے معیار تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ ادبا، وشعراء نے صنف نازک کی حیثیت اور اس کے حسن وجمال کے باب میں نہ جانے کب سے کتنے صفحات سیاہ کررہے ہیں۔ اسے قلب کہہ کر پکارا اور بنی نوع انسان کا نصف حصہ قرار دیا لیکن آپؐ نے عورت کے متعلق جو بات فرمائی اس کے سامنے اب تک کے ادبا کے تمام اقوال بے معنیٰ ہوکر رہ گئے اور اس سے اچھی بات عورت کے بارے میں دنیا کہنے سے قاصر ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "رفقاً بالقواریر" اس میں وہ معنویت اور فصاحت وبلاغت ہے کہ صنف نازک کی پوری تصویر کشی ہوجاتی ہے۔

مصطفیٰ صادق الرافعی نے ایک مقالہ "حقیقۃ المسلم" تحریر کیا جس میں انھوں نے ایک سچے مسلم کی تعریف کی کہ اسے اس دنیا میں کن کن ذمہ داریوں کو انجام دینا ہے ایک مسلم کی پوری زندگی اللہ کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے اور وہ خود کو اللہ کے سپرد کردیتا ہے۔ اللہ کے حکموں سے

بنی نوع انسانی کو متعارف کرانے والے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رافعی کا کہنا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سب سے اکمل ترین انسان ہیں۔ یہ امت مسلمہ آپؐ کی ذات سے وابستہ ہو کر ہی منزل مقصود کو پا سکتی ہے۔ یہ وہ امتِ مسلمہ ہے جو تکالیف و اذیتوں کے باوجود خداوند قدوس سے خود کو جوڑے رکھتی ہے اور دنیاوی اوہام و خرافات سے خود کو دور رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔[۲۰]

آگے رافعی کہتے ہیں کہ آج دنیا جو تمام اچھے کاموں اور نیک راستوں پر گامزن ہے۔ ان کی بنیاد ڈالنے والے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رافعی نے آپؐ کو ایک ایسا سرچشمہ قرار دیا ہے کہ جس سے امت مسلمہ فیض یاب ہو کر پاکیزہ اور تمام آلائشوں سے منزہ ہو سکتی ہے۔ اپنی اس بات کو انھوں نے فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ خداوند قدوس نے ریگستان عرب میں روح سمندر پھونک دی اور اس سمندر سے اپنا کرشمہ دکھایا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسا مرکزی نقطہ قرار دیا کہ جس سے سمندر ابال کھا رہا تھا۔ امت مسلمہ اس سمندر کی موجیں قرار پائیں۔ ان موجوں سے ساری دنیا فیض یاب ہوئی۔[۲۱]

سیرت پاک پر رافعی کا ایک طویل مقالہ "سمو الفقر فی المصلح الاجتماعی الاعظم" ہے جس میں انھوں نے بتایا کہ دنیا کے فقر اور قلت کو سامنے رکھ کر فقر رسول اللہ سے کائنات میں ایک آپؐ کا فقر شان استغنا سے بالاتر تھا۔[۲۲] فقر رسول اللہ سے کائنات میں ایک حسن اور عظمت پیدا ہوئی۔ آپ کا فقر ایک عظیم معجزہ ہے جس معجزے سے آج تک کوئی شخص مشرف نہ ہو سکا۔ آپؐ کے فقر کے ماوراء انسانی حقائق کی ایک دنیا آباد ہے۔ چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی دلایل و براہین کے ذریعے ان حقایق کو دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔[۲۳] آپ کا فقر علماء و فلاسفہ کے لیے ایک سبق ہے جو سبق کتابوں اور تحقیق و تحلیل سے حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ سبق صرف آپؐ کی حیات مبارکہ اور آپ کی سیرت و کردار سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آپؐ کی ذات سے افکار و خیالات کو زندگی ملتی ہے۔[۲۴]

رافعی نے اس مضمون میں آپؐ کے فقر سے متعلق ایک واقعہ نقل کیا کہ ایک روز آپؐ کو بھوک لگی تو آپؐ نے اپنے پیٹ پر ایک پتھر اٹھا کر رکھ لیا اور فرمایا کہ کتنے ہی اس دنیا میں شکم سیر اور زرق برق لباس میں ملبوس ہیں لیکن یہی قیامت کے روز بھوکے اور ننگے ہوں گے۔ کتنے اس دنیا میں صاحبِ حیثیت اور صاحب ثروت ہیں لیکن آخرت میں ذلیل و خوار ہوں گے۔ کتنے اس دنیا میں حقیر تصور کیے جاتے ہیں لیکن یہی عنداللہ بڑے رتبوں والے ہوں گے۔[۲۵]" اس مضمون میں آپؐ کے فقر سے متعلق اور احادیث بھی نقل کی ہیں جس سے یہ نتیجہ پیش کیا ہے کہ آپؐ کا فقر تمام امت کے لیے درس عبرت ہے۔ ہم اسی وقت اس دنیا میں ایک کامیاب زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ہمارے سامنے اسوۂ رسول اور نقوش خاتم النبیین ہوں آپؐ کا فقر ہمارے لیے چراغ راہ ہے۔ فقر رسول سے ہرگز یہ مفہوم نہ نکالا جائے کہ تمام نعمتوں کے باوجود بھی ہم بھوکے رہیں۔ کیوں کہ یہ چیز تحدیث نعمت کے برعکس ہے۔ اگر خدا نے ہم کو کسی نعمت سے نوازا ہے تو ہم اس سے لطف اندوز ہوں۔ کیوں کہ یہی علامت شکر ہے۔

مصطفیٰ صادق الرافعی نے ایک مقالہ "درس من النبوۃ" تحریر کیا۔ اس میں مستشرقین اور اسلام دشمن مصنفین کے ان خیالات کی تردید کی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات المومنین سے کسی نفسانی خواہش کی وجہ سے شادیاں کیں۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہو۔ چنانچہ جس وقت امہات المومنین نے دیکھا کہ آپؐ کو یہود و نصاریٰ کے قبایل اور ان کے مال و دولت پر فتح حاصل ہو رہی ہے تو انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ آپؐ ان کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو دنیا میں امراء

سلاطین اپنی بیویوں کے ساتھ کرتے ہیں اور انہیں فاقہ کشی اور تنگیوں سے نجات دلائیں۔ چنانچہ اسی موقع سے متعلق یہ آیت نازل ہوئی:

یا ایہا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیاۃ الدنیا وزینتہا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحاً جمیلاً وان کنتن تردن اللہ ورسولہ والدار الآخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجراً عظیماً ۰ (الاحزاب: ۳۳/۲۸)

(اے نبی! اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے)

آپ نے حضرت عائشہؓ کو بلا کر یہ آیت تلاوت کی اور کہا کہ تم اپنے والدین سے اجازت لے لو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آپ کے پسندیدہ امر میں میں والدین سے اجازت لوں گی؟ جب کہ اللہ نے آپ کو دنیائے انسانیت کی ہدایت کے لیے منتخب کیا ہے۔ چنانچہ تمام امہات المومنین نے حضرت عائشہؓ کے خیال سے اتفاق کیا۔

اس واقعہ سے رافعی نے یہ ثابت کیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شہوت کا الزام لگانا یکسر جہالت اور فتور عقل کی علامت ہے۔ کیونکہ مذکورہ بالا واقعہ سے یہ بات منظر عام پر آتی ہے کہ آپ نے امہات المومنین کو زیورات اور دنیاوی آرائش سے ہمیشہ دور رکھا۔ دوسرے آپ کے ذہن میں امہات المومنین کے باب میں کبھی کوئی خیال پیدا نہیں ہوا کہ جو شہوت سے قریب ہو۔ تیسرے آپ نے ہمیشہ امہات المومنین کو فقراء کی بیویوں کی طرح رکھا۔ تیسرے آپ نے خود اپنی زندگی نہایت سادگی سے بسر کی۔ آپ کی زندگی کے طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ بھی نہیں پیش کیا جا سکتا جو شہوت کے خانہ میں آتا ہو۔ چوتھے قصۂ تخییر کا تعلق فقر و استغناء سے ہے۔ اس کا مادیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ آپ معلم انسانیت ہیں۔ آپ کی سیرت مبارکہ تمام امت کے لیے قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ آخر میں اس نے یہ بات بھی بتائی کہ قرآن کریم نے زوجات النبیؐ کو امہات المومنین کا خطاب دیا۔ اس سے یہ بات منظر عام پر آئی کہ ایک بیوی اسی وقت اکمل ترین ہو سکتی ہے جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ وہی سلوک کرے جو ایک ماں اپنے بیٹے کے ساتھ کر سکتی ہے۔[۲۵]

حوالے

۱؎ مصطفیٰ الرافعی کی حیات وخدمات پر درج ذیل کتابیں ملاحظہ کریں۔
(۱) محمد سعید العریان۔ حیاۃ الرافعی۔ الطبعۃ الثالثۃ۔ مطبع الاستقامہ۔ القاہرہ۔ ۱۹۵۵ء
(۲) نعمات احمد فواد۔ دراسۃ فی ادب الرافعی۔ دار الفکر العربی (ب ت)
۲؎ مصطفیٰ صادق الرافعی۔ وحی القلم۔ الطبعۃ السادسۃ۔ مطبع الاستقامہ۔ القاہرہ (ب ت) ۲/۲ ۳؎ ایضاً ۲/۳۔
۴؎ ایضاً ۲/۴۔ ۵؎ ایضاً ۲/۴ ۶؎ ایضاً ۲/۷۔ ۷؎ ایضاً ۲/۱۰۔ ۸؎ ایضاً ۲/۱۹۔ ۹؎ ایضاً ۲/۲۱
۱۰؎ ایضاً ۲/۲۲۔ ۱۱؎ ایضاً ۲/۲۴۔ ۱۲؎ ایضاً ۲/۲۴-۲۵۔ ۱۳؎ ایضاً ۲/۲۵-۲۶۔ ۱۴؎ ایضاً ۲/۳۷۔ ۱۵؎ ایضاً ۲/۳۷-۳۸
۱۶؎ ایضاً ۲/۴۰۔ ۱۷؎ ایضاً ۲/۴۱۔ ۱۸؎ مصطفیٰ صادق الرافعی۔ وحی القلم۔ الطبعۃ السادسۃ۔ مطبعۃ الاستقامہ۔ القاہرہ (ب ت) ۳/۹
۱۹؎ ایضاً ۳/۲۲۔ ۲۰؎ ایضاً ۳/۱۱-۱۲۔ ۲۱؎ ایضاً ۳/۱۳۔ ۲۲؎ ایضاً ۳/۱۴۔ ۲۳؎ ایضاً ۳/۱۹۔ ۲۴؎ ایضاً ۳/۱۵۔ ۲۵؎ ایضاً ۳/۱۸

فصد؟

ابو وارث جمیل*

عمل فصد کے موجد حکمائے یونان ہیں۔ یہ ایک قوی ترین طریقہ علاج ہے۔ جس کے ذریعے بہت سے مزمن امراض کا شافی علاج ممکن ہے۔ یہ طریقۂ علاج عرصۂ دراز سے حکماء کی عدم توجہی کا شکار رہا ہے جس سے اس فن کے فروغ میں کمی رہی کیونکہ حکماء اسے فعل قبیح سمجھ کر اس سے الگ رہے جس سے یہ فن چند گنے چنے اور ان پڑھ لوگوں سے وابستہ ہو کر رہ گیا۔ جو کہ خود کو فصّاد بتلاتے ہیں اور اپنے خاندانی پیشے کے طور پر اس سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ بلاد ہند کے اندر جہاں کہیں بھی کسی قدر یہ فن رائج ہے تو وہ اسی قسم کے لوگوں تک محدود ہے جس سے عوام الناس کو ان کی جہالت کی بنا پر فائدہ سے زیادہ نقصان کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور جو فن کے بدنامی کا سبب بنتا ہے۔

فصد کی تعریف:

شیخ الرئیس ابن سینا نے فصد کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

"فصد ایک کلی استفراغ ہے جو کثرت کو یعنی اخلاط کی زیادتی کو اسی تناسب سے دور کرتا ہے جس تناسب سے یہ عروق میں پائی جاتی ہے" (ترجمہ و شرح کلیات قانون)

بدن سے مواد خارج کرنے کا نام استفراغ ہے اور یہاں پر کلی استفراغ سے مراد ہے کہ فصد سے چاروں خلطیں (مواد) جو کہ خون میں ملی جلی رہتی ہیں (صفرا، سوداء، بلغم اور خون) اپنے طبعی تناسب سے خارج ہوتی ہیں جس سے عمل فصد کا اثر کم و بیش سارے بدن پر یکساں پڑتا ہے چنانچہ فصد کی عملی تعریف امین الدولہ ابو الفرج ابن القف المسیحی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"فصد ایک تفرق اتصال جو کہ ایک مخصوص آلہ (نشتر) کے ذریعہ وریدوں میں بالارادہ پیدا کیا جاتا ہے۔"

(کتاب العمدہ فی الجراحت)

فصد کی مذکورہ تعریف میں تفرق اتصال (ترکیب کا ٹوٹ جانا) سے مراد وریدوں کا تفرق اتصال ہے جو کہ مخصوص آلے کے ذریعے انجام پذیر ہوتا ہے جو عمل فصد کو عمل جراحت سے ممتاز کرتا ہے۔ کیونکہ عمل جراحت پھوڑوں پر شگاف سے اور عمل حجامت بدن کی سطح پر عمل سے تعلق رکھتا ہے۔

جن رگوں کی فصد کھولی جاتی ہے وہ وریدیں اور شریانیں

---

* لکچرر، شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

ہیں لیکن مادہ مرض کا غلبہ چونکہ وریدی خون میں ہی ہوتا ہے لہٰذا وریدوں کا فصد کھولنا ہی معمول میں داخل ہے۔

اب ہم چند مخصوص رگوں کے فصد کی افادیت پر قدرے اختصار سے تذکرہ کریں گے۔ چنانچہ آج کل جن رگوں کے فصد کا اکثر معمول ہے وہ عرق النساء کی فصد ہے جو کہ کولہے کے درد میں بہت فائدہ مند ہے۔ اس مرض میں مریض کو چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ بواسیر یا خون حیض رکنے کی صورت میں ورید مابض الرکبہ (Popliteal Vein) کی فصد مفید ہوتی ہے۔ ورید صافن کی فصد سے بھی یہی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ہاتھ کی ورید قیفال (Cephalic Vein) کی فصد نکسیر اور بالائی حصہ جسم کے فساد خون سے ہونے والے امراض میں مفید ہے۔ ورید اسیلم (Vein between middle & ring finger) کی فصد جگر اور طحال کے درد میں مفید ہے۔ اسی طرح بواسیر اور کمر کے درد میں مفید فائدہ ہوتا ہے۔ ورید اکحل (Median Vein) کی فصد جسم کے بالائی اور زیریں حصہ کے درد میں مفید ہے۔ اسی طرح وداج ظاہر (Ext. Jugular Vein) کی فصد شدید درد سر اور داء الثعلب میں مفید ہے۔

تعداد عروق مفصودہ

عروق مفصودہ کی تعداد کے بارے میں حکماء کے مابین اختلاف ہے۔ یونانیوں کے نزدیک اُن کی تعداد ۶۶ ہے چنانچہ ارسطاطالیس (ارسطو) کی تصنیف جو یونانی زبان میں تھی اس کی بابت علامہ علی حسین گیلانی فرماتے ہیں کہ میں نے اس میں دیکھا کہ انسان کی ایک تصویر بنی تھی جو کرسی پر بیٹھا تھا اور اس تصویر میں اسی تعداد کے مطابق ان رگوں کی فصد دکھلائی گئی تھی اور ہر فصد کا فائدہ اسی کے کنارے پر لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ علامہ گیلانی فرماتے ہیں کہ "بدن کی ساری عروق مفصودہ کی تعداد جن میں وریدیں اور شریانیں دونوں شامل ہیں جہاں تک استقرا اور تلاش کی رہبری سے پتہ چلتا ہے اور جو ہماری کتابوں میں مذکور ہے ۳۶ ہیں۔

ورید مفصودہ کی تعداد کا ۳۴ ہونا شیخ الرئیس ابن سینا اور امین الدولہ ابوالفرج ابن القف المسیحی کی روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ عروق مفصودہ کا بیان پر ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

عروق مفصودہ

وریدِ مفصودہ ۳۴ ہیں۔

نواحی سر کی ۱۲ وریدیں۔

عرق الیافوخ۔ (Fantanual V.)

عرق الجبہہ (Frontal vein)

عرق الصدغ (Supra Occipital. V.)

عرق الماق (2 Veins of Lachrymal Angle)

عرق خلف الاذن۔ (Temporal. V.)

وداج ظاہر (Ext Jugular V.)

عرق ارنبہ (Veins at tip of nose)

عرق تحت الخشاء (3 Small post auricular V.)

عرق تحت اللسان (Sublingual V.)

عرق العنفقہ (Labial V.)

عرق لبہ (Veins of Gums)

چار رگ

ہاتھوں کی ۱۲ وریدیں۔ ہر ایک میں ۶ ہیں۔

۱۔ ورید قیفال (Cephalic Vein)

۲۔ ورید اکحل (Median Vein)

۳۔ ورید باسلیق (Basilic Vein)

۴۔ ابطی (Axillary Vein)

۵۔ حبل الذراع (Veins between Thumb & index finger)

۶۔ وریداسیلم (Veins between middle & ring finger).

پیروں کی ۸ وریدیں ہر ایک میں چار چار ہیں۔

۱۔ عرق النسا 1.(Sciatic Vein)
۲ ورید صافن (Saphenous V.)
۳۔ ورید مابض الرکبہ (Poplitaal V.)
۴۔ ورید مشط قدم (Veins of the heel)

بطن کی دو وریدیں۔

۱۔ جگر کے اوپر کی ورید
۲۔ طحال کے اوپر کی ورید

شریانات مفصودہ

۱۔ شریان خلف الاذن (Temporalartery)
۲۔ شریان صدغی Postauricular artery

عمل فصد کی ابتدا۔

عمل فصد کے ابتدائی پس منظر کے بابت ابن اصیبعہ نے ابن مطران کا قول نقل کیا ہے کہ :

"ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کا پہلا شخص ایک ہی تھا جو فن طب کا اسی طرح محتاج ہوا جس طرح آج کا ایک جم غفیر محتاج ہوتا ہے۔ اس کے جسم میں ثقل پیدا ہوا، آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ایسی صورت میں کیا کرے۔ طاقت ور ہونے کے باعث نکسیر پھوٹی اور تمام تکلیفیں دفع ہوگئیں۔ اس واقعہ کو اس نے ذہن میں رکھا۔ دوبارہ بعینہٖ یہی حالت پیش آئی تو اس نے ناک کو کرید کر خون بہایا جس سے تکلیف دفع ہوگئی اب یہ بات اس کے ذہن میں محفوظ ہوگئی اور اس نے اپنی اولاد اور نسل کو اس کی تعلیم دینی شروع کی۔ آگے فن میں لطافت پیدا ہوئی اور رگ کو نہایت باریکی کے ساتھ کھول دیا گیا۔ رگ کو کھولنے کا مفروضہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ مذکورہ نوعیت کے کسی مریض کو زخم یا خراش لگی ہو اور اس سے خون جاری ہوگیا اور مذکورہ نوع کا فائدہ پہنچ گیا ہو۔ پھر ذہنوں کے اندر باریکی کے ساتھ فصد کھولنے کی بات آگئی ہو اور ادویہ طب کا ایک باب قرار پا گیا ہو۔"

(عیون الانباء فی طبقات الاطباء)

عمل فصد اور جالینوس

ابن اصیبعہ عمل فصد کی بابت جالینوس کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے جس کو کہ جالینوس نے "کتاب الفصد" میں روایت کیا ہے جس میں کہ اسے خواب میں شریان کی فصد کھولنے کا حکم ہوا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ :

"خواب کے اندر مجھے دو بار داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان شریان کی فصد کھولنے کا حکم ہوا۔ چنانچہ بیدار ہونے کے بعد شریان کی فصد کھول دی۔ خون بہتا رہا حتی کہ خود بخود رک گیا۔ خواب میں ایسا ہی حکم ملا تھا۔ خون ۵۰۰ ملی لیٹر سے کم ہی بہا تھا کہ درد فوراً زایل ہوگیا۔ جو عرصے سے حجاب حاجز (ڈایافرام) اور جگر کے مقام اتصال (ملنے) پر محسوس ہو رہا تھا۔ یہ تکلیف بچپن سے تھی وہ کہتا ہے کہ شہر فرغامس کا ایک شخص میرے علم میں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایک مزمن مرض سے شفا دی۔ یہ مرض اس کے پہلو میں تھا۔ اس نے ہتھیلی کی شریان کھول دی۔ ایسا اس نے ایک خواب کے رو سے

کیا۔ (عیون الانباء فی طبقات الاطباء)

عمل فصد اور حکمائے عرب

حکمائے عرب میں فصاد کی ایک بڑی تعداد تھی جو کہ اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ عمل فصد سے متعلق ان کے بہت سے معالجاتی واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں چنانچہ دور عباسیہ میں بغداد کے شفاخانہ میں بھی باضابطہ فصاد ہوا کرتے تھے جن میں صاعد بن بشر سرفہرست تھا۔ ابن اصیبعہ ان کا ایک واقعہ نقل کرتا ہے کہ:

"وزیر علی بلبل بغداد میں تھا۔ اس کا ایک بھانجہ تھا جس کو سکتہ دمویہ لاحق ہوا۔ بغداد کے تمام اطباء سے اس کا حال مخفی رہا۔ ان میں صاعد بن بشیر موجود تھا۔ یہ خاموش رہا بقیہ تمام اطباء نے موت کا فیصلہ دے دیا۔ وزیر نے تجہیز کا انتظام کیا۔ لوگ تعزیت کے لیے اکٹھا ہوئے۔ عورتوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ صاعد بن بشیر وزیر کی مجلس سے ہٹے نہیں چنانچہ وزیر نے پوچھا کوئی ضرورت۔ اس نے کہا ہاں آقائے من حکم ہو تو عرض کروں۔ وزیر نے کہا جو جی میں ہو کہو۔ صاعد نے کہا یہ سکتہ دمویہ ہے صرف ایک نشتر لگانے دیں۔ اگر کامیاب ہوا تو مراد بر آئی ورنہ کوئی نقصان نہ ہوگا۔ وزیر نے خوشی کا اظہار کیا۔ عورتوں کو ہٹایا اور تمریخ نطول، بخور اور نشوق (سعوط) کی جو ضرورتیں تھیں مہیا کیں پھر ضروری کار روائیوں کے بعد طبیب نے بازو باندھ کر مریض کو بعض حاضرین کی گود میں بٹھایا اور بقدر ضرورت پٹیاں باندھنے کے بعد نشتر لگایا جس سے خون نکل آیا۔ ساتھ ہی گھر کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خون نکلتا رہا حتی کہ ایک کلو نکل گیا۔ آنکھیں کھل گئیں لیکن آواز نہیں نکلی۔ اب طبیب نے دوسرے ہاتھ کو بھی باندھا اور بقدر ضرورت سعوط دینے کے بعد ایک اور فصد کیا جس سے پہلی فصد کے بمقدار بلکہ اس سے بھی زیادہ خون نکلا۔ اب مریض بولنے لگا۔ اس کے بعد صاعد نے کھانے پینے کی ضروری اشیاء دیں۔ چنانچہ صحت ہوگئی۔"

(عیون الانباء فی طبقات الاطباء)

اس طرح کا ایک واقعہ ابن بطلان نے "علتہ نقل الاطباء المہرۃ تدبیر اکثر الامراض" کے عنوان میں تحریر کیا ہے کہ بغداد میں وزیر ابوطاہر بن بقیہ کو اس کے گھر میں سکتہ ہوگیا۔ وہاں امیر عزالدولہ بختیار بھی آگیا۔ اطباء نے متفقہ طور پر موت کا فیصلہ کر دیا۔ ابوالحسن ثابت بن ابراہیم بن زہرون حرانی نے کہا۔ امیر اگر یہ مر ہی چکے ہیں تو فصد سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ کیا فصد کھولنے کی اجازت ہے۔ انھوں نے فرمایا۔ ابوالحسن اجازت ہے۔ ابوالحسن نے فصد کھولی تھوڑا سا خون رسا اور رستے رستے بہنے لگا۔ وزیر کو افاقہ ہوگیا۔ تنہائی میں واقعہ پوچھا تو فرمایا وزیر کا معمول یہ تھا کہ صدغ کی رگوں سے موسم بہار میں کافی خون کا استفراغ کیا کرتے تھے۔ اس موسم میں ایسا نہ ہو سکا۔ میں نے فصد کھول دی تو طبیعت گھٹن سے نکل کر معمول پر آگئی۔

اہل فصد:

شیخ الرئیس ابن سینا تحریر کرتا ہے کہ فصد کے لیے دو قسم کے لوگ اہل اور مناسب ہیں۔

۱۔ وہ لوگ جو (کثرت خون کے باعث) امراض میں مبتلا ہو جانے کی استعداد رکھتے ہوں۔

۲۔ وہ لوگ جو (کثرت خون کے باعث) کسی مرض میں مبتلا ہوگئے ہوں۔

ان امراض دمویہ کی استعداد رکھنے والوں کی مندرجہ ذیل مثالیں ہیں:

ا۔ ایسے لوگ عرق النساء دموی، نقرس دموی اور

وغیرہ الفاصل دموی میں مبتلا ہونے کی استعداد رکھتے ہیں۔

۲۔ ایسے لوگ نفث الدم (پھیپھڑے سے خون آنا) میں باربار مبتلا ہوجایا کرتے ہیں۔

۳۔ ایسے لوگ خون کی زیادتی کے ساتھ صرع، سکتہ، مالیخولیا، اورام جلد، رمد حار میں مبتلا ہونے کی استعداد رکھتے ہیں۔

۴۔ ایسے لوگ جن میں خون بواسیر کی عادت ہو اور وہ بند ہوگیا ہو۔

۵۔ وہ عورتیں جن کا خون حیض بند ہوگیا ہو۔

۶۔ وہ لوگ جن کے اندرونی اعضا میں سوء مزاج حار مادی ہو۔

زمانۂ فصد

مذکورہ بالا استعداد رکھنے والوں میں شیخ الرئیس کی رائے کے مطابق موسم ربیع میں ان کی فصد کی جائے۔ باوجودیکہ ان امراض میں یہ اب تک کہ مبتلا نہ ہوئے ہوں۔

بلحاظ نوعیت اور حاجت فصد کے دو وقت بیان کیے گئے ہیں؛

۱۔ اختیاری ۲۔ ضروری اور اضطراری

فصد کا اختیاری (پسندیدہ) وقت دوپہر بعد کا ہے جب کہ غذا پورے طور پر ہضم ہوچکی ہو اور فضلات سے فراغت حاصل ہوچکی ہو۔

اور اضطراری وقت وہ ہے جس میں تاخیر کی گنجائش نہیں رہتی اور فصد کی حاجت شدید ہوتی ہے۔ مثلاً جب کہ سکتہ دمویہ اور مرض خناق کا اندیشہ ہو۔

علامہ علی حسین گیلانی نے استفراغ کے لیے دس اصول (قوانین عشرہ) بیان کیے ہیں جس سے یہ دلیل قایم کرتے ہیں کہ بدن کے اندر خون کا امتلا (ارتفاد) ہے جس کو فصد کے ذریعے دور کرسکتے ہیں۔

۱۔ قوت۔ ۲۔ عمر۔ ۳۔ مزاج طبعی۔ ۴۔ مزاج عارضی۔ ۵۔ عادت۔ ۶۔ سحنہ۔ ۷۔ پیشہ۔ ۸۔ سابقہ تدابیر۔ ۹۔ ملک۔ ۱۰۔ موجودہ وقت

فصد سے پرہیز

اسی طرح حکما نے فصد سے پرہیز کن حالتوں میں کیا جائے اس کے لیے کچھ اصول بیان کیے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں؛

۱۔ شدید بارد مزاجوں میں۔

۲۔ سخت ٹھنڈے ممالک میں۔

۳۔ شدت درد کے وقت

۴۔ حمام محلل کے بعد۔

۵۔ جماع کے بعد۔

۶۔ ۱۴ برس سے کم عمر اور بوڑھوں میں۔

۷۔ نہایت لاغر اور نہایت فربہ لوگوں میں۔

۸ مزمن مریضوں میں الّا یہ کہ امراض فساد خون کے باعث عارض ہوئے ہوں جو فصد کے متقاضی ہوں۔

۹۔ ستقلم حمیٰ کی حالت میں

۱۰۔ جب کہ معدہ رطوبات فضلیہ سے پُر ہو اور آنتوں میں ثقل بھرا ہوا ہو۔

عمل فصد اور انتقال الدم یا عملیہ خون میں فرق

عمل فصد

۱۔ عمل فصد کے ذریعے حاصل ہونے والا خون ناقص ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں مادہ مرض کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ انتقال الدم کے لیے مستعمل نہیں ہے۔

۲۔ اس میں خون کا اخراج مرض کی نوعیت کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ مقدار متعین نہیں۔

۳۔ عمل فصد کے لیے اوقات زمانہ متعین ہے

۱

جب کہ یہ اختیاری ہو۔

۴۔ اس میں حفظ ماتقدم کے طور پر یا امراض سے نجات کی غرض سے عمل کرتے ہیں۔

انتقال الدم / عطیہ خون

۱۔ انتقال الدم کے لیے حاصل کیا گیا خون صحت مند ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ بحالت صحت حاصل کیا جاتا ہے۔

۲۔ انتقال الدم کے لیے حاصل کیا گیا خون کا عطیہ ایک مخصوص مقدار میں حاصل کیا جاتا ہے۔

۳۔ انتقال الدم اور عطیہ خون کے لیے اوقات اور زمانے کی کوئی قید نہیں۔

نوٹ: حالاں کہ اوقات اور زمانہ کا لحاظ تولید خون کے اعتبار سے ضروری ہے۔

۴۔ یہاں حفظ ماتقدم اور مرض سے نجات کا کوئی نظریہ نہیں ہے۔

"اے صاحبو! مسلمانوں کی حالت کا تنزل اب اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ تمام ہندوستان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ نکلے گا جو اس کو تسلیم اور اس پر افسوس نہ کرتا ہو۔ ہماری حالت زار اب اس درجے پہنچ گئی ہے کہ غیر قومیں بھی ہم پر آنسو بہاتی ہیں اور ہمارے بچوں کی تعلیم کے لیے خیرات سے روپیہ جمع کرنے پر کوشش کرتی ہیں۔ بلکہ ہم کو اپنے ان ہم وطن ہندو بھائیوں کا جنھوں نے صرف دل میں ایسا ارادہ کیا شکر گزار ہونا لازم ہے مگر کیا ہماری قوم میں جن کے اسلاف کے ناموں کی شہرت دنیا کے ہر حصے میں گونج رہی تھی اور جن کی سیف و قلم کی نام آوری کے نشان ہسٹری میں اور دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں اب تک پائے جاتے ہیں اتنی غیرت اور ہمت بھی باقی نہیں رہی کہ اپنی قوم کی تعلیمات کی درستی پر توجہ کریں"

سرسید احمد خاںؒ

ایک مکمل ہیلتھ ٹانک ، بلکہ اور بھی بہت کچھ !



سنکارا : دل اور جگر کی صحت اور قوّت کے لیے لازمی بنیادی عناصر کا نادر مرکّب

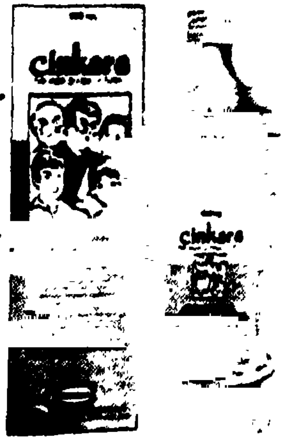
سنکارا واحد ٹانک ہے جس میں اچھی صحت کے لیے تمام لازمی بنیادی اجزا موجود ہیں ۔ مثلاً آئرن ، سوڈیم ، پوٹاشیم اور کیلشیم وغیرہ ۔ اسی کے ساتھ قدرتی جڑی بوٹیوں اور وٹامنز کے فوائد بھی شامل ہیں ۔ ان سے آپ کے دل ، جگر ، ہڈیوں ، عضلات اور دیگر اعضاء کو طاقت ملتی ہے اور نظام ہضم اور مرکزی نظام کو بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے ۔

آپ کو سنکارا کی کب کب ضرورت ہوتی ہے ؟

• عام اور غیر معمولی کمزوری میں • سخت جسمانی محنت کے بعد • جسم میں وٹامنوں کی کمی میں • بیماری کے بعد کی کمزوری میں • بھوک نہ لگنے میں • چھوت کی بیماریوں سے بچاؤ کی قوت بڑھانے کے لیے • حمل کے دنوں میں • بچوں کو ان کی بڑھوتری کے دنوں میں • وزن کی کمی میں • اعصابی پریشانی اور کام کی زیادتی سے تھکاوٹ میں • تغذیہ کی عام خرابی میں • تناؤ ، دباؤ اور شدتِ مرض میں ۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن ، کیلشیم ، زنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ قیمتوں کے ساتھ ساتھ :

Reputed brands of tonics	Iron (mg)	Calcium (mg)	Zinc (mg)	Alcohol content percent (V/V)	Contents per unit pack	Retail price excluding tax (Rs)
1	–	124	–	12.00	400	31.95
2	–	–	–	11.0	240	32.00
3	9.68	–	–	–	454	27.50
4	13.00	–	–	–	200	25.31
5	21.50	–	0.00682	5.5	200	28.26
6	16.709	–	–	–	300	23.40
7	–	–	–	–	200	28.00
8	7.63	–	0.50	–	100	35.00
9	5.60	9.50	–	9.5	300	31.95
Cinkara	20.59	19.87	2.00	[illegible]	[illegible]	24.44



لازمی بنیادی عناصر ، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

سنکارا

مشہور عالمی ٹانک — ہر موسم میں سب کے لیے

ہمدرد

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۲

شمارہ ۳

مارچ ۹۳ء

بانی :

سرسید احمد خاںؒ

سرپرست :

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر :

کبیر احمد جائسی

نائب مدیر :

احمد مجتبیٰ قریشی

انچارج سرکولیشن :

شفیق احمد

ترتیب : سرفراز

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,

TAHZIBUL AKHLAQ &

NISHANT,

ALIGARH MUSLIM

UNIVERSITY,

ALIGARH. 202002

PHONE : 24027

مندرجات

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - پرنٹر پبلشر اسرار احمد - مقام اشاعت ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات اے ایم یو علی گڑھ - پریس - اے ایم یو پریس - علی گڑھ

اداریہ

جس طرف بھی نگاہ اٹھا کر دیکھیے دنیا کے ہر خطّہ اور ہر گوشہ میں بسنے والے مسلمان کشاکش در کشاکش کے شکار ہیں جہاں وہ اکثریت میں ہیں وہاں آپسی نفاق نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ مثلاً افغانستان میں مذہب کے نام پر آپسی جنگ ہو رہی ہے اس کا مذہب سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ پختون، اُزبک اور تاجیک قومیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ رہی ہیں۔ عراق اور کویت ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینے کے درپے نظر آتے ہیں۔ پاکستان میں مہاجر اور غیر مہاجر کی جنگ جو ناگوار شکل اختیار کر چکی ہے اور جتنی زندگیوں کی بھینٹ لے چکی ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سندھی، پنجابی کا مخالف ہے تو پنجابی سندھی کا، بلوچ، پختون کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے تو پختون بلوچ کے خون کا۔ غرض کہ عددی اکثریت اور مادی وسائل کی موجودگی کے باوجود دوسرے درجے کی بالا ممالک بڑی طاقتوں کے دستِ نگر اور ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں وہاں مختلف عنوانات اور مختلف طریقوں سے ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں۔ بڑے مہذب انداز سے ان کی نسل کشی کی جا رہی ہے مگر اس کے باوجود آپسی نفاق اُن کو نہ تو ایک مرکز پر جمع ہونے دے رہا ہے اور نہ ہی ان کو کوئی لائحۂ عمل مرتب کرنے دے رہا ہے۔ ہر جگہ نفاق کا دور دورہ ہے اور امّت مرحومہ ہے کہ نفاق سے نکلنے اور پیش رفت کی راہوں پر گامزن ہونے کا خواب تک نہیں دیکھ رہی ہے۔

اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھیے تو مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ عصری اور مذہبی علوم کے متخصّصین کی تعداد پہلے کے مقابلے میں سو گنا اگر نہیں ہو تو پچاس گنا ضرور ہو چکی ہے۔ بڑی بڑی دانش گاہوں اور عالی شان دینی مدارس کی تعداد بھی روز افزوں ہے۔ مسلمانانِ عالم کے پاس تیل جیسی دولت ہے وہ بڑی بڑی تجربہ گاہوں کے بھی مالک ہیں جن میں نتیجہ خیز تحقیقات ہو رہی ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں مالی حیثیت سے بھی مستحکم مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے مگر ان تمام باتوں کے باوجود زندگی کے ہر محاذ پر ہر ملک میں مسلمان پچھڑتے ہی چلے جا رہے ہیں، مسجدیں پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ آباد نظر آتی ہیں۔ قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بھی پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ کانوں میں آ رہی ہیں۔ پھر بھی مسلمانوں کی ہر دُعا بے اثر اور ہر عمل، نامحمود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟

ہمارے نزدیک مسلمانوں کی اس پستی، ذلت، اَدبار اور کس مپرسی کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے اور اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتے ہوئے دینی اور دنیوی دونوں امور میں سنت

سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ ہماری سرکشی کی چند موٹی موٹی مثالیں یہ ہیں۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ بہت سے لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے روزے رکھ رہے ہیں۔ تراویح پڑھ رہے ہیں۔ جماعت سے نماز ادا کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود بھی سنت سے سرکشی کا ہمارا انداز وہی ہے۔ آپ اختتامِ سحر کے وقت گھڑی لے کر بیٹھ جائیے تو آپ کو اس سنگین حقیقت کا احساس ہوگا کہ بہت سی مسجدوں سے طلوعِ فجر سے پہلے ہی اذان کی آواز آنے لگتی ہے۔ یہ سنت الرسول سے کھلی ہوئی سرکشی ہے مگر کوئی عالمِ دین کوئی علامۂ وقت کوئی شیخِ زماں اس سرکشی کی طرف توجہ نہیں دلاتا

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس نماز کے بعد استراحت فرما کر تہجد کی نماز ادا فرماتے، اس کی حرمت کا بھی ہم کو کوئی پاس لحاظ نہیں۔ ہم نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ جس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نفل ادا کرنے سے احتراز فرمایا ہے اس وقت عالم ہو یا عامی التزام کے ساتھ نفل ادا کرتا ہے اور اس کو کارِ ثواب سمجھتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ ثواب اتباعِ سنت میں ہے اس سے روگردانی کرنے میں نہیں۔ ہم کو یہ تو یاد رہتا ہے کہ پہلی صف میں نماز ادا کرنے پر زیادہ ثواب ملتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہم فراموش کر بیٹھے ہیں کہ نماز کے لیے اہتمام ضروری ہے اور پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے لیے وقت سے پہلے مسجد میں آ جانا لازمی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ پہلی صف میں نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنے کے لیے بہت سے حضرات نمازیوں کو پھلانگتے ہوئے، گھستے پلتے پہلی اور دوسری صف کے درمیان میں آ کر دھنس جاتے ہیں اور جب جماعت کھڑی ہوتی ہے تو پہلی صف پر حملہ آور ہو کر بیچ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے حضرات خود بھی پریشانی سے نماز ادا کرتے ہیں اور اغل بغل والے کے لیے بھی باعثِ آزار بنتے ہیں مگر اپنے اسی عمل کو کارِ ثواب سمجھنے پر مُصر رہتے ہیں، بعض حضرات نفلی تلاوت کو سنن اور واجبات پر ترجیح دینے کے عادی بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ حضرات نمازیوں کے بیچ میں بیٹھ کر زور زور سے تلاوت کر کے نمازیوں کا دھیان دوسری طرف مبذول کرانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ بہت سے واعظین کا وطیرہ یہ ہو گیا ہے کہ ابھی لوگ سنتوں سے فارغ نہیں ہوئے ہیں کہ وہ اس ڈر سے اپنا وعظ شروع کر دیتے ہیں کہ مجمع کم ہو جائے گا، ایسے واعظین دوسروں کی نماز خراب کر کے مسرور ہوتے ہیں کہ انھوں نے کوئی دینی فریضہ انجام دیا ہے۔

اوپر جو چند مثالیں تحریر کی گئی ہیں وہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہیں۔ کیا یہی اتباعِ سنت ہے جس کے ہم مدعی ہیں ان میں سے کوئی ایک عمل بھی ایسا ہے جس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کہا جا سکتا ہے؟ جب ہم دینی معاملات میں بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی نہیں کر رہے ہیں تو دنیاوی معاملات کا تو ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

مسلمانوں کے درد کا اصل علاج نہ عصری علوم کی دانش گاہیں اور ان کی بڑی بڑی ڈگریاں ہیں نہ ہی عالی شان مدارس کی اسنادِ فراغت۔ مسلمانوں کے درد کا اصل علاج آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی میں ہے۔ جس دن بھی مسلمان دینی اور دنیاوی دونوں امور میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعی اور حقیقی پیرو بن جائے گا، اسی دن سے اس کے حالات بدلنے شروع ہو جائیں گے۔ عددی اقلیت و اکثریت کا تصور اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ جائے گا اور ہر طرف وہی مناظر نظر کے سامنے ہوں گے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے معاشرے کے تھے۔ جب تک مسلمان آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعی اور حقیقی پیرو نہیں بنتے، کوئی حکومت کوئی معاشرہ، کوئی علم و فن، کوئی فلسفہ کوئی نظریہ ان کو قعرِ مذلت میں گرنے سے نہیں روک سکتا۔ موجودہ حالات کے اس دوراہے پر ہم کو اپنے آپ سے سوال کرنا چاہیے کہ کیا ہم واقعی متبعِ سنت ہیں؟ یعنی کیا ہم واقعی اور حقیقی مسلمان ہیں؟

بکر احمد عباسی

سر سید احمدؒ نے فرمایا

"کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا۔ آہ وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے؟ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے۔"

"قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ چکے ہیں تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے، امراء غافل و بے پرواہ ہیں۔ علماء زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔"

"ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے مگر متعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک ہنر اور علم اور فن کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔"

تراویح

سید حامد ▽

قرآن کریم کی برکتوں میں سے ماہ مبارک رمضان بھی ہے اس مہینے میں نفس کو مارنے کے، جو ہر پل موٹا ہونے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے، سو جتن کیے جاتے ہیں۔ ذرا سی ڈھیل نفس کو دے دیجیے اور یہ سر پر چڑھ جاتا ہے۔ اس کی لگام کھینچتے رہیے تب ہی یہ قابو میں رہتا ہے الٰہ اللہ کیا کیا ترکیبیں کی جاتی ہیں اسے تابع فرمان رکھنے کے لیے: بھوک لاکھ ستائے کچھ نہ کھاؤ، پیاس سے زبان سوکھ جائے حلق تر نہ کرو۔ نیند پیہم یلغار کرے اسے ہر بار پیچھے ڈھکیل دو۔ لذتوں کی طرح لگاتار دل کو لبھانا چاہے، اسے پاس پھٹکنے نہ دو۔ جو خواہش سر اٹھائے اس پر انکش لگا دو۔ طرح طرح کی برائیاں دل کا محاصرہ کریں ان کو ایک قدم آگے نہ آنے دو۔ جھوٹ زیب داستان بن کر زبان پر آنا چاہے، گریبان پکڑ کر اسے نکال باہر کرو۔ غیبت کرنے کو جی چاہے، بہتان لگانے پر طبیعت مائل ہو، نکتہ چینی پر طبیعت آمادہ ہو، الزام تراشی کے لیے طبیعت مچلے، تلملائے، بل کھائے، اس کا گلا گھونٹ دو۔ طبیعت کو حمد و ثنا، شکر و غنا، خیر اندیشی، خوش بینی، خوش خلقی، خودداری، خود نگہداری کی صراطِ مستقیم پر ڈال دو۔ خود عاید کی ہوئی پابندی، بھوک پیاس، صبر، ضبط، شکر، صرف نفس کی تہذیب اور تزکیہ کے لیے ہی تو ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح ہماری قربانی کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح وہ ہماری عبادات و وظائف اور ہمارے روزہ نماز سے بے نیاز ہے ہم اپنے زعم باطل اپنے گمان تقویٰ میں یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ روزے نماز، زکوٰۃ، خیرات پر عامل ہو کر ہم اپنے رب پر احسان کر رہے ہیں، عیاذاً باللہ۔ یہ بھی نہیں کہ ہم ان نعمتوں کے جن سے اس نے ہمیں نوازا ہے، اس کے شکر کا حق ادا کر رہے ہوں۔ یہاں بھی احسان اسی کا ہے، ممنون احسان ہم ہی ہیں۔ روزے کی ریاضت سے وہ ہمارے دل کا زنگ چھڑاتا ہے، اس کی انانیت، اس کی خود فریبی، اس کی لذت پرستی اور خفلت کو دور کرتا ہے۔ ہمیں سکھاتا ہے کہ غصہ اور غرور، فریب اور کج روی، ناانصافی اور حق تلفی ایک عمر کی عبادت کو ایک پل میں بھسم کر دیتی ہیں۔ انسان نفس پر قابو حاصل نہ کر سکے تو عبادتیں بے کار ہیں، عبادتیں اپنے ساتھ حسنِ عمل کو لے کر نہ چل سکیں تو عبادتیں کھوکھلی ہیں۔ خالق کی پرستش کرنے والا اس کی مخلوق کو کیوں کر نظر انداز کر سکتا ہے۔ حسنِ عمل بغیر ضبطِ نفس کے ممکن ہی نہیں۔ رمضان ضبطِ نفس کی تربیت دیتا ہے ہمارے یہاں

▽ سابق وائس چانسلر، اے ایم یو علی گڑھ ——— ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

ایک دن کو دوسرے دن پر، ایک ماہ کو دوسرے مہینوں پر فوقیت نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف ان دنوں کو ان مہینوں کو جو ضبطِ نفس اور خدمتِ خلق میں بسر ہوں۔ رمضان شریف کا مقصد اور اس کا نشان امتیاز بھی یہی ہے۔ خدمت کو عبادت سے الگ کر دیجیے تو بچا کیا؟

لیکن رمضان کو ایک امتیاز اور بھی حاصل ہے نزولِ قرآن کا امتیاز، جس کی یاد میں ہم اجتماعی طور پر قرآن کو دہراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ ہم ناتواں بندے اپنے پروردگار کے پیمان کے ایفا میں شریک ہوتے ہیں۔ رمضان کا چاند جہاں نظر آیا، مسجدوں میں غیر معمولی چہل پہل ہو گئی۔ عشا کی نماز کے ساتھ تلاوت قرآن پاک کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عشا کی سترہ رکعتوں میں تراویح کی ۲۰ رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا امام کے ساتھ مقتدی رمضان میں کلام پاک کی مکمل تلاوت کر لیتے ہیں۔

لیکن بہت سی مسجدوں میں جس رفتار سے تراویح پڑھی جاتی ہے اس سے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امام خود تو تلاوت کلام پاک کر رہا ہے لیکن مقتدیوں کو تلاوت میں شریک نہیں کر رہا ہے۔ امام صاحب اتنی برق رفتاری کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں کہ معنیٰ در کنار الفاظ گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور وضاحت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ اجتماعی تلاوت تو نہیں ہوئی نعوذ باللہ، امام صاحب کی طرف سے سرپٹ دوڑنے کا ایک مظاہرہ ہو گیا۔ بعض ائمہ دس روز میں قرآن ختم کر لیتے ہیں۔ بعض چار روز میں۔ ان کی رفتار کا تو ساتھ کوئی دے ہی نہیں سکتا۔ جو حضرات ۲۲ تا ۲۴ دن میں تکمیل کرتے ہیں وہ بھی سکون و اطمینان کے ساتھ نہیں پڑھ پاتے۔ عام طور پر وہ روزانہ پچاس منٹ تراویح پر صرف کرتے ہیں۔ بہر کیف یہ تعجیل سراسر ناروا ہے کہ ۲۴ روز سے کم میں قرآن ختم کیا جائے۔ راقم سطور نے ناروا کا جو لفظ استعمال کیا وہ مذہبی احکام کے سیاق میں نہیں ہے۔ اس سے اس کی مراد "غیر ضروری اور بے محل" ہے۔ یہ ہیچ مداں یہ تسلیم کرتا ہے کہ تراویح میں اس طرح کی شرکت بھی خیر و برکت رکھتی ہے، لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کلام پاک اس انداز سے پڑھا جائے کہ اس کے الفاظ مقتدیوں کے سامعہ میں اتر جاتے، ذہن سے گزرتے اور ان کا ایک حصہ حافظہ میں محفوظ رہ جاتا۔ قرآن کریم کو خواہ وہ تراویح کے دوران ہی کیوں نہ ہو، اس انداز سے پڑھنا چاہیے کہ اس سے نمازیوں کو سکون اور حظ حاصل ہو، ان کے ذہنوں کے دریچے ارشاداتِ ربانی کی پذیرائی کرنے اور انھیں جذب کرنے کے لیے کھل جائیں۔ تیز رفتاری کی تائید میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا حفظ اور اس کی قرأت تیز رفتاری سے سہل ہو جاتی ہے شاید ایسا نہیں ہے۔ بعض حفاظ حضرات معتدل رفتار سے تلاوت کرتے ہیں۔ شاید یہ بات تسلیم کرنی پڑے کہ امام کو چھوٹے چھوٹے وقفوں سے ایک لفظ پر زور دے کر حافظے کو کمک پہنچانی پڑتی ہے اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ مدعا یہ بہر حال ہونا چاہیے کہ قرآن پڑھتے وقت اس کے وقار، عظمت، حسن صوت، اور غنا کا خاطر خواہ اثر مقتدیوں پر پڑتا ہے۔ یہ کیا ضرور کہ تراویح پچاس منٹ میں پڑھ لی جائے۔ سامعہ پذیرائی اور فہم ادراک سے محروم رہے۔ ۱۵ منٹ کا اضافہ بھی کر دیا جائے تو بڑا فرق آ جائے۔ الفاظ صاحت کے ساتھ ادا ہوں اور نمازیوں کے ذہن نشیں ہوتے چلے جائیں۔ ۱۵ کے بجائے اگر ۲۵ منٹ کا اضافہ ہو تو کہنا ہی کیا۔ زبان اور ذہن کی ساری گرہیں کھلتی چلی جائیں؛ امام اور مقتدی دونوں کو سکون اور انشراحِ قلب حاصل ہو۔ خواصِ عبادت کو چھوڑ کر عوام بھی کیفیت محسوس کریں، حظ اندوز ہوں۔ اللہ اللہ کیا سماں ہے۔ اپنے پروردگار کا کلام اس کے بندے اس کے دربار میں خشوع و خضوع، عجز و تشکر کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ پڑھ رہا ہے امام اور شریک ہو رہے ہیں سب

نمازی۔ یوں بھی بندے کے لیے واجب ہے کہ اپنے رب کا کلام ادب، آہستگی، نرمی اور فروتنی کے ساتھ پڑھے۔ آدابِ عبودیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جُرعہ جُرعہ لطف اندوز ہو۔ نور کا نزول ہو رہا ہے، اس کی پذیرائی ذہن اور قلب و جگر کی تہیں کھول کر عاجزی اور بندگی کے انداز سے ہمہ تن گوش ہو کر کرے۔ اسی طرح جیسے برگِ گل تبسم اور نور کی پذیرائی کرتی ہے۔ یہ عامی و خاص محسوس کرتا ہے کہ جس تیز رفتاری اور بلند آوازی کے ساتھ قرآن دوران تراویح پڑھا جاتا ہے وہ نہ صرف مقتدیوں کو یک گونہ محروم رکھتا ہے بلکہ وقارِ کلام پاک کے منافی ہے۔ اس طرح اس کی تاثیر گھٹ جاتی ہے، فیض رسانی کم ہو جاتی ہے۔ کیا اس طرح صاحبِ بارگاہ، خالقِ کائنات کے احترام میں کسر نہیں آتی؟

عبادت کے اس زریں سلسلہ کا فیض دوچند ہو جائے اگر نماز سے پہلے امام صاحب فرما دیا کریں کہ آج وہ تراویح میں کون سی سورتیں تلاوت فرمائیں گے ان کی شانِ نزول کیا ہے، ان کا مفہوم، آن کا لب لباب کیا ہے۔ اسی طرح نماز کے خاتمے پر وہ بتا دیا کریں کہ دوسرے روز کون سی سورتیں تلاوت فرمائیں گے۔ یہ اعلان بعض مقتدیوں کو اس کا موقع دے گا کہ دن میں ان سورتوں کی باترجمہ تلاوت کر سکیں اور دوہرے ثواب کے مستحق ٹھہریں؛ قرآن کریم کی تفہیم میں مدد ملے اور ذوقِ تلاوت شہ پائے۔

امام صاحب اگر خوش الحان ہوں تو سونے پہ سہاگہ ہو جاتا ہے۔ جن حفاظ کا لہجہ کرخت ہو انھیں تراویح پڑھانے کی زحمت نہ دی جائے۔ ورنہ انھیں اور ان کے مقتدیوں کو ان کی محرومی کا احساس ہوا کرے گا اور ذوقِ عبادت اور کیفِ سماعت مجروح ہو جائے گا۔

"بھائیو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا غلام بنانا چاہوں، میں تو خود اللہ تعالیٰ کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا کام میرے سپرد ہے۔ اگر میں یہ کام اس طرح سرانجام دوں کہ تم اپنے گھروں میں اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرو تو یہ میری خوش نصیبی ہے اور اگر خدانخواستہ میری یہ خواہش ہو کہ تم لوگ میرے دروازے پر حاضری دیا کرو تو یہ میری بدبختی ہوگی۔ میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں اور نصیحت کرتا ہوں، لیکن صرف قول سے ہی نہیں بلکہ عمل سے بھی۔

حضرت عمر بن الخطاب

سرسید کا استدلالی اندازِ بیان

قمر الہدیٰ فریدی ▽

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ ہر صاحب طرز ادیب کی کم و بیش تمام تحریریں ایک اسلوب نگارش کی مظہر ہوتی ہیں لیکن یہی بات سرسید کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ انھوں نے مذہب، سیاست، تاریخ، تنقید، تحقیق اور صحافت وغیرہ موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور ہر ایک کے لیے الگ الگ طرز ادا اختیار کیا ہے۔

زیادہ تر اُن کا لب و لہجہ سنجیدہ ہوتا ہے جس میں بعض اوقات خشکی بھی آجاتی ہے لیکن اندازِ بیان بالعموم استدلالی ہوتا ہے۔ سامنے کی باتوں سے نکتے پیدا کرنا اور ان کی مدد سے اپنے موقف کو مضبوط بنانا اُن کا خاص اسلوب ہے۔

سرسید کا کمال یہ ہے کہ وہ آسان زبان میں بڑی سے بڑی بات آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔ ثبوت کے طور پر 'بحث و تکرار'، 'رسم و رواج' اور اس نوع کے دیگر مضامین پیش کیے جا سکتے ہیں۔ 'بحث و تکرار' کے تمہیدی کلمات ملاحظہ ہوں:

"جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور رغیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبوڑا، جو کمزور رہا، دم دبا کر بھاگ نکلا۔"

سرسید نے ایک ایسے جانور کا انتخاب کیا ہے جو ہندوستان میں عام طور سے ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ گلی گلی میں مارا مارا پھرنا بھونکنا اور ایک دوسرے کو کاٹنا بھنبوڑنا جس کی فطرت ثانیہ ہے۔ وہ کتوں کی آپسی جنگ کے اجمالی ذکر پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ موضوع سے متعلق ایک ایک جزیہ پر روشنی

▽ لکچرر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈالتے ہیں اور صورت حال کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ آخر میں بتاتے ہیں کہ "نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے۔ واہ یوں نہیں، یوں ہے۔ وہ کہتا ہے ـــ واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے ـ تم کیا جانو! دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے، رخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراونی ہوجاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عیف عیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا، ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔"

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ سرسید نے جس تفصیل سے کتوں کا ایک دوسرے پر جھپٹنا اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کا منظر پیش کیا ہے، اسی تفصیل، ترتیب اور انداز سے ناشائستہ افراد کے درمیان ہونے والی تکرار پر روشنی ڈالی ہے اور جب وہ ہر طرح مطمئن ہو جاتے ہیں کہ "مدعا نگاری" کے لیے زمین ہموار ہو گئی ہے تو یوں نصیحت کرتے ہیں:

"پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار سے پرہیز کرے۔"

واضح ہو کہ سرسید بحث و مباحثے کے خلاف نہیں ہیں بلکہ کتوں کی طرح ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہونا ان کی نظر میں قابل مذمت ہے۔ لکھتے ہیں ــــ "انسان میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث و تکرار ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔"

یہاں ہر بات سلجھے ہوئے انداز میں کہی گئی ہے اور اس طرح کہی گئی ہے کہ قاری قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اور اب سرسید کے ایک نسبتاً کم معروف مضمون "طریق تناول طعام" کا طرز بیان ملاحظہ ہو۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"ضد اور نفسانیت انسان کے بہت بڑے دشمن ہیں۔ کسی اچھی بات کو ضد سے نہ ماننا اور اس کی نیک و بد پر غور نہ کرنا درحقیقت انسان کا کام نہیں ہے۔"

پہلا جملہ ہی توجہ طلب ہے۔ ایک ایسی بات کہی گئی ہے جسے ماننے میں کسی صاحب عقل کو تامل نہیں ہو سکتا اس تمہید کا فائدہ یہ ہے کہ فطری طور پر آگے پڑھنے اور لکھنے والے کے خیالات کو جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ آگے چل کر ہندوستانی مسلمان کے طریقہ تناول طعام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "دسترخوان پر کوئی تو فیرنی کلمۂ شہادت کی انگلی سے اور کوئی دست بخیر چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے۔ کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے تھڑا ہوا پنجہ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے۔ کسی نے بورانی کے پیالے سے منہ لگا کر سڑ پا بھر کر یہ کہہ کر واللہ بڑی تیز ہے، اوہ اوہ کرنا شروع کیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں کی نکالی ہوئی مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں۔ اس عرصے میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اس نے ہاتھ دھونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا اور

بیسن سے دانت رگڑنا اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر زبان صاف کرنا شروع کیا ہے اور بے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ اُن ہاتھ منہ دھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو ان لوگوں کی کریہہ آواز سننے اور زرد زرد ہلدی کے ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوتھڑے تھوہ کر کر چلمچی یا تاشش میں تھوک دینے اور بتاشے کی طرح اس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پروا ہے۔ نعوذ باللہ منہا!"

مذکورہ پیراگراف میں محض واقعہ بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ معاملے کے تمام ترمنفی پہلوؤں کو ابھارنے کے لیے تشدید Intensification سے بھی کام لیا گیا ہے فن کار جب کسی واقعے کی تصورکشی کرتا ہے تو اپنی طرف سے بعض رنگوں کا اضافہ بھی کر دیتا ہے۔ تاکہ حسب منشا پہلوؤں اور گوشوں پر دوسروں کی توجہ مبذول کرا سکے۔ لیکن اس عمل میں وہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب اس کی صناعی فطری معلوم ہو۔ یہاں بھی یہی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ دیکھیے!

"کسی نے پورانی کے پیالے سے منھ لگا کر سٹرپا بھر کر، یہ کہہ کر واللہ بڑی تیز ہے اوہ اوہ کرنا شروع کیا ہے:"

بظاہر کس قدر سیدھا سادہ جملہ ہے۔ لفظوں کی ترتیب و انتخاب میں بھی کوئی خاص اہتمام نظر نہیں آتا لیکن تجزیہ کیجیے تو اس سادگی میں کتنی لہجہ کاری ہے۔ پورانی کے پیالے سے منہ لگانا، سٹرپا بھرنا اور اس کے بعد "واللہ بڑی تیز ہے" کہہ کر پورانی کے مزے کا اظہار کرنا اور بالآخر ان سب افعال کے نتیجے میں اوہ اوہ کرنا ___ کھانے والے کی ذہنی کیفیت کی کس قدر مکمل غمازی ہے۔ پھر جھوٹے برتن، نیم خوردہ کھانے، چھوڑی ہوئی ہڈیوں اور سالن سے نکالی ہوئی مکھیوں کا بیان اس اہتمام کے ساتھ آتا ہے کہ وہ سب سامنے رکھی ہیں۔ یہ ذکر بہ ذات خود ابکائی پیدا کرنے کے لیے کافی ہے لیکن سرسید اب بھی مطمئن نہیں۔ وہ کھانے سے فارغ ہونے والوں کے ہاتھ منہ دھونے اور کھنکارنے کا عمل بھی مصور کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ منہ سے نکلے ہوئے لعاب کے لیے زرد زرد ہلدی کے رنگ کی تشبیہ ڈھونڈتے ہیں۔ بلغم کے لوتھڑوں کو بتاشے کی طرح پانی پر تیرتا ہوا دکھاتے ہیں اور یوں قاری کو یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ کھانے کا یہ طریقہ مناسب نہیں۔ اصولی طور پر یہاں پہنچ کر بات مکمل ہو جاتی ہے لیکن وہ حسب عادت بحث کو مزید پھیلاتے ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ اُن کی نثر کی خامی ہے کہ اس کے سبب سے ان کی تحریر صرف اسی جگہ ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے موقعوں پر بے جا تکرار و طوالت کا شکار ہوئی ہے لیکن مقصدیت اور مدعا نگاری سرسید پر اس قدر حاوی تھی کہ وہ اس خامی کی جانب متوجہ نہ ہو سکے۔ سرسید کی بیشتر تحریریں قوم کو جھنجھوڑنے کے لیے وجود میں آئی تھیں۔ انھیں اس کا شدید احساس تھا کہ ان کے مخاطب عوام ہیں، اور عوام سے صاف صاف انداز

> "ہم اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ اسلام کا نظریۂ اخوت نسل اور قومیت کی تمام رکاوٹوں سے بالاتر ہو جاتا ہے یہ ایسی خصوصیت ہے جو کسی مذہب میں نہیں۔"
>
> رادھا کرشنن

میں بات کہنا چاہیے۔" انھیں ادائے مطلب میں سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حسنِ بیان کو قربان کر دیتے تھے ۔ کہیں کہیں قواعد کے اصولوں سے بھی روگردانی کر جاتے تھے ۔ ان کے یہاں متروکات کا استعمال بھی ہوا ہے اور الفاظ و خیالات کی تکرار بھی ملتی ہے۔ کہیں زبان اکھڑی اکھڑی سی ہوتی ہے ۔ کہیں جملے ڈھیلے ڈھالے معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں بیان ضرورت سے زیادہ سپاٹ اور طویل ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتے تو خود بھی ذرا سی توجہ سے ان خامیوں کو دور کر سکتے تھے لیکن انھیں اس کی فکر نہ تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی ان کی نظر میں تھی اور مستقبل کا اندھیرا ان کے سامنے ! ان کا دل مضطرب تھا اور وقت کم ! اکثر اوقات انھیں برجستہ لکھنا پڑتا ۔ بہت سے موقعوں پر انھیں اپنی تحریر کو دوبارہ ایک نظر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی ۔ ایسی صورت میں ان کے یہاں اعلیٰ ادبی نمونوں کی کم یابی حیرت کی بات نہیں ہے ۔ تاہم ان کا واضح ، قطعی اور استدلالی اندازِ بیان اپنے اندر اظہار و ابلاغ کی جو صلاحیتیں رکھتا ہے ، اس کا اعتراف نہ کرنا یقیناً زیادتی ہوگی کہ یہ وہ طرزِ تحریر ہے جس نے اردو نثر کو توانائی بخشی ہے ۔

اعلان بابت ملکیت

مالک : ـــــــ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

قومیت : ـــــــ ہندوستانی

حصہ دار : ـــــــ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

ایڈیٹر : ـــــــ پروفیسر کبیر احمد جائسی

قومیت : ـــــــ ہندوستانی

پرنٹر پبلشر ـــــــ پروفیسر اسرار احمد

پریس : ـــــــ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس ۔ علی گڑھ

اشاعت کی مدت : ـ ماہانہ

مقام اشاعت : ـــ ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں ۔

کبیر احمد جائسی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۳ (مارچ ۹۳ء)

نفرت

محمد مختار اصلاحی علیگ ▽

نفرت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔ محبت کی طرح نفرت کے لیے بھی ہر دل میں جگہ ہے۔ یہ نافع بھی ہے اور نقصان دہ بھی اگر ہر قسم کی برائیوں اور ہر طرح کے برے کاموں سے نفرت ہے تو یہ نفع بخش ہے لیکن اگر کسی کو اچھے بھلے کاموں سے یا بھائی کو بھائی سے نفرت ہے تو یہ نقصان دہ اور تباہ کن ہے۔ دراصل یہی وہ نفرت ہے جس سے تمام مذاہب نے بڑی سختی سے روکا ہے اور ہر دانش ور نے کھل کر اس کی مذمت کی ہے۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ نفرت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کی تعمیری صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے۔

مذہب، سیاست، معیشت، وطنیت، علاقائیت، قومیت، حسب و نسب، رنگ و نسل، امارت و غربت، زبان و طرز تحریر، ذات پات اور اونچ نیچ وغیرہ ان سب ہی ذریعوں سے کم و بیش نفرت کو پھیلنے کا موقع ملتا رہا ہے۔

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب تو نفرت و عداوت کے خلاف ہیں لیکن اکثر مذہب ہی کے پیروکار نفرت و دشمنی کی آگ لگانے میں سب سے پیش پیش رہتے ہیں۔ سیاست کی باگ ڈور جب بھی کسی غیر ذمہ دار اور بدکردار کے ہاتھ میں آئی تو اس نے نفرت پھیلا کر بھری بستیوں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ روٹی روزی اور روزگار کے حصول میں بھی نفرت کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ وطن و قوم کے نام پر بھی نفرت کا پرچار ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ حسب و نسب اور رنگ و نسل نے بھی نفرت کو خوب خوب ہوا دی ہے۔ امارت و غربت کے باہمی فرق نے بھی نفرت کو ابھارا ہے۔ زبان و طرز تحریر کے مسئلے نے ہر جگہ کم لیکن ہمارے ملک میں نفرت کی زبردست آگ بھڑکائی ہے۔ ذات پات اور اونچ نیچ کے جھگڑے نے نفرت کا جو زہر پھیلایا ہے اس سے ہمارے دیس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

نفرت کسی وجہ یا کسی بھی ذریعے سے ہو نہایت خطرناک ہے اور اس کے نتائج کبھی بہتر نہیں ہوتے۔

نفرت کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔

۱۔ نفرت جس دل میں جگہ بناتی ہے سب سے پہلے اسی کو تباہ کرتی ہے۔ کیونکہ نفرت کی آگ ہر وقت اس کے دل میں سلگتی رہتی ہے۔

۲۔ نفرت کرنے والے کے اخلاق، عادات اور طرز فکر میں ایسی خرابی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کی شخصیت کے توازن کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

۳۔ فکر و عمل کا دائرہ اس کی اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرے سے اس

▽ اصلاحی دواخانہ۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی۔

کا رشتہ کٹ جاتا ہے۔

۴۔ ناجائز دباؤ اور ظلم و فساد اس کی عادت ثانیہ بن جاتے ہیں۔

۵۔ نفرت، سکون و مسرت کے احساس کو بے چینی و ناگواری میں تبدیل کر دیتی ہے۔

۶۔ یہ ایک طرف تو اخلاق حسنہ یعنی خلوص، محبت، ہمدردی، ایثار و قربانی، عفو و درگزر وغیرہ کو دور کر دیتی ہے تو دوسری طرف بہت سی اخلاقی برائیوں کو جیسے خودغرضی، ذاتی رنجش، بغض و کینہ، عداوت و دشمنی کو اکٹھا کر لیتی ہے۔

۷۔ جس گھر، جس خاندان، جس جماعت اور جس ادارے میں نفرت کو گھسنے کا موقع مل جاتا ہے اسے تہس نہس کر کے رکھ دیتی ہے۔

۸۔ نفرت نے بے شمار جھگڑے کھڑے کیے جس میں لاکھوں انسان ہلاک اور ہزاروں گھر تباہ و برباد ہوئے۔

تدارک:

نفرت کا مکمل اور کامیاب علاج تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا اور سکھایا ہے کہ " انسان ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا گیا ہے اور اس رشتہ سے دنیا کا ہر فرد ایک دوسرے کا بھائی ہے۔ اتر کا رہنے والا ہو یا دکن کا۔ مشرق کا ہو یا مغرب کا، ایران کا ہو یا توران، عرب کا ہو یا عجم کا۔ کالا ہو یا گورا، امیر ہو یا غریب۔ عالم ہو یا جاہل۔ انگریزی بولتا ہو یا عربی، ہندی جانتا ہو یا اردو، بحیثیت انسان کے سب برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے شریف و بہتر انسان وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو اور ہر طرح کی بری عادتوں اور گناہوں سے دور رہتا ہو۔ جہاں کہیں اور جب تک اس ہدایت پر پابندی سے عمل ہوتا رہا نفرت کا وہاں کبھی گزر نہ ہو سکا۔

سیدنا مسیح کا ارشاد ہے کہ گناہوں سے نفرت کرو مگر ان انسانوں سے نہیں جو گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک انسان گنہگار ہے تو گویا وہ روح و دل کی تندرستی سے محروم ہے۔ اب اگر اس نے اپنی غفلت و بدبختی سے روحانی تندرستی کھو دی ہے تو اس قیمتی سرمایہ کو کھو کر وہ نفرت کا نہیں ہمدردی اور رحم دلی کا مستحق ہے جس طرح ایک طبیب و معالج ہر طرح کی بیماریوں سے تو نفرت رکھتا ہے لیکن بیماروں سے نہیں بیماروں کے لیے تو وہ نہایت ہی شفیق و مہربان ہوتا ہے۔

مہاتما بدھ فرماتے ہیں کہ نفرت کی آگ کو اگر محبت کے پانی سے بجھایا جائے تو وہ آسانی سے بجھ جاتی ہے۔

بھرتری ہری کا قول ہے کہ انسان خود کو بھول گیا ہے اگر وہ اپنے آپ کو پہچان لے تو نفرت کرنا چھوڑ دے گا۔ ان بہترین تعلیمات پر اگر سچائی سے عمل کیا جائے تو بلاشبہ دلوں سے نفرت و کدورت دور ہوگی اور ماحول خوشگوار ہوگا۔

آج پوری دنیا میں اور خاص طور سے ہمارے ملک میں ہر طرف نفرت کا بڑا زور ہے۔ جس طرف دیکھیے ایک دوسرے کے خلاف آستینیں چڑھی ہوئی ہیں۔ بہت ہی کم ہیں جن کا دل صاف ہو۔ آج ہر دل سے اس نفرت کو نکالنے کے لیے بڑی سخت محنت کی ضرورت ہے۔ نئے سرے سے تعلیمی نظام کا بڑی مستعدی سے جائزہ لینا ہوگا۔ ایسے تمام فاسد لٹریچر اور کتابوں کو جن سے نفرت کی بو آتی ہے ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا ہوگا۔ نصاب تعلیم میں ایسی کتابیں شامل کی جائیں جن میں نفرت کے نقصانات اور بھائی چارگی و ملنساری کے فائدے بتلائے گئے ہوں۔ فلموں اور دوسرے تشہیری ذریعوں سے نفرت کی جگہ محبت کو عام کیا جائے۔ ہر حکومت کا یہ اولین فرض ہے کہ نفرت پھیلانے والے مجرموں کو سخت سزا دے تاکہ پھر کسی کو نفرت پھیلانے کی جرأت نہ ہو سکے۔

سعودی عرب سنہ ۱۹۹۲ء

مشاہدہ ـــ مطالعہ ـــ تجزیہ

مسعود الرحمٰن خاں ندوی ▽

حجاز کی یہ میری تیسری زیارت رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر پچیس دن کے لیے برائے حج و زیارت تھی۔ اس سے قبل ۱۹۶۵ء/۱۳۸۵ھ میں تقریباً نصف سال قیام کا موقع ملا تھا اور ۱۹۸۳ء/۱۴۰۴ھ میں صرف چند روز کا۔ تینوں زیارتوں کا مقصد ادائیگی حج و عمرہ تھا یا صرف عمرہ۔ اس لیے درج ذیل مشاہدات کی نوعیت ایک عام زائر کے سرسری تاثرات و احساسات کی ہے، اسی وجہ سے شاید بعض ایسی ناقابل ذکر چیزوں کا ذکر بھی آپ کو ان تاثرات میں ملے گا، جن پر ایک پردیسی مسافر کی نظر پڑی تو دل کو چھو گئی۔

۱۔ شخصی اشتہار بازی

علاقے کے کئی ملکوں میں ۱۹۶۰ء/۱۳۸۰ سے کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ جیسے مصر، عراق اور لیبیا۔ ان سب ملکوں میں ہندوستان سے جانے والے زائر کے لیے ایک انوکھی چیز ہر پبلک عمارت، اہم سڑک اور چوراہے پر حاکم وقت کے بڑے بڑے پورٹریٹ Portraits کا سامنا ہوتا تھا اور اس کے زمودات کی تلقین قدم قدم پر ہوتی تھی جو شروع میں اچنبھے اور بعد میں طبیعت پر بار بنتی تھی۔ ہمارے ملک میں یہ بدعت بہت بعد میں اندرا گاندھی کے زمانے سے شروع ہوئی تھی اور ان کے خاندان کے اوراق سمٹنے کے ساتھ اس ظاہرہ میں تخفیف آنے لگی۔ سعودی عرب میں شہنشاہیت اور خاندانی موروثیت کے باوجود شخصی شتہار در قدم بہ قدم تلقین کرنے والے معلم سے کم از کم جدہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ جدہ کے تقریباً ایک ہزار کیلو میٹر راستوں پر سابقہ نہ پڑا جس کی وجہ سے سفر میں گرانی نہ ہوئی۔ اگرچہ اخبارات و رسائل کے صفحات پر شخصی اشتہار بازی سعودی صحافت میں بھی ویسی ہی ہے جیسی علاقے کے دوسرے ملکوں میں جس کی وجہ سے اخبارات و رسائل کا مطالعہ ایک صبر آزما امتحان ہوتا ہے۔

۲۔ رابطہ عالم اسلامی کی حیثیت

ہمارے چار رکنی وفد میں دو صحافیوں کی موجودگی سے شبہ ہوتا تھا کہ رابطہ کی مہمان نوازی کہیں سرکاری سعودی پروپیگنڈہ کے کام میں نہ لائی جانے والی ہو لیکن رابطہ کے ذمہ داروں نے حکومتی مشنری سے علیحدگی کا مکمل ثبوت دیا۔ سعودی حکومت کے کارہائے نمایاں دکھانے کے لیے سرکاری دورے نہیں کرائے گئے۔ پرتپاک استقبال، خاطر و مدارات اور حفاظت وغیرہ کے نام پر شعبۂ رابطۂ عامہ کے رقیب و حبیب مہمانوں کے آس پاس نہیں منڈلاتے رہے۔ منیٰ میں قیام و طعام اور مقررہ اوقات پر حرم آمد و رفت کے لیے آرام دہ بسوں کا انتظام کر کے مہمانوں

▽

کو آزاد چھوڑ دیا گیا تھا جو چاہے ان سہولتوں سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے، جہاں جب چاہے تنہا آئے جائے اور جتنا چاہے منتظمین کو اپنی زبان "بے زبانی" سے زچ کرے۔ اول سے آخر تک بڑا ذہنی سکون رہا کہ جس مقدس مقصد سے آئے تھے اسی کی ادائیگی میں یک سوئی کے ساتھ لگے رہے۔

۳۔ امن و امان

نجد، حجاز کی قریبی تاریخ سے واقف کوئی بھی شخص اب جب کبھی بھی سعودی عرب پہنچتا ہے، تو یقینی طور پر اس کو موجودہ سعودی خاندان کی حکومت سے پہلے اقتصادی بدحالی اور بدوی قبائلیوں کی لوٹ مار کے طفیل، بدنظمی و بدامنی کی وہ ناقابل بیان تصویر ضرور یاد آتی ہے جس کی دست برد سے حاجیوں کے "مقدس" قافلے بھی محفوظ نہ تھے۔ اہم مہمانوں اور سرکاری قافلوں کی حفاظت کے لیے پولس اور فوجی دستے تک ساتھ ہوتے تھے۔ تب بھی کبھی کبھی شوریدہ سر جنگجو قبائل سے جان و مال اور عزت و آبرو کی امان رشوت پر مصالحت کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ کیونکہ ان بدحال ننگے بھوکے بدوی قبائلیوں کی زندگی کا تنہا سہارا وہی لقمۂ عیش تھا جس کو وہ دوسروں کے منہ سے چھین سکیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ جس زندگی کے عادی ہو گئے، شاید اس میں ان کو یہ تمیز بھی نہیں رہ گئی تھی کہ جس کے منہ سے وہ نوالہ چھیننے نکلے ہیں وہ خود بھی ان ہی کی طرح مفلوک الحال محتاج ہے یا اس قابل بھی کہ اس سے کچھ چھینا جا سکے اور یہ کہ وہ کس مقصد سے اس خاک اڑتے بیابان اور دھوپ سے تپتے صحرا میں ٹھوکریں کھانے نکلا ہے؟

موجودہ سعودی حکومت کے قیام اور استقرار کے ساتھ شریعت کا قانون نافذ ہوا تو دھیرے دھیرے جنگل کا قانون ختم ہوا اور لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو سے کھیلنے والوں کو صرف عبرتناک شرعی سزاؤں ہی کا خوف لاحق نہیں ہوا، بلکہ خود ان کے لیے عزت و آبرو کی استقرار بخش زندگی کا انتظام کیا گیا۔ میری مراد ملک عبدالعزیز مرحوم کی ان کوششوں سے ہے جو انھوں نے قبائلیوں کو صحرانوردی کی اُٹھائی گیروں والی زندگی سے موڑ کر ان کو زرعی استقرار بخش گھریلو زندگی کا عادی اور نظم و نسق کا پابند شہری بنانے کے لیے کیں۔ یہ تبدیلی جتنی مستحکم ہوتی گئی اسی کے قوی [illegible] نظم و نسق پر مرتب ہوتے گئے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں ایک مصری صحافی محمود ابوالفتح نے روزنامہ الاہرام میں لکھا تھا کہ:

> "اب ایک عورت [illegible] ہوئے بغیر خوف و خطر جزیرۂ عرب کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کر سکتی ہے۔"

اور جارج انطونیوس (George Antonios) نے اپنی کتاب The Awakening of The Arabs شائع شدہ ۱۹۳۸ء میں لکھا کہ:

> In fact we do not exaggerate if we say that the degree of public order maintenance the kingdom of Saudi-Arabia has achieved far exceeds that of the rest of the world, including the most advanced countries."

> اگر ہم یہ کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ مملکت سعودی عرب نے امن عام کا جو معیار قائم کیا ہے وہ ترقی یافتہ ممالک سمیت تمام دنیا سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

اور مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ جو کچھ عرصے سے ہم لوگ سعودی عرب میں زرعی انقلاب کے دعوے اور غذائی خودکفالت کے نعرے سن رہے ہیں تو کیا اُن کے پیچھے بھی ان ہی قبائلیوں کو سدھانے اور ان کو قومی زندگی میں دل و جان سے شامل

کرنے کی کوششوں کا ہاتھ تو نہیں ہے۔

۴۔ زرعی انقلاب اور زرعی خودکفالت

سرکاری نعروں اور دعووں پر اعتبار نہیں کیا جاتا ہے اور نہ کرنا چاہیے کہ وہ اکثر مغالطوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ آئندہ جو معلومات آپ سعودی زرعی انقلاب اور غذائی خودکفالت کے بارے میں سننے والے ہیں ان کے بارے میں بھی ہوشیار رہیے گا۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ معلومات سرکاری ذرائع سے نہیں ملی ہیں اور ان کا لکھنے والا ایک آزاد صاحبِ قلم صحافی اور کالم نویس حسن عبدالحیٔ قزاز ہے، جنھوں نے اسی سال شایع شدہ اپنی کتاب The Security we enjoy (دار العلم ۱۹۹۲ء/ ۱۴۱۲ھ) میں یہ اور اس طرح کی بہت سی کارآمد معلومات جمع کی ہیں لیکن ان کے مواد پیش کرنے کے انداز اور تحریر کے اسلوب سے یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ مصنف ایک آزاد صاحبِ قلم ہے یا شعبۂ روابطِ عامہ کا آفیسر؟ بہرحال اس کتاب میں (Food Security) پر ایک باب ہے جو اس کے صفحات ۲۱۳ — ۲۲۳ پر پھیلا ہوا ہے۔ مجھے ان معلومات سے دلچسپی اس لیے ہوئی کہ میں نے خود کھانے پینے کی بہت سی چیزوں کی پیکنگ پر مقامی سعودی کمپنیوں کے پتے لکھے ہوئے دیکھے۔ کرید بڑھی تو پوچھ تاچھ سے اندازہ ہوا کہ گزشتہ دہائی میں کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ تفصیلی معلومات کے لیے مذکورہ کتاب حاصل ہوئی، جس کی معلومات کا خلاصہ درجِ ذیل ہے۔ معلومات کو ذیلی سرخیوں کے تحت جمع کرکے ترتیب میں نے دیا ہے۔

زراعتی زمین

سعودی عرب کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ وہ پورا کا پورا صحرا و بیابان ہے۔ ۱۹۷۵ء/ ۱۳۹۵ھ میں وہاں زراعتی زمین پچاس ہزار ہیکٹر تھی۔ دس سال کے عرصے میں ۱۹۸۴ء/ ۱۴۰۴ھ تک توسیع دے کر دو پوائنٹ تین ملین تیئس لاکھ ہیکٹر زمین قابلِ زراعت بنائی گئی اور اس کی ایک سو پچاس ملین (پندرہ کروڑ) ہیکٹر زمین میں جنگلات پھیلے ہوئے ہیں۔ ص ۲۱۶ - ۲۲۳

پانی کی فراوانی

پانی کی قلت کی بات بھی ماضی کی داستان بن چکی ہے۔ فی الوقت ایک سو چھیاسی بندھ، بیس سے زیادہ نمکین پانی کو قابلِ استعمال بنانے والے پلانٹ اور مختلف شہروں اور دیہاتوں میں پھیلے ہوئے سیکڑوں پانی کے پروجیکٹ کام کر رہے ہیں (ص ۲۲۳) جن کا مملکت کی زراعتی ترقی میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔

پانی کی فراوانی کا کچھ اندازہ مجھ کو اس سے بھی ہوا کہ وہ ملک جہاں ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے پانی کی قلت کی وجہ سے ہر طرح کے استعمال کے پانی کی خرید و فروخت معمولاتِ زندگی میں تھا اور اب بھی مقامی آبادی پینے کا پانی خریدنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی، وہاں حاجیوں کے بیس پچیس لاکھ کے اضافی مجمع کے لیے ضرورت سے زیادہ پانی ہر وقت دستیاب ہے۔

گیہوں کی پیداوار

دوسرے اور تیسرے ترقیاتی منصوبے میں غذائی خودکفالت اور مملکت کو درآمدی سے برآمدی بنانے کے لیے سنجیدہ کوششیں شروع ہوئیں۔ ۱۹۸۱ء/ ۱۴۰۱ھ میں گیہوں کی پیداوار انسٹھ ہزار ٹن بتائی گئی ہے۔ اس کے بعد اعداد و شمار میں تین لاکھ ٹن کا تذکرہ ہے جو ملکی ضرورت نو لاکھ ٹن سے چھ لاکھ ٹن کم تھی۔ ۱۹۸۴ء/ ۱۴۰۴ھ میں یہ مقدار بڑھ کر ایک ملین (دس لاکھ) ٹن ہوئی اور ۱۹۸۵ء/ ۱۴۰۵ھ میں یہ تعداد دوگنی سے زیادہ بڑھ کر دو پوائنٹ تین ملین (تیئس لاکھ) ٹن ہو گئی جس سے نہ صرف مملکت کو خودکفالتی حاصل ہوئی بلکہ وہ یورپ اور دیگر ضرورت مند ممالک کو گیہوں برآمد کرنے اور برادر دوست ممالک کو گیہوں ہدیہ کرنے کے قابل ہوئی۔ اور اقوامِ متحدہ کی — Food and

certificate کے Agricultural Organisation
of merit میں مملکت کی اس قابل ذکر ترقی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو ترقی پذیر ممالک کے لیے قابل تقلید نمونہ قرار دیا گیا۔ (ص ۲۱۵، ۲۱۷ و ۲۲۰۔)

یہ صحیح ہے کہ مملکت کو اپنا گیہوں پیدا کرنے میں جو لاگت صرف کرنا پڑی، اس سے بہت کم میں گیہوں درآمد کیا جاتا رہتا لیکن موجودہ عالمی نظام میں جس طرح سیاسی مصالح کے تحت ضرورت مند ممالک کی بنیادی ضرورتوں کو نشانہ بنایا جانے لگا ہے، وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے مسلح جنگ کی بربادیوں سے کم ہولناک نہیں، اس لیے ہر باعزت قوم کو اپنی سالمیت کے لیے بنیادی ضرورتوں میں غیروں کا محتاج نہ ہونا چاہیے، ورنہ انجام بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

کھجور کی پیداوار

زراعتی پیداوار میں گیہوں کے بعد کھجور کا نمبر آتا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق ملک کے مختلف علاقوں میں گیارہ ملین (ایک کرور دس لاکھ) درخت ہیں، عالمی غذائی پروگرام میں مملکت کا سالانہ حصہ بڑھ کر اکیس ہزار ٹن کھجور کا ہو گیا ہے۔ کھجور کی پیداوار کو مزید بہتر بنانے اور بڑھانے کے ہمت افزائی کے طور پر حکومت ایک ٹن کھجور کی پیداوار پر دو سو پچاس سعودی ریال کی امدادی رقم (Subsidy) مہیا کرتی ہے۔

مدینہ منورہ کے مختصر قیام میں خوش قسمتی سے مجھے شہر کے مضافاتی علاقوں تک آنے جانے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ شہر کی بڑے پیمانے پر توسیع سے آس پاس کے [illegible] کا [illegible] یقینی طور پر سمٹا ہے۔ یہی حال کھجور کے [illegible] زراعتی علاقوں کا بھی ہوگا جو توسیع زدہ شہروں کے آس [illegible] کی تلافی جبھی ممکن ہوگی جب کہ شہروں سے [illegible] علاقوں میں اس کی پیداوار بڑھانے کا اہتمام ہو رہا ہو۔

سبزیاں

گیہوں اور کھجور کے علاوہ سبزیوں کی پیداوار کے کامیاب تجربے ۱۹۷۸/۱۳۹۸ھ سے Green houses (سبزی گھروں) میں شروع ہوئے جن کی تعداد تین سو تک پہنچ چکی ہے اور ان کی وجہ سے بہت سی وہ سبزیاں جو پہلے درآمد کی جاتی تھیں، اب برآمد کی جا رہی ہیں۔ (ص ۲۲۱)

ڈیری پیداوار

اسی طرح دودھ اور گوشت کے قابل جانوروں کی پرورش کی طرف توجہ ہوئی ہے اور گوشت، دودھ، انڈا مرغی کی پیداوار میں اتنی توسیع ہوئی ہے کہ اپنی ضرورت کی تکمیل کے بعد اس پیداوار کا ایک حصہ پڑوسی خلیجی ممالک میں برآمد بھی کیا گیا ہے۔ (ص ۲۲۲)

درآمدی بل میں کمی اور بیرونی کرنسی کی بچت

پیداوار میں معقول ترقی کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ غذائی مواد کی درآمد میں کمی کی وجہ سے صرف ۱۹۸۶/۱۴۰۶ھ میں مملکت کے درآمدی بل میں پانچ ہزار ملین (پانچ ارب) سعودی ریال کی کمی (اور بیرونی کرنسی کی بچت) ہوئی جو گزشتہ درآمد کا نصف فیصد تھی، درآمدی بل کی کمی اور بیرونی کرنسی کی بچت کے اس تناسب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ (ص ۲۲۰)

۵۔ سیاسی صورت حال

سیاسی صورت حال کے سلسلے میں جن لوگوں سے بات چیت کا کچھ موقع ملا، اس سے اندازہ ہوا کہ مملکت کا سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ علاقہ کے بہت سے ممالک کے مقابلے میں زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے۔ مغربی جمہوریت اور انتخابی سیاست کا مطلقاً گزر نہ ہونے کے باوجود مملکت کے مختلف اجتماعی، اقتصادی، مذہبی طبقات کا ملکی پالیسی بنانے میں دخل اور وزن پایا جاتا ہے۔

عوام کی پہنچ علاقائی حکام، مملکت کے وزراء سے لے کر شاہ تک ان کے ایوانِ عوام یا کھلے درباروں کے ذریعے بہت آسانی سے ممکن ہے جن کی فلاح وبہبود اور خوشی و رضامندی کا خیال علاقے کے نام نہاد جمہوری نظاموں کے تابع ممالک سے بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ خلیجی جنگ کے بعد مہنگائی کا اثر سعودی عرب میں بھی پڑا ہے۔ ہمارے مملکت پہنچنے سے ماہ دو ماہ پہلے حکومت نے عوامی راحت کے لیے جن سہولتوں کا اعلان کیا تھا ان میں سے پٹرول کی قیمت میں کمی، اندرونِ ملک مفت ٹیلی فون کی سہولتیں مجھے یاد رہ گئیں۔ اگر سعودی خاندان کی مذہبی اور غیر مذہبی خدمات کا گہرا اثر عوام کے دل و دماغ پر نہ ہوتا تو ماضی قریب کے تین واقعات حرم پر انتہا پسندوں کا قبضہ، ایرانی دراندازی اور کویت پر عراقی قبضے کے بعد کی صورت حال میں سے کوئی بھی واقعہ اس خاندان کے لیے موت کا پیغام بن سکتا تھا۔

نئی نسل کے نوجوان دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی کئی متضاد سمتوں میں سوچتے ہیں اور الگ الگ خانوں میں بٹے ہوئے ہیں:

الف: ایک بڑی تعداد مذہبی امور میں غیر متشدد۔ سیاسی نظام میں غیر جانب دار۔ معاشرتی زندگی میں سہولت پسند۔

ب۔ ایک معقول تعداد مذہبی امور میں متشدد۔ سیاسی، اقتصادی، معاشرتی زندگی میں اسلام کی بالادستی کی قائل اور اس کے لیے کوشاں۔ موجودہ حکومت کی "صلح کل" پالیسی کے خلاف۔

ج۔ بہت کم تعداد سیاسی، اجتماعی، مذہبی مسائل میں انتہا پسند لیکن موجودہ سیاسی نظام اور ملکی معاشرے کی اصلاح سے مایوس۔ لہٰذا ترک تمدن پر آمادہ اور دشت و بیابانوں میں پناہ کے طالب۔

د۔ سب سے کم تعداد۔ مذہب سے بیزار معاشرتی زندگی میں مغربی طرزِ حیات کے دلدادہ۔ سیاسی مسائل میں یورپ اور امریکہ کے تابع مہمل۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف رجحانات کے حامل نوجوانوں میں جس طبقے کو منانے اور قومی دھارے میں شامل رکھنے میں سب سے زیادہ مشکل ایک مذہبی حکومت کو بھی پیش آتی رہی ہے۔ وہ تیسرا انتہا پسند، ضد و انانیت کا شکار طبقہ ہے جس کو اپنی صواب دید پر اتنا اعتماد ہے کہ اس کو معاشرے کے دوسرے طبقات کے ساتھ نہ مصالحت گوارا ہے نہ مشارکت، نہ مصلحت کا اس کے ہاں کوئی گزر ہے نہ قدم بہ قدم اپنے مقاصد حاصل کرنے کا صبر۔ اس لیے وہ کل جہاں سے نالاں، شاکی اور مایوس، شاید خدا سے بھی جس نے یہ رنگا رنگ کائنات بنائی، بلکہ خود سے بھی۔ اس لیے وہ نامرادی کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں امید کی کوئی کرن اس کو سہارا دینے کے لئے موجود نہیں۔ اس لئے وہ اپنی زندگی کی ابتدا وہاں سے کرنا چاہتا ہے، جہاں سے انسان کو سفر شروع کیے ہوئے صدیاں بیت چکیں مجھے پرانی نسل کے تجربہ کار بزرگ مذہبی لوگوں سے بھی بات چیت کا موقع ملا اور ان کو بھی میں نے جوشیلے جذباتی نوجوانوں کی انتہا پسندی اور ناعاقبت اندیشی کا ناقد پایا۔

۶۔ صحافت

جس قسم کی آزاد صحافت کے ہم لوگ عادی ہیں ہمارے اکثر عرب، مسلم برادر ممالک اس سے مانوس نہیں لیکن ان کی "پابند صحافت" کی زبانیں جب اپنے حریف کے خلاف کھلتی ہیں تو ہماری آزاد صحافت کی بیباک ترین زبان بھی کیا ان کا مقابلہ کرے گی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کسی عرب حاکم کے خلاف آپ کو مواد جمع کرنا ہو تو اس کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ اس کی حریف صحافت کا مطالعہ کریں، کم وقت میں کسی زحمت کے بغیر مطلوب حاصل

پھر مگر پابند صحافت کے مطالعہ میں ایک مشکل یہ ہے کہ وہ آپ سے زیادہ حاضر دماغی اور باریک بینی کا مطالبہ کرتی ہے کیونکہ اس میں اختلافی بیان یا الزام وغیرہ تو چھپ نہیں سکتا، صرف اس پر "ردعمل" چھپے گا۔ اب یہ آپ کی ذہانت اور دقت نظر پر موقوف ہے کہ ردعمل کے بین السطور سے اصل وجہ نزاع اور حقیقی سبب اختلاف کا پتہ چلائیں، جیسا کہ میرے ساتھ ذیل کے تین صحافتی معرکوں میں ہوا:

الف۔ سوڈانی حکام کے خلاف مہم

میں حجاز پہنچا تو اس وقت سعودی صحافت میں سوڈان کے سربراہ کرنل بشیر اور ان کے ہم نوا اخوان المسلمین کے رہنما شیخ ترابی کے خلاف مورچہ قائم تھا۔ سوڈان کی موجودہ حکومت کے مخالف مختلف الخیال عناصر جو سعودی عرب میں پناہ گزیں تھے ان کی واقعی اور غیر واقعی تنظیموں کے معروف وغیر معروف رہنماؤں کی طرف سے سوڈانی حکام پر "الزام بازی اور ناشکر گزاری" کی مبہم تہمتوں کی بنیاد پر تمام اخبارات کے صفحات رنگین تھے۔ باقی کسر سعودی صحافی اور مراسلہ نگار اپنے اداریوں، صحافتی تحقیقات انٹرویو وغیرہ سے پوری کر رہے تھے مگر حقیقی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی کہ یہ معرکہ کیوں شروع ہو گیا؟ کئی دن تک روزانہ کی تحریروں کے سطور و بین السطور میں تلاش کرتے کرتے ایک دن پتہ چلا کہ کرنل بشیر کا ناقابل معافی قصور یہ ہے کہ انھوں نے سعودی حکومت پر الزام لگایا ہے کہ وہ سوڈانی حکومت کے باغی عناصر کی مدد کر رہی ہے۔ میں شیخ ترابی کے خلاف فرد جرم معلوم کرنے میں ناکام رہا۔ ممکن ہے کہ انھوں نے کوئی ایسی ہی بات سعودی عرب کے خلاف کہی ہو یا دشمن کا دوست میرا دشمن کے اصول کے مطابق شیخ ترابی قابل گردن زدنی قرار پا گئے ہوں۔

ب۔ کرنل قذافی کے خلاف مورچہ

اثنائے قیام اچانک ایک دن صبح کے اخبارات میں کرنل قذافی کے خلاف بیانات دیکھے تو فکر ہوئی کہ اب کرنل صاحب نے کیا نیا شوشہ چھوڑا۔ کئی دن بعد کسی اداریے کے ایک جملے سے پتہ چلا کہ قذافی نے پھر مقامات مقدسہ کو عالمی تحویل میں دینے کی بات دہرائی ہے۔

ج۔ شاہ حسین کے خلاف غصہ

واپسی سے دو ایک دن پہلے ایک صبح کے اخبارات میں اردن کے شاہ حسین کے خلاف ناراضگی کے آثار نظر آئے۔ وجہ یہ تھی کہ شاہ حسین نے شاہ فہد کی اس تجویز کی مخالفت کی تھی جس میں انھوں نے یونسکو کی نگرانی میں بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ، قبۃ الصخرۃ اور مسجد عمر بن الخطاب کی تعمیر و مرمت کے مصارف خود برداشت کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔

یہ بات صحیح ہے کہ علاقے کے دوسرے عرب حکام کی طرح سعودی حکام کو میں نے عرب سیاست کی "کلامی معرکہ آرائیوں" میں بذات خود میدان میں اترتے نہیں دیکھا اور اس کو میں نے ہمیشہ ان کی شرافت، وضع داری بلکہ دینی تربیت پر محمول کیا۔ لیکن عرب اور اسلامی اتحاد کے ایک داعی کی حیثیت سے یہ بات بھی ان کے مقام سے بہت فروتر ہے کہ ان کی مملکت کی صحافت کا معیار علاقے کے دیگر ممالک کی صحافت سے ممتاز نہ ہو اور وہ خود نہ سہی تو اُن کے صحافی ان کے حریفوں کے خلاف اسی طرح میدان کارزار میں کود پڑیں جس طرح دیگر عربوں نے آپس کے اختلافات کو ہوا دینے کے لیے ایک دوسرے کے خلاف رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

پابند صحافت کا ایک بڑا نقصان افواہوں کی گرم بازاری ہے۔ اس سفر میں بھی اس کا تجربہ ہوتا رہا۔ مثلاً اموات کی کثرت، جگہ کی تنگی سے حاجیوں کا حدود منیٰ سے باہر قیام، بدانتظامی کی وجہ سے عرفات میں وقت مقررہ (زوال تا مغرب) کے اندر پچیس ہزار حاجیوں کا نہ پہنچ سکنا وغیرہ۔ یہ اور اس طرح کی دوسری باتیں ہر سال ہی حاجیوں کی زبانی سننے کو ملتی ہیں۔ حکومت اپنی بدنامی کے خوف اور حاجیوں کے "ذہنی سکون" کی خاطر اس طرح کی معلومات فراہم نہیں کرتی

صحافت از خود ایسی خبریں شایع نہیں کر سکتی، اب بڑھا چڑھا کر افواہیں پھیلانے والوں کو میدان خالی ملتا ہے اور عدیم المثال کامیاب حج کی اخباری مبارک بادیں اس زہر کا تریاق نہیں بنتیں۔

میرے خیال میں یہ حقیقت کہ دنیا کے سب سے بڑے مجمع کو مقرر و محدود زمان و مکان میں جگہ بہ جگہ منتقل کرنے اور ان کی تمام ضرورتوں کی فراہمی کے لیے وزارت حج و اوقاف اور تمام حکومتی مشنری کا سال بھر ان انتظامات کو مثالی، بہتر سے بہتر اور وسیع تر بنانے کی تگ و دو میں لگا رہنا خود مملکت کے لیے اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ اس کے سامنے کسی ایک انتظامی پہلو میں کوئی کمزوری، کسی ضرورت کے قیاس و اندازوں میں کمی یا موسم کی بے رحم شدت سے شرح اموات میں اضافہ وغیرہ وقتی و عارضی آسمانی سلطانی حوادثات کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی، بشرطیکہ صحیح صورت حال سرکاری وضاحتوں کے ساتھ سامنے آتی رہی اور لوگوں کا سرکاری اطلاعات و توجیہات پر اعتماد بحال ہو جائے۔

د۔ ایران سے تعلقات

میرے قیام کے دوران سعودی صحافت میں ایران کے خلاف کوئی پروپیگنڈہ مہم دیکھنے کو نہ ملی۔ ایرانی حجاج کو دیگر حاجیوں کی طرح تمام سہولتوں کے علاوہ ان کے مخصوص شعائر ادا کرنے کی بھی سہولت دی گئی۔

ھ۔ خلیجی جنگ

عراق و کویت کی جنگ کے سیاق میں سعودی حکومت کے ردِ عمل اور بیرونی فوجوں کی آمد سے اتفاق یا اختلاف کرنے والے لوگ تو ملے لیکن مجھے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو عراق کے موقف کا حامی ہو یا جس کے دل میں صدام حسین کی موجودگی میں عراقیوں کی مدد کے لیے نرم گوشہ ہو۔ پہلے جس چیز کا خیال تھا، سعودی عرب کی موجودہ زیارت میں یقین ہو گیا کہ خلیجی جنگ نے عربوں کے درمیان کدورت، نفرت و کراہیت کی جو دیواریں کھڑی کر دی ہیں، مستقبل قریب میں ان کا ازالہ آسان نہیں۔ میرے قیام کے دوران سعودی صحافت میں اگرچہ عراق کے خلاف کوئی محاذ آرائی قائم نہ تھی لیکن حاکم عراق کا نام کسی بھی بہانے آجائے تو انتہائی حقارت سے لیا جاتا تھا۔

۷۔ بیرونی ملازمین

خلیجی ممالک کی طرح سعودی عرب میں بھی بیرونی ممالک کے کام کرنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ بازاروں، سرکاری محکموں، پرائیویٹ کمپنیوں کے دفاتر میں آنے جانے والوں کو ابتدا میں یہ اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ وہ کسی عرب ملک میں آئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ سعودی حکام و ذمہ داران موجود بھی ہوں گے تو ان ہی غیر ملکی ملازمین کے پس پردہ۔ یہ اس بات کی بھی علامت ہو سکتی تھی کہ ان خلیجی ممالک میں بیرونی ملازمین نہ صرف بہتر حالت میں ہوں گے بلکہ وہاں کے سیاہ و سفید پر ان کا قبضہ ہوگا لیکن وہاں سے عارضی یا مستقل طور پر واپس آنے والے بڑے طبقے کو ہمیشہ عربوں کے طرزِ عمل اور سلوک کا نہ صرف شاکی پایا بلکہ بسا اوقات تو ظلم و ستم کی دل دہلا دینے والی ایسی ایسی ہولناک داستانیں سننا پڑتی ہیں کہ جن پر اعتبار آنا مشکل ہوتا ہے۔

قدرتی طور پر اثنائے قیام اس طرف بھی توجہ ہوئی۔ تجارت اور دفتری ملازمت کرنے والے طبقہ پر خوش حالی اور اطمینان کی علامات واضح تھیں لیکن مزدور پیشہ طبقہ جن کا تعلق خاص طور سے پرائیویٹ Contractors یا ان کے ایجنٹ Agents سے ہوتا ہے، ان کو غیر مطمئن اور ناآسودہ حال پایا۔ ہمارے قیام کی عمارت اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں سڑکوں کی صفائی کرنے والا عملہ انتہائی مہذب، شائستہ نوجوان بنگالی لڑکوں پر مشتمل تھا۔ ان کے مرجھائے ہوئے تھکے تھکے چہروں سے خود بخود ان کی طرف توجہ ہوئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان کو چار سو سعودی ریال

(تین ساڑھے تین ہزار ہندوستانی روپیے) ماہانہ پر صرف چار ماہ کے لیے بلایا گیا ہے۔ وہ خوش تھے کہ اس بہانے ان کو حج کا موقع ملا۔ واپسی کے نام پر ان کے افسردہ چہروں پر مایوسی کی لہر کچھ اور تیز ہو جاتی تھی۔ تھکے تھکے اس لیے تھے، کہ ان کا عرب مالک Contract یا اس کے کارندے ان کو آرام کا موقع نہیں دیتے تھے۔ ایک جگہ کام ختم ہوتا تھا تو ان کو دوسری جگہ کام پر لگادیا جاتا تھا۔

وہ لوگ جو زیادہ بہتر ملازمتوں پر زیادہ مدت سے مملکت میں مقیم تھے، میں نے ان سے حقیقت جاننا چاہی اور یہ پوچھا کہ اس طرح کی شکایتوں، بدمعاملگی اور بدسلوکی کا تدارک کیسے ہوتا ہے؟ ان کا خیال تھا کہ

—— سرکاری طور پر آنے والے ملازمین کے ساتھ شکایت اور برا معاملہ شاذ و نادر ملے گا۔

—— غیر سرکاری طور پر ایجنٹوں کی معرفت آنے والے ملازمین کے ساتھ عموماً دھوکا ہوتا ہے، طرفین کی توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ بیرونی ایجنٹ نہ عرب ملازم رکھنے والے Contractors کی ضرورت کا خیال رکھتے ہیں نہ ملازمت کے لیے آنے والے اشخاص کی صلاحیتوں تمناؤں اور آرزوؤں کا۔ ان کو متعینہ تعداد بھیجنے اور طرفین سے صرف اپنا کمیشن لینے سے دلچسپی ہے۔ اس لیے ان ایجنٹوں کی معرفت آنے والے لوگ پہلے دن ہی سے مشکلات میں گھر جاتے ہیں۔

—— اکثر پرائیویٹ کام کرانے والے (خواہ کنٹریکٹر ہوں یا گھریلو ملازمین رکھنے والے مالک) حریص لالچی، بدعہد، ظالم اور سخت دل ہوتے ہیں۔

—— شہروں کے مقابلے میں دور دراز دیہی علاقوں کے ملازمین و مزدور زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔

—— سب سے زیادہ مصیبت زدہ طبقہ وہ ہے جس کا اپنے ملک میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے وہ نہ صرف اپنے جائز حقوق کے مطالبے سے بچتا ہے، بلکہ اپنے مالک کی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھی ملازمین کی لگائی بجھائی کر کے خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی ذلیل و خوار کرتا ہے۔

—— بیرونی ملازمین کے حقوق قابل اطمینان ہیں۔ ان کی شکایات پر غور کرنے اور انصاف دلانے کا محکمہ موجود ہے۔

—— شکایات کی صورت میں ملازمین متعلقہ محکمے تک رجوع بہت دیر سے کرتے ہیں

—— زبان کا اختلاف ان کی شکایت کی حقیقی نوعیت سمجھنے میں کبھی کبھی اثر انداز ہوتا ہے۔

—— شکایت کی صحیح پیروی ہو تو سعودی حکام اور ذمہ دار عرب و غیر عرب کی تفریق پر فیصلہ نہیں دیتے بلکہ مظلوم کو بے لاگ انصاف ملتا ہے، اس حد تک کہ مقامی لوگ بھی امن و امان اور نظم و ضبط کے ذمہ داروں اور عدلیہ کا سامنا کرنے سے اسی طرح جھجکتے ہیں جس طرح بیرونی۔ واللہ اعلم

ان تاثرات و مشاہدات کے علاوہ سب سے زیادہ حیران کن بیسویں صدی کا تعمیری شاہکار معماروں کی انگلیوں کا قطب مینار، شاہانہ حوصلوں کا ہمالیہ، توسیع حرمین شریفین کا وہ تاریخی منصوبہ ہے جس کی تعمیر و تجدید و توسیع اور تجمیل و تہذیب و سجاوٹ سے نہ اس کو بنانے والوں کے ہاتھ رکتے ہیں، نہ اس پر خرچ کرنے والوں کے دل بھرتے ہیں اور نہ اس کو دیکھنے والوں کی نظر تھکتی ہے۔ اس توسیع کا تعارف ہم کسی اور نشست میں پیش کریں گے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۳ - (مارچ ۹۳ء)

بنیادی فزکس میں مسلم سائنسدانوں کی خدمات

عبدالباری ▽

عام طور سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ سائنس کو مشاہدے تجربے اور سلسلے وار کڑی میں باندھنے والے مسلم سائنس داں ہی تھے اور ان کا یہ رجحان اندلس کی یونیورسٹیوں سے ہو کر یورپ تک پہنچا۔ یہ کام ان مسلم سائنس دانوں نے آٹھویں صدی میں شروع کیا۔ جس وقت اسلام کی شعاعیں لگ بھگ ساری دنیا کو منور کر رہی تھیں مسلم سائنس دانوں نے یہ کام عربی اور فارسی زبانوں میں کیا جو اس وقت کی مروجہ زبانیں تھیں۔ ان کتابوں کو ترجمہ کر کے مغرب (یورپ) میں بڑے پیمانے پر تحقیقات (RESEARCHES) شروع کی گئیں۔ مگر اس سلسلے میں سب سے بڑی علمی بے ایمانی جو مغرب نے کی وہ یہ تھی کہ انھوں نے ان کتابوں کے ترجمے کے ساتھ ساتھ سائنس دانوں کے ناموں کا بھی ترجمہ مغرب کے دیگر زبانوں میں کر دیا لہٰذا آج ان ناموں سے یہ اخذ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ آیا یہ مسلم سائنس دانوں کے نام ہیں یا غیر مسلم سائنس دانوں کے۔ جیسے ابوالقاسم الزہراوی کو Al bcurasis محمد بن جابر ابن سینا البطانی کو Albetinius ابو علی ابن سینا کو Avicinna محمد ابن زکریا الرازی کو Rhazes ابن رشد کو Averroes ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی AL KHINDUS اور ابو علی ابن الحسین الہیثم کو Alhazen وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک اتنی بڑی علمی چوری تھی جس کی قیمت آج بھی پوری دنیا کی اسلامی برادری ادا کر رہی ہے اور یہ طعنے سننے پڑ رہے ہیں کہ سائنس میں مسلمانوں کا کوئی تعاون (CONTRIBUTION) نہیں ہے۔ اسلامی سائنس کی سمت میں یہ بھی ایک اہم کام ہوگا کہ اس طرح مسلم سائنس دانوں کے جو نام تبدیل کیے گئے ہیں ان کی ایک صحیح فہرست ان کے مکمل کارناموں کے ساتھ شائع ہو تا کہ مسلمانوں کے حال سے ان کے ماضی کا رشتہ جوڑا جا سکے اور اس کی بنیاد پر مستقبل کی نئی عمارتیں کھڑی کی جائیں۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے مسلم سائنس دانوں نے فزکس کے بنیادی سوالوں کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ابو علی سینا کو فزکس کے سربراہوں میں گنا جاتا ہے۔ انھوں نے قوت (FORCE) رفتار (VELOCITY) روشنی (LIGHT) حرارت (HEAT) اور خلا (VACUUM) وغیرہ پر بہت ہی مفصل اور عمیق مطالعہ پیش کیا جن کی وجہ سے بعد کے ادوار میں نظریاتی (THEORITICAL) اور تجرباتی (EXPERIMENTAL) فزکس کے بہت سارے شعبوں میں تحقیق شروع ہوئی اور

▽ اسلامیہ کالج، سیوان - بہار

سب الگ الگ ایک نئے شعبے میں تبدیل ہوئے۔ جیسے میکینکس (MECHANICS) کے میدان میں چکنے دھوری (AXEL) لیور (LIVER) پلی (PULLY) ڈھلوان سطح (INCLINED PLANE) ہوائی چکی (WIND MILL)۔ پن چکی (WATER WHEEL) اور دانتے والی چکی (TOOTHED WHEEL) وغیرہ وغیرہ۔

الخوارزمی (م ۱۱۱۵-۱۱۲۱ء) فزکس اور علم فلکیات کے بڑے ماہروں میں سے تھے۔ ان کی کتاب المیزان الحکمت (THE BOOK OF BLANCE OF WISDOM)۔ مرکز قوت کشش پر بہت اہم کتاب ہے اس کتاب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ کائناتی طاقت، کائنات کے مرکز کی طرف مائل ہے نہ کہ زمین کے مرکز کی طرف جو اس وقت کے سائنس دانوں کا عقیدہ تھا ایسی کتاب میں انھوں نے البیرونی (متوفی ۱۰۴۹ء) کی تحقیقات کی بنیاد پر تحقیق کر کے بہت سارے رقیق (LIQUID) اور ٹھوس (SOLID) کی کثافت (DENSITY) کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ ہو سکتا ہے کثافت کی جان کاری اس مادے کے اوصاف کی جان کاری پر کس قدر اثر انداز ہوتی ہے جس کا اندازہ اس زمانے میں اتنا زیادہ نہیں رہا ہو مگر آج جو لوگ ٹھوس (SOLID STATE) اور رقیق (LIQUID STATE) پر تحقیقات کر رہے ہیں ان کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ کثافت کی جان کاری مادے کے اوصاف پر کس قدر ایک اکائی یا کل حجم (BULK) پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں اس SUBJECT کی تعریف، پتلی نلی پر رقیق کا دباؤ اور اس کی سطح پر تناؤ (SURFACE-TENSION) کثافت ناپنے کے لیے AEROMETER کا استعمال رقیق کا صحیح درجہ حرارت، المیزان کے ذریعے سطح کے مستوی ہونے کی جانچ اور اس کے ذریعے وقت کی رفتار جاننا وغیرہ پر بھی بڑی تفصیلی بحث ہے۔ ساتھ ہی اس کتاب میں الخوارزمی نے میکینکس، فزکس اور ٹھہری ہوئی حالت میں رقیق کے EQUILIBRIUM اور دباؤ کا بھی بہت تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اپنی ایک دوسری کتاب جسے انھوں نے المیزان پر ہی لکھا ہے، میں اس بات کی اہمیت پر زور دیا گیا کہ وزن کرتے وقت درجہ حرارت کی تبدیلی کو ختم کرنے کی کتنی ضرورت ہے اور درجہ حرارت کی تبدیلی ان پر کتنی اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گلیلیو (GALILEO) الخوارزمی کے ہی تحقیقی نقش قدم پر چلے تھے اور گلیلیو کی تحقیق میں ان کی تحقیقات کا بہت ہاتھ رہا ہے۔

الخوارزمی کا پورا نام ابوالفتح عبدالرحمٰن المنصور الخوارزمی تھا۔ وہ ایک رومی غلام تھے۔ ان کے مالک کا نام علی الخوارزمی المادارزی تھا۔ یہ اسلامی اقدار اور اصولوں کی اعلیٰ ظرفی ہی تھی کہ جب علی الخوارزمی کو یہ معلوم ہوا کہ ان کے غلام کو سائنس اور فلسفے میں گہری دلچسپی ہے تو انھوں نے اپنے غلام الخوارزمی کے لیے ماہوا میں ایک عمدہ اور اعلیٰ قسم کی سائنس اور فلسفہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ الخوارزمی نے فلکیا جدول TABLE بھی بنایا جس کا نام خراسان کے گورنر سنجر ابن ملک شاہ ابن الپ ارسلان (جو بعد میں خراسان کے سلطان بھی بھی ہوئے) کے نام پر الزیج المعتبر السنجری رکھا۔ علم فلکیات کی دنیا میں یہ بات اہم تھی جو انھوں نے ستاروں کے اصل مقام (POSITION) کے بارے میں بتایا۔

الخوارزمی سے قبل المیزان کی تحقیق میں عمر الخیام (متوفی ۱۱۳۱ء) کا نام بڑے محققوں میں تھا جنھوں نے اس میدان کو اپنی تحقیقات سے کافی مواد فراہم کیا۔ ساتھ ابن سینا (متوفی ۱۰۳۷ء/۴۲۸ھ) اور الرازی (متوفی ۹۳۲ء/۳۰۸ھ) نے بھی المیزان کی تھیوری (THEORY) پر بنیادی تحقیقی اضافہ کیا۔ بنو موسیٰ (متوفی ۸۷۳ء/۲۱۳ھ) جو المامون کے دور خلافت میں تھے۔ فرشتوں اور فرستوں کے نام سے المیزان پر ہی اہم تحقیقات کیں۔ الرازی نے تو المیزان اللبی۔ (PHYSI-

(CAL BALANCE) بنا کر بہت سارے مادے کی کثافت بھی دریافت کی۔

محمد ابن علی ابن الرستم خراسانی (متوفی ۱۱۸۵ء) دیوار گھڑی کے بڑے ماہروں میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ الساعتی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ انھوں نے ۱۱۴۶-۴۹ء کی دہائی میں ایک دیوار گھڑی بنائی جسے باب جیرون میں لگایا گیا۔ اسی باب جیرون کو اس گھڑی کی بنا پر اکثر باب الساعۃ بھی کہتے ہیں۔ الساعتی کے لڑکے رضوان نے اس گھڑی کی مرمت کی اور اس کی بناوٹ (MECHANISM) کو اور بہتر بنایا۔ ساتھ ہی انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی جس میں انھوں نے گھڑی کی بناوٹ اور استعمال کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ کتاب اسلامی دور حکومت میں مسلمانوں کی گھڑی سازی پر ایک بہترین تصنیف ہے۔

قیصر ابن ابی القاسم (متوفی ۱۲۵۱ء) جو مصر کے رہنے والے تھے۔ ریاضی اور علم فلکیات کے بڑے عالموں میں سے تھے انھوں نے فلکیاتی گلوب بنایا۔ ابو النصر الفارابی (متوفی ۹۵۰ء/۳۳۹ھ) جو فزکس اور ریاضی وغیرہ کئی علوم پر عبور رکھتے تھے (PHYSI-CAL PROCESS) کے خلا (VACUUM) ہے۔ انھوں نے ہوا کے لچیلے پن (ELASTICITY OF AIR) پر ایک مضمون لکھا جو تحقیق کے میدان میں اول بنیادی پرچے (FIRST ORIGINAL PAPER) کی حیثیت سے آج بھی جانا جاتا ہے۔ مسلم سائنس دانوں نے ہی سب سے پہلے گرم بھاپ والے حمام بنانے کا ایجاد کیا۔ حمام لفظ عربی لفظ حم سے نکلا ہے جس کے معنی گرم کے ہیں۔ جب مغربی سائنس داں اور سیلانی عرب کی طرف تشریف لائے تب ان کے تجربے میں یہ حمام آیا اور یہ محسوس ہوا کہ اس سے کس قدر آرام ہے اور پھر جب یہ لوگ اپنے اپنے ملکوں میں واپس گئے تو انھوں نے اسے وہاں رائج کیا۔

حالانکہ [illegible] سائنس دانوں نے [illegible] کے استعمال کا تصور پہلے ہی [illegible] کیا تھا لیکن مسلم سائنس داں ہی تھے

جنھوں نے سب سے قبل مقناطیسی کمپاس (MAGNETISED COMPASS) بنایا تاکہ وہ انھیں سمندری سفر میں استعمال کر کے سمت کا پتہ لگا سکیں۔ مغرب میں سب سے پہلے یہ کمپاس اٹلی کے ملاحوں نے استعمال کیا۔ کچھ مسلم سائنس دانوں اور تاریخ دانوں نے اس کمپاس کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ بیلک القباجقی (BAILAK AL-QABAJAQUI) (متوفی ۶۴۰ھ/۱۲۴۲ء) نے اپنی کتاب کنز التجار (KANZ-AL-ANZAR) میں تیرتی ہوئی کمپاس کا تذکرہ کیا ہے۔

مسلم سائنس دانوں نے ہی سب سے پہلے بندوق اور منجنیق ایجاد کیں اور توپوں میں دھماکہ خیز مادے کو استعمال کر کے دشمنوں کی صفوں میں لمبی دوری سے پھینکتے تھے۔ اس سے قبل چینی باشندے سوڈیم نائٹریٹ کا استعمال کرتے تھے۔ بعض تاریخ داں یہ لکھتے ہیں کہ بندوق کا استعمال سب سے قبل CRESSY کی جنگ میں ہوا۔ جب کہ اسلامی تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بندوق اور منجنیق کا استعمال بہت پہلے سے ہوتا آیا ہے۔ ابن خلدون جو تاریخ کے بڑے محققوں میں ہیں اور جن کی تاریخ آج بھی مستند مانی جاتی ہے نے لکھا ہے کہ بارہ برس کی تحقیق کے بعد بندوق اور منجنیق کا استعمال بہت قبل سے ہوتا آیا ہے۔ منجنیق کے ذریعے بڑے بڑے پتھر اور آگ کے گولے دشمن کی طرف پھینکے جاتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ علم بصارت (OPTICS) کے بانی الہیثم (۹۶۵-۱۰۳۹ء) تھے تو بےجا نہ ہوگا کیونکہ الہیثم نے فزکس کو جو کچھ اپنی تحقیقات سے عطا کیا ہے اس کا اعتراف اور انکار نہیں کیا جا سکتا۔ الہیثم سے قبل دوسرے مسلم سائنس داں اور یونانی سائنس داں یہ تسلیم کرتے تھے کہ کسی چیز (OBJECT) کو دیکھنے کے لیے آنکھ سے ایک روشنی نکلتی ہے جو اس چیز پر پڑتی ہے اور تب وہ دکھائی دیتی ہے۔ افلاطون (PLATO) کا ماننا تھا کہ کچھ شعاعیں آنکھ سے چیزوں کی طرف نکلتی ہیں اور تب چیزیں دکھائی دیتی ہیں [illegible] (EMPEDOCLES) کا خیال تھا کہ روشنی آنکھوں سے نکلتی

[illegible]) سے تعلق رکھتی ہے۔ امفب جیزوں [illegible]
[illegible] ATOMIC THEORY کے ATOMIC [illegible]
[illegible] نے اپنے تحقیقی مضمون QUES... [illegible]
[illegible] افلاطون کی ہی طرح کی THEORY تھی میں
[illegible] کر چیزوں کو دیکھنے میں آنکھ کی LENSE ہی بنیادی
کردار ادا کرتی ہے۔ چیزوں کو دیکھنے والی قوت تو دماغ سے
آتی ہے مگر چیزوں سے آنے والے عکس اسی آنکھ کے
LENSE میں جذب ہوتی ہے۔ الکندی نے بھی اپنے تحقیقی
مقالے MONOGRAPH میں لکھا ہے کہ آنکھوں سے شعاعیں
خارج نہیں ہوتی ہیں۔ مگر الہیثم نے اس میدان میں اپنی
انقلابی تحقیقات سے دنیائے سائنس کو مالامال کیا اور
اس وقت تک تصورات کو یکسر تبدیل کر دیا۔ آج بھی الہیثم
کا نظریہ (THEORY) ہی چیزوں کو دیکھنے کا تسلیم شدہ نظریہ
(ACCEPTED THEORY) ہے۔ الہیثم کے مطابق چیزیں اس
وقت دکھائی دیتی ہیں جب چیزوں سے شعاعیں ٹکرا کر آنکھ کے
LENSE پر پڑتی ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اندھیرے میں رکھی چیزیں
اجالے میں موجود آنکھوں کو دکھائی پڑتیں۔ جب کہ ہوتا یہ ہے کہ
اگر چیزیں اجالے میں ہوں اور آنکھیں اندھیرے میں تو بھی چیزیں
دکھائی پڑتی ہیں۔ اس وقت ان کے ہم عصر بہت سارے سائنس
دانوں نے اس نظریے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر البیرونی
اور ابن سینا کی وسعت ذہنی و نظر نے اسے تسلیم کر لیا۔ الہیثم
نے اور بہت سارے علم بصارت (OPTICS) کے مسائل کو حل کر کے
دنیائے سائنس کو جلا بخشی۔ انھوں نے تجرباتی فزکس کو بھی
بڑی ترقی دی اور بہت کامیاب تجربات کیے۔ الہیثم کے کارناموں
کی ایک لمبی فہرست ہے جن پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔
انھوں نے ارسطو کے کاموں کا تجزیہ کیا اور ان پر تنقیدیں
لکھیں۔ انھوں نے گیلن (GALON) کے بھی بہت سارے کاموں
کی تلخیص لکھی ہے۔ الہیثم کی تصانیف ریاضی میں پچیس عدد
اور مابعد الطبیعیات (METAPHYSICS) اور فزکس میں تقریباً

چالیس عدد ہیں۔ ان کی کتابیں نباتات (BOTANY)
اور ادویات (MEDICINE) پر بھی بہت مشہور ہیں۔ ان
کی مشہور تصانیف میں "کتاب المناظر" معیاری فزکس (CL-
-ASSICAL PHYSICS) کی ایک ایسی کتاب ہے جس
نے چھ سو سال تک تمام سائنس دانوں کو متاثر کیے رکھا
بہت سارے رومن، جرمن اور مسلم سائنس دانوں نے جیسے
راجر بیکن (ROGER BECON) جون پیکھم - (JOHN PEC-
KHAM) ویٹے لو (WETELO) لیوی بن جرسن (LEVI BI-
N GERSON) - احمد بن ادریس القرضاوی اور قطب الدین
شیرازی وغیرہ وغیرہ نے اس کتاب کو بنیاد بنا کر اس نظریے
پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

نصیر الدین طوسی نے بھی علم بصارت میں اہم تحقیقات
کی ہیں۔ ان کی دو ضخیم کتابیں بہت مشہور رہی ہیں ان میں سے
ایک کا نام "المباحث فی انعکاس الاشعات والعطاف"
(RESEARCH ON THE REFLECTION AND REFRACTION
OF LIGHT) ہے جو انعکاس کے بنیادی اصول 'انعکاس اور
انعطاف کے زاوے برابر ہوتے ہیں اور شعاع واقع (IN-
CIDENT RAY) - عمودی خط (PERPENDICULAR)
اور شعاع منعکس (REFLECTED RAY) تینوں ایک ہی
سطح پر ہوتے ہیں' پر لکھی ہے۔ دوسری کتاب "تحریر المناظر"
ہے جس میں انھوں نے الہیثم کے نظریے کی تائید کی ہے
کہ چیزیں کیسے دیکھی جاتی ہیں جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

قطب الدین شیرازی (متوفی ۱۳۱۱ء) جن کا شمار اس
دور کے بڑے سائنس دانوں میں ہوتا ہے نے علم بصارت
پر تحقیقی مقالات اپنی فلکیاتی تحریروں میں لکھا ہے۔ ان کے دیگر
تحقیقی پرچوں میں ایک جس کا عنوان "نہایت الادراک فی
دریافت الافلاک" (HIGHEST UNDERSTANDING OF
THE KNOWLEDGE OF SKY) ہے جس نے بہت عرصے تک
سائنس دانوں کو مواد فراہم کیا۔ انھوں نے پہلی بار علم [illegible]

دیکھنے کے قدرتی طریقے اور (Geomatical Optics)
قوس و قزح پر بہت تفصیلی مضامین لکھے ہیں۔ وہ سب سے
پہلے سائنس داں تھے جنہوں نے قوس و قزح پر تفصیلی،
لائق اعتماد (Convincing) اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔
ابن کافہ پر جو بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جس میں وہ کہتے
ہیں کہ قوس و قزح اس وقت بن سکتا ہے جب شعاعیں
وائے کرۂ ارض (فضا) سے دوبارہ انعطاف اور ایک
بار انعکاس ہوتی ہیں۔

چودھویں صدی کے مشہور زمانہ سائنس داں جناب
کمال الدین ابوالحسن الفارابی ہیں، جنہوں نے الہیثم کے آپٹکس
کے کاموں میں گہری دلچسپی لی اور "تنقیح المناظر" (Correc-
-tion of Optics) جیسی کتابیں لکھیں جو کتاب المیزان پر
ایک مفصل اور اولین تفسیر ہے۔ یہ نہ صرف فزکس اور عضویاتی
علم البصارت (Physiological Optics) بلکہ علم موسیمات
علم تناظر اور بہت سارے دوسرے Subjects
پر ایک عمدہ کتاب ہے اس میں نفسیاتی علم تناظر اور رنگوں
کے اثرات وغیرہ عنوانات پر بھی تفصیلی بحث ہے۔ انہوں نے
کروی انحراف کو دور کرنے کے لیے Hyperboloid-
-al Lense کا استعمال بتایا۔ انہوں نے روشنی کے انعطاف
کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جو جاسوس سائنس کے مطابق یہ بتاتا
ہے کہ روشنی کی رفتار بہت زیادہ مگر محدود ہے اور روشنی
کی رفتار مختلف واسطوں سے گزرنے پر اس واسطے (Me-
-dium) کے بصارتی کثافت کے الٹے تناسب (Inver-
-sely Proportional) میں ہوتی ہیں۔ یہ بصارتی کثافت
مادے کی عام کثافت سے مختلف ہوتی ہے۔ دوسری اہم
بحث انہوں نے روشنی کے دو مختلف نظریے Corpuscular
Theory of Light کے مقابلے Wave Theory of
Light پیش کی ہے۔ انہوں نے Camera Obscure
پر بھی کامیاب تجربے کرکے الہیثم کے تجربات کو استعمال کرکے
آگے بڑھایا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کمرے میں چھوٹے سوراخ
ہو کر روشنی کے آنے پر جو تصویر بنتی ہے وہ سوراخ کے سائز
پر منحصر کرتی ہے اور سوراخ جتنا چھوٹا ہوگا اتنا ہی صاف
(Sharp) عکس (Image) بنے گا۔ انہوں نے یہ بھی
دکھایا کہ عکس الگ پردے پر بنتا ہے لیکن عکس اور روشنی
کی شعاع ایک دوسرے کے مخالف سمت میں ہوتی ہیں۔

ابن یوسف (۱۰۰۹ء) نے سب سے پہلی بار گھڑی
میں لٹکن کا استعمال کیا اور البیرونی (۱۰۴۸ء) نے Time
Machine بنایا جو ادین کیلنڈر پر مشتمل تھا۔ البیرونی نے
کچھ خاص قسم کا کنواں بھی بنایا جو Hydrostatic دباؤ
کی وجہ سے خود بخود پانی نکالتا تھا جیسے جھرنے سے نکلتا
ہے۔

مسلم سائنس دانوں نے ہی سب سے پہلے جہاز رانی کا
کام شروع کیا تاکہ سمندر کے سفر کو آسان بنایا جاسکے اور ساتھ
ہی یہ بھی کوششیں کی جاتی رہیں کہ کس طرح جہاز کو ہلکا
بنایا جاسکے۔

دس بارہ صدیوں تک مسلم سائنس داں دنیائے
سائنس کو جلا بخشتے رہے جن کا احاطہ کرنا اس چھوٹے
سے مضمون میں ممکن نہیں تاہم ان عوامل کو سمجھنا ہوگا کہ آخر
وہ کون سی وجہ ہے جس نے ان کو دنیائے سائنس کا بارہ
صدیوں تک امام بنائے رکھا اور پھر وہ پیچھے رہ گئے تو
ایسے کہ عمیق غار میں جا گرے۔ سائنسی تحقیقات کے لیے جو
ماحول اور فضا کشی درکار ہے وہ اسلام کی حق پسندی
صداقت طلبی اور علم دوستی کی وجہ سے میسر ہوئی تھی۔ قرآن
اور سنت نے جس طرح علم و سچائی کے حاصل کرنے پر زور دیا
اور جس طرح اس کے ماننے والوں نے قرآن و سنت کو دلچسپی
کے ساتھ پکڑا۔ اس کا واضح نتیجہ تھا کہ لوگوں کے انداز فکر بدلیں
اور کائنات پر غور و فکر کریں۔ جہاں ایک طرف قرآنی آیات
تخلیق کائنات الہیہ پر غور و فکر کی طرف رغبت دلاتی ہیں

کہا ہمیں نبی اکرمؐ کی ایسی بات سنائیے جو ان کی طرف سے بہت پسندیدہ و
نقل ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا: قیامت کے دن ایک آواز
دینے والا آواز دے گا کہ عقل مند لوگ کہاں ہیں؟ تم لوگ
پوچھیں گے؟ عقل مند سے مراد کون لوگ ہیں؟ جواب
ملے گا: وہ لوگ جو اللہ کو یاد کرتے صبح و شام ہر حال میں کرتے
تھے اور آسمانوں اور زمینوں کے پیدا ہونے پر غور کرتے
تھے اور کہتے تھے یا اللہ تو نے یہ سب بے فائدہ نہیں پیدا
کیا۔ ظاہر ہے زمین اور آسمان میں غور و فکر کرنے کا مطلب
یہی ہے کہ ان پر غور و فکر اور ان کی حکمتوں کو سوچنے اور
سمجھنے ہی سے اللہ جل شانہ کی معرفت میں قوت
پیدا ہوتی ہے۔

ابن ابی دینار نے ایک مرسل روایت نقل کی ہے
کہ نبی اکرمؐ ایک مرتبہ ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے
جو چپ چاپ بیٹھے تھے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: کیا بات
ہے کس سوچ میں بیٹھے ہو؟" لوگوں نے عرض کیا: "مخلوقات
الٰہیہ کی سوچ میں ہوں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہاں!
اللہ کی ذات پر غور نہ کیا کرو کہ وہ تو وراء الوراء ہے
اس کی مخلوقات میں غور کیا کرو۔"

حضرت ابو ہریرہؓ حضور اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں
کہ ایک آدمی چھت پر لیٹا ہوا آسمان اور ستاروں کو دیکھ
رہا تھا اور پھر کہنے لگا: خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ تمہارا پیدا
کرنے والا بھی کوئی ضرور ہے۔ اے اللہ تو میری مغفرت
فرما دے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی نقل ہے کہ آپ نے
فرمایا کہ ایک ساعت کا غور و فکر ساٹھ سال کی عبادت
سے افضل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ابو ذرؓ
سے بھی ہے کہ ایک ساعت کا غور و فکر تمام رات کی عبادت
سے بھی افضل ہے۔ الغرض حضور اکرمؐ کی وہ بہت مشہور حدیث
جس میں آپ نے فرمایا کہ حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے۔

لئے جہاں دیکھو حاصل کرو۔"

اس طرح آپ کو بے شمار احادیث ملیں گی جن میں
علم و حکمت کے حاصل کرنے اور کائنات پر غور و فکر کرنے پر
آپ نے کس قدر زور دیا ہے اور اس کی وجہ سے جو ماحول
پیدا ہوا تاریخ شاہد ہے کہ کس طرح اس نے سائنس کو بھی
ایک آزاد ماحول اور کھلی فضا بخشی جس کا اثر سولہویں عیسوی
صدی تک قائم رہا۔ مگر بعد میں جب قرآن و سنت سے
دوری اور آسان راہوں کی تلاش امت مسلمہ میں بھی رائج
ہو گئی تو اس کے جو اثرات مرتب ہونے تھے وہ آج بھی بحیثیت
مجموعی اس قوم پر غالب ہے۔ محنت اور جفاکشی جس قوم کا
ایمان تھا جب وہی قوم خانقاہوں میں گھس کر ریاضت
کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کرنے لگی تو اس کے جو اثرات
پڑنے چاہیے تھے وہ پڑ کر رہے۔ جب ملت کا سواد اعظم
ہی میدان کارزار سے جی چرانے لگے تو پھر کوئی وجہ نہ ہوگی
کہ پسماندگی و جہالت عام طور پر امت کی تقدیر نہ ہو گی اور
ہر کس و ناکس کے طعنے برداشت کرنے ہوں گے۔

مسلم سائنس دانوں کے کارناموں کو گن کر ہمیں
ماضی کی یادوں میں کھونے کے بجائے ایک تابناک مستقبل کے
لیے حال میں ٹھوس بنیادوں پر عمارتیں کھڑی کرنی ہوں گی
تاکہ آنے والی نسلیں میدان عمل میں برسر پیکار رہیں اور ان
کا ذہن سائنس (علم) کا نام آتے ہی عام طور پر مغرب (یورپ)
جانے کے بجائے یہ محسوس کرے کہ یہ تو ان کی ہی میراث ہے
جن پر آج مغرب مہر لگائے بیٹھا ہے۔ ورنہ ہمارا ایک طبقہ جو اپنی
تاریخ و روایات سے جہالت و محرومی کی بنا پر یورپ سے مرعوب
ہے اور ذہنی و فکری افلاس میں مبتلا ہے یہ نہ سمجھے کہ فلسفہ و
سائنس کی تمام ترقیاں یورپ کی ہی دین ہیں اور اس میں ہمارا
کوئی حصہ نہیں۔ بلکہ بقول علامہ اقبالؒ

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۳ - (مارچ ۱۹۹۳ء)

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی نصابی اور ترجمہ شدہ کتابیں

کلثوم ابوالبشر ☆

بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا محمد حسین آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی کی درسی کتابوں کو مشعلِ راہ بناکر جدید طرز پر نصابی کتابوں کے لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جن ادباء اور مشاہیرِ ادب نے درسی کتابوں کی تالیف میں دلچسپی کا اظہار کیا اور اس میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ان میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، اصغر گونڈوی اور خواجہ غلام السیدین قابلِ ذکر ہیں۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی پنجاب یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔ دورانِ تعلیم بہت کم طلبا میں اتنی استعداد اور قابلیت ہوتی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کی طرف راغب ہوں۔ ان کی تمام صلاحیتیں اور قوتیں صرف اخذ کرنے کی طرف ہی مبذول رہتی ہے مگر اپنی خداداد ذہنیت سے ڈاکٹر شادانی نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی چند معیاری نصابی کتابیں تالیف کیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں فارسی کی اہم و مستند کتابوں کا اردو ترجمہ ہیں۔ فارسی کی ان کتابوں کو ڈاکٹر شادانی نے اردو کے قالب میں ڈھال کر ادب اردو پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔ آیئے ادبی و فنی نقطۂ نظر سے ان کی نصابی کتابوں کا جائزہ لیں۔

نقشِ بدیع

ڈاکٹر شادانی کی پہلی تالیف ہے۔ یہ فارسی اردو لغت ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے جدید فارسی کے تقریباً ساڑھے چھ ہزار لغات اور محاورات کی نشان دہی کی ہے جو مروجہ کتب لغات میں نہیں ملتے ہیں۔ ایران میں عام طور پر مستعمل ہیں۔ اس کتاب کی تصحیح اور نظرِ ثانی ان کے استاد علامہ جناب پروفیسر سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی نے کی۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری گیٹ، لاہور نے فرمائش پر ۱۹۲۳ء میں مطبع کریمی لاہور سے اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ ڈاکٹر شادانی نے اس کتاب کو صاحبزادہ عبدالجلیل خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر کے نام معنون کیا۔ پیش کش میں فرماتے ہیں:

"میں اپنی ناچیز مساعی کے اس چھوٹے سے تحفہ کو انتہائے نیاز مندانہ ارادت اور نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ عالی جناب صاحبزادہ عبدالجلیل خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر جن کا بیکران تلطف دائمی میرے لیے کونین کی بہترین نعمت ہے اور جن کی تحریکات معنوی طلب علم پر میری آمادگی اور مشاغلِ علمیہ میں انہماک کا باعث ہوئیں، کے حضور میں پیش کر کے اپنے لیے انتہائی مسرت اور ناز محسوس کرتا ہوں..."

☆ شعبۂ اسلامیہ و فارسی، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

سرمایہ بہم پہنچاتا ہوں۔"؎

کتاب کے تعارف میں ڈاکٹر شادانی نے اس لغت کی تالیف کا مقصد واضح طور پر بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں

"شاہنامہ، [illegible]نامہ، سکندرنامہ، انشائے [illegible] وغیرہ وغیرہ کتب فارسیہ [illegible]ت میں شمار کیا جاتا ہے اور قدیم فارسی لٹریچر کے بہترین نمونے ہیں۔ اگر ایران کی دورِ حاضر کی فارسی سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ اکثر لغاتِ [illegible] عربیہ جن کا استعمال قدما کے یہاں بکثرت پایا جاتا ہے، اب ٹکسال باہر خیال کیے جاتے ہیں اور ایک بڑی حد تک وہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہو چکے ہیں۔ مرادف فقرے، طویل و دقیق جملے، پیچیدہ اور دشوار ترکیبیں اب نامطبوع خیال کی جاتی ہیں اور ان کے بجائے سادگی، سلاست اور بے ساختگی کو مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ گویا تحریر و تقریر دونوں میں یک رنگی اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور سادگی و سلاست کی طرف یہ میلان کچھ اس بنا پر نہیں کہ قدما کا تتبع ممتنع اور محال ہے۔ بلکہ ارتقائے تمدن اور اشاعتِ علوم نے اس ضرورت کو محسوس کرا دیا ہے کہ علوم کو سہل الحصول بنانے کے لیے طرزِ بیان کی مشکلات کو کم کرنا لازمی ہے۔"؎

برصغیر پاک و ہند و بنگلا دیش میں فارسی زبان صدیوں سے بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس سرزمین میں کئی اہلِ قلم پیدا ہوئے جن کی فارسی دانی پر شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور آج بھی زبان و ادب کے کئی رسیا و اہلِ فن موجود ہیں جنہوں نے فارسی کی قدیم مایہ ناز ادبی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ گلستان، بوستان، مثنوی رومی، سکندر نامہ، دیوانِ حافظ انھیں ازبر ہیں۔ ان کتابوں کی گہرائی و گیرائی میں ان کی طبع کی جولانیاں قابلِ ذکر ہیں۔ مگر یہی بزرگ ہستیاں اگر آج ایران چلی جائیں اور وہاں کی جدید فارسی کتب کا مطالعہ کریں تو ان کی فارسی دانی دھری رہ جائے گی۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ آج ایران کی فارسی نے جدید جامہ پہن لیا ہے۔ وہاں کی بول چال اور روزمرہ محاورے کی زبان میں صد درجہ فرق پیدا ہو گیا ہے۔

جدید فارسی نے سادگی، سلاست اور بے ساختگی کو اپنا لیا ہے۔ فارسی کے بیشتر لغات جو برصغیر پاک و ہند و بنگلا دیش میں اب بھی رائج ہیں وہ ایران میں اب مستعمل نہیں ہیں بلکہ ان لغات و محاورات کو اہلِ ایران جانتے بھی نہیں۔ بلکہ انھیں سن کر ہنستے ہیں۔ برصغیر کی فارسی تقویم پارینہ بن چکی ہے۔ جدید فارسی میں، انگریزی، ترکی، روسی اور فرانسیسی لغات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ انھیں حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر شادانی نے جدید فارسی کے روزمرہ الفاظ، محاورات اور تراکیب کو اس لغت میں اردو معنی کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ طالبِ علم اور اہلِ فن ان لغات سے آشنا ہوں اور ایران جانے کے بعد فارسی جاننے کے باوجود اپنے آپ کو اس ملک میں اجنبی محسوس نہ کریں۔

اس لغت کی تالیف میں ان کے دوست ہرگوردیال سنگھ کا نام قابلِ ذکر رہے گا۔ کیونکہ ان ہی کی ایما پر اور فرمائش پر ڈاکٹر شادانی نے اس لغت کو لکھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"اوائل سنہ ۱۹۲۰ء میں میرے مرحوم دوست سردار ہرگوردیال سنگھ بی۔اے نے جنھیں فطری طور پر فارسی لٹریچر سے صد درجہ مناسبت اور محبت تھی اور اس میں کامل دستگاہ رکھتے تھے مجھے اس امر پر آمادہ کیا کہ جدید لغات و محاورات فارسی کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا جائے جس سے موجودہ مشکلات کا استیصال ہو جائے

اس لیے کہ لغت کو موجودہ دور کی کتب سمجھنے
یہاں کی ہی لٹریچر کے سمجھنے میں مدد دے سکتی ہیں
بیسوی صدی کی فارسی کے لیے ان کا وجود کالعدم
[illegible] ہے چنانچہ ۴۰ ماہ کی مسلسل محنت
کے بعد تقریباً چھ ہزار جدید لغات و محاورات
فارسی کا یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کے پیش نظر
ہے مدون ہو گیا۔"[۱]

"نقش بدیع" ۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ فارسی کے جدید الفاظ و محاورات کے معنی کو آسان، سلیس اور عام فہم اردو میں بتلایا گیا ہے۔ کہیں کہیں مزید وضاحت کے لیے الفاظ اور محاورات کو جملوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اس کتاب کی کاپیاں محفوظ ہیں۔ (اس کتاب کی دستیابی کے لیے میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے لائبریرین جناب محمد حسین رضوی کی ممنون ہوں جن کی کرم فرمائی نے مجھے اس کتاب کی فوٹو کاپی ڈھاکا میں ارسال کیں۔)

اس کتاب کی تدوین و تالیف میں کئی ممتاز اہل قلم کی مساعی بھی شامل ہیں جس کا اعتراف ڈاکٹر شادانی نے بذاتِ خود کیا ہے۔ ان فاضل علما میں مولانا میرزا ہادی علی بیگ، مولانا اسحاق النبی، مرحبین علوی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دار السرور [illegible] قیام کے دوران چند اہل زبان سے بھی ڈاکٹر شادانی نے مدد حاصل کی۔

اس لغت کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر شادانی ایک دوسری لغت کی تالیف میں سرگرداں تھے۔ اسی لیے ۱۹۳۱ء میں وہ ایران جانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ایک درخواست میں لکھتے ہیں:

"I am desirous of studying the system of education and the method of teaching of the Persian people to obtain thorough knowledge of the modern Persian, to acquire practice in speaking the colloquial tongue with correct pronunciation and intonation and to collect some more material unavailable in India for my modern Persian dictionary on which I have been working for the last seven years I have a mind to go to Persia and stay there for a few months"

اس لیے جہاں تک معتبر و مستند ذرائع کا تعلق ہے نقش بدیع کے علاوہ ڈاکٹر شادانی نے ایک اور لغت بھی لکھی تھی۔ بقول ڈاکٹر کلیم سہسرامی اس لغت کا نام French Elements in Modern Persian تھا۔ اس بات کی [illegible] مرحومہ بیگم شادانی نے بھی مجھ سے کی۔ [illegible] خود ڈاکٹر شادانی نے ۱۹۳۲ء [illegible] درخواست میں اپنی غیر مطبوعہ کتابوں میں اس کتاب کا نام [illegible] لیکن [illegible] ریسرچ کی فہرست میں اس کا نام European Elements in Modern Persian [illegible]

[illegible] اس لغت کی [illegible] بقول بیگم شادانی انھوں نے پاکستان [illegible]

کے ہو۔ ان کا تمام غیر مطبوعہ کلام اشاعت کے لیے مہیا تھا جو فی الحال نا پید ہے۔"

ڈاکٹر ابوالیث صدیقی نے ایک ملاقات میں مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر شادانی کا کچھ غیر مطبوعہ کلام ان کے پاس موجود ہے اور وہ ان کی فوٹو کاپی مجھے ارسال فرمائیں گے لیکن افسوس کہ میرے بار بار یاد دلانے اور رابطہ قائم کرنے کے باوجود نہ تو خاطر خواہ جواب دیا اور نہ ہی (مسودہ) کی فوٹو کاپی روانہ کی۔

کشف الابہام فی ترجمہ مکاتبات علامی

ایام طالب علمی میں ڈاکٹر شادانی کی یہ دوسری کتاب ہے جو غالباً ۱۹۲۳ء کے اواخر یا جنوری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی کیونکہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد ان کی تیسری تالیف "السعی الزاہر فی رباعیات بابا طاہر" جو فروری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی کے سرورق پر اس کتاب کا نام لکھا ہوا ہے۔ اور عندلیب شادانی کو کشف الابہام و نقش بدیع کا مصنف بتایا گیا ہے۔ اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن جو لاہور سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا ہے میری نظر سے گذرا۔ یہ کتاب ابوالفضل کی فارسی کتاب "انشائے ابوالفضل" یا "مکاتبات علامی" کا اردو ترجمہ ہے۔

ابوالفضل کی فارسی کتاب قدیم فارسی کی متقع، مرصع، مسجع نثر سے پُر تھی۔ عربی کے دقیق و ثقیل الفاظ سے عبارت پر زور ہونے کے باعث طالب علموں کے لیے اس کا سمجھنا کافی مشکل تھا چونکہ فارسی کے زیادہ تر شاگرد اس دور سے واقف ہوتے تھے اس لیے ڈاکٹر شادانی نے اس مشکل کتاب کو اردو کا جامہ پہنا کر قارئین کی مشکل آسان کر دی۔ اس کتاب کو انہوں نے اپنے استاد پروفیسر اولاد حسین شادان بلگرامی کے نام معنون کیا۔

طبع اول میں ڈاکٹر شادانی نے ترجمہ کے ساتھ مشکل الفاظ کی فرہنگ نہیں دی تھی۔ اس کمی کو طبع دوم میں پورا کیا۔ ان کے استاد پروفیسر اولاد حسین صاحب نے شیخ مبارک علی کی فرمائش پر بذات خود دفتر اول کی فرہنگ لکھی۔ طبع دوم میں یہ کتاب مع فرہنگ کے شائع ہوئی۔ کتاب کے ص ۸۵ پر درج ہے۔

"وجاہت حسین صدیقی عندلیب شادانی نے ایم اے ایل۔ منشی فاضل لیکچرار ڈھاکا یونیورسٹی نے دفتر اول ابوالفضل کا ترجمہ لکھا تھا اور فرہنگ چھوڑ دی تھی جس کی ضرورت طلبا کو رہا کرتی ہے جب بار دوم اس ترجمے کے چھاپنے کی نوبت آئی تو شیخ مبارک علی نے فرہنگ لکھنے کی خواہش مجھ سے کی۔ ان کی اس تمنا کو میں پورا کرتا ہوں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء (سید اولاد حسین شادان بلگرامی)[۱]

یہ کتاب طلبا کے لیے اس قدر مفید ہوئی اور اس کی ہر دل عزیزی کا یہ عالم رہا۔ ۲۵ سال کے عرصے میں اس کتاب کے پانچ ایڈیشن شائع ہو گئے۔ اصل فارسی کتاب کو ابوالفضل کے بھانجے اور داماد عبدالصمد بن افضل محمد نے تالیف کیا تھا اور اس کا نام مکاتبات علامی رکھا۔ کتاب کا ترجمہ (بہ قلم شادانی) سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفضل کی موت جل کر، ڈوب کر یا زہر سے نہیں ہوئی بلکہ شہزادہ سلیم کی ایما پر بندیل کھنڈ کے راجہ نرسنگھ دیو نے ابوالفضل کو قتل کیا۔ ابوالفضل کے مرنے کے بعد مؤلف عبدالصمد نے ابوالفضل کے تمام مکاتبات کو جو منتشر پڑے ہوئے تھے فراہم کرنا شروع کیا۔ جمع آوری کے بعد ان مکاتبات کو اپنی معلومات کے مطابق تین قسموں کے عنوان میں تقسیم کیا۔ بقول عبدالصمد

"اول وہ خطوط اور فرمان جو انھوں نے (ابوالفضل) حضرت شہنشاہ کی زبان سے سلاطین ایران و توران کے بادشاہوں اور بلند مرتبہ امرا کے نام قلم معنی سنج سے تحریر فرمائے ہیں دوسرے وہ عرضیاں اور رقعے جو اپنی طرف سے حضرت سلطان عالم اور امرائے ذی حشم کو لکھے ہیں اور تیسرے وہ خطبے اور دیباچے جو انھوں نے اور کتابوں، بیاضوں اور نثروں وغیرہ کے لکھے۔"

انتخاب جو بعض مقاصد کے لیے احاطۂ تحریر میں لائے ہیں۔"

تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے فارسی کی یہ ایک اہم اور مستند تاریخی دستاویز ہے جو شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔ مورخین کے لیے یہ کتاب مشعل راہ ہے۔ ڈاکٹر شادانی نے اپنے رشحات قلم سے اس کتاب کو اردو جامہ پہنا کر تاریخ کا ایک نیا باب اردو داں اور طالب علموں کے لیے کھول دیا۔ جو مورخین فارسی سے نابلد تھے ان کے لیے یہ ترجمہ روشنی کا مینار ثابت ہوئی، اس کتاب میں اکبر بادشاہ کی فتوحات اور بیرونی ممالک سے متعلق شہنشاہ کے تعلقات خطوط کے آئینے میں اجاگر ہوتے ہیں دفتر اول کے ترجمہ میں حسب ذیل خطوط کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی کا نامہ عبداللہ خاں ازبک والی توران کے نام۔

نامۂ محبت افزا عبداللہ خاں ازبک کے نام تحریر ہوا۔

عبداللہ خاں ازبک والئ توران کے نام

حضرت شاہ اکبر اعظم کا مکتوب گرامی مملکت ایران کے فرماں رواشاہ عباسی کے نام۔

حضرت شہنشاہ اکبر اعظم کا والا نامہ ولایت کاشغر کے حاکم کے نام۔

حضرت شہنشاہ اکبر کا مراسلہ یورپ کے فلاسفروں کے نام۔

حضرت شہنشاہ اکبر اعظم کا فرمان سپہ سالار خان خاناں ولد بیرم خاں کے نام۔

حضرت شہنشاہ اکبر اعظم کا فرمان سپہ سالار خان خاناں کے نام

حضرت شہنشاہ اکبر اعظم کا تعزیت نامہ حکیم ہمام کے نام ان کے بھائی جالینوس زمانہ حکیم ابوالفتح گیلانی کی وفات پر۔

حضرت شہنشاہ اکبر اعظم کا فرمان اعظم خاں کوکلتاش ولد شمس الدین محمد خاں کے نام

حضرت شہنشاہ اکبر اعظم کا دستور العمل ممالک محروسہ کے عاملوں (یعنی حاکموں) اور معاملات متعلقہ کے کارپردازوں کے لیے۔

حضرت شہنشاہ اکبر اعظم کا نام شہباز خاں کنبو صوبہ دار مالوہ کے نام

حضرت شہنشاہ اکبر اعظم کا فرمان عام محصولات کی موقوفی کے بارے میں۔

حضرت شہنشاہ اکبر اعظم کا فرمان حاکم خاندیس راجی علی خاں کے نام۔

غرض ترجمہ ہونے کے باوجود ادبی وتحقیقی نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔

الدری الزاہر فی شرح رباعیات بابا طاہر

نصابی کتابوں میں ڈاکٹر شادانی کی یہ تیسری کتاب ہے جو ۱۹۲۴ء میں مطبع کریمی لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے ایران کے مایہ ناز رباعی گو شاعر بابا طاہر کی ۶۲ رباعیات کا سادہ وسلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کا یہ ترجمہ رباعیات بابا طاہر ہیرن ایلن ایڈیشن مطبوعہ لندن ۱۹۰۲ء سے منقول ہے۔ اسی کی مدد سے انھوں نے یہ ترجمہ مع شرح کے پیش کیا۔ اس بات سے ہم واقف ہیں کہ شادانی نے ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ مگر فارغ التحصیل ہونے سے قبل ان کی یہ کتاب شائع ہو چکی تھی۔ رباعیات بابا طاہر ہیرن ایلن ایڈیشن اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے نصاب میں داخل تعلیم تھی اور یہ فخر وافتخار ڈاکٹر شادانی کو ہی نصیب ہوا کہ ان کی ترجمہ شدہ کتاب ایک لحاظ

سے پنجاب یونیورسٹی کے طلبا کی رہنمائی کر رہی تھی۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ زمانۂ طالب علمی میں ہی ان کی فارسی دانی کا سکہ اہلِ قلم کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا اس کتاب کو انھوں نے آغا محمد طاہر صاحب نبیرۂ حضرت آزاد کے نام معنون کیا۔ خراجِ عقیدت کے طور پر پہلے صفحے پر اُن کی تصویر بھی شائع کی۔

باباطاہر کی رباعیوں کا ترجمہ کرنے سے قبل دیباچے میں رباعی سے متعلق چند خاص امور پر روشنی ڈالی۔ ایران اور ہندوستان کے معتبر اہلِ قلم کی کتابوں کے حوالوں سے رباعی کی مختصر تاریخ بیان کی۔ مختلف مصنفین کے نظریوں کے بعد رباعی کی ایجاد کا سہرا اہلِ عجم کے سر ہی باندھا۔ رباعی کو اہلِ عجم دوبیتی اور ترانہ کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ رباعی کے اوزان اور اس کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے اہلِ جمہور کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"جمہور کے نزدیک رباعی کے وزن ۲۴ ہیں اور صرف بحرِ ہزج میں آتی ہے اور ان اوزان کو اخرم اور اخرب دو شجروں میں بیان کیا ہے۔ دونوں کا ایک ایک وزن بطورِ مثال یہاں لکھا جاتا ہے۔

ہزج اخرم: مفعولن، مفعول، مفاعیل، فعول

ہزج اخرب: مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعول"

باباطاہر کی رباعیاں یا دوبیتیاں تقریباً نوسو برس سے ایران میں ستار پر گائی جا رہی ہیں۔ عوام الناس ان رباعیوں کے دلدادہ ہیں لیکن تعجب ہے کہ ان کی زندگی کے حالات پردۂ خفا میں آج تک پوشیدہ ہیں۔ ان کی رباعیات کے کئی ایڈیشن مختلف جگہوں سے شائع ہوئے ہیں مگر افسوس کہ کسی نے بھی ان کے حالاتِ زندگی پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی۔ ڈاکٹر شادانی نے مختلف شائع شدہ کتابوں کے حوالے سے باباطاہر کی مختصر سوانح حیات مرتب کی اور اسے اس کتاب میں پیش کیا۔ اس کے بعد ان کی رباعیات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"باباطاہر کا اندازِ بیان نہایت سادہ اور صاف ہے جو قدما کی نمایاں خصوصیت ہے کسی بات کو پیچ دے کر نہیں کہتا۔ خیالات بھی زیادہ گہرے اور فلسفیانہ نہیں ہیں۔ اور زیادہ تر جذباتِ نفسانی اور تاثراتِ قلبی سے متعلق ہیں۔ اس کے کلام میں بیشتر انھیں حالات اور واردات کا مذکور ہے جو عموماً ہر شخص کے لیے ناگزیر ہیں اور جب کوئی اس کا کلام پڑھتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ خاص اسی کے خیالات کی ترجمانی اور خود اسی کے حالات کا بیان ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام کو اس درجہ ہردلعزیزی اور قبولیتِ عامہ حاصل ہے۔

طرزِ ادا کی سادگی اور بے ساختگی میں لاکھوں بناؤ اور بلا کی دل کشی و دل فریبی ہے۔ دردِ ہجر و فراق، غم نصیبی و ایذا کشی اور زار نالی کے مضامین اس کے یہاں بکثرت ہیں اور ان مضامین کو وہ کچھ ایسے موثر پیرایہ اور درد بھرے انداز سے بیان کرتا ہے کہ چوٹ کھایا ہوا دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ ساتھ ہی کثیر معنی اور طویل مفہوم کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر دیتا ہے۔"

باباطاہر کی رباعیات پر تنقید کرنے کے بعد انھوں نے ان رباعیوں کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ایک حد تک تدوین کا حق بھی ادا کر دیا۔ مختلف ایڈیشنوں میں کس لفظ کو کس انداز میں لکھا گیا ہے اس کی نشان دہی کی گئی ہے۔ علاوہ

بیان کی غلطیوں کو ظاہر کیا ہے۔ جو رباعیاں بابا طاہر کی نہیں ہیں اور ان کے نام سے منسوب ہو گئی ہیں۔ انھیں مستند حوالوں سے غلط ثابت کیا ہے۔ غرض بابا طاہر اور ان کی رباعیات پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے۔

چہار مقالہ

چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی کی فارسی کتاب ہے جس کا اصلی نام "مجمع النوادر" ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر شادانی نے مع مقدمہ کے اگست ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع کیا۔ چہار مقالہ پر ان کا لکھا ہوا مقدمہ فنی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے قابلِ ستائش ہے۔ دراصل کتاب سے زیادہ یہ مقدمہ قارئین کے لیے مفید ثابت ہوا۔ ۱۵۱ صفحات پر مشتمل اس مقدمے میں انھوں نے چہار مقالہ کی سن تالیف، اس کے موضوع، تاریخی اور ادبی لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت کا بخوبی جائزہ لیا ہے جو قابل تحسین ہے۔ چہار مقالہ کی سن تالیف کے بارے میں معتبر حوالوں سے اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا کہ اس کی تالیف بین ۵۵۱-۵۵۲ھ ہے اس کتاب کا موضوع حکمت عملی ہے۔

اس کتاب کو ابواب پر منقسم نہ کر کے مقالوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی لیے چہار مقالہ کے نام سے یہ کتاب زیادہ مشہور ہے۔ مصنف نظامی عروضی کے خیال میں:

> " بادشاہ کے لیے چار قسم کے لوگوں کا وجود اشد ضروری ہے۔ قیام سلطنت کے لیے دبیر اور بقائے نام کے لیے شاعر کا وجود ناگزیر ہے۔ نظام امور میں منجم کے بغیر چارہ نہیں اور صحت جسمانی کے لیے طبیب کا ہونا لازمی ہے۔"[13]

ڈاکٹر شادانی نے اس کی تاریخی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کئی جگہوں پر اس کتاب میں لکھی ہوئی تاریخی غلطیوں کو بھی طشت از بام کیا ہے۔ نظامی عروضی نے جن جن تاریخی واقعات اور اشخاص کے نام ایک دوسرے کے ساتھ غلط ملط کیے تھے اور سنین کی بے شمار غلطیاں کی تھیں۔ ان تمام لغزشوں کو انھوں نے اجمالی طور پر بیان کیا ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کتاب کو تاریخ ابوالفضل بیہقی، تاریخ گزیدہ شیخ عطار کا تذکرۃ الاولیا اور شیخ سعدی کی گلستاں کا ہم پلّہ بتایا ہے اس کتاب کی ادبی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> " اگرچہ مرادفات کی کثرت، لغات عربیہ کی بہتات بے لطف قافیہ پیمائی اور لفظی صنعت گری ایران کے بیشتر انشاء پردازوں خصوصاً متاخرین کا مخصوص انداز ہے لیکن اس کے برعکس چہار مقالہ کا اسلوب بیان نہایت صاف اور سادہ ہے اور مختصر لفظوں میں کثیر معنی کا ادا کرنا، اس کی ممتاز خصوصیت ہے۔ عبارت کی بے ساختگی اور روانی طرز ادا کی دلکشی و شیرینی، بندشوں کی چستی، فقروں جملوں کی ہم پیوستگی۔ غرض عبارت کے جملہ اجزائے ترکیبی کی ساخت و وضع کچھ اس طور پر واقع ہوئی ہے۔ جس نے اس کو نہایت مطبوع گوارا بنا دیا۔ حسنِ عبارت کے لیے کہیں کہیں رنگینی سے بھی کام لیا گیا ہے مگر اعتدال کے ساتھ ٹھیک اس طرح جیسے غازہ رخ محبوب کو نکھار کر چمکا دے۔ نہ اس قدر کہ اصلی رنگ کو دبا دے۔ فی نفسہ یہ فارسی کے انشاء پردازوں کے لیے اس وقت بھی ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔"[12]

چہار مقالہ کی ادبی و فنی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے بعد ڈاکٹر شادانی نے مصنف نظامی عروضی کی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں۔ دراصل چہار مقالہ کے مطالعہ سے ہی مصنف کی زندگی کے حالات کا عکس ملتا ہے جو سب

سے معتبر وسیلہ ہے اسی لیے انھوں نے چہار مقالہ کے مطالعے کے بعد مصنف کے حالات کو اخذ کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا فارسی کی مختلف تاریخی و ادبی کتابوں میں نظامی عروضی کے زندگی کے حالات کا کوئی تفصیلی حال نہیں ملتا ہے۔ محمد عوفی کی لباب الالباب جو چہار مقالہ سے صرف ساٹھ سال بعد کی تصنیف ہے، میں بھی نظامی عروضی کے متعلق معلومات بہت کم ملتی ہیں۔

ڈاکٹر شادانی نے مختلف مصنفوں کے حوالوں اور چہار مقالہ سے اخذ کردہ مواد سے مصنف کی زندگی کے چند اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اسی لیے اس کتاب سے فارسی کے شائقین کے علاوہ متعلمین بھی بہرہ اندوز ہوئے۔

احسن الرسالہ یعنی اردو ترجمہ چہار مقالہ

یہ کتاب چہار مقالہ (مقالہ اول) کا مکمل اردو ترجمہ ہے جس طرح کتاب چار مقالوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اس کے مترجم بھی چار ہیں۔ یعنی چاروں مقالے کے مترجم علیحدہ ہیں۔ پہلے مقالہ کا ترجمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کیا۔ دوسرا مقالہ جناب مولوی ابوالفتح حافظ محمد عبدالحفیظ خاں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ تیسرے مقالہ کو اردو کے قالب میں مولوی عبدالعزیز خاں نے ڈھالا اور چوتھے مقالہ کے مترجم مولوی بشیرالدین احمد صاحب ہیں۔ یہ کتاب بہ فرمائش شیخ مبارک علی دسمبر ۱۹۲۵ء میں لاہور سے چھپی۔ کل صفحات ۴۴ ہیں۔

ڈاکٹر شادانی نے مقالہ اول کا جو اردو ترجمہ کیا، اس کی یہ خوبی ہے کہ پہلے ہر باب کے مشکل الفاظ کے معنی اور دقیق الفاظ کو اعراب کے ساتھ پیش کیا تاکہ قارئین ان کے تلفظ میں کسی قسم کی غلطی نہ کریں مثلاً خَلق یعنی لوگ۔ خُلق یعنی عادت خِلقت۔ خَلَنْدَت وغیرہ۔ اسی طرح بیشتر عربی الفاظ کے معنی و مطلب کی عمدگی کے ساتھ تشریح کی ہے۔ اس کے بعد ہر باب کا ترجمہ کیا۔ کہیں کہیں ترجمہ میں سجع و صنعت کی خوبی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

خلاصہ شعر العجم: شعر العجم کو علامہ شبلی نعمانی کی مایۂ ناز ادبی و تنقیدی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے۔ جس میں شعر کی حقیقت، شاعری کی ماہیت، ایران میں فارسی شاعری کی ابتدا و بتدریج ترقی فارسی شعراء کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی رائے کے علاوہ عربی شاعری کے اثرات، فارسی شاعری کا اثر ادب اور نظامِ حکومت پر، عشقیہ شاعری، صوفیانہ شاعری اور فارسی شاعری پر تنقیدی گفتگو کی گئی ہے۔

فارسی شاعری کی تاریخ کے پہلو بہ پہلو ملکی و معاشرتی زندگی پر اس کے اثرات کا چابکدستی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ فارسی شاعری کی یہ پہلی تاریخ ہے جو اپنے فن اور طرز میں یکتا و بے مثل کہی جا سکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی:

> "یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے کہ اردو سے قطع نظر اس زمانہ تک خود فارسی میں شعر العجم کے طرز کی فارسی شاعری کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔" [۵۱]

شعر العجم کی پانچ جلدوں کی ضخامت تقریباً ۱۴۶۰ صفحات ہیں۔ طلبا اور اہلِ فن کی آسانی کے لیے ان پانچ جلدوں کو اس زمانے کے ماہرین نے باختصار پیش کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد کا خلاصہ مولانا بشیرالدین احمد بشیر نے کیا۔ اس کتاب میں شعر کی حقیقت اور ایران میں فارسی شاعری کے اسباب پر بحث کرنے کے بعد ایرانی شعراء رودکی، فرخی، فردوسی، اسدی، منوچہری، سنائی، خیام، انوری اور نظامی گنجوی کے حالات کو مختصر بیان کیا ہے۔

شعر العجم کی دوسری جلد جس میں خواجہ فریدالدین عطار حافظ، ابن یمین، کمال اسماعیل، شیخ سعدی، امیر خسرو اور سلمان ساوجی کا تذکرہ ہے۔ اس کو بالاختصار منشی غلام احمد خاں منشی فاضل رامپوری اور شادانی نے اپنے زورِ قلم کا نشانہ بنایا۔

شعر العجم کی چوتھی جلد کو جناب آغا محمد باقر نبیرہ مولانا

آزاد مرحوم نے اپنے رشحاتِ قلم سے اختصار کا جامہ پہنایا۔ اس جلد کے تین باب ہیں۔ ہر باب کو مختصر کر کے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں شاعری کی حقیقت اور شاعری کے عناصر پر بحث ہے۔

دوسرے باب میں ایران میں شاعری کیوں کر پیدا ہوئی اور اس کے عروج و زوال کی داستان ہے۔

تیسرا باب فارسی شاعری پر اجمالی تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے مثنوی پر تنقید کی گئی ہے اور شاہ نامہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

شعر العجم کی تیسری اور پانچویں جلد کا خلاصہ ڈاکٹر شادانی نے کیا۔ دونوں کتابیں لاہور سے شایع ہوئیں۔

تیسری جلد کے خلاصے میں فارسی شاعری کے دورِ آخر کا تذکرہ ہے۔ تیموری دور میں فارسی شاعری کی خصوصیات پر بحث ہے۔ اس کے بعد فغانی، شیرازی، فیضی، عرفی شیرازی، نظیری، طالب آملی، مرزا صائب اور ابوطالب کلیم کے حالات اور ان کے کلام کا مختصر طور پر تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

مغل دور میں ایرانی شعرا کی سرپرستی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ دکن میں ابراہیم عادل شاہ کی فارسی قدر دانی کا بھی تذکرہ ہے۔ حکیم ابوالفتح اور خان خاناں کی ادب نوازی اور غزالی کا تذکرہ بھی مختصر طور پر ہے۔ غرض علامہ شبلی نعمانی کی کتاب کا نچوڑ اس خلاصہ میں موجود ہے۔ یہ خلاصہ تقریباً ۴۴ صفحات پر محیط ہے۔

شعر العجم کی پانچویں جلد کے خلاصہ کا نام "الایجاز یعنی خلاصۂ شعر العجم حصۂ پنجم" ہے۔ اس کتاب میں مختصر طور پر قصیدہ، غزل، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری اور فلسفیانہ شاعری پر گفتگو کی گئی ہے۔ نمائندہ شعرا کے کلام سے مثالیں بھی دی ہیں۔ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۳۲ء میں لاہور سے شایع ہوا۔ یہی ایڈیشن میری نگاہ سے گزرا۔ پہلا ایڈیشن کب شایع ہوا؟ مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔ تیسرا ایڈیشن کل ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

قصائد قاآنی: (مع تدوین و حواشی)

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی یہ کتاب راقم الحروف کو بعد از تلاشِ بسیار دستیاب نہ ہو سکی۔

مشرقی پاکستان کے اردو ادیب

یہ کتاب چھوٹی تقطیع میں اناسی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی نے ۱۴/ مئی ۱۹۵۱ء میں شایع کیا۔ کتاب کے مرتب کی حیثیت سے حفیظ ہوشیارپوری کا نام ہے۔ اگرچہ یہ کتاب شادانی کی تالیف نہیں ہے اس کے باوجود اس کا تذکرہ یہاں کرنا ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ اس کتاب میں بیشتر مضامین ڈاکٹر شادانی کے ہیں۔ ان مضامین کی وجہ سے کتاب کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔

۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد اہلِ پاکستان کو مشرقی پاکستان کے نامور شاعروں اور ادیبوں سے روشناس کرانے کے لیے ریڈیو پاکستان ڈھاکا نے جنوری، فروری، مارچ ۱۹۵۰ء میں ریڈیو سے اردو تقریروں کا ایک سلسلہ نشر کرنا شروع کیا تھا۔ اس سلسلے میں نو تقریریں کی گئیں۔ ان تمام تقریروں کے مجموعہ کو کتابی صورت میں "مشرقی پاکستان کے اردو ادیب" کے نام سے شایع کیا گیا۔ ان نو تقریروں میں سات تقریریں ڈاکٹر شادانی نے نشر کیں۔ صرف دو تقریریں بعنوان "نواب احسن اللہ "شاہین" اور "خواجہ عتیق اللہ شیدا" کے حالات کو جناب حیدر دہلوی نے بیان کیا۔ ان تقریروں کا مقصد تحقیق و تنقید نہ تھا بلکہ مشرقی پاکستان کے ادبا و شعرا کے حالاتِ زندگی پر جو پردہ پڑا ہوا تھا اسے اٹھانا تھا۔ ڈاکٹر شادانی نے بڑی جستجو اور تلاش کے بعد ان تمام شعرا و ادبا کی زندگی کے حالات کو جمع کیا۔ حکیم حبیب الرحمن مرحوم کی بیاضیں اور ان کے قلمی نسخوں سے استفادہ کیا۔ یہ کتاب مشرقی پاکستان میں اردو زبان اور ادب کے طالب علموں کے لیے اہم اور مفید سمجھی جاتی تھی۔

شمالی بنگال میں اردو ادب کی تحقیق کے لیے یہ ایک نادر تحفہ ہے۔ چونکہ اس کتاب کے بیشتر مضامین ڈاکٹر عندلیب شادانی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اس کتاب کو ان کے نام سے منسوب کرنا باعث حق تلفی اور بے ادبی نہ ہوگی۔ ڈاکٹر شادانی نے جو سات تقریریں کیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ عبدالغفور نساخ
۲۔ شائق، اختر اور صبا
۳۔ سید محمود آزاد
۴۔ نواب سید محمد آزاد
۵۔ خواجہ بیدار بخت بیدار
۶۔ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن خاں۔
۷۔ آشفتہ اور عیش

یہ تمام تقریریں وہ ہیں جن میں انھوں نے بڑی چابکدستی سے مذکورہ بالا شعرا اور ادبا کی زندگی کے حالات اور کلام پر تنقیدانہ نظر ڈالی ہے۔

ناپید تصانیف

ڈاکٹر شادانی نے چند کتابیں اور بھی تصنیف کی تھیں مگر زمانے کے دست برد سے وہ محفوظ نہ رہ سکیں اور اگر محفوظ ہوں بھی تو منظر عام پر نہیں آئیں۔ ان کے ذاتی فائل کے مطالعے کے بعد پتہ چلا ہے کہ انھوں نے مرزا جان طپش کی کتاب "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" کا ایک تنقیدی ایڈیشن تیار کر لیا تھا اور اسے شائع کرانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر یہ کتاب شاید شائع نہیں ہو سکی۔ اس کا قلمی نسخہ اب کہاں اور کس کے پاس ہے نہیں معلوم۔ واللہ اعلم۔ ۱۹۴۴ء میں ریڈرشپ کی درخواست میں انھوں نے اس کتاب کو غیر مطبوعہ بتایا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

A critical edition of Shamsul Bayan by Mirza Jan Tapish based on the authors own copy lately discover by the editor's containing considerable amount of new material which was not available to the editor of 1st edition with a long introduction and copious note." [۱۴]

۱۹۵۴ء یعنی دس سال بعد وہ اسی کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ پریس میں جانے کے لیے تیار ہے۔ یہ کتاب پریس میں گئی یا نہیں اس بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔

ریڈرشپ کی درخواست میں انھوں نے ایک اور کتاب کا حوالہ دیا تھا مگر شاید اس کتاب کو بھی طباعت نصیب نہ ہوئی۔ بقول ان کے یہ کتاب غالب کے ۳۲ فارسی خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے غالب کے فارسی خطوط کی نثر پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ نقش بدیع کے علاوہ انھوں نے ایک اور لغت تیار کی تھی جس کا نام French-Element in Modern Persian تھا۔ اس کتاب کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں:

A unique work of its kind and indispensible for a student of modern Persian." [۱۵]

مگر ۱۹۵۴ء میں اپنے تحقیقی مقالے کی فہرست[۱۶] میں وہ ایک لغت European Elements — in —

"Modern Persian" کا نام تحریر کرتے ہیں۔ غالباً فرنچ ایلیمنٹس ان ماڈرن پرشین کو ہی وسیع پیمانے پر لکھ کر اس کا دوسرا نام "یورپین ایلیمنٹس ان ماڈرن پرشین" رکھا ہوگا۔ مگر افسوس یہ لغت اب ناپید ہے۔ بقول بیگم شادانی:

> انھوں نے اس لغت کو شائع کرانے کے لیے پاکستان کے کسی اہم محقق کے سپرد کی تھی جو اب تک شائع نہ ہوسکی۔ ان کے ذاتی فائل سے ایک مطبوعہ کتاب[۱۸] کا پتہ چلتا ہے۔" رباب شکستہ" یہ نظموں کا مجموعہ ہے مگر مجھے اس کی کوئی کاپی تاحال دستیاب نہ ہوسکی۔"

حواشی

۱ نقش بدیع ۔ مطبوعہ لاہور، ۱۹۲۳ء ۔ ڈاکٹر شادانی ۔ ص ۴

۲ ایضاً ص ۵

۳ ایضاً ص ۷

۴ ڈاکٹر شادانی کی ذاتی فائل ۔ مملوکہ ڈھاکا یونیورسٹی ۔ رجسٹرار آفس ۔ غیر مطبوعہ ۔ ص ۶۰

۵ پروفیسر اور صدر شعبۂ السنہ ۔ راج شاہی یونیورسٹی ۔ بنگلا دیش

۶ ذاتی فائل مملوکہ رجسٹرار آفس ڈھاکا یونیورسٹی ۔ غیر مطبوعہ ص ۲۶۸

۷ ایضاً ص ۱۳۹

۸ "اردو مخطوطات" کے سیمینار میں فروری ۱۹۸۶ء میں خدا بخش لائبریری میں ملاقات ہوئی ۔

۹ کشف الابہام فی ترجمہ مکاتبات علام ۔ طبع پنجم ۔ لاہور ۱۹۴۹ء ص ۸۵

۱۰ ایضاً ص ۴

۱۱ الدرر الزاھرہ فی شرح رباعیات باباطاہر ۔ مطبوعہ لاہور ۔ ۱۹۲۴ء ص ۷

۱۲ ایضاً ص ۱۲

۱۳ چہار مقالہ ۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۲۴ء ص ۴

۱۴ ایضاً ص ۵

۱۵ شبلی ایک دبستان ۔ مطبوعہ ڈھاکا ۔ ص ۱۳۷

۱۶ ذاتی فائل ۔ مملوکہ ڈھاکا یونیورسٹی، رجسٹرار آفس ۔ غیر مطبوعہ ص ۲۶۸

۱۷ ایضاً

۱۸ ایضاً ص ۱۳۹

۱۹ ایضاً

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۱ - شمارہ ۳ - (مارچ ۹۲ء)

اسلامی ثقافت تعمیرات کے آئینے میں

محمد خبیر ندوی ☆

کسی تہذیب یا سماج کے معیار زندگی کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے فن تعمیر ہی میں اس کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے اس کے مقاصد زندگی، ان کی تکمیل کے لیے قوت اظہار اور اظہار میں بلندی خیال کے مطالعے کے لیے فن تعمیر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے اسلام اپنی شان و شوکت، بلندی و عظمت مکمل ضابطۂ حیات کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن، علوم و فنون، صنعت و حرفت، زراعت و تجارت، عمارتوں کی سربلندی اور ان کو اسلامی طرز پر مزین کرنے میں سرفہرست رہا ہے۔

میں اس کے ثبوت میں ایک طائرانہ نظر دو ملکوں کی روشنی میں ڈالوں گا اور ان سطور میں ان ہی دو ملکوں میں اسلامی طرز کی عمارتیں، ان عمارتوں میں نقش و نگار، اسلامی طرز تعمیر اور اس کا جلال و جمال آپ کو نظر آئے گا جس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جائے گی کہ اسلام عمارتوں کو منقش کرنے کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس نے تعمیر و تزئین اور نقش و نگار کا ایک خاص انداز اور بلند معیار عطا کیا ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی فن تعمیر کی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو سرفہرست ہمیں ایک تو عہد فاطمی نظر آتا ہے، دوم ہندوستان کا شاہی عہد۔ چنانچہ ہمیں فاطمی عہد میں اسلامی حکومت کے زیر اہتمام تعمیرات میں جو نشان راہ ملتا ہے وہ شہر قاہرہ کی بنیاد ہے۔

قاہرہ:

فاطمی عہد کے خلیفہ رابع المعز باللہ کے زمانے میں اس کے خلیفہ جوہر رومی نے ۱۵ر اگست ۹۶۹ء کو مصر کے دارالحکومت فسطاط پر قبضہ کرنے کے بعد اسی رات کو فسطاط کے شمال مشرق میں دریائے نیل سے ایک میل کی مسافت پر ایک جدید شہر کی بنیاد ڈالی۔ عرب مورخ المقریزی کا بیان ہے کہ

"یہ وہی مقام ہے جس پر اس وقت قاہرہ آباد ہے۔"[۱]

اس شہر کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ المعز نے مشرق سے آنے کے بعد اس کو قاہرہ کا نام دیا۔ اس سے پہلے یہ شہر المنصوریہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس شہر قاہرہ کی فصیل کے اندر ایک مسجد، ایک محل اور ایک قلعہ بھی تھا اور یہ سب عمارتیں اینٹ کی بنی ہوئی ہونے کے باوجود نقش و نگار سے مرصع تھیں۔

اس شہر میں اسلامی فن تعمیر کی چند جھلکیاں دیگر

☆ منیجر رضوان لائبریری، تمبور۔

تعمیرات سے اور بھی نظر آئیں گی جن میں سرفہرست جامع ازہر مسجد الحاکم، جامع الجیوش، جامع الاقمار، جامع صالح بن ارزق، دار الحکمۃ، مدرسہ بختیار، مدرسہ طاہریہ، مدرسہ فردوس، مدرسۃ الکامل، مدرسہ صالحیہ جیسی عمارتیں اپنی مثال آپ ہیں۔ ایسی ہی اسلامی تعمیرات کی چند جھلکیاں بغداد کی عمارتوں میں بھی نظر آئیں گی جن میں اسلامی طرز کی عمارتوں میں خلیفہ منصور کی شاہی مسجد، جامع سلطان اور جامع رصافہ قابل ذکر تعمیرات ہیں۔ ایسے ہی ہمارے وطن ہندوستان میں بھی اسلامی فن کاری اور اسلامی نقش و نگار سے مرصع عمارتیں جگہ جگہ نظر آئیں گی جن میں علاء الدین کا دروازہ قطب صاحب کی لاٹ، سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ، مقبرہ التتمش، آگرہ کا تاج محل، موتی مسجد آگرہ، دہلی کی شاہجہانی جامع مسجد، لال قلعہ دہلی، جون پور کی مسجد جامع الشرق، جون پور کا قلعہ، موتی مسجد بھوپال جیسی اور بہت سی عمارتیں اپنے اندر ایک عجیب جاذبیت کا محور بنی ہوئی ہیں۔

اس طائرانہ اجمال کے بعد اب ہم ان عمارتوں کے متعلق قدرے تفصیل سے آپ کو روشناس کراتے ہیں۔ چنانچہ اول الذکر تعمیر یعنی بنائے قاہرہ جس میں اگرچہ بہت سی عمارتیں مثلاً مساجد، مدارس، قلعے، محلات وغیرہ بکثرت تعمیر ہوئے جن کا اب وجود نہیں اور ان کے آثار مٹ چکے ہیں پھر بھی اس دور کی ایک مسجد جو قاہرہ کی شہر پناہ کے اندر بنائی گئی تھی اب بھی موجود ہے اور جامعہ ازہر (AL AZHAR UNIVERSITY) کے نام سے آج بھی معروف بین الناس والعام ہے۔ اس عمارت میں محراب تک وسطی دالان بنا ہوا ہے اور وسطی دالان کے ہر دو جانب دوہرے ستون کے چھتے کا حاشیہ ہے۔ محراب کے مقابل جگہ پر ایک گنبد بنا ہوا ہے جو اپنے اندر خاص کشش کے سبب سیاحوں کا مرکز بنا ہوا ہے، شروع میں جامعہ ازہر کے حرم کے جنوب مشرقی گوشہ میں صرف ایک گنبد تھا پھر بعد میں اس کے جواب میں شمال مشرقی گوشہ میں ایک گنبد کا مزید اضافہ

کیا گیا۔[۵۲]

اس مسجد کی خشتی دیواروں اور کمانوں پر دست کاری کی موٹی تہہ چڑھائی گئی ہے اس میں کتبے اور دیگر چیزیں کندہ کی گئی ہیں، اس وقت کا فن تعمیر خشتی فن تعمیر تھا۔ اسلام کے ابتدائی عہد میں تعمیر کاری کا انحصار اسی پر رہا اور برابر یہی فن استعمال ہوتا رہا جب تک کہ تزئین یعنی استر کاری اور روغنی مٹی میسر نہ ہوئی۔

مسجد الحاکم[۵۳]

اس میں بھی اسلامی طرز کی بہت سی دلچسپ چیزیں ہیں کیونکہ اس میں فاطمی خلفا کی جدت پسندی کا نادر نمونہ سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ اس مسجد کی مغربی دیوار میں پتھر کا ایک شاندار دروازہ ہے جو ایک نیا اضافہ ہے اس پر بیل بوٹوں کا نہایت باریک کام قرآنی آیات کی شکل میں کندہ ہے۔ شمال مغربی اور جنوب مغربی گوشوں پر اندر دو ابھارے بنے ہوئے ہیں اس میں نہایت عمدہ گڑھے ہوئے پتھروں سے مینار بنائے گئے ہیں اور اصل میناروں کے اندر چکر دار زینے ہیں اور کوفی کتبوں سے میناروں کی تزئین کی گئی ہے۔ نیز استر کاری بھی بیل بوٹوں سے مزین اور کتبوں سے آراستہ ہے ان پر سونے کے پتر اور رنگ چڑھائے گئے ہیں۔ مسجد الحاکم سنگی کام کی وجہ سے سنگ کاری کے اعلیٰ درجہ کا نمونہ سمجھی جاتی ہے۔

جامع صالح بن ارزق

یہ عمارت ۱۱۶۰ء میں تعمیر ہوئی اس میں اندرونی دریچوں میں استر کاری میں منبت کاری کے ساتھ ساتھ رنگین شیشوں کا بھی بکثرت استعمال ہے اور بیرونی دریچے استر کاری کی جالیوں کے ہیں جن سے عمارت کی زیبائش کی گئی ہے۔ محراب میں رنگین شیشوں کی پچی کاری ہے جس کے دونوں بازوؤں پر ہشت پہل ستون ہیں۔ اس کے منبر پر باریک صندلی ذلاکاری کی گئی ہے۔ یہ منبر مختلف النوع گل کاری کے

نمونوں سے پر ہے، اس طرح سے عمارت کی خوبصورتی دوبالا ہوگئی ہے۔ ؎

اس قدر تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لداؤ چھت، اٹھا ہوا گنبد، قلمی شکلوں سے مزین توڑے، پرکار محراب پتھر کی جالیاں، رنگین شیشے کے دریچے، رنگی ہوئی لکڑی کی جالیاں، استرکاری، دندانے دار سرول، ہندسی نباتی پھولوں کے ساتھ ملاکر تزئین کے طریقوں میں غیر معمولی پچی کاری، مربع سے مسدس، مسدس سے مثمن اور مثمن سے دائرے میں تبدیل ہونے والی منزلوں والے مختلف شکلوں کے مینار، مذکورہ تمام عناصر فاطمی دور میں ظہور پذیر ہوئے۔

تعمیرات بغداد

باقی رہی بغداد کی تعمیرات تو وہاں کی عمارتوں کی خوبصورتی ہی کے پیش نظر مشہور مورخ قدیم احمد بن یعقوب کا بیان ہے کہ "بغداد دنیا کا ایک عجوبہ ہے"۔ نیز اس زمانے کا مشہور مقولہ بغداد ہی کے متعلق تھا کہ بغداد کے علاوہ ساری دنیا دیہات ہے، جس نے بغداد نہیں دیکھا اس نے دنیا نہیں دیکھی ؎ اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ بغداد کے علاوہ ساری دنیا دیہات اس لیے سمجھی جاتی تھی کہ اہل بغداد کو اپنی عمارتیں سجانے اور ان میں جدت پیدا کرنے کا بڑا شوق تھا۔ یہ لوگ اپنی عمارتوں میں حوض، فوارے اور باغات کا خاص اہتمام کرتے تھے اور آرام و آرائش کی خاطر اپنے محلوں کو گرد و ٹھنڈا کرنے میں ماہر فن شمار کیے جاتے تھے اور اس کی خاطر اپنے محلات کے اندر ہی طرح طرح کے طریقے اپناتے تھے اور ان عمارتوں میں بہترین تعمیرات کا مظاہرہ کرتے تھے ؎ اسی لیے بغداد اپنے علوم و فنون کے ساتھ ساتھ تعمیرات کے نمونوں کی وجہ سے سیاحوں اور مورخین دونوں کے لیے مقناطیسی کشش کا مرکز رہا۔

ہندوستان کی عمارتیں

اسلامی تہذیب و ثقافت کی علم برداری میں ہندوستان بھی کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا چنانچہ یہاں بھی آپ کو اسلامی طرز کی عمارتیں کافی نظر آئیں گی۔ ہندوستان نے عربی طرز اور اسلامی نقش و نگار کے متعلق تعمیرات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ہندوستان میں ایسی عمارتیں بکثرت موجود ہیں جن سے اسلامی ثقافت کا چہرہ تعمیراتی فن میں روز روشن کی طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایک سرسری نظر ہندوستان کی عمارتوں پر بھی ڈالتے چلیے۔ اولاً ذہن تاج محل، دہلی کی جامع مسجد اور قطب صاحب کی لاٹ پر جاتا ہے لیکن اصل چیز ہندوستان کی تعمیرات میں کہ اس میں صرف ایک نظریے پر اتحاد نہ تھا بلکہ ہندوستان چونکہ مختلف المذاہب قوموں کا گہوارہ رہا ہے اس لیے زیادہ تر جو عمارتیں یہاں پائی جاتی ہیں ان میں تین عنصر خصوصی طور سے غالب ہیں اور ان ہی تین عناصر سے ایک مشترکہ تہذیب جنم لیتی ہے جسے بعد میں ہندوستانی تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ؎ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں عربی طرز کی عمارتیں بنانے کا شوق عربوں کی فتوحات اور ان کے اثرات کی وجہ سے آیا۔ کیونکہ عربوں نے یا تو مفتوحہ ممالک پر مکمل طور سے اپنا قبضہ جما کر اپنا تمدن رائج اور عام کیا اور کہیں ملک کے پرانے تمدن کو اپنے تمدن کے ساتھ ضم کر لیا اور اسی مشترکہ تمدن کی وجہ سے عمارتوں نیز رہن سہن میر ــ لطافت آگئی لیکن اس کے باوجود بعض عمارتوں پر اثر و رسوخ کے باعث مشترکہ کلچر ہونے کے باوجود بھی عربی وضع غالب ہے جس کی مثال علاء الدین کا دروازہ، تاج محل اور قطب مینار ہے کہ ان پر ہر طرح سے عربی وضع و رنگ غالب ہے خود قطب صاحب کی لاٹ دیکھنے کے بعد ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس کے معمار عربی رہے ہوں گے کیونکہ اس میں جا بجا عربی نقش و نگار اور قرآنی آیات کی شکل میں کندہ ہیں۔ ایسے ہی علاء الدین کا دروازہ بھی ہے جو حسین عمارت ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے فن تعمیر کا عمدہ اور اعلیٰ نمونہ ہے۔ نیز اس کے علاوہ ہم بھوپال

کی تاریخی موتی مسجد و تاج المساجد اسلامی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تصور کی جاتی ہیں۔

عربوں کی مشترکہ تہذیب و تمدن کا اثر اس قدر پھیلا کہ ہندوؤں نے بھی اس طرز کو اپنی قدیم عمارتوں کے لیے منتخب کرتے ہوئے نہ صرف پسند کیا بلکہ اس طرز تعمیر کو اپنایا جس کی ایک عمدہ مثال، بنارس، متھرا اور بندرابن کے مندروں کا ایک حصہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

بندرابن مندر

اس مندر کی تعمیر میں ایک حصہ بالکل اسلامی اور عربی طرز تعمیر کا ایک بین ثبوت ہے جو نمونہ بھی ہے اور یہ عمارت شمالی ہندوستان کے طرز پر بنی ہوئی ہے اور وہ محرابیں جو دروازے کے سامنے لگائی گئی ہیں ان پر ایرانی اور عربی وضع غالب ہے جن کو دیکھ کر فوراً اسلامی کلچر کا عکس تعمیرات کے آئینے میں نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان نے اپنے عروج کے زمانے میں اس فن میں خوب ترقی کی۔ ترقی ہند کا یہ زمانہ ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک شمار کیا جاتا ہے اور اس زمانے کو تعمیرات ہند کے لحاظ سے اعلیٰ عروج کا زمانہ کہا جاتا ہے جس کی بین وجہ یہی ہے کہ اس وقت کے بادشاہوں کو عمارتوں کے بنانے سے فی الواقع شغف تھا جس کی مثال اکبر کا مقبرہ سکندرہ آباد میں بہت ممتاز مانا جاتا ہے، جس میں عربی ایرانی اور ہندی تینوں اثرات غالب ہیں اور آگرہ میں تاج بی بی کا روضہ جسے "تاج محل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہند، ایران اور عرب کی مرکب طرز تعمیر کا واحد نمونہ ہے اور مختلف کلچروں کی واحد عمارت ہے۔

ایک نامعلوم شخص نے ہیو رسک نامی میگزین میں اس تاج محل کے متعلق اس طرح لکھا ہے کہ

"ساری عمارت جلا کیے ہوئے پتھر سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے اور جس وقت اس پر آفتاب کی شعاعیں پڑتی ہیں تو آنکھوں میں چکا چوند سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، در نظر نہیں ٹھہرتی ہے، اس حیرت انگیز عمارت کو دیکھنے کے لیے صرف چاند کی روشنی ہی موزوں ہے۔ سنگ مرمر کی کندہ کی ہوئی سلیں جن پر ہر ایک بے نظیر باریکی اور لطافت کے ساتھ پھول پتی، گلاب کی پنکھڑیاں اور عربی گل کاریاں قرآن کریم کی آیات نقش و نگار کی صورت میں بنی ہوئی پتلے پتلے ستون، پُر تکلف جھروکے، غلام گردشیں جن میں روشنی کے لیے جالیاں لگی ہوئی ہیں خالص سنگ مرمر کی باریک جالیاں مختلف قیمتی پتھروں کی شوخ رنگ، پچی کاری سنگ موسیٰ کے کتبے۔ بہرحال جو کچھ بھی قدرت کی صنعت میں تھا وہ یہاں بھاری تعداد میں اعزاز کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور یہ ایک ایسا مجموعی اثر پیدا کرتا ہے جس کی نظیر عالم میں نہیں ہے۔" سلہ

بہرحال ان تمام عمارتوں سے آپ نے بخوبی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اسلام جیسا آفاقی مذہب ہے، ایسے ہی وہ ایک آفاقی کلچر اور مشترکہ تہذیبوں کا گہوارہ بھی ہے۔ خواہ وہ کلچر اور ثقافت تعمیرات کے میدان میں ہی کیوں نہ ہو۔

اس لیے اس آفاقی کلچر اور ثقافت نے عمارتوں کے نقش و نگار پر اپنے کیا اثرات مرتب کیے اور اس نے کیسی کیسی اسلامی ثقافت کے دائرہ میں عمارتیں تعمیر کیں وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن یہ تمام عمارتیں آپ کو نہ صرف متوجہ کر رہی ہیں بلکہ زبان حال سے ببانگ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ اسلام کی گزشتہ عظمت و جلال کے بارے میں کون ہے جو آگے بڑھے، بات افسوس کہ یہ آواز صرف کہانیوں کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی۔ کاش علامہ اقبال کا یہ شعر سب کے ذہن میں گردش کرتا

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو　　　اور آج بھی اسلامی طرز تعمیر کے نمونے پائے جاتے۔

حواشی

۱ اصلاً یہ جامع ازہر فوج کی عبادت گاہ کے طور پر بنایا گیا تھا۔ پھر بعد میں ۹۹۶ء میں عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مقام بنا کر اسے مرکزی حیثیت دے دی گئی اور آج یہ جامعہ ازہر کے نام مشہور و معروف ہے۔

۲ ملاحظہ ہو تاریخ مقریزی ج ۳۔

۳ اس کی بنیاد المعز کے ایک جانشین نے رکھی مگر اس کی تکمیل ایک دوسرے جانشین الحاکم نے ۱۰۱۲ء میں کی جس کی وجہ سے اس کے نام سے منسوب کرتے ہوئے مسجد الحاکم قرار پائی۔ (تاریخ فتوح الشام)

۴ اسلامی فن تعمیر۔

۵ کتاب البلدان - احمد بن یعقوب

۶ تاریخ اسلام جلد چہارم۔ دار المصنفین اعظم گڑھ

۷ تفصیل کے لیے ابن ابی اصیبعہ کی کتاب طبقات الاطباء ملاحظہ ہو۔ ۱۲ خ

۸ ہندوستان پر اسلامی تہذیب کے اثرات۔

۹ ماہنامہ تیورسک نامی میگزین ایک فرانسیسی باتصویر رسالہ ہے جو فرانس سے نکلتا ہے۔ ربوب سے اردو ترجمہ۔ ۱۲ خ

"اولادِ آدم کو دینے کے لیے اسلام کے پاس اتنا کچھ ہے کہ یہ ان کا دل موہ لینے میں ناکام نہ رہے گا۔ ترقی یافتہ یورپ اور عیسائیت کسی شکل میں اتنا نہیں دے سکتی۔"

ولیم ولفرید۔

تکوینی نظامِ الٰہی

محمد اسلم صدیقی ٭

قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اللہ تعالیٰ شان ہے تکوینی نظام کے تابع ہیں۔ اس معاملے میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی مغلوں کی حکومت کا عالم عروج و زوال اسی اصول کے تحت واقع ہوا۔ اس مختصر تحریر میں آئینے مغل حکومت کے آخری دور کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر (م ۱۷۰۷ء) جو اس ملک زمانہ معتبر اور معلوم تاریخ کی روشنی میں، ہندوستان کا سب سے بڑا فرماں روا تھا اور اس کی سلطنت، ہندوستان میں قایم ہونے والی تمام سلطنتوں میں سب سے زیادہ وسیع تھی جیسا کہ کیمبرج ہسٹری کے مصنفین لکھتے ہیں:

"اس کی حکومت غزنی سے چٹاگانگ تک اور کشمیر سے کرناٹک تک وسیع تھی۔"

(کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد ۵۔ ص ۳۱۶)

دوسرے مورخ لکھتے ہیں:

"قدیم زمانے سے انگریزوں کے عروج تک ہندوستان میں اتنی طویل و عریض حکومت کبھی قایم نہیں ہوئی تھی۔"

(کیمبرج ہسٹری آف دی ورلڈ ص ۱۷۵)

مغل حکومت کے زوال کی ابتدا اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۰ء) کے بعد ہی ہوگئی تھی اور اس کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اس وقت کا حکومتی ادارہ سیاسی، انتظامی اور اخلاقی حیثیت سے انحطاط و پستی، بدنظمی، طوائف الملوکی اور انتشار و اضطراب کے اس نقطہ پر پہنچ چکا تھا، جس کو کسی معاشرتی نظام کا دم واپسیں یا حالتِ نزع سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ سلطنت مغلیہ ایک حکمراں مسلمان خاندان کے طویل ترین اور قوی ترین اقتدار کی علامت بن کر رہ گئی تھی، جس کی پشت پر نہ تو کوئی مرکزی طاقت تھی، نہ سلیقہ اور نہ حوصلہ۔ اورنگ زیب کے بعد اس کے عظیم اور پرجلال تخت پر، اس کی اولاد میں وہ لوگ آئے جنھوں نے گویا قسم کھائی تھی کہ عالمگیر نے حمایت و حفاظتِ اسلام، احیائے دین اور اجرائے سنت کی جو عملی ہوئی تھی وہ اس کی تلافی کریں گے، نیز اس نے سلطنت کے حدود میں جو توسیع کی تھی ملک کے نظم و نسق کو اپنی بیدار مغزی مستعدی اور فرض شناسی سے جو استحکام بخشا تھا عوام اور فتنہ پردازوں پر جو رعب و اثر قایم کیا تھا، وہ اپنی تعیش پسندی، کاہلی و نااہلی، اندرونی اختلاف و

٭ غازی پور لاج، سرسید نگر، علی گڑھ

کشمکش، خود غرضی، جاہ پسندی، ارکانِ سلطنت و وزراء پر کلی اعتماد اور امورِ سلطنت سے غفلت و لاپرواہی کے ذریعے اس "گناہ" کو جو عالمگیر اعظم سے سرزد ہوا تھا، مسلسل کفارہ ادا کرتے رہیں گے۔ چنانچہ یہ مغل سلطنت ہی نہیں، ملتِ اسلامیہ ہی نہیں، ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کے تختِ سلطنت پر یکے بعد دیگرے، کمزور و نااہل حکمراں آتے رہے اور تاریخ کی یہ بوالعجبی اور خدا کی شان بے نیازی و کبریائی (تکوینی نظام الٰہی) کا ظہور تھا کہ اس کا پہلا ہی جانشیں (شاہ عالم بہادر شاہ اول) اپنے نامور باپ عالمگیر کا بالکل ضد تھا۔ اورنگ زیب کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشیں ہوئے جن کے نام تاریخ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ گویا نصف صدی کی مدت میں، کسی کی مدت حکومت صرف دس مہینے، کسی کی چار مہینے سے بھی کم، کسی کی برائے نام، کسی کی چند دن حکومت رہی۔ (تلخیص از تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم۔ باب دوم۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

غرضیکہ سلطنت مغلیہ بازیچۂ اطفال بنی ہوئی تھی۔ پورا ملک طوائف الملوکی، خانہ جنگی، سیاسی بدامنی اور ہر طرح کے شر و فساد میں مبتلا تھا۔ دلی کی سیاسی مرکزیت ختم ہوچکی تھی۔ ہر شمشیر زن اور طالع آزما اپنی سرداری کا علم اٹھائے بادشاہی کا خواب پریشان دیکھ رہا تھا۔ گویا یہاں بھی وہی صورت حال نمایاں ہوگئی تھی۔ جو خلافت بغداد کے آخری ایام میں ہوگئی تھی اور جس کے نتیجے میں تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کرکے دامن خلافت کو پارہ پارہ اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور پورا بغداد مع اپنے علم و فن و ثقافت کے کھنڈر بن گیا اور خون انسانی میں سر تک ڈوب گیا۔ یہی سنتِ الٰہیہ (تکوینی نظام الٰہی) ہمیشہ سے کارفرما ہے۔ جہاں بھی ایسے حالات اور اسباب و عوامل جمع ہوجائیں گے، وہاں وہی کچھ ہوگا جو بغداد اور یہاں ہندوستان میں بھی پیش آیا۔

اس زمانے میں اس پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تین نوخیز طاقتیں تھیں۔ مرہٹہ، سکھ، جاٹ اور بیرونی تاجروں میں سے انگریز، جن کا بظاہر تاجر مگر شاطرانہ اضافہ المضاعف تھا جن کے ہاتھوں بالآخر اس زوال کی اور حکومت سے بیدخلی کی تکمیل اور اس پر مہر لگ گئی۔ اس کی ابتدا ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کے مقابلے میں انگریزوں کی کامیابی سے ہوگئی تھی۔ پھر بکسر میں ۱۷۶۴ء میں شجاع الدولہ اور ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت نے ان کے قدم جمادیے۔ سلطان ٹیپو کی نعش دیکھنے کے بعد انگریز جنرل ہارس نے فخریہ اعلان کیا:

"آج ہندوستان ہمارا ہوگیا"

(تاریخ سلطنت خداداد۔ میسور۔ ص ۲۶۶ از محمود خاں بنگلوری)

اس سے قبل ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی متحدہ اور مجموعی طاقت کا مقابلہ ہوچکا تھا۔ جس کے نتیجے میں پوری مرہٹہ فوجی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی تھی۔ بقول سر جادو ناتھ سرکار:

"مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ سرداروں کی پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ختم ہوگئی"۔

(شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ از پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص ۴۵)

غرض کہ اس جنگ نے ان کی کمر توڑ دی اور وہ ہمت و حوصلہ سب ہار بیٹھے لیکن ان کی اس تباہی و بربادی کا انجام کیا ہوا؟ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

"اگر سلطنت (مغلیہ) میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لیے قائم کرسکتی تھی۔

> "لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت "بے روح جسم" کی مانند تھی۔ جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین پلاسی (انگریزوں) نے اٹھایا۔"
>
> (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص ۴۵)

پانی پت میں مرہٹوں کی پامالی کے باوجود، احمد شاہ ابدالی واپس لوٹ گیا تھا۔ حالانکہ اس کو ان حالات میں جن میں ملک دوچار تھا، پورا موقعہ حاصل تھا کہ وہ دہلی کے تخت پر متمکن ہو جاتا اور اس کو اس کا حق بھی تھا لیکن وہ جس نیت اور مقصدِ اعلیٰ کے تحت یہاں آیا تھا اس کو پورا کرنے کے بعد دہلی کا رخ بھی نہیں کیا۔

> "مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی کسی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت و وحدت کو برقرار رکھ سکنے کی تدبیر سوچتے لیکن شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۳ء) اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر کے زمانے کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدارِ اعلیٰ کو برقرار رکھنا چاہتے تھے لیکن اس طرح کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے "انصاف" کی حکومت ہو۔"
>
> (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص ۵۴)

دو سو برس پہلے شاہ ولی اللہ کا حکومت کے متعلق یہ تصور اسلام کی روح کے عین مطابق تھا اور یہ آج بھی دعوتِ فکر دیتا ہے۔ شاہ صاحب جس حکومت کے متعلق یہ تصور پیش کر رہے تھے وہ حکومت تو سرے سے بے روح جسم کی مانند ہو چکی تھی اور اس کی تدفین بالآخر کلی طور پر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔

سقوطِ بغداد کے بعد اتنی پریشان کن صورت کبھی پیش نہیں آئی تھی بلکہ صورتِ حال اب اس سے کہیں زیادہ تشویش ناک اور تباہ کن تھی۔ منگولوں نے تباہی و بربادی تو مچا دی تھی لیکن کوئی نئی تہذیب و کلچر یا تصورِ حیات، ان کے پاس نہیں تھا۔ علوم و فنون کا تو ذکر ہی کیا، خود ان کا دامن ان سب سے خالی تھا سوائے بربریت اور ظلم کے۔

اب صورتِ حال کی نوعیت اور اس کے امکانات بالکل ہی جداگانہ اور نئے تھے۔ انگریزی اقتدار کے پہلو بہ پہلو، نئے علوم، نئے زاویہ ہائے فکر اور نئے سائنسی انکشافات، دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے ساتھ عیسائی مشنری تحریک کا ایک جال سارے ملک میں پھیل گیا اور عیسائی مبلغین کو ہندوستان میں ایک زرخیز میدان نظر آنے لگا تھا انگریزوں کے مظالم کی داستان خونِ چکاں" اسبابِ بغاوتِ ہند" میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ بہت ہی وقیع اور معتبر کتاب ہے۔ مسلمانوں کے تعلیمی ذوق اور نظم کے متعلق غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۷۸۴ء) کا ایک بیان لائقِ توجہ ہے: موصوف مآثر الکرام میں تحریر فرماتے ہیں:

> "امراء اور اصحابِ خیر کی حویلیاں اور ڈیوڑھیاں طلبا کی قیام گاہیں ہیں جہاں ان کو ضروریاتِ زندگی مفت مہیا ہیں۔"

مزید فرماتے ہیں:

> "ہر بستی کے صاحبِ توفیق افراد، طالب علموں کا خیال رکھتے ہیں، ان کی خدمت کرنے کو بڑی سعادت تصور کرتے ہیں۔"

پھر یہ انقلاب رونما ہوا کہ بدقسمتی سے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت قائم ہو گئی تب ان مدارس پر مصائب اور مشکلات نازل ہو گئیں۔ اور ۱۸۲۸ء میں لارڈ ولیم بینٹک نے تمام اوقاف اور معافیاں بحق سرکار ضبط کر لیں۔ یہ اوقاف اور معافیاں اصحابِ ثروت اور اصحابِ خیر نے درس گاہوں

اور طلباء کے لیے مقرر کی تھیں۔ اس طرح مدارس کی آمدنی کے وسائل کے سرچشمے خشک ہو گئے تو مدارس خود بخود مرجھا گئے اور یہی مقصد بھی انگریزی حکومت کا تھا جس کے نتیجے میں سات سو برسوں سے زائد ہندوستان میں مسلمانوں کا جو نظام تعلیمی تھا، اس کی بساط الٹ دی گئی لیکن ان بے رحمانہ اور ظالمانہ تدبیر و عمل کے باوجود اللہ تعالیٰ کی مشیت اور فضل سے کہ آج مسلمان جو اس ملک میں ہر طرح معاشی اور اقتصادی تنگی اور تباہی کا شکار ہیں۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں مکاتب اور مدارس دینی کا جال پھیلتا جا رہا ہے اور اس میں روز افزوں اضافہ و ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ اس طور پر بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان مدارس کے ذریعے اس ملک میں مسلمانوں اور ان کے دین کی خدمت اور حفاظت کا اللہ تعالیٰ کام لے رہا ہے۔ سلطنت تو فرو دگئی لیکن دین بچ گیا۔ ذالک فضل اللہ

شرائط ایجنسی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق اور نشانات

مئی ۱۹۹۳ء سے شرائط ایجنسی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ۵ رسالوں سے کم کی خریداری پر ایجنسی نہیں دی جائے گی

۲ ۵ سے ۲۰ عدد تک رسالہ منگانے پر کمیشن ۲۵٪ ہوگا

۳۔ ۲۱ سے ۴۰ عدد تک رسالہ منگانے پر کمیشن ۳۰٪ ہوگا

۴۔ ۴۱ یا ۴۱ سے زیادہ رسالہ منگانے پر کمیشن ۳۵٪ ہوگا۔

۵۔ ڈاک خرچ ادارہ ادا کرے گا۔

۶ ہر ماہ کا رسالہ بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ وی پی واپس آنے کی صورت میں ایجنسی منسوخ کر دی جائے گی اور دوبارہ شروع کرانے پر پچھلے شمارے اور ڈاک خرچ کی رقم دینی ہوگی۔

اگر کسی وجہ سے آپ اپنی ایجنسی چند ماہ یا ہمیشہ کے لیے بند کرانا چاہتے ہیں تو وقت پر ادارہ کو اطلاع دیں۔

شکریہ

انچارج سرکولیشن

کیسے تھے وہ لوگ

محمد اللہ خاں ★

ہم سے پہلے جو لوگ دنیا سے گزر گئے وہ سب ہمارے بزرگ تھے لیکن اِس وقت میں بزرگی کے اُس سلسلے کو زیادہ طول نہ دے کر صرف ۱۸۵۷ء اور اُس کے بعد آنے والی نسلوں کے کردار اور اُن کے بنیادی اصولوں کے متعلق کچھ کہنا چاہوں گا۔

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں بڑی مصیبت پریشانی اور خون ریز انقلاب کا سال ہے۔ اُس سال ہزاروں میل دور سے آنے والی انگریز قوم نے ہندوستانی حکمرانوں کی بساطِ سلطنت اُلٹ کر اپنی بساط بچھائی اور اِس بدقسمت ملک پر مکمل قبضہ جمانے کے بعد اِس سرزمین کے باحوصلہ سپوتوں کو خون کے دریا میں ڈبو دیا اور جو خوش قسمت لوگ خون کے اُس دریا سے زندہ نکل آئے اُن کی سوچنے سمجھنے اور زندگی کے نئے نقشے بنانے کی قوت ایسی مفلوج ہو گئی کہ انھیں اپنے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔

اُن حالات کی تشریح و توضیح کا میرے موضوع سے تعلق نہیں ہے۔ اس لیے میں اُن حالات کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اُن نازک اور پیچیدہ حالات میں خدا کے کچھ بندوں نے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھا۔ اپنے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا اور پوری قوم کو فکر و عمل کی راہوں پر گامزن کرنے کے لیے زندگی کی آخری سانس تک جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے جو کام شروع کیا کسی بھی مرحلے میں اُسے چھوڑا نہیں۔ چنانچہ اُن کی زندگی کا یہی وہ امتیاز ہے جس کے متعلق مجھے اپنے اِس مضمون میں کچھ عرض کرنا ہے۔

۱۸۵۷ء اور اُس کے بعد آنے والے دور میں جن لوگوں نے قومی خدمت کا فرض انجام دیا، اُس منتخب گروہ میں سرسید مرحوم کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے اُن کی اصلاحی اور تعمیری خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے اردو زبان خاص طور پر اردو نثر کو ایک نئی جہت عطا کی اور اُس کے ذریعے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ مسلم معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لیے مسلسل جدوجہد کی اور انھوں نے تعلیمی میدان میں جو کارنامہ انجام دیا اُس کی تو مثال ملنا بھی مشکل ہے۔

سرسید مرحوم کو اپنے مشن میں جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اُس کے لیے انھیں بڑے سنگین اور حوصلہ شکن مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر انھوں نے یہ کہہ دیا کہ

"مسلمان قوم بے حسی اور بے عملی کے اُس مقام

★ قصبہ سہاور، ضلع ایٹہ۔ یو۔پی

پہنچ گئی ہے کہ اُس کی اصلاح ناممکن نظر آتی ہے، لیکن میں اس کی خدمت سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ میری قوم ہے۔"
چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جو سرسید مرحوم کو زندگی بھر سرگرم عمل رکھ سکا۔

۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے بعد سرسید مرحوم نے اپنی قوم کو اس حال میں دیکھا تھا کہ اُس کے حوصلے پست، قوتِ عمل مفلوج، سوچنے سمجھنے اور مستقبل کے نقشے بنانے کی صلاحیت مفقود۔ پستی سے نکلنے کی امید معدوم اور جو لوگ اس حالت کو ختم کرنے کی تدبیر کرتے۔ اُن کے متعلق شکوک و شبہات اور کوئی بات کچھ میں آبھی جائے تو پست حوصلوں اور نا امیدی کی گھٹا ٹوپ اندھیروں کے سبب اُسے عمل میں لانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کو بے وقوفی اور سعی لاحاصل سمجھا جاتا تھا
اُن حوصلہ شکن حالات میں سرسید مرحوم کو اپنے تعلیمی اور اصلاحی منصوبے کی تکمیل کے لیے حسبِ ضرورت کارکن اور سرمایہ فراہم نہ ہو سکا تو انھوں نے اُن منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قایم کی اور اُس کے پلیٹ فارم سے زبردست تحریک چلائی جس کے بہت شاندار نتائج حاصل ہوئے اور اس تحریک کے ذریعے قوم کے اندر زبردست جوش و خروش اور قومی ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوا۔
سیّد صاحب نے مسلمانوں کی ذہنی بیداری اور معاشرتی اصلاح کے لیے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ انھیں یورپ کی علمی ترقی سے روشناس کرانے کی غرض سے متعدد انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے پیش کرنے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی قایم کی اور اس کے ذریعے اردو میں ایک ایسا لٹریچر فراہم کر دیا کہ جو مسلمانوں کی ذہنی بیداری میں بہت معاون ثابت ہوا۔
سرسید مرحوم نے گہری سوجھ بوجھ اور منصوبہ بند

عملی جدوجہد کے ذریعے اپنے مقاصد میں حیرت انگیز پیش قدمی کی تو دوسرے صاحبِ احساس، صاحبِ فکر اور قومی ہمدردی کا جذبہ رکھنے والے حضرات بھی ان کاموں کی طرف متوجہ ہوئے سیّد صاحب کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور اُن کے مقاصد کو شاندار طریقے سے آگے بڑھایا۔ چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے جو بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئی مسلمانوں کے بڑے مقتدر عمائدین انتہائی صبر و استقلال اور تحمل کے ساتھ مسلسل جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں اور جیسی ضرورت محسوس کرتے ہیں اُسی کے مطابق کام کا نقشہ بناتے ہیں۔ رکاوٹوں سے گھبراتے نہیں پوری قوت اور دانش مندی سے اُنھیں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
کوئی شخص کسی مجبوری یا اپنی ذاتی کمزوری کی بنا پر میدان سے ہٹنا چاہتا ہے یا آخرت کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے تو دوسرا شخص انتہائی تیزی اور دلی رغبت کے ساتھ اُس کام کو سنبھال لیتا ہے اور کام کے تسلسل میں فرق نہیں آنے دیتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند کی تواریخ کے مطالعے سے اُن تحریکوں کے بانیوں اور اُن کے معاونین کے کردار کا یہ پہلو بہت نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے کہ وہ ہر کام مستقل مزاجی، منصوبہ بندی اور کامیابی کے زبردست یقین کے ساتھ انجام دیتے تھے اور جو کام کرنے کا فیصلہ کر لیتے اُس سے زندگی بھر چمٹے رہتے تھے اور اُس کام کی تکمیل کے لیے ہر شخص انفرادی طور پر بھی خود کو ذمہ دار سمجھتا اور اُسی حیثیت سے ہر خدمت انجام دیتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جو بھی پودا لگایا جاتا وہ ایک خاص رفتار سے بتدریج اوپر اٹھتا اور لازماً ایک قدآور درخت بن جاتا تھا کہ جس کے گھنیرے سائے سے ہر نسل مستفید ہوتی رہی ہے اور انشاءاللہ آئندہ

نسلیں بھی فیض یاب ہوتی رہیں گی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی "پنجاہ سالہ تاریخ" جو کانفرنس کی ابتدائی تاریخ اور ۱۸۸۶ء سے ۱۹۳۶ء تک کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی روداد وں پر مشتمل ہے۔ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ ان پچاس سالوں میں کانفرنس کے سالانہ اجلاس زبردست تیاری کے ساتھ ملک کے مختلف اور دور دراز شہروں میں بڑے منصوبہ بند طریقے سے منعقد کیے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک اجلاس برما کی راج دھانی رنگون میں بھی منعقد ہوا تھا۔ اُس دور میں دور دراز کے اسفار کافی دشوار تھے۔ اس کے باوجود ہمیں یہ نقشہ نظر آتا ہے کہ وابستگان کانفرنس ہر اجلاس میں شریک ہیں اور جو کام جوانی میں شروع کیا ہے۔ اُسے بڑھاپے میں بھی پوری مستعدی، خوش طبعی اور جوش و خروش سے جاری رکھے ہوئے ہیں اور کوئی الجھن یا دشواری انھیں کام کرنے سے روک نہیں پاتی۔ بلکہ موانعات انھیں اور زیادہ مستعد اور سرگرم بنا دیتے ہیں۔ وہ ذاتی طور پر کیسے بھی پریشان ہوں، بیمار ہوں۔ گھریلو معاملات میں الجھے ہوئے ہوں لیکن قومی خدمت کے میدان سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتے۔ بہت زیادہ مجبوری کی حالت میں اُس خدمت سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں اور قوم اُن کی سبکدوشی پر راضی نہیں ہوتی تو وہ اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کے باوصف اجتماعی رائے کا احترام کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اپنے کام میں جٹے رہتے ہیں۔

تحریک ندوۃ العلماء کے بانی مولانا محمد علی مونگیری جو کہ ندوۃ العلماء کی نظامت کے فرائض انجام دیتے تھے، بہت بیمار رہنے لگے اور نظامت کا بوجھ برداشت کرنا اُن کے لیے بہت زیادہ دشوار ہوگیا تو انھوں نے استعفیٰ دے دیا لیکن اُن کا استعفیٰ منظور نہیں کیا گیا اور کام کرتے رہنے کی درخواست کی گئی تو مولانا نے استعفیٰ واپس لے لیا۔ کچھ دن بعد دوبارہ استعفیٰ پیش کیا تب بھی منظور نہیں کیا گیا اور مولانا کی تکالیف کے پیش نظر مولانا عبدالحیٔ مرحوم کو نائب ناظم مقرر کرکے اُن کے کاموں کا بوجھ ہلکا کردیا گیا۔

اُس دور کی تحریکات اور مختلف نوعیت کے اداروں کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے آئیں گی۔ چنانچہ ہمارے بزرگوں کے وہی جذبات، مستقل مزاجی، خود اعتمادی اور دیانت داری اُن تحریکات، اداروں اور عظیم الشان لٹریچر کو وجود میں لانے کا سبب بنیں اور جب اُن جذبات کا جوش و خروش گھٹنے لگا تو وہ برکتیں بھی ختم ہوگئیں جو اُن عظیم الشان جذبات و احساسات کا ثمر تھیں۔

ملّتِ اسلامیہ کی موجودہ نسل جو کہ اپنے بزرگوں کے شاندار کارناموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور اُن سے فیض یاب بھی ہو رہی ہے۔ اُسی انداز کے یا اُن سے بھی بڑے کارنامے انجام دینا چاہے تو اُسے اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے دور کے چیلنجوں کا مردانگی اور پامردی سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہونے کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے اور نہ کوئی چھوٹا راستہ ہے۔

کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

بیگم نصرت شروانی ▽

یوں تو مسلمانوں کی جتنی بُرائی کی جائے ضرورت سے کم ہی ہوگی۔ گویا بس کرتے جایئے مسلمانوں کی بُرائی "مسدس حالی" اور "جوابِ شکوہ" سے شروع ہو کر مسلمانوں پر بس و طعن کچھ ایسی زباں زدِ عام ہوئی ہے کہ جسے دیکھیے یہی فرماتا ہوگا کہ مسلمان سب نالائق، نامعقول، احمق، پاجی وغیرہ وغیرہ ہیں اور ظاہر ہے کہ

"زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو"

جب سب کہتے ہیں تو پھر مسلمانوں کی کیا مجال کہ وہ ان "تعریفوں" پر پورے نہ اُتریں؟

خاص کر تعلیم کے معاملے میں تو مسلمانوں کو روز ڈرّے لگتے ہیں۔ "مسلم اسکولوں کی حالتِ زار"، "اردو میڈیم اسکولوں کی تباہی و بربادی"۔ یہ عنوان آئے دن اردو اخباروں کی زینت بنتے ہیں۔ کہیں سے خبر آتی ہے کہ منیجر نے فلاں مسلم اسکول کے باغ کے پیڑ چُرا لیے۔ کہیں اور سے خبر آتی ہے کہ فلاں مسلم کالج کا صدر اسکول کا پنکھا اپنے گھر میں ٹانگ کر بیٹھ گیا ہے۔ کہیں یہ رونا ہے کہ منیجر نے اپنے تین تین نالائق سالوں کو فلاں مسلم اسکول میں (نہایت لائق امیدواروں کو رد کرتے ہوئے) ٹیچر مقرر کرا دیا۔ وغیرہ وغیرہ

"الٹی بات" تو جناب اگر کہیں یعنی کسی مسلم ادارے میں (محض اتفاق سے کبھی) مسلم بچیوں کی تعلیم کو فروغ حاصل ہو جایا ہو تو یہ "الٹی بات" ہی کہی جائے گی۔ ہے نا؟ ایسی ہی ایک کہانی پیش ہے۔ اتر پردیش (جسے الٹا پردیش کہا جاتا ہے تو کوئی خاص غلط نہیں کہا جاتا) کے ضلع فیض آباد (جسے آج کل غیض بر باد بھی کہا جائے تو شاید بالکل غلط نہ ہو) کے مقام ٹانڈہ میں ایک مسلم نسواں اسکول ہے۔ ۱۹۷۶ء میں اس اسکول سے چار مسلم لڑکیاں آٹھویں کلاس کے امتحان میں شریک ہوئی تھیں۔ ٹانڈہ میں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی ہے اور (خدا جھوٹ نہ بلوائے تو) وہاں یہی ایک مسلم لڑکیوں کا جونیئر ہائی اسکول تھا۔ لہٰذا اس اسکول میں آٹھویں کلاس کی سطح پر صرف چار مسلم لڑکیوں کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہی سمجھیے۔

پھر کیا ہوا؟ اگلے سال یعنی ۱۹۷۷ء میں اسی سطح پر مسلم لڑکیوں کی تعداد آٹھ ہوگئی یعنی ڈبل ("ہندو کو ڈبل" تو آپ نے سنا ہوگا۔ "مسلمانوں کو ڈبل" کم ہی سننے میں آتا ہے) اس کے اگلے سال تعداد تیرہ ہوئی اور پھر انیس ہوگئی۔ گویا ۱۹۷۹ء تک تعداد چار سے بڑھ کر انیس ہوگئی۔ یوں سمجھیے پانچ گنی۔ یعنی تین سال میں تین سو پچھتر فیصد اضافہ ہوا۔

▽ سکریٹری مسلم گرلز ایجوکیشن کمیٹی۔

اور اس کے بعد؟

لیکن فلکِ ناہنجار کو (جی ہاں مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن یہی منحوس تو ہے) شاید مسلمانوں کی یہ ترقی نہ بھائی۔ ۱۹۸۰ء میں مسلم لڑکیوں کی تعداد گھٹ کر صرف نو عدد رہ گئی۔ یعنی پچھلے سال کی آدھی سے بھی کم۔ اب یہ قصہ بارہ سال پرانا ہے۔ اس لیے مت پوچھیے کہ یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا! بس جو ہوا سو ہوا۔ بہرحال خوشی کی بات یہ ہے کہ ۱۹۸۱ء میں تعداد پھر بڑھ کر تیرہ ہو گئی۔ اس کے اگلے سال اٹھائیس۔ یعنی ڈبل سے زیادہ۔ اس کے بعد تینتیس (۳۳)، بیالیس، انچاس، پچپن اور ۱۹۸۷ء میں تعداد ستاسی عدد ہو گئی۔ ۱۹۷۶ء سے لے کر ۱۹۸۷ء تک گیارہ سال میں تعداد چار سے بڑھ کر ۸۷ ہو جانے کا مطلب ہے کہ پورے بائیس (۲۲) گنی ہو گئی۔ یہ اضافہ دو ہزار پچہتر فیصد ہے۔

پھر دھکا لگا

مگر ۱۹۸۸ء میں تعداد گھٹ کر صرف سڑسٹھ رہ گئی اور ۱۹۸۹ء میں مزید گھٹ کر باسٹھ رہ گئی۔ یعنی دو سال تک اس موقر اسکول میں آٹھویں کلاس کی سطح پر مسلم لڑکیاں آگے بڑھنے کی بجائے الٹی پیچھے کی طرف گئیں۔ بھئی ہم کو تو شوق ہے ہی ایسے موقعوں پر پوچھ بیٹھنے کا کہ "ارے یہ کیا ہوا؟" لہٰذا ۱۹۸۸ء کا نتیجہ آتے ہی ہم پوچھ بیٹھے۔ جواب آیا کہ "انشاء اللہ اب آئندہ تعداد زیادہ رہے گی۔" لیکن اگلے سال ذرا سی اور کم تھی۔ صرف باسٹھ عدد۔ پھر لکھا کہ عزیز بھائیو اور بہنو! اپنے موقر اسکول میں بورڈ امتحان کی سطح پر مسلم لڑکیوں کی تعداد گھٹنے کے رجحان کو روکنے اور پلٹنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ خدا کے فضل سے ۱۹۹۰ء میں تعداد پھر بڑھ کر پچانوے ہو گئی۔ اگلے سال ایک سو سترہ اور اب ۱۹۹۲ء میں ایک سو اٹھائیس (۱۲۸)۔ ۱۹۷۶ء سے لے کر ۱۹۹۲ء تک تعداد چار عدد سے بڑھ کر ایک سو اٹھائیس ہونے کا مطلب ہے کہ بتیس گنی ہو گئی۔ یہ اضافہ تین ہزار ایک سو فیصد ہے۔

ایک شاندار قدم

ساتھ ہی ساتھ اس ادارے نے ایک اور شاندار قدم آگے بڑھایا۔ یعنی یہ ہائی اسکول بن گیا۔ ۱۹۹۲ء میں اس موقر اسکول سے پہلا بیچ ہائی اسکول بورڈ امتحان میں شریک ہوا ہے جس میں باسٹھ مسلم طالبات ہیں۔ کئی مسلم گرلز ہائی اسکول جو برسوں سے قائم ہیں وہاں بھی اب تک ہائی اسکول کی سطح پر مسلم لڑکیوں کی تعداد اتنی نہیں ہو پائی ہے۔

ہم اس موقر ادارے کے ذمہ داران عہدیداران پرنسپل صاحبہ و محترمہ اساتذات اور طالبات اور ان کے والدین کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

اس اسکول کی کہانی منظر عام پر لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ دوسرے مقامات پر بھی مسلمان دیکھیں کہ ایک جگہ ایک مسلم گرلز اسکول میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کی رفتار کتنی دل خوش کن اور حوصلہ افزا ہے۔ کئی جگہ مسلم گرلز اداروں میں مسلم لڑکیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے سال بہ سال الٹی گھٹ جاتی ہے۔ جب ان اداروں کے ذمہ داران سے پوچھا جاتا ہے کہ "ایسا کیوں ہوا؟" تو وہ جھٹ تحریر فرما دیتے ہیں کہ "یہاں کے مسلمان بڑے تعلیم دشمن اور جہالت دوست ہیں۔ وہ اپنی لڑکیوں کو پڑھانا ہی نہیں چاہتے۔" وغیرہ وغیرہ

یہ عزیز بھائی اور بہنیں ٹانڈہ کے مسلم نسواں اسکول کی کامیابی کی کہانی سنیں (مطلب یہ کہ پڑھیں) تو شاید اپنے علاقے میں مسلم لڑکیوں کو تعلیم میں تیزی سے آگے لانے کی کوشش ایسی کریں جگہوں پر بھی مؤثر طور پر کی جا سکے۔

بہرحال اس ایک اسکول کے واقعات سے اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ جہاں بھی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ لگ کر جم کر مسلم لڑکیوں کو تعلیم آگے لانے کی کوشش کی جائے وہاں اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم

ے ایسی کوشش کو شاندار کامیابی عطا فرماتے ہیں۔

مسلم نسواں اسکول، ٹانڈہ

درجہ آٹھ	شریک امتحان	پاس		فرسٹ ڈویژن	
		تعداد	فی صد	تعداد	فی صد
۱۹۷۶ء	۴	۴	سو	۴	سو
۱۹۷۷ء	۸	۸	سو	۱	بارہ
۱۹۷۸ء	۱۳	۱۳	سو	۴	اکتیس
۱۹۷۹ء	۱۹	۱۹	سو	۴	اکیس
۱۹۸۰ء	۹	۹	سو	-	صفر
۱۹۸۱ء	۱۳	۹	انہتر	۱	آٹھ
۱۹۸۲ء	۲۸	۲۸	سو	۲۵	نواسی
۱۹۸۳ء	۳۲	۳۲	سو	۳۱	ستانوے
۱۹۸۴ء	۴۲	۳۹	ترانوے	۵	بارہ
۱۹۸۵ء	۴۹	۴۹	سو	۴۰	بیاسی
۱۹۸۶ء	۵۵	۵۵	سو	۴۶	چھیاسی
۱۹۸۷ء	۸۷	۸۷	سو	۵۰	ستاون
۱۹۸۸ء	۶۷	۶۷	سو	۵۷	پچاسی
۱۹۸۹ء	۶۲	۶۲	سو	۲۷	چوالیس
۱۹۹۰ء	۹۵	۹۴	ننانوے	۳۳	پینتیس
۱۹۹۱ء	۱۱۷	۱۱۲	چھیانوے	۴۳	سینتیس
۱۹۹۲ء	۱۲۸	۱۲۶	اٹھانوے	۴۲	چونتیس

تہذیب الاخلاق کی ایجنسیاں

۱۔ میسرز بک ایمپوریم
سبزی باغ۔ پٹنہ، بہار

۲ میسرز محمد الیاس۔ نیوز پیپر ایجنٹ
۱۹ سالو ٹولہ اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ مغربی بنگال۔

۳۔ میسرز مکتبہ معارف الاسلام
ریاض الدین امیر محمد۔ جمعیت کالونی
روم نمبر ۶۸۔ ۴ نظام پورہ
بھیونڈی۔ تھانے

۴۔ میسرز آزاد کتاب گھر
ساکشی بازار۔ جمشید پور۔ بہار

5 میسرز طالب حسین
ایف ڈی ہائیر سکنڈری اسکول
کاٹھ دروازہ۔ مرادآباد۔ یوپی

۶۔ میسرز صدیق اختر انصاری۔ اردو نیوز پیپر ایجنٹ
فالٹی پورا۔ کامپٹی۔ مہاراشٹر

۷۔ میسرز احمد حسین
جمال بک ڈپو، باری روڈ۔ گیا۔ بہار

۸۔ میسرز مکتبہ جامعہ لمٹیڈ
پرنسز بلڈنگ، ای۔ آر روڈ۔ بمبئی۔ مہاراشٹر

۹۔ میسرز مکتبہ عمر۔ بک سیلرز اینڈ نیوز پیپر
مدینہ مسجد کمپلکس
میناکشی سرکل۔ بیجاپور۔

۱۰ میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ بغیہ۔ فیروز آباد۔ یو۔پی

۱۱ میسرز ثنائی بک ڈپو
پرانا قلعہ۔ سیوان۔ بہار

۱۲۔ میسرز ایجوکیشنل بک ہاوس
شمشاد مارکیٹ،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ یو۔پی

۱۳۔ میسرز انوار بک ڈپو
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۱۴ میسرز کتاب سینٹر
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۵۔ میسرز فردوسی کتاب گھر
بک سیلرس اینڈ پبلشرز۔
بجوپیا پورک۔ دھرواد۔

۱۶- میسرز عبدالقیوم
اردو لائبریری۔ تحصیل گیٹ۔
گھنٹہ گھر۔ بدایوں۔ یو۔پی

۱۷- میسرز اسلامک بک سینٹر
جامعہ کمپلکس۔ ایم۔آر۔روڈ۔ بنگلور۔

۱۸- میسرز کتاب محل
تکیہ۔ اعظم گڑھ۔ یو۔پی

۱۹- میسرز محمد شمع۔
معرفت خورشید بک اسٹال
پارنوادہ۔ رانچی روڈ۔ نوادا۔ بہار

۲۰- میسرز کریسنٹ بک
اردو بازار۔ دربھنگہ۔ بہار

۲۱- میسرز مکتبہ اسلامی
عقب بنے میاں کی درگاہ۔ شاہ گنج۔ اورنگ آباد

۲۲- میسرز راشد حمیدی
محلہ محل سرائے۔ دھام پور۔ بجنور۔

۲۳- میسرز مسٹر آر۔ڈی۔کے
معرفت۔ اے ڈبلیو خاں۔ چارج مین۔ کیو لے ای
دہیکل فیکٹری۔ جبل پور۔ مدھیہ پردیش

۲۴- میسرز آزاد بک ڈپو۔
مین روڈ۔ مدھوبنی۔ بہار

۲۵ میسرز اسلامیہ بک ڈپو
بک سیلرز اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ
نیو مارکیٹ۔ تاتارپور چوک۔ بھاگل پور سٹی۔

۲۶ میسرز النور بک ایجنسی
مکان نمبر ا۔ ۱۱۔ ۱۱۷-
مستان پورا۔ ناندیڑ۔ مہاراشٹر

۲۷- میسرز ایم ایچ بک سیلر
ہول سیلر اور پبلشر
سمر گنج۔ دربھنگہ۔

۲۸- میسرز صابری کتاب گھر
صابری محل امینیہ۔ شاہ آباد
گلبرگہ۔ کرناٹک

۲۹ میسرز ریان الحسن۔ ایجوکیشنل سوسائٹی
اسلام پورہ۔ عادل آباد۔ مدھیہ پردیش۔

۳۰- میسرز سینٹرل نیوز ایجنسی۔ پرائیویٹ لمیٹڈ
پوسٹ بکس نمبر ۲۷۴۳۔ نئی دہلی۔

۳۱ میسرز ظہیر الدین صدیقی
۷۔ ناظم صاحب اسٹریٹ۔ بدھوارا۔ بھوپال۔

۳۲- میسرز سی او ایم وہاب شمسی۔
بیرا بھون۔ سی پی ای آفس۔ گودلے۔ پیلہ۔

۳۳- میسرز سلطان بک ڈپو۔
ڈیزائن اینڈ پورٹریٹ۔ ایم۔ای اسکول۔ گیا بہار

داخلہ نوٹس

برائے اے۔ ایم۔ یو۔ اسکولز

سال ۹۴-۱۹۹۳ء کے لیے مندرجہ ذیل درجات میں تحریری و تقریری امتحانات کی بنیاد پر داخلے کے لیے مستحق امیدواروں کی طرف سے درخواستیں مطلوب ہیں جو مقررہ فارم پر وصول کی جائیں گی۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے:

درجات و اسکول جن میں داخلے کیے جائیں گے

۱۔ ایس۔ ٹی۔ ہائی اسکول (منٹو سرکل) صرف طلبا کے لیے

درجہ اوّل: ——— اردو اور انگریزی میڈیم میں

درجہ ششم: ——— انگریزی میڈیم
اردو میڈیم ——— محدود نشستیں

درجہ نہم: ——— انگریزی میڈیم
اردو میڈیم ——— محدود نشستیں

۲۔ گرلز ہائی اسکول۔ صرف طالبات کے لیے

درجہ اوّل: ——— اردو اور انگریزی میڈیم

درجہ ششم: ——— انگریزی اور اردو میڈیم

درجہ نہم: ——— انگریزی میڈیم

۳۔ سٹی ہائی اسکول۔ صرف طلبا کے لیے

درجہ ششم: ——— اردو، انگریزی اور ہندی میڈیم

درجہ نہم: ——— اردو، انگریزی اور ہندی میڈیم (محدود نشستیں)

۴۔ اے۔ ایم۔ یو سٹی برانچ مڈل اسکول

درجہ اوّل: ——— اردو میڈیم (برائے طلباء و طالبات)

درجہ ششم: ——— اردو میڈیم (صرف برائے طالبات)

داخلہ فارم معہ پراس پیکٹس متعلقہ اسکولوں سے پندرہ روپے نقد ادا کرنے کے بعد ۲۰ مارچ ۹۳ء سے اسکول کے اوقات میں حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ درخواستیں جمع کرنے کی آخری تاریخ ۲۰ اپریل ۹۳ء ہے۔

مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۹۳ء — مینیجرس، اے ایم۔ یو۔ اسکولز

شمارہ ۴

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۲

اپریل ۹۳ء

زر سالانہ :

انڈیا ... Rs. 45.00

بیرونی ممالک ... US $ 20.00 ایشیائی ممالک

عام ممالک US $ 5.00

* بانی

سرسید احمد خاںؒ

* سرپرست :

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

* مدیر

کبیر احمد جائسی

* نائب مدیر :

احمد مجتبیٰ قریشی

* انچارج سرکولیشن :

شفیق احمد

* تزئین : سرفراز

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,

TAHZIBUL AKHLAQ &

NISHANT,

ALIGARH MUSLIM

UNIVERSITY,

ALIGARH. 202002.

PHONE : 24627

مندرجات

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات، اے ایم یو علی گڑھ۔ پریس: اے ایم یو پریس علی گڑھ

اداریہ

بابری مسجد کے واقعۂ انہدام پر مسلمانوں کا ردِّ عمل مختلف انداز سے سامنے آرہا ہے ایک نوع کا ردِّ عمل تو یہ ہے کہ مسجد شہید ہو چکی ہے اس کا بدل ملنا ممکن نہیں ہے۔ اگر ٹھیک اسی جگہ پر جہاں ۶ دسمبر ۹۲ء تک مسجد واقع تھی دوسری مسجد بنا دی جائے تب بھی وہ "بابری مسجد" نہ ہوگی ایک نئی مسجد ہوگی اس لیے بابری مسجد کے لیے فوراً نوحہ و ماتم کو بند کرکے دوسرے "مقامات آہ و فغاں" کی طرف متوجہ ہوا جائے اور "ایک "نشیمن" کے اجڑنے کا کوئی غم نہ کیا جائے اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کی کوشش میں مسلسل مصروف رہا جائے کہ اب کوئی اور نشیمن نہ اجڑنے پائے۔ یہ مثبت اندازِ فکر مسلمانوں کے ایک خاص طبقے میں ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ عوامی جلسوں میں مقررین نے اسی اندازِ فکر کی ترجمانی کرنی شروع کر دی ہے۔ مراسلہ نگار حضرات کے مراسلے مختلف اخبارات میں برابر شائع ہو رہے ہیں۔ بہت سے ادیبوں نے اس اندازِ فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے مقالے تحریر کیے ہیں جو ملک کے مختلف علمی و ادبی رسالوں میں آج تک شائع ہو رہے ہیں اسی کے پہلو بہ پہلو ایک دوسرا اندازِ فکر بھی مسلمانوں کے ایک طبقے میں پیدا ہو گیا ہے جو ہمارے نزدیک نہ صرف غیر دانشمندانہ ہے بلکہ پوری کی پوری قوم کی ہمتوں کو پست کر دینے بلکہ قعرِ مذلت میں ڈھکیلنے والا ہے۔ یہ اندازِ فکر ان گم نام خطوں میں ظاہر ہو رہا ہے جو ادارۂ تہذیب الاخلاق کو برابر موصول ہو رہے ہیں۔ ان مراسلہ نگاروں میں اتنی بھی اخلاقی جرأت نہیں ہے کہ وہ اپنے نام کو ظاہر کر دیں ہم کو اب تک جو خطوط موصول ہوئے ہیں ان کا لبِّ لباب یہ ہے کہ "نہ تو خدا کی خدائی کی کوئی حقیقت ہے نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی، نہ مسلمان خیر الامت ہیں اور نہ ہی تائید اور نصرتِ الٰہی ان کے ساتھ ہے۔ اگر مذکورہ بالا باتیں حقیقت ہوتیں تو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اجودھیا میں جو واقعہ پیش آیا اور جس طرح اللہ کا گھر چشمِ زدن میں اللہ کو نہ ماننے والوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا، یہ سب کچھ نہ ہوتا مسجد اپنی جگہ برقرار رہتی اور مسلمانوں کے سروں پر تائید و نصرتِ الٰہی کا علم سایہ فگن ہوتا اور مخالفوں کی ساری کوشش ناکام ہو جاتیں۔"

ہمارے لیے اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ گم نام مراسلہ نگار ذہنی مریض ہیں یا کسی سیاسی اور مذہبی پارٹی کے ایجنٹ ہیں جو مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے کرائے پر حاصل کیے گئے ہیں یا اس کم علم طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی فکری کجی کی وجہ سے قلت معلومات کے باوجود خود کو زہد میں بایزید بسطامی، فقہ میں امام ابوحنیفہ اور مدنیات میں ابن خلدون کا ہم سر سمجھتا ہے اور اپنے پندار باطل کا اسیر ہوکر نہ صرف خود گمراہ ہوتا ہے بلکہ اپنے جیسے کج فکروں کو بھی مزید گمراہ کیے بغیر نہیں رہتا۔ اگر یہ مراسلہ نگار حضرات "غیروں" کے لیے کام کر رہے ہیں تو اُن کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان گم نام مراسلوں کے ذریعے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش سمندر کے دھارے کو تنکوں سے پھیر دینے کی کوشش کے مترادف ہے۔ اس سعیِ لاحاصل سے نہ تو مسلمان اللہ سے برگشتہ ہوگا اور نہ ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کرے گا۔ اگر یہ گم نام مراسلہ نگار حضرات ذہنی مریض ہیں تو ملت اسلامیہ کو دانش مندی کے ساتھ ان کے علاج کا انتظام کرنا چاہیے اور ان کو یہ محسوس نہ ہونے دینا چاہیے کہ ان کا علاج ہو رہا ہے کیونکہ کوئی فاتر العقل، کوئی دیوانہ کوئی مجنوں یہ ماننے کے لیے مطلق آمادہ نہیں ہوتا کہ وہ فاتر العقل یا دیوانہ ہے اور اگر ایسا بھی نہیں ہے تو ملت اسلامیہ کو ایسے کج فکروں سے مزید ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان اپنی تنوع پسندی اور دل میں چھپے ہوئے کبر و غرور کی وجہ سے بھی اس طرح کے شوشے چھوڑ کر مسرور ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اکثر طبائع ایسا کرتے بھی رہتے ہیں۔ کج فکری کا جواب کج فکری نہیں بلکہ مثبت اور راست فکر کو عام کرنا ہوا کرتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب تک امت مسلمہ اس ذہنی جھٹکے کے اثر سے آزاد نہیں ہوسکی ہے جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اسے لگا تھا لیکن اگر ہم کو اس دنیا میں سربلند و سرخرو ہوکر رہنا ہے تو اب اس جھٹکے کو فراموش کر دینا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا جس سے ہم اس قابل ہوسکیں گے کہ اپنا ایک لائحۂ عمل مرتب کر کے اس کے مطابق زندگی کے سفر میں اپنا اگلا قدم اٹھائیں اور اس بات کے لیے کوشاں ہو جائیں کہ اب ۶ دسمبر ۹۲ء کی طرح کا کوئی دوسرا جھٹکا ہندوستان میں آباد امت مسلمہ کو نہ لگنے پائے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ جلد ۱۲ ۔ شمارہ ۴ ۔ (اپریل ۱۹۹۳ء)

آزمائش کی گھڑی

سید حامد ∇

جتنی فکر مسلمان اپنے مستقبل کی اس وقت کر رہے ہیں اتنی فکر انھوں نے پہلے کبھی نہیں کی ۔ اس فکر میں ملک کے روشن خیال عناصر مسلمانوں کے شریک ہیں لیکن ابھی تک کوئی شکل ایسی نہیں نکلی جو ہندوستان میں مسلمانوں کی سلامتی اور خوش حالی کی طرف اشارہ کرتی ہو ۔ یہ بھی یقین نہیں کہ جو لوگ اس وقت ساتھ دے رہے ہیں وہ آگے چل کر سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے پلٹ نہ جائیں ۔ اس وقت انصاف پسند جماعتیں اور افراد مسلمانوں سے ہمدردی اس لیے کر رہے ہیں کہ ان پر مظالم کا پہاڑ توڑا گیا ہے جس نے ہندوستان کی تصویر کو بگاڑ دیا ہے ۔ جب ہمدردی اور رحم کی باڑھ اتر جائے گی تو پھر ان کا گوشۂ خاطر شاید مسلمانوں کی طرف نہ رہے، یا اس حد تک نہ رہے ۔ کانگریس کے دور میں مسلمانوں کے ساتھ (پالیسی کا اعلان کچھ بھی ہوتا رہا ہو) لگاتار ناانصافیاں اور زیادتیاں ہوتی رہیں اور وہ زوال کی منزلیں طے کرتے رہے ۔ کانگریس ان کی مائی باپ بن گئی تھی ۔ لہٰذا وہ شور نہ مچا سکے اور تغافل اور ظلم کے خلاف کوئی مؤثر احتجاج بھی نہ کر سکے ۔ ان کے بیشتر نمائندے اپنی ذاتی اغراض کا تعاقب کرتے رہے ۔ مسلمانوں پر الٹا الزام یہ آیا (جسے سنگھ سنگٹھن اب ہر آن دوہرا رہا ہے) کہ مسلمانوں کا کانگریسی سرکار لاڈ کرتی چلی آئی ہے جس کی وجہ سے اکثریت کی حلق تلخی ہو رہی ہے ۔ سنگھ کے سارے سنگھٹنوں کو بڑی مہارت حاصل ہے لفظوں کے معنی بدلنے اور حقیقت کو سر کے بل کھڑا کر دینے میں ۔ بابری مسجد کے سلسلے میں اس کی پیماں شکنیاں اور دروغ گوئیاں اور تاویلیں بظاہر کبھی نہ ٹوٹنے والا ریکارڈ بن گئی ہیں ۔ اب مسلمان کس گروہ پر بھروسہ کریں ۔ بھاجپا درپئے آزار اور ناقابل اعتبار ۔ کانگریس کا ریکارڈ سیکولرزم کے دعووں کے باوجود ایک سرے پر تعصب، دوسرے سرے پر غفلت سے داغدار ۔ جنتا دل دونیم اور ڈھلمل یقین ۔ رہ گئیں بائیں بازو کی ترقی پسند جماعتیں ۔ سیکولرزم ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے لیکن یہ پارٹیاں پسپائی کی منزلیں طے کر رہی ہیں، بڑی حد تک شہر نشیں ہو گئی ہیں ۔ مسلمانوں، مظلوم مسلمانوں کے حق میں یہ آواز بلند کرتی ہیں تو کچھ ڈھارس بندھ جاتی ہے لیکن ان ساری پارٹیوں میں کسی کی حیثیت ستون کی نہیں ہے کہ ان سے ٹیک لگائی جا سکے ۔ ناموافق محاذ کو موافق کس طرح بنایا جائے، یہ ہماری سیاسی بصیرت کی آزمائش ہے ۔

مسلمانوں کی آبادی ہندوستان کی آبادی کا ساتواں حصہ بھی نہیں ۔ تعداد کو دیکھیے تو وہ اکثریت سے

∇ سابق وائس چانسلر ۔ اے ۔ ایم ۔ یو علی گڑھ

نہیں لے سکتے۔ تعلیمی، اقتصادی اور سماجی حالت کو دیکھیے وہ بہت بچھڑے ہوئے۔ فسادوں کے دوران پولس اکثر مظلوم مسلمانوں کے خلاف اور ظالموں کے موافق صف آرا ہو جاتی ہے۔ ان کی سلامتی اور عافیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ پھر کس طرح وہ جان مال آبرو کی حفاظت کریں۔ حکومت بار بار حفاظت کا اعلان کرتی ہے اور تدبیریں بھی۔ کبھی سنجیدگی، کبھی نیم دلی کے ساتھ۔ لیکن فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ زیادہ سنگین اور طویل ہوتا جاتا ہے۔ عداوت اور شقاوت بڑھ رہی ہے۔ وہ دور بھی گزر گیا جب مسجد کے سامنے باجہ بلوے کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اکثریت کا مذہبی تعصب ایودھیا، سورت اور بمبئی کے ساتھ اپنے عروج اور آدھکتم وسعت کو پہنچ گیا ہے۔ فساد اب منصوبہ بند طریقے سے کرائے جا رہے ہیں۔ لوگوں کے کانوں میں زہر بھر دیا گیا ہے، ذہن مسموم ہو گئے ہیں۔ وبا نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ظلم نے پشیمانی سے ناطہ توڑ کر فخر کے ساتھ جوڑ لیا ہے۔ جو لوگ ڈنکے کی چوٹ پر مسلمانوں کے خلاف آگ لگا دینے والے بھاشن دیتے پھرتے ہیں، ان کی چیرہ دستیاں کو قانون سہمے ہوئے دیکھتا رہتا ہے، سنتا رہتا ہے اور دم سادھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب وہ لوگ جن پر ظلم ہو رہا ہے فریاد کریں تو کس سے؟ سرکار پر سے اعتماد اٹھ جائے تو انجام بھیانک ہو سکتا ہے۔ ظالموں کی بڑھتی ہوئی شقاوت اور منصوبے کی کوکھ سے جنمے ہوئے سلسلہ بند فسادات اور پولس کی ظلم نوازی، چشم پوشی یا ناکارہ پن۔ ان سب کا مقابلہ ایک ایسی ملت کو کرنا ہے جس میں تنظیم نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں اور جسے حسد، بے عملی، بے اثاری اور نا اتفاقی نے اپنے بے درد شکنجے میں کس لیا ہے کتنی بڑی آزمائش ہے یہ، ہم پر کتنا برا وقت پڑا ہے۔

افرادی طاقت کے اجزاے ترکیبی تین ہوتے ہیں تعلیم، صحت، یقین۔ تعلیم سے مدت ہوئی ہم نے منھ پھیر لیا۔ کوئی اجنبی بھی جو ہمیں دیکھے گا، پہلی نظر میں سمجھ لے گا کہ نہ ہمارے اوقات و اطوار، نہ ہماری غذا، نہ ہمارا طرز زندگی، نہ ہمارا ماحول ہمیں تندرست رکھ سکتا ہے بہت ہمت کر کے ہم میں سے کچھ لوگ گھنی اور گندی بستیوں سے نکلتے ہیں تو بلووں کے دوران اغیار کی نگہ التفات کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ یقین کا جہاں تک تعلق ہے اس نے بہت دنوں سے ہمارا ساتھ چھوڑ رکھا ہے۔ یقین اللہ کی نصرت، اپنے مسلک اور مقصد اور اپنی اجتماعی صلاحیت اور روشن مستقبل پر۔ ہم میں سے زیادہ تر نے ظواہر مذاہب کو مدنظر بنا لیا ہے۔ اس کی دل کو گرما دینے والی روح سے ہمارا کوئی سروکار نہیں رہا۔ ہمارے اندر اس یقین، اعتماد اور افتخار کی کمی ہے جو اقوام کو سرگرم عمل کرتے ہیں اور جن کے بازووں پر معرکے سر کیے جاتے ہیں۔

تعلیم کی طرف واپس آیے تو اُس تغافل سے بھی زیادہ تشویش ناک جو ہم نے اس کے تئیں روا رکھا ہے وہ وضع اور سطح ہے جس پر ہمیں تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے اپنے انگریزی اسکول خانہ جنگی کو تعلیم کا اصل اصول سمجھتے ہیں۔ معیار کو درد سر سمجھ کر انھوں نے طاق پر بٹھا دیا ہے اور تعداد پر قناعت کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ کیف کی کمی کم سے پوری کی جاتی ہے۔

ریاستی سرکاریں، خصوصاً اترپردیش بھارت میں ہمارے اسکولوں کو تسلیم کرنے میں تاخیر کو ڈھال بنا لیتی ہیں۔ سرکاری اسکول کھولتے وقت ہماری آبادیوں کی طرف سے نظر ہٹا لیتی ہیں۔ جو لوگ تعلیم کے لیے تنظیم اور ترتیب کے ساتھ کام کرنا چاہیں انھیں سرکار یہ بتا کر ہی نہیں دیتی کہ مسلمانوں کی تعلیمی کیفیت کہاں کہاں کیا ہے۔ رجسٹرار جنرل کو شاید ہدایت کی گئی ہے کہ خبردار مردم شماری

کے دوران مسلمانوں کی تعلیمی حیثیت کے بارے میں جو آنکڑے جمع کیے گئے ہیں، اس کی آہٹ بھی انھیں نہ ملنے دو۔ یہ ردہ مسلمانوں کی تعلیمی کیفیت پر ڈالنا تھا، اس لیے تعلیم کے فرقہ وارانہ اعداد و شمار داخل دفتر کر دیے گئے۔ خبر ہی نہیں ہوگی تو شکایت کیسے کریں گے۔ آنکھیں بند رہیں گی تو منھ بھی نہ کھل پائے گا۔ دینی تعلیم کا حال اور ابتر ہے یہ تو داد دیجیے ان لوگوں کو جو ذرائع کی حوصلہ ربا کمی کے باوصف مکتبوں اور مدرسوں کو کسی طرح چلا رہے ہیں۔ ان کا نصاب دیکھیے تو احساس ہوگا کہ دنیا سے بے خبر رکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور دین کی تعلیم اس انداز سے دی جاتی ہے کہ دین کی روح ہاتھ نہیں آتی۔ ان مدارس کے فارغین جو دنیا کے حالات اور دوسرے مذاہب سے ناآشنا ہیں دعوت کا کام کیسے انجام دیں گے اور روزمرہ کی زندگی میں دوسروں کے لیے مثال کیسے بنیں گے۔ پڑھانے کے طریقے میں بھی مدت دراز سے کسی تبدیلی کی جسارت نہیں کی گئی۔ علم دراصل ناقابل تقسیم ہے۔ طریق تدریس نے عالم گیر تجربات کے سلسلے میں جو ترقیاں کی ہیں ان کو نظر انداز کرنے کے بعد کیا ہم علم کو پہنچانے کا حق ادا کر سکتے ہیں؟

علوم کے دائرے میں گزشتہ پچھتر برسوں میں ایسا زبردست انقلاب آیا ہے جسے دسپھوٹ یا ایکس پوژن کیا جاتا ہے۔ جو کوئی اس دسپھوٹ سے ہم رفتار نہ ہو سکے گا وہ اس کی زد میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

مسلمان جو تعلیم میں اس قدر پیادہ رو ہیں۔ اگر اب بھی اپنی پسماندگی کا کفارہ کمر کس کے ادا نہیں کرتے تو کارواں کے پاوں تلے روندے جائیں گے۔ اتنی بڑی قیامت جو اُن پر حال ہی میں گزری ہے۔ اس کے دو مثبت جواب تھے: تعلیم اور تنظیم؛ دونوں میں سے کسی میں حرکت کے آثار نہیں دکھائی دیتے ہم

اس بڑی آزمائش میں وہ کیوں کر پورے اُتریں گے

مسلمانوں کی اعلا تعلیم کا اندازہ لگانا ہو تو ان کی اعلےٰ تعلیم گاہوں کے احاطوں میں گھوم کر دیکھیے۔ کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر، خواہ اساتذہ ہوں خواہ طالب علم، صرف کیمپس کی بابت بات کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ باتیں بھی اکثر غیبت، حسد، سازش یا استہزا کے انداز میں۔ ملک میں یا دنیا یا علوم کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے ان کی بلا جانے۔ ہمارے طالب علموں کا، اچھے طالب علموں کا انداز، ان کی فکری اُٹھان، یہ ہوتی ہے کہ جو ادارہ تعلیم دے رہا ہے، نوکری بھی وہی دے گا۔ علی گڑھ پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ریویو کمیٹی نے داخلی نسل کشی (ان بریڈنگ) کی تہمت رکھی تھی جس کا جواب آج تک کسی سے بن نہیں پڑا۔ علم طالب علموں کے (طالب علموں کے، کیوں کہیے، طالب علم رہنماؤں کے) یہ لچھن ہیں کہ انھیں ہنگامہ برپا کرنے اور تعلیمی سال کو برباد کرنے کے لیے بہانہ چاہیے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں طالب علموں نے بغیر کسی جواز کے، غلط باتیں پھیلا کر اور غلط نتائج نکال کر اپنے پرو وائس چانسلر کے خلاف الزام و دشنام اور تشدد کی ایک مہم چلا دی۔ چار مہینے کے قریب برباد ہو گئے، دنیا کی نگاہوں میں جامعہ ملیہ اور اسلام کی تصویر بگڑی۔ اس کے بعد انتہائی غیر اسلامی شعار اختیار کرتے ہوئے اپنے استاد (پرو وائس چانسلر) کو زد و کوب کیا اب وہ اپنے گھر سے پرو وائس چانسلری کر رہے ہیں جامعہ آنے میں انھیں اپنی جان کا خطرہ ہے۔ حساب لگایئے نقصان کتنا اور کس کا ہوا۔

ہماری ان یونیورسٹیوں کا ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ ہنگامہ انگیزی کو ہمارے باتدبیر وزیروں کی طرف سے شہ ملتی رہی ہے کہ ان کی دکان اسی طرح چلتی ہے

جہاں تجزیہ اقتدار پارٹی ساتھ نہیں دیتی وہاں دوسری پارٹیاں اکھاڑے میں کود پڑتی ہیں۔ نقصان صرف طالب علموں کا ہوتا ہے لیکن اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے علما اور دوسرے غیر سیاسی اکابرین بھی ایسے تخریب کار طالب علموں اور ان کی جامعہ دشمن تحریکوں کی مذمت نہیں کرتے۔ وجہ دو میں سے ایک ہو سکتی ہے: اطلاع کی کمی یا جراُت کی کمی۔ دونوں میں سے کوئی قابلِ معافی نہیں۔ ہمارے ملّی ضمیر کو ان امور پر بھی بیدار ہونا چاہیے جن کا تعلق ذہن کی تربیت، شخصیت کی تشکیل اور دنیا میں کامیابی سے ہے۔

قوموں اور جماعتوں اور ملتوں کو بنانے میں صحت اور مہم جوئی کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ اس طرف بھی اب ایک عرصے سے ہماری نظر صرف اچٹتی ہوئی پڑتی ہے۔ صحت مند ذہن کا ٹھکانا صحت مند شخصیت میں ہوتا ہے۔

الغرض بڑی شدید ضرورت ہے ہمیں اپنے نقطۂ نظر اطوار و عادات، مشاغل اور ردّ عمل کو بدلنے کی۔ بڑی بڑی مصیبتیں سوئی ہوئی صلاحیتوں کو مہمیز کرتی ہیں۔ جو مصیبت ہم پر دسمبر ۹۲ء اور جنوری ۹۳ء میں پڑی وہ ماضی میں اپنی تیاریوں اور مستقبل میں اپنے امکانات کے لحاظ سے اتنی سنگین ہے کہ اس سے زیادہ بھیانک مصیبت تصور میں نہیں آتی۔ اس نے ہمارے اطمینان و سکون کو برہم تو کر دیا، ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے لیکن ہماری فکر مندی نے عمل کی شکل ابھی تک اختیار نہیں کی۔ آزمائش کی اس گھڑی نے ہمیں جہد ساماں نہیں پایا۔ مصیبت جو آزمائش اپنے ساتھ لائی ہے ان میں پورا اترنے کی کوئی قابلِ لحاظ کوشش ہنوز نظر میں نہیں آتی۔

اتنے حشر خیز سانحے کے بعد ہم سے یہ بھی نہ ہوا کہ مل بیٹھتے اور اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے جس نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے، اپنی بہترین صلاحیتوں اور اپنی اعلا ترین انفرادی طاقت کو بروئے کار لے آتے۔ یہ سوچنا بھی مناسب نہ ہوگا کہ پرسنل لا بورڈ اور ملّی کونسل کے اراکین، ہر چند محترم ہونے کے باوجود، اس طوفان کو پیچھے دھکیل سکیں گے جو منھ کھولے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اندر کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے اور اگر اتفاق سے کوئی ایسا شخص پیدا بھی ہو جائے تو اس وقت جو مزاج ہمارا ہے ہم اس کی قیادت کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ لہٰذا ضرورت اجتماعی، پُر اخلاص، دور اندیش اور ہمہ گیر قیادت کی ہے ہمارے یہاں علمائے کرام کے علاوہ جن کی عالمی اور عصری بصیرت بالعموم بہت محدود ہے، عصری علوم کے ماہرین ہیں، یونیورسٹیوں کے بعض ممتاز اور دردمند پروفیسر ہیں؛ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت، عملی سوجھ بوجھ اور طرز ارتباط کے سہارے، تجارت، صنعت، ملازمت ڈاکٹری، وکالت، زراعت اور دوسرے پیشوں میں امتیاز حاصل کیا ہے اور وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے ملک کے بعض علاقوں میں تعلیم اور فلاح کے قابل قدر کام انجام دیے ہیں۔ ملّی قیادت میں، اجتماعی ملی قیادت میں، ان سب کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ ان سب کو ایک ساتھ بیٹھ کر سارے امور پر پیوست کنندہ غور و خوض کرنا چاہیے۔ ڈر ہے کہ یہ موقع اگر ہاتھ سے جانے دیا گیا تو پھر شاید موقع ہی نہ ملے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان ملک اور بالخصوص اکثریت کے تعلق سے اپنے نقطۂ نظر اور تعلقات کو از سرِ نو کس نہج پر ڈھالیں گے۔ یہ وقت چھوٹی موٹی تدبیروں اور ٹھوک پیٹ کا نہیں ہے۔ یہ وقت انتہائی اہم، انقلاب آور، دور رس اور ملت ساز اور عہد آفریں فیصلے کرنے کا ہے۔ ان فیصلوں کو بافہم سوجھ بوجھ اور جراُت درکار ہوگی۔ پرسنل لا بورڈ نے بہت کام کیا ہے اور اس نے فی الجملہ اعتدال اور توازن

کا رُخ اختیار کر رکھا ہے لیکن یہ بات بہرحال کچھ انوکھی سی لگتی ہے کہ ملت کی ہمہ گیر قیادت اس بورڈ کی تحویل میں ہو جو پرسنل لا کے تحفظ کے لیے وجود میں لایا گیا ہو۔ یہ وقت مسلمانوں کی آزمائش کا ہے، کیا وہ اپنی تمام ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں اور اپنی افرادی طاقت کو بروے کار لاسکتے ہیں یا نہیں۔

اور بروے کار لانے کا مفہوم صرف رہنما خطوط فراہم کر دینا نہیں ہے بلکہ اپنی مثال اور ایک بے لاگ مثال جد و جہد سے مسلمانوں کو تعمیر، تنظیم، تعلیم، فلاح اور اصلاح کے لیے سرگرمِ عمل کر دینا بھی ہے۔ ہم میں سے چند اہلِ فکر، مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ ہتھیار ڈال دو، اکثریت کی انتہا پسندی اور اس کی برہنہ جارحیت کے آگے کندھے ڈال دو۔ انھیں دوسروں کا یہ مشورہ بھی گراں گزرتا ہے کہ ملت خود کو مضبوط کرے۔ ایک حد تک اپنے تحفظ کا انتظام بھی کرے۔ طاقت کی منطق کا انھیں احساس ہی نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ضعیفی سے بڑا اس عالم اسباب میں کوئی جرم ہی نہیں۔ زندگی میں توصلہ اعتماد اور زندہ دلی کی محوری اہمیت ان حضرات کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ انھیں معلوم ہی نہیں کہ:

غارت گرِ گلزار ہیں جو پھونک رہے ہیں
کانوں میں گل و لالہ کے مرجھانے کی باتیں

شاعر نے کہا ہے:

چمن میں آہ کیا جینا جو ہو بے آبرو جینا

ہم اس طرزِ استنباط اور طریقِ استدلال کو دور سے سلام کرتے ہیں جو حوصلہ، سرافرازی، عزتِ نفس اور رزو مندی اور عزائم پر ضرب لگاتا ہو۔ سوال جوش دلانے نہیں ہے۔ جوش اور ہوش دو ہم وزن لفظ ہیں۔ سانوں اور جماعتوں کو ضرورت دونوں کی پڑتی ہے۔ فرق ت ترتیب کا ہے۔ اگر جوش کو پہلے رکھا تو جب ہوش آئے گا وہ پشیمانی اور بے بسی کو ساتھ لے کر آئے گا۔ اگر ہوش کو پہلے رکھا تو جوش اس کا تابع فرمان ہو گا۔ اس کا کہنا مانے گا، اس کے کہنے پر چلے گا اور اس کے منصوبوں اور ارادوں کو اجتماعی طاقت کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔ جوش نہ ہو تو ہوش نہتا اور بے عمل رہ جاتا ہے۔ ہوش نہ ہو تو جوش کو راہ دکھانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بے سمت اور بے عناں ہو جاتا ہے۔ ضرورت ایسی سیادت کی ہے جو ہوش کی راہ پر جوش کو چلا سکے، جو فکر کو اجتماعی عمل کا روپ دے سکے۔ فی الحال تو دینی اور عصری مفکرین و مخلصین مل کر ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔ اگر ایک نے دوسرے کو اور دونوں نے اس خطرناک گھڑی کی اہمیت کو نظرانداز کیا تو کام بن چکا۔

بپایانِ گفتگو میں ایک بات اور دہرا دی جائے مسلمان اقلیتوں، پسماندوں اور کمزوروں سے ناطہ جوڑ لیں تو اقلیت اکثریت اور اکثریت اقلیت میں بدل جائے۔ یہ بات سامنے کی دیوار پر لکھی ہوئی ہے، اسے پڑھنے کے لیے چشم بینا چاہیے۔ آزمائش کی گھڑی پکار پکار کر کہہ رہی ہے ع

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

ہماری تدبیرِ منزل یعنی انتظام خانہ داری ایسا ابتر و خراب ہے جس میں نہایت درجہ کی اصلاح و ترقی کی حاجت ہے۔

سر سید احمد

ڈاکٹر ہادی حسن

جلیل احمد قدوائی ▽

میں ان کا شاگرد کبھی نہیں رہا۔ مگر ۱۹۲۶ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد جب سجاد حیدر صاحب نے اپنی مہربانی سے مجھے لکھنؤ سے بہ اصرار بلا کر دفتر رجسٹرار میں ملازمت دلا دی تو میری اور ہادی حسن صاحب کی دوستی ہوگئی۔ وہ دوستی کرنے میں پیش قدمی کرتے تھے اور اس معاملے میں چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ کرتے تھے۔ فریق ثانی کا انھیں پسند آجانا خواہ مخواہ ہی سہی شرط تھی اور بس۔ ان کے لیے کسی کو اپنا دوست بنانا کچھ مشکل نہ تھا وہ بلا کے حسین تھے اور ایک ناقابل بیان خوبصورت بلکہ بے پناہ مسکراہٹ سے جو اُن کے شفاف اور سفید موتیوں کی طرح دانتوں کی چمک ہر طرف بکھیر دیتی، جسے دیکھ لیتے وہ اسی وقت ہمیشہ کے لیے ان کا ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہی نہ تھی اُن کے منہ سے پھول بھی جھڑتے تھے۔

علی گڑھ میں اساتذہ اپنے خالی گھنٹے زیادہ تر دو جگہ گزارتے تھے۔ یا تو لٹن لائبریری میں بشیر الدین، اسسٹنٹ لائبریرین، کے پاس یا یونیورسٹی کے دفاتر میں کسی کے پاس، اپنے ذاتی کام سے۔ میری اور ڈاکٹر ہادی حسن کی ملاقات شاید ان کے کسی کام ہی کے سلسلے میں ہوگئی جب وہ سجاد صاحب یا اسسٹنٹ رجسٹرار ابوالحسن مرحوم، بیرسٹر ایٹ لا کے پاس آکر بیٹھتے تھے۔

باکمال اور مستند فارسی داں بلکہ اہل زبان ڈاکٹر ہادی حسن، نواب محسن الملک کے برادر زادہ تھے۔ سرخ و سفید، نرم و نازک، شمشاد قد، شیروانی اور چوڑی دار پاجامے نیز سوٹ دونوں ہی لباس ان پر خوب کھلتے تھے۔ فیس لینز لگاتے اور سیاہی مائل قدرے سخت قالب کی لانبی ترکی ٹوپی داہنی طرف ذرا جھکی ہوئی اوڑھتے تھے۔ جس کا پھندنا چلنے میں ہلتا رہتا تھا۔ مخاطب کی کمر میں اپنا داہنا ہاتھ ڈال کر جانی جانی کہہ کر بات کرتے تھے۔ جو کوئی ان کے پاس تردد اور پریشانی کی حالت میں جاتا شاداں و فرحاں واپس آتا۔ میرے اس شعر کا مصداق ہے

لائے ہیں ساتھ دولت صبر و قرار دل
پلٹے ہیں آپ کے در جنت نشاں سے ہم

جس کا ساتھ دیتے آنکھ بند کر کے اس کے ساتھ ہو جاتے کوئی ان کے دوست کے خلاف انھیں بھڑکا نہیں سکتا تھا۔ اپنے دوست کی ہمیشہ تعریف ہی کرتے۔ پسندیدہ طلباء کو سرٹیفکیٹ دیتے تو توصیف میں قلم توڑ دیتے۔

▽ سی ۵، کوزی ہومس، سر شاہ محمد سلیمان روڈ، گلشن اقبال، کراچی

ں میری تقریری سے قبل میری امید و بیم کی کیفیتوں کو دیکھ کر
ے جوش کے ساتھ تسلی دیتے۔ اپنے اس انداز میں جو
یں پر ختم ہوتا "جانی یہ جگہ تمہارے ہی لیے نکالی گئی ہے۔ جیسے
نی تم اس جگہ پر مقرر ہونے ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے" وغیرہ
ڈاکٹر صاحب ابتدا میں کچھ عرصے نباتیات کے استاد
ہے بعد میں فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے
اُن کی لائن تھی۔ "ایرانی جہاز رانی کی تاریخ" ۔ The
History of Persian Navigat ان کی ڈاکٹریٹ کے مقالہ
موضوع تھا۔ ان کا انگریزی زبان میں یہ مقالہ بڑے سائز
) ایک ضخیم کتاب کی شکل میں آرٹ پیپر پر اور باتصویر شائع
ا تھا۔ فردوسی کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر یونیورسٹی کی طرف
ے ایران گئے تھے اور وہاں اپنی قابلیت کا لوہا منوا کر اور
بنے حسن تقریر کے جھنڈے گاڑ کر واپس آئے تھے مگر
ا قابلیت سے قطعی بے خبر تھے۔ غرور اُن میں نام کو بھی نہیں
ھا۔ ایران سے واپسی پر انھوں نے اسٹریچی ہال میں ایک
ام تہران میں اپنی کارگزاری اور فردوسی کے یادگاری
ن پر نہایت شاندار فی البدیہہ تقریر کی تھی۔ ہال کھچا کھچ
را ہوا تھا۔ تقریر کے خاتمے پر مجمع نے اُن سے اپنی محبت
، اظہار میں لفظاً ہلّہ بول دیا تھا اور نہ جانے کتنوں نے
ہ کے خوب بوسے لیے۔ وہ ہنس ہنس کر اپنے گال پیش
تے رہے۔ ہال سے باہر نکلنے پر کسی نے پوچھا کہ اپنی تقریر
، بارے میں خود ان کی کیا رائے تھی تو مسکراتے ہوئے
ں شہادت کی انگلی سے انگریزی "زیرو" (صفر) کی شکل
ہوا میں ایک چھوٹا سا دائرہ بنایا جس کا مطلب تھا کہ ایک
ول اور بے معنی سی تقریر! واضح ہو کہ انھیں انگریزی اور
رسی دونوں زبانوں میں اہل زبان کی سی تقریر کرنے کا
لکہ حاصل تھا اور ان کی تقریر یکے بعد دیگرے دونوں زبانوں
ں ہوتی تھی۔
ان کی بیگم کشور جہاں بیگم جن کے نام ڈاکٹر صاحب
نے اپنی ڈاکٹریٹ کا مطبوعہ مقالہ معنون کیا تھا۔ صورت شکل
میں ان سے بالکل مختلف تھیں مگر حسن اخلاق میں ان سے
کم نہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک سنگین علالت پر موصوفہ
نے ان کی بے لوث خدمت کی تھی جس کی بنا پر دل دے
بیٹھے اور ہمیشہ کے لیے انھیں اپنے آغوش میں لے لیا
ابتدائی ایجاب و قبول کی شان بھی خوب تھی۔ ڈاکٹر صاحب
نے فرمایا: "آپ مجھ سے کیا لینا پسند کریں گی؟" ڈاکٹر
صاحب نے ان کی خاطر اپنے سارے خاندان سے قطع تعلق
کر لیا تھا۔ تعلیم کے اوقات کے علاوہ گھر ہو یا باہر دونوں
اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ میں
صاحب باغ کے صدر دروازہ پر واقع دو مکانوں میں سے
ایک میں رہتا تھا۔ دوسرے مکان میں حکیم عبداللطیف
(جھوائی ٹولہ، لکھنو والے، بعد میں شفاء الملک اور پرنسپل
طبیہ کالج ہوئے) قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان
کی بیگم، صاحب باغ کے باہر والی سڑک پر منٹو سرکل جاتے
ہوئے چوراہے پر جعفر منزل میں مقیم تھے۔ اپنی زندگی کے
چند بہترین ایام ان کے ساتھ گزرے جن کی یاد آج تک
دل سے نہیں جاتی۔

دونوں میاں بیوی شام کو چراغ جلے چہل قدمی کو نکلتے
صاحب باغ کی طرف آتے ہوئے میرے مکان پر مجھے آواز
دیتے یا میں جعفر منزل چلا جاتا تو دونوں کے ساتھ سیر کو
جاتا یا صاحب باغ والی سڑک ہی پر ہماری چہل قدمی ہوتی
صاحب باغ کے دروازے کے بالکل سامنے سڑک کی
دوسری طرف خواجہ غلام السیدین کی نو تعمیر کوٹھی تھی جس
کے سامنے سرسبز لان پر وہ اپنے ہوالی موالی کے ساتھ بیٹھے
ہوتے تھے۔ کبھی وہاں چلا جاتا جس کا سا تذکرہ میں سیدین
صاحب والے مضمون میں کر چکا ہوں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے
ساتھ ہوتا تو سڑک ہی پر ٹہلتا۔ ان کی بیگم صاحبہ پردہ نہیں
کرتی تھیں۔ وہ ساڑھی باندھتی تھیں مگر اسے ٹخنوں سے

کچھ اوپر اٹھاتی تھیں۔ یہ ایک نیا فیشن ان دنوں نکلا تھا جو زیادہ دن نہیں چلا۔ پھر ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت تک پردہ کا سخت رواج تھا۔ صرف بمبئی میں طیب جی کے خاندان میں یا پنجاب میں سر محمد شفیع کے گھر سے جو حکومت ہند کے ممبر تھے، پردہ اٹھ گیا تھا۔ علی گڑھ میں تین گھر تھے جہاں کی خواتین میں پردہ کا رواج نہ تھا مگر یہ "نیم دروں نیم بروں" قسم کی بے پردگی تھی۔ میاں محمد شریف پروفیسر فلسفہ (جو میاں شفیع ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے) ڈاکٹر ہادی حسن اور سجاد صاحب۔ ان گھروں کی خواتین باہر نکلتی تھیں مگر چوری چھپے۔ شام کے بعد تاروں کی چھاؤں میں۔ آپس ہی کے مردوں سے ان کے یا اپنے گھروں میں ملتی تھیں، دن کے وقت برسرعام نہیں نکلتی تھیں۔ اکبر نے ایسی ہی بے پردگی کے بارے میں کہا تھا ؎

اٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون ساحق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری ہمسایہ کی خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

میری اس وقت تک شادی نہیں ہوئی تھی اور بیگم ہادی حسن اور مسز شریف کے گھروں میں میرا آزادی سے آنا جانا تھا۔ موخرالذکر اور ان کی دو بیٹیاں جو بعد میں علی الترتیب بیگم خواجہ حسین اور بیگم میاں افتخار الدین ہوئیں میری بڑی عزت کرتی تھیں۔ ہاں نذر سجاد مجھ سے پردہ کرتی تھیں جو بعد میں سجاد صاحب کے علی گڑھ سے بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر واپس جانے پر ہردوئی (اودھ) میں اٹھا جہاں میں اپنے ایک عزیز کے پاس گیا تھا اور دونوں میاں بیوی تبھی وہیں تھے کہتی تھیں علی گڑھ میں نہ جانے کیوں سمجھتی تھی کہ آپ میرے سامنے آنا پسند نہیں کریں گے۔ پھر تو انھوں نے بعد میں امی کی جگہ لے لی۔ سجاد صاحب تو باپ سے بڑھ کر ہو ہی چکے تھے۔

علی گڑھ میں پروفیسر اور مسز شریف نے میری شادی کے بعد ہم دونوں کی بڑی پرتکلف دعوت کی تھی اور میری بیوی کا پردہ ترک کرا دیا تھا۔

حواشی

لہ میں نے علی گڑھ سے بی اے اس سال کے موسم سرما کے اختتام پر پاس کر کے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور کہیں لکھ چکا ہوں کہ والد صاحب کو ان کے مسلسل شدید دمے کے مرض کی وجہ سے سرکاری ملازمت سے قبل از وقت پنشن دلا دی تھی اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کے ساتھ ان کی مالی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ نیز ان سے قریب بھی رہنا چاہتا تھا۔ میرے سابق وطن اناؤ اور لکھنؤ کے درمیان کم و بیش چالیس میل کا فاصلہ تھا۔ قانون کی تعلیم شام کو ہوتی تھی۔ میں نے دن کے وقت ماہنامہ "اسانظر" میں بہ حیثیت شریک مدیر ملازمت کر لی تھی۔ سجاد صاحب کو جن کے میرے ساتھ مربیانہ تعلقات بہت پہلے سے قائم ہو چکے تھے۔ یہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھے لکھا کہ مالی انتظام تو علی گڑھ میں خود ان کے دفتر سے میرے متعلق ہو جانے کے بعد بھی ممکن تھا اور میرا لکھنؤ میں قیام کسی طرح پسند نہ کیا

چنانچہ میں علی گڑھ واپس چلا آیا اور ایسا کہ پھر ۱۹۳۶ء تک وہیں کا ہو رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی ناقابلیت کی وجہ سے ایل ایل بی نہ کر سکا۔ سجاد صاحب کو علی گڑھ میں میری موجودگی شاید اس لیے بھی پسند تھی کہ میں اور خواجہ منظور حسین میرے سینیئر، ہم عصر اور دوست ان کے مضامین اور ترجموں کی املا کرتے تھے۔ ویسے سجاد صاحب نے (سر راس مسعود کی طرح جن کا ذکر حاشیہ نمبر ۸ میں آئے گا) جب میں علی گڑھ سے الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۱ء میں اردو میں ایم۔اے کرنے گیا تھا (یہ امتحان میں نے ۱۹۳۳ء میں اوّل درجہ میں پاس کیا) میری مالی امداد کی تھی۔ اگرچہ وہ علی گڑھ سے جا چکے تھے۔ ان پر مفصل مضمون لکھنے کی تمنا برس ہا برس سے میرے دل میں ہے۔ اے کاش مرنے سے پہلے پوری ہو جائے۔ یہی دقت سر راس مسعود پر مضمون لکھنے میں پیش آئی تھی۔ اُن کے الطافِ بے پایاں سے دل اس قدر متاثر تھا کہ جب لکھنے بیٹھتا قلم ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ ان کی وفات، ۱۹۳۷ء کے سالہا سال بعد پاکستان میں (غالباً ۱۹۶۴ء میں) کس قدر مشکل سے اُن پر بُرا بھلا اظہارِ خیال کر سکا۔ (یہ مضمون بعنوان "ایک دل نواز محسن"، میرے مجموعہ "مرقع مسعود" شائع کردہ راس مسعود سوسائٹی کے اردو حصہ میں شامل ہے۔

۵۲ لیب بوائے سے ترقی کر کے اس عہدے پر پہنچے تھے۔ بعد میں لائبریرین ہوئے۔ پہلے آنریری لائبریرین یونیورسٹی کا کوئی سینیئر پروفیسر ہوا کرتا تھا اور ہادی حسن صاحب بھی آنریری لائبریرین رہ چکے تھے بشیرالدین "بشیر کالیے" کے لقب سے مشہور تھے۔ اس لیے کہ بہت کالے تھے۔ مگر اس قدر صاف ستھرے اور خوش وضع و خوش پوشاک بلکہ جامہ زیب تھے کہ ان کی طرف دل کھنچتا تھا۔ ادبیات کے بڑے شوقین تھے اور پھر کم و بیش ہر علم پر نئی اور پرانی کتابوں سے وافر واقفیت تھی۔ نیز ان کے حوالوں پر عبور تھا۔ چنانچہ ضرورت مند طلبا ہی نہیں بشرطِ خواہش و ضرورت اساتذہ تک بھی ان سے استفادہ کرتے تھے۔ انھوں نے میرے اور خواجہ منظور کے ساتھ غالباً چند روسی افسانوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا ع

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

۵۳ ان کے ہر وقت تازہ استری کیے ہوئے انگریزی لباس کی وجہ سے اس میں شکنیں نہ پڑنے کی کوشش میں وہ کم و بیش سارا وقت بیٹھتے بھی ایک خاص انداز میں تھے۔ لوگ موصوف کو لارڈ ڈبلکس کہتے تھے۔ لارڈ کچز کے انداز کی خوب گھنی سیاہ اور پورے ہونٹوں کو ڈھانک لینے والی مونچھیں تھیں مراد آباد کے رہنے والے تھے مگر دیسی میں انھیں چھو بھی نہیں گیا تھا۔

۵۴ بے شک انھیں یہ معلوم تھا کہ سر راس مسعود نے علی گڑھ کے وائس چانسلر فنڈ سے (جو شاید تمام یونیورسٹیوں میں اس نام کا اور اپنے کام کے اعتبار سے پیلا نٹ تھا اور راس کے تصرف کے تنہا وہی مختار و مجاز تھے۔ اس لیے کہ وہی اپنے دوستوں سے لڑ جھگڑ کر بلکہ فرماتے تھے اُن کی جیبوں سے زبردستی نکال کر روپیہ لاتے)۔ الہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔اے اُردو کی تعلیم کے لیے مجھے روپیہ دیا تھا۔ یہ بھی پہلا بلکہ شاید تنہا واقعہ تھا کہ ایک یونیورسٹی کے فنڈ سے کسی دوسری یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی طالب علم کی مالی امداد کی گئی [illegible]

کورٹ کے بعض ارکان کی صلواتیں بھی سننی پڑی تھیں۔

۵ "جعفر منزل" خان بہادر سید جعفر حسین صاحب ہمارے میجر جنرل سید شاہد خاں ریٹائرڈ کے نامور دادا، رُڑکی (یوپی) کے فارغ التحصیل کی کوٹھی تھی جو انھوں نے علی گڑھ کی محبت میں یونیورسٹی کو نذر کردی تھی۔ موصوف سرسید کے خاص الخاص دوستوں میں تھے۔ تعمیر کے فن میں انھیں ایسا درک حاصل تھا کہ اول الذکر کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ اس زمانے کی عمارتیں تو تمام کی تمام سرسید کی خواہش کے مطابق موصوف کی نگرانی میں تعمیر ہوئیں۔ ایک خاص وضع کے بزرگ تھے اور علی گڑھ کے اس قدیم حلقہ سے متعلق تھے جس کے ارکان وہاں کے عرف عام میں مائی لارڈز کہے جاتے تھے۔ راقم الحروف نے انھیں اولڈ بوائز کے سالانہ جلسہ میں دیکھا تھا ؏

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ (میرؔ)

۶ ملاحظہ ہو میرا مجموعہ مضامین "چند اکابر چند معاصر"

اور وہ جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کا مار ڈالنا خدا نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے، مگر جائز طریق پر (یعنی حکم شریعت کے مطابق) اور بدکاری نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا، قیامت کے دن اس کو دونا عذاب ہوگا اور ذلت و خواری سے اس میں ہمیشہ رہے گا مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو خدا نیکیوں سے بدل دے گا اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے"

(سپارہ ۱۹)

مسلم قیادت ـــــ حال اور مستقبل

محمد یٰسین ▽

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علامہ اقبال کا یہ شعر قیادت و امامت کے اعلیٰ ترین معیاروں کا مظہر ہے۔ سچائی، انصاف پسندی اور جرأت مندی سرمثالی قاید کی امتیازی خصوصیات ہیں اور اگر یہ خوبیاں کسی قوم میں یکجا ہو جائیں تو وہ "دنیا کی امامت" کرسکتی ہے۔ ہمارا موضوع ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت تک محدود ہے۔ لہٰذا ہم عالمی سطح پر قوموں کی رہنمائی کے ماورائی تصور سے صرف نظر کرکے اپنے ملک کے پس منظر میں ہی اس مسئلہ کے چند پہلوؤں پر اظہار خیال کریں گے۔

آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، معاشی، مذہبی و معاشرتی مسایل نہ صرف پیچیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ اگر یہ کہا جائے کہ باہمی نا اتفاقی، ذہنی جمود، نفسیاتی انتشار اور فسطائی یلغار کے باعث پوری ملت مایوسی، شکست خوردگی اور احساس کمتری کا شکار ہے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ بابری مسجد کی شہادت نے جہاں مرکزی و ریاستی حکومت، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ، انتظامیہ اور پولس کی قلعی کھول دی۔ وہیں مسلم قیادت کو بھی بُری طرح بے نقاب کردیا۔ ایکشن کمیٹی کے مقاصد اپنی جگہ درست سہی لیکن لائحۂ عمل میں جذباتیت، ناعاقبت اندیشی، باہمی اختلاف اور حکومتِ وقت پر ضرورت سے زیادہ انحصار و اعتماد نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ منظم اور منصوبہ بند طور پر لاکھوں کارسیوکوں نے مسجد کو مسمار کردیا مگر پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے نام نہاد مسلمان ممبروں نے استعفیٰ تو درکنار اجتماعی طور پر احتجاج کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ عام مسلمان کو شکایت رہی کہ ہمارے لیڈروں نے نہ تو ملّی اتحاد و تنظیم کی پرخلوص کوشش کی، نہ حکومتِ وقت سے مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے اور نہ فسادات سے نپٹنے کے لیے کوئی لائحۂ عمل تیار کیا۔ اتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کے باوجود حماقتوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ ۲۶ جنوری کو یوم جمہوریہ کا بائیکاٹ، کالے جھنڈے لہرانے کی تحریک اور بابری مسجد کے ملبہ پر نماز کے لیے نمائشی جلوس کی قیادت وہ معرکۃ الآرا اقدامات ہیں جن کا خمیازہ ہمیں

▽ پروفیسر شعبۂ انگریزی - اے ایم یو علی گڑھ

بہت دنوں تک بھگتنا ہے۔

ملک میں ہماری آبادی پندرہ کروڑ کے قریب ہے۔ جمہوری سیکولر اور سوشلسٹ جمہوریہ ہند کے آئین نے ہمیں جان و مال کے تحفظ، مذہب و کلچر کی آزادی، مادری زبان میں تعلیم، حق رائے دہندگی اور تلاش معاش کی یقین دہانی کی ہے۔ اس کے باوجود گزشتہ دہائیوں کے تجربوں اور حالیہ فسادات کی بربریت اور شدت دیکھ کر اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا ہے۔ اگر ہم موجودہ صورت حال کا معروضی جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ آزادی کے فوراً بعد تاریخی و سیاسی عوامل کی کارفرمائیوں کے نتیجے میں قومی اتحاد کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ تقسیم ہند کی ذمّہ داری مسلم لیگ کے علاوہ کانگریس اور برطانوی حکومت پر بھی ہے۔ آج بھی مسلمانوں کی موجودہ نسل کو ہدف ملامت بنایا جاتا ہے۔ تقسیم ملک کے سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ یہ بٹوارہ اکثریتی علاقوں کی بنیاد پر ہوا مذہبی بنیاد پر نہیں۔ اسی لیے ۱۹۴۷ء میں سات کروڑ مسلمان ہندوستان میں اور تقریباً ایک کروڑ ہندو پاکستان میں اقلیت کی حیثیت سے رہ گئے۔ آزادی کے بعد تقریباً چالیس سال تک کانگریس مرکز اور ریاستوں میں برسرِ اقتدار رہی لیکن نہ تو اس نے مسلمانوں کے مسایل کی طرف خاطر خواہ توجہ کی اور نہ ان کی اعلیٰ قیادت ابھرنے دی۔ پے در پے فسادات کے دوران مسلمان فرقہ پرستوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوتے رہے۔ دیہاتوں میں شکی اور چک بندی قوانین کے تحت اپنی موروثی آراضیوں سے بے دخل بھی ہوئے۔ صنعت و تجارت اور دیگر شعبوں میں امتیازی و معاندانہ رویے کی بدولت پسماندہ طبقوں میں داخل ہو گئے۔

اس صورت حال کے لیے بہت حد تک مسلم قیادت ذمّہ دار ہے۔ کیونکہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں مسلمان نمائندے پارٹی کے وفادار ضرور رہے مگر انھوں نے ملی مسایل سے بے اعتنائی برتی۔ صالح اور تعمیری قیادت سے محروم ہو کر عام مسلمان غلط پروپگنڈہ کا شکار ہوتے رہے یا جذباتیت کی رو میں بہہ کر فرقہ پرستوں کی ٹولیوں کا چارہ اور پولس کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہے۔ رفتہ رفتہ یہ حقیقت ہم پر روشن ہوتی جا رہی ہے کہ ہمارے یہاں عالموں، دانشوروں، مفکروں اور ملّت کے خادموں کی کمی نہیں ہے۔ اگر کمی ہے تو قیادت کی؛ پرخلوص قیادت کی۔

اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے ۱۸۵۷ء کی تباہ کاریوں کے بعد ہمیں سرسید جیسا عالی دماغ قاید اور باعمل مصلح قوم نصیب ہوا جس کی رہنمائی میں ہم نے ملّی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور پھر زمانے نے دیکھ لیا کہ

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر ابھرے

گزشتہ سو برسوں کے دوران مسلم قیادت، محبّان قوم علما، اور ہمدرد و روشن خیال اکابرین کے ہاتھ میں رہی ہے۔ سرسیّد کے بعد علاّمہ شبلی، ڈاکٹر اقبال اور مولانا آزاد اپنے اپنے طور پر مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکال کر باوقار زندگی جینے کی تلقین کرتے رہے۔ سرسید کا سارا زور مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح معاشرے پر تھا۔ اس نصب العین کی خاطر وہ عملی سیاست سے الگ ہو گئے۔ شبلی نیشنلسٹ مسلمان تھے۔ چنانچہ وہ اصلاحی تحریکوں کے علاوہ قومی دھارے میں بھی شریک رہے۔ شاعرِ مشرق متحدہ ہندوستان میں خودمختار ریاستوں کے وفاق اور اقلیتوں کے آئینی حقوق کے علم بردار تھے۔ مولانا آزاد قومی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے اور آزادی کے بعد جمہوری سیکولر نظام کے ستون ثابت

ہوئے۔ تقسیم ہند کے جلو میں فرقہ وارانہ فسادات سے پریشان حال مسلمانوں کی انھوں نے نہ صرف دلجوئی کی بلکہ جامع مسجد کے اپنے تاریخی خطبے میں جمہوری اور سیکولر ہندوستان میں مسلمان کو باعزت شہری زندگی کی بشارت بھی دی۔ ان کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ہمارے آخری لیڈر تھے، جنھوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ ملت کی مجاہدانہ قیادت کی۔ گزشتہ چوتھائی صدی کے دوران کچھ علاقائی اور پیشہ ور قسم کے نیتا ابھرے جن کے نزدیک اسمبلی یا پارلیمنٹ کے لیے ٹکٹ حاصل کرنا، خوشامد یا جوڑ توڑ سے وزارت میں شمولیت، اپنے اعزا و اقربا کے لیے لائسنس و پرمٹ اور ملازمت یا مالی منفعت ہی حاصل حیات رہا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مسلم لیگ کیرالا کے ایک گوشے میں محدود ہو گئی ہے اور کسی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں رہی۔ جمعیۃ العلمائے ہند کی تنظیمی حیثیت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ البتہ دینی تعلیمی مجلس اپنے خاص پروگرام کے تحت اہم تعمیری خدمت انجام دے رہی ہے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے اہم جماعت "مسلم مجلس مشاورت" رہی ہے جس سے ڈاکٹر سید محمود اور ڈاکٹر فریدی جیسے محب ملت وابستہ رہے۔ بانیان مجلس نے ۸، ۹ راگست ۱۹۶۴ء میں لکھنؤ کنونشن کے بعد جس خلوص نیت سے اس جماعت کو قائم کیا اس سے مسلمانوں کو بڑی امیدیں وابستہ ہوئیں۔ افسوس مجلس مشاورت اب وہ نیم سیاسی مردہ جماعت رہ گئی ہے جس کے جلسوں میں سستی لیڈری اور جھوٹی شان کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں سے عام مسلمان سیاسی مداریوں، مذہبی بہروپیوں اور شعلہ بیان ناعاقبت اندیش مقرروں و خطیبوں کے فریب پیہم کا شکار رہا ہے۔
مولانا اخلاق حسین قاسمی نے "مسدس حالی" کے زیر عنوان معاصر "قومی آواز" (۱۲ راگست ۱۹۹۲ء) میں مسلم قیادت کے متعلق لکھا تھا:

"مذہبی قیادت میں انتشار کا حال یہ ہے کہ ایک ادارہ، ایک پارٹی اور ایک مشرب کے علما، کبھی شوریٰ کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے بلکہ سرکاری حلقوں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

ہمارے موجودہ لیڈروں میں کچھ ایسے ہیں جو ملی قیادت پر اپنا موروثی حق سمجھتے ہیں۔ ان حضرات کے آبا و اجداد اپنی فطری صلاحیتوں اور خداداد ذہنی و روحانی توانائی کی بدولت یقیناً امامت و قیادت کے مستحق تھے لیکن وہ خود ان تمام فضیلتوں سے عاری ہونے کے باوجود ذاتی مفاد کے لیے خاندانی بیساکھی لگائے پھرتے ہیں۔ افسوس صد افسوس آج مسلم اداروں کی تقسیم کے ذمہ دار اور عوامی چندوں کی خرد برد میں ملوث اصحاب بھی ملت کی رہنمائی کے دعوے دار ہیں:

ع رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

اس طبقے کے لیڈر دینی علوم اور اسلامی تاریخ میں کچھ شدبد تو رکھتے ہیں مگر جدید سیاست، معاشیات تاریخ قانون اور دوسرے سماجی علوم سے قطعاً بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ حریفوں سے نبرد آزمائی کے لیے ان کے پاس جذباتی تقریروں اور فتووں کے علاوہ کوئی دوسرا ہتھیار نہیں ملتا۔

دوسرا طبقہ، قائدین ان ناخداؤں پر مشتمل ہے جو کسی نہ کسی یونین یا ذیلی جماعت میں سرخرو ہو کر منظر عام پر آئے اور کچھ نام نہاد بڑے لیڈروں کے لاحقے سابقے بنتے بنتے کچھ نہ کچھ ہو رہے۔ ان میں اکثر سیکولرزم کی دہائی دیتے رہتے ہیں لیکن علوم دین سے قطعاً ناواقفیت کی بنا پر مسلم نفسیات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

تیسرا طبقہ ان لیڈروں کا ہے جو ساری زندگی

"معقول گورنمنٹ" رہے یا قبل از وقت سبکدوش ہو کر ملی قیادت کے جذبے سے سرشار ہوئے۔ اس قماش کے بھی لیڈر ملی قیادت کا تاج پہننے کے لیے ہر پلیٹ فارم اور ہر جلسہ میں اپنی شرکت ملت کے لیے فال نیک سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ بڑی دشواری یہ ہے کہ وہ موقع بموقع اپنے سابقہ موقف بدلتے رہتے ہیں اور پھر بطور جواز اخباروں میں مراسلے پر مراسلہ اور مضمون پر مضمون لکھنے میں اپنی ساری توانائی صرف کرتے رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ مولانا آزاد نے ۴ راگست ۱۹۱۲ء کے "الہلال" میں عصری قیادت پر کچھ اس طرح اظہار خیال کیا تھا:

> "ہندوستانی مسلمانوں کی بدبختی یہ ہے کہ ہم میں جو گروہ آج رہنمائی کی موٹر پر سوار ہے اور جس نے لیڈری کا تخت خود ہی بچھایا ہے اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی رسم تاجپوشی ادا کی ہے، اس نے اپنی عزت و شوکت اور جاہ و نمائش کا جوا کھیلنے کے لیے اپنی ملت مظلومہ کو ایک بازیچہ بنالیا ہے اور ان میں سے جو اٹھتا ہے اسی گیند کو ایک ٹھوکر لگا کر اپنی طاقت کی نمائش کرنا چاہتا ہے۔ مسلمان بیچارے تو اپنے لیڈر کی پرستش کے لیے موجود ہیں۔"

جب آج سے تقریباً اسی سال پہلے یہ صورت حال تھی تو آج کے مادی خود غرض اور لادینی ماحول میں ملت کے نام نہاد لیڈروں کے اخلاقی زوال کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ مسلم قیادت کے اس جائزے کا مقصد کسی فرد واحد یا کسی مخصوص طبقہ یا مکتب فکر کی تضحیک یا دل آزاری نہیں۔

گر روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

عرض مدعا صرف اتنا ہے کہ ہماری لیڈر شپ ملی قیادت کے معیاروں پر پوری نہیں اتر رہی ہے۔ مسلمانوں کی رہنمائی کا حق اسی مرد مومن کو حاصل ہے جو بےغرض ہو اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر ملک و ملت کی خدمت کرے اور مستقبل کے لیے لائحۂ عمل مرتب کر کے ملت کو منزل مقصود کی طرف گامزن کرے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج ہمارے درمیان سرسید جیسا عظیم مصلح اقبال جیسا دردمند مفکر، آزاد جیسا بالغ نظر قاید یا حفظ الرحمٰن جیسا مخلص مجاہد نہیں، لیکن ان بزرگوں کے کارنامے ہمارے سامنے۔ ان کے نظریات و تصورات سے ہم آج بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

ہماری سب سے بڑی ضرورت ایک متحد اور منظم مرکزی ادارے کی ہے جو مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکے اب تک ہماری لیڈر شپ دہلی و لکھنؤ تک محدود دائرے میں کام کرتی رہی ہے لیکن ہمارے مسایل ایسے ہیں جن پر مقامی یا علاقائی سرحدوں میں محصور ہو کر غور و فکر نہیں ہو سکتا۔ کہنے کا مطلب ہے کہ ہمیں مسلم عوام تک پہنچ کر ان سے رابطہ قایم کرنا ہوگا۔ بابری مسجد کے سلسلے میں ہماری سب سے بڑی کمزوری یہی رہی کہ ہم نے یہ ساری ذمہ داری چند خود ساختہ لیڈروں پر ڈال دی جو حالات کو نہ سمجھ سکے اور نہ ان پر قابو پا سکے مسجد کی شہادت کے بعد ایک طرف ایک مذہبی رہنما اس عظیم المیے سے کوئی عبرت نہیں حاصل کر رہے ہیں اور دوسری طرف ایک دوسرے عالم دین شری اتفاق کی سابقہ تجاویز کو سیکولر رنگ دے رہے ہیں۔ مجھ گنہگار کی سمجھ میں تو بس اتنی بات آتی ہے کہ ہم مسجد کا معاملہ حکومت پر چھوڑ دیں اور اس پر اصرار نہ کریں

کہ عبادت گاہ کب، کہاں اور کیسے بنے۔ البتہ ہمیں مسجد کی زمین اوقاف اور مزارات پر اپنے قانونی حق کے لیے جدوجہد جاری رکھنا چاہیے۔

آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے کچھ مسایل دائمی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ مسایل ہیں ــــــ تعلیمی پسماندگی، معاشی بدحالی، معاشرتی زوال، سیاسی عدم تنظیم، ثقافتی تشخص اور پرسنل لا کا تحفظ۔ تعلیمی مسایل کے متعلق ادھر اخبارات و رسایل میں کافی لکھا جا چکا ہے اور سمیناروں، کانفرنسوں میں بھی اس اہم مسئلہ پر تبادلۂ خیال ہوا ہے۔ یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ جنوبی ہند میں شمالی ریاستوں کے مقابلے میں تعلیمی بیداری زیادہ ہے۔ شمالی ہند میں اگرچہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسی بین الاقوامی شہرت کی یونیورسٹیاں اور دیوبند اور ندوہ جیسے عظیم الشان دینی ادارے موجود ہیں جن سے ملّت کی کئی نسلیں فیض یاب ہو چکی ہیں لیکن اب یہ ادارے نئے چیلنجوں سے دوچار ہیں۔ دینی تعلیمی کونسل اور یو۔پی رابطہ کمیٹی کے ذریعے تعلیم کی ترویج و اشاعت کا کام بخوبی ہو رہا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس میدان میں ہماری قیادت مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں مثلاً کسانوں، مزدوروں، کاریگروں، دست کاروں اور چھوٹے دکان داروں کے گھروں میں بھی تعلیم کی روشنی پھیلانے کا انتظام کریں۔

جہاں تک معاشی مسایل اور روزگار کی سہولتوں کا تعلق ہے ہماری قیادت کا فرض ہے کہ عام تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کی تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف توجہ کریں اور کم سرمایے سے چھوٹی دست کاریوں اور صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے مہم چلائیں۔ مسلم مخالف سیاسی جماعتیں برابر الزام لگا رہی ہیں کہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی مراعات سے انھیں نوازتی رہی ہیں۔ اس حقیقت سے بھی پردہ اُٹھنا چاہیے کہ حکومت کی جاری کردہ اسکیموں سے مسلمانوں کو کتنا فائدہ پہنچا ہے ضلعی سطح پر معاشی سروے کے ذریعے حاصل کردہ اعداد و شمار سے مستقبل میں لائحۂ عمل کی تیاری میں مدد مل سکتی ہے۔

ہماری قیادت یا مرکزی تنظیم کے لیے سب سے اہم کام معاشرتی اصلاح ہے۔ آج مسلمان ان تمام بدعتوں کو فخریہ اپنانے لگے ہیں جو برادرانِ وطن کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔ جہیز کی لعنت مسلمانوں میں بڑھتی جا رہی ہے اور طلاق کی لعنت کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے۔ یہی نہیں اخباروں میں مسلمان دُلہنوں کی خودسوزی کے واقعات بھی پڑھنے کو ملے ہیں۔ معاشرتی زوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر نمایشی شان و شوکت کے لیے اسراف بے جا کے مرتکب ہو کر مسلمان اپنے بچوں کا مستقبل تاریک بنا رہے ہیں۔ شراب، جوا، قمار بازی اور دوسری لعنتیں بھی ملّت کو ہم وطنوں کے درمیان بدنام کر رہی ہیں۔

سیاسی محاذ پر بھی ہماری قیادت کا رول ناگفتہ بہ رہا ہے۔ آزادی کے بعد کچھ دنوں تک جمعیتہ العلماء کانگریس کی منظورِ نظر رہی لیکن اس جماعت کی لیڈرشپ ننگِ اسلاف ہی ثابت ہوئی۔ مسلم لیگ سے اتحاد اور اس کے لیے منطقی جواز بھی ووٹ حاصل کرنے کی سیاسی شعبدہ بازی ہے۔ کچھ لوگ جنتا دل میں شریک ہوئے مگر وہ بھی کوئی ملّی خدمت نہیں انجام دے سکے۔ اگرچہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے کسی الگ سیاسی جماعت کی گنجایش نہیں لیکن زمانے کا تقاضا ہے کہ وہ سیاسی طور پر بیدار رہیں اور سیکولر سیاسی جماعتوں سے تعاون کریں۔ سیاست سے کنارہ کشی ہمارے لیے خودکشی کے مترادف ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہماری قیادت مسلمانوں کو صحیح مشوروں سے نوازے

اور انھیں "ووٹ بینک" بننے سے روکے۔ حالیہ برسوں میں ہمارے ہی ووٹوں سے الیکشن جیتنے والے مسلمان نمائندے اپنی وفاداریاں بیچنے میں اکثریتی طبقے کے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ساتھ رہے۔ جمہوریت میں سیاسی جماعتوں کی اپنی آئیڈیالوجی اور الگ حکمت عملی ہوتی ہے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہمیں بہرحال اپنے بنیادی مسایل کو حل کرنے کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔

ہماری قومی ٹریجڈی یہ ہے کہ گزشتہ دس پندرہ برسوں میں ملک کے اندر آن فرقہ پرست اور فسطائی قوتوں کو فروغ حاصل ہوا ہے جن کے یہاں "قومیت" کا تصور اکثریتی طبقے تک محدود ہے اور جن کے مشاہیر ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب، ماضی کی شاندار روایات، قومی یک جہتی، علم وادب اور فنون لطیفہ غرض کہ ہر شعبۂ حیات میں مسلمانوں کے کارناموں کے منکر ہیں۔ احیاء پرستی کی جو جارحانہ لہر پچھلی چوتھائی صدی کے دوران ابھری ہے اس میں سرکاری ذرایع ابلاغ، قومی پریس اور ویڈیو کیسٹ کا زبردست حصّہ ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد تو گمان ہونے لگا ہے کہ ہندوستان میں پڑھے لکھوں کا ایک مخصوص طبقہ دامے، درمے، سخنے نسلی تعصب، تہذیبی تنگ نظری، مذہبی منافرت اور لسانی رجعت پسندی کو ہوا دیتے رہے ہیں۔ سیکولر جمہوری اسٹیٹ میں سرسوتی بال مندر اداروں سے معصوم ذہنوں کو پراگندہ کیا گیا ہے۔ اینٹ اور کھڑاؤں پوجا کے ذریعے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں منظم طور پر جو نفرت کے بیج بوئے گئے ہیں اس کا خمیازہ ہندوستان کو بہرحال بھگتنا ہے۔ ہمیں سنگھ پریوار کی زہریلی صحافت اور شرپسند سیاست کا سمجھ کر جواب دینا ہے۔ اگرچہ دسمبر کے افسوسناک واقعے کے بعد ملک میں روشن ضمیر اور وسیع المشرب صحافیوں نے بے باکانہ مرکزی سرکار کی کوتاہیوں اور فسطائی جماعتوں کے گھناؤنے منصوبوں کا پردہ فاش کیا ہے لیکن ہمیں ساری ذمّہ داری انھیں کے کندھوں پر نہیں ڈالنی چاہیے۔ اگر ہماری قیادت چاہے تو کسی نہ کسی مرکزی ادارے میں ذرایع ابلاغ پر نظر رکھنے کے لیے مسلم دانش وروں، صحافیوں اور مصنفوں سے مدد لے سکتی ہے۔ ہمارے یہاں ایسے لکھنے والوں کی کمی نہیں جو بی۔ این۔ اوک، گری لال جین، اڈوانی، جوشی اور سنگھل یا اس طائفہ کے لاحقوں، سابقوں کا مدلل جواب نہ دے سکیں۔

فسطائی جماعتوں نے "ہندی پردیش" (یوپی بہار، راجستھان اور مدھیہ پردیش) کو تعلیمی، سیاسی ثقافتی پروگراموں کا "کرم بھومی (میدان عمل) بنا رکھا ہے لہذا ہمیں ہندی پریس اور پلیٹ فارم سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ہماری قیادت ان بیہودہ اور بے بنیاد الزامات سے ناواقف رہی ہے جنھیں ہٹلر کے ہندوستانی پیرو گوبلز کی ہم نوائی میں سو سو دفعہ جھوٹ بول کر سچ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن کے ذہنوں میں دیومالائی اساطیر و دیگر خرافات نے جگہ پائی ہو ان سے حق گوئی کی امید ہی فضول ہے لیکن ان کے "منطقی طرز استدلال" کا ہمیں قایل ہونا پڑتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس ملک میں اول و آخر ہندو ہی ہیں لہذا "ہندوتو" کے سب سے بڑے مخالف "حریف" کا اجتماعی پوسٹ مارٹم ضروری ہے۔

۱۔ مسلمان تشدد پسند ہوتے ہیں کیونکہ ان کے معاملات قرآن وحدیث پر منحصر ہیں۔

۲۔ مسلمان ملک دشمن اور غدار ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کو چار چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے۔ لہذا ان کی بڑھتی ہوئی آبادی ہندوستان

کو دوسرا پاکستان بنا دے گی۔

۴۔ مسلمان قومی دھارے میں شریک نہیں ہونا چاہتے لہذا یونیفارم سول کوڈ کی مخالفت کرتے ہیں۔

۵۔ مرکزی اور ریاستی حکومتیں مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے ان کی منھ بھرائی کرتی رہی ہیں۔

۶۔ ہندوؤں میں پردہ، ستی کا رواج، بچپن کی شادی وغیرہ تمام سماجی برائیاں مسلمانوں کی آمد کے بعد شروع ہوئیں۔

۷۔ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں ہندوؤں کو ذہنی، ثقافتی اور سیاسی طور پر غلامی کے لیے مجبور کیا۔

ملاحظہ کیا آپ نے؟ یہ تو مشتے از خروارے ہے۔ جو لٹریچر ۱۹۸۰ء کے بعد منظر عام پر آیا ہے اس سے ہماری جمہوری سیکولر حکومت کو کوئی خطرہ نظر آئے یا نہ آئے ہمیں تو اس کی روشنی میں اپنی مدافعت کا سامان جلد از جلد کرنا ہوگا۔

خاکسار ملت مظلومہ کا ایک ادنیٰ اور گمنام خادم ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں میں شمالی ہند کی بیشتر یونیورسٹیوں، تعلیمی اداروں کے رابطے کے علاوہ اسے ہندوستانی نفسیات کو تاریخ کی روشنی میں سمجھنے کے مواقع ملے ہیں۔ یہ گنہگار اب قطعی طور پر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہمارے پیچیدہ مسایل نہ تو علمائے کرام ہی تنہا حل کر سکتے ہیں اور نہ جدید تعلیم یافتہ دانشور ہی۔ اب ہمیں اجتماعی قیادت (Collective Leadership) کے اصول کو اپنانا ہوگا اور اپنی مرکزی تنظیم کے تحت مختلف مدرسہ ہائے فکر کے مخلص مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ ایک دوسرے کے علم، تجربے اور فکر سے ایسی اجتماعی [illegible] ۱۹۸۰ء نومبر [illegible]

سے زیادہ اصلاحی اور فلاحی ہوگی۔ ایسی جماعت کی تشکیل میں خالی الذہن، خود غرض، ابن الوقت اور سڑک چھاپ لیڈروں کو قطعاً جگہ نہ دی جائے۔ آج کل جتنے سیمینار، کانفرنس، مذاکرے، مباحثے ہوئے ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ہمارا فورم ایک خاص نصب العین کے ساتھ کام کرے گا۔

وقت کا اہم تقاضا ہے کہ مجلس مشاورت کی خالص تعمیری و فلاحی نقطۂ نظر سے تنظیم نو کی جائے اور اس میں مسلم عالموں، دانش وروں، استادوں، وکیلوں مصنفوں، صحافیوں اور سماج سیوکوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔ آپ چاہے کوئی نام منتخب کریں، ہماری مرکزی تنظیم یا پلیٹ فارم ملی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ "مجلس مشاورت" کے ابتدائی مقاصد کا اعادہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ گاہے گاہے بازخواں این قصہ پارینہ را۔

۱۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت کی اصلاح اور انھیں "خیر امت" کے درجے پر پہنچانے کی کوشش تاکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنی زندگی بسر کر سکیں اور قومی و ملی مسایل کو حل کرنے میں اپنی حیثیت کے مطابق تعاون کر سکیں۔

۲۔ ملک میں ملکی خدمت میں معروف تمام مسلم ذیلی جماعتوں کو یکجا کرنا۔

۳۔ فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنا اور دنگوں اور بلووں کے شکار لوگوں کی امداد اور بازآبادکاری کرنا۔

۴۔ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور جماعتوں کے درمیان باہمی اتحاد اور خیر سگالی کے جذبات پیدا کرنا۔

۵۔ ہندوستانی دستور کے سیکولر کردار کو

اسباب بنانے کے لیے مختلف فرقوں اور سیاسی جماعتوں کی حمایت اور تعاون حاصل کرنا تاکہ ملک کے شہریوں کے درمیان مذہب، ذات پات اور رنگ و نسل کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہ ہو سکے۔

۶۔ مسلمانوں کو بلا خوف و خطر ملک کو درپیش مسایل کو حل کرنے کی جدوجہد میں شرکت کے لیے آمادہ کرنا۔

۷۔ حسب بالا مقاصد کے حصول کے لیے موزوں اقدامات کرنا۔

واضح رہے کہ ان مقاصد کے پیش نظر ملکی حالات اور چوتھے عام انتخابات کے موقع پر مشاورت نے اپنے اجلاس ۲۱-۲۳ جولائی ۱۹۶۶ء کو اپنا نو نکاتی "عوامی منشور" شایع کیا۔ اس کے مطابق تعلیمی و انتخابی نظام میں اصلاح سماجی بہتری، عائلی قانون کا تحفظ، مادری زبان اور اقلیتی تعلیمی اداروں کی ترقی، اقلیتی کمیشن کے قیام اور اوقات کی نگرانی کے لیے منتخب نمائندوں کی شرکت پر زور دیا گیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۸۳ء کے اجلاس کے بعد یکم مارچ ۱۹۸۳ء کو مشاورت نے مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور معاشی ترقی کے لیے رہنما خطوط متعین کیے اور قومی سطح پر تمام سرکاری و غیر سرکاری اصلاحات کی کامیابی یا ناکامی کا جائزہ پیش کرنے کی تلقین کی۔ اس لائحہ عمل (Action Plan) کے تحت فرقہ وارانہ فسادات، اقلیتی کمیشن، قومی یک جہتی کونسل، عائلی قانون، معاشی اصلاحات، روزگار، ملازمت، تعلیم و اوقاف کے مسایل کی نشان دہی کی گئی۔ اس میں کلام نہیں کہ مجلس مشاورت نے ملت کی تنظیم میں اہم کردار ادا کیا۔ قومی یک جہتی، ہندو مسلم اتحاد اور تعمیری سیاست سے مسلمانوں کی خود اعتمادی بحال ہوئی۔ ۱۹۸۶ء میں بابری مسجد کا دروازہ کیا کھلا مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش کا دور شروع ہوا۔ ایکشن کمیٹی، رابطہ کمیٹی، انصاف پارٹی اور اس نوع کے دیگر تجربوں نے ملت کے درمیان جو انتشار پیدا کیا اس کے لیے

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

۲۱، ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۲ء کے مشاورتی اجلاس میں گیارہ میں سے محض ۳ ممبران کی شرکت باہمی نا اتفاقی انتظامی نااہلی اور سیاسی چپقلش کی درد بھری داستان ہے۔

آج ہمیں صبر و استقلال سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ ملت کو درپیش خطرات کا معروضی جائزہ لے کر مثبت اور تعمیری اقدامات کی فکر کرنا چاہیے۔ آل انڈیا مسلم یوتھ کنونشن نے ملک کے نوجوانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے، حق و انصاف کی جدوجہد جاری رکھنے اور ملک کی خوشحالی کے لیے مہم شروع کی ہے۔ یہ ہمارے لیے فال نیک ہے۔ مقامی و علاقائی تنظیمیں اپنا کام کرتی ہیں لیکن مرکزی تنظیم کو فعال بنانے سے ہماری قوت بڑھ جائے گی اور ہم مسلمانوں کے بقا، بہبود اور خوش حالی کے لیے زیادہ خلوص یک جہتی اور منظم طریقے سے لائحہ عمل مرتب کر سکیں گے۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

عید الفطر کا پیغام

[یہ خطبہ عید الفطر کے موقع پر جامع مسجد مسلم یونیورسٹی میں دیا گیا]

محمد سعود عالم قاسمی ▽

عزیزانِ اسلام

عید الفطر کا یہ مبارک لمحہ دنیا کے مسلمانوں کو نیا حوصلہ، نئی امنگ، نیا عزم اور فکر و عمل کی نئی قوت بخشنے آیا ہے۔ بیتے ہوئے سال کی اذیتوں، مصیبتوں اور خونی حادثوں کا غم اٹھانا چاہتا ہے، دل و دماغ اور اعصاب سے رنج و محن کی پرچھائیاں ہٹانا چاہتا ہے اور حزن و یاس اور الم و اضمحلال کی سیاہیاں مٹانا چاہتا ہے:

ولا تہنوا و لا تحزنوا و انتم الاعلون
ان کنتم مومنین (آل عمران ۱۳۹۰)
نہ کمزوری دکھاؤ اور نہ غم کھاؤ اور تم ہی
سربلند رہوگے اگر تم مومن ہو]۔

ہر مصیبت اپنے بطن میں راحت کا سامان رکھتی ہے، ہر غم میں خوشی کا امکان مضمر ہوتا ہے اور ہر تاریکی میں روشنی کی کرن خوابیدہ ہوتی ہے:

ان مع العسر یسرا
[بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے]

اس لیے مصائب و آلام کا ماتم کب تلک، حالات کی چیرہ دستی کا شکوہ کہاں تک؟ فکر و عمل کا محور درست کرو اور سرگرم عمل ہو جاو کیوں کہ

یہاں کوتاہیٔ فکر و عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہ درست ہے کہ گزرے ہوئے سال میں بے شمار بجلیاں ہمارے آشیانوں پر گریں، یہ بھی سچ ہے کہ بار بار موجِ خوں ہمارے سروں سے گزری، یہ بھی بجا ہے کہ جان و مال کے ساتھ ہماری عزت و آبرو بھی تاراج ہوئی یہ بھی بجا ہے کہ مکانوں کے ساتھ ہماری مسجدیں بھی مسمار ہوئیں۔ یہ بھی اٹل ہے کہ مجرموں کے مقابلے میں مسلمان ہی بیشتر ابتلا و آزمائش سے دوچار ہوئے۔ یہ بھی صحیح کہ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ہمیں تنگ نظر آئی اور وضاقت علیہم الارض بما رحبت کی عملی تفسیر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ان سب کے باوجود عیدِ سعید کا پیغام یہی ہے:

ولا تایئسوا من روح اللہ انہ لا ییأس

من روح اللہ الا القوم الکفرون ؎
(یوسف - ۸۷)
[خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو کہ خدا کی رحمت سے کافر ہی ناامید ہوا کرتے ہیں]

دل بجھ گیا تو اور بڑھے گی یہ تیرگی
جلتے رہو کہ صبح درخشاں کبھی آئے گی

مسلمان مقصد حیات، نظریہ حیات اور نظام حیات رکھنے والی ایک ممتاز قوم ہے جس کی تشکیل ایمان و اسلام، تزکیہ و احسان، صدق و اخلاص، صبر و شکر، جاں بازی و جاں نثاری، امر بالمعروف و نہی عن المنکر عدالت و استقامت اور عزیمت و شہادت کے خمیر سے ہوئی ہے اس کے افراد کا تعارف دو جملوں میں کرایا جاتا ہے:

رھبان باللیل، فرسان بالنہار
[رات کے راہب اور دن کے مجاہد ہیں]

ایسے لوگوں کو ابتلاء و آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ بار بار گزرنا پڑتا ہے کہ یہی زندگی کی علامت ہے اور مقصد حیات کو حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ سنت اللہ بھی یہی ہے کہ آزمائش سے گزرے اور مطلوبہ معیار پر پورا اترے بغیر کامیابی نہیں ملتی اور اللہ کی سنت حتمی اور اٹل ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی

سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل
ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا
(الاحزاب ۶۲)
[جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان کے بارے میں بھی خدا کی سنت یہی رہی ہے اور تم خدا کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے]۔

جلیل القدر رسولوں کی تاریخ بھی یہی سبق دہراتی ہے حضرت ابراہیمؑ مراحل ابتلا سے گزرے تو خلیل اللہ بنائے گئے۔ حضرت موسیٰؑ مقامات آزمائش سے گزرے تو کلیم اللہ بنائے گئے۔ حضرت عیسیٰؑ دشت محن سے گزرے تو روح اللہ بنائے گئے۔ حضرت یوسفؑ قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے تو خزانے کی امانت اور منصب نبوت سے سرفراز ہوئے۔ محمد عربیؐ نے شعب ابی طالب اور طائف کی اذیتیں برداشت کیں تو حبیب اللہ چنے گئے اور خاتم الانبیاء بنائے گئے۔ گلشن کائنات کا دستور بھی یہی ہے کہ پھولوں کا حسن کانٹوں کے ہجوم میں نکھرتا ہے۔ ہیروں کا وجود سنگریزوں کی چوٹ کھا کر سنورتا ہے۔

تڑپے نہ اگر موج تو گوہر نہیں بنتے
ترشے نہ اگر سنگ تو پیکر نہیں بنتے

قرآن حکیم اس حقیقت کو صاف صاف بیان کرتا ہے:

الم ۝ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون ۝ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکذبین
(العنکبوت ۳)
[کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی اور جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں ہم نے ان کو بھی آزمایا تھا اور ان کو بھی آزمائیں گے تو اللہ ان کو ضرور معلوم کرے گا جو اپنے ایمان میں سچے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں]۔

آزمائش کی یہ بھٹیاں اس لیے سلگائی جاتی ہیں کہ جس میں ایمان و استقامت کا عنصر ہے وہ تپ کر کندن بن جائے اور جس کے دل میں نفاق کا شائبہ

ہے وہ کوہ بن جائے۔

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ وہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

منزل کی تڑپ، مقصد سے عشق اور نصب العین سے وابستگی راہِ حیات کی دشواریوں پر قابو پانے کا سلیقہ سکھا دیتی ہے۔

عید الفطر صبر و شکر کا خوب صورت تحفہ ہے۔ عید الفطر مومن کی زندگی کو معتدل اور مستقیم رکھنے کا اعلان ہے مومن ہر حال میں صبر و شکر کا پابند ہے۔ کیونکہ کشمکش حیات میں یہی اس کا ہتھیار ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذلک علی اللہ یسیر ہ لکیلا تاسو علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم واللہ لا یحب کل مختال فخور (الحدید۔ ۲۲،۲۳)

[کوئی مصیبت ملک پر اور خود تم پر نہیں پڑی مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں۔ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے تاکہ جو چیز تم سے فوت ہو گئی ہے اس کا غم نہ کھاؤ اور جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں]۔

صبر بزدلی کا نام نہیں، صبر خود سپردگی کا عنوان نہیں، صبر راہِ فرار نہیں، صبر ظلم سہتے رہنے کا مذہبی طریقۂ کار نہیں بلکہ صبر جلد بازی سے گریز کرنے، جذباتیت سے پرہیز کرنے، اشتعال سے دامن بچانے اور مایوسی و پژمردگی سے محفوظ رہنے کا نام ہے۔ ایمان و عمل پر جمے رہنے اور اپنے دینی موقف پر ڈٹے رہنے کا نام ہے۔ مخالفت اور خسارت کے طوفان میں حق کی ثبات پر کھڑے رہنے کا نام ہے۔ اپنا دین، اپنی تہذیب، اپنا وجود، اپنی شناخت یعنی اپنے نظامِ حیات سے ذرا بھی منہ نہ موڑنے کا پیغام ہے۔ صبر بے کاری و بے زاری، آرام طلبی و تن آسانی اور جمود و تعطل کا حریف اور عزم و ہمت اور حرکت و عمل کا رفیق ہے۔ کامیابی و کامرانی تو انہی کے قدم چومتی ہے جو تیز و تند آندھیوں میں بھی صبر کا دامن تھامے ہوئے سرگرم سفر ہوتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذلک بانھم لا یصیبھم ظمأ ولا نصب ولا مخمصۃ فی سبیل اللہ ولا یطئون موطئا یغیظ الکفار ولا ینالون من عدو نیلا الا کتب لھم بہ عمل صالح۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (التوبہ۔ ۱۲۰)

[یہ اس لیے کہ انھیں خدا کی راہ میں جو تکلیف پہنچتی ہے پیاس کی، یا محنت کی یا بھوک کی یا وہ ایسی جگہ چلتے ہیں کہ کافروں کو غصہ آئے یا دشمنوں سے کوئی گزند ان کو پہنچتا ہے تو ہر بات پر ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے۔ بے شک اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا]

صبر و شکر ہی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایسی لیڈرشپ پیدا کرے گا جو آزادی، ترقی اور نجات کی راہ پر ملت کو گامزن کرے گی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے متعلق اپنی اس سنت کا اعلان کرچکا ہے

وجعلنا منھم أئمۃ یھدون بامرنا لما صبروا وکانوا بآیاتنا یوقنون

(السجدہ ۲۴)

[اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے رہنا پیدا کر دیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے]

عید الفطر مسلمانوں کے لیے عزت و وقار، سرخروئی و سربلندی اور آزادی و امن کی بشارت ہے۔ اگر مسلمان اللہ سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑ لیں، توبہ و انابت اور اجتماعیت کے ساتھ اطاعت کا مظاہرہ کریں، ذوق جہاد اور شوق شہادت پیدا کریں تو مجبوری و محکومی کی سیاہ رات ڈھل جائے گی، کمزوری و خواری کے بادل چھٹ جائیں گے، نکبت و ادبار کا ماحول بدل جائے گا، سراسیمگی و احساس کمتری کے سائے سکڑ جائیں گے، خوف و ہراس کی کیفیت دور ہو جائے گی اور اللہ اپنا یہ وعدہ دوبارہ پورا کر دکھائے گا

وعد اللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم و لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم و لیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا و من کفر بعد ذلک فاولئک ھم الفاسقون

(النور - ۵۵)

[اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کر دے گا اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کریں ایسے ہی لوگ فاسق ہیں]

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

"اسلام کی تعلیمات کی بدولت انسان میں تہذیب و شائستگی کا ایک نیا تصور پیدا ہوا ہے اور اس نے حسن معاشرت کا ایک ایسا بلند معیار قائم کیا ہے جس سے انسان پہلے کبھی واقف نہ ہو سکا۔"

فرانسس لوئیس

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲- شمارہ ۴ (اپریل ۱۹۹۳ء)

افسردگی (ڈپریشن) معالج کی نظر میں

سہیل احمد اعظمی ▽

افسردگی یا نفسیاتی افسردگی عام طور سے سبھی طبقوں میں دکھائی دی جانے والی ایک بیماری ہے۔ معالجات کی دنیا میں سب سے زیادہ پائی جانے والی عام بیماری کو "ڈپریشن" یا افسردگی کا نام سب سے پہلے ماہر امراض دماغ ڈاکٹر امل کریلن نے دیا تھا۔ ٹائیفائیڈ اور ہائی بلڈ پریشر کی بیماری کی طرح افسردگی بھی ایک بیماری ہے معاشی نقصان، خاندان میں اچانک موت، ناکامیابی یا بلا کسی خاص وجہ کے بھی یہ بیماری پیدا ہو سکتی ہے۔

پھیلاؤ

ہمارے ملک میں یہ بیماری کسی کو بھی ہو سکتی ہے چاہے وہ امیر طبقے سے تعلق رکھتا ہو، غریب ہو، صنف نازک ہو یا مرد۔ عورتوں میں عموماً ۴ سے ۹ فی صد تک اور مردوں میں تین فی صد تک یہ بیماری پائی جاتی ہے عمر کے کسی بھی حصے میں اس بیماری کا شکار ہونے کے امکانات مردوں میں ۸ سے ۱۲ فیصد اور عورتوں میں ۲۰ سے ۲۶ فی صد تک پائے جاتے ہیں۔ لمبے عرصے تک ۱۲ سے ۲۰ فی صد لوگ اس بیماری کا شکار رہ سکتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اس بیماری سے ایک ماہ سے زیادہ عرصے سے دکھی ہوں ان میں ۱۰ فی صد میں خودکشی کا رجحان زبردست ہوتا ہے۔

علامات

یہ بیماری کسی بھی عمر میں ہو سکتی ہے مگر چالیس کے دہے میں زیادہ امکان ہوتا ہے۔ یہ بیماری اچانک بھی ہو سکتی ہے اور آہستہ آہستہ بھی۔ بیمار کو کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی۔ نیند یا تو کم ہو جاتی ہے یا پھر بہت آسکتی ہے۔

عام وزن میں کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے، اسی طرح بھوک میں کمی بھی ہو سکتی ہے اور زیادتی بھی جرم کے احساس کے ساتھ، بے یار و مددگار محسوس کرنا، رونے کی خواہش کرنا، خالی پن، جسمانی تکالیف کا احساس۔ جیسے درد کا احساس جسم میں، کمزوری اور کسی کام کے نہ کرنے کا احساس غالب رہتا ہے۔ ایسے حالات لگاتار ۱۵ دن تک بنے رہیں تو مریض ڈپریشن کا شکار کہلاتا ہے۔ بچوں میں اس بیماری کا پتہ لگانا تھوڑی مہارت، احتیاط اور غور و فکر چاہتا ہے۔ کیونکہ بچے اس بیماری کے علامات کو اچھی طرح ظاہر نہیں کر پاتے۔ چپ چاپ رہتے ہیں۔ ان کے مطالعے اور پڑھائی پر برا اثر پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے روگی جن کو یہ بیماری تین بار سے زیادہ

▽ ڈپارٹمنٹ آف سائکٹری، میڈیکل کالج۔ اے ایم یو علی گڑھ

ہوچکی ہو ان کے دوبارہ بیمار ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

علاج

اس بیماری کے پیدا ہونے میں انسانی سماج کے کردار کا بڑا حصہ ہوتا ہے جب انسان کو اعصابی یا جسمانی تناؤ کا سامنا ہو یا احساس کو چوٹ لگتی ہو تو وہ ایک حد تک تو برداشت کرتا ہے مگر جب یہ حالات برداشت کی حد پار کر جاتے ہیں تو وہ شخص اپنے کو حالات کے حوالے کر دیتا ہے اور بے یار و مددگار ہو کر جینا سیکھ جاتا ہے اور اس کے بعد حاصل ہوئے مواقع کا فائدہ نہیں اٹھا پاتا اور اس طرح ہر موقع پر حوصلہ افزائی کی کمی کا احساس افسردگی کی وجہ بن جاتا ہے۔

فرائڈ کے مطابق کسی عزیز شے کے نقصان سے جو احساسات کو چوٹ لگتی ہے اس کے ردعمل کے نتیجے میں خود کو سزا دینے کا عمل کا احساس مضبوط تر ہوتا جاتا ہے۔ نتیجتاً منفی سوچ۔ اپنے سے نفرت پچھتاوا اعتماد میں کمی اور ناامیدی پیدا ہوتی ہے اور روگی افسردگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے خاندان جن کی خاندانی پچھلی پشت میں افسردگی کا شکار کوئی فرد رہا ہو، کے افراد اس بیماری کے شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دماغ میں کیمیاوی اجزا کی نسبت میں کمی زیادتی (توازن کا بگاڑ) بھی اس بیماری کا سبب بن سکتی ہے۔

علاج

علاج کے لیے ماہر امراض دماغ یا دماغی امراض کے اسپتالوں سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ آج کے دور میں دماغی علاج کے طریقوں اور دواؤں سے اس بیماری پر فتح پائی جا سکتی ہے مگر اس میں خاندان کا تعاون انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ مریض دوران علاج اپنے ٹھیک ہونے کے سلسلے میں مشکوک رہتا ہے اور یہ افسردگی کے مریضوں میں خاص طور سے پایا جاتا ہے۔ افسردگی دور کرنے والی دوائیں یقینی طور پر اثر دکھاتی ہیں۔ ادھر کچھ برسوں میں اداسی (ڈپریشن) ختم کرنے والی دواؤں میں کافی سدھار ہوا ہے جس کے استعمال سے کیمیاوی اجزا میں توازن پھر قائم ہو جاتا ہے اور افسردگی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ۲۰ سے ۳۰ فی صد تک بیماری لمبا علاج چاہے مگر یہ ان بیماروں کے ساتھ ہوتا ہے جو دوا باقاعدگی سے نہیں کھاتے ہیں۔ ان دواؤں کا سائڈ افکٹ دیکھنے میں آیا ہے لیکن یہ کوئی خطرہ نہیں پیدا کرتا اور ٹھیک ہو جاتا ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ افسردگی کی بیماری ایک دن میں ٹھیک نہیں ہوتی ہے۔ دوا کا اثر دوسرے ہفتہ سے دکھائی دینے لگتا ہے۔ اگر دوا کا اثر ایک ماہ میں دکھائی نہیں دیتا تو اس حالت میں بجلی کے شاک کے ذریعے علاج یا دوسرے ذرائع جو مناسب ہوں، اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ دھیان رہے سدھار کے بعد بھی ۵ ماہ تک دوا مناسب مقدار میں دی جانی چاہیے۔ کیوں کہ بیماری کا حملہ چوتھے مہینہ میں دوبارہ ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لیے مریض کے خاندان کا تعاون اہم ہے اور مریض کو خود کوشش کرنا چاہیے۔ اسے اعتماد ہونا چاہیے اور کچھ کرتے رہنا چاہیے اور اپنے من کے حالات سے معالج کو مطلع کراتے رہنا چاہیے۔ مریض کو اگر صلاح لینا ہو تو سوالوں کی ایک فہرست بنا کر رکھنی چاہیے۔ دوا کے استعمال کے بارے میں کوئی مشکل ہو یا کوئی شبہ تو اس کو معالج سے بات کر کے دور کر لینا چاہیے۔ اس طرح وقت کی رفتار اور اہمیت کو سمجھ کر صحیح دواؤں کا استعمال افسردگی (ڈپریشن) کی بیماری سے چھٹکارا دلا سکتا ہے۔

قسط اوّل

جدید بینک کاری اور اسلام

محمد نظام الدین رضوی ▽

عصر حاضر کا بینک کاری نظام کچھ ایسی مرکزیت حاصل کر چکا ہے کہ آج دنیا کے تقریباً سارے ہی معاشی و اقتصادی امور اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ گویا معاشی توانائی کی فراہمی کے لحاظ سے یہ ہمارے شمسی نظام کے مشابہ ہے۔

یہ پورا نظام تین مضبوط بنیادوں پر رواں دواں ہے۔

۱۔ عوام سے مال حاصل کر کے اعلیٰ پیمانے پر تجارت۔

۲۔ عوام کو تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت وغیرہ کے لیے قرض کی فراہمی۔

۳۔ ترسیلِ زر اور امانتوں کے تحفظ کا اجارہ۔

"ترسیل زر" سے مراد ہنڈی، ڈرافٹ، اور ٹراویلنگ چیک وغیرہ کا اجرا ہے اور "امانت" سے مراد لوگوں کی قیمتی اشیا ہیں۔

۴۔ بلوں اور ہنڈیوں کے دام کی کچھ کٹوتی کے ساتھ پیشگی ادائیگی ـــــ یہ بینک کا ضمنی کاروبار ہے۔

عوام سے حاصل شدہ مال کی شرعی حیثیت

عوام کے ذریعے بینک میں جو مال جمع ہوتا ہے وہ یا تو "امانت" ہے یا "قرض" یا "مضاربت"۔

امانت کا احتمال تو اس لیے ناقابلِ اعتنا ہے کہ اس میں صرف راس المال کی واپسی ہوتی ہے اور مال ضایع یا ہلاک ہو جائے تو امین اس کا ذمہ دار نہیں ہوتا لیکن بینک اس کے برخلاف تاوان کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اصل مال پر ایک طے شدہ در سے کچھ "اضافہ" بھی دیتا ہے۔

اور اسے "مضاربت" بھی نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ مضاربت کی ایک لازمی شرط یہ ہے کہ تجارت میں خسارہ ہو تو اس کا تنہا ذمہ دار ربّ المال (سرمایہ دار) ہوتا ہے۔ مضارب (تاجر) کا اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ البتہ نفع میں دونوں کسی بھی طے شدہ فی صد یا حصّہ شایع کے حساب سے باہم شریک ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں بھی راس المال مضارب کے پاس امانت ہوتا ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ بینک کے ذریعے سرمایہ کاری میں صاحب مال خسارہ کا قطعی ذمہ دار نہیں ہوتا اور مال کے

▽ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور۔ ۲۷۶۴۰۴

نقصان کی صورت میں تاوان کا حق دار بھی ہوتا ہے ۔
لہذا بینک میں جمع شدہ مال کی شرعی حیثیت "قرض" کی ہے
کہ اس میں مثل مال کی واپسی بہرحال لازم ہوتی ہے اور
اس پر کچھ اضافہ کا معاہدہ بینکوں کی دنیا میں رائج ہے۔

قرض لینے دینے کی شرط

اسلام کے نزدیک قرض ایک قسم کا احسان یا
تبرع وصلہ ہے اس لیے وہ اسے ہر قسم کے مادی منافع سے
پاک و منزہ دیکھنا چاہتا ہے اور کسی معاہدے کی رو سے
منافع کے لین دین کو ربا و سود قرار دے کر ناجائز گردانتا ہے
یعنی اسلام کے اصول کے مطابق قرض پر مشروط نفع کا لین
دین سود ہے جو قطعی حرام و گناہ ہے۔ ہم آگے چل کر اس
مسئلے پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ اس مقام
پر صرف پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل
کرتے ہیں۔ ارشاد نبوت ہے:

کل قرض جر منفعۃ فھو ربا

(الہدایہ بحوالہ مسند حارث)

[جو قرض کی وجہ سے جو نفع حاصل کیا جائے
وہ سود ہے]

تو معاملۂ قرض کے جواز کی شرط یہ ہے کہ وہ سود کی آلودگی
سے پاک ہو۔

**مالِ قرض پر اضافہ کے جواز و عدم جواز کے متعلق
علماء کے دو گروہ:**

عام طور پر علمائے کرام نے بینک اور ارباب مال
کے باہمی لین دین کو قرض کا معاملہ گردانا ہے۔ اس کی
مختلف شکلیں ہیں۔

۱۔ میعادی جمع کھاتہ (فکسڈ ڈپازٹ)
(Fixed Deposit)
۲۔ چالو کھاتہ (کرنٹ اکاؤنٹ)
(Current Account)
۳۔ بچت کھاتہ (سیونگ بینک اکاؤنٹ)
(Saving Bank Account)
۴۔ متواتر جمع کھاتہ (کیومولیٹیو ڈپازٹ اکاؤنٹ)
Cumulative Deposit

ان تمام صورتوں میں راس المال پر تھوڑا یا زیادہ جو
کچھ بھی اضافہ قرض دہندہ کو وصول ہوتا ہے وہ اپنی ظاہری
شکل میں سود ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے علماء
کا ایک مختصر طبقہ اسے ناجائز قرار دیتا ہے۔ اس طبقے کے
خیال میں یہ اضافی رقم مطلقاً سود ہے جو کسی طرح حلال
نہیں۔

لیکن علما کا ایک بڑا طبقہ اس میں کچھ توسع کا
قایل ہے۔ وہ اسے مطلقاً سود ماننے کے لیے آمادہ
نہیں بلکہ تفصیل کا نظریہ اختیار کرتا ہے۔ اس کی وضاحت
کے لیے پہلے تین ضروری مقدمات کو ذہن نشین کیجیے

پہلا مقدمہ

دنیا میں بسنے والے انسان اسلام کی نگاہ میں
چار حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

۱۔ مسلم۔
۲۔ غیر مسلم ذمی
۳۔ غیر مسلم مستامن
۴۔ وہ غیر مسلم جو نہ ذمی ہو، نہ مستامن۔

"مسلمان" تو وہ ہے جس نے مذہب
اسلام کو قبول کیا، اس کے تمام اصول و
فروع، عقاید، عبادات و معاملات میں
اس کی پابندی کا دل و زبان سے عہد و
اعتراف کیا۔

"غیر مسلم ذمی" وہ شخص ہے جس نے اسلام
کو تو قبول نہیں کیا لیکن سلطان اسلام
سے اجازت حاصل کر کے دستوری معاہدے

کے ساتھ اسلامی حکومت میں اس نے مستقل
سکونت اختیار کرلی یعنی وہیں کا باشندہ ہوگیا۔
"غیر مسلم مستامن" یہ بھی ایک طرح کا
ذمی ہی ہے، فرق یہ ہے کہ اس کا قیام
اسلامی حکومت میں محض عارضی ہوتا ہے
جیسے آج کے زمانے میں کسی بھی غیر ملک میں
ویزا (Visa) لے کر جانے والے کا
قیام عارضی ہوتا ہے۔

"وہ غیر مسلم جو نہ ذمی ہو، نہ مستامن"
اس کی تعریف اس کے نام سے ظاہر ہے بالفاظِ
دیگر یہ وہ شخص ہے جو سلطان اسلام سے
کوئی دستوری معاہدہ کیے بغیر دارالاسلام
میں عارضی یا مستقل رہائش پذیر ہو، یا
غیر دارالاسلام کا باشندہ ہو۔

ذمی اور مستامن چوں کہ اپنی رضا و خوشی سے سلطان
اسلام سے دستوری معاہدہ کرکے اسلامی حکومت میں
مستقل یا عارضی رہائش اختیار کرتے ہیں اور اس معاہدے
میں ان پر کوئی جبر و زور نہیں ہوتا اس لیے دیوانی کے
معاملات اور تعزیرات میں ان کا حکم ٹھیک وہی ہے جو
مسلمانوں کا ہے۔ لہذا جو معاملات مسلمانوں کے درمیان
باہم حرام و گناہ ہوں گے وہ تمام تر معاملات مسلمان اور
غیر مسلم ذمی و مستامن کے درمیان بھی حرام و گناہ قرار
پائیں گے۔ قانون اسلام کی بڑی معتمد و مستند کتاب
الھدایہ میں ان کے احکام ان الفاظ میں درج ہیں:

واھل الذمۃ فی البیاعات کالمسلمین
لقولہ علیہ السلام فی ذلک الحدیث
فاعلمھم ان لھم ما للمسلمین و
علیھم ما علی المسلمین۔
ولانھم مکلفون محتاجون
کالمسلمین الا فی الخمر والخنزیر خاصۃ
فان عقدھم علی الخمر کعقد المسلمین
علی العصیر وعقدھم علی الخنزیر
کعقد المسلم علی الشاۃ لانھا اموال
فی اعتقادھم ونحن امرنا بان نترکھم و
ما یعتقدون (الہدایہ ص ۸۶ ج ۳ مسایل منثورہ)

ت غیر مسلم ذمی (و مستامن) خرید و فروخت
(وغیرہ) کے معاملات میں مسلمانوں کی طرح
ہیں اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا:
"انھیں بتادو کہ جو معاملات مسلمانوں کے
لیے حلال ہیں وہ ان کے لیے بھی حلال ہیں
اور جو معاملات مسلمانوں پر حرام ہیں وہ ان
پر بھی حرام ہیں"۔

اور اس لیے بھی کہ وہ بھی مسلمانوں
کی طرح سے مکلف و حاجت مند ہیں۔ البتہ
خاص طور پر شراب و خنزیر کے سلسلے میں ان
کا حکم مسلمانوں سے الگ تھلگ ہے کیونکہ
ان کے نزدیک شراب کی خرید و فروخت
مسلمانوں کے شیرۂ انگور کی خرید و فروخت
کی طرح ہے اور ان کے یہاں خنزیر کی خرید و
فروخت مسلمان کے بکری خریدنے اور بیچنے
کی طرح ہے کیونکہ شراب و خنزیر ان کے مذہب و
اعتقاد میں مال ہیں اور شریعت اسلامی نے
ہمیں حکم دیا ہے کہ انھیں ان کے عقیدے و
مذہب پر آزاد چھوڑ دیں۔

اور جس غیر مسلم نے سلطان اسلام سے کوئی دستوری
معاہدہ نہیں کیا اس پر عبادات کی طرح سے دیوانی کے معاملات
میں بھی اسلامی قانون کا اطلاق نہ ہوگا اور ایسے اس بات

کو مکمل آزادی حاصل ہوگی کہ اپنے تمام مال واسباب میں اپنے مذہب کے مطابق جیسے چاہے تصرف کرے کہ جب اس نے مذہب اسلام کو قبول نہیں کیا اور کسی دائرہ میں بھی اس نے اسلامی اصولوں سے کوئی مصالحت نہیں کی تو اسلامی اصول کی پابندی اس کے ذمہ کیوں عاید ہوگی؟

دوسرا مقدمہ

قرآن وحدیث کے مطالعے سے یہ امر واضح ہو کر سامنے آتا ہے کہ اسلامی اصولوں کے مطابق سود صرف مسلم اور ذمی ومستامن کے مال میں ہی متحقق ہوگا۔

مسلم کے مال میں تو اس لیے سود متحقق ہوگا کہ وہ اسلام کا پیرو ہے اور اسلامی احکام کا مخاطب ہے لہذا اسلام کا قانونِ "سود" اس کے مال میں جاری ہوگا۔

اور ذمی ومستامن کے مال میں اس لیے یہ قانون جاری ہوگا کہ انھوں نے اس باب میں خوش دلی سے اسلامی اصولوں کے ماننے کا عہد کیا ہے۔

لیکن جو غیر مسلم ذمی، یا مستامن نہیں وہ نہ تو اسلامی احکام کا مخاطب ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں اس کا کوئی رضاکارانہ معاہدہ ہے، لہذا اس کے مال میں شرعی اصطلاح کا سود متحقق نہ ہوگا۔ تاکہ یہ نہ ہو کہ اسلام نے ان پر اپنے "پرسنل لا" کا کوئی حکم جاری کیا یا ان کے فکر واعتقاد یا مذہبی آزادی میں کوئی رخنہ اندازی کی۔ اس کا بیان حدیث پاک میں بڑے نمایاں الفاظ میں موجود ہے۔ ارشادِ نبوت ہے:

لا ربا بین اهل الحرب واهل الاسلام

(الدرایہ بحوالہ بیہقی)

"مسلم جو ذمی ومستامن نہ ہو اور مسلم کے درمیان کوئی معاملہ سود نہیں۔"

تیسرا مقدمہ

آج عام طور سے دنیا میں ایسے ہی غیر مسلم پائے جاتے ہیں جو ذمی نہیں اور بہت سے ممالک میں ان کی حکومت بھی ہے جیسے امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، چین، جاپان نیپال وغیرہ ـــــ ہندوستان کے غیر مسلم باشندے بھی ذمی یا مستامن نہیں، جیسا کہ ان کی تعریف سے عیاں ہے آج سے تین سو سال پہلے ہندوستان کے ایک مایہ ناز جلیل القدر ومعتمد عالم حضرت علامہ احمد جیون رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا اور حقائق کا صحیح جائزہ لینے سے یہ حقیقت بھی اجاگر ہو جاتی ہے کہ یہاں عملی طور پر حکومت بھی انھیں لوگوں کی ہے گو نام جو کچھ بھی ہو اور کم از کم آج کے حالات میں تو کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے غیر مسلم اور ان کی حکومتیں سیکولر (Secular) یا غیر اسلامی ہیں انھیں اسلام کے قانونِ معاملات سے کوئی سروکار نہیں۔ بالفاظ دیگر یہ نہ تو احکام اسلام کے مخاطب ہیں اور نہ ہی معاہد۔ لہذا ان کے مال میں سود کا تحقق نہ ہوگا جیسا کہ دوسرے مقدمہ سے عیاں ہے۔

ان مقدمات سے جو احکام واضح ہو کر سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں:

مسلم حکومتوں کے بینک

مسلمان مسلمان، یا مسلمان وذمی، یا مسلمان ومستامن کے درمیان سود کا تحقق ہوگا۔ لہذا جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہے جیسے انڈونیشیا، مصر، شام، عراق، لیبیا، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان وغیرہ وہاں کے بینکوں میں روپے جمع کرنے پر جو کچھ زاید رقم ملے وہ سود ہے کہ قرض سے مشروط نفع کا حصول شرعی نقطۂ نظر سے سود کے ہی زمرے میں آتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ نبوت سے اس کا ثبوت فراہم کیا گیا۔

غیر مسلم حکومتوں کے بینک۔

"مسلمان" اور "غیر ذمی ومستامن غیر مسلم" کے

درمیان کوئی معاملہ سود نہیں ہوتا۔ لہذا ان کی حکومتوں کے بینک میں روپیے جمع کرنے پر فکسڈ ڈپازٹ یا سیونگ اکاونٹ وغیرہ کے ذریعے سے جو کچھ اضافی رقم ملے وہ سود نہیں کہ یہاں بھی اگرچہ یہ اضافی رقم قرض کا ہی مشروط نفع ہے مگر یہ نفع گزشتہ بیان کے مطابق شرعی سود کے حدود سے باہر ہے۔

البتہ اس نفع کے جواز کے لیے شریعت نے ایک لازمی شرط یہ رکھی ہے کہ نفع کے حصول میں مسلمان کی طرف سے کسی قسم کی بدعہدی، دھوکا و فریب نہ ہو اور غیر مسلم اپنی رضا و خوشی سے بلا جبر و اکراہ نفع دے جیسا کہ فقہ اسلامی کے ماہر کامل امام ابن الہمام نے وضاحت کی۔ آپ رقم طراز ہیں:

وانما یحرم علی المسلم اذا کان بطریق
الغدر، فاذا لم یاخذ عنہ فبای طریق
یاخذہ حل بعد کونہ برضا

فتح القدیر ص ۱۷۸ - ج ۶

[غیر مسلم کا مال صرف بدعہدی کے ذریعہ
مسلمان کو حاصل کرنا حرام ہے لیکن جب
بدعہدی نہ ہو اور غیر مسلم راضی ہو تو اس کا
مال جیسے بھی ملے لینا حلال ہے]۔

اور ظاہر ہے کہ قرض و نفع کے لین دین میں شرط کے یہ تقاضے پورے طور پر ملحوظ ہوتے ہیں، مسلمان کی طرف سے قرض کے دینے اور نفع کے حصول میں کوئی بدعہدی نہیں ہوتی اور بینک اپنی رضا و خوشی سے ہی ایک طے شدہ در سے نفع دیتا ہے۔ لہذا اس نفع کے حصول کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ ماضی قریب کے ایک عبقری فقیہ اور اسلامی قانون کے ماہر کامل امام احمد رضا قدس سرہ نے اس سلسلے میں مختصر و مفصل بہت سے فتاوی ارقام فرمائے ہیں۔ دو فتووں کا اقتباس یہاں پیش کرتا ہوں:

آپ سے سوال ہوا کہ:

"گورنمنٹ جو قرضہ کا منافع دے رہی ہے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں"

تو آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ

"سود کی نیت سے لینا جائز نہیں، اور اگر کسی گورنمنٹ پر اس کی رعیت خواہ اور شخص کا شرعاً کچھ آتا ہے اس میں وصول سمجھنا بلاشبہ روا، یوہیں اگر بیت المال میں حقدار ہو تو اس میں لے سکتا ہے اور اگر کچھ نہ ہو اور اسے سود نہ سمجھے بلکہ یہ تصور کرے کہ ایک جائز مال برضا ئے مالک بلا غدر و بدعہدی ملتا ہے تو وہ بھی روا ہے۔

اصل حکم یہ ہے مگر اہل تقوی خصوصاً مقتدا کو ان دو صورتوں، خصوصاً اخیرہ سے احتراز چاہیے کہ ناواقف اسے متہم نہ کریں۔ حدیث میں ہے "تہمت کی جگہوں سے بچو"

(فتاوی رضویہ۔ جلد ۷ - ص ۱۲۳)

ایک دوسرے مقام پر رقم طراز ہیں:

"یہاں کے ہندو وغیرہ جتنے غیر مسلم ہیں ان میں نہ کوئی ذمی ہے نہ مستامن اور جو غیر مسلم نہ ذمی ہو نہ مستامن سوا غدر و بدعہدی کے کہ مطلقاً ہر کافر سے بھی حرام ہے۔ اس کی رضا سے اس کا مال جس طرح ملے جس عقد کے نام سے ہو، مسلمان کے لیے حلال ہے"۔ (حوالہ سابق ص ۱۰۵)

سود نہ سمجھنے کی قید اس لیے ہے کہ "جائز" کام بھی ناجائز سمجھ کر کرنا گناہ ہے جیسے دوسرے ایک خاص طریقے اور ڈھنگ پر رکھے ہوئے کپڑے کو اجنبی عورت سمجھ کر بری نگاہ سے دیکھنا گناہ ہے کہ یہ اپنے طور پر نافرمانی خدا پر اقدام ہے۔

[illegible]

بھی بینکوں کی طرح سے عوام سے قرض لے کر سرمایہ کاری کرتے ہیں جس کی مختلف شاخیں ہیں۔

۱۔ بچت بینک کھاتہ (سیونگ بینک اکاونٹ)
(S. B. A)

۲۔ میعادی جمع کھاتہ۔ (فکسڈ ڈپازٹ)
(F. D. A)

۳۔ قومی بچت وثیقہ (نیشنل سیونگ سرٹی فیکیٹ
(N. S. C)

۴۔ کسان فلاحی نامہ (کسان وکاس پتر)۔
(K. V. P)

۵۔ اندرا فلاحی نامہ (اندرا وکاس پتر)
(I. V. P)

۶۔ ماہانہ آمدنی اسکیم (منتھلی انکم اسکیم)
(M. I. S)

ان کھاتوں میں روپیے جمع کرنے پر ڈاک خانوں میں ایک طے شدہ در سے راس المال پر جو مخصوص اضافہ ملتا ہے وہ بھی اپنی ظاہری شکل کے لحاظ سے سود ہے کہ یہ قرض کا نفع ہے مگر جیسا کہ واضح کیا گیا یہ حقیقت میں سود نہیں بلکہ مال مباح ہے۔ لہذا اسے بھی شرعاً وصول کر کے اپنے استعمال میں لانے کی اجازت ہے۔

میعادی جمع کھاتوں میں، روپیہ جمع کرنے پر ڈاکخانے "پتر، یا سرٹی فیکیٹ وغیرہ" کے نام پر جو قبالہ جات یا وثائق جاری کرتے ہیں ان میں علمائے مانعین کے طور پر بھی جواز کی راہ یوں نکل آتی ہے کہ ارباب مال "قرض کا معاملہ" کرنے کے بجائے "وثائق کی خرید و فروخت" کریں۔ یعنی روپیے جمع کرتے وقت ہر رب المال یہ کہے کہ "میں نے یہ وثیقہ یا قبالہ اتنے دام میں خریدا" اور دام اتنا ہی بتائے جتنا وثیقہ پر درج ہے۔ پھر جب اس کی [illegible]

پھر کہ "میں نے اتنے دام میں یہ قبالہ یا وثیقہ بیچا" [illegible] دام اتنا ہی طے [illegible] جتنا وصول ہوگا۔ ٹھیک یہی حل بینکوں [illegible] کا بھی ہے۔

اس طور پر نفع کا حصول بالاتفاق جائز ہوگا کہ یہ نفع قرض کا نہیں بلکہ تجارت کا ہے جو اسلام میں مطلقاً جائز ہے۔

زندگی بیمہ کا حکم

"زندگی بیمہ" (لائف انشورنس Life Insurance) بھی عوام سے قرض حاصل کرنے کا ایک خاص قسم کا ذریعہ ہے جو بینکوں کے "متواتر جمع کھاتہ" (کیومولیٹو ڈپازٹ اکاونٹ (C.D.A.) کے مشابہ ہے۔ یہاں سود کے بجائے بونس (Bones) کے نام پر نفع ملتا ہے لیکن شرعی نقطۂ نظر سے حقیقت دونوں کی ایک ہے کہ دونوں قرض کا نفع ہیں۔ لہذا تفصیل بالا کے مطابق یہاں بھی اضافی رقم مباح اور اسے لینا جائز ہونا چاہیے۔

البتہ قرض کا معاملہ "متواتر جمع کھاتہ" سے مشابہت کے ساتھ ساتھ قمار و غرر پر بھی مشتمل ہے جو "زندگی بیمہ" کی پوری مدت کو حاوی و محیط ہے مگر یہ قمار اپنے نافع و مضر ہونے کے لحاظ سے مدت بیمہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

ایک: ابتدائی تین سال کی مدت پر۔

دوسرے: اس کے مابعد کی مدت۔

بیمہ کے ابتدائی تین سال کا زمانہ بڑی ہی امید و بیم کی کش مکش کا زمانہ ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے تین سال سے پہلے ہی قسطوں کی ادائیگی موقوف ہوگئی اور یہ آئندہ پانچ سال کی مدت کے اندر باقی ماندہ رقم یکشت [illegible]

سوخت ہوجائے گی اور بیمہ دار (پالیسی ہولڈر Policy Holder) خوف و بیم کی مہیب تاریکی سے نکلنے کے بجائے یقینی محرومی کے ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پھنس کر رہ جائے گا جہاں سے کبھی امید کی کرن نمودار نہ ہوگی۔ ہاں اگر یہ زمانہ خیر و خوبی کے ساتھ گزر گیا اور تین سال کی تمام قسطیں ادا ہوگئیں تو اب محرومی کے اندیشہ و عزر کا بادل چھٹ گیا اور مستقبل کچھ یوں تابناک ہوگیا کہ راس المال مع اضافہ (بونس) بہرحال ملے گا۔ اب یہاں قمار صرف نفع یا اضافہ کی کمی بیشی تک محدود ہے کہ بیمہ دار اگر خوش قسمتی سے بیمہ کی میعاد سے پہلے ہی جاں بحق ہوگیا تو نفع زیادہ ہوگیا گا ورنہ کم۔ لیکن نفع بہرحال ملے گا۔ اس لیے زندگی بیمہ کا جواز اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ بیمہ کرانے والے کو اپنی آمدنی نیز موجودہ مال و متاع کے پیش نظر ظن غالب ہو کہ وہ ابتدائی تین سال کی قسطیں ادا کرے گا۔ اس شرط کے ساتھ زندگی بیمہ کی اجازت دینے میں یہ مصلحت بھی پیش نظر ہے کہ ایک حد تک یہ مسلم کش فرقہ وارانہ فسادات میں مالی تحفظ، یا ترکہ میں اضافہ کا ذریعہ ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کے ذریعے فسادات میں بھی کچھ کمی آئے تو جلب مصلحت اور دفع مفسدہ کے لیے نفع کے ظن غالب کی صورت میں "زندگی بیمہ" جائز ہے۔ کچھ علما نے دفع حرج کے لیے مال (دکان و ذرائع نقل و حمل) کے بیمہ کی بھی مطلقاً اجازت دے دی ہے لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ بیمہ اموال میں نفع کا حصول عام طور سے مشکوک ہے جیسا کہ اس کے شرائط کے واقف کار پر عیاں ہے۔ البتہ بیمہ اموال کے لیے قانونی مجبوری کی صورتیں بہرحال مستثنیٰ رہیں گی۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ أَمْرًا۔ ○

(باقی آئندہ شمارے میں)

ا؎ "بیمہ" فارسی کے لفظ "بیم" سے ماخوذ ہے۔ مراد ہے اندیشۂ ضرر کا ذمہ یا ضمانت

"سپر اندازی بہادروں کا شیوہ نہیں ہوتا
ہمیں وقت کے سب سے بڑے
اس فتنے کے خلاف محاذ آرا
ہونا چاہیے اور ابھی ہونا ہے۔ اپنے
بچوں کو دین سے آگاہ کرنا ہے۔ دین
کی تعلیم دینی ہے۔ ہر شہر، ہر قریہ،
ہر محلہ اور ہر گھر میں۔"

سید حامد

سیلف امیج

کسی شخص کے بزنس، اسپورٹس، دوستانہ تعلقات، محبت، لیڈرشپ اور ملازمت میں کامیابی کی کلید صرف ایک بنیادی چیز ہے اور وہ ہے سیلف امیج، وہ لوگ جن کو اپنی ذات اور اپنی خوبیوں پر مکمل اور ٹھوس اعتماد ہوتا ہے۔ وہ کامیابی کے لوہے کے لیے گویا مقناطیس کی حیثیت رکھتے ہیں جو ان کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ ایسے افراد کی گود میں کامیابیاں گرتی ہیں جیسے کسی شخص کی گود میں پکا ہوا سیب گرتا ہے۔

کچھ ایسے لوگوں کے برعکس بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جس چیز کو وہ ہاتھ لگاتے ہیں وہ لوٹ جاتی ہے جس منصوبے کا وہ ارادہ کرتے ہیں وہ سوچ بچار کے زینے پر ہی اٹک جاتا ہے۔ بعض کام وہ شروع کرتے ہیں تو وہ ادھورے رہ جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ناکامی ان کا تعاقب بڑی سرعت سے کرتی ہے کوئی کام بامراد نہیں ہوتا ہے۔ چوں کہ ان کا سیلف امیج بڑا مایوس کن ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنی کامیابیوں کے جہاز کو تارپیڈو خود ہی مارتے رہتے ہیں۔ نتیجۃً ان کا امیدوں بھرا جہاز مایوسی کے سمندر میں غرق آب ہو جاتا ہے۔

ہمارا سیلف امیج اپنے بارے میں کیسا ہے؟

ہم اپنے آپ کو کسی کام کا اہل سمجھتے ہیں؟ ہمارے دست و بازو میں کتنی قوت ہے؟ ہم میں کسی کام کے کرنے کی استعداد کتنی ہے؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں اپنی استعداد کی انونٹری (INVENTORY) کرتے رہنا چاہیے۔ کسی خموش جگہ پر بیٹھیے اور کاغذ پر اپنے متعلق اچھی باتیں لکھنا شروع کیجیے وہ کام جن کو کر کے آپ خوش ہوتے ہیں اور لذت پاتے ہیں ان کی ایک فہرست بنایئے۔ مثلاً کیا آپ خوش مزاج ہیں؟ کیا آپ وقت کے پابند ہیں؟ کیا آپ مہمان نواز ہیں؟ کیا آپ لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہیں؟ (PEOPLE ORI-ENTED) ——— کیا آپ ہاتھ سے کام کرنا پسند کرتے ہیں؟ کیا آپ کو ریاضی، کیمسٹری، شماریات اور انگریزی جیسے مضامین میں سے کوئی مضمون پسند ہے؟ کیا آپ کسی کام کے سرانجام دینے میں تردد سے کام لیتے ہیں؟ کیا آپ چیلنج پسند کرتے ہیں؟ کیا آپ انجانی جگہوں اور اجنبی لوگوں سے ملنے سے گھبراتے ہیں؟ کیا آپ ایک اچھے سیلز مین ہیں؟

آپ کا سیلف امیج اپنے بارے میں اگر منفی ہے تو اس کو بدلنا زیادہ مشکل امر نہیں ہے۔ ایسا دیکھنے میں شاذ و نادر ہی آیا ہے کہ ایک شخص کا اپنے بارے میں

☆ کنگسٹن، کنیڈا۔

سیلف امیج منفی ہو اور وہ خوش حال زندگی گزار رہا ہو،
منفی سیلف امیج کو بدلنے کے لیے پہلی بنیادی بات تو یہ ہے
کہ اپنے ذہن میں سے منفی رجحانات کو یوں نکال دیں جیسے
باغبان جڑی بوٹیوں کو پھولوں پھلوں کے درختوں میں سے
نکال باہر پھینکتا ہے۔

مثبت سیلف امیج پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے
کہ اپنی استعداد پر پوری توجہ مرکوز کریں۔ بعض لوگ یہ کہتے
ہیں کہ وہ چوں کہ اس قدر خوش شکل اور اسمارٹ نہیں
ہیں اس لیے وہ کامیابی کے زینے پر پوری گرفت سے چڑھ
نہیں سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے آپ کا اپنے اردگرد
کے لوگوں سے موازنہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ خدا نے آپ
کو ایک منفرد شخص بنایا ہے اور اس پاک ذات سبحانہٗ نے آپ
کو خاص منفرد استعداد سے نوازا ہے۔ آپ
اپنی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز کریں کہ آپ کتنے اسمارٹ اور
ذہین، با اخلاق اور ملنسار انسان ہیں۔ اچھے صاف ستھرے
کپڑے پہن کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھیں آپ کتنے اسمارٹ
نظر آتے ہیں۔

ایک ضروری بات یہ ہے کہ لوگوں سے آپ جب ملیں تو
خوش مزاجی سے ملیں۔ اپنے چہرے کو مسکراہٹ کے زیور
سے آراستہ رکھیں مسکراہٹ CONTAGIOUS ہوتی ہے
آپ کو مسکراتا دیکھ کر لوگ بھی مسکرانا شروع کر دیں گے۔
جس بدقسمت انسان کے چہرے پر تیوریاں چڑھی ہوں گی،
اس سے ملنا کون پسند کرے گا۔ جو لوگ مسکراتے نہیں
ہر وقت دوسروں سے ناراض رہتے ہیں ایسے لوگوں سے
مل کر تو انسان پر ڈپریشن (DEPRESSION) طاری
ہو جاتا ہے۔ کوشش کریں کہ آپ خوش مزاج لوگوں کی صحبت
میں رہیں۔ مایوسی کو کبھی اپنے قریب نہ آنے دیں۔ مایوسی
انسان کی سب سے بڑی خفیہ دشمن ہے۔ مایوسی کا اثر انسان پر
رفتہ رفتہ یوں ہوتا ہے کہ پھر انسان اس سے RECOVER
نہیں ہو سکتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ اللہ کی رحمت
سے کبھی مایوس نہ ہو۔

اپنا مقابلہ اپنے سے زیادہ خوش حال لوگوں سے نہ
کریں بلکہ اپنے سے کم تر حیثیت والے لوگوں سے کریں۔ اگر
خدا نے آپ کو زیادہ دولت سے نہیں نوازا ہے تو دیکھیں
خدا نے آپ کو ذہین بچوں سے نوازا ہے اپنا مقابلہ دوسروں
سے کرنا ایسا ہی ہے جیسے غبارے میں سے کوئی ہوا خارج
کر دے۔

ایک دانا شخص عبداللہ سے پوچھا گیا کہ قیامت کے
روز خدا کی حکومت کیسی ہو گی؟ اس نے جواب دیا مجھے علم
نہیں لیکن ایک بات کا مجھے ضرور علم ہے کہ قیامت کے روز
جب میں خداوند کریم کے حضور حاضر ہوں گا تو مجھ سے یہ
استفسار نہیں کیا جائے گا کہ تم موسیٰ علیہ السلام جیسے کیوں
نہ تھے؟ یا تم نے صلاح الدین ایوبی جیسے کارنامے کیوں نہ
سرانجام دیے؟ بلکہ مجھ سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم عبداللہ
کیوں نہ تھے؟

اپنے کام میں شغف پیدا کرنا بھی ایک لازمی امر ہے
اپنے کام یا ہنر سے متعلق اتنی کتابیں پڑھیں، میگزین جرنل
اور رسالے پڑھیں کہ وہ کام آپ کی فطرتِ ثانیہ بن جائے
بچوں کے لیے شروع شروع میں بائیسکل چلانا جوئے شیر
لانے کے مترادف ہوتا ہے مگر ایک ماہ، دو ماہ اور
سال کے بعد بچے بائیسکل بغیر سوچے یوں چلاتے گویا وہ ماں
کے پیٹ سے چلانا سیکھ کر آئے تھے۔ یا کبھی آپ نے غور
کیا کہ جو لوگ ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرتے ہیں ان میں سے
بعض سرجن بن جاتے اور سرجن آپریشن میں مہارت پیدا
کرنے کے لیے کتنی عرق ریزی سے ٹانکے لگانا سیکھتے ہیں۔ انسانی
جسم کے بعض حصوں پر چھوٹی سے چھوٹی جگہوں پر آپریشن کرنا
بعض دفعہ کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہر
عضو، آنت، شریان، رگ وغیرہ وغیرہ کو ٹھیک ٹھیک اس

کے صحیح مقام پر واپس رکھنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔

بعض لوگ ایک نیا کام یا بزنس شروع کرتے ہیں۔ جب شروع میں توقع کے مطابق کامیابی حاصل نہیں ہوتی ہے تو بد دل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ چاہیے تو یہ کہ جب ناکامی ہو تو اپنے آپ پر نظر ڈالیں کہ مجھ میں کیا خامی تھی کہ مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے اپنے میں خوبیاں پیدا کریں۔ اپنا سیلف امیج بدلیں۔ پھر دیکھیں کامیابی کس طرح آپ کے قدم چومتی ہے۔

اپنے آپ کو ہمیشہ ایک کامیاب انسان کے روپ میں دن رات، ہر آن ہر لمحہ دیکھیں۔ اپنے متعلق برے الفاظ جیسے کم عقل، بیوقوف، کم بخت ہرگز استعمال نہ کریں۔ آپ نے کبھی غور کیا جو لوگ باسکٹ بال کے کھلاڑی ہوتے ہیں دن رات چلتے پھرتے گیند کو BUCKETT میں ڈالتے رہتے ہیں اور جو لوگ کرکٹ کے شوقین ہوتے ہیں، ان کا چلنے کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس چیز کو نفسیاتی اصطلاح میں IMAGING کہتے ہیں۔

کامیابی کے لیے یہ امر لازم ہے کہ جو مشکل درپیش ہے اس کا حل بار بار سوچیں۔ پھر اس حل کو عمل درآمد کرنے کے لیے مختلف عوامل اور ذرائع پر غور و خوض کریں۔ ان ذرائع پر عمل کرنے کے عمل کو اپنے ذہن میں اتنی بار دہرائیں کہ مذکورہ مشکل کا حل آپ کو مکمل طور پر ازبر ہو جائے۔ اور وہ عمل آپ کے لاشعور میں راسخ ہو جائے۔

سیلف امیج کے بڑھانے میں ایک بات جو غیر شعوری طور پر حاوی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ کیا سوچیں گے یا دوسرے لوگ، دوست اعزہ اور رشتہ دار آپ سے کیا امید رکھتے ہوں گے۔ یاد رکھیں کہ آپ آپ ہی ہیں۔ اس بات کی ہرگز پرواہ نہ کریں کہ لوگ آپ کو کس روپ یا کیریکٹر میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ خداوند کریم نے آپ میں جو استعداد ودیعت کی ہے آپ اس سے انکار ہرگز نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کے والدین یا بھائی بہن چاہتے ہیں کہ آپ ایک پیشہ ور وکیل بنیں جب کہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ میں وکیلوں جیسی خصلتیں نہیں ہیں بلکہ آپ کا من یہ کہتا ہے کہ آپ ایک اچھے سیلزمین بنیں تو مناسب یہی ہے کہ سیلزمین بن کر آپ اپنے آپ میں پنہاں خوبیوں کو اجاگر کریں۔

اپنے اردگرد اچھے دوستوں، با اعتماد باوقار احباب کا حلقہ پیدا کریں اپنے عزیزوں اور متعلقین سے اچھے تعلقات استوار کریں۔ کیونکہ فیملی یونٹ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ خدا نے رشتہ دار، باہمی محبت، مودت اور ضرورت کے وقت مدد کے لیے بنائے ہیں۔ جتنی محبت آپ کو زیادہ ملے گی اتنا ہی زیادہ آپ کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ وہ لوگ جن کے فیملی تعلقات استوار نہیں ہوتے ہیں یا آئے دن وہ گھریلو پریشانیوں میں خواہ مخواہ الجھے رہتے ہیں، کامیابی اُن کے گھر کا رخ نہیں کرتی ہے

دوست بنائیے اور اچھے دوستوں کی صحبت میں رہیے وہ آپ کے لیے ایک عمارت کے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

> "ہر انسان قدرت کا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے۔ یہ صرف مشکلات کی ٹھوکریں ہیں جو اس خزانے کو اندر سے باہر لاتی ہیں۔"

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲ - شمارہ ۴ (اپریل ۹۲ء)

خون بیش قیمت ہے

اسلم پرویز ▽

ہمارے ادیب، شاعر اور سیاست دان اتنے عرصے سے لفظ 'خون' کا استعمال کرتے چلے آرہے ہیں کہ اب یہ ایک عام لفظ بن چکا ہے۔ مختلف موقعوں پر مختلف حضرات نے اسے مختلف رنگوں اور مزاجوں میں دیکھا ہے۔ کسی نے کبھی اس کو سفید کہا تو کسی نے اس کا رنگ بدلتے دیکھا کسی نے اس کو پانی کی طرح بہتے دیکھا تو کسی نے اس کو رگوں میں منجمد دیکھا۔ کسی نے اس کو گندا دیکھا تو کسی نے اس کو جوش مارتے دیکھا۔ کسی نے خون کو رنگ لاتے دیکھا تو کہیں اس میں کشش دیکھی گئی۔ کسی نے خون خرابہ دیکھا تو کسی نے اس کو کھولتے دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے قلم کار اس کو اتنے رنگ و روپ دے چکے ہیں کہ اگر سائنس والوں کے سامنے یہ بیاض کھول دی جائے تو وہ بھی سوچنے لگیں گے کہ کہیں خون میں واقعی یہ سب کچھ تو نہیں ہوتا۔ خون کو اتنی اہمیت اس لیے ملی ہے کیوں کہ اس کا زندگی سے براہ راست تعلق ہے اور اس تعلق کا اعلان اٹھارہویں صدی میں تو باقاعدہ ہو گیا تھا اگرچہ زمانہ قدیم سے ہی اس کی اہمیت سے لوگ واقف رہے ہیں۔ خون کے رنگ میں زندگی کی جھلک نظر آتی ہے اور اس کی گردش کو زندگی کی برق رفتاری کا مظہر مانا گیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ خون ہمارے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ غذا اور ہوا۔ کیونکہ غذا اور ہوا کو ہمارے جسم کے نہاں خانوں تک پہنچانے کا کام خون کے ہی سپرد ہے۔ اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی آپریشن یا حادثے کے سبب خون کم ہو جانے کے بعد مریض کے لیے خون کی تلاش کی جاتی ہے۔ اس وقت زندگی اور موت کے درمیان صرف اسی خون کا فاصلہ ہوتا ہے۔

صحت مند جاندار کے جسم میں خون ہمیشہ رقیق حالت میں رہتا ہے۔ اس کو ہم ایک طرح کا گھول سمجھ سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر خون تین قسم کے ذرّات پر مشتمل ہوتا ہے جن کو سرخ ذرات، سفید ذرات اور پلیٹی لیٹس کہتے ہیں۔ یہ ذرّات ایک پانی جیسے ہلکے رنگ کے رقیق مادے میں تیرتے رہتے ہیں جس کو پلازما کہا جاتا ہے۔ چوں کہ خون میں سرخ ذرّات کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اس لیے خون ہم کو سرخ رنگ کا نظر آتا ہے۔ ایک صحت مند عورت کے ایک ملی لیٹر (ایک لیٹر میں ایک ہزار ملی لیٹر ہوتے ہیں)۔ خون میں تقریباً ۴۵ لاکھ سرخ ذرات ہوتے ہیں۔ جب کہ صحت مند مرد کے اتنے ہی خون میں ایسے پچاس لاکھ ذرّات ہوتے ہیں۔ ان ذرات کی تعداد انسان کی صحت اور اس کی رہائش کی سطح سمندر سے بلندی پر منحصر ہے۔ صحت اچھی ہو تو سرخ ذرّات

▽ ذاکر حسین کالج - اجمیری گیٹ - دہلی۔

نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی بات کو ہم اکثر یوں کہتے ہیں کہ آج کل فلاں شخص تو بالکل سرخ ہو رہا ہے یا سرخ و سفید نظر آتا ہے۔ سطح سمندر سے زیادہ اونچائی پر رہنے والوں کے جسم میں بھی ان ذرات کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے پہاڑی علاقوں کے لوگ ہم کو زیادہ سرخ نظر آتے ہیں یہ ذرات ہماری ہڈیوں میں موجود گودے میں تشکیل پاتے ہیں۔ تمام ہڈیوں میں سے خاص طور پر پسلیاں، سینے کی ہڈیاں اور کمر کی ہڈی میں ان کے بننے کا عمل زیادہ ہوتا ہے ان ذرّات میں ایک خاص قسم کا کیمیائی مادہ پایا جاتا ہے جس کو ہیموگلوبین کہتے ہیں، اسی کی وجہ سے ان کی رنگت سرخ ہوتی ہے اور سرخ ذرات کے تمام افعال کا ذمّہ دار یہی کیمیائی مادہ ہے۔ خون کے یہ سرخ ذرات جو کہ دراصل ایک قسم کے خلیے یعنی سیل ہیں اپنی تشکیل کے وقت نیوکلیس بھی رکھتے ہیں لیکن بعد میں ان کی نشوونما کے دوران نیوکلیس ان خلیوں سے باہر چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ بھی ہیموگلوبین لے لیتی ہے۔ اوسطاً خون کے ایک ذرّے میں ہیموگلوبین کے ۲۸ کروڑ رسالمے یعنی مالیکیول ہوتے ہیں (کسی بھی کیمیائی مادے کی بنیادی اکائی کو مالیکیول کہتے ہیں اور ان کے ملنے سے ہی کیمیائی مادے بنتے ہیں) یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ خون کا ایک سرخ ذرہ جو کہ آنکھ سے نظر بھی نہیں آتا، اس میں اتنی بڑی تعداد میں یہ مالیکیول ہوتے ہیں۔ اس سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بذاتِ خود مالیکیول کتنا چھوٹا ہوگا۔ خون کے یہ

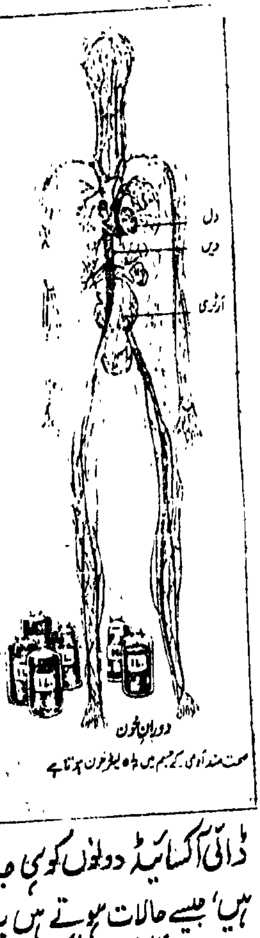
سرخ ذرے عموماً ۱۲۰ دن تک زندہ رہتے ہیں۔ اس دوران خون کے ساتھ مستقل گردش کرتے کرتے ان کی جھلی کمزور ہو کر گھس جاتی ہے اور آخرکار یہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے خون کے ذروں کو کلیجی اور تلّی جذب کر لیتی ہے۔ ان دونوں اعضا میں موجود کچھ خاص قسم کے خلیے ان ذروں کو توڑ کر ان کو چھوٹے اجزا میں تحلیل کر دیتے ہیں یعنی ہیموگلوبین مالیکیول اور دوسرے اجزا ان سے نکال لیے جاتے ہیں جو کہ دوسرے نئے ذروں کو بنانے میں کام آتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق انسان کے جسم میں ہر سکنڈ میں ۳۰ لاکھ ذرّے ٹوٹ کر جگر اور تلّی میں جذب ہوتے رہتے ہیں اس عدد سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کارخانہ کتنا بڑا ہے اور یہ عمل کتنی سرعت کے ساتھ ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی سیکڑوں مثالیں ہمیں سائنس پڑھ کر ملتی ہیں جنھیں دیکھ کر خدا کی خدائی پر یقین مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے آج اتنی ترقی کے بعد بھی انسان سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنی نازک، اتنی چھوٹی اور اتنی پیچیدہ مشین بنا سکے جو اس رفتار سے اپنا کام جاری رکھے۔ یہاں مزید دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جتنے سرخ ذرات ہر لمحے ٹوٹتے ہیں اس سے چار گنا زیادہ ذرات اسی سکنڈ ہڈیوں کے گودے میں تیار ہو جاتے ہیں، جس کے باعث یہ سلسلہ قایم رہتا ہے۔



خون میں موجود سرخ ذرات

خون کے سرخ ذرات جس رقیق مادّے میں تیرتے

ہیں اسس کو پلازما کہتے ہیں۔ اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر کہیں چوٹ لگ جائے تو وہاں پر فوراً خون جم جاتا ہے اور اس کھرنڈ کے نیچے ایک پتلا زرد رنگ کا پانی سا رہ جاتا ہے اسی کو پلازما کہتے ہیں۔ سرخ ذرّات اور پلازما مل کر جسم میں نقل و حمل کا کام انجام دیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا جسم بے شمار چھوٹے چھوٹے خانوں سے مل کر بنا ہے جن کو خلیہ سیل (Cell) کہا جاتا ہے۔ ہر سیل اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے اور زندگی کی تمام خصوصیات رکھتا ہے نیز تمام افعال انجام دیتا ہے۔ یعنی بالکل ہماری طرح ہر سیل کو پانی کی پیاس لگتی ہے۔ بھوک لگتی ہے یعنی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، تازہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے یعنی آکسیجن گیس درکار ہوتی ہے اور بالکل ہماری طرح اسے رفع حاجت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے فضلے کو بھی باہر نکالنا چاہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ تمام کام جو ہمارا جسم کرتا نظر آتا ہے، ان کا مکمل عکس ہر خلیے میں ملتا ہے۔ جسم کے ہر خلیے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جسم کے ہر خلیے سے براہ راست تعلق ہو۔ یہ تعلق خون کے ذریعے قایم ہوتا ہے۔ دل خون کو ایک پمپ کی طرح پورے جسم میں قوت کے ساتھ گردش کراتا ہے۔ خون بڑی سے چھوٹی اور پھر اور چھوٹی نالیوں میں گزرتا ہے۔ چھوٹی نالیاں باریک باریک جال سا بنا کر سب خلیوں سے اپنا تعلق قایم رکھتی ہیں۔ اس طرح ہر خلیے کے پاس سے کم از کم ایک باریک نالی ضرور گزرتی ہے۔ تمام جسم میں گردش مکمل کر کے خون پھر دوبارہ دل میں واپس آتا ہے۔ چونکہ خون کا براہ راست تعلق خلیے سے ہوتا ہے اس لیے خلیے کو غذا اور آکسیجن گیس فراہم کرنا اور اس کا فضلہ اکٹھا کرنا خون کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ خون کے سرخ ذرّوں میں موجود ہیموگلوبین یہ خاصیت رکھتی ہے کہ یہ آکسیجن کو جذب کر لیتی ہے جس طرح مقناطیس لوہے کو پکڑتا ہے اسی طرح یہ کیمیائی مادہ بھی آکسیجن گیس کو پکڑ لیتا ہے جب خون پھیپھڑوں میں سے گزرتا ہے تو وہاں آکسیجن گیس موجود ہوتی ہے جو ہمارے سانس لینے کے عمل کے نتیجے میں پھیپھڑوں میں تازہ ہوا کے ساتھ جاتی ہے۔ خون کے سرخ ذرات فوراً اس آکسیجن کو جذب کر لیتے ہیں۔ ایسا کرنے پر خون کے سرخ ذرات کا رنگ مزید نکھر جاتا ہے اور وہ چمک دار سرخ رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ جب یہ خون خلیوں سے گزرتا ہے تو خلیے آکسیجن سرخ ذرات سے لے کر کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس واپس دے دیتے ہیں۔ یہ گیس جو کہ ایک قسم کا فضلہ ہے ہیموگلوبین سے جڑ جاتی ہے۔ یعنی خون کے سرخ ذرات آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ دونوں کو ہی جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جیسے حالات ہوتے ہیں یہ ویسا ہی عمل کرتے ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خون کے سرخ ذرات سے جڑ جاتی ہے تو اُن کے رنگ میں کچھ نیلاہٹ شامل ہو جاتی ہے۔ جب یہ خون دوسری قسم کی نسوں سے واپس آتا ہے تو اس میں نیلاہٹ پائی جاتی ہے۔ پھیپھڑوں میں واپس آکر خون کے سرخ ذرات فوراً تازہ آکسیجن کو پکڑ لیتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ گیس بعد میں ہمارے منہ کے ذریعے سانس باہر نکالنے کے عمل کے دوران باہر آجاتی ہے۔ گویا کہ ہمارے سانس



دورانِ خون

صحت مند آدمی کے جسم میں ۵ لیٹر خون ہوتا ہے

اندر لینے اور باہر نکالنے کے عمل کے دوران باہر آجاتی ہے۔ گویا کہ ہمارے سانس اندر لینے اور باہر نکالنے کے وقفے کے دوران یہ سب کام ہو جاتے ہیں۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ سانس لینے اور واپس چھوڑنے کے درمیان کتنا کم وقفہ ہوتا ہے۔ اسی لمحے میں یہ سارے کام ہو جاتے ہیں۔ اب تو کم از کم آپ مان ہی گئے ہوں گے کہ یہ نظام کتنا برق رفتار ہے۔

اب آئیے غذا کی طرف یعنی خلیوں تک غذا کیسے پہنچتی ہے۔ ہمارے جسم کے خلیے خوراک کے معاملے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔ ان کو نہ نہاری روٹی درکار ہوتی ہے اور نہ وہ کوئی چاٹ یا گوشت استعمال کرتے ہیں، ان کو تو صرف گلوکوز چاہیے ہوتا ہے۔ اب یہ گلوکوز کہاں سے آتا ہے؟ جو بھی غذا ہم کھاتے ہیں، ہمارا نظام ہاضمہ اس کو توڑ کر تحلیل کرکے آخر کار گلوکوز میں بدل دیتا ہے۔ یہ گلوکوز خون کے رقیق مادے یعنی پلازما کے ذریعے ہر خلیے تک پہنچتا ہے۔ خون میں گلوکوز کی مقدار کافی ہوتی ہے کھانا کھانے کے بعد ہمارے خون میں اس شکر کی مقدار میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ خون اس شکر کو سب خلیوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ پوری گردش کے بعد خون میں جو شکر باقی رہ جاتی ہے وہ جگر میں آڑے وقت کے لیے جمع ہو جاتی ہے۔ یہ عمل اس وقت ہوتا ہے جب خون جگر میں سے گزرتا ہے۔ خلیوں میں پیدا ہونے والا فضلہ بھی پلازما میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب خون گردوں میں سے گزرتا ہے تو وہاں خون سے ان تمام فضلوں کو نکال لیا جاتا ہے۔ صفائی کا کام گردوں میں ہوتا ہے۔ پلازما کے ذریعے خوراک یعنی گلوکوز کے علاوہ وٹامن ہارمون اور نمکیات بھی خلیوں تک پہنچائے جاتے ہیں۔ عموماً پلازما میں سوڈیم اور کلورین کی مقدار کافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چکھنے پر خون ہم کو نمکین لگتا ہے۔ کیونکہ نمک کے اجزا اس میں موجود ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر کسی کو فوری توانائی کی ضرورت ہو تو اسے گلوکوز دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غذا کیسی قسم کی بھی ہو وہ بالآخر گلوکوز میں تبدیل کی جاتی ہے۔ یہ کام نظام ہاضمہ کے ذریعے ہوتا ہے اور اس میں وقت لگتا ہے۔ گلوکوز میں تبدیل ہونے کے بعد ہی غذا خون میں شامل ہو کر خلیوں تک پہنچتی ہے۔ اس لیے اگر خلیے کو غذا فوراً پہنچانی ہے تو اسے گلوکوز کی شکل میں دیا جاتا ہے کیونکہ یہ فوراً خون میں جذب ہو کر تمام جسم میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس طرح خون کے سرخ ذرات اور پلازما مل کر تمام خون میں خوراک اور آکسیجن کی تقسیم کا کام کرتے ہیں۔

اعلیٰ و ارفع روایات کی پاسبانی و تحفظ ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے جس پر سختی سے کاربند رہنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ زمانے کی خوش گوار تبدیلیوں کا کھلے دل سے استقبال بھی کرنا چاہیے۔

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

بابری مسجد سے سبق

محمد اسحاق ○

آزادیِ ہند کے بعد بابری مسجد کا مسمار کیا جانا مسلمانوں کے لیے ایک عظیم حادثہ ہے بلکہ ہر شریف ہندو کا سر شرم سے جھک گیا ہے اور ساری دنیا کے لوگوں نے اس کی مذمت کی ہے۔ بابری مسجد کو ڈھانے کا مسئلہ محض وقتی اور ہنگامی نہیں ہے بلکہ فاشسٹ تنظیموں کا پچاس سالہ پلان کا یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے تاکہ وہ بتلا سکیں کہ یہ ملک ان کا ہے اور مسلمان 'ہندوتو' کی تحریک کو قبول کرلیں ورنہ ان کا رہنا بسنا مشکل ہے۔ یہ ایک چیلنج ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی زندگی اور موت، عزت و آبرو کا سوال ہے اگر اب بھی مسلمان ہوش و حواس اور صبر و تحمل سے کام نہ لیں اور اب بھی ان کا کوئی طویل مدتی لائحہ عمل تیار نہ ہو تو وہ اس طوفان کا مقابلہ نہ کرسکیں گے جو جلد یا بہ دیر آنے والا ہے۔

تقریریں، تحریریں، نعرے، ہڑتالیں اور احتجاج یہ سب وقتی اور ہنگامی، جوش و جذبے کے مظاہر ہیں۔ نہ تو اس سے قوم بنتی ہے اور نہ قوم سنبھلتی ہے البتہ ان کا خون سڑکوں پر بہہ جاتا ہے۔ جان و مال اور آبرو دن دہاڑے لٹ رہی ہے لیکن مسلمان اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔

ویسے مسلمانوں کی ۲۰ کروڑ آبادی سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ اکثر دیہات میں مسلمان اتنی کم تعداد میں ہیں کہ ان کی معیشت اور روزگار کا انحصار بالکلیہ مقامی آبادی کے رحم و کرم پر ہے۔

ان فسطائی طاقتوں کا مقابلہ نہ کرسکنے کی چند وجوہات ہیں:

۱۔ آر۔ ایس۔ ایس کے اس وقت ۲۷ لاکھ والنٹیرز باضابطہ ٹریننگ پائے ہوئے ہیں جنھیں فسادات کروانے اور لوٹ مار کی ٹریننگ کوئی چالیس برس سے دی جارہی ہے۔ اس وقت ۳۰ ہزار شاکھائیں یا سنٹرس میں ان کی تربیت جاری ہے۔ یہ ہر اسکول، کالج، مندر، میدان میں ان کی ٹریننگ کا کام دن رات جاری ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے معصوم ذہنوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کا زہر بھر دیا جاتا ہے اور یہ زہر ان کے لٹریچر میں تو صاف ہے۔ اس کے علاوہ اب آثار قدیمہ کے ہر گائیڈ کا کام یہی ہے اور تاریخ کی کتابوں اور اسکول کی نصابی کتابوں میں بھی یہ زہر

○ الجبیل - سعودی عربیہ

اتار دیا گیا ہے۔ ان ہی شاخاؤں میں تربیت پائے ہوئے بچے بڑے ہو کر آج پولس، فوج، سیاست ایڈمنسٹریشن اسکول کالج اور یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ان فسطائی طاقتوں کے پیچھے حکومت اور ایڈمنسٹریشن کی ہمدردیاں حاصل ہیں، اس لیے مسلمان اپنے کو مجبور محض پاتے ہیں۔ اگر حکومت کا سچ مچ کوئی مذہب نہیں ہوتا تو انصاف ہوتا، انصاف اس وقت ہوتا جب دل صاف ہوتا۔

انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے

مسلمانوں کا ذہن فرار کا ہے اپنے آپ کو قسمت اور تقدیر اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کا فراری ذہن (ESCAPISM) کئی برسوں میں تیار ہوا ہے وہ نوشتہ دیوار پڑھنے کے لیے تیار نہیں اور کل کے متعلق سوچنے کی انھیں فرصت نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ادب، شعر، افسانے، شعلہ بیانی اور خانقاہی طرز زندگی پر زور، اور بھی بہت سے اسباب نے حقائق زندگی سے فرار کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ وہ اس بات کو سوچنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ حضور اکرمؐ سے زیادہ غیبی تائید کے اور کون مستحق ہو سکتے تھے لیکن رسول خدا نے جنگ بدر میں پوری امکانی تیاری کے ساتھ تین سو تیرہ جاں نثاروں کے ساتھ نکل آئے تب غیبی امداد بھی آئی۔ اپنی امکانی تدبیر ہی تقدیر ہے (اقبال) لیکن مسلمان اس راز سے واقف نہیں ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی اور زوال کا ایک ہی سبب ہے وہ آندھی کی طرح آتے ہیں اور بجلی کی طرح گزر جاتے ہیں۔ وہ ایک مسجد کے شہید کر دینے پر اپنا خون پانی کی طرح بہا دیں گے لیکن ایک مسجد کی تعمیر کا کام ان سے نہیں ہو سکے گا۔ وہ کوئی تعمیری کام مل جل کر کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ مسلمانوں کا جوش قابلِ تعریف اور ہوش قابلِ افسوس۔ دنیا کی ساری قومیں مسلمانوں کی اس کمزوری سے واقف ہیں۔

۳۔ تقسیم ہند یا پاکستان کا بننا مسلمانوں کی سیاسی غلطی کا ایک شاہکار ہے۔ ہندوستان پر ایک ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد ایک الگ گھر بنا لینا سیاسی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے اب تو یہ بحث بے کار سی ہے کہ "اگر پاکستان نہ بنتا تو کیا ہوتا"۔ لیکن ہمارے مورخ اور دانش ور اس پر غور کریں۔

۴۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے ان کی کوئی آل انڈیا سیاسی قیادت آج تک قائم نہ ہو سکی اور نہ آئندہ کوئی امید نظر آتی ہے، جب تک ساری قوم میں اتحاد اور ان کی ایک موثر قیادت قائم نہ ہوگی اس وقت تک ہماری ساری طاقت اور انرجی ضائع جائے گی۔ گزشتہ الیکشن میں ایک سرسری سروے کے مطابق یہ پتہ چلا تھا کہ سارے ملک میں ممبران پارلیمنٹ کے ۸۲ حلقے ایسے ہیں جہاں پر مسلمانوں کے ووٹ کسی ایک امیدوار کو قطعی کامیاب کر سکتے ہیں لیکن ہمیشہ کی طرح یہ ووٹ بکھر گئے اور اس "جمہوری ایٹمی طاقت- DEMOCRATIC ATOMIC POWER" کو یوں ہی ضائع کر دیا۔

جمہوریت اور سیکولرازم دستور ہند کی دو باتیں ایسی ہیں جو مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ ساری اقلیتوں اور پسماندہ طبقات کے حق میں دو بڑی نعمتیں ہیں۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کا کہنا تھا کہ سیکولرازم مسلمانوں سے زیادہ

ہندوؤں کے حق میں مفید ہے۔ اگر حکومت کا کوئی خاص مذہب ہوگا تو ہندوستان بہت جلد آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

جمہوریت ایک آزمائی ہوئی طرز حکومت ہے۔ اس کی ساری خرابیوں کے باوجود اس کی متبادل اور کوئی حکومت بہت عرصے تک کامیاب نہ ہو سکی۔ سیاست ہماری زندگی کے ہر شعبے پر چھائی ہوئی ہے۔ جس کے ہاتھوں میں حکومت ہوتی ہے وہ نہ صرف اپنوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں بلکہ ان کی ترقی کا راز بھی حکومت ہے۔ جب تک مسلمان سیاست اور ملک کے جمہوری نظام سے دور رہیں گے وہ سخت نقصان میں رہیں گے بلکہ ایک غیر مسلم دانشور کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کا جمہوری نظام سے الگ تھلگ رہنا خودکشی کے مترادف ہے۔ جب تک مسلمان گرام پنچایت سے لے کر دلی کی پارلیمنٹ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کریں گے اس وقت تک وہ اپنی قوم کا توازن دوسروں کے مقابلے میں قائم نہ رکھ سکیں گے۔ اس کے لیے وہ سیاسی تنظیموں کے ایسے نمائندوں کا ساتھ دے سکتے ہیں جو ان کے کاز کی نمائندگی کر سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ساری مسلم سیاسی تنظیموں کا ایک وفاق قائم ہو اور وہ اپنی واضح پالیسی کے ساتھ کسی آل انڈیا سیاسی پارٹی کا ساتھ دیں جو قومی سطح پر قائم ہو چکی ہو۔

مسلمان سیاست کو اب تک شجر ممنوعہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کا بڑا فائدہ دوسروں کو ہوا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہمارے دانشور اور اہل ثروت اس طرف متوجہ ہوں۔ یہ ایک کڑوا کسیلا پھل ہے جسے قوم کی صحت کے لیے ہضم کرنا ضروری ہے۔

کوئی سیاسی یا سماجی تنظیم مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کا کوئی تعلیمی اور سماجی ترقی کا پروگرام نہ رکھتی ہو۔ ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط فی صد ۴۵ ہے اور مسلمانوں کا ۲۵، ۳۰ فی صد سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ مسلم خواتین میں تعلیم کا فیصد دس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ ہمیں تعلیم کے میدان میں بڑے دوررس پروگرام پر چلنے کی ضرورت ہے۔ اب بھی ہم اہل وطن سے کوئی پچاس برس پیچھے ہیں۔ ہمیں یہ فاصلے طے کرنے تک دوسرے سو برس آگے ہو جائیں گے۔ ضرورت ہے کہ دستور ہند کے چوکھٹے میں ابتدائی پرائمری تعلیم کو مسلمان اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ گیارہ سال سے ۱۴ سال کی عمر تک پانچویں یا ساتویں جماعت تک کی تعلیم کا انتظام اقلیتیں اپنی مرضی سے کر سکتی ہیں۔ اس لائحہ عمل کے بڑے مفید نتائج نکل آئیں گے۔

مسلمانوں میں عام طور پر سوشل سروس تنظیموں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہنگامی طور پر دو چار لوگ کچھ سماجی بھلائی کے کاموں کے لیے آگے آجاتے ہیں، ورنہ پھر ان کا کوئی وجود نہیں۔ دیہات، قصبات اور شہروں میں سوشل سروس تنظیموں کی سخت ضرورت ہے۔ ایسے حضرات جو صاحب دولت و ثروت ہیں اور جنھیں کچھ فرصت بھی ہے ان کے لیے خدمت کے سیکڑوں مواقع ہیں۔ ہر خدمت کے موقع کو غنیمت جانیں اس سے معاشرے میں ایک خوشگوار تبدیلی ہی نہیں بلکہ جاندار حرکت پیدا ہوگی۔

بابری مسجد کا تقدس اور اس کی تاریخی اہمیت ختم ہو چکی اب اسی مقام پر دوبارہ مسجد بننے کے آثار کم ہیں۔ پہلے تو اس کا دوبارہ تعمیر ہونا مشکل ہے۔ اگر تعمیر ہو جائے تو باقی رہنا اور بھی مشکل ہے۔ دوبارہ تعمیر کے بعد وہ کسی طرح بابر کی مسجد تو نہیں ہوگی بلکہ وہ کسی اور نام سے ہوگی۔ پھر یہ ایک آثار قدیمہ کی طرح ممکن ہے باقی رہے کیوں کہ شاید ہی کوئی اس میں جاکر نماز ادا کر سکے۔ بہتر ہے اس سارے قضیے کو علمائے کرام کے ہاتھوں میں دے دیں اور مسلمان ان کے جو ضروری کام ہیں اس طرف لگ جائیں۔ اس وقت قوم کی نکبت، غربت، افلاس اور جہالت دور کرنے کے طویل مدتی منصوبوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ بابری مسجد کے مسئلے نے ساری

قوم کو دس برس سے پھنسا رکھا ہے۔ وہ اپنے فروعی مسائل
کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ
ناسمجھ، ناعاقبت اندیش لیڈروں کی باتوں پر قطعاً دھیان نہ
دیں۔ ان کی شعلہ بیانی نے ساری قوم کو شعلوں کی لپیٹ
میں لے لیا ہے۔ یہ لیڈران تقاضوں سے ناآشنا ہیں جو
آج مسلمانوں کے لیے ایک باعزت قوم کے طور پر ابھر آنے
کے لیے کیا کچھ خاموش جہد مسلسل کی ضرورت ہے۔

یہاں پر اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ بابری
مسجد کے حادثے اور اس کے بعد کے واقعات پر ملک
کے انگریزی پریس نے جو کچھ فسطائی طاقتوں کی سرزنش اپنے
اداریوں اور مضامین کے ذریعے کی ہے۔ اس کے لیے ہمیں
شکرگزار ہونا چاہیے کیونکہ اپنا تو کوئی انگریزی روزنامہ نام
کو بھی نہیں ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا
ہے کہ فسطائی طاقتوں نے صرف دو چار فی صد اہل وطن
کو ہی متاثر کیا ہے۔ ملک کی ۹۵ فی صد آبادی اس
گھناؤنے فن سے بیزار ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے
کہ ایسے طبقات سے میل جول بڑھائیں۔ یہ ایک نادانی
کی بات ہے کہ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو مندروں کو مسمار
کرکے بدلا لے لیا، مگر ہم ان شریف اہل وطن کی ہمدردیاں
کھو دیں گے جو ملک کی سیکولر طاقت کے لیے ایک
قیمتی اثاثہ ہیں۔ نفرت اور عداوت ذہنوں میں پیدا
ہوتی ہے۔ امن و محبت ہی سے یہ قلعے مسمار کیے جا سکتے
ہیں۔

بابری مسجد کا حادثہ رحمت خداوندی کی ایک نشانی
ہے جس کے ذریعہ للکار کر کہہ رہے ہیں کہ ابھی وقت
ہے، جاگ جاؤ، یہ صرف آنے والے طوفان کا ایک
اشارہ ہے۔ محض اندھے جوش و جذبے سے تم اپنا ہی
بگاڑ لوگے۔ اگر اب بھی تمہارا کچھ پروگرام اور پلان نہیں
ہے تو بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب
"تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

"اسلام تمام دنیا کی برائیوں کا واحد علاج ہے
یہ کہہ کر میں کوئی کھوکھلی شیخی نہیں بگھار رہا۔ مغرب
ایشیا اور افریقہ میں جو کچھ ہو رہا ہے، سوچ سمجھ
کر اس کا مشاہدہ کرنے والا اس کی صداقت
کا اندازہ کر لے گا۔ یہ اسلام ہی ہے جس
میں صحیح اور قابل عمل طریقے سے حقیقی مجلس
اقوام کا تخیل پایا جاتا ہے۔"

طامس آرنلڈ

اُردو بک کلب

سلطانہ حیات ▽

اردو بک کلب کی تحریک پیش کی جاچکی ہے۔ اس تحریک کا حاصل یہ ہے کہ اردو والے خود اپنے بل بوتے پر اردو کو زندہ رکھنے کا عزم کریں جو بتدریج ختم ہورہی ہے مثلاً آج اردو کا کوئی بھی اخبار ایسا نہیں ہے جو کم ازکم دو لاکھ روزانہ چھپے اور اس کی رائے کی کوئی اہمیت ہو اور وہ اردو والوں کو بوقت ضرورت کوئی اہم اطلاع بھی پہنچا سکے۔

۲ - اچھے مصنف اور شاعر اردو میں اب پیدا نہیں ہوں گے کیوں کہ ان کی اچھی سے اچھی لکھی ہوئی کتابوں کا کوئی خریدار نہ ہوگا تو وہ مجبوراً اپنی تخلیقی قوتوں کو دیگر زبانوں کی خدمت میں صرف کردیں گے۔ اردو کا حلقہ محدود ہونے کی منجملہ اور وجوہ کے ایک یہ بھی ہے کہ اردو والوں نے اردو کے اخبارات اور کتابیں وغیرہ خرید کر پڑھنی بند کردی ہیں۔

اردو بک کلب کی تحریک یہ ہے کہ بغیر قید مذہب و ملت ہم سب اردو والے خود بھی عہد کریں اور دوسروں سے بھی عہد کروائیں کہ وہ اپنی آمدنی کا صرف ایک فی صد حصہ اردو کی بقا کی خاطر خرچ کریں گے۔ اس کے لیے عہد نامہ بھر دیں۔ یعنی ہر ماہ جو عہد کیا ہے اس کو اردو کتابیں رسایل اور اخبارات وغیرہ خریدنے پر صرف کریں۔ اگر آپ اردو کے لیے ایک فی صد روپیہ بھی خرچ نہیں کرسکتے تو یہ سمجھیے کہ اردو ختم یعنی ہندوستان میں اردو کا "نہ کہیں جنازہ اُٹھے گا نہ کہیں مزار ہوگا"۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بہی خواہان اردو کی ایک جماعت گھر گھر جاکر عہدنامہ لوگوں سے بھروالے، ساتھ میں کتب فہرست دکھلائے۔ ممکن ہو تو کتابیں بھی ساتھ لے جائے۔ اگر عہد کرنے والے کو کتاب پسند نہ ہو تو دوسری کتابوں کی فرمایش کریں۔ وہ کتابیں نہ ملیں تو آئندہ ماہ کے لیے ان کتابوں کا آرڈر دے دیں لیکن ہر ماہ کتاب خریدنا اپنا فرض سمجھیں۔ کتاب پسند نہ آئے تو کسی دوسرے کو دے دیں یا پھاڑ کر پھینک دیں مگر ہر ماہ اپنا عہد پورا کرنا اپنا فرض سمجھیں۔

اردو کارکنوں کا آپ انتظار نہ کیجیے۔ خود اردو کارکن بنیے یا دوسروں کو بنائیے۔ اردو کارکن ہر کتاب پر کتب فروش سے کمیشن حاصل کرلیں جو ان کی آمدنی کا بعد میں ایک معقول ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ کیسے؟ اس سلسلے میں ہم سے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

فرض کیجیے اس وقت اردو کی کتابوں کی تیاری اور خرید و فروخت پر صرف ایک کروڑ روپے صرف ہوتے ہیں۔ اگر یہ تحریک کامیاب ہوتی ہے تو یہ ایک کروڑ رقم اردو والوں کی ہمت کے مطابق ایک ارب تک پہنچ سکتی ہے۔ اس صورت میں ہمارے اخبارات کی اشاعت لاکھوں ہو جائے گی تو پھر حکومت بھی اردو کے مطالبات کو نہ صرف نظرانداز نہ کر سکے گی بلکہ ان پر عمل پیرا ہونا اپنا فرض سمجھے گی۔

اس تحریک کو کامیاب بنایے تو اس سے ملحق اردو کی ترقی و ترویج کے اور گوشے بھی نکل آئیں گے جن سے روزی روٹی کے ساتھ علم و ادب کے چراغ بھی روشن ہوں گے۔

عہد نامہ یہ ہے

میں عہد کرتا ہوں / کرتی ہوں کہ ہر ماہ کم از کم اپنی کل آمدنی کا ایک فی صد حصّہ یا اس سے زیادہ مبلغ ...... روپیے ماہانہ اردو کتابیں یا اخبارات وغیرہ خریدنے میں خرچ کروں گا / کروں گی۔ کیوں کہ میں اردو زبان کی بقا کو انتہائی اہم اور ضروری سمجھتا / سمجھتی ہوں۔ مجھے اردو بک کلب کا ممبر بنالیجیے۔ نیز اردو تحریک سے باخبر رکھیے۔

یہ عہد نامہ پُر کروانے والے کا نام ______

مکمل پتہ ______

نام و دستخط ممبر ______

ولدیت ______

مکمل پتہ ______ تاریخ ______

نوٹ: یہ عہد نامہ کارڈ پر بھی لکھ کر بھیجا جاسکتا ہے۔ براہ کرم کم از کم ۵ ممبر اور بنانے کی کوشش کریں۔

عہد نامہ بھر کر یہیں بھیجیے۔ اردو بک کلب۔ بی ۲/۴ ریور بنک کالونی لکھنؤ۔ اترپردیش۔

اسلام نے سوسائٹی کا جو نقشہ بنایا ہے، اگر ٹھیک ٹھیک قایم ہو جائے اور صرف چند خانے ہی نہیں بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بن جائیں تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو جائے گا جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑ پتی ہوں گے نہ مفلس و محتاج ملیں گے۔ ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری ہو جائے گی۔"

مولانا آزاد

امن اور ترقی

عطا عابدی ▽

مشہور ہے کہ ہنسنا اور رونا کسے نہیں آتا یعنی جذبات کے مثبت و منفی اظہار سے ہر شخص فطری طور پر آشنا اور متعارف ہے لیکن کچھ رویے ایسے بھی ہیں جو صرف مثبت پہلو رکھتے ہیں اور جس کی تمنا دنیا کا ہر انسان کرتا ہے ان رویوں میں نمایاں، خوب صورت اور توانا رجحان وہ ہے جس کا تعلق امن اور ترقی سے ہے۔ امن اور ترقی صرف دو الفاظ ہی نہیں، فرحت و طمانیت کا خوش گوار لمس بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی آدمی امن اور ترقی کا منکر نہیں ہو سکتا۔ امن اور ترقی کی سطح چاہے خانگی ہو، قصباتی ہو، ریاستی، ملکی یا قومی ہو ہر سطح پر امن اور ترقی کی خواہش کا اظہار ہر زبان پر ملتا ہے۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب دنیا کا ہر شخص امن اور ترقی کا طلب گار ہے تو پھر اس مشترکہ تمنا کی تکمیل کے لیے مشترکہ لائحہ عمل ترتیب دینے میں کیوں کوتاہی ہو رہی ہے؟ تمام لوگ امن اور ترقی کے لیے ایک آواز نظر آنے کے باوجود امن اور ترقی کو کیوں ترس رہے ہیں؟ معروضی نقطۂ نظر ڈالا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ اس میں دوسروں سے زیادہ خود ہماری تساہلی اور قصور کا حصہ ہے۔ یہ قصور اور ناقص رویے کیا ہیں؟ اس کی نشان دہی یا جواب کے لیے ہمیں اس صورت حال پر نظر رکھنی ہوگی جس کا تعلق امن سے نہیں، جنگ و بدامنی سے ہے، ترقی سے نہیں تنزلی و زوال سے ہے۔ جب ہم ان منفی رویوں کو نظر میں رکھیں گے تو اس کے تشکیلی عناصر سامنے آئیں گے۔ ماحول اور سماج کے منفی رویوں کے تشکیلی عناصر کی نشان دہی کے بعد جن ترجیحی اقدام پر عمل ناگزیر ہوگا، اس کے تحت پیدا ہونے والی ضرب و زد میں خود ہم بھی آسکتے ہیں۔ جب یہ احساس پیدا ہو جائے گا اور ہم ذہنی طور پر اپنی کوتاہیوں اور تسامحات کے احتسابی آئینے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے تو ایک ایسی فضا قائم ہو جائے گی جو سماج، ماحول اور معاشرہ کو صراط مستقیم دکھلائے گی، ایک تعمیری رُخ دے گی۔ اپنے کج رویوں کی نشان دہی کرنا اور اسے دور کرنے کی طرف عملاً متوجہ ہونا، امن اور ترقی کے منفی تشکیلی عناصر کی اصلاح کے لیے امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ بعض مخالفت، لڑائی، جنگ و جدل اور ان کے سبب تنزلی و تباہی کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم اپنے ہر قدم کو درست اور مخاطبین یا مخالف کے ہر قدم کو غلط سمجھنے لگتے ہیں۔ اپنے حق کے لیے سوچنا

▽ ای ۲۲/۱۵۳ - ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲

تو ہو جاتے ہیں لیکن دوسروں خصوصاً کمزوروں کو حق لانے کے معاملے میں اس پر عمل کرنے کی ترغیب کا رویہ ملتا ہے لیکن کبھی خود کو فرائض کے پیمانے پر ناپنے کی ضرورت شدت سے محسوس نہیں کرتے۔ ہم اپنی حق گوئی اور بے باکی و قابلِ فخر وجرأت مندی کے جائز اظہار سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اسی حق گوئی اور بے باکی کا اظہار جب دوسرے فریق یا مخالفین کی جانب سے ہوتا ہے تو اسے برداشت نہیں کرپاتے۔ اسے اکثر باغیانہ روش سے موسوم کر دیتے ہیں جب یہ رویہ پروان چڑھتا چلا جاتا ہے تو عدم اعتمادی مخالفت اور جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

امن کے بغیر ترقی کا تصور نا ممکن ہے۔ امن ہے تو ترقی ہے تعمیر ہے۔ امن نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ یہاں ترقی سے مراد وہ ترقی نہیں ہے جس کا تعلق منفی اور انتقامی رویوں سے ہے بلکہ ترقی سے مراد ہے پرسکون طور پر مثبت ونیک عمل میں توسیع واضافہ۔

امن کے تشکیلی عناصر میں حسن سلوک بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ حسن سلوک کا ہر شخص مداح ہوتا ہے حسن سلوک کی تاثیر دلوں پر حکومت کرنے کی ہوتی ہے حسن سلوک کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہر منفی عمل کے جواب میں بھی سختی سے گریز کیا جائے۔ سختی بعض اوقات اصلاح اور اکثر اوقات بغاوت وانتشار کا سبب بنتی ہے سختی کا معیار کیا ہو، یہ واقعہ کی نوعیت پر منحصر کرتا ہے۔ سختی کا استعمال آخری قدم کے طور پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے قبل ہی تمام مضمرات پر غور کر لیا جائے تو سختی اصلاح کا کام کر سکتی ہے۔

موجودہ دور میں خانگی سے لے کر عالمی سطح تک بدامنی اور اگر ابھی پائی جاتی ہے۔ ایسے عالم میں سنجیدہ اور دانش ور طبقہ کی ذمہ داری میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے ان کی اولین اور اہم ذمہ داری ہے کہ ہر سطح پر ہدایت اور سلامتی کا راستہ ہموار کریں۔ ظاہر ہے اس کے لیے جب تک ہم خود امن وسلامتی کی راہ پر گامزن نہ ہوں گے کسی کو راہ دکھانے یا ہدایت کا خاطر خواہ اثر پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ضرورت ہے کہ دانش ور طبقے اور مخلص سیاست داں ملک وقوم ہی نہیں بلکہ دنیا کے سامنے امن وترقی کی راہوں کا سچا اور وفادار مسافر و رہنما بن کر اپنی نیک نیتی اور تیز رفتاری کا ثبوت دیں اور ایک کارواں کی صورت اختیار کر کے دنیا کے لیے نمونۂ عمل بنیں۔

امن اور ترقی خوب صورت ترین الفاظ ہیں۔ اس کی عملی صورت گری اس سے بھی زیادہ خوب صورت، دل کش اور پائیدار ثابت ہوگی۔ تعمیر ہو یا ترقی۔ اس کا تمام تر دارو مدار امن پر ہے۔ امن نہ ہو تو لطیف احساسات گھٹ کر دم توڑ دیتے ہیں۔ امن نہ ہو تو تمام سنہرے خواب بھیانک تعبیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ امن کے بغیر ہر رشتے اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ امن کے بغیر تعمیر وترقی کا تصور کوئی بھی آدمی کسی بھی سطح پر کسی بھی طرح نہیں کر سکتا۔ امن کے بغیر اگر خود ساختہ ترقی ہوئی بھی تو اس کی بنیاد زوال آمادہ ہوگی۔ یہ ترقی لمحاتی اور عارضی ثابت ہوگی۔ ترقی کے وجود کا سارا انحصار امن پر ہے۔ اگر امن کی جلوہ کاری اپنی اصلی صورتوں میں ہو تو تعمیر وترقی کا سارا باب وا ہو جائے۔ ہر طرف طمانیتِ قلب اور دلی راحت سے سیراب انسان نظر آئے۔ لہٰذا ہم اس گفتگو میں صرف امن کی بات کریں گے کہ اس سے خود بخود تعمیر وترقی کے رجحانات کی عکاسی ہو جاتی ہے۔

آج کے ہنگامہ خیز اور پرتشدد جذبوں کی توانائی کے دور میں آخر امن کا قیام کیسے ہو؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمیشہ ہر شخص کے دل وزبان پر گردش کرتا رہتا ہے لیکن اس کے جواب کے لیے اپنی طرف کم اور دوسروں کی طرف

زیادہ تکیہ کرنے کا رجحان عام ہو گیا ہے۔ امن کے علم کی سربلندی کے لیے خود اپنی زندگی اور اپنے دائرۂ کار میں امن کے ان اصولوں کا مظاہرہ لازمی ہے جسے اگر ایک لفظ میں کہنا چاہیں تو حق پسندی کہیں گے۔ حق اپنی زندگی کے ہر عمل پر منطبق ہو تاکہ دنیا ہماری تحریر و تقریر سے ہی امن کا نام اور پیغام نہ سنے بلکہ امن کے علم داروں کی خوبیوں کا مشاہدہ بھی کر سکے۔ اس نمونۂ عمل سے گمراہ کیے ہوئے افراد بھی اپنی بدعملی پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کریں گے۔ وہ یہ سمجھیں گے کہ حقیقی امن کے قیام سے انفرادی اور اجتماعی مسایل کس طرح حل ہوتے ہیں۔ نیز زندگی کا حسن کتنا دل کش، روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔ حق و انصاف کی سربلندی کو اپنے مفادات پر ترجیح دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ امن قایم نہ ہو۔

جب ہم عالمی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ عرب دنیا بدامنی اور فساد میں گھری ہوئی تھی۔ معاشرے میں تمام تر خرابیاں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ تعمیر و ترقی کا تصور لوٹ مار اور جنگ و جدل نیز تسکینِ نفس کے لیے آسایشوں کے حصول تک محدود تھا۔ لیکن ایک دور ایسا آیا جب وہ جنگ جو خطہ، اخلاقی طور پر تباہ خطہ، امن و امان اور تعمیر و ترقی کا گہوارہ بن گیا۔ اُس وقت کے حالات اور سماجی تبدیلیوں کا مطالعہ امن قایم کرنے میں صحیح راہ کا کام انجام دے سکتا ہے۔

یہ مطالعہ اس بات کو واضح کر دے گا کہ امن کے لیے مساوات کتنا ضروری ہے۔ رنگ و نسل، جاہ و حشمت، دولت و ثروت اور قوت و اقتدار کے پیمانے پر کسی کی فضیلت مقرر کرنا امن کی راہ کا روڑا ہے۔ آج ہمارے سماج، ملک اور دنیا میں بدامنی کی اہم وجہ یہی ہے کہ ہم خود کو رنگ و نسل، علاقہ و قصبہ اور جاہ و حشمت کی بنیاد پر دوسروں سے برتر اور افضل سمجھتے ہیں اور اسے تسلیم کرنے پر دوسروں کو مجبور کرنے کا جذبہ اپنے اندر پاتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ایک مخالفانہ روش پیدا ہوتی ہے۔ باغیانہ خیالات جنم لیتے ہیں۔ مخاطب کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے اور پھر دست و گریباں ہونے کی نوبت آ کر امن کو خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ عدمِ مساوات کی فضا ایک دوسرے کا اعتبار و اعتماد چھین لیتی ہے اور شکوک کی دیواریں اونچی ہو کر دشمنی کی حدوں کو چھو لیتی ہیں۔ نتیجہ امن و ترقی کی تمام خوب صورتی کی غارت گری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

مساوات کی عملی صورت گری پہلے بھی قیامِ امن کا ضامن ثابت ہوئی ہے اور آج اور آیندہ بھی ہوگی۔ مساوات کا رجحان جبر و ظلم کی نفی کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی ذات اور مفادات کو اپنی ذات اور مفادات کے مترادف سمجھتا ہے۔ لہٰذا جبر و ظلم کی طرف مایل ہونا اس رجحان کے لیے دشوار کن امر بن جاتا ہے اور امن کی دھندلی تصویر رفتہ رفتہ روشن ہونے لگتی ہے۔

امن کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ امن دنیا کی نیک خواہشات کا نچوڑ ہے۔ سماج کا ہر طبقہ دنیا کا ہر ملک امن کے قیام پر زور دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ امن ہی میں زندگی ہے، عافیت ہے، ترقی ہے، محبت ہے، معصومیت ہے، سکون اور خوب صورتی ہے۔ ان تمام دل کش اور مسحور کن الفاظ میں پوشیدہ جنتِ ارضی کی طلب کس کو نہیں ہے؟ کون نہیں چاہتا کہ اس کی زندگی اپنے نیک مقاصد کے تابع گزرے؟ اور یہ مقاصد قیامِ امن کی کوششوں میں کامیابی کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اگر کچھ لوگ امن کی راہ میں مزاحمت کر رہے ہیں تو وہ گمراہ بھی ہو سکتے ہیں اور استحصال زدہ بھی۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی جو ان کو امن کے بجائے جنگ کی رغبت دلاتی ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ وجہ عدمِ مساوات اور حق و انصاف سے عاری نظام تو نہیں۔ اگر کچھ لوگ واقعی گمراہ ہیں، اپنے مقاصد سے دور جا چکے ہیں اور امن کے بجائے

امن کی فضا پیدا کرکے کسی غیر کے ہاتھوں کا کھلونا بنے بغیر اپنے حسن سلوک، اخلاقِ عالیہ، نظامِ عدل و مساوات اور علم داری سے ان کو یہ بتانا ہوگا کہ ماضی کی قابلِ احترام ساجوں کا تقدس صرف امن سے قائم رہ سکتا ہے حال کی انسانی خوش حالی اور کامیابی صرف امن سے ممکن ہے مستقبل کے حسین خواب اور تمناؤں کی تعبیر کا انحصار صرف امن پر ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو، اس پیغام کو اس کے اصل مفہوم میں لوگوں کے دلوں میں اتارنے میں کامیاب ہوئے تو سمجھیے کہ قیام امن کے لیے ایک مضبوط بنیاد ڈال دی۔ امن کے ایک قابلِ عمل اور مفید ترین نظام کی تشکیل کا خواب حقیقت میں بدل دیا۔

امن کے قیام کے لیے جنگ یا لڑائی کی نہیں جدوجہد اور قربانی کی ضرورت ہے۔ جنگ ایک انتہائی درجے کی مجبوری میں اٹھایا گیا قدم ہے۔ جنگ نے اب تک مسائل ہی پیدا کیے ہیں۔ اس نے تباہی و بربادی کے المناک نظارے ہی پیش کیے ہیں۔ جنگ سے کوئی تصفیہ آج تک نہیں ہو سکا میدانِ جنگ کی کامیابی کو ترقی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ میدان جنگ کی کامیابی خوشیوں کی نوید لاتی ہے تو اس کی حیثیت لمحاتی ہوتی ہے۔ ہاں اس کے تلخ اثرات برسوں تک دلوں میں بغض و تعصب، حسد و کینہ اور تشکیک و تخریب کے جذبات کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ یہ سوچنا کہ جنگ کے سہارے ہر چیز فتح کر لیں گے، صحیح نہیں ہے۔ حقیقی دنیا میں جنگ سے زیادہ طاقت ور، بڑی اور اہم چیز امن ہے امن سے ہم بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں لیکن جنگ سے ہم سوائے چند خطوں کی فتح اور بدلے میں انتقامی عمل، ردعمل کے اور کیا حاصل کر سکتے ہیں؟ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے سخت سے سخت ترمراحل کی مشکلات کا حل امن ہی سے ملا ہے، جنگ سے نہیں۔ لہٰذا اس خیال کو دل سے محو کرنا ہوگا کہ جنگ سے کوئی بڑی چیز مل جائے گی۔

معاشرے میں پائی جانے والی سماجی و اخلاقی خرابیوں سیاسی و صحافتی کج رویوں، اقتدار پسند افراد کا استحصالی عمل، معاشی بدحالی کے ذمہ داران اور امن کے ماحول کو درہم برہم کرنے والوں کے خلاف متعلقہ سطح پر جنگ کی جا سکتی ہے لیکن اس کی نوعیت چونکہ میدانی جنگ کی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اسے جنگ سے نہیں بلکہ ایک مہم، ایک جدوجہد، ایک عزم اور ایک عمل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس مہم پر روانہ ہونے والے افراد یا کارواں کا رخ البتہ اس طرف ہونا چاہیے جہاں امن کا قیام آسان سے آسان تر ہو سکے۔ اس کے لیے ظلم و زیادتی کی نہیں بلکہ ہمدردی، انسانیت نوازی اور خلوص نیت کی ضرورت ہوگی۔

ہمارے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں سائنس کی پروردہ ٹکنالوجی کے رول کی اہمیت کو سمجھنے سے ہم قاصر رہے۔

——— پروفیسر ع۔ الا اعم

اتر پردیش کے ہمارے ایک درجن گرلز انٹر کالجوں کے ۱۹۹۲ء کے نتائج

کہیں اتنا اچھا تو کہیں خراب کیوں

بیگم نصرت شروانی ▽

اتر پردیش کے ہمارے بارہ گرلز انٹر کالجوں کے ۱۹۹۲ء
ائج چارٹ میں پیش ہیں۔ ان سب سے ملاکر ایک
چھ بتیس طالبات بورڈ امتحان میں شریک ہوئیں اور
ہزار چار سو ایک یعنی چھیاسی فیصد پاس ہوئیں اور
سو چونسٹھ یعنی دس فیصد فرسٹ ڈویژن لائیں۔ یہ
ن کالجوں کا اوسط رزلٹ۔

چارٹ میں نتائج پاس فی صد کے اعتبار سے
ہیں۔ تین کالجوں (۱ قدوائی میموریل ۲ نجیب الدولہ
۳ فتح پور) سے سو فی صد طالبات پاس ہوئیں۔
کے بعد ۴ مسلم جوبلی سے اٹھانوے فیصد پاس
آل احمد سے ستانوے فیصد پاس ۶ کرامت
نے چورانوے فی صد پاس اور ۷ گورنمنٹ خورشید
ستاسی فی صد پاس۔ ان سات کالجوں میں
اوسط سے بہتر رہا۔ ۸ حمیدیہ میں نتیجہ چھیاسی
صد پاس یعنی اوسط کے بالکل برابر رہا۔ باقی چار
ں میں پاس فیصد اوسط سے کمتر رہا۔

فرسٹ ڈویژن:

آج کل فرسٹ ڈویژن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ چارٹ میں ہر ایک کالج کا فرسٹ ڈویژن کا فیصد تناسب بھی درج ہے۔ اس اعتبار سے بھی سب سے اچھی کارکردگی قدوائی میموریل کی ہے جہاں سے اٹھائیس فی صد طالبات فرسٹ ڈویژن لائیں۔ اس کے بعد آل احمد اور گورنمنٹ خورشید دونوں سے بائیس فی صد فرسٹ ڈویژن۔ پھر مسلم جوبلی سے چودہ فی صد فرسٹ ڈویژن اور کرامت حسین سے بارہ فی صد فرسٹ ڈویژن۔ ان پانچ کالجوں میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب اوسط سے زیادہ ہے۔ نجیب الدولہ میں دس فی صد فرسٹ ڈویژن یعنی اوسط کے بالکل برابر۔ چھ کالجوں میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب اوسط سے کمتر رہا۔

اوسط سے نیچے: جن چار کالجوں میں پاس فیصد اوسط سے نیچے رہا وہ ہیں ۹ بیگم فیر اکیاسی فی صد پاس۔ ۱۰ امام باڑہ مسلم چہتر فی صد پاس۔ ۱۱ اسلامیہ چھیاسٹھ فیصد

▽ سکریٹری مسلم گرلز ایجوکیشنل کمیٹی۔

انٹر بورڈ امتحان

شریک امتحان	پاس تعداد	پاس فیصد	فرسٹ ڈویژن تعداد	فرسٹ ڈویژن فی صد	گرلز انٹر کالج کا نام۔ مقام۔ ضلع
۹۳	۹۳	سو	۲۶	اٹھائیس	قدوائی موریل الہ آباد
۱۰	۱۰	سو	۱	دس	نجیب الدولہ۔ نجیب آباد۔ بجنور
۱۲	۱۲	سو	-	صفر	فتح پور گرلز۔ مئو
۲۳۶	۲۳۲	اٹھانوے	۳۳	چودہ	مسلم جوبلی کانپور
۶۷	۶۵	ستانوے	۱۵	بائیس	آل احمد امروہہ۔ مراد آباد
۲۲۳	۲۱۰	چورانوے	۲۶	بارہ	کرامت حسین لکھنؤ۔
۲۰۹	۱۸۱	ستاسی	۴۶	بائیس	گورنمنٹ خورشید۔ رام پور۔
۲۰۲	۱۷۳	چھیاسی	۵	دو	حمیدیہ الہ آباد
۹۸	۷۹	اکیاسی	-	صفر	بیگم خیر بستی
۲۸۶	۲۱۷	چھہتر	۱۱	چار	امام باڑہ مسلم۔ گورکھ پور
۱۷۴	۱۱۵	چھیاسٹھ	۱	ایک	اسلامیہ بریلی
۲۲	۱۴	چونسٹھ	-	صفر	مجیدیہ گرلز وارانسی
۱۶۳۲	۱۴۰۱	چھیاسی	۱۶۴	دس	بارہ کا ٹوٹل

پاس اور ۱۴ مجیدیہ چونسٹھ فی صد پاس۔

جن چھ کالجوں میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب اوسط سے کمتر رہا وہ ہیں امام باڑہ مسلم چار فی صد فرسٹ ڈویژن۔ حمیدیہ دو فی صد فرسٹ ڈویژن۔ اسلامیہ ایک فی صد فرسٹ ڈویژن اور باقی تین (فتح پور، بیگم خیر اور مجیدیہ) میں فرسٹ ڈویژن صفر۔

باقی ہیں کیا دیرے

ابھی ہم یہ تجزیہ نہیں کر رہے کہ ان اداروں میں مسلم طالبات کے نتائج اپنی غیر مسلم ہم جماعتوں کی بہ نسبت کتنے بہتر یا کتنے کمتر ہیں۔ ابھی ہم یہ جائزہ بھی نہیں لے رہے کہ گزشتہ سال یعنی ۱۹۹۱ء کی بہ نسبت نتیجہ کتنا بہتر یا کمتر ہوا۔

کیوں؟ یہ تجزیہ و جائزہ کیوں نہیں؟ اس لیے کہ ابھی ہمارے قریب دس گرلز انٹر کالج ایسے ہیں جن کی قبلہ محترمہ پرنسپل صاحباؤں نے ابھی تک ۱۹۹۲ء کا نتیجہ ہم کو نہیں بھیجا۔ باقی سب یا تقریباً سب نتائج آنے کے بعد ہی کوئی تجزیہ و جائزہ زیادہ وسیع اور زیادہ معنی خیز ہو سکے گا۔ چنانچہ جن محترمہ پرنسپل صاحباؤں

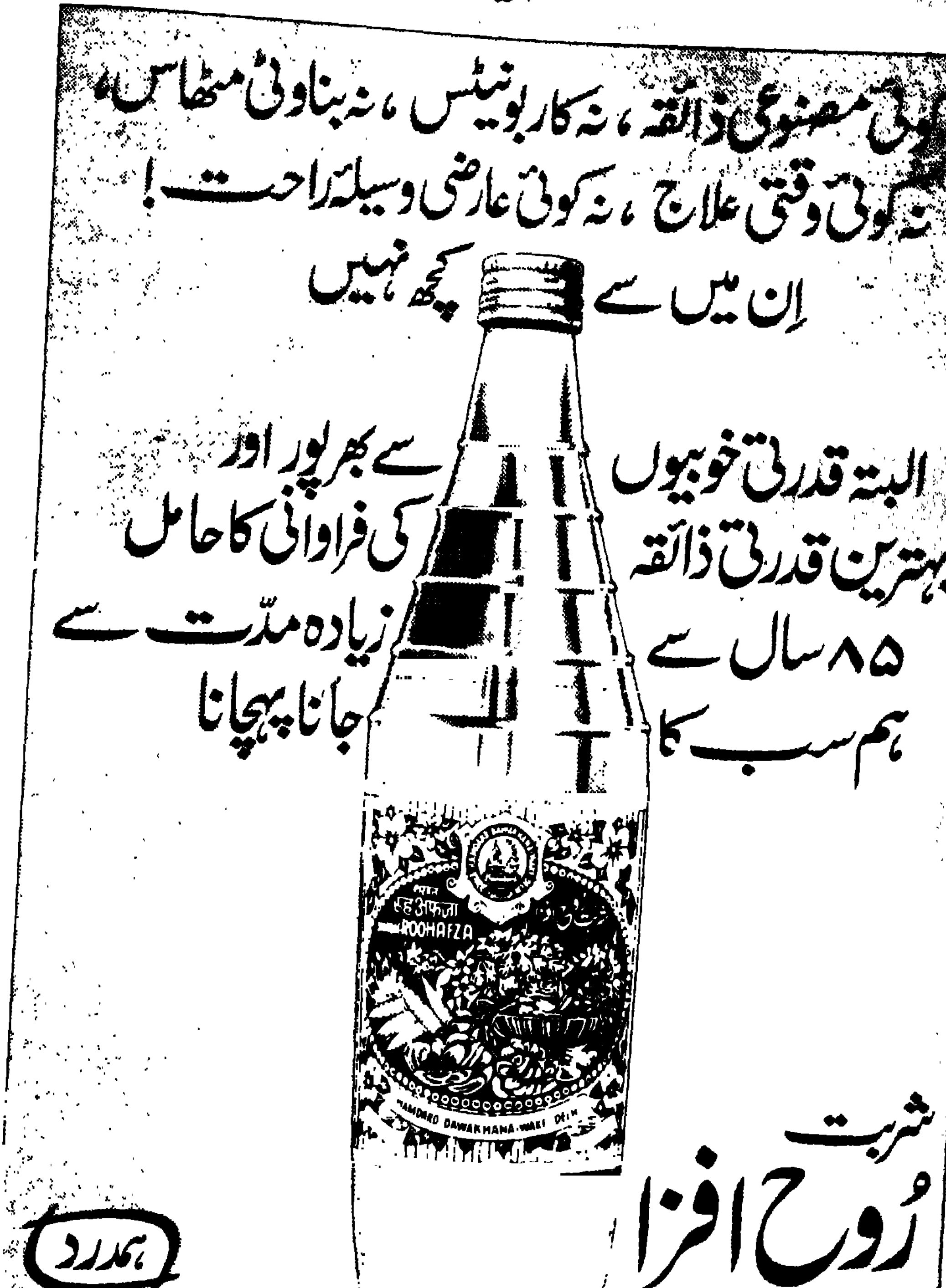
نے ابھی تک ۱۹۹۲ کا رزلٹ نہیں بھیجا۔ وہ براۓ کرم اب جلد از جلد بھیج دیں۔

البتہ سر دست اتنا ضرور کہا (یعنی لکھا) جاسکتا ہے کہ اگر بارہ میں سے ہمارے چھ کالج ایسے ہیں جن سے سو فی صد یا کم از کم نوے فی صد طالبات پاس ہوسکتی ہیں تو پھر ہمارے کسی کالج سے صرف چونسٹھ یا چھیاسٹھ فی صد طالبات کیوں پاس ہوں؟ اگر ہمارے ہی چھ کالج ایسے ہیں جن سے اٹھائیس فی صد سے لے کر کم از کم دس فی صد تک طالبات فرسٹ ڈویژن لاسکتی ہیں تو پھر ہمارے ہی ان کالجوں میں فرسٹ ڈویژن کا تناسب صفر کیوں ہو؟ اگر متعلق اسکولوں کے ذمہ دار خود اس بابت غور فرمائیں تو بڑا اچھا ہوگا۔

"خدا کی قسم! میں نے کسی شکستہ دل کو جس کا سارا خاندان اس کی نگاہوں کے سامنے قتل کر دیا گیا ہو، ایسی جرأت، دلیری اور بے فکری سے لڑتے نہیں دیکھا۔ امام حسینؑ کے حملے سے ان کے دائیں بائیں کے لوگ اس طرح بھاگتے تھے جس طرح بھیڑیے کو دیکھ کر بکریاں بھاگتی ہیں۔"

عبید اللہ بن عمار

تاریخ طبری۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۹


نہ کوئی مصنوعی ذائقہ ، نہ کاربونیٹس ، نہ بناوٹی مٹھاس،
نہ کوئی وقتی علاج ، نہ کوئی عارضی وسیلۂ راحت!
اِن میں سے کچھ نہیں
البتہ قدرتی خوبیوں سے بھرپور اور
بہترین قدرتی ذائقہ کی فراوانی کا حامل
۸۵ سال سے زیادہ مدّت سے
ہم سب کا جانا پہچانا
ROOHAFZA
شربت
روح افزا
ہمدرد

جلد ۱۲

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ۵

مئی ۱۹۹۳ء

* بانی
سر سید احمد خاںؒ

* سرپرست :
پروفیسر محمد نسیم فاروقی
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

* مدیر
کبیر احمد جائسی

* نائب مدیر :
احمد مجتبیٰ قریشی

* انچارج سرکولیشن :
شفیق احمد

* ترتیب : سرفراز

زر سالانہ :

انڈیا ... Rs. 45.00

بیرونی ممالک ... US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US $ 8.00 عام ڈاک

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,

TAHZIBUL AKHLAQ &

NISHANT,

ALIGARH MUSLIM

UNIVERSITY,

ALIGARH. 202002

PHONE : 24827

مندرجات

تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو۔

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ : پرنٹر پبلشر: کبیر احمد جائسی - مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق

ROF. M. N. FARUQUI
ICE-CHANCELLOR

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH—202002

May 4, 1993

ear Students,

After going through the trauma of tragic death of some of our promising students d turmoil that followed, the A.M.U. Campus is slowly returning towards normalcy. The niversity Community had always emerged stronger from such crises with reinforced termination and resolve not to allow vested interests to vitiate the academic atmosere of the University. I believe that nobody should be allowed to play with the career the students The politics of agitations should be discouraged and it should be our deavour to stunt the growth of fissiparous tendencies and create an atmosphere concive to peaceful pursuit of knowledge.

As you know the University campus remained disturbed only due to uncalled for tivities of some undesirable elements who had none of the interests of the University its students at heart.

Realising the hardship gone through by the students community, the University has vanced the dates of the Summer vacations by a month so that the task of reviewing e academic programmes should be completed and teaching and examinations resumed oothly. The University Administration acting upon the recommendations made in rious meetings of the University functionaries has decided to hold extra classes and ssional tests etc. of the final year students from 10th May, 1993 onwards and to conct the final year examinations between the 20th May and 9th June, 1993. The detailed ching and examination programmes are being drawn-up by the concerned Deans of e Faculties and shall be notified shortly. The University would see to it that the examiions are conducted within the minimum possible time and as a special gesture to the al year students hold their examinations in backlog papers in continuation of the pers of the final year without any gaps. This has been decided upon with a view that e final year students are able to get their results at the earliest.

I hope the student community would respond whole-heartedly to this programme, ough in this process the University shall be burdened with a considerable amount of ditional work and loss of finances. The security arrangements at the examination centres e also being reinforced for peaceful conduct of examinations. Thus, every effort is ing made to see that the students are not put to any loss of their academic activities ., teaching, examinations etc.

The above programme is subject to total peace and tranquility in the campus which disturbed, would have adverse effect on the examination and admission programmes.

Wishing you good luck for your examinations.

Yours sincerely,

M. N. Faruqui

(Prof. M. N. Faruqui)
Vice-Chancellor

اداریہ

سات آٹھ اپریل کی درمیانی شب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا، اساتذہ اور انتظامیہ پر جو کچھ گزری اس سے قومی اخبارات اور الکٹرانک میڈیا کے ذریعے ملک کا بچہ بچہ واقف ہو چکا ہے۔ ایک بار پھر بربریت کی وہی داستان دہرائی گئی جو ۱۹۴۷ء کے بعد سے آج تک لاٹھی اور بندوق بردار دہراتے چلے آ رہے ہیں اور نہ جانے کب تک دہراتے رہیں گے۔ واقعے کی سنگینی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اندرونی سلامتی کے وزیر اور گورنر بہ نفس نفیس بہ عجلت تمام علی گڑھ آئے تاکہ وہ خود حالات کا جائزہ لے سکیں۔ اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں یونیورسٹی طلبا سے تقریباً خالی ہو چکی ہے، دفاتر کھلے ہوئے ہیں مگر تعلیمی دنیا کی ہما ہمی مفقود ہے۔ ممبران پارلیمنٹ کے پیہم ہنگاموں کی وجہ سے حکومت نے عدالتی انکوائری کا حکم دے دیا ہے۔ ممکن ہے کہ عدالتی انکوائری ہو بھی جائے مگر اس بات کی یقین دہانی کرانے والا کوئی نہیں ہے کہ مذکورہ انکوائری کمیٹی کی رپورٹ کا حشر گیان پرکاش انکوائری کمیٹی رپورٹ جیسا نہ ہوگا۔

عوام ہوں یا بندوق بردار افراد دونوں ہی کو یہ بات ہر وقت یاد رکھنی چاہیے کہ بندوقیں پھول نہیں گولیاں برساتی ہیں وہی گولیاں جو جانوں کا خاتمہ کر دیتی ہیں، یہ گولیاں چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں، آتش زنی کرنے والوں اور اسی طرح کی دوسری حرکتیں کرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں، یہ احتجاج کرنے والوں، اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے والوں یا اپنے مطالبوں کو لے کر سڑکوں پر نکل آنے والوں کے لیے ہرگز ہرگز نہیں ہوتیں، مگر آزاد ہندوستان کا المیہ یہ ہے کہ یہاں بڑا سے بڑا ظلم اور بڑی سے بڑی دھاندلی قانون کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھتی ہے۔ اب یہ لے اتنی بڑھ چکی ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے فعال رکن پارلیمنٹ جناب اٹل بہاری واجپئی کو پارلیمنٹ میں حکومت سے سوال کرنا پڑا کہ بندوق برداروں میں جو شدید فرقہ وارانہ جذبات سرایت کر گئے ہیں اس کے لیے حکومت کیا کر رہی ہے؟ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ واجپئی جی کو بھی فرقہ واریت پر تشویش ہونے لگی ہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ دہلی میں بوٹ کلب پر مظاہرہ کرنے والے طلبا کے ساتھ بندوق دھاریوں نے جو غیر انسانی سلوک روا رکھا اس کے غلط اور بے جا ہونے کا اعتراف انسانی وسائل کے وزیر ارجن سنگھ

نے کیا ہے مگر ہائے رے مجبوری ہمارے یہ وزیر باتدبیر حکومت میں رہتے ہوئے بھی غلط اور بے جا کو نہ تو ختم ہی کروا پا رہے ہیں اور نہ ہی کوئی ایسا لائحۂ عمل بنا رہے ہیں کہ آئندہ اس قسم کے واقعات نہ ہوں۔ گولیاں صرف سماج دشمن عناصر، چوروں، قاتلوں، ڈاکوؤں اور اسی قماش کے لوگوں پر چلیں، طلبا اور پُرامن مجبوروں پر نہیں۔

حکومت کی گدی پر تو ایک سے ایک "اعلیٰ دماغ" براجمان ہیں۔ ہم کو اس بات کے ماننے میں تامل ہے کہ یہ "اعلیٰ دماغ" اتنی موٹی سی بات بھی نہ جانتے ہوں گے کہ ایک گولی اگر ایک مخالف کی زندگی کا خاتمہ کرتی ہے تو کم از کم دس نئے مخالف ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ آسام ہو یا پنجاب، جھارکھنڈ ہو یا کشمیر ملک کے جس حصے میں بھی بے اطمینانی یا شورش ہے وہاں گولیوں کے ذریعے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو پا رہا ہے بلکہ گولیوں کی وجہ سے حکومت کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ آخر اربابِ اقتدار اس بات کو کب محسوس کریں گے، کب وہ ایسا لائحۂ عمل مرتب کریں گے کہ گولیوں کے ذریعے مخالفین کی تعداد میں اضافہ نہ کیا جائے جس طرح بہت سے ملکوں میں پھانسی کی سزا ختم کر دی گئی ہے کیا اسی طرح سے بندوق برداروں سے جنگی حالات کے علاوہ گولیاں واپس نہیں لی جا سکتیں۔ کیا حکومت بندوق برداروں کو یہ حکم نہیں دے سکتی کہ گولیاں صرف ڈاکوؤں، قتل کر کے بھاگنے والوں، زبردستی زنا اور بداعمالی کرنے والوں، قومی ذخائر کو تباہ کرنے والوں ہی پر چلائی جائیں فرضی مڈبھیڑوں، احتجاجی جلسوں اور سڑک پر نعرہ لگانے والوں پر نہ چلائی جائیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے المناک حادثے نے یہاں کے لوگوں کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ مقامی انتظامیہ نے ۲۵ منٹ کی ایک ویڈیو فلم بنائی ہے جس میں یہاں کے طلبا کو "غیر قانونی حرکتوں" میں ملوث ہوتے دکھایا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انتظامیہ کو پہلے سے اس بات کا اندازہ تھا کہ طلبا کی طرف سے غیر قانونی حرکتیں ہوں گی جس کے نتیجے میں بندوق بردار گولی چلائیں گے اور طلبا کی موت ہوگی طلبا کی موت کو منصفانہ قرار دینے کے لیے یہ ویڈیو فلم ثبوت کا کام دے گی۔ چونکہ عدالتی جانچ کا کام شروع ہو چکا ہے اور جانچ کرنے والا کمیشن اس ویڈیو فلم کے بارے میں انتظامیہ سے خود پوچھ تاچھ کرے گا اس لیے ہم اس پر رائے زنی سے گریز کرتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ عدالتی جانچ کا کام جلد مکمل ہو اور اس کی رپورٹ کا حشر گیان پرکاش کمیٹی رپورٹ جیسا نہ ہو۔ اگر زبانِ خنجر کو چپ کر بھی دیا گیا تو آستین کے لہو کو پکارنے سے کوئی بھی نہ روک سکے گا۔

لگاؤ یا لاگ؟

سید حامد ○

واشنگٹن سے آئی ہوئی ایک خبر ۱۲ر اگست کے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوئی ہے۔ ۱۱ر اگست کے نیویارک ٹائمز سے ماخوذ ہے ۴۶ سالہ پاکستانی شاعر اختر حمید خاں کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ قصور؟ انھوں نے "احمق اور شیر ببر" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک احمق انسان شیر کے بچے کو پالتا ہے۔ بچہ بڑا ہو کر اسے چٹ کر جاتا ہے۔ شاعر کا اشارہ تھا پاکستان کی فوج کی طرف جو اس کی دانست میں پاکستان کو کھائے جا رہی ہے۔

ایک انتہا پسند گروہ نے جو مذہبی عالموں پر مشتمل تھا، اس نظم کو دوسرے معنی پہنا دیے۔ انھوں نے کہا کہ شیر سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں کیونکہ ان کا لقب شیرِ خدا تھا۔ اسی طرح شاعر ناقابلِ معافی گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔

امریکی اخبار کی رپورٹ بتاتی ہے کہ جرم ثابت ہونے کی صورت میں شاعر رسن و دار کا سزاوار ہوگا۔

غلطی ہائے مضامین کی اس سے زیادہ عبرتناک مثال شاید ڈھونڈے نہ ملے۔ جی نہیں۔ جوئندہ یابندہ مثال ضرور ملے گی اور وہ ہمارے ہندوستان جنت نشان میں۔ یاد کیجیے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو جب سزائے موت کا حکم ہوا تو اس کی تعمیل کے لیے تارا مسیح نامی جلاد مامور ہوا۔ بھٹو مرحوم کی شہرت اسلام دوستی کی نہیں تھی۔ ان کا دور اسلام اور اخلاق سے بیگانگی کے لیے جانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے عہد میں آوارگی اور بدچلنی کا بول بالا ہوا۔ ہم اس تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ بھٹو صاحب کو جب پھانسی دی گئی تو ہندوستان کے بعض طبقوں پر کیا گزری۔ کشمیر میں بعض مذہبی انتہا پسندوں نے عیسائی مشنوں پر حملے کیے اور ان میں سے چند کو نذرِ آتش کر دیا۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ ایک عیسائی تارا مسیح نے سابق صدر پاکستان کی جان لی تھی۔ اس کا بدلہ سرحد پار لیا جا رہا ہے۔

دلم بہ سوخت زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است
[حیرت سے میرا دل جل اٹھا کہ یہ کیسی عجیب حرکت ہے]۔

اب نفسِ مضمون کی طرف آئیے۔ ایک حد تک پاکستانی مسلمان اور ہندوستانی مسلمان ایک ہی

○ سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ۔ جہالت، عجلت، جذباتیت کی وجہ سے ان کا رد عمل اکثر یا تو مضحکہ خیز ہوتا ہے یا عبرت ناک ۔ کوئی پوچھے ان نام نہاد محبان اسلام سے کہ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کہ تارا مسیح اور اختر حمید خاں نے کیا قصور کیا تھا ۔ تارا مسیح نے بہ حیثیت ایک سرکاری ملازم کے اپنا فرض ادا کیا ۔ کوئی عیسائی پھانسی کا سزاوار قرار دیا جاتا تو تارا مسیح اسے بھی پھانسی کے تختہ پر اسی بے نیازی سے لٹکا دیتا ۔ غور کیجیے تو جلاد سے زیادہ غیر جانب دار انسان کم ہوتے ہوں گے جن کی وہ جان لیتا ہے اُس سے اُسے ذرہ برابر عداوت نہیں ہوتی ۔

اختر حمید خاں کا روے سخن کنایۃً پاکستان میں فوج کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی طرف تھا ۔ انھوں نے بہت سلیقہ اور دھار کے ساتھ اپنے مفہوم کو ادا کر دیا لیکن ان کو سزا دینے کے لیے ان کی نظم سے وہ مفہوم منسوب کیا جا رہا ہے جو شاعر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور جس تک انتہائی بلند پرواز مشکل پسند اور موشگاف قاری کا ذہن کبھی نہیں پہنچ سکتا ۔

یہ دونوں مثالیں ایسی ہیں جن پر آپ حسب ظرف مسکرا بھی سکتے ہیں اور تلملا بھی سکتے ہیں ۔ اول الذکر سے ایک مضحکہ خیز اجتماعی بوکھلاہٹ کو رواج دیا جائے گا ۔ آخر الذکر سے اس دل دوز درد کا اظہار ہوگا جو ہر امت کے بگاڑ پر ہر باحس اور باشعور انسان محسوس کرے گا کہ ابتدا کیا تھی اور انتہا کیا ہے ۔ عروج کو زوال سے مفر نہیں لیکن چشم فلک نے نہ ایسا عروج دیکھا ہوگا نہ ایسا زوال جس سے مسلمانوں کو واسطہ پڑا ۔ وہ امت جس نے انسانیت کی جبیں سے سارے جالے جھاڑ دیے، ساری شکنیں دور کر دیں ۔ سارا غبار دھو ڈالا ۔ جس نے انسان کو اعتماد اور سرفرازی بخشی ۔ جس نے اخلاق کا محور انصاف کو بنایا جس نے خلق کی خدمت اور فرض کی ادائگی کو عبادت قرار دیا ۔ اس کا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ناصیہ پیہم شکن آلود، جالوں اور گرد و غبار سے اٹا ہوا ؟ اور وہ خود خدمت کے نام سے نالاں اور گریزاں ۔ اعمال عبادت سے منہ پھیرے ہوئے ، افکار عقاید کو بیٹھ دیے ہوئے جذبات، انصاف سے روگرداں ۔ ایک جسد نیم جاں پر اسلام کا لیبل لگا رکھا ہے ۔ اسلام کی دعوت کی راہ میں ہم سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ۔ جو ہمیں دیکھتا ہے اسلام سے بدظن ہو جاتا ہے ۔ وہ سوچتا ہے کہ اسلام جہالت اور جذبات کا مرکب ہے ۔ سوجھ بوجھ اور سنجیدگی اسے چھو بھی نہیں گئی ۔ اس کے ماننے والے عقاید اور عبادات کی پرچھائیں بھی اپنے افکار و اعمال پر نہیں پڑنے دیتے ۔ ہمارا وہ حال ہے جیسے قرآن کریم کو بغیر ترجمے کے ناظرہ پڑھ لیا جائے ۔ ہم جانتے ہی نہیں کہ قرآن کے معنیٰ اور مفہوم کیا ہیں؟ قرآن و سنت کے زیر سایہ عادات و اطوار اور نقطۂ نظر حتیٰ کہ افتادِ طبع تک پر کیا اثر پڑتا ہے ۔ ان کے زیر اثر سچے کھرے اور خدمت پیشہ کردار کیسے ڈھلتے ہیں، یہ سبق ہم بھول گئے، عقل و فہم اور ایمان و عقیدہ، عبادت اور خدمت، افکار و اعمال کا وہ زندہ اور تابندہ ارتباط جو انسانیت کو اسلام کی دین تھا ۔ مسلمانوں کے حافظہ اور ان کی چال ڈھال اور اخلاق و اطوار سے محو ہو گیا ۔

دو مثالیں جو اوپر دی گئیں، ہماری شامت اعمال سے وہ کمیاب نہیں ہیں ۔ ایک ہفتے کے اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے ، جلسوں میں جا کر تقریریں سن لیجیے ۔ گھروں میں جھانک کر دیکھیے ، ہر جگہ آپ کو اس طرز نگاہ کی اور واقعات، حادثات، بیانات اور نگارشات کے

تیں اس وضع کے رد عمل کی مثالیں مل جائیں گی۔ اس رخ، اس نقطۂ نگاہ کو جہل مرکب کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ایک ایسی چٹان ہے جس سے ٹکرا ٹکرا کر اصلاح کی نہ جانے کتنی کوششوں کے جہاز چکنا چور ہو چکے ہیں۔ ان کی بھلائی کی جو بات کہیے اسے برے معنی پہنا دیے جائیں گے۔ نیت پر شبہ کیا جائے گا۔ دین کے اصل اصول، اس کی غرض وغایت کی بات کیجیے تو جہالت کے شبستان نشین اسے الحاد اور زندقہ سے ملا دیں گے۔ سمجھنے سمجھانے، سوچنے، پرکھنے، بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لینے کی کھڑکیاں ایک ایک کر کے بند ہوتی جا رہی ہیں۔ ہٹ دھرمی، کج بحثی شعلہ باری کا بازار گرم ہے۔

ایسے کٹھور نقطۂ نظر کو بدلنا ہوگا۔ زمین شور میں سنبل جڑ نہیں پکڑتا۔ جہالت اپنے گھپ اندھیرے کو کم نہیں ہونے دیتی۔ اگر یہ کم ہونا شروع ہوا تو سچائی اور انصاف کا آفتاب عالم تاب اس کا شیرازہ بکھیر کر اسے ہوا میں اڑا دے گا۔ اسلام کو شکایت اپنے ماننے والوں سے ہے، اپنے نکتہ چینوں سے نہیں۔ ان کی نکتہ چینیوں کے جواب دیے گئے ہیں، دیے جا رہے ہیں، دیے جائیں گے۔ ان جوابات کی تردید اسلام کے مخالفین نہیں کر پائیں گے، نہ انھیں ایسا کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی مکمل اور موثر تردید ہمارے اعمال اور کردار، ہمارے اسالیب نظر اور ہمارے عالیہ افکار میں ملتی ہے۔ ہم اپنے مخالفین کی دریدہ دہنی یا ہرزہ سرائی پر جب ہنگامہ برپا کرتے ہیں تو اسلام کی پیروی اور اس سے اپنی نسبی وابستگی کا اعلان نہیں کرتے۔ ہم اعلان اس بات کا کرتے ہیں کہ ہم نے اس کی تائید میں دلایل لانے کی صلاحیت کھو دی ہے۔ ہنگامہ اور تشدد اور شور وغل وہاں شروع ہوتا ہے جب حلم وعلم اور فکر وتدبر معزول ہو جاتے ہیں۔

اسلام عبودیت ہے، خدمت ہے، بصیرت ہے، مسئولیت ہے۔ اسلام ہمیں ہزاروں خانہ ساز معبودوں سے یکسو ہو کر خدائے واحد کے سامنے سربسجود کرتا ہے۔ اسے سجدہ کرنے میں انسان کی سربلندی کا راز ہے۔ اسلام ہمیں خلق خدا کی خدمت اور فلاح اور اصلاح کے لیے مامور اور مکلّف کرتا ہے۔ اسلام ہم سے کائنات کے رموز کی تہیں کھلواتا ہے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر جینا سکھاتا ہے۔ اسلام ہمیں اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ یہ ذمّہ داری اور یہ احتساب، یہ جواب دہی نہیں ہے، لمحہ بہ لمحہ ہے۔ آخری جواب دہی روز قیامت کے لیے رکھی گئی ہے۔ محشر و معاد سے مراد یہی ہے اور یہ سب کچھ فیضان رسالت ہے۔ اسلام نور ہے، رحمت ہے، برکت ہے۔ کیا ہمیں زیب دیتا ہے کہ اسے اس کے محور سے ہٹا دیں اور اسے نکم"؛

> "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زندگی کے آخر میں بھی اپنے لیے اسی منصب کا دعویٰ کیا، جس سے انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تھا اور میں یہ یقین کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اعلیٰ ترین فلسفہ اور سچی مسیحیت ایک روز یہ تسلیم کرنے پر متفق ہوں گے کہ آپ ایک پیغمبر تھے، خدا کے سچے پیغمبر۔"
>
> پروفیسر بارسورتھ اسمتھ

ظلمت اور شدت میں بدل دیں۔

پروردگار نے دین کو اپنی توحید کے اظہار اور انسانیت کے تحفظ کے لیے مامور کیا ہے لہذا دین داری کا سب سے کھرا پیمانہ انسانیت ہے۔ جس شخص میں جتنی زیادہ انسانیت ہے اتنا ہی زیادہ وہ دین دار ہے۔ یاد رکھیے یہ ممکن ہے کوئی شخص مسلمان نہ ہو لیکن اچھا انسان ہو لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص مسلمان ہو اور اچھا انسان نہ ہو۔ اچھا ہو کہ ہم اپنے آپ کو اس پیمانے سے ناپیں۔

لاگ اور لگاؤ میں بظاہر بہت چھوٹا سا فرق ہے لیکن لگاؤ کی لاگ سے دیر نہیں لگتی۔ لیکن دراصل ہیں دونوں ایک دوسرے کی ضد۔ خدارا سوچیے کہ آپ کو اسلام اور انسانیت سے لاگ ہے کہ لگاؤ اگر لگاؤ ہے تو آپ کو اپنے جھکاؤ، اپنے اندازِ فکر، اپنے طرزِ عمل کو بدلنا ہوگا۔ اور اگر لاگ ہے تو اپنی روش پر قایم رہیے۔

"کیا کہا؟ اللہ سے صرف اہلِ علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز بہت عجیب۔ یہ بات جو مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کس نے بتائی۔ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد (صلعم) ان پڑھ تھے، انھیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی انھیں یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب، بہت عجیب۔"

پروفیسر جینز

نقوش۔ شخصیات نمبر ص ۹-۸

بابری مسجد کے تناظر میں

مسلمانوں کے آئندہ لائحہ عمل کا مسئلہ

ریاض الرحمٰن خاں شروانی ٥

تہذیب الاخلاق سیاسی جریدہ نہیں ہے لیکن آج انسانی زندگی میں سیاست کی جو اہمیت ہے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر تہذیب الاخلاق کے اپریل ۱۹۹۳ء کے شمارے کا اداریہ اور کم سے کم تین مضامین ایسے ہیں جو یا تو براہِ راست سیاست سے متعلق ہیں ورنہ ان پر سیاست کی پرچھائیں پڑتی ہوئی صاف محسوس ہوتی ہے۔ اس مضمون کا مقصد ان سب تحریروں کا تفصیلی جائزہ لینا نہیں ہے لیکن ان سب میں بعض باتیں ایسی ضرور کہی گئی ہیں جو وضاحت طلب یا مستحقِ تائید و حمایت ہیں۔

فاضل مدیر نے اپنے اداریے کا آغاز اس طرح کیا ہے:

"بابری مسجد کے واقعۂ انہدام پر مسلمانوں کا ردّعمل مختلف انداز سے سامنے آرہا ہے"۔

لیکن تعجب ہے کہ صرف دو انداز کے ردّعمل کے اظہار پر اکتفا کیا ہے اور ان میں سے دوسرا ردّعمل ایسا ہے جو پہلی مرتبہ تہذیب الاخلاق کے صفحات ہی پر پڑھنے کو ملا ہے کہیں اور نظر سے نہیں گزرا ہے۔ فاضل مدیر نے ایک ردّعمل تو یہ بتایا ہے کہ

"مسجد شہید ہوچکی، اس کا بدل ملنا ممکن نہیں ہے۔ اگر ٹھیک اسی جگہ پر جہاں ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء تک مسجد واقع تھی، دوسری مسجد بنادی جائے تب بھی وہ "بابری مسجد" نہ ہوگی، ایک نئی مسجد ہوگی۔ اس لیے بابری مسجد کے لیے فوراً نوحہ و ماتم بند کرکے دوسرے "مقاماتِ آہ و فغاں" کی طرف متوجہ ہوا جائے"۔ وغیرہ وغیرہ

دوسرا ردعمل یہ بیان کیا گیا ہے کہ (نعوذ باللہ)

"نہ تو خدا کی خدائی کی کوئی حقیقت ہے، نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی۔ نہ مسلمان خیر الامت ہیں اور نہ ہی تائید و نصرتِ الٰہی ان کے ساتھ ہے"۔ —— وغیرہ وغیرہ

خیر یہ دوسرا ردّعمل تو سراسر مریضانہ اور قطعاً غیر اسلامی ہے اور اس کا بہت اچھا جواب جناب محمد اسحاق نے اپنے "بابری مسجد سے سبق" میں دیا ہے کہ

"وہ (مسلمان) اس بات کو سوچنے کے لیے

---

٥ سابق صدر شعبۂ عربی۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ —— حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ

تیار نہیں کہ حضور اکرمؐ سے زیادہ غیبی تائید کے اور کون مستحق ہو سکتے تھے لیکن رسولِ خدا نے (؟) جنگ بدر میں پوری امکانی تیاری کے ساتھ تین سو تیرہ جاں نثاروں کے ساتھ نکل آئے۔ تب انھیں بھی آئی۔"

ی تائیدِ الٰہی کی اولین شرط مادی تیاری ہے۔ قرآن کا ان ہے کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ انسان کو ی ملے گا جس کی وہ کوشش کرے گا۔ اس کوشش صحیح خطوط پر انجام پانا بھی ضروری ہے اور اس کے دی پہلو سے صرف نظر بھی ممکن نہیں ہے۔ تاہم حیرت ہے کہ فاضل مدیر نے اپنے اداریے میں مسلمانوں کے ی نقطۂ نظر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ وہ یہ کر سکتے تھے کہ ں نقطۂ نظر کا ذکر کر کے اگر چاہتے تو اس پر تنقید تے لیکن صحافتی دیانت کا تقاضہ تھا کہ اس کا ذکر ضرور نا چاہیے تھا۔ وہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسجد اسی جگہ بنی چاہیے ال وہ پہلے واقع تھی اور اس لیے بنی چاہیے کہ ۶ر دسمبر ۹۲ء ، واقعۂ ہائلہ کے بعد بھارت ورش کے مانیہ پردھان تری جی نے غیر مشروط الفاظ میں اس کی یقین دہانی کی ی۔ خیر انھوں نے ۱۵ر اگست ۱۹۹۱ء کو دہلی کے لال قلعے فصیل سے یقین دہانی تو یہ بھی کی تھی کہ ایودھیا میں تع عمارت کو نقصان ہرگز نہیں پہنچنے دیا جائے گا اور شبہ وہ اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکے۔ تاہم انھیں ں یقین دہانی پوری کرنے کا ایک اور موقع تو ملنا ہی چاہیے ں کی حفاظت اور اس میں نماز کا اہتمام سرکار کی ذمہ داری نا چاہیے۔ تاہم اگر وزیر اعظم اور مرکزی سرکار اپنے اس ہد پر بھی قائم نہیں رہتی ہے تو کم سے کم مسلمانوں کو حمیت ں اور عزتِ نفس کا اتنا ثبوت تو دینا ہی چاہیے کہ وہ رکار کے قائم کیے ہوئے کسی ٹرسٹ سے وابستہ نہ کر ایودھیا میں کسی دوسرے مقام پر مسجد کی تعمیر میں

پارٹی نہ بنیں۔ یہی مسلم پرسنل لا بورڈ اور ملی کونسل کا موقف ہے اور بلاشبہ اس موقف کو مسلمانانِ ہند کی بھاری اکثریت کی تائید حاصل ہے جس میں مجھ جیسے بے مایہ مسلمان بھی شامل ہیں۔ جناب محمد اسحاق صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

" بابری مسجد کو ڈھانے کا مسئلہ محض وقتی اور ہنگامی نہیں ہے بلکہ فاشسٹ تنظیموں کا (کے؟) پچاس سالہ پلان کا یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ تاکہ وہ بتلا سکیں کہ یہ ملک ان کا ہے اور مسلمان "ہندوتو" تحریک کو قبول کر لیں ورنہ ان کا رہنا بسنا مشکل ہے۔"

اس مسئلے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے اور اس کا مقابلہ اسی سطح پر کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے کسی مصلحت یا کسی دباؤ سے بابری مسجد کے محاذ سے قدم پیچھے ہٹا لیے تو پھر ہم نہ متھرا اور بنارس کی مسجدوں کو بچا سکیں گے اور نہ اس ملک میں اپنی انفرادیت اور شناخت قائم رکھ سکیں گے۔

سید حامد صاحب ملت کے ایک نہایت دردمند، جری، باحوصلہ اور فعال بزرگ ہیں۔ اِدھر کافی مدت سے وہ قلمے اور قدمے مختلف محاذوں پر ملت کی جو بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں اس کی اس وقت شاید کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے۔ میرا ان سے عقیدت و نیاز کا ذاتی رشتہ اب کئی سال پرانا ہو گیا ہے، اس کے باوجود بابری مسجد کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں سے متعلق میں پوری طرح ان کا ہم خیال نہیں ہوں۔ بابری مسجد کی سابق قیادت کے بارے میں ان کے اور میرے نقطۂ نظر میں کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے بابری مسجد سے ہٹ کر بھی کرنے کے کئی اہم

کام میں۔ مثلاً انھیں اپنے بچوں کی تعلیم کے فروغ اور اپنی اقتصادی حالت کی بہتری کی طرف پوری توجہ مبذول کرنی چاہیے تاہم، جیسا کہ عرض کیا، میرے نزدیک بابری مسجد اپنے انہدام کے باوجود آج بھی اس ملک میں مسلمانوں کی دینی حمیت اور عزت نفس کی علامت بن گئی ہے اور ہمیں اس معاملے کو اس کی انتہا تک پہنچائے بغیر چارہ نہیں ہے اور اس کے لیے اس وقت مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت ہی سب سے زیادہ کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔

سید حامد صاحب نے اپنے پیش نظر مضمون "آزمائش کی گھڑی" میں من جملہ دیگر امور کے ملک کی سیاسی جماعتوں کا تجزیہ بھی کیا ہے لیکن اس تجزیے میں ان کا قلم ان جماعتوں کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی پر ہی رک گیا ہے، آگے نہیں بڑھا ہے۔ اس کے برعکس میری رائے ہے۔ ——— میں اپنی اس رائے کا اظہار کہیں اور بھی کر چکا ہوں کہ مسلمانان ہند کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ اپنی آئندہ جدوجہد کی سمت متعین کرنے کے لیے اپنے دوسرے ہم وطنوں میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کی اچھی طرح پہچان کر لیں اور پھر دوستوں کے ساتھ مل کر دشمنوں سے نظریاتی سطح پر نبرد آزما ہو جائیں بلکہ میرا خیال ہے کہ گزشتہ چند ماہ کے یا چند برسوں کے حالات نے ان دوستوں اور دشمنوں کی نشان دہی خود بخود کر دی ہے اور اس لیے اس بارے میں ہمارا کام کافی آسان ہو گیا ہے۔ کیا ہم ان جماعتوں اور ان سیاسی رہ نماؤں کو ایک سطح پر رکھنے کی غلطی کر سکتے ہیں جنھوں نے ۱۹۹۰ء میں بابری مسجد کو ٹوٹنے سے بچایا اور جنھوں نے ۱۹۹۲ء میں اسے توڑا یا کم سے کم اس کے خاموش تماشائی بنے رہے ورنہ ممکن ہے کسی سطح پر اس سازش میں شریک بھی رہے ہوں؟ صاف صاف عرض کرنے دیجیے کہ کیا ایک طرف وی۔ پی سنگھ، لالو پرشاد اور ملایم سنگھ اور دوسری طرف کلیان سنگھ اور ان کی جماعت کے دوسرے لیڈروں اور نرسمہا راو اور ایس۔ بی۔ چوان کو ایک سطح پر رکھا جا سکتا ہے؟ اسی طرح ۶ دسمبر کے بعد مسلمانوں پر جو قیامت مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، گجرات اور یو۔ پی کے بعض شہروں اور خود دہلی کے بعض علاقوں میں ٹوٹی اور زیادہ تر سرکاری مشینری کے ہاتھوں ٹوٹی اور اس کے برخلاف مغربی بنگال بہار اور اڑیسہ میں وہ یا تو بالکل محفوظ رہے یا بہت کم تختۂ مشق بنے۔ اس صورت میں اول الذکر ریاستوں کی برسر اقتدار جماعتوں بھاجپا اور کانگریس (آئی) اور ثانی الذکر ریاستوں کے ارباب اقتدار یعنی بائیں بازو کی جماعتوں اور جنتا دل کے ساتھ ایک جیسا معاملہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ میری ناچیز رائے میں سید حامد صاحب جیسے ذی فہم، با تدبر، مستعد اور فعال دانشوروں کا اولین فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ غیر کانگریسی سیکولر جماعتوں کو جو بدقسمتی سے مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہیں، قریب لانے کی کوشش کریں اور پھر ان کے ساتھ مل کر ملک کے دوسرے بچھڑے ہوئے طبقوں کے تعاون سے بھاجپا اور کانگریس (آئی) کے خلاف سیاسی محاذ بنائیں، تاکہ آنے والے انتخابات میں، جہاں تک ممکن ہو، اقتدار غلط ہاتھوں میں پہنچنے سے محفوظ رہے۔ مسلمانوں اور دوسرے پس ماندہ طبقوں کے مسایل کا حل اسی صورت میں ممکن ہے۔

پروفیسر محمد یٰسین کا مسلم قیادت کا تجزیہ بڑی حد تک درست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد حفظ الرحمن کے بعد مسلمانوں کو کوئی ایسا لیڈر نہیں ملا جس میں ہوش اور جوش کا امتزاج ہو اور جس کی نظر وسیع ہو۔ تاہم مولانا محمد حفظ الرحمن کا تعلق بھی کانگریس سے گہرا تھا اور آخر عمر میں جبل پور کے فسادات سے متاثر ہو کر ان کی سوچ میں

ایسی تبدیلی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے جو ملک اور خود مسلمانوں کے مستقبل کے لیے خوش آئند نہیں کہے جا سکتے تھے۔ یہی غلطی ڈاکٹر سید محمود نے کی تھی جس کا بعد میں انھیں اعتراف کرنا پڑا تھا اور اس سے تائب ہونا پڑا تھا۔ دراصل اس ملک کی ساخت ایسی ہے کہ ہمارا کوئی مسئلہ محض ایک فرقے کا مسئلہ نہیں رہ سکتا ہے اور اس کے حل کی خاطر مختلف فرقوں کا باہمی اتحاد و تعاون ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس مقصد سے جس تنظیم کی بھی تشکیل کی جائے اس کا سیکولر کردار واضح سے واضح تر ہو اور اس میں فرقہ پرست عناصر (چاہے ان کا تعلق اکثریتی فرقے سے ہو یا اقلیتی فرقے سے) کی بالکل گنجائش نہ ہو۔ اس لحاظ سے میرے نزدیک مسلم مجلس مشاورت سے زیادہ مفید اور کامیاب تجربہ خدائی خدمت گار یا انسانی برادری کا تھا جس کی داغ بیل ۱۹۶۹ء میں خان عبدالغفار خاں نے اپنی ہندوستان تشریف آوری کے موقع پر ڈالی تھی لیکن جیسے ان کی ہندوستان سے واپسی کے بعد شری جے پرکاش نرائن اور ان کے حواریوں نے اغوا کر کے اپنے گھر کی داسی بنا لیا تھا اور اسی لیے اس سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکا جس کی توقع تھی اور پھر وہ اپنی موت آپ مر گئی۔ یہ تجربہ آج بھی دہرائے جانے کے قابل ہے چاہے خدائی خدمت گار کے نام سے ہو یا انسانی برادری کے (اگرچہ میں پہلے نام کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ متحدہ ہندوستان کے سابق صوبۂ سرحد میں اس کی ایک شاندار تاریخ ہے اور یہی بادشاہ خان کا منشا تھا)۔ تاہم، جیسا کہ عرض کیا گیا اس پر کسی بھی فرقے کے فرقہ پرست افراد اور یا جماعتوں کی پرچھائیں ہرگز نہیں پڑنی چاہیے ورنہ یہ پودا بارآور ہونے سے پہلے ہی حسبِ سابق مر جائے گا۔

محمد یٰسین صاحب نے ملک کی تقسیم کے تناظر میں بعض باتیں ایسی لکھی ہیں جو محلِ نظر ہیں۔ تاہم چونکہ ان کی حیثیت پیشِ نظر مضمون میں محض ضمنی ہے، اس لیے ان سے تفصیلی بحث ضروری نہیں ہے۔ البتہ ان کا یہ فرمانا کہ:

"بٹوارہ اکثریتی علاقوں کی بنیاد پر ہوا مذہبی بنیاد پر نہیں۔"

اس وقت درست قرار دیا جا سکتا تھا جب اس بٹوارے کی جدوجہد مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں ہوئی ہوتی لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ پاکستان تو بنا تھا سرحد، سندھ، بلوچستان، پنجاب اور بنگال میں اور اس کے لیے لڑائی لڑ رہے تھے یو۔پی، بہار، سی۔پی، بمبئی اور مدراس کے مسلمان۔ اس پوری تحریک کا سب سے زیادہ مضحکہ خیز اور ناقابلِ فہم پہلو تھا جس کے نتائج اقلیتی ریاستوں کے مسلمان آج تک بھگت رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میرے نزدیک قولِ فیصل جناب محمد اسحاق کا یہ جملہ ہے کہ

"تقسیمِ ہند یا پاکستان کا بننا مسلمانوں کی سیاسی غلطی کا ایک شاہکار ہے!"

اپنی اس سیاسی غلطی کو بغیر کسی ذہنی تحفظ کے قبول کیے بغیر ہم اپنے لیے مستقبل کی منصوبہ بندی صحیح خطوط پر کر ہی نہیں سکتے ہیں۔

محمد اسحاق صاحب کے مضمون کی اٹھان بہت اچھی تھی اور درمیان میں بھی انھوں نے کئی قابلِ قدر باتیں کہی ہیں لیکن وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ یعنی

"بابری مسجد کا تقدس اور اس کی تاریخی اہمیت ختم ہو چکی۔ اب اس مقام پر دوبارہ مسجد بننے کے آثار کم ہیں پہلے تو اس کا

دوبارہ تعمیر ہونا مشکل ہے۔ اگر تعمیر ہو جائے
تو باقی رہنا اور بھی مشکل ہے۔" ــ وغیرہ وغیرہ
اس سے اتفاق ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ، جیسا کہ خود ان
کا ایک اقتباس اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ بابری مسجد
ملک کی تسلطی طاقتوں کی جیت کی علامت بن گئی ہے
اور بقول اُن کے۔

"ان تسلطی طاقتوں کے پیچھے حکومت اور
ایڈمنسٹریشن کی ہمدردیاں حاصل ہیں۔"

اس صورت میں ان طاقتوں اور ان کے ہمدردوں سے
لوہا لیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یہ لوہا ظاہر ہے کہ
توپ و تفنگ کی صورت میں لینا ممکن نہیں ہے لیکن
اپنی اخلاقی اور اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر ضرور لیا
جانا چاہیے۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے
اتحادِ فکر و عمل کی اگر کوئی بنیاد بن سکتی ہے تو وہ بابری
مسجد ہی ہے۔ اسے چھوڑ کر مسلمانوں میں ایسا ذہنی انتشار
پیدا ہوگا کہ وہ پھر کسی کے سمیٹے سمٹیں گے نہیں اور نہ
معلوم کس کس دِشا میں منہ اُٹھا کر چل کھڑے ہوں گے
اور پھر ہم کہہ بھی کیا رہے ہیں۔ محض یہی نا کہ اگر وزیر اعظم کو
اپنے قول کا پاس ہے تو وہ بابری مسجد اسی جگہ تعمیر کرائیں
جہاں وہ پہلے قائم تھی اور اگر وہ اپنے اس دوسرے قول
کا پالن اسی طرح کرنے سے معذور ہیں جیسے پہلے قول

یعنی بابری مسجد کی حفاظت ہر قیمت پر کرنے سے قاصر
رہے تو پھر برائے مہربانی کوئی ٹرسٹ قایم کر کے ایودھیا
میں کسی دوسری جگہ مسجد تعمیر کرانے کی زحمت گوارا نہ
فرمائیں اور نہ اس معاملے میں مسلمانوں کی کوئی تنظیم
یا افراد ان کے ساتھ تعاون کریں۔ اس صورت
میں پروفیسر محمد یٰسین کا یہ ارشاد کہ:

"مجھ گنہگار کی سمجھ میں تو بس اتنی بات
آتی ہے کہ ہم مسجد کا معاملہ حکومت پر
چھوڑ دیں اور اس پر اصرار نہ کریں کہ
عبادت گاہ کب، کہاں اور کیسے بنے۔"

کیسے قابلِ عمل قرار دیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اس صورت
میں کہ چند ہی صفحات پہلے وہ خود کانگریس اور اس کی
حکومتوں پر اعتراض کر چکے ہیں کہ نہ تو انھوں نے

"مسلمانوں کے مسایل کی طرف خاطر
خواہ توجہ کی اور نہ اُن کی اعلیٰ قیادت
اُبھرنے دی۔ پے در پے فسادات
کے دوران مسلمان فرقہ پرستوں کے ہاتھوں
تباہ و برباد ہوتے رہے۔" وغیرہ وغیرہ

ایسی جماعت اور اس کی حکومت پر کسی معاملے میں بھی
کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے اور بابری مسجد جیسا نازک
اور حساس مسئلہ اس کی صواب دید پر کیسے چھوڑا
جا سکتا ہے۔

"علمِ جغرافیہ، دریافت و انکشاف،
بین الاقوامی تجارت، نئی جگہوں کی
کھوج لگانے اور سیاحت کے میدان
میں اہلِ یورپ مسلمانوں کو اپنا
ثقافتی بزرگ جانیں۔"
جے۔ ایچ۔ کریمر

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲ - شمارہ ۵ (مئی ۱۹۹۳ء)

انوکھی آواز

سینئر آئی پی ایس آفیسر مسٹر شجاع الدین ساجد نے کہا ہے کہ چند مجرم صفت ظالم آئی پی ایس افسروں کو ان کے کیے کی سزا نہ ملنے کی وجہ سے پوری پولس فورس بدنام ہو رہی ہے بلکہ عوام پر پولس کے تشدد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "عوام اور اخبارات ہم پولس افسروں کے کھیل کو اب بخوبی سمجھنے لگے ہیں اور ہمارا کھیل صاف ہے۔ یعنی اپنی طاقت اور جبر کا بے جا استعمال کرنا، اپنے ماتحتوں کو پوری طرح چھوٹ دینا، قانون توڑ کر بے ہتھیار لوگوں پر زیادتیاں کرنا اور گنہگاروں اور ظالموں کو بچانا۔" مسٹر ساجد کے بقول ہر زیادتی اور ظلم کے بعد اعلیٰ پولس افسر عوام اور ان کے رہنماؤں کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں کہ اگر پولس کے قصوروار اسٹاف کے خلاف کارروائی کی گئی تو اس سے فورس کی ہمت شکنی ہوگی۔

ان خیالات کا اظہار مسٹر ساجد نے سینٹرل انڈین پولس سروس ایسوسی ایشن کی رکنیت سے استعفا دیتے ہوئے اس خط میں کیا ہے جو کہ ایسوسی ایشن کے سکریٹری مسٹر نکھل کمار کو بھیجا تھا۔ یہ خط ۳۰ مارچ ۱۹۹۳ء کو بھیجا گیا تھا اور حال ہی میں اسے اخبارات ...

خط میں مسٹر ساجد نے قصوروار پولس والوں کو فورس کی ہمت شکنی کا بہانہ بنا کر سزا نہ دینے کی ذہنیت کی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ بات کوئی نہیں ہے کہ ہمارے نزدیک ان بے شمار انسانی جانوں کے مقابلے میں چند مجرم صفت پولس افسروں کا ظالمانہ حوصلہ زیادہ اہم ہے جو ان کے یک طرفہ برتاؤ کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ چند لوگوں کو سزا دینے سے لاکھوں افراد پر مشتمل فورس کا حوصلہ کیسے پست ہو سکتا ہے۔

پولس کے ظالمانہ کردار کا ذکر کرتے ہوئے سینئر آئی پی ایس افسر نے اس خط میں کہا ہے کہ آج کل کوئی بھی ہندو مسلم جھگڑا چند گھنٹوں میں پولس اور مسلمانوں کے بیچ ٹکراؤ کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کے نتیجے میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت اور پولس کے درمیان اجنبیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کے بقول حالیہ بے شمار واقعات میں قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پولس نے مظاہرین کو ہلاک کرنے کی نیت سے گولیاں چلائیں، جب کہ ...

نیت سے گولی چلانی چاہیے کہ خلاف قانون جمع ہونے
والا ہجوم ڈر کر بھاگ جائے یا مظاہرین گر پڑیں تاکہ انھیں
گرفتار تو کیا جا سکے مگر ان کی جان کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ مسٹر
ساجد کے مطابق پچھلے دنوں کچھ پولس والوں نے جن میں اعلیٰ
افسر بھی شامل ہیں مجمع پر اس طرح گولیاں چلائیں جیسے
وہ چاندماری کر رہے ہوں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان
کے سامنے کارڈ بورڈ کے پتلوں کے بجائے زندہ انسان
تھے جو اُن کی مشق کا نشانہ بنے۔ ان کے بقول یہ بھی بہت تا
ہوا ہے کہ کچھ افسروں نے پہلے قدم کے طور پر ہی اندھا
دھند گولیاں برسائیں اور وہ قاعدے قانون توڑے
جو یہ کہتے ہیں کہ گولی چلانے سے پہلے لاٹھی چارج اور
آنسو گیس کا استعمال ضروری ہے۔ کیونکہ قانون کا
مقصد مجمع کو منتشر کرنا ہے نہ کہ لوگوں کو جان سے مارنا۔

مسٹر ساجد نے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے
کہا ہے کہ انھیں جسٹس آنند نرائن مُلّا کے وہ الفاظ یاد
آتے ہیں جو انھوں نے ایک کیس کے فیصلے میں کہے تھے۔
انھوں نے کہا تھا کہ

"پولس فورس خاکی وردیوں میں
ملبوس ڈاکوؤں کا ایک گروہ ہے"

مسٹر ساجد نے کہا کہ میں آئی پی ایس ایسوسی ایشن
کی معرفت پولس کے سربراہوں کو ہوشیار کرنا چاہوں
گا کہ عوام اور پریس کو ہماری چال بازیوں کا اسی روز
علم ہو جائے گا جس دن انھیں یہ پتہ چل گیا کہ گنہگار
پولس والوں کے خلاف کارروائی کی پوری طاقت خود
پولس کے اعلیٰ افسروں کے پاس ہوتی ہے اور یہ کہ بے گناہوں
کا خون کرنے والوں کو سزا دینے میں سیاسی رہنماؤں
کی منظوری کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی جیسا کہ پولس کے
اعلیٰ افسر عوام کو غلط تاثر دیتے آئے ہیں۔

مسٹر ساجد کے مطابق انھوں نے تین
سال پہلے ستمبر ۱۹۹۰ء میں بھی ایک خط لکھا تھا جس
میں کہا تھا کہ:

" اب جب کہ میں بڑے بڑے
اقتدار اور رعونت زدہ پولس افسروں
کے درمیان سانس لیتا ہوں مجھے
مظلوم اور غریب عوام کے حق میں
کھل کر لڑنے کے لیے آئی پی ایس
گروہ کو رخصتی سلام کہنے اور
عہدے کو خیرباد کہنے میں کبھی
کبھی عار نہیں ہوگا۔"

ان کے بقول سرکار نے ان سے
اس خط پر صفائی مانگی تھی اور انھوں نے پھر یہی
جملہ صاف صاف دہرا دیا تھا۔

(بشکریہ قومی آواز — دہلی۔)

۳ رمئی ۱۹۹۳ء

چرچے ہماری پسماندگی کے

عبدالمتین

مسلمانوں کی پسماندگی کے بارے میں ادھر کئی برسوں سے اہل نظر زیادہ فکرمند ہو گئے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اس موضوع پر اکثر تقاریر کی جاتی اور مباحثے منعقد کیے جاتے ہیں۔ یہ خوش آئند ہے اس لیے کہ ماضی کی روش سے ہٹ کر مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اب مسلمانوں کے مسایل پر اظہار خیال کرنے لگا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے یعنی آزادی کے بعد ایک ربع صدی تک مسلم اقلیت کے مسایل پر الگ سے اہلِ فکر کم ہی غور کرتے تھے اور اس کا برملا اظہار نادانی یا دیوانگی سمجھا جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ فرزانگی ختم ہوئی لیکن اب دوسری خرابی آ گئی ہے اور وہ ہے اہلِ فکر کی کثرت۔ صحت مند سماج کے لیے ضروری ہے کہ مختلف گروہوں اور مشاغل میں معقول تناسب رہے۔ اس تناسب میں کمی یا زیادتی قومی علالت کی علامت ہے۔ اہلِ فکر کا ہجوم اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ابھی سہل پسندی غالب ہے۔ عمیق فکر کے لیے قومی تاریخ کا وسیع اور گہرا مطالعہ اور ملی مزاج سے ہم آہنگی ضروری ہے۔ یہ صفات ماضی قریب میں موجود تھیں لیکن آزاد ہندوستان کی نئی نسل ہنوز ان سے ناآشنا ہے۔ فکر کا معاملہ شاید غالب کے میخانے کی طرح ہے جہاں جام بھرے رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں۔ وقیع اور قد آور شخصیت موجود نہ ہو تو بہتوں میں اپنے قد کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ فی زمانہ اکثر اہلِ فکر اعتماد گزیدہ نتائج کی طرف چھلانگ لگا رہے ہیں لیکن نتیجہ ہر حال میں ہر شخص کا ایک ہی رہتا ہے یعنی یہ کہ مسلمان کاہل ہیں، ان میں اتحاد نہیں ہے، بغض و حسد ان کی فطرت ہے۔ لہذا یہ برادران وطن سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ کبھی یہ بات فارسی آمیز اردو میں خود ساختہ بلند میز سے کہی جاتی ہے اور اس احساس سے کہی جاتی ہے کہ ان کی ذہنی بلندیوں تک رسائی عوام الناس کے لیے ممکن نہیں ہے اور کبھی ان خیالات کا اظہار بہ زبان انگریزی ہوتا ہے تاکہ عوام اور خواص کا فرق قایم رہ سکے۔ بہر صورت یہ فکر کا انتشار اور رغامی ہے۔ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ مفکرین کے اس ہجوم کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اکثر مذاکرے اور مباحثوں میں مبین اور واضح حقیقت کے بیان پر سارا زور بیان صرف کر دیا جاتا ہے۔ اسی

۴۔ زکریا مارکیٹ، نزد میڈیکل کالج، علی گڑھ - یو۔ پی۔

حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آزادی کے بعد مسلمان اعلیٰ ملازمتوں میں، تجارت میں، تکنیکی تعلیم میں اور سائنسی علوم میں برادران وطن سے بہت پیچھے ہیں۔ اس مسلّم حقیقت کو تسلیم کرلینے کے لیے مختلف کالجوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ طلباء کی کل تعداد مختلف مذہبی گروہوں کے طلباء کی تعداد اور پھر کہیں لال اور کہیں ہری روشنائی سے مختلف خانوں میں ان کا فی صد تناسب ایک نقشہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سب پیچیدہ عمل اور محنت کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ پس ثابت ہوا کہ مسلمان پس ماندہ ہیں۔ مضمون نگار کی محنت قابل تعریف ہے لیکن Sense of Proportion میں انتشار بہرحال ایک خرابی ہے۔

ہمارے مضمون نگاروں کے اس بیانیہ اسلوب کی بہت بڑی وجہ شاید اکثریتی فرقے کے دانش وروں کا اسلوب ہے۔ ملک کی حالت پر جب یہ حضرات مختلف تعلیمی اداروں میں توسیعی خطبات دیتے ہیں تو تمام وقت موجودہ حالات کی تصویر کشی میں صرف کر دیتے ہیں۔ دردمندی اور خلوص اس تصویر کو بہت بھیانک بنا دیتے ہیں۔ سیاست دانوں کی موقع پرستی، اقربا پروری تمام اخلاقی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر مالی منفعت کی ہوس بہت تفصیل سے بیان کی جاتی ہے لیکن ان نکات پر آکر بات ختم کر دی جاتی ہے۔ اخلاقی تنزل کی وجوہات سے بحث نہیں کی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اکثریتی فرقے کے اکثر دانشور سمجھتے ہیں کہ بلند دعووں سے قطع نظر ان کے مذہبی ادب میں جاری و ساری مادی فلسفہ اور اس کے زیر اثر وجود میں آنے والی قدریں ذمہ دار ہیں۔ اس اخلاقی انتشار کی خالص دیسی ماحول میں اب اظہار ہو رہا ہے۔ اس ناممکن بحث میں اکثریتی فرقے کے لوگ الجھتے نہیں ہیں۔ قریب قریب یہی حال اکثر امریکی شعراء کا ہے جو مغرب کی بے معنی زندگی پر بہت بامعنی اور پُر اثر شعر کہتے ہیں لیکن وجوہات کے

تجزیے سے مکمل گریز کرتے ہیں۔ کیونکہ تہذیبی برتری سے متعلق مفروضات کی شکست کا احساس خاصہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

چند سطور پہلے کہا گیا تھا کہ اصل کام پسماندگی ثابت کرنا نہیں بلکہ اس کا خلوص سے تجزیہ اور اس کو دور کرنے کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر کے بعد تجاویز پیش کرنا ہے۔ یہاں ایک تلخ حقیقت بیان کرنا ضروری ہے۔ قومی معاملات میں محض خلوص پر مشتمل سنجیدگی کافی نہیں ہوتی ہے۔ پچھلے سو سال کی تاریخ میں کئی اہم فیصلے کیے گئے جن کی خامیوں اور مکمل غلط ہونے کا اعتراف انھیں مخلصوں نے بعد میں کیا۔ ان گھروں کی لرزہ دینے والی داستان پڑھیے جن کے مکین روزمرہ استعمال میں آنے والے برتن بیچ کر مخلصوں کی دعوت پر افغانستان ہجرت کر گئے اور مکمل تباہی کے بعد وطن لوٹ آئے۔ ترکی میں خلافت کی حفاظت کے لیے بڑے جذبے اور خلوص سے ہندوستان میں تحریک چلائی گئی۔ چند سال بعد جب خود اہل معاملہ نے خلیفہ کو ۱۹۲۴ء میں ملک بدر کر دیا تو ان میں سے اکثر اکابرین اس واقعہ کو اپنی زندگی کا عظیم ترین حادثہ کہہ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ اس مذہبی تحریک سے وابستہ بعض رہنما ملک کی اندرونی سیاست میں لادین سیاست کے علم بردار ہوئے۔ قیام پاکستان کی مخالفت کرنے والے مخلصوں کا گروہ قیام پاکستان کے بعد اپنے بچوں کو مستقبل کی خوشنما تعمیر کے لیے خاموشی سے پاکستان بھیجتا رہا۔ متحدہ ہندوستان اور لادینی سیاست کا علم بردار الجمعیۃ، سیکولر ہندوستان میں اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکا۔ ان سب فیصلوں اور واقعات کے پیچھے خلوص تھا لیکن سیاسی فراست اور بصیرت کا فقدان۔ بات اگر تشبیہ میں کہی جائے تو یہ ہے کہ ہم نے فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی کو ہاکی کے میدان میں اُتار دیا اور ہاکی کے کھلاڑی سے اچھا کرکٹ کھیلنے کی

توقع کی۔

محض خلوص آج پھر بیمین اور متحرک ہوتا محسوس ہوتا ہے لیکن نتائج اخذ کرنے میں کلی طور سے ظاہر پر انحصار، سطح کے نیچے دیکھنے سے گریز اور بہت وسیع تعمیم Gener- alization جیسے رجحانات فکر پر غالب ہیں۔ آج چوں کہ مسلمان پسماندہ ہیں اس لیے یہ کہنا بہت آسان ہے کہ محنت نہیں کرتا ہے اور تکنیکی ذہن نہیں رکھتا ہے۔ یہ قیاس صد فی صد صحیح نہیں ہے۔ قومی مزاج کے بارے میں حتمی بات کہنے میں احتیاط شرط ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ برطانوی ہندوستان میں اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ تھی۔ یہ بات دیگر سیاست دانوں اور دانش وروں کے لیے خاصی ناگوار تھی اور اس کا اظہار وہ لوگ مناسب اور نامناسب لہجوں میں اکثر کیا کرتے تھے۔ یہی حال فوج میں تھا۔ پھر بمبئی، کان پور اور بہت سے شہروں میں مسلمان تجارت میں بہت پیچھے نہیں تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں ٹاٹا اور برلا جیسے سرمایہ کار اور صنعت کار نہیں تھے۔ لیکن اس کی وجہ مسلمانوں کی کاہلی سمجھنا مناسب نہیں ہے۔ نواب صاحب چھتاری نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ انھوں نے نیل بنانے کے کارخانوں میں جب سرمایہ لگانا چاہا تو اس وقت یو۔پی کے گورنر نے لائسنس دینے سے انکار کر دیا اور مشورہ دیا کہ وہ زمین داری خریدنے پر ہی توجہ دیں۔ رہا تکنیکی رجحان کا مسئلہ، تو آج بھی مشاہدہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی معقول آبادی والے شہروں میں بیشتر موٹر اور اسکوٹر مکینک مسلمان ہوتے ہیں اور گاڑی درست کروانے وہ آتے ہیں جن کا سوجن ان کاریگروں کا ہاتھ لگنے سے بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ اصل میں قومی پسماندگی کی کوئی ایک وجہ نہیں ہوتی ہے۔ اس کے لیے سماجی، تاریخی عوامل پر نظر ڈالنی چاہیے لیکن آیئے

پہلے یہ دیکھیں کہ کاہلی کی بات اتنی شدت اور تسلسل سے کیوں دہرائی جا رہی ہے۔

ہوا یوں ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے مفکرین کا ایک حلقہ بالغ ہو گیا ہے اور بلوغ کسی کا بھی ہو بہرحال خود ... ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کی ایک خفیف سی تعداد اپنی غیر معمولی محنت اور دیگر عوامل کی وجہ سے اعلیٰ ملازمتوں میں داخل ہوئی اور سروس کے غیر اہم شعبوں میں ترقی کرتی چلی گئی۔ یہ مسلمان حکام مسلمان قوم کی آبرو ہو سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے لیے ان کو ذمہ دار ٹھہرانا ... ہوگا۔ ان کی خود اعتمادی کے لیے جس سہارے کی ضرورت تھی وہ سہارا مفقود تھا۔ یعنی مضبوط مسلم سماج۔ اس کے علاوہ موجودہ سول سروس سابقہ سول سروس سے مختلف ہے۔ برطانوی دور کے بے شمار سول حکام نے انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنے علمی مشاغل جاری رکھے تھے۔ یہ اپنی قوم کا ایسا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں جو کسی بھی قوم کے لیے باعث ... ہو سکتا ہے۔ Malcolm, Marshman, Elph-inston, Hunter, Elliott, Colebrook, Duff, Cunningham وغیرہ بے شمار ایسے نام ہیں جنھوں نے برطانوی سامراج کو باعزت ادارہ بنا دیا تھا۔ Philip Mason, Penderell Moon, Cambell-Johnson وغیرہ آخری دور کے نام ہیں جن کی تخلیقات کے بغیر غروب آفتاب کا منظر نہیں پیش کیا جا سکتا ہے۔ انھیں میں سے بعض اس ... بنیادی ماخذ ہیں اور بعض اپنی مخصوص زبان اور ادب کے لیے شاید بہت عرصے تک پڑھے جائیں گے۔ ...ay case ...ood ruff کی The Pathans یا The Men who Ruled India کی یا Rulers of India میں محض بیان نہیں ہے۔ صرف منظر کشی نہیں ہے، بلکہ تجزیہ ہے ...ate ہے Deep insight اور Perception

سب اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ خداداد ذہانت کو یقین کی دولت میسر آگئی تھی اور جب ان دو صفات کی آمیزش ہوتی ہے تو کرشموں کا ظہور ہوتا ہے۔ برطانوی پارلی منٹ میں Gladstone سے لے کر علی گڑھ کے کلکٹر Russell تک جن کے نام پر آج بھی رسل گنج آباد ہے ہر ایک کو اپنی تہذیبی برتری کا بھرپور احساس تھا K.K. Aziz نے اپنی کتاب The British in India: A Study in Imperialism کے آخری حصے میں برطانوی سیاست دانوں اور مفکروں کے اقوال نقل کیے ہیں۔ ان کو پڑھ کر ممکن ہے بعض لوگ لبوں کے خم کے ساتھ تبسم کریں لیکن اتنی بات واضح ہے کہ صحیح یا غلط ہر ایک کو اپنی تہذیبی برتری کا بھرپور یقین تھا۔ یہاں صرف قول نقل کیے جاتے ہیں۔ ایک عملی سیاست داں اور دوسرا ایک خالص عالم کا۔ لارڈ کرزن نے برطانوی کابینہ کو ایک دستاویز پیش کی جس میں انھوں نے لکھا تھا۔

"I say without disparagement to America or anyone else, if you want to see a backward country fairly governed, on the whole we do it better than anybody else. My conviction is that the salvation of the dark places consists in having them under the British rule"[۴]

آکسفورڈ کے پروفیسر Gilbert کی رائے تھی کہ

"To the men of my youth, western, specially British civilization was simply the right road of human progress; other civilizations, if one could call them civilizations at all, were just false roads or mistake."[۵]

موجودہ مسلمان حکام کا المیہ یہ ہے کہ انھیں کھڑے ہونے کے لیے یقین کی مضبوط چٹان میسر نہ آسکی۔ وجوہات کئی ہیں ا۔ اپنے ہمسروں میں شاذ و نادر ہی انھیں مسلمان مل پاتا ہے۔ برسوں نشست و برخاست غیر مسلموں میں ہونے کے وجہ سے تعداد کے ساتھ عقل میں بھی اقلیت میں ہونے کا احساس غیر شعوری طور پر ذہن میں سرایت کرتا رہتا ہے۔ ب۔ علمی مشاغل کے ذریعے یہ اپنی دقیع روایت سے واقف ہو سکتے ہیں لیکن انتظامی معاملات کی پیچیدگیوں اور سول سروس کے مزاج میں تبدیلی سے علمی مشغلے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ج۔ شہری سرگرمیوں میں ہمہ وقت تعلق غیر مسلموں سے رہتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ حکام مسلم عوام اور ان کی سماجی زندگی سے قطعاً بے تعلق ہو جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آزاد ہندوستان میں باوقار اسلامی تہذیب بے وقار مسلمانوں کی وجہ سے اکثریتی طبقے کی حاکم تہذیب یا عدم تہذیب میں کہیں گم ہو گئی ہے۔ لہٰذا چند خوش نصیب اور خوش حال مسلمانوں کا عام مسلمانوں کو ہر اعتبار سے حقیر فقیر سمجھ لینا اور ذاتی کامیابی کے لیے محنت کا واحد قدر بن کر ابھرنا یا اس کو طلسماتی چیز سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔

قومی ترقی کے لیے افراد کا محنتی ہونا یقیناً ضروری ہے لیکن منزل تک پہنچنے کے لیے یہ واحد ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم میں سے اکثر نہیں تو بہت سے اپنی مراد پا چکے ہوتے۔ امسال ۱۹۹۲ کے I.A.S کے مقابلے کے امتحان میں ۱۴ مسلمان امیدوار کامیاب ہوئے۔ یعنی جہاں تک

محنت کی رسائی ہو سکتی تھی وہاں تک یہ پہنچ گئے لیکن تعزری ان کو نصیب ہوئی۔ ہزاروں خانوں میں تقسیم ہندوستانی سماج میں یہ کہنا ذہنی سادگی ہوگی کہ صلاحیت اور صرف صلاحیت انتخاب کا معیار ہوتی ہے۔ لہٰذا تجزیہ نگار کے لیے مناسب ہے کہ وہ بد دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے میں جلدی نہ کرے۔ مسلمانوں کو کاہل کہنے کے بجائے خود بھی محنت کرے اور پیچیدہ مسایل کا یک جہتی (Unidimensional) تجزیہ کرنے اور یک جہتی حل تجویز کرنے کے بجائے وسیع تناظر میں اس کا جائزہ لے۔ مسلمانوں پر توجہ کے ساتھ ساتھ اکثریتی طبقے کی نفسیات کا ذہنی نظر سے مطالعہ کرے۔ "Holier Than Thou" والی ذہنیت کو ترجیح کر ملی جذبات میں اپنے کو مدغم کر دے۔ یوں کہ مکمل ہمدردی سے ہی پیچیدہ مسایل اپنے پوشیدہ گوشے آشکار کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں بیک وقت ضروری ہیں اس لیے کہ مسئلہ ہمہ جہتی (Mult-dimensional) ہے۔ جن لوگوں نے ماضی میں ملی مسایل پر غور کیا تھا انھوں نے اپنے کو ملی مزاج سے مکمل ہم آہنگ کر لیا تھا۔ اس لیے ان کا نظریہ ہم سے مختلف تھا۔ ہمیں بیدار کرنے کے لیے انھوں نے اکثریت کو آئیڈیل کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ ہمارے اپنے زمانۂ عروج کی تاریخ کا ذکر کر کے غیرت دلائی۔ شبلی نے معنون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" لکھا اور حالی نے "مدوجزر اسلام" رائٹ آنریبل سر امیر علی نے اسلام کی روح پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مغرب کی تاریخ کا محاسبہ کیا اور سخت لفظوں میں کیا اور ڈاکٹر اقبال نے غیر مبہم لفظوں میں کہا کہ میرے یہاں آتش رفتہ کا سراغ ہے اور کھوئے ہوؤں کی جستجو۔

میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!

ان حضرات کا مقصد مسلمانوں کو ماضی کی عظیم پری کا عکس دکھا کر زمانۂ حاضر کی تلخ تاریخ سے بے خبر رکھنا نہیں تھا بلکہ ان میں خود اعتمادی پیدا کرنا اور اپنی درخشاں روایات کے شایان شان حال کی تعمیر کے لیے ذہنوں کو تیار کرنا تھا۔ ماضی سے بدظن ہو کر یا بے خبر رہ کر کم سے کم مسلمان با اطمینان زندگی نہیں گزار سکتا۔ ماضی میں ہمارے یہاں محض خانہ جنگی کی تاریخ نہیں ہے نہ ہی دینی اور سائنسی علوم کی مسلسل آویزش ہی ہے۔ نہ ہی یہ کسی ایک طبقے کی کھل کھیلنے کی داستان ہے۔ ہمارا ماضی ان تہذیبی اقدار کی تاریخ ہے جو مذہبی تعلیمات کی وجہ سے وجود میں آئی تھی اور اس بے پناہ ولولہ کی تاریخ ہے جو قرآن نے پیدا کیا اور جس کا اظہار سیاسی سطح پر وسیع فتوحات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ Gruenebaume کسی بھی لہجے میں سہی بہرحال اعتراف کرتا ہے کہ

" The main Source of the Muslims' feeling of Superiority, however, was the incontrovertible knowledge That his was the final religion, the one and only truth" [2]

ہمارے موجودہ اہل فکر کو چاہیے کہ وہ کبھی کبھی اپنے ماضی کا ذکر کر لیا کریں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ غیروں پر بھی تنقیدی نظر ڈالیں۔ جیسا کہ انگلستان کی درس گاہوں کے تربیت یافتہ سر امیر علی اور خالص مشرقی سر سید احمد نے کیا تھا۔ سر سید کا معاملہ بھی عجیب و غریب ہے۔ آج ان کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کہی جا رہی ہیں جن سے لگتا ہے کہ وہ میدان میں کھڑاؤں پہن کر اور گلے میں جنیؤ ڈال کر بس کسی مٹھ میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے۔ حالاں کہ اس دردمند مسلمان نے اسلام کے بنیادی عقاید سے ہمیشہ گہرے شغف کا اظہار کیا مسلمانوں کی تہذیبی عظمت کو جتلایا اور غیروں پر شدید تنقید کی ہے۔ حالی کی حیات جاوید بھی ان دو باتوں کی تصدیق کرتی

تیسری بات کے لیے ان کے مضامین سے دو اقتباسات حاضر ہیں۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"ہماری رائے یہ ہے کہ اکثر اشراف خاندان کے مسلمان لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی ہوئی اور درستی اخلاق کا بھی سبق پڑھایا ان کی عمدہ سوسائٹی بن گئی جو درستی اخلاق کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اعلیٰ تعلیم تک پہنچیں پر وہ باستفادہ نہ ہوں گے بلکہ بار خاطر ہوں گے بہرحال اس وقت جو تعلیم ہندو بنگالیوں کو، بمبئی کے پارسیوں، بمبئی اور پونا کے برہمنوں اور مرہٹوں کو دی گئی اور اعلیٰ درجے کی تعلیم کیا جاتا ہے اس سے ہندوستان کے حق میں کوئی اچھا پھل ہاتھ نہیں لگا۔" ۵

مہاراجہ جے پور کے یہاں ان کی صاحبزادی کی شادی کی تقریبات کے سلسلے میں سرسید نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی موجودہ دانش وروں کے سامنے رہنا چاہیے سرسید لکھتے ہیں:

"اس بات کے سننے سے البتہ ہم کو افسوس ہے کہ میز پر بجائے نفیس نفیس برتنوں کے پتوں کی رکابیاں تھیں جس کو ہندی میں پتل کہتے ہیں اور صرف یہی ایک چیز تھی جو اس زمانے کی یاد دلاتی تھی، جب کہ دنیا کی قوموں کو برتن بنانے کا فن نہیں آتا تھا مگر ہم کو امید کرنی چاہیے کہ ہمارے ہندو بھائی اپنے دھرم کو قائم رکھ کر بہت جلد تہذیب و شائستگی میں ترقی کریں گے۔"

درحقیقت ہمارے لیے اور خصوصاً میرے لیے یہ بات نہایت خوشی کی ہے اس لیے کہ میں ہمیشہ یہ خیال رکھتا تھا کہ ہمارے ہندو بھائیوں میں سویلائزیشن کی ترقی مع قیام ان کے مذہب کے نہیں ہوسکتی۔ مگر اس حال کے سننے سے جو جے پور میں ہوا مجھے یقین ہوگیا کہ میرا یہ خیال غلط تھا اور میں اپنے اس خیال کے غلط نکلنے سے بے انتہا خوش ہوا ہوں اور خود اپنے کو مبارک باد دیتا ہوں۔" ۶

انھیں حضرات کی سعیِ بلیغ کا نتیجہ ہے کہ ہندی مسلمانوں نے وہ کر دکھایا جو تاریخ میں بہت کم ہوا ہے۔ اصل میں اعتماد طعنہ زنی سے نہیں بلکہ اپنی تہذیبی اقدار میں بھرپور یقین سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے مذہب اور تہذیب کو دو الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا تھا۔ لہٰذا ہندو کا معیار کے طور پر حوالہ دینے کی بات ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ آج حالات قدرے مختلف ہیں۔ جو کل محکوم تھے آج اکثریت کی بنا پر حاکم ہیں اور رہیں گے۔ اب وہ اپنی تہذیب کو برتنا ہی نہیں چاہتے انھیں اس کے ابلاغ کی بھی فکر ہے۔ ایسے میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے لیے عموماً اور تجزیہ کرنے والوں کے لیے خصوصاً ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی تہذیبی اور فکری تاریخ سے گہری واقفیت حاصل کریں اور اس کے بعد ہندو تہذیب اور اس کے منبع یعنی مذہب کا مطالعہ کریں۔ یہ مطالعہ مغربی تہذیب سے متاثر یا جدید تعلیم سے آراستہ اسکالرس کی کتابوں کا نہیں بلکہ براہ راست مہابھارت، رامائن، منوسمرتی، شری مدبھگوت جیسی بنیادی کتابوں کا ہونا چاہیے۔ تب کہیں جا کر پسماندگی ترقی اور تہذیب کا مفہوم واضح ہو پائے گا۔

مسلمانوں کی پسماندگی کی وجوہات

مسلمانوں کی کارکردگی میں تلاش کرنا کافی ہے۔ پسماندگی پر اطمینان انسان کی فطرت کے خلاف ہے اور پھر مسلمانوں کا پسماندگی پسند کرنا اور بھی ناممکن ہے۔ ہماری تہذیب

پرستی اور جذباتی ہونے کا الزام
نلے فرنگ روزِ اول سے لگاتے آئے ہیں۔ لہٰذا وجوہات
ی تلاش بنگالوں میں بھی کرنا پڑے گی۔ ہماری پسماندگی ماضی
ریب کے حالات میں ناگزیر تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد
سلمانوں کا متوسط طبقہ جو ہر قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی
ہے ترکِ وطن کر گیا اور اس کے جانے کے ساتھ ہی اس
تعمیر کردہ معاشی ڈھانچہ Infra structure بھی
تم ہو گیا۔ یہاں جن لوگوں نے دانستہ طور پر رہنا پسند کیا
وہ کچھ عرصے بعد سنبھالا لیتے لیکن معاصر حکومت نے نظریاتی
بنیادوں پر کچھ ایسے قدم اٹھائے جن سے مسلمان براہِ
راست متاثر ہوئے اور ان کی معاشی بنیادیں ہل کر رہ
گئیں۔ اس وقت کے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو کے ذہن پر
سوشلزم اور عوامی حکومت کے مغربی تصورات حاوی تھے اور
چونکہ مسلم آبادی کا خاصہ بڑا طبقہ زراعت سے متعلق رہا تھا
اس لیے وہ مسلمانوں کی فکر کو کبھی جاگیردارانہ کہتے رہے اور
زندگی بھر اس زاویہ سے مسلمانوں پر شدید تنقید کرتے
رہے۔ ایک جگہ مسلمانوں کی پسماندگی کی دو وجوہات بتلاتے ہیں:

"It derived from certain historical causes, from the delay in the development of a new Industrial middle class and the excessively feudal background of The Muslims, which blocked up avenues of development and Prevented the release of talent" [10]

علی گڑھ کالج کے بارے میں رائے دیتے ہیں کہ یہاں
قدامت پرستی حاوی تھی۔ کیونکہ

"Its trustees came from among the princes and big landlords, typical representatives of the feudal order" [11]

مسلم لیگ کے بارے میں موصوف کی رائے تھی
کہ اس پر

"Reactionary and Semi-feudal elements" [12]

ایسے وزیرِ اعظم کے زیرِ اثر آزاد ہندوستان کے
معاشی ڈھانچے کو نئی شکل دی جانے لگی۔ زراعتی ہندوستان
سے صنعتی ہندوستان تک پہنچنے کے لیے وقت کا انتظار مناسب
نہیں سمجھا گیا۔ پورا سفر ایک چھلانگ میں طے کر لینا چاہا۔ جذبہ
قابلِ احترام تھا لیکن اس تیز رفتاری کا مسلمان ساتھ نہیں
دے سکتے تھے پہلی بات وہی جس کا ذکر ابھی ہوا یعنی معاشی
اعتبار سے زراعت پر انحصار۔ دوسرا یہ کہ ان کی اپنی خواہش
کے مطابق ملک تقسیم ہوا تھا۔ صدیوں پرانا معاشرہ پلک
جھپکتے آنکھوں سے غائب ہونے لگا۔ برسوں ایک غیر یقینی
کیفیت رہی۔ ہر گھر میں بحث کا موضوع کہ کتنے لوگ یہاں رہیں
گے اور کتنے چلے جائیں گے۔ جانے والوں کو جائیداد کا معاوضہ
کتنا اور کیسے دیا جائے گا۔ اس پر مستزاد محکمۂ کسٹوڈین کی
مستعدی، برسوں فضا میں غیر یقینی کیفیت چھائی رہی۔ دوسری
طرف پنڈت جواہر لال نہرو کا سترہ سالہ دورِ حکومت۔ واقعہ
یہ ہے کہ جدید صنعتی ہندوستان کی بنیاد اسی دور میں رکھی
گئی۔ اس دور کا امتیازی وصف ایک شدید خواہش تھی
کہ ملک صنعتی اعتبار سے دنیا کے دیگر ممالک میں ایک
باعزت مقام حاصل کر لے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض
سے، سوشلزم کے دعووں کے باوجود نجی سیکٹر میں صنعتیں
قائم کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے فراخ دلی سے
مالی امداد دی گئی اور رواداری سے لائسنس جاری کیے

ان سب کا فائدہ ظاہر ہے کہ اس ملک کی اکثریت کو جس کا نشانہ کی ہونا محض سادہ لوحی ہوگی۔

بہرحال جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد معاشی نظام پر اشتراکی فکر کی گرفت کمزور ہوتی چلی گئی۔ بہت سی صنعتیں سرکاری کنٹرول سے نکال کر نجی سرمایہ کے لیے چھوڑ دی گئیں۔ لائسنس کے ضابطے کہیں ختم اور کہیں بہت نرم کر دیے گئے۔ ان سب کا فائدہ کسی حد تک مسلمانوں کو بھی پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ ساتویں دہائی میں مسلمانوں میں زبردست معاشی تبدیلی آئی۔ بعض شہروں میں ان کی صنعتی رفتار قابل رشک ہے۔

رہا یہ سوال کہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کا خاطر خواہ رواج نہ ہو سکا تو اس کی وجہ بہت واضح ہے اور جس کی طرف اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اعلیٰ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے اور اعلیٰ ذہن بنیادی ضرورتوں کی فکر سے بوجھل ماحول میں پرورش نہیں پاتا ہے لیکن عام مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت کا احساس ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم سماج اپنی مالی حالت کی درستگی کی طرف پہلے توجہ دے رہا ہے۔ یعنی اعلیٰ تعلیم کے لیے جن ذہنوں کی ضرورت ہے ان کی تعمیر میں منہمک ہے۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالیے۔ ایسے بے شمار ناخواندہ خاندان ملیں گے جنھوں نے نہایت ناساعد حالات میں کامیاب صنعتیں یا تجارت میں اپنی ساکھ قائم کی اور اب اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔

آخر میں تہذیبی پسماندگی کا مسئلہ۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد کو اپنی محنت اور مسلسل جد و جہد کی وجہ سے معاشی خوش حالی میسر آ رہی ہے اور یہ لوگ قومی معاملات میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ تہذیبی اقدار ابھی ان کی سماجی زندگی کا جز نہ بن سکیں جو سابقہ متوسط طبقہ کا امتیاز تھیں۔ اصل میں معاشی اقدار کی اساس ہمیشہ عقیدہ ہوتا ہے چاہے وہ مذہبی اصول ہوں یا کوئی غیر مذہبی نظریہ۔ عقیدے سے وابستگی ان معاشرتی اقدار کو استحکام عطا کرتی ہے۔ ہمارے نئے معاشرے کو وہ والہانہ نظریاتی وابستگی میسر نہ آ سکی۔ اس لیے کہ واقفیت محدود ہے۔ مسلم معاشرتی اقدار کی پرورش کے لیے اسلام سے شیفتگی ضروری ہے۔ یہاں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلم تعلیمی اوقاف شہر شہر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ ہمارے مذہب میں تعلیم کی اہمیت تھی۔ لہٰذا ایک طرف طالب علموں میں طلبِ علم کی خواہش اور دوسری طرف حصول جزا کی خاطر خوش حال لوگوں میں وسائل کی فراہمی کا جذبہ تھا۔ دوسری مثال ہماری سابقہ معاشرت میں نفاست کی تھی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کہ 'صفائی نصف ایمان ہے'، ہمارے تحت الشعور میں قدر کی حیثیت سے جذب ہو چکی ہے۔ انھیں جزئیات سے مسلم معاشرتی تہذیب وجود میں آئی تھی۔ آج یہ مسئلہ نئے سرے سے توجہ چاہتا ہے سرکاری مدارس جہاں بچوں کا ذہن تشکیل پاتا ہے، ہمارے مقصد کے حصول میں مدد نہیں دے سکتے لیکن فی زمانہ ان سے مفر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں شکوہ یا درخواست کرنے کے بجائے خود اپنے گھروں پر توجہ دینی چاہیے۔

آخر برطانوی ہندوستان میں بھی ہم نے اپنے معاشرے کی حفاظت کی تھی۔ دیہات دیہات مکتبوں کا ایک سلسلہ پھیلا دیا تھا جہاں بچے ایک دو سال تعلیم پانے کے بعد سرکاری مدارس میں داخل ہو جاتے تھے۔ آج ہم کو پہلے تشکیل اور پھر حفاظت کا دوسرا کام کرنا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم اردو زبان سے واقفیت اور اس کے بعد اردو ادب کا مطالعہ ہونا چاہیے۔ اردو ادب کے ذریعے ہم اپنی روایتی تہذیب سے واقف ہوں گے اور اس طرح سماج کو تہذیبی پسماندگی سے بچا سکتے ہیں۔ اس کو اتفاق نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہمارے یہاں لٹریچر اور شائستہ طور طریقوں کے لیے ایک ہی لفظ رائج ہے یعنی ادب جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ

ادب کے طالب علم کو بے ادب نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ادب میں جو تہذیب پیش کی وہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے۔ شائستہ جذبات اور شائستہ انداز بیان اس کی شان ہیں۔ ہماری موجودہ تہذیبی پسماندگی اکثریتی فرقے کی طرف اشتیاق بھری نظروں سے دیکھنے سے دور نہیں ہوگی۔ یہ بے چارے خود اپنی پسماندگی سے پریشان ہیں۔ صدیوں بعد بھی یہ تہذیب کے معنیٰ متعین نہیں کر پائے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے پردے پر پیش ہونے والی اکثر کہانیوں کا موضوع آج بھی بہو کو زندہ جلانا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ان مسلم اہل فکر پر تعجب ہوتا ہے جو اُن سے مرعوب ہیں۔ ان سے جو آج بھی اپنی لختِ جگر کا "کنیا دان" کرتے ہیں اور بیٹے سے یہ تلقین کرنے کی جراُت نہیں کر پاتے کہ تم بھی وہی کرنا جو شری کرشن بھگوان کرتے تھے۔

ہم پسماندہ ضرور ہیں لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مایوسی کفر ہے۔ آزادی کے بعد پچیس تیس سال آزمائش اور ابتلا کے تھے۔ جیسے تیسے وہ وقت نکل گیا۔ آج علی گڑھ کی مثال سامنے رکھیے۔ چند سال پہلے ہمارے بزرگوں کے سامنے بچوں کی تعلیم کے لیے محض ایک مشنری اسکول تھا۔ اب مسلم یونیورسٹی سے ملحق اسکولوں کے علاوہ تین خاصے بڑے اسکول ہیں جن میں مجموعی طور سے چار ہزار سے زائد طلبا زیر تعلیم ہیں۔ یہاں مسلم ماحول ہے اور اردو و دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ معیار تسلی بخش نہ ہو لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان مضامین کے معیار کے معاملے میں ہم کچھ ضرورت سے زیادہ معیار پسند ہو جاتے ہیں۔ ورنہ کچھ نہ ہونے سے بہرحال موجودہ انتظام غنیمت ہے۔ اگر آپ ان مدارس کے فارغ شدہ طلبا سے گفتگو کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان میں مسلم تہذیبی شعور اچھا خاصہ ہے۔ سیکولرازم کا مفہوم ان کے ذہنوں میں وہ نہیں ہے جو پچھلی نسل کے نزدیک تھا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے اہل فکر کا ذہن فکری سطح پر صاف ہو۔ سمت کے تعین کے لیے فکر کا واضح ہونا اشد ضروری ہے۔ عقیدوں کی قوت سے ہی کارہائے نمایاں انجام پاتے ہیں۔ لہٰذا سیکولرازم سے، مسلم قوم سے اور مذہب اِسلام سے وابستگی کی سطح متعین کرنا بے حد ضروری ہے اور اہم! اس سمت خاصہ انتشار ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ ہم کو اپنی ترقی کا موازنہ اکثریتی طبقہ کی ترقی سے نہیں کرنا چاہیے یہ بڑی سادہ لوحی ہوگی۔ ہم کو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ بعض عیش ان کے تجمل حسین خاں کے لیے ہی بنے ہیں ہم کو اس میں سے کچھ اس لیے مل جائے گا کہ ان کے تجمل جی کو نظر نہ لگے لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ بے شمار میدان ایسے ہیں جہاں ہم اپنی برتری ثابت کر سکتے ہیں اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہماری اس سمت کوشش جاری ہے۔ خیال کی بلند پروازی اپنے آپ میں بہت بڑا وصف ہے کیونکہ بلند حوصلہ افراد کے خیالات بھی بلند ہوتے ہیں اور پست حوصلہ افراد کے پست۔ لہٰذا یہ محض شاعرانہ خیال نہیں بلکہ ہمارا عقیدہ ہونا چاہیے کہ

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اور ہم یہ سحر ضرور پیدا کر کے رہیں گے۔ ان شاء اللہ

حوالے

۱ اشتیاق حسین قریشی - Ulama In Politics

۲ جوش ملیح آبادی - یادوں کی بارات

۳؎ نواب احمد سعید خاں آف چھتاری ۔ یاد ایام

۴؎ کے ۔ کے ۔ عزیز The Birtish in India: A Study in Impirialism - Pakistan. P 418

۵؎ کے ۔ کے ۔ عزیز The Birtish in India.

۶؎ The Hindustan Times. New Delhi

۷؎ Gruenbaum Medieval Islam Chicago 1956. P35

۸؎ سر سید احمد خاں ۔ مقالات سر سید ۔ جلد ۹ صفحہ ۱۵

۹؎ ایضاً جلد ۱۵ صفحہ ۱۴۵

۱۰؎ جواہر لال نہرو Antobiograpay - P 390.

۱۱؎ ایضاً " P 348

۱۲؎ ایضاً " p. 349

"میں نے جس مسلمان سے پوچھا کہ وہ کون
ہے؟ اس نے یہی جواب دیا کہ وہ مسلمان ہے
کیا بات ہے کہ تمام مذاہب میں تنہا اس
مذہب (اسلام) نے یہ جانا کہ ایک وسیع تر
چیز کو قومی احساس کو جگہ دی جائے۔ ایک
ایسی چیز کو جو قومی تر بھی ہے اور زیادہ منفرد
بھی۔ ایسا کیوں کر ہے کہ اسلام کسی ہم آہنگ
اعتقاد کے بغیر اخوت کی مثالی تدریس پا سکتا
تھا لیکن عیسائیت اپنے مثالی معتقدات
کے باوصف ناکام رہتی ہے۔"

پروفیسر کیسر لنگ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۵ (مئی ۱۹۹۳ء)

(دوسری اور آخری قسط)

جدید بینک کاری اور اسلام

محمد نظام الدین رضوی ٥

عوام کو تجارت وغیرہ کے لیے مال کی فراہمی

بینک کا دوسرا بنیادی کاروبار یہ ہے کہ عوام کو چھوٹی یا بڑی تجارت، زراعت و دست کاری کے وسایل، جدید طبی آرجات، ذرایع نقل وحمل (ٹرک بس، ٹمپو، ٹریکٹر وغیرہ) مکانات کی تعمیر وغیرہ کے لیے اپنی صواب دید کے مطابق حسب ضرورت قرض دیتا ہے اور اس پر ایک مقررہ در سے سود بھی لیتا ہے ـــــ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس کی اجازت نہیں دیتا، اس کی نگاہ میں مسلمان کو کسی بھی فرد، انجمن یا بینک سے اس طرح کا سودی قرض لینا حرام و گناہ ہے۔ قرآن حکیم میں بڑی سختی کے ساتھ مسلمانوں کو اس سے روکا گیا ہے۔ جیسا کہ ذیل کی آیات و احادیث سے اندازہ ہوگا:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔

(بقرہ ۲ - ۲۷۸، ۲۷۹)

[اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو سود باقی رہ گیا ہے۔ اسے چھوڑ دو اگر مسلمان ہو۔ پھر اگر ایسا نہ کرو تو یقین کرلو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا]۔

قیامت کے روز سود خواروں کے حال زار کی منظر کشی یوں کی گئی۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ

(بقرہ ۲ - ۲۷۵)

اسی آیت میں سود خواروں کو یہ وعید بھی سنائی گئی:

وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ

(بقرہ ۲: ۲۷۵)

[اب جو ایسا کرے گا تو وہ دوزخی ہے۔ وہ اس میں مدتوں رہیں گے۔ اللہ سود کو

٥ دار العلوم اشرفیہ مصباح العلوم، مبارک پور، اعظم گڑھ۔ یوپی۔ ۲۷۶۴۰۴

ستاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے]۔

ان آیات سے مسلم ممالک کے بینکوں اور عام ممالک کے مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنا چاہیے جو سودی قرض دینے اور لینے میں تامل نہیں کرتے۔

حدیث میں ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فمن زادَ أو استزاد فقد أربى الآخذ والمعطي فيه سواءٌ

(صحیح مسلم - باب الربوٰ - ج ۲ - ص ۲۵)

[زیادہ دینا بھی یقیناً سود ہے اور زیادہ لینا بھی یقیناً سود ہے۔ لینے والے اور دینے والے سب برابر ہیں]۔

اب ساتھ ہی ساتھ نزول قرآن کے زمانے کے معاشی حالات کا بھی ایک سرسری سا جائزہ لے لیجیے تاکہ آج کے حالات پر ان آیات کا انطباق بخوبی عیاں ہو جائے۔

حجۃ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والربا الذي كانت العرب تعرفه وتفعله انما كان قرض الدراهم والدنانير الى اجل بزيادة على مقدار ما استقرض على ما يتراضون به ...... هذا كان المتعارف المشهور بينهم ...... فابطل الله تعالى الربا الذي كانوا يتعاملون به وابطل ضروبًا أخر من البياعات وسماها ربا۔

(احکام القرآن - ج ۱ - ص ۴۶۴ - ۴۶۵)

[عرب جس چیز کو سود کہتے تھے اور جسے باہم برتتے تھے وہ صرف یہ تھا کہ درہم (چاندی کا روپیہ) و دینار (سونے کا روپیہ) ایک معین میعاد تک کے لیے قرض دیتے اور باہمی رضامندی سے اس پر ایک اضافہ طے کر لیتے۔ عربوں میں یہی قرض والا سود مشہور و متعارف تھا ...... تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے سودی کاروبار کو باطل فرما دیا اور ساتھ ہی خرید و فروخت کی کچھ قسموں کو بھی سود قرار دے کر باطل فرمایا]۔

یہ انکشاف بہت واضح طور پر اس بات کو نمایاں کر رہا ہے کہ عہد جاہلیت یا "قرن اسود" میں سود کاری کا جو "معاشی نظام" رائج تھا وہ سب کچھ آج کے عہد تمدن و "قرن منور" میں بڑے عظیم پیمانے پر بینکوں کی دنیا میں بھی رائج ہے۔ فرق یہ ہے کہ قرن اسود میں یہ کاروبار سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں تھا اور آج اس کی باگ ڈور حکومت کے ہاتھوں میں ہے۔ عہد جاہلی میں انسان عموماً غربت و افلاس کی وجہ سے سود کے شکنجے میں آتا تھا اور عہد تمدن میں قانون کا دباؤ بھی اسے سود لینے پر مجبور کرتا ہے۔

ع "روشنی لائی ہے منزل سے بہت دور ہمیں"

قرآن حکیم نے دنیا والوں کو سب سے پہلے اسی سود کاری سے روکا تھا۔ لہٰذا آج کی بینکنگ سودکاری پر بھی بجا طور پر اس کا اطلاق ہوگا۔ بالفاظ دیگر سودی قرض عہد جاہلی کا ہو یا عہد تمدن کا وہ بہر حال اسلام میں حرام ہے اور حرام رہے گا۔

جیسا کہ دوسرے مقدمے میں بیان ہوا مسلمان احکام الٰہیہ کا مخاطب ہے اس لیے علماء کے ایک طبقے کا موقف یہ ہے کہ اس کے مال میں سود کا تحقق ہوگا

لہٰذا مسلمان کے لیے سود کی شرح پر کسی بھی فرد یا مالیاتی ادارے سے قرض لینا حلال نہیں۔ اسی نکتے کی طرف امام ابن الہمام کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ نے درج ذیل عبارت میں اشارہ کیا ہے۔ رقم طراز ہیں:

لا یخفی انہ انما یقتضی مباشرۃ العقد اذا کانت الزیادۃ ینالھا المسلم ...... وقد التزم الاصحاب فی الدرس ان مرادھم من حل الربا ما اذا حصلت الزیادۃ للمسلم نظراً الی العلۃ

فتح القدیر۔ ص ۱۷۸-ج ۶

[پوشیدہ نہ رہے کہ دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ سودی شکل کا کاروبار غیر مسلم سے اس وقت حلال ہے جب اضافہ مسلمان کو ملے...... اور ہمارے اساتذہ نے علتِ ربا کے پیش نظر درس میں اس وضاحت کا التزام کیا ہے کہ فقہا کی مراد ظاہری سود کی حلت سے یہ ہے کہ زاید رقم مسلمان کو حاصل ہو]۔

فقیہ فقید المثال امام احمد رضا خاں قدس سرہ فرماتے ہیں:

"(غیر مسلم نے) مسلمان کو اگر سو روپے کا نوٹ قرض دیا اور شرط کرلی کہ مہینہ بھر بعد بارہ آنے یا ایک پیسہ زاید لوں گا تو حرام اور سود ہے۔ لان کل قرض جر منفعۃ فھو ربا۔

(فتاوی رضویہ۔ ج ۷۔ ص ۱۰۵)

مطلب یہ ہے کہ مسلمان احکام شرعیہ کا پابند ہے لہٰذا اس کے مال میں شرعی سود کا قانون جاری ہوگا اور اسے اپنے مال میں ہر طرح تصرف کی آزادی حاصل ہوگی لیکن علماء کا ایک بڑا طبقہ اسے سود نہیں تسلیم کرتا اور بجائے خود ان کی دلیل بھی قوی اور مستحکم نظر آتی ہے اور عامۂ متونِ مذہب کے ظاہر سے بھی یہی عیاں ہے۔

انکم ٹیکس کی مجبوری

فروغِ معاش کے بہت سے وسایل و ذرایع کی فراہمی یا خریداری کے سلسلے میں انکم ٹیکس Income-Tax کی ناگزیر دشواری سامنے آتی ہے جس سے بچنے کی ایک راہ بینک سے سودی قرض کا حصول ہے اب ہمارے لیے تین راستے ہیں۔

یا تو بینک سے قرض کا تعاون لیے بغیر ہم فروغ معاش کے وسایل مہیا کریں تو یہ انکم ٹیکس کے یقینی اور مہیب خطرات کو دعوت دینا ہوگا جس کے "سایۂ کرم" میں عام انسان کبھی پنپ نہیں سکتا۔ بلکہ عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں "بائی پاس" سے بھاری رشوت کے ذریعے اس سے بچ نکلنا ممکن ہے لیکن اس طرف شرعی ممانعت کی مضبوط چٹان سدِّ راہ ہے۔ پھر یہ بائی پاس بھی کوئی محفوظ گزرگاہ نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بینک سے سودی قرض کا تعاون لے کر انکم ٹیکس کے خطرات سے یقینی تحفظ حاصل کر لیا جائے۔ یہ ذریعہ ہماری معاشی ترقی کی راہ میں کوئی زیادہ خلل انداز نہ ہوگا لیکن دوسری طرف ایک طبقۂ علماء کے نزدیک سود کاری کا ارتکاب لازم آئے گا اور از راہ احتیاط میرا موقف بھی یہی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ قناعت شعار بن کر معاشی ترقی کی تگ و دو سے کنارہ کش ہو جائیں تا کہ ہماری حالت زار اور زیادہ خستہ سے خستہ تر ہوتی جائے اور ہم غیروں کے دست نگر ہو کر [illegible]

کو ان کے رحم و کرم کے حوالے کر دیں ـــــ آپ ہماری اس بات سے حیرت زدہ نہ ہوں کیونکہ اگر تمام مسلمان اسی قناعت شعاری کے پیکر مجسم بن جائیں تو یقیناً مادی وسائل کے لحاظ سے ہماری حیثیت صفر سے بھی کمتر ہوگی جس کے نتیجے میں تعلیمی ثقافتی، سیاسی انحطاط لازمی ہوگا بلکہ یہ انحطاط و زوال اپنے نقطۂ انتہا کو پہنچ جائے گا۔ پھر بھی ہم دوسروں کے محکوم و مرحوم اور دست نگر نہ ہوں گے تو کیا ہوں گے؟ اسلام کبھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔

ان حالات میں فکری توانائی سخت کشمکش میں مبتلا ہے کہ اب آخر کون سی راہِ نجات اختیار کی جائے؟

اسلام کے اصولوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسے کشمکش کے ماحول میں بھی اپنے ماننے والوں کو بے سہارا نہیں چھوڑتا بلکہ ان کی بھی رہنمائی کرکے انھیں بروقت سنبھالا دیتا ہے۔ چنانچہ اس پیچیدہ صورت حال کے لیے بھی اس نے ہمارے لیے یہ رہبر اصول وضع کیا ہے کہ:

من ابتلیٰ ببلیتین یختار اھونھما

(الاشباہ والنظائر ص ۱۱۲)

[جو دو بلاؤں میں گھر جائے وہ ان میں سے ہلکی و کمتر بلا کو اختیار کرے]۔

اور جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہم تین تین بلاؤں سے دوچار ہیں

۱۔ انکم ٹیکس کے یقینی خطرات
۲۔ سود یا رشوت سے آلودگی
۳۔ معاشی زبوں حالی اور بعد درجہ تعلیمی و ثقافتی و سیاسی انحطاط۔

ان سب میں معتدل نیز محفوظ راہ یہی ہے کہ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے بینک سے قرض لے کر اپنی معاش کو مضبوط بنایا جائے۔ اس کے برعکس دوسری راہوں میں یہ اعتدال نظر نہیں آتا کیونکہ شریعت کی خلاف ورزی براہ راست یا بالواسطہ تو ہر جگہ ہے جبکہ انکم ٹیکس اور اس کے متعلقات کے نفاذ کی صورت میں جو بربادی ہوگی اور قناعت شعاری کے نتیجے میں جو ادبار آئے گا ان سے قرض کے مختلف فیہ سود کا کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

پہلی اور آخری صورتوں میں شریعت کی خلاف ورزی بایں طور ہوگی کہ ان کا التزام ایک طرح سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ گو وہ ہلاکت جس نوع کی بھی ہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ

(البقرہ ۲ - ۱۹۵)

[اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو]۔

تفسیر خزائن العرفان میں اس آیت کی تشریح یہ کی گئی:

"راہِ خدا میں انفاق کا ترک بھی سبب ہلاکت ہے اور اسراف بیجا بھی، اور اسی طرح اور چیز بھی جو خطرہ و ہلاکت کا باعث ہو۔ ان سب سے باز رہنے کا حکم ہے۔ حتیٰ کہ بے ہتھیار میدان جنگ میں جانا یا زہر کھانا یا کسی طرح خودکشی کرنا۔ علماء نے اس سے یہ مسئلہ بھی اخذ کیا ہے کہ جس شہر میں طاعون ہو وہاں نہ جائیں۔ اگرچہ وہاں کے لوگوں کو وہاں سے بھاگنا ممنوع ہے۔"

یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ آیت کریمہ دونوں مذکورہ بلاؤں کو بھی عام ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ کرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال، و اضاعۃ المال

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

[بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے لیے مکروہ رکھتا
ہے فضول بک بک اور سوال کی کثرت
اور مال کی اضاعت و بربادی]۔
علاوہ ازیں فقہ اسلامی کا ایک اصول یہ ہے کہ
" دفع الرشوۃ لدفع الظلم امر
جائز ۔"
(الہدایہ ۔ ج ۳ ۔ ص ۲۲۹)
[ظلم ٹالنے کے لیے رشوت دینا جائز
ہے]۔
تو انکم ٹیکس وغیرہ کی بلا ٹالنے کے لیے سودی قرض (جو مختلف فیہ
ہے) لینا بھی جائز ہونا چاہیے کہ سودی قرض کی طرح سے
رشوت بھی لینا دینا حرام ہے۔
اس تفصیل کے پیش نظر انکم ٹیکس سے بچنے کی ضرورت
نیز مفسدۂ مظنونہ کے ازالے کے لیے بینک سے سودی
قرض لینا میری نگاہ میں جائز ہے۔ البتہ مقروض اس بات
کا پورا لحاظ رکھے کہ امکانی حد تک جلد سے جلد قرض ادا
کردے تاکہ کم سے کم سود دینا پڑے۔ پھر یہ اجازت
بھی صرف انھیں لوگوں کے لیے ہے جنھیں انکم ٹیکس کا خطرہ
ہو اور جو لوگ اس خطرے کے نشان سے باہر ہیں ان
کے لیے قطعی اجازت نہیں۔

اجارہ

ایک جگہ سے دوسری جگہ روپیہ بھیجنے کے لیے
ڈرافٹ کے اجرا، مسافروں کی سہولت کے لیے ٹراویلنگ
چیک کا اجرا اور قیمتی چیزوں کی حفاظت پر اجرت
(فیس) کا حصول بلا شبہ جائز ہے۔ اسلام نے فریقین
کو اس کی اجازت دی ہے۔
یہ بینک کا تیسرا کاروبار ہے جس میں کوئی حرج
نہیں ہے۔
چالو کھاتا یا کرنٹ اکاؤنٹ (Current Account)
پر بینک عام طور پر اپنے کھاتہ دار کو کوئی سود نہیں دیتا۔
وہ اپنی خدمات کے عوض " بینک اخراجات Bank Charges
یا ضمنی اخراجات Incidental Charges "
وصول کرتا ہے۔ یہ بھی اجارہ ہی کے زمرے
میں شامل ہے اور شرعاً جائز اور درست ہے۔

ہنڈی اور بلوں کا بٹہ

بینک کا ایک ضمنی کام یہ بھی ہے کہ وہ ہنڈی اور
بلوں کو ان کے بھنائے جانے کے وقت سے پہلے بھنا دیتے ہیں
لیکن ان پر تحریر شدہ رقم سے کچھ اپنے لیے وضع کر لیتے ہیں
تحقیق یہ ہے کہ یہ وضع شدہ رقم بھی سود ہی ہے۔ معاشیات
کی ایک درسی کتاب " ارتھ شاستر کی روپ ریکھا " میں
بھی اس کا تعارف اسی نام سے کرایا گیا جیسا کہ اس کے
مصنفین رقم طراز ہیں:
" بینک کا بٹہ ایک پرکار سے اس کے
روپے پر سود ہے جو بینک بل کا بٹہ کروانے
والے کو بل کا بھگتان کے سمے سے پہلے ہی دے
دیتا ہے۔"
(ارتھ شاستر کی روپ ریکھا۔ ص ۱۸۳)
چوں کہ یہاں بھی بینک کو سود ہی دینا ہوتا ہے اس
لیے یہ بھی ناجائز و گناہ ہے۔ حجۃ الاسلام امام ابوبکر جصاص
رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے کو دلائل کے ساتھ بڑی
وضاحت سے منقح کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:
الرجل یکون علیہ الف درھم دین
مؤجل فیصالحہ منہ علی خمس
مائۃ حالۃ فلا یجوز وقد روی سفیان
عن حمید عن میسرۃ قال سألت
ابن عمر یکون لی علی الرجل الدین
الی اجل فاقول عجل لی واضع
عنک فقال: ھو ربا۔ وروی عن

زید بن ثابت ایضا النهی عن ذلک
وهو قول سعید بن جبیر والشعبی و
الحکم وهو قول اصحابنا وعامة
الفقهاء

ومعلوم ان ربا الجاهلیة انما
کان قرضا موجلا بزیادة مشروطة
فکانت الزیادة بدلا من الاجل
فأبطله الله تعالی وحرمه۔ وقال
"وذروا ما بقی من الربوا" حظر ان
یؤخذ للاجل عوض۔ فاذا کانت علیه
الف درهم موجلة فوضع عنه علی ان
یعجله فانما جعل الحط بحذاء الاجل
فکان هذا هو معنی الربا الذی نص
الله تعالی علی تحریمه۔ ولاخلاف
انه لو کان علیه الف درهم حالة
فقال له اجلنی وازیدک فیها مائة
درهم، لا یجوز لان المائة عوض
من الاجل۔ کذلک الحط فی معنی
الزیادة اذ جعله عوضا من الاجل
وهذا هو الاصل فی امتناع جواز
اخذ الابدال عن الاجال۔"

(ایک شخص پر کسی کے ہزار روپے میعادی
قرض ہوں اور وہ اس سے کم (مثلاً) پانچ سو
روپے نقد پر مصالحت کرلے تو یہ ناجائز ہے۔

حضرت سفیان، حمید سے اور وہ
میسرہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت
میسرہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر
رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا کہ ایک
آدمی کے ذمہ میرا دین (قرض) ہے جس کی
ادائیگی کی ایک میعاد مقرر ہے۔ میں اس
سے کہتا ہوں کہ تم مجھے میعاد مقرر سے پہلے
ہی دے دو، میں کچھ روپے چھوڑ دوں
گا (تو کیا یہ جائز ہے؟)

انھوں نے فرمایا کہ یہ سود ہے۔ صحابی
رسول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ
عنہ سے بھی اس کی ممانعت مروی ہے۔
یہی قول سعید بن جبیر، شعبی اور حکم علیہم الرحمۃ و
الرضوان کا ہے اور یہی مذہب ہمارے
ائمہ حنفیہ و تمام فقہاء کا ہے۔

یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ عہد جاہلیت
کا سود "میعادی قرض طے شدہ اضافے کے
ساتھ" ہوا کرتا تھا اور یہ اضافہ میعاد کا
بدل ومعاوضہ ہوتا تھا تو اللہ تبارک و
تعالیٰ نے اسے باطل وحرام فرمادیا اور
یہ فرمان صادر کرکے کہ "جو سود باقی رہ
گیا ہے اسے چھوڑ دو" میعاد کا کوئی عوض
لینے سے ممانعت فرمادی۔ تو جب کسی آدمی
پر ہزار روپے میعادی قرض ہوں اور
قرض خواہ اس شرط پر اس میں سے کچھ
کم کرے کہ مقروض اسے میعاد سے پہلے
ہی ادا کردے تو اس نے یہ کمی میعاد ہی
کے مقابل کی ہے اور یہی معنی ہے اس
سود کا جس کو اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں
میں حرام قرار دیا ہے۔

اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں
ہے کہ اگر کسی شخص کے ذمہ ہزار روپے
نقد لازم ہوں اور وہ صاحب حق سے
یہ کہے کہ تم ادائیگی کے لیے کوئی میعاد مقرر

کردو، میں تمہیں سو روپیے زیادہ دے دوں گا، تو یہ (بالاتفاق) ناجائز ہے کیوں کہ یہ سو روپیے میعاد کا عوض ہیں۔ اسی طرح سے قرض میں کمی بھی ایک طرح کا اضافہ ہے کیونکہ اسے میعاد کا عوض قرار دیا ہے (مثال کے طور پر مقروض نے ہزار روپے کے بدلے میں نوسو ہی پیشگی ادا کیے تو اسے میعاد کی وجہ سے سو روپیے نفع کا اضافہ مل گیا) اور اس باب میں یہی ضابطہ کلیہ ہے کہ میعاد کے بدلے میں معاوضہ لینا ناجائز ہے۔" تفسیر احکام القرآن۔

للامام الجصاص الرازی الحنفی م ۳۷۰ھ

ص ۴۶۷ ۔ ج ا۔

ٹھیک یہی حال بینک کے "بٹّے" کا بھی ہے کہ قبل از وقت بل یا ہنڈی بھنانے کے عوض میں تحریر شدہ رقم سے کچھ وضع کر لیتا ہے تو بلاشبہ یہ وضع یا کٹوتی میعاد ہی کے عوض میں ہے۔ لہٰذا یہ بھی سود اور ناجائز ہے۔

جواز کی راہ:

اگر قبل از وقت بلوں یا ہنڈیوں کو بھنانا ہی ضروری ہو تو بھناتے وقت صاحب حق یہ صراحت کر دے کہ میں نے یہ بل یا ہنڈی اتنے روپیے میں بیچی اور روپیے اتنے ہی بتائے جتنے اسے بینک کے ذریعے وصول ہوں گے اس طرح سے یہ تبادلہ جائز ہو گا۔

رہ گئی یہ بات کہ یہ تو معمولی کاغذ کی خطیر رقم کے عوض میں بیع ہوئی تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں تو شریعت نے فریقین کی باہمی رضامندی سے طے شدہ دام کے بدلے میں بیع کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

فتح القدیر میں ہے:

لو باع کاغذۃ بالف یجوز ولا یکرہ

(فتح القدیر۔ جلد ۶۔ ص ۳۲۴)

[اگر کاغذ کا کوئی ٹکڑا ہزار روپیے میں بیچا تو یہ بلا کراہت جائز ہے۔]

اسلامی بینک

عصر حاضر میں جب کہ بینک کاری کی ترقیات کا سورج نصف النہار پر پہنچ رہا ہے۔ اس کی عظیم افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آج کتنے ممالک ہیں جو مال و زر کے بے پناہ ذخائر یا عظیم الشان بینکوں کے سہارے اکتشافات و ایجادات میں کمال پیدا کر کے سپر پاور super power بن چکے ہیں اور دنیا کے امیر ترین ممالک میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اگر ان کی چلمن میں جھانک کر دیکھا جائے تو وہاں زیادہ تر ہماری ہی دولت بے بہا کی گلکاری نظر آئے گی اور محسوس ہو گا کہ وہ ہمارے ہی ریال ہیں جن کے بل بوتے پر وہ آج دولت کی دنیا میں سب سے اونچے نظر آ رہے ہیں۔ اگر ہم عقل و دانش کے تقاضوں پر کاربند ہو کر اپنی دولت کے خزانے اپنے قبضے میں کر لیں تو اس سے ہمارا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہو گا کہ معاشیات کی دنیا میں ہمارا بھی ایک وقار اور مقام ہو گا اور اس کے ذریعے مذہب و ملت کے فروغ و استحکام کے قابل قدر کارنامے انجام دیے جا سکیں گے۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ) اور دوسرا بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ سودی معاملات کی آلودگی سے ہمارا دامن داغ دار نہ ہو گا۔

آج قدم قدم پر بینکوں کی سوسائٹی میں ہو بہیں سود جیسی معصیت کا بادل ناخواستہ "خیر مقدم" کرنا پڑتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بینکنگ نظام ہمارے ہاتھوں میں نہیں۔ اس لیے سخت ضرورت ہے کہ اہل اسلام اس طرف بھی توجہ فرمائیں اور جگہ جگہ ایسے مالیاتی ادارے

کریں جن کی بنیادیں "اسلامی اصولوں پر" استوار کی گئی ہوں اور وہ "سود" اور اس کے مثل دوسرے ناجائز عقود سے مکمل پاک ہے۔

مذہب اسلام کے نظریہ معاشیات کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ اسلام نے بہت سے ایسے عقود کی اجازت دی ہے کہ ان پر عمل پیرا ہو کر کامیابی کے ساتھ اسلامی بینک چلائے جا سکتے ہیں۔ ہم یہاں ان عقود کی صرف ایک فہرست پیش کرتے ہیں:

۱۔ بیع موجل۔ (سامان نقد، دام ادھار)
۲۔ بیع مرابحہ (لاگت پر معین نفع کے ساتھ فروختگی)۔
۳۔ بیع عینہ (قرض سے خاطر خواہ نفع کے حصول کا جائز معاملہ)۔
۴۔ مضاربت: (ایک طرف سے دام دوسری طرف سے کام اور نفع میں فیصد کے لحاظ سے حسب قرارداد شرکت)۔
۵۔ شرکت مفاوضہ۔
۶۔ شرکت عنان
۷۔ اجارہ (کرایہ پر مزدوری اشیاء کی فراہمی)۔
۸۔ قرض حسن پر اجرت کتابت کا حصول
۹۔ شفاخانوں کا قیام۔
۱۰۔ تبرعات کی فراہمی۔ وغیرہ

> "خلیفہ ہارون رشید نے شہنشاہ شارلیمانی کو جو ساعت آلی پیش کی تھی اس کی کہانی عام معروف ہے۔ عرب اور ایرانی ایسے آلات بنانے میں جواب نہ رکھتے تھے۔ اسلام میں میکانیکی کا علم یونانی فکر اور تجربے کی میراث ہی نہیں تھا بلکہ اس میں چند قابل قدر اضافے بھی کیے گئے جو مسلمان دانشوروں کا کرشمہ تھے۔"
>
> ایچ۔ جی۔ ولز۔
> تہذیب و تمدن ص ۱۳۲

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۵ (مئی ۱۹۹۳ء)

سائنس اور مذہب

سلطان رفیع ◇

علمی وفکری حلقوں میں راہ پانے والے اس نظریے کی حقیقتاً کوئی بنیاد نہیں ہے کہ علم و سائنس اور مذہب ایک دوسرے کی ضد ہیں اور یہ ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ دیگر ادیان اور مذاہب کے بارے میں تو یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ ان کے سلسلے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ البتہ اسلام کے بارے میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ علم و آگہی کو نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ اس کا محرک اور داعی بھی ہے۔ اسلام ایک فطری دین ہے۔ تحقیق و جستجو اور تعلم و تعقل اس کی روح و اساس ہے اور علم و عمل کی راہوں میں کشادگی اس کا طریقۂ کار ہے۔ جو مذہب اپنی رہنما کتاب (قرآن پاک) میں جگہ جگہ انسانوں کو علم حاصل کرنے اور قدرت و فطرت کے رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی کی دعوت دیتا ہو۔ جو دین ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو کوشش و کاوش کی راہ پر لگانے کی ترغیب دیتا اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہو اور جو نظریۂ حیات و فکر و اجتہاد اور غور و تدبر کو انسانی زندگی کا سرمایہ بتاتا ہو۔ وہ بھلا کسی کو اپنی محنت و کاوش کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے سے کیوں روکے گا؟ اور وہ کھیتی بونے والے کو اس کے کاٹنے کے حق سے کیوں محروم کرے گا؟ اسلام وہ دین ہے جو بلند نگاہی وسعت نظری، عزم و حوصلہ، پامردی اور وسیع المشربی کا مبلغ ہے۔ وہ تحقیق و جستجو کا جذبہ ابھارتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو محنتی اور باعمل بنانا اور دیکھنا چاہتا ہے جہاں یہ تاثرات و اوصاف یکجا ہوں وہاں علم و عمل کا بول بالا ہے۔ ایجادات و اختراعات عمل میں آتی ہیں۔ نئے نئے راستے کھلتے ہیں اور انسانیت فلاح ترقی سے آسودہ اور بہرہ ور ہوتی رہے گا چنانچہ یہ تاثر کسی طور بھی صحیح اور درست نہیں ہے کہ علم و سائنس اور مذہب کا ایک دوسرے سے بیر ہے یا وہ باہم متصادم ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس مذہب (اسلام) نے ہمیشہ علم و فن کے فروغ و ترویج کی حوصلہ افزائی اور معاونت کی ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ اسے پوری طرح سمجھا اور سمجھایا نہیں گیا۔ اس کی ذمہ داری مسلم علما اور دانشوروں پر عاید ہوتی ہے۔ جو عبادات اور فقہی مسایل پر تو اتنا زور دیتے ہیں اور فروعی اختلافات کو ہوا دیتے ہیں تو اتنا وقت صرف کرتے ہیں مگر اسلام کے ان پہلوؤں اور گوشوں کو اجاگر کرنے کی سعی نہیں فرماتے جو علم و عمل، تحقیق و جستجو جد و جہد، محنت و مشقت، مساوات، انصاف، محبت و مروت امن و امانیت، وسیع القلبی، دوسروں کو اپنی خوبیاں دینے اور دوسروں کی اچھائیاں قبول کرنے کے باب میں

اس کا طرۂ امتیاز ہیں اور جنھیں جان کر اور معلوم کرکے ہی دنیا اسلام کو پسند کرنے، اس کے قریب آنے اور اسے اختیار کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے۔

اسلام، علم و سائنس، علوم جدید اور ایجاد و اختراع کا مخالف نہیں بلکہ اس کا داعی اور مبلغ ہے۔ البتہ وہ ان کے صحیح جائزے اور مفید استعمال پر بہت زیادہ زور دیتا ہے اور اس کا ایسا کرنا غلط بھی نہیں ہے کیونکہ آج کے دور میں علم و سائنس اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں غلط راہ پر پڑ جانے اور غلط طور پر استعمال ہونے کے باعث کچھ ایسے گھناؤنے اور ہولناک مناظر پیش کر رہے ہیں کہ جنھیں دیکھتے ہوئے اسلام کی علم و سائنس کے صحیح اور مفید استعمال پر زور دینے کی تھیوری بجائے خود درست اور صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔ علم و سائنس کے مذکورہ گھناؤنے اور ہولناک شواہد بادی النظر میں چونکہ اخلاق و مذہب کی پاکیزہ تعلیمات کے مطابق نہیں ہیں اس لیے کچھ لوگ یہ سمجھنے اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ مذہب اور علم و سائنس کا کوئی میل نہیں ہے لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بجائے خود علم و سائنس میں کوئی خرابی موجود نہیں ہے بلکہ یہ اس کا غلط اور خود غرضانہ استعمال ہے جو اسے بُرا یا غلط بنا دیتا ہے بلکہ اسی طرح جیسے کہ چاقو میں کاٹنے اور تراشنے کی صلاحیت موجود ہے جس سے آپ پھل بھی کاٹ سکتے ہیں اور کسی کی ناک بھی۔ اگر چاقو کو اشیائے خورد و نوش کے تراشنے میں استعمال کرنے کے بجائے اسے کسی کا پیٹ پھاڑ کر انتڑیاں باہر نکالنے کے کام میں لایا جائے تو اس میں قصور کس کا ہوگا، چاقو کا؟ یا اسے غلط طور پر استعمال کرنے والے کا؟

انسان اپنی نوعیت اور مزاج ہر دو اعتبار سے ضرورت اور احتیاج کا پتلا ہے اور ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے اس لیے آدمی کا ذہن اور ہاتھ پاؤں تحقیق و تجسس اور ایجاد و اختراع کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بیل گاڑی سے ہوائی جہاز تک، پتھر سے ایٹمی ایندھن تک، حد نظر سے ٹیلی ویژن تک، آواز کی پہنچ تک محدود دائرے سے مائیکرو ویو ریڈیو، ٹیلی فون تک، سرکنڈے کے قلم سے ٹائپ رائٹر تک ذہن کی یادداشت کی محدودیت سے کمپیوٹر تک، تیر و کمان سے ایٹم بم، میزائل اور راکٹ تک، درخت کے سائے سے ایرکنڈیشنر تک اور ہاتھ پاؤں کی استعداد سے روبوٹ (مشینی انسان) تک کا تدریجی سفر انسان کی اسی احتیاج اور اس کی آسودگی و تکمیل کی داستان ہے یہ ترقی انسان کی کھوج، لگن اور اس کے خوب سے خوب تر کے جذبہ اور جدّوجہد کی کرشمہ سازی ہے۔ انسانی فطرت میں رچا بسا ہوا جذبۂ تحقیق و جستجو اسے برابر آگے ہی بڑھائے لیے جا رہا ہے وہ کبھی تنریاتن سنگھ کی شکل میں ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی کو چھو لیتا ہے تو کبھی خلائی شٹل میں بیٹھ کر چاند کی وادی میں جا اترتا ہے۔ یہی جذبہ ہے جس سے مخمور و سرشار ہو کر آدمی آسمان میں تھگلی لگا رہا ہے۔ مصنوعی بارش برسا رہا ہے۔ بجلی کا دماغ (کمپیوٹر) اور بجلی کے کارکن (روبوٹ) بنا رہا ہے۔ موسمی تبدیلیوں کی پیشگی خبر دے رہا ہے۔ فلک شگاف عمارتیں تعمیر کر رہا ہے۔ ہزاروں میل دور سے بیٹھا باتیں کر رہا اور باتیں سن رہا ہے اور لاکھوں میل پرے کی چیزوں اور مناظر سے گھر بیٹھے لطف اندوز ہو رہا ہے جنگلوں اور ویرانوں کو آباد کر رہا ہے۔ پُرغضب اور پُرشور سمندروں پر بند باندھ کر ان کے پانی سے بجلی اور اناج پیدا کر رہا ہے۔ پتھریلی اور بنجر زمین کا سینہ چیر کر غذا اور معدنی دولت نکال کر رہا ہے۔ یہ انسان ہے۔ ہاں انسان ہی ہے مگر کون انسان؟ اللہ کا بندہ وہ حقیر ناچیز اور مشت خاک ہستی جو خود کچھ بھی نہ تھا۔ اس کو ذہن کو اس کے خالق و مالک نے توانائی اور حوصلہ بخشا۔ اسے ذہن رسا مرحمت فرمایا۔ سمجھ بوجھ دی۔ اپنے کلام قرآن پاک کے

ذریعے اشارے کنایوں میں فطرت کے رازہائے سربستہ بتائے اور پھر ان رازہائے دروں پردہ کی پردہ کشائی کا اذن دیا تاکہ وہ کارگاہ عالم کی پوشیدہ حقیقتوں کو معلوم کرے اور ان سے فیض یاب ہو۔ کیوں کہ یہ تمام ظاہر اور پوشیدہ نعمتیں استفادۂ انسانی کے لیے تخلیق کی گئی ہیں اور منشائے خداوندی یہی ہے کہ انھیں دریافت کیا جائے اور ان سے تمتع کیا جائے۔ کائنات کی حقیقتوں کی دریافت اور افتاد سے آدمی مالک کائنات کی عظمت و جبروت سے باخبر ہوتا ہے اور اس کی بندگی اور پرستش پہلے سے زیادہ انہماک و احترام کے ساتھ کرنے لگ جاتا ہے۔ پھر ان خدائی نعمتوں سے بیش از بیش طور پر فیضیاب ہونے کے نتیجہ میں اس کے ایمان و ایقان میں بھی مزید اضافہ ہوتا ہے اور وہ خدا کا شکر بجالانے میں زیادہ منہمک اور پُرجوش ہوجاتا ہے۔ اس طرح کائنات کی پوشیدہ حقیقتوں کی دریافت اور ادراک خدا کی خدائی کو تسلیم اور قایم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس سے اللہ کی حاکمیت کا تصور انسانی قلوب میں مزید راسخ ہوتا ہے اور خدا کے وجود اور اس کی بالادستی ان کی نظر میں بھی قایم ہوجاتی یا بڑھ جاتی ہے۔ جو پہلے اس بارے میں مشکوک اور متذبذب تھے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ علم و سائنس کا حصول اور استعمال مذہب و اخلاق کی عملداری کو قایم کرنے اور فروغ دینے میں معاون تو ہوسکتا ہے کسی بھی طرح نقصان رساں نہیں ہے پھر بھلا مذہب خصوصاً اسلام کو علم و سائنس سے کیا اندیشہ یا تعرض ہوسکتا ہے۔

انسان جب بھی پُرامن مقاصد کی خاطر علم و فن کو فروغ دیتا اور خدائی نعمتوں سے استفادہ کی سعی کرتا ہے تو مذہب اس کی سرپرستی اور پشت پناہی کرتا ہے۔ کیونکہ مذہب کا مقصد و منتہا بھی انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبود ہی ہے۔ البتہ جب آدمی تمام اخلاقی اور قانونی حدود کو پھلانگتے ہوئے علم و فن کا ناجائز اور غلط استعمال شروع کر دیتا ہے تو پھر مذہب اس کے مقابل آکھڑا ہوتا ہے اور تہذیب و اخلاق اپنے آہنی ہاتھوں سے اس کی کلائی تھام لیتے ہیں اور ضمیر کا بچھو اس کے کلیجے میں اپنا ڈنک اُتار دیتا ہے جس پر یکلخت پکار پڑتی ہے کہ مذہب نے علم اور ترقی کا راستہ روک دیا۔ اخلاق آزادیٔ فکر و عمل کا دشمن ہے اور ضمیر کسی کو من مانی کرنے نہیں دیتا لیکن اگر آنکھوں پر سے تعصب کی پٹی کو اُتار کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسا کہ مذہب فکر و عمل کی راہ کو نہیں روک رہا ہے۔ وہ ترقی کا مخالف نہیں ہے۔ وہ دل کی امنگوں کو بر آنے سے روکنا نہیں چاہتا۔ بلکہ خود انسان اور انسان کی بھلائی اور فلاح کی خاطر ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ مذہب دشمن تو ہے مگر فکر و عمل کا نہیں بلکہ فکر و عمل کے غلط رجحانات کا دشمن ہے اور کیوں نہ ہو؟ جب ایٹم کی قوت ایندھن کے لطور استعمال ہونے کی بجائے بستیوں پر آگ برسانے اور لاکھوں بے گناہ انسانوں کو ہلاک کرنے کے کام میں آنے لگے۔ جب ہائیڈروجن کے تابکار مادہ کو بیماروں کی شفایابی کی بجائے نسلوں کو نیست و نابود کرنے اور فضا کو مسموم بنانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ جب میزایل اور راکٹ سفری فاصلوں میں کمی کرنے کا کام انجام دینے کی بجائے انسانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے اور انھیں ہمیشہ کے لیے اپاہج اور معذور بنا دینے کے لیے وقف ہوجائیں۔ جب سائنسی ایجادات کو عوام الناس کے استفادہ اور انھیں آرام و راحت بہم پہنچانے کے لیے بروئے کار لانے کی بجائے انمول داموں فروخت کرنے، لوٹ کھسوٹ مچانے اور ان پر اجارہ داری قایم کرکے مخصوص ہاتھوں میں ارتکاز دولت کے لیے استعمال کیا جانے لگے۔ جب مشینیں عوام و عام کی ضرورت پوری کرنے کی بجائے اونچا اور مراعات یافتہ طبقہ کی پُرتعیش زندگی میں رنگ بھرنے کا کام انجام دینے لگیں جیسے کہ سیلاب

قدرتی تغیرات اور آفات ارضی و سماوی کی پیشگی اطلاع دینے کے بجائے ممالک کی جاسوسی کے سلسلہ میں استعمال ہونے لگیں (وغیرہ وغیرہ) تو مذہب کیوں نہ اُن کے راستے میں حایل ہوگا؟ لیکن یہ مذہب و اخلاق کی علم دشمنی نہیں بلکہ علم دوستی اور انسان دوستی ہوگی۔

آج صورت حال یہ ہے کہ علم و سائنس کے منہ زور گھوڑے افراط و تفریط کی حدود کو پھلانگتے ہوئے بے تحاشہ دوڑتے چلے جارہے ہیں۔ ان کے قدموں تلے اچھی اور بری ہر چیز روندی اور کچلی جارہی ہے۔ اگر مذہب و اخلاق نے ان کے منہ میں لگام نہ دی تو اندیشہ ہے کہ زندگی کے میدان کو وہ اس طرح روند ڈالیں گے کہ نہ کوئی ہری پتی یا رنگین پھول باقی رہے گا اور نہ زندگی کا نام و نشان۔ آج کے دور میں علم و سائنس کا کھلونا ایسے ہاتھوں میں آگیا ہے جو اقتدار، دولت اور جاہ و حشم کے نشے میں مخمور ہیں اور دنیا و مافیہا سے غافل ہوکر معصیت اور ظلم و استحصال کے لیے کھلے عام استعمال کیا جارہا ہے اور کوئی نہیں ہے جو اُن ہاتھوں کو روک سکے۔ ماسوائے مذہب و اخلاق کے اس طرح مذہب و اخلاق ہی انسانیت کی آخری امید نظر آتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آج کے دور میں صرف خدا پرست انسان ہی اچھے اور برے کی تمیز کا حامل ہوسکتا ہے۔ وہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر ہی اور روز قیامت اپنے اچھے برے اعمال و افعال کی جواب دہی کا تصور اپنے قلب و ذہن میں رکھنے کے باعث ہی گناہ، ظلم اور جہالت کے کاموں سے بچا رہنے کی امید کرسکتا ہے ورنہ اس دلدل میں تو سبھی اندر ہی اندر اترے چلے جارہے ہیں۔ صرف خدا پرست انسان ہی ایسا ظرف رکھتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت پانے کے باوجود اس کا سر سجدے میں ہو اور وہ خدا سے خیر و فلاح کا طالب ہو۔ وہ ہمالیہ کی چوٹی پر پہنچ کر بھی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرے۔ وہ زمین پر چلے تو آہستہ خرامی سے اور آسمان کی جانب نگاہ کرے تو عاجزی کے ساتھ۔ صرف ایسے ہی آدمی سے دنیا کو کسی شرارت یا ظلم کا اندیشہ نہیں ہوسکتا۔ خواہ اس کے قبضۂ قدرت میں کتنے ہی ہوائی جہاز، راکٹ، میزائل، ایٹم بم، کمپیوٹر اور روبوٹ کیوں نہ ہوں۔ جس وقت بھی ان کا استعمال کرے گا اچھا اور منصفانہ استعمال کرے گا اور اس کی ذات سے دنیا کو چین، راحت اور فراغت ہی ملے گی لہٰذا لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل" کی طرح علم و سائنس کے ساتھ ساتھ مذہب اخلاق کی پاسداری بھی دنیا کے لیے ضروری اور مفید ہے۔ اس سے اعتدال و احتیاط کی جو فضا پیدا ہوگی وہ انسان اور انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ اس بارے میں اسلامی فکر بڑی واضح اور مبنی بر حقیقت ہے جیسے آج کے دور میں تمام پریشانیوں اور مصائب کا مداوا کہا جاسکتا ہے۔ دیگر مذاہب میں بھی کچھ یہی انداز فکر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بھارت کے ایک مفکر اور دانش مند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے پنسلوانیہ یونیورسٹی کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہی بات اس طرح کہی تھی کہ "ایک صداقت تمام مذاہب میں مشترک ہے جو موجودہ تہذیب و تمدن کے جملہ مسایل کا حل بھی ہے وہ یہ کہ انسان کے ذہن کو بلندی کی جانب مایل کرنے کی کوشش کی جائے۔ دنیا کا موجودہ نظام نہ تو مادی ہے اور نہ خالص ذہنی، بلکہ روحانی ہے۔ جب کہ مذہبی زندگی کی حقیقتیں سائنسی صداقتوں سے بالاتر ہیں۔ چنانچہ مذہب کی مدد سے ہی تمام سماجی اور سیاسی نظاموں میں باہمی رواداری اور مفاہمت پیدا کی جاسکتی ہے۔"

(بشکریہ ماہنامہ طالب علم، کراچی)

ظُلم

محمد مختار اصلاحی علیگ ٭

ظلم کے لغوی معنیٰ "بے جا استعمال" کے ہیں۔ کسی چیز کا بے محل استعمال غلط اور خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے اسی لیے زیادتی، حق تلفی، ناانصافی اور تاریکی کو بھی مرادی معنیٰ میں ظلم کہا جاتا ہے اور یہ اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اپنے خالق و مالک کی دی ہوئی نعمتوں کو جھٹلانا اور بخشی ہوئی صلاحیتوں کا بے جا استعمال ظلم ہے۔ ماں باپ کی نافرمانی اور استاد کی ناقدری و بے ادبی بھی ظلم ہے۔ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا لحاظ و خیال نہ کرنا بھی ظلم ہے۔ کسی کمزور کو ستانا و مارنا اور کسی کا حق دبانا بھی ظلم ہے۔ وعدہ کر کے وفا نہ کرنا اور معاہدہ کر کے اور اس کی خلاف ورزی کرنا بھی ظلم ہے اسی طرح ظلم کی اور بھی شکلیں ہیں۔

ظلم و ستم کے طریقے بھی مختلف ہیں۔

کسی بادشاہ یا حاکم کا ظلم یہ ہے کہ وہ اپنی حکومت کا نظام کار درست نہ کر پائے۔ ملک کے باشندوں کے آرام و آسایش اور ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی بندوبست نہ کر سکے اور کسی کمزور کو طاقت ور سے انصاف نہ دلا سکے جج اور منصف کا ظلم یہ ہے کہ حق و انصاف کے مطابق فیصلہ نہ کرے، کمزور کے مقابل طاقت ور کی حمایت کرے اور موافق فیصلے کے لیے رشوت طلب کرے۔ شوہر کا بیوی پر ظلم یہ ہے کہ وہ اس کے واجبی حقوق اور اس کی ضرورتوں کو پورا نہ کرے اور اس کے ساتھ محبت و حسن سلوک سے پیش نہ آئے اور ایک سے زاید بیویوں کی صورت میں یکساں برتاو اور انصاف نہ کر سکے۔ بیوی کا شوہر پر ظلم یہ ہے کہ وہ اس کے آرام و آسایش کا خیال نہ کرے۔ اس کے احساسات و جذبات کی بھی اسے کوئی پروا نہ ہو اور اپنے شوہر کو نظر انداز کر کے غیروں سے رسم و راہ بڑھائے۔ ماں باپ کا اپنی اولاد پر ظلم یہ ہے کہ وہ ان کی صحیح تعلیم و تربیت سے غفلت برتیں اور انھیں بری صحبت و غلط ماحول میں جانے سے نہ روکیں۔ اولاد کا ماں باپ پر ظلم یہ ہے کہ وہ اُن کا کہنا نہ مانیں، ان کے حقوق ادا نہ کریں، ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئیں اور جب دونوں بیمار یا بوڑھے ہو جائیں تو ان کی خدمت کرنے میں کوتاہی کریں۔ پڑوسی کا پڑوسی پر ظلم یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کا خیال نہ کریں، باہم میل جول نہ رکھیں، اور دکھ سکھ میں شرکت نہ کریں۔ ہماری اس دنیا میں ظلم و ستم کے یہ سارے طریقے رائج ہیں اور پھر ان کے علاوہ بھی ہیں۔ ظلم چھوٹا ہو یا بڑا بہرحال ظلم ہے اور اس کا نتیجہ ہمیشہ خراب

٭ اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ، بمبئی۔

ہوتا ہے۔

تمام مذاہب نے بھی ظلم کو بڑی سختی سے روکا ہے۔
قرآن مجید میں تو کئی جگہ ظالموں کو ظلم کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جس روز ظالموں کو ان کا عذر کچھ نفع نہ دے گا، ان پر خدا کی طرف سے پھٹکار ہوگی اور ان کے لیے برا گھر ہوگا۔"

(سورہ المومن ۵۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جا سکتی ہے لیکن ظالم کی مدد کیوں کر کی جائے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔"

(صحیح بخاری - باب المظالم)

حضرت مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"ظلم مت کرو ورنہ تمہارا حال یہ ہوگا کہ دعائیں کرو گے لیکن قبول نہ ہوں گی، بارش طلب کرو گے لیکن بارش نہ ہوگی، مدد مانگو گے لیکن تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی۔"

(طبرانی)

ظلم کے اور بھی نقصانات ہیں۔

۱- ظلم نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی جانیں لی ہیں، بے شمار گھروں کو برباد اور ویران کیا ہے اور نہ جانے کتنی پاک دامن عورتوں کی عفتیں و عصمتیں لوٹی ہیں۔

۲- ظالم کی جب نیت بگڑتی ہے تو نہ کوئی دلیل و حجت کام آتی ہے اور نہ اسے اپنا و پرائے کی کوئی تمیز ہوتی ہے۔

۳- ظالم کو کبھی سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوتا کیوں کہ دکھے ہوئے دلوں سے اس کے کے لیے بد دعائیں نکلتی ہیں۔

۴- ظالم کو ہر شخص نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

۵- ظالم ظلم کے علاوہ اور بھی بہت سی برائیوں میں مبتلا رہتا ہے۔

۶- ظالم کی عمر بہت کم ہوتی ہے اور اس کا انجام ہمیشہ عبرت ناک ہوتا ہے۔

ظلم کا تدارک اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ شروع ہی سے بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور کیا جائے، انھیں یہ بھی بتایا جائے کہ بحیثیت ایک انسان کے ان کے فرائض کیا ہیں، بھائی کو بھائی کے ساتھ کس طرح خلوص و محبت سے پیش آنا چاہیے؟ بھلے اور برے کی پہچان کیوں کر کی جائے؟ اپنے معاشرے کو صاف و ستھرا اور پاکیزہ کیسے بنایا جائے؟ آج ساری دنیا میں جو ظلم و ناانصافی کا دور دورہ ہے اس کی بڑی وجہ صحیح تعلیم و تربیت کی کمی ہے۔ دنیا کے تمام ممالک خطرناک و مہلک آلات جنگ تیار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں تاکہ انسانی گردنیں نہایت آسانی و تیزی سے کاٹی جا سکیں لیکن کسی کو اس طرف ذرا بھی دھیان نہیں ہے کہ ایسی پاک و صاف اور خوش گوار فضا بنائی جائے کہ ان آلات جنگ کی کوئی ضرورت ہی نہ پڑے۔

ہمارے ملک میں بھی ظلم و غارت گری کا جو طوفان بپا ہے اس کا بھی اہم سبب یہی ہے کہ شروع

سے ہم نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی، حالانکہ غلامی سے نجات پانے کے بعد ہمارا یہ پہلا فرض تھا کہ ہم سب سے پہلے اپنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتے لیکن افسوس کہ ہم نے اپنے نظامِ تعلیم ہی کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا ہے۔ اگر ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ظلم و بربریت کی تباہ کاریاں کو روکا جائے تو ایک طرف بچوں کی تعلیم و تربیت پر پورا دھیان دینا ہوگا۔ دوسری طرف جرأت و پامردی کے ساتھ ظلم و ستم کا مقابلہ بھی کرنا ہوگا۔ ظلم کے پھیلنے اور بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ مصلحت، غفلت اور بزدلی کی وجہ سے ظلم کا مقابلہ نہیں کرتے۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ ظلم جب بھی سر اٹھائے اسے کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اسی دوطرفہ کوشش سے ہم بڑی حد تک ظلم کا سدِباب کر سکتے ہیں۔

"عرب ہیئت دانوں نے آسمان پر اپنے ہنر کے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ کوئی شخص بھی کرۂ فلک کے ستاروں کا نام پڑھے گا تو جھٹ حقیقت جان لے گا۔ یورپ کی زبانوں میں ستاروں کے اکثر نام عربی سے لیے گئے ہیں۔ مثلاً عقرب (بچھو)، الجبیدی، الجدی (لڑکا) الطائر (اڑنے والا)، ذنیب (ذنب، دُم) فیرکیڈ (فرقد، بچھڑا)۔ پھر متعدد اصطلاحات بھی عربی الاصل ہیں۔ اس میں ازیمتھ (السمت)۔ نادر (نظیر)، زینتھ (السمت) عربی سے ماخوذ ہیں۔ یہ اسلام کے اس ورثہ کی شہادت دیتی ہیں جو سسلی سے یورپ کو ملا۔"

فلپ حتی۔ عربوں کی تاریخ،

خون ہمارا محافظ

محمد اسلم پرویز ٭

خون کے سرخ ذرات اور پلازما ہمارے جسم میں غذا اور آکسیجن کے نقل و حمل کے ذمّہ دار ہیں۔ انہی کی وجہ سے جسم کے تمام خلیے اپنے فضلے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ نقل و حمل میں معاون ہونے کے علاوہ خون کا ایک اور اہم کام دفاعی نوعیت کا ہے۔ یعنی جسم کو جراثیموں کے حملوں سے بچانا۔ ہمارے لیے یہ حفاظتی کام خون میں موجود کچھ دوسرے ذرّات کرتے ہیں جن کو سفید ذرّات اور پلیٹی لیٹس کہا جاتا ہے۔ برخلاف سرخ ذرّات کے جو کہ گول اور دونوں سروں سے پھولے ہوئے ہوتے ہیں سفید ذرّات کئی مختلف شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ سرخ ذرّات کے مقابلے میں یہ خون میں کم تعداد میں ہوتے ہیں۔ اوسطاً .. ، سرخ ذرّات کے ساتھ ایک سفید ذرہ ہوتا ہے۔ ان کی کل پانچ قسمیں ہوتی ہیں۔ (شکل دیکھیے) نیوٹروفلس اور مونو سائٹس جسم میں داخل ہونے والے جراثیموں کو نگل کر ختم کر دیتے ہیں۔ جب کسی جگہ پر جراثیم حملہ کرتے ہیں تو یہ دونوں ذرّات خون کی باریک نالیوں میں سے باہر نکل آتے ہیں اور اس جگہ پر جاکر جراثیم کو گھیر لیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ جراثیم کو اپنے اندر ہضم کر لیتے ہیں۔ ان سفید ذرّات کے اندر ایک خاص قسم کا عضد ہوتا ہے جس میں جاکر یہ جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس لڑائی کے نتیجے میں جو سفید ذرّات یا جراثیم مارے جاتے ہیں وہی پیس بناتے ہیں۔ کسی بھی زخم پر پیس کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ جسم کا دفاعی نظام اپنا کام کر رہا ہے اگر یہ دفاعی نظام حملہ آور سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے تو ہمارا جسم بیماری سے بچ جاتا ہے ورنہ تو پھر ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سفید ذرّات کی عمر کافی ہوتی ہے اور ایک صحت مند آدمی کے جسم میں یہ صرف چند دن زندہ رہ پاتے ہیں۔ آپ یہ پوچھیں گے کہ اگر جراثیم کا حملہ نہ ہو تو یہ سفید ذرّات کیسے مارے جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے جسم کے اندر مستقل جراثیم موجود رہتے ہیں اور آتے رہتے ہیں۔ ہمارے اردگرد چاروں طرف جراثیم ہی جراثیم ہیں۔ چاہے ہوا ہو، پانی ہو یا کھانا، ہر چیز میں جراثیم موجود ہوتے ہیں اور یہ سفید ذرّات ہمیں اطلاع دیے بغیر خاموشی سے ان جراثیم سے لڑتے رہتے ہیں اور بیماریوں سے ہماری حفاظت کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم بیمار ہی جب پڑتے ہیں جب ہمارے یہ محافظ جراثیموں سے لڑنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ ان کی ناکامی کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں یا تو حملہ شدید اور طاقت ور ہو یا پھر دفاعی نظام کسی وجہ سے کمزور ہو گیا ہو۔ ہمارا دفاعی نظام اکثر بیماری یا کسی پریشانی

٭ ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ دہلی۔

کی وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مزید بیماری لگنے کا ڈر کافی رہتا ہے۔

سفید ذرات کی ایک اور قسم ہوتی ہے جس کو لمفوسائیٹ کہتے ہیں۔ ان کی ہمارے جسم میں ایک خاص اہمیت ہے کیونکہ یہ ہمارے لیے ایک مخصوص دفاعی ہتھیار بناتے ہیں جس کو اینٹی باڈی کہا جاتا ہے۔ جب ہمارے جسم میں کوئی باہری چیز داخل ہوتی ہے تو اس کا فوری ردعمل خون میں ہوتا ہے۔ ہمارے جسم میں داخل ہونے والی ہر چیز یقیناً کسی نہ کسی سالمے یعنی مالیکیول سے بنی ہوگی۔ چاہے یہ پروٹین ہوں یا کاربو ہائیڈریٹ۔ ان باہری مالیکیول کو اینٹی جن کہا جاتا ہے۔ ان کے ردعمل کے طور پر خون میں ایسے مالیکیول بنتے ہیں جو ان کی ضد ہوتے ہیں ان کو ہی اینٹی باڈی کہا جاتا ہے اور ان کے بننے کا عمل لمفوسائیٹ کی مدد سے ہوتا ہے۔

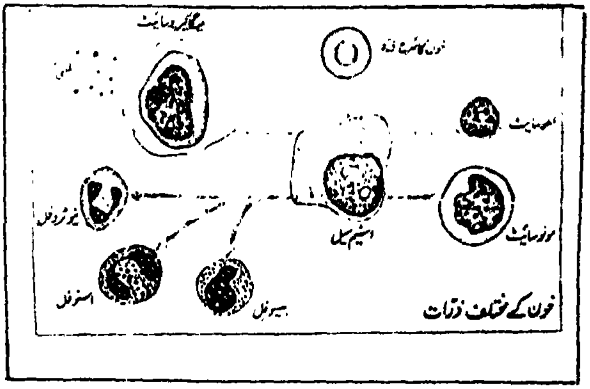
ہر اینٹی جن کے لیے ایک مخصوص اینٹی باڈی ہوتی ہے جو کہ فوراً اس سے جڑ جاتی ہے جس طرح مقناطیس سے لوہا جڑ جاتا ہے اسی طرح اینٹی باڈی، اینٹی جن سے چپک جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں باہر سے داخل ہونے والا مادہ یا اینٹی جن اپنی صلاحیت کھو دیتا ہے اور اس کی وجہ سے جسم میں کوئی بیماری پیدا نہیں ہوتی۔ آج کل مختلف بیماریوں کے ٹیکوں کے استعمال سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔

اسی اینٹی جن، اینٹی باڈی بنیاد پر ٹیکہ بنا ہے۔ ٹیکہ دراصل متعلقہ بیماری کے کمزور جراثیم کی تھوڑی سی مقدار پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کالی کھانسی کے ٹیکے میں کالی کھانسی پیدا کرنے والے جراثیموں کی تھوڑی سی مقدار ہوگی۔ جب اس کو جسم میں داخل کیا جاتا ہے تو یہ اینٹی جن کی حیثیت سے جسم میں جاتا ہے۔ اس سے لڑنے کے لیے قدرتی طور سے فوراً اینٹی باڈی بنتے ہیں۔ یہ اینٹی باڈی دراصل کالی کھانسی کے جراثیم کو مارنے والے مادے ہوتے ہیں۔ ٹیکے میں جراثیم بہت تھوڑے ہوتے ہیں، اس لیے وہ تو فوراً مر جاتے ہیں لیکن یہ اینٹی باڈی جو کہ اس بیماری کے خلاف لڑنے والے سپاہی ہوتے ہیں کافی عرصے تک خون میں موجود رہ کر جسم کو کسی بھی ممکنہ حملے سے بچاتے ہیں۔ اس طرح ٹیکے کے ذریعے جسم کا قدرتی دفاعی نظام مزید چوکس کر دیا جاتا ہے یہ سپاہی بھی لمفوسائیٹ کی مدد سے تیار کیے جاتے ہیں اس طرح دیکھا جائے تو اس قسم کے سفید ذرات ہماری حفاظت کے لیے بے حد ضروری ہیں۔

سفید ذرات کی بقیہ دو قسموں کو اسنوفل کہا جاتا ہے اگرچہ ان کا کام ابھی پوری طرح سے واضح نہیں ہوا ہے لیکن یہ طے ہو چکا ہے کہ یہ دونوں قسمیں بھی جسم کا دفاع مضبوط کرتی ہیں۔ اس کا ثبوت ہم کو یوں ملتا ہے کہ جب بھی ہمارے جسم پر جراثیموں کا حملہ ہوتا ہے ہمارے خون میں ان دونوں قسم کے ذرات کی تعداد کافی بڑھ جاتی ہے۔ کل ملا کر سفید ذرات کی یہ پانچوں قسمیں ہم کو بہت سی ایسی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہیں جن کے حملے کا ہم کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ یہ تمام قسم کے سفید ذرّات ہڈیوں کے گودے میں ہی بنتے ہیں۔ اگر کبھی کسی وجہ سے ان کے بننے کے عمل میں گڑبڑ ہو جاتی ہے تو ایسی حالت میں مریض کی بیماری طول پکڑ لیتی ہے۔ اس دوران ڈاکٹر ہڈی میں سے گودا نکال کر اسے ٹیسٹ کرتے ہیں۔

خون کے ذرّوں کی تیسری قسم پلیٹی لیٹس کہلاتی ہے یہ بھی ہڈی کے گودے میں بنتے ہیں اور سائز میں بمقابلہ سرخ یا سفید ذرات کے کافی چھوٹے ہوتے ہیں۔ پلازما کے ساتھ مل کر یہ خون جمانے میں مدد کرتے ہیں۔ خون کی اہمیت سے واقف ہونے کے بعد ذہن میں قدرتی طور سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ خون کی اگر جسم میں اتنی ہی اہمیت ہے تو اس کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے قدرت نے کیا انتظامات کیے ہیں۔ ہم میں بنیادی طور پر دو طرح کے حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔ اوّل تو تازہ اور نیا خون بننے کا عمل کافی تیز ہوتا

ہے۔ سترکلو کے ایک اوسط شخص میں لگ بھگ پانچ لیٹر خون ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے خون نکل جائے تو اس کی کو جسم فوراً پورا کر لیتا ہے۔ عموماً ایک لیٹر تک نکلا ہوا خون دو بارہ بآسانی بن سکتا ہے۔ دوسرا طریقہ جو جسم استعمال کرتا ہے وہ خون کے بہاؤ کو روکنے کا ہے۔ جیسے ہی کسی جگہ کوئی زخم ہوتا ہے یا کٹ جاتا ہے تو وہاں پر پلیٹی لیٹس اکٹھا ہو جاتے ہیں اور اس کے اندرونی حصے سے چپک جاتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کا کیمیائی مادہ خارج کرتے ہیں جس کی وجہ سے کئی کیمیائی عملات کے بعد پلازما جو کہ عام حالات میں رقیق ہوتا ہے، ہلکے ہلکے جمنے لگتا ہے۔ اس میں لمبے لمبے ریشے پیدا ہو جاتے ہیں جو کہ پلیٹی لیٹس کے ساتھ مل کر زخم کے اوپر ایک سخت پرت سی بنا دیتے ہیں۔ جس کے باعث خون کا بہنا رک جاتا ہے۔ خون جمنے کے عمل کے دوران جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی کسی بیماری کی وجہ سے جسم میں کم ہو جائے تو ایسے حالات میں زخم کا بھرنا یا خون کا بند ہونا بڑا مشکل ہو جاتا ہے اور مریض زیادہ خون نکلنے کی وجہ سے مر جاتا ہے۔



خون کے مختلف ذرات

ہمارے خون میں موجود سرخ ذرات کی سطح پر بھی کچھ خاص قسم کے مادے پائے جاتے ہیں جن کو اینٹی جن کہا جاتا ہے ان کی بنیاد پر انسانی خون کو چار مختلف گروپوں میں رکھا گیا ہے جن کو AB، B، A اور O کہا جاتا ہے اگر A گروپ کے انسان میں B گروپ کا خون داخل کر دیا جائے تو یہ دونوں قسم کے خون ایک دوسرے سے چپک جاتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس چپکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جس طرح سرخ ذرات پر اینٹی جن ہوتے ہیں اسی طرح خون کے پلازما میں اینٹی باڈی ہوتے ہیں۔ اگر دو مختلف خون مل جاتے ہیں تو ان میں آپس میں رد عمل ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مریض ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مریض کو کسی سبب باہری خون دینے کی ضرورت پڑ جائے تو اس کے خون کا گروپ معلوم کرنا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ صحیح گروپ معلوم ہونے کے بعد ہی مریض کو اس گروپ کا خون دیا جا سکتا ہے۔ O گروپ کا خون ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی گروپ کے انسان کو دیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا کسی گروپ سے رد عمل نہیں ہوتا۔ کس انسان میں کس گروپ کا خون ہوگا یہ اس بات پر منحصر ہے کہ اس کے والدین میں کون سے گروپ موجود تھے۔ یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک نسلی خاصیت ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو گروپ ماں باپ کا ہو وہی اولاد کا بھی ہو۔ گروپ کے علاوہ ایک اور چیز جو خون میں ٹیسٹ کی جاتی ہے۔ اس کو آر ایچ فیکٹر (Rh-Factor) کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا مادہ یا اینٹی جن ہے جو کہ سرخ ذرات میں موجود ہوتا ہے۔ جن افراد میں یہ ہوتا ہے ان کو مثبت آر ایچ (Rh+) کہا جاتا ہے جب کہ وہ لوگ جن میں یہ نہیں ہوتا ان کو منفی آر ایچ (Rh-) کہتے ہیں۔ مختلف آبادیوں میں اس کا تناسب مختلف ہوتا ہے لیکن عموماً ۸۵ فی صد سے زاید لوگ مثبت قسم کے ہوتے ہیں۔ آر ایچ فیکٹر کی جانچ خون دیتے وقت کافی بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر مثبت انسان میں منفی خون دے دیا جائے تو بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اسی طرح

شادی کے وقت بھی اگر یہ خیال رکھا جائے تو بہتر ہے کہ میاں بیوی دونوں ایک ہی قسم کے ہوں۔ اگر منفی قسم قسم کی خاتون کے مثبت قسم کا بچہ ٹھہرے (کیونکہ باپ میں مثبت خون تھا) تو ایسے میں عموماً بچے کی جان کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ان سب باتوں کے پیش نظر ضروری ہے کہ ہم کو اپنے خون کا گروپ معلوم ہو۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہر صحت مند آدمی خون کی جانچ کرا کر گروپ وغیرہ کی تفصیل اپنے ساتھ رکھے۔ غیر ممالک میں تو اس قسم کی خدمات کے لیے باقاعدہ ادارے ہیں، جو آپ کو شناختی کارڈ بنا کر دیتے ہیں، جن میں یہ تفصیل موجود ہوتی ہے۔ اس سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ اگر خدا نخواستہ آپ کسی حادثے کا شکار ہو گئے تو جو وقت آپ کے خون کی جانچ پڑتال میں ضایع ہوتا ہے وہ بچا لیا جائے گا اور آپ کو فوری امداد مل جائے گی۔ ایسے لمحوں میں ایک ایک منٹ قیمتی ہوتا ہے اور اس قسم کی پیش بندی قیمتی وقت کو بچا کر آپ کی قیمتی جان بچانے میں مددگار ہوتی ہے۔

"انسان بقا کی تلاش اور جستجو سے کبھی نہیں اکتائے گا مگر اس کو کبھی یہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی، کیوں کہ وہ جسمانی ساخت کے چند قوانین کا پابند ہے۔ وہ عضویاتی زمان کو روکنے کے لیے اور غالباً ایک حد تک اس کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن وہ موت پر کبھی فتح نہیں پا سکتا۔"

ڈاکٹر الکسس کیرل

سرسید احمد اور مدرسہ رحیمیہ

عقیلہ شاہین ☆

آج کل علمی اور ادبی حلقوں میں اکثر یہ گونج سنائی دیتی ہے کہ اگر علم و ادب کا قوم کی ترقی کے ساتھ گہرا رابطہ ہے تو اس علم و ادب کو کیا کہا جائے گا جو قوم کی تربیت و تہذیب میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کر رہا ہے۔ حالانکہ قوم کی تعمیر نو کا مسئلہ اتنا گمبھیر ہے کہ اقبال نے تو اپنی شاعری کا مرکز ہی اس مسئلے کو رکھا ہے مگر ان کے پاس دل میں اُتر جانے والی قدرتِ کلام بھی تھی۔ آج اس حقیقت پر توجہ دلانے والوں کے پاس تو یہ دولت بھی نہیں ہے

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

[گیت و ساز کہاں اور میں کہاں۔ یہ تو ایک بہانہ ہے متوجہ کرنے کا ورنہ میں تو ایک بدحال ساربان کی طرح ہوں جس کی اونٹنی مہار توڑ کر نکل گئی ہے اور وہ اسے قطار میں واپس لانے کے لیے سرگرداں نظر پریشان ہے]۔

یہ سوے قطار کون سا راستہ ہے اور ناقۂ بے زمام کیا ہے۔ یہ ایک گہرا تاسف اور احساس زیاں کیوں ہے اس کو سمجھنے کے لیے ڈو صدی پیچھے کے تاریخی حوالوں پر نگاہ ڈالنی ضروری ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں مسلم حکومت کے برباد ہونے اور تنزل اور انتشار کے ڈیڑھ سو سال بعد ۱۸۵۷ء میں مکمل طور پر غیر ملکیوں کے زیر اقتدار آجانے کا زمانہ ہے۔ اس وقت ہر طرف قتل و غارت اور دار و گیر کا بازار گرم تھا کیوں کہ نئے حاکموں نے مسلم قوم کو خاص طور سے سفاکی اور بہیمیت کا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ مسلم قوم کی صدیوں کی غفلت کے بعد جاگنے کی کوشش میں دو جنگیں (۱۸۳۰ء اور ۱۸۵۷ء) ناکام ہو چکی تھیں۔

اس سراسیمگی، تباہی اور ناامیدی کے دور میں ایک صاحب نظر، جگر دار، اپنی بصیرت و عزم کی روشنی میں تعمیر نو کا راستہ بنانے نکلا۔ اس وقت جب جان و مال، عزت آبرو کچھ بھی محفوظ نہ تھا۔ صدیوں کا افتخار خاک و خون تھا، تہذیب کا ایوان تباہ ہو چکا تھا۔ اور دین و ایمان کی شمعیں مخالف طوفان سر سر کی زد میں تھیں۔ اس وقت میں ایک بہادر شخص نے ہر محاذ پر انتہائی دور اندیشی کے ساتھ ایک ایسی علمی، عملی، قلمی اور عقلی جنگ آغاز کی کہ آخر ہارے ہوئے دلوں میں امید کی کرن اور مستقبل کی لگن پیدا کر کے چھوڑی۔

اگرچہ سرسید احمد خاں پر خاصی تعداد میں کتابیں بھی

☆ جنرل سکریٹری حلقۂ ارباب ذوق، ٹورنٹو، کینیڈا۔

لکھی گئی ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے پاک و ہند کے عام مسلمان کو ان کے تمام کارناموں سے مکمل آگاہی نہیں ہے۔ عام طور سے صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے مغربی علوم اور مغربی زبان سیکھ کر حکومت سے ملازمتیں حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی مگر یہ ان کی تحریک کا ایک ادنیٰ سا پہلو ہے کیوں کہ یہ کام تو مشنری اسکول اور کالج بھی کر رہے تھے حقیقت یہ ہے کہ سرسید مسلم قوم کو مشنری تعلیم گاہوں کے اثرات سے بچا کر اپنے دین کی تعلیم و تربیت کے ساتھ مکمل باعزت زندگی بخشنا چاہتے تھے۔ ان کی تحریک کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے ان کی تحریریں اور تقاریر کی بے شمار گواہیاں موجود ہیں:۔

"کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھو دے۔"

مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں، یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت میں لاثانی ہے۔ اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں۔"

"..... کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیوے اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔"

"..... مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں، ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا ان کو غیرت نہیں آتی۔"

یہی جوش اور قومی غیرت تھی جس کے تحت سرسید نے تعلیمی تحریک کے ذریعہ مسلمانوں میں زمانے کے سیاسی اور معاشی مسائل کو سمجھتے ہوئے ایک انقلابی طرز فکر پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش کو پورے فقیرانہ ایثار اور قربانیوں کے ساتھ پروان چڑھایا۔ انھوں نے انگریزی حکومت کے انتہائی استبداد کا زمانہ دیکھا تھا لیکن مسلمانوں کی بہبودی کے لیے وہ شدید خطرات میں پڑنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ یہ سرسید ہی کا جگرا تھا کہ اس نے اس چور چور دل کے ٹکڑے جمع کر کے اور سر سے کفن باندھ کر اسباب بغاوت ہند لکھی اور غیر ملکی حکومت کا سراہانت آمیز ظلم گنوایا۔ پھر اس کا انگریزی میں ترجمہ چھپوا کر برطانوی پارلیمنٹ کے تمام ممبروں کو بھجوادی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لفظ "نصاریٰ" لکھنے پر علماء کو پھانسیاں دی جاتی تھیں اور ہزارہا مسلمانوں کو بغیر کسی وجہ کے دوسروں کی مدد سے گولیوں کی باڑیں مار کر شہید کرنا آئے دن کا مشغلہ تھا۔ اس زمانے میں انگریزوں نے اپنی حکومت کی بحالی کا دربار سجایا جس میں بے شمار راجے اور جاگیردار شریک ہوئے، سرسید وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ سر ولیم میور نے کتاب "لائف آف محمدؐ" میں آپ کی بابت ہتک آمیز باتیں لکھیں تو اس غیرت مند نے اپنا مکان فروخت کر کے اس کتاب کا جواب چھپوایا اور دشمنان اسلام کی زبان بند کی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے برسوں تک تمام تمام دن سخت موسموں، لو اور دھوپ میں کالج کی تعمیر کی نگرانی کی اور مزدوروں کے ساتھ کام کیا۔ وہ شخص جس نے کالج کی عمارت کے ساتھ قوم کی تعمیر نو کی بنیاد ڈالی۔ اسی شخص نے اپنے دور کے اہل علم کو بھی متاثر کیا جس کے سبب اردو شاعری، دور جدید اور اقبال جیسے مفکر اور شاعر سے مالا مال ہوئی۔ اردو نثر داستانوں کی تفریحی زبان سے

بدل کر موثر مضمون نویسی، سیاست، صحافت، تنقید، تاریخ، مذہب، فلسفہ اور سائنس کی بھی زبان بن گئی۔ ہر علمی شعبے کو اپنے موضوع کے اعتبار سے جو اصطلاحات درکار ہوتی ہیں وہ تمام زبانوں میں آہستہ آہستہ ترقی پاتی ہیں۔ لیکن اس دور میں یہ کام تقریباً "آناً فاناً" ہوگیا۔

یہاں سرسید جیسی شخصیت کے کردار و عمل کا پورے طور پر احاطہ کرنا یقیناً مشکل ہے لیکن اس ایک شخص کے ہاتھوں اتنی زبردست تبدیلی کس طرح آئی اس پر توجہ کرنا ضروری ہے۔ شاید ایک وجہ تو بروقت نہایت مخلص اور صاحب علم دوستوں کا مہیا ہونا ہے۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، سید مہدی علی (محسن الملک) سید مشتاق حسین (وقار الملک) ان میں سے ہر ایک زندگی کے اہم پہلوؤں پر اعلیٰ درجے کی کتابوں کے مصنف ہوے۔ اس دور میں سائنس ٹکنالوجی اور انجینرنگ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ خواتین کو بھی علوم سے آگاہ کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ نذیر احمد کا کہنا تھا کہ قومی تنظیم کی ابتدا گھروں میں تنظیم پیدا کیے بغیر نہیں ہوسکتی۔ بقول ایک نقاد:

> "نذیر احمد کی ہیروئن قومی مسایل سے آگاہ ہونے کے سبب زندگی کی تگ و دو میں زیادہ بہتر طور پر مردوں کا ساتھ دے سکتی ہے۔"

اس تحریک کی ایک اور خوبی شیعہ اور سنی نقطہ ہاے نظر کا ایک دوسرے سے قریب آنا بھی ہے۔ سرسید کے دوسرے معمولی کارناموں میں چیچک کے ٹیکے لازمی کروانا۔ اور ہومیوپیتھک طریقۂ علاج رائج کرنے کی کوشش بھی شامل ہے۔ اردو کا پہلا اخبار بھی انھی نے جاری کیا تھا۔ لیکن تبئین الکلام یعنی سرزمین عرب کے تینوں مذاہب بنیادی اصولوں کے لحاظ سے کس طرح ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اور اسی ذریعے

یہ درست نہیں ہے۔ (ادارہ)

نظریات، بدعات اور رسومات خود بخود رد ہوجاتے ہیں اور بہ نسبت بت پرستوں کے اہل کتاب، اہل اسلام سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے رسالے تہذیب الاخلاق اور سائنٹفک سوسائٹی کا اخبار، اردو صحافت اور سائنسی تعلیم کا سنگ میل بنے۔

یہ عام انقلاب آفریں فضا اور اس کی بنیاد کی تلاش ہمیں شاہ عبدالرحیمؒ کے مدرسے اور ان کے لائق فرزند شاہ ولی اللہؒ تک لے جاتی ہے۔ شاہ عبدالرحیمؒ اورنگ زیب کے زمانے کے ایک مشہور عالم دین تھے۔ جنھوں نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا بلا معاوضہ کام کیا تھا۔ ان کو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بھی نسبت تھی، کیوں کہ یہ ان کے ایک پوتے عبدالاحد عرف شاہ گل کے شاگرد سید عبداللہ اکبرآبادی کے مرید تھے۔ ان کی پرورش اور تربیت بھی آگرے میں ہوئی تھی جو اس زمانے میں سلطنت مغلیہ کے مغربی اضلاع کا صدر مقام تھا۔ خود شاہ عبدالرحیم کے والد اورنگ زیب کی فوج کے اعلیٰ عہدے دار تھے مگر شاہ عبدالرحیم نے کوئی منصب شاہی یا جاگیر قبول نہیں کی اور پوری زندگی سادگی اور غریبی میں بسر کی۔ انھوں نے دلی آکر مہندیوں (محلے کا نام) میں ایک مدرسہ قایم کیا۔ یہ مدرسہ ۱۷۲۹ء میں قایم ہوا اور ۱۸۲۹ء میں نواب غازی الدین خاں (نظام الملک آصف جاہ والی و بانی ریاست حیدرآباد دکن) نے ایک لاکھ ستر ہزار روپیے اس کی توسیع و اشاعت کے لیے دیے (حوالہ آثار الصنادید از سرسید صفحہ ۱۸۱) اس مدرسے کا آغاز اس خاص اصول کے پیش نظر کیا تھا کہ اسلام کے اصول عقلی طور پر اور عملی انداز میں پیش کیے جائیں۔ شیخ محمد اکرام مرحوم نے جو اسلامی تاریخ کے بڑے موقر مصنف ہیں، اپنی کتاب رودِ کوثر میں تقریباً سو صفحات شاہ ولی اللہؒ کی تحریک پر قلم بند کیے ہیں اور ان کو

صحیح معنوں میں حکیم الامت قرار دیا ہے۔

اس خاندان کا سلسلۂ نسب ایک طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسری طرف حضرت امام موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے اور اس عظیم ورثے کی نسبت سے شاہ عبدالرحیمؒ شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ کی یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کے تمام علوم دینی یعنی فقہ، حدیث تصوف اور تفسیر قرآن کو عقلی دلایل کے ساتھ آپس میں قریب لائیں اور مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات کو دور کریں تاکہ قرآن کا صحیح ترین مفہوم عوام تک پہنچ سکے۔ شاہ ولی اللہ نے پہلی بار قرآن کا ترجمہ (فارسی) کیا۔ ان سے پہلے ترجمہ کرنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ پھر شاہ عبدالقادر نے اردو ترجمہ کیا جس پر ان کو بے حد خوشی اور منکسرانہ ناز بھی تھا۔ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

روز قیامت ہر کسے با خویش دارد نامۂ
من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآن در بغل

اس خاندان کے مسلک پر حالی نے اپنے ایک مضمون میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"قرآن مجید میں جو آیتیں یا الفاظ اب تک ایسے موجود ہیں جن کی نسبت بقول شاہ ولی اللہ یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ ان کے حقیقی معنیٰ مقصود ہیں یا مجازی۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ ان کے معنیٰ متعین کرنے کا وقت اب آپہنچا ہے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اٹھا دیا جائے اور جو معنیٰ اصول عربیت کے مطابق ایسے قرار پائیں جن سے کوئی اعتراض، جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے، رفع ہو جائے تو بلا تامل وہی معنیٰ اختیار کیے جائیں۔ اگرچہ تیرہ سو برس سے کسی مفسر نے وہ معنیٰ نہ لکھے ہوں۔"

شاہ ولی اللّٰہی تحریک کو عالم اسلام پر زبردست احسان سمجھا جانا چاہیے لیکن جامدِ فکر اور تقدیس کے ہالوں میں گم رہنے والے اس کو قرآن کی بے ادبی سمجھ کر شدید مخالفت کا اظہار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز کو کسی ایسی زہریلی چیز کا نشانہ بنایا گیا کہ ان کی بینائی جاتی رہی اور ہاتھ لکھنے سے معذور ہوگئے۔ پھر بھی ان کا حلقۂ درس وتدریس وسیع سے وسیع تر ہی ہوتا گیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریر کے مطابق:

"اس زمانے میں علوم اسلامی کا کوئی استاد ایسا نہ تھا جو اُن کا شاگرد نہ ہو۔"

اس خاندان نے عوام کو علوم سیاست سے بھی آگاہ کیا۔ عام آزادیٔ رائے کے حق میں فتوے دیے۔ ان کا خیال تھا کہ اگرچہ انگریزی عمل داری میں مذہبی احکام پورے کرنے کی آزادی ہے لیکن آزادیٔ رائے نہ ہونے کے سبب یہ ملک دارالحرب قرار دیا جائے گا۔

محمد اکرام کی رائے میں پانی پت کی تیسری لڑائی کا میدان شاہ ولی اللہ ہی کا سجایا ہوا تھا (بحوالہ رود کوثر ص ۵۵)* سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی وہابی تحریک انہی کے حریت پسندانہ خیالات کا نتیجہ تھی۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی جو بظاہر ناکام رہی مگر ۹۰ سال تک غیر ملکیوں کے قدم اکھاڑنے کی راہیں بناتی رہی، سب ان ہی حضرت کی رکھی ہوئی انقلابی بنیادوں کا نتیجہ ہے** شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں عوام کے حقوق اور حکومت کے فرائض پر بصیرت افروز نکات پیش کیے گئے ہیں۔ عوام اور معاشرے کے باہمی تعلق کا جائزہ

* تاریخی حقائق اس بیان کی تصدیق نہیں کرتے ** تاریخی اعتبار سے یہ بات بھی غیر مصدقہ ہے (ادارہ)

لیتے ہوئے بادشاہوں کی غفلت شعاری اور خود بادشاہت کا کڑا احتساب کیا گیا ہے۔

سرسید کی تعلیمی تحریک اور دینی طرز فکر کا بھی شاہ ولی اللہ تحریک سے اس طرح گہرا تعلق ہے کہ سرسید، نذیر احمد، قاسم نانوتوی اور مولانا یعقوب (بانی دار العلوم دیوبند) سب اسی مدرسۂ رحیمیہ کے پڑھے ہوئے تھے اور ایک ہی استاد مولوی مملوک علی پرنسپل اور پروفیسر دلی کالج کے شاگرد رشید تھے۔ اس مدرسے کے بہت سے نام بدلے گئے۔ مدرسۂ رحیمیہ سے مدرسہ غازی الدین پھر دلی کالج اس کے بعد اینگلو عربک کالج اور اب ذاکر حسین کالج اور اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول کہلاتا ہے۔ لیکن معنوی طور پر یہ مدرسہ بہت سے تعلیمی اداروں کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ دار العلوم دیوبند براہ راست اس کا وارث سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی اور سرسید کے توسط سے ان کی بنائی ہوئی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر انتظام قائم شدہ ادارے مثلاً سندھ مدرسہ۔ انجمن حمایت اسلام کا اسلامیہ کالج لاہور، کراچی کا سرسید کالج، آگرہ میں صغیر فاطمہ کالج اور شعیب محمدیہ کالج، جناح کالج کراچی اور اٹاوہ کا مولوی بشیر الدین کا اسکول سب کسی نہ کسی طرح مدرسۂ رحیمیہ کی طرز فکر سے متاثر اور اسی کی بالغ نظری اور آزاد فکری کے نمائندہ ہیں۔

[یہ مقالہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۹۲ء کو ٹورنٹو کنیڈا کے سرسید ڈے میں پڑھا گیا]

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی لشکر اسلام کو نصیحت

"دھوکہ نہ دینا، خیانت نہ کرنا اور نہ ظلم کا بدلہ ظلم سے دینا اور نہ بچوں یا بوڑھوں اور عورتوں کو ہلاک کرنا، کھجور یا کسی اور پھل دار درخت کو نہ کاٹنا۔ اونٹوں اور بکریوں کو سوائے غذا حاصل کرنے کے ہلاک نہ کرنا۔

تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو حجروں میں خلوت گزیں ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا اور خدا کے نام پر اپنی راہ لینا۔"

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔جلد ۱۲۔شمارہ ۵ (مئی ۱۹۹۳ء)

(پہلی برسی کے موقع پر)

الحاج عبید الرحمان خاں شروانی

شاہد قمر آفریدی

شہر علی گڑھ و مسلم یونیورسٹی کی مشہور و معروف علمی ادبی سماجی شخصیت عبید الرحمٰن خاں شروانی کے انتقال کو مئی ۹۲ء میں ایک سال ہوگیا وقت گزرتا جا رہا ہے مگر ان کی یاد اب بھی تازہ ہے۔

مرحوم اپنے آبائی وطن (ریاست) بھیکم پور کے نزد حبیب گنج میں ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ موضع جاگیردارانہ نظام میں بہت مشہور رہا ہے جو آپ کے والد محترم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام سے موسوم ہے۔ آج بھی اس بستی کی شکستہ کھنڈر نما گڑھی جو خوب صورت قلعے کے طرز پر بنائی گئی تھی ماضی کی داستان اپنی گود میں لیے موجود ہے اور آپ کے ہی بزرگوں کی تعمیر شدہ وہ خوب صورت مسجد جس کا صحن سفید سنگ مرمر کا ہے، محرابوں، جالیوں، پتھروں کی حسین و خوب صورت دلکش تراش خراش، گنگا جمنی فن کارانہ نقوش ہماری قدیم تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ مرحوم کے والد مولانا حبیب الرحمٰن خاں نواب صدر یار جنگ کے خطاب سے پہچانے جاتے تھے جن کا شمار اپنے دور کی مشہور علمی و ادبی شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ وہ مولانا آزاد کے ہم مکتب بھی تھے۔

۱۹۳۲ء میں جب حبیب منزل میرس روڈ علی گڑھ میں تعمیر ہو چکی تھی تو اس محل نما وسیع و عریض کوٹھی کے ایک بڑے ہال میں آزاد، نہرو، جناح اور دیگر اہم تاریخی ہستیاں بھی سر جوڑ کر بیٹھ چکے ہیں۔ اپنے وقت کے مدبر علماء کرام کا اس جگہ گزر رہا۔ لہٰذا اس علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی ماحول کے گرد و پیش عبید الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے بچپن و جوانی کے ایام گزرے ہیں۔ مرحوم دینداری ایمان داری، خلوص و محبت کے لیے مشہور تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں نوابی شان کی قطعی خو بو نہ تھی۔ ان کی یادداشت تقریباً سند کا درجہ رکھتی تھی۔ بہت تفصیل و جزئیات کے ساتھ من و عن واقعہ کو دہرا دیتے۔ طالب علمی کے دور کی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے کہ جنرل ایوب خاں بھی بکی بارک (جو ایس ایس ہال کے نام سے موسوم ہے) میں رہتے تھے اور ہم سے ایک سال سینیر تھے۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں اور نواب صاحب آف چھتاری احمد سعید خاں ان کے کلاس فیلو اور ساتھی تھے۔ آپ میں خوبی یہ تھی گو کہ انگریز حکام زمین داری نظام کے مخالف تھے اس کے باوجود عبید الرحمٰن خاں شروانی کے خاندانی وقار اور دبدبے کی

عثمان پاڑہ، علی گڑھ - یو۔پی

علی قابلیت سے بیحد متاثر تھے۔

مرحوم کی سیاسی زندگی کا آغاز بیسویں صدی میں ۱۹۴۳ء سے ہوا جس میں وہ مسلم لیگ کی طرف سے یوپی اسمبلی کے ۱۹۴۷ء تک ممبر رہے اور اپنے دور کی مشہور ہستیوں کے ساتھ مل جل کر قوم و ملک کی خدمات انجام دیں۔ موصوف اپنی ضعیف العمری کے باوجود ایک مضبوط یادداشت رکھتے تھے۔ دوران گفتگو ایسی اہم باتوں کا انکشاف کرتے تھے کہ سننے والا انگشت بدنداں رہ جاتا تھا۔ ملاقات کا کوئی وقت مقرر نہ تھا سوائے نماز کے اوقات کے۔ ہر وقت قوم و ملک اور مسلم یونیورسٹی کے مسائل پر بات چیت کرتے نہ تھکتے تھے ہر ایک شخص کی عزت و تکریم فرماتے اور یہی وجہ تھی کہ ان کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا۔ خدمتِ خلق سے مرحوم کو بے حد سکون ملتا۔ ان کا معمول تھا کہ موسم سرما میں غربا اور مساکین کے لیے لحاف و گدّے تقسیم کرتے۔ بیواؤں کے وظائف بھی مقرر تھے اور ضرورت مند طالب علموں کے لیے ان کے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے ہوئے تھے۔ مرحوم کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ یونیورسٹی کے مسائل کی فکر دامن گیر رہی اور قومی و ملی مسئلوں پر بے چین ہو جاتے اور جب کبھی مسلم یونیورسٹی ہنگاموں اور ناگفتہ بہ حالات کے سبب بند ہو جاتی تو ان کی راتوں کی نیندیں غائب ہو جاتیں۔ گھنٹوں روتے، افسوس کرتے، طالب علموں کے ہاسٹل، طلبا کی یونین، وائس چانسلر کی رہائش گاہ کے پیدل کئی چکر لگاتے سینئر اساتذہ اور پروفیسر صاحبان کو جمع کرتے۔ ان سے کہتے۔ یہ طالب علم بچے ہیں بہکے ہوئے ہیں ان کو مناؤ۔ ان کے مسائل حل کرو۔ اس بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اپنے تدبر و مصلحت سے الجھے مسئلوں کا حل ضرور ڈھونڈ نکالتے اور ان کی ساری زندگی خدمتِ خلق سے بھرپور تھی۔ -- مرحوم کی نیکی، ایمانداری اور محنت سے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے۔ اس لیے یونیورسٹی اور دیگر شعبوں کے ذمہ دار حضرات ان کو اعزازی منصب کی دوڑ میں الجھا کر ذمہ داریاں سونپ دیتے جس کو وہ بڑی خوبی سے نبھاتے۔

مرحوم اپنی زندگی میں بہت سے اعزازی عہدوں اور منصبوں پر فائز رہے۔ مسلم یونیورسٹی کے چار مرتبہ وائس چانسلر مختلف مواقع پر رہے۔ طویل مدت تک یونیورسٹی کے اعزازی خازن کے فرائض بغیر کسی تنخواہ کے نہایت ایماندارانہ طور سے انجام دیتے رہے۔ یونیورسٹی کورٹ کے اعزازی رکن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری، ڈیوٹی لون سوسائٹی کے صدر، جامعہ اردو کے خازن، دیوبند مجلس منتظمہ، دار المصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ العلماء کے اعزازی رکن موہن لال آئی ہاسپٹل کے ٹریژرار اور مسلم یونیورسٹی کے پرو چانسلر اور دیگر بہت سے مسلم تعلیمی اداروں کے مختلف حیثیت سے وابستہ رہے۔

مرحوم صوم و صلاۃ کے سختی سے پابند تھے اور اپنی زندگی میں چار مرتبہ حج کا مقدس فریضہ ادا کیا۔ مدینہ منورہ اور بیت اللہ شریف جانے والے اور وہاں سے واپس آنے والے سے لپٹ کر روتے اور اس کے ہاتھوں کو چومتے۔ گزشتہ دنوں جب میں مدینہ منورہ سے ایک ڈیڑھ سال بعد واپس علی گڑھ آیا تو مجھے گلے لگا کر آبدیدہ ہو گئے اور فرطِ محبت سے میری پیشانی چوم لی اور بہت دیر تک دیارِ رسولؐ مدینہ منورہ، بیت اللہ شریف کی تجلیوں کی بابت والہانہ انداز میں ذکر کرتے رہے۔

الحاج شروانی صاحب مرحوم ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے اور خدمتِ خلق کا جذبہ تو جیسے ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہر وقت کام کے لیے مستعد رہتے۔ ضعیفی کے باوجود سفر کی تھکن و تکلیف کی پرواہ نہ کرتے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں ہنگامہ کے دوران جب بہت سے طالب علم جیل میں بند ہوئے

اور درس گاہ میں تالے پڑ گئے تو مرحوم ان حالات کی سنگینی سے سخت بے چین و مضطرب تھے اور وہ مثل ماہی بے آب تڑپتے تھے اور یہی کیفیت انلیق کردار کی تحریک کے دوران تھی جب طلباء وزیراعظم مسز گاندھی کی رہائش گاہ پر اپنی گرفتاریاں پیش کر رہے تھے، سخت بے چینی کا عالم تھا۔ آنکھیں رو رو کر سُجا لی تھیں۔ اس لیے کہ ان کو مسلم یونیورسٹی اور طالب علموں سے بہت زیادہ پیار تھا اسی جذبہ کے تحت انھوں نے لاکھوں روپیے کے عطیات درس گاہ سرسید کی نذر کر دیے۔ جس میں والد محترم مولانا حبیب الرحمٰن خاں صدر یار جنگ کی وہ مشہور لائبریری ہے اس میں سب سے نایاب قلمی نسخہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی تحریر میں قرآن مجید اور دیگر مشہور قلمی نسخے اور بیش بہا قدیم کتابیں جن کی قیمت کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا وہ سب مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی کو سونپ دیے۔ غرض کہ مرحوم کی تمام زندگی قوم و ملک کے فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ مرحوم "خان بہادر" کے لقب سے تھے جو انگریزوں نے ان کے خاندانی وقار کی بدولت دیا تھا لیکن جب آزادی کی تحریک نے جنم لیا تو یہ طے پایا گیا کہ برٹش گورنمنٹ نے جو خطابات و اعزازات جن لوگوں کو دیے گئے ہیں وہ سب انگریز سرکار کو واپس کر دیے جائیں۔ لہٰذا مرحوم نے انگریزوں کا "خان بہادر" کا توصیفی خطاب یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ "مجھے وطن عزیز کی آزادی سے پیاری کوئی چیز نہیں۔"

مرحوم عمر کے آخری دور میں بے حد نحیف و کمزور ہو گئے تھے، صبح و شام پابندی سے ٹہلنے جاتے تھے وہ معمول بھی چھوڑ دیا تھا اور جب آدمی بہت ضعیف العمر ہو جاتا ہے تو عمر کے اس نشیب و فراز میں اکثر نظر انداز کیا جانے لگتا ہے۔ بعض اوقات مرحوم اس بات کو محسوس کرتے تھے لیکن ان کے جذبۂ خلوص میں کبھی فرق نہ آیا جو ان کی مخلصانہ شخصیت کا ایک وصف ہے۔ شیروانی ٹوپی اور پاجامہ میں ملبوس، پیشانی پر نماز کا ایک نورانی نشان جس نے چہرے کو اور بھی خوب صورت بنا دیا تھا یونیورسٹی کی ہر تقریب میں نظر آتے ان کے گرد لوگوں کا جمگھٹا ہوتا تھا وہ دلچسپ انداز میں باتیں کرتے اور محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔ مسلم یونیورسٹی کے پرانے واقعات، تاریخی باتیں دوران گفتگو اس انداز سے بیان کرتے کہ سننے والے کو ان کی یادداشت پر رشک آتا۔ جی چاہتا کہ شیروانی صاحب مرحوم کے پاس اور بیٹھا جائے۔

ملک و قوم اور سماجی خدمات کے صلے میں آں جہانی راجیو گاندھی نے یو پی اسمبلی کے پرانے ایم ایل اے ہونے کے ناطے ۱۹۹۰ء میں ان کو شال اور توصیفی سند بھی پیش کی تھی جس کا مرحوم محبت سے ذکر کرتے۔

> "پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے ایسے معجزات دیے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے اور مجھ کو جو معجزہ عطا ہوا ہے وہ قرآن ہے۔"
>
> (بخاری۔ باب الاعتصام)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲ شمارہ-۵ (مئی ۱۹۹۳ء)

تعلیم اور منصوبہ بندی

محمد اللہ خاں ☆

اس وقت ایک خوب صورت مطبوعہ کارڈ میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک بچے کے ختنہ اور پہلی سالگرہ کی تقریب کا مشترکہ دعوت نامہ ہے۔ اس موقعے پر بچے کے سرپرستوں نے اپنے اعزا و احباب کو بڑی تعداد میں مدعو کیا ہے۔ اس دعوت نامہ کو پڑھتے ہوئے میرے کانوں میں مائک پر ہونے والی رکارڈنگ کی آواز بھی آرہی ہے، جس کا ایک شادی والے گھر سے تعلق ہے۔ جہاں تین، چار دن بعد لڑکی کی بارات آئے گی۔ جی ہاں تین چار دن بعد اور ان دنوں میں مائک پر مسلسل رکارڈنگ ہوتی رہے گی۔ اسی سے شادی کے مجموعی اخراجات۔ ہماہمی اور وقت کی ناقدری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جس شخص کے بیٹے کی ختنہ وغیرہ کی تقریب کے دعوت نامے کا ذکر کیا گیا، ان کے ایک قریبی دوست سے کچھ لوگ مقامی مسلم جونیر ہائی اسکول کے چندے کے سلسلے میں ملے تھے۔ اس وقت انھوں نے ان لوگوں کی بڑی خوش دلی سے پذیرائی کی اور یہ فرمایا کہ وہ اپنے مخصوص احباب سے مشورہ کریں گے اور اجتماعی چندہ سے اسکول میں ایک کمرہ بنوادیں گے۔ ان کے اس منصوبے سے اسکول والوں کو بہت خوشی ہوئی اور وہ مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی معینہ مقام پر پہنچ گئے۔ وہاں میدان خالی تھا۔ کافی دیر انتظار کیا لیکن بے نتیجہ۔ مجبوراً وہ قافلہ ان صاحب کی دکان پر پہنچا جن کے بچے کی شان دار تقریب کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں وہ سب لوگ جن سے تعلیمی قافلے کو ملنا تھا خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ قافلہ کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ جب کہ وہ لوگ اس قافلے میں شریک اکثر لوگوں کی بڑی عزت کرتے ہیں اور جہاں ملتے ہیں سلام کرتے ہیں لیکن تعلیمی چندہ کی بات کی گئی تو ان کا منھ بدل گیا اور چند روز پہلے اس حلقے کے ایک رکن نے جو منصوبہ از خود پیش کیا تھا اسے حیلے بہانے سے خود ہی مسترد کردیا اور چندے میں ایک روپیہ بھی نہیں دیا۔

جس شخص کی لڑکی کی پرشور تقریب شادی کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے گھر پر اسکول کے چندے کے لیے حاضری دی گئی تو انھوں نے کل پچاس روپیے عنایت کیے اور کافی کہنے سننے پر بھی اس رقم میں اضافہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ چنانچہ اہل بستی کی اسی ذہنیت کا یہ نتیجہ ہے کہ بیس بائیس ہزار کی آبادی والے قصبے میں ساٹھ فی صد مسلمان

☆ قصبہ سہاور۔ ضلع ایٹہ۔

جن میں کافی لوگ خدا کے فضل سے باحیثیت اور صاحبِ جائیداد ہیں، لشتم پشتم قایم ہونے والے ایک مسلم جونیر ہائی اسکول کو بھی اُس کے پاؤں پر کھڑا نہیں کر سکے ہیں۔

اس کے برخلاف دیہات کے ان پڑھ باشندوں کی تعلیمی منصوبہ بندی ملاحظہ ہو کر ہمارے نواح کے ایک گاؤں میں جونیر ہائی اسکول نہ تھا اور اس کے بچے پڑوس کے گاؤں میں پڑھنے جاتے تھے۔ ایک دن اس گاؤں کے بچوں نے ان کی مارپیٹ کر دی۔ یہ بات اُن کے بڑوں کو کھل گئی۔ وہ سب ایک چوپال پر جمع ہوئے اور یہ طے کر لیا کہ وہ اپنے گاؤں میں جونیر ہائی اسکول ضرور قایم کریں گے۔ زمین اُن کے پردھان نے فراہم کی۔ جو کمی رہی وہ آس پاس کے کھیت والوں نے پوری کر دی۔ لگان کی شرح سے فی گھر چندہ مقرر کر کے وصول کر لیا گیا۔

وہ گاؤں زیادہ بڑا اور مالدار نہیں ہے۔ اس لیے اسکول کی تعمیر میں تین سال لگے۔ پہلے سال چھٹا۔ دوسرے سال ساتواں اور تیسرے سال آٹھواں درجہ تعمیر کرایا گیا۔

اُسی رفتار سے تعلیمی کام بھی آگے بڑھتا رہا اور وہ اسکول ایڈ گرانٹ پر آگیا، کچھ دن بعد ہائی اسکول اور اس کے بعد انٹرمیڈیٹ کالج بن گیا۔ اس کی وجہ سے گاؤں کی رونق بڑھ گئی۔ باہر سے ٹیچر آئے تو ان کو رہائش کے لیے کمروں اور مکانوں کی ضرورت ہوئی۔ ان کی اور طلباء کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دُکانیں بھی کھل گئیں جس سے وہاں کے لوگوں کی مالی اور سماجی حالت بہتر ہو گئی اور چند سال میں اس گاؤں کے نقشے ہی بدل گئے۔

مسلمان عام طور پر اس انداز سے منصوبہ بندی نہیں کرتے اور ہمیشہ اس خیال میں رہتے ہیں کہ غیب سے کچھ مردانِ کار نمودار ہو کر اُن کی پریشانیاں دور کر دیں۔ خدارا اس قسم کی باتیں اپنے ذہنوں سے نکال کر کام کی باتیں سوچیے اور ایک متحرک قوم ہونے کا عملی ثبوت پیش کیجیے۔ ورنہ زمانے کی ٹھوکریں کھا کر پامال ہونے کے لیے تیار رہیے۔ خدا ہمیں عقلِ سلیم عطا فرمائے اور اُس بُرے انجام سے محفوظ رکھے۔ آمین

"ہم بلاشبہ اپنی قوم کو اپنے ہم وطنوں کو سولیزڈ قوم کی پیروی کی ترغیب کرتے ہیں مگر ان سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان میں جو خوبیاں ہیں اور جن کے سبب وہ معزز اور قابلِ ادب سمجھی جاتی ہیں اور سولیزڈ شمار ہوتی ہیں، ان کی پیروی کریں، نہ اُن کی ان باتوں کی جو ان کے کمال میں نقص کا باعث ہیں۔"

سرسید احمد


ان میں سے کچھ ہیں
البتہ قدرتی خوبیوں سے بھرپور اور
بہترین قدرتی ذائقہ کی فراوانی کا حامل
۸۵ سال سے زیادہ عرصے سے
ہم سب کا جانا پہچانا
شربت
رُوح افزا
ہمدرد

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ۶

جلد ۱۲

جون ۹۳ء

زرسالانہ :

انڈیا ... Rs. 45.00

بیرونی ممالک ... US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US $ 9.00 عام ڈاک

* بانی

سرسید احمد خاںؒ

* سرپرست :

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

* مدیر

کبیر احمد جائسی

* نائب مدیر :

احمد مجتبیٰ قریشی

* انچارج سرکولیشن :

شفیق احمد

* تزئین : سرور

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,

TAHZIBUL AKHLAQ &

NISHANT,

ALIGARH MUSLIM

UNIVERSITY,

ALIGARH. 202002.

PHONE : 24027

مندرجات

[ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی ان سے متفق ہو]

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ناشر: کبیر احمد جائسی۔ مقام اشاعت: ماہنامہ تہذیب الاخلاق اینڈ
نشانات۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ۔ مطبع اے ایم یو پریس علی گڑھ۔

اداریہ

ابھی اپریل کی مسلم یونیورسٹی کے طلبا پر پولیس فائرنگ کا زخم بھرا بھی نہ تھا کہ ہم کو ایک دوسرے ایسے سانحے سے دوچار ہونا پڑا جس نے ہر چہار طرف سکوت کا سا عالم طاری کر دیا ہے، دماغ شل ہے ذہن ماؤف اور دل ششدر کہ کیا ہوا کیوں کر ہوا کیسے ہوا۔ ۲۰ مئی کو دن میں تقریباً ساڑھے بارہ بجے آرٹس فیکلٹی اور ولایت منزل (فیکلٹی آف تھیالوجی) کے درمیان اسکوٹر پر سوار ڈاکٹر اقبال حسن خان ریڈر سنی تھیالوجی کو چند موٹر سائیکل سوار افراد بلکہ دہشت گردوں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ گولی اتنی نزدیک سے اور ایسے مقام پر ماری گئی تھی کہ جائے واردات پر ہی انھوں نے دم توڑ دیا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

یہ حادثہ یونیورسٹی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا حادثہ ہے جب کسی استاد کو سر راہ دن دہاڑے اس طرح گولی ماری گئی ہو اور قاتل ہوائی فایر کرتے سب کو ڈراتے، دھمکاتے اور ہراس پیدا کرتے ہوئے سکنڈوں کے اندر جائے واردات سے غائب ہو گئے ہوں۔ اس سفاکانہ قتل کی تفتیش ہو رہی ہے، ممکن ہے قاتلوں کا سراغ مل جائے، یہ قتل کیوں ہوا اس کی وجہ بھی معلوم کر لی جائے، اس سازش کا جال بچھانے والے بے نقاب ہو جائیں، شاید یہ بھی ہو کہ قاتلوں کو سزا بھی مل جائے مگر جو جا چکا وہ تو گیا اب انصاف اپنا تقاضا چاہے جس طرح پورا کرے جانے والے کو واپس لانا اس کے بس میں بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر اقبال حسن خان بڑی متحرک اور فعال شخصیت کے حامل تھے، دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو جتنا متحرک اور فعال ہوتا ہے اس کی شخصیت اتنی ہی متنازع فیہ ہو جاتی ہے اور اس سے اختلاف کرنے والوں کی تعداد اس کے مداحوں، دوستوں اور چاہنے والوں کی تعداد سے کم نہیں ہوتی۔ اقبال حسن سے بھی اختلاف کرنے والے خاصی تعداد میں تھے۔ ایسے افراد تفریح طبع کے لیے ان سے ایسے ایسے لطائف و ظرائف منسوب کرتے جو علی گڑھ کی عبقریت کا شاہکار ہوتے۔

ان سطروں کو لکھتے وقت ۶۲-۱۹۶۳ء کا تعلیمی سال نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے، اس وقت نہ تو موجودہ آرٹس فیکلٹی بنی تھی نہ ہی کینیڈی ہال اور نہ ہی دیگر جدید عمارتیں، سائنس کے چند مضامین کو چھوڑ کر بقیہ سارے مضامین کی تدریس ایس۔ ایس ہال میں ہوا کرتی۔ اقبال حسن خان اس سال بی۔ اے فائنل میں تھے، ان کے ہم درسوں میں جو لوگ اس وقت یونیورسٹی میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ان میں میرے علاوہ نوشاد حسین (شعبۂ فلسفہ)، توفیق احمد نظامی (شعبۂ سیاسیات) مسعود الحسن (شعبۂ معاشیات) کے نام اس وقت یاد آ رہے ہیں۔ اقبال حسن خان ہم سب لوگوں کے مقابلے میں اس زمانے میں بھی تیم شحیم تھے اور لیڈری کے جراثیم اسی زمانے سے ان میں سرایت کیے ہوئے تھے، اس کے باوجود ہم میں سے کوئی نہ کوئی ان کو چھیڑ کر غصہ دلایا کرتا اور ان کی ملامیاں سنا کرتا۔ اس زمانے میں بھی ان کو چھیڑنا خطرے سے خالی نہ تھا، اس لیے ان کو اس حکمت عملی سے چھیڑا جاتا کہ چیخ چلا کر رہ جاتے اور ہاتھا پائی کی نوبت نہ آتی جب امتحان کا زمانہ قریب آ گیا تو اقبال حسن نے اپنے "نیاز مندوں" کو جمع کر کے درس دینا شروع کیا، وہ درس دیتے

وقت ایسے ایسے "نکات" بیان کرتے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے مگر ان کا درس جاری رہتا اور ان کے "نیاز مند" ہمہ تن گوش ان سے مستفید ہوتے رہتے۔ ہم میں کوئی کھلنڈرا اگر کبھی دخل در معقولات کر بیٹھتا تو فوجداری کی نوبت آنے لگتی۔ دن گزرتے رہے، اقبال حسن نے بی۔ اے بعد ازاں اردو میں ایم۔ اے کر لیا۔ جب وہ ایم۔ اے ہو گئے تو اسی زمانے میں ان کو اس زمانے کا "عجوبہ" یعنی سینیر پراکٹوریل مانیٹر مقرر کیا گیا جس کی وجہ سے اقبال حسن کا رعب نہیں بلکہ "رواب" طلبا کے دلوں پر طاری ہو گیا جو نمائش کے اختتام تک باقی رہا۔ پھر نہ جانے کیا "حادثہ" ہوا کہ انھوں نے شعبۂ دینیات میں داخلہ لے لیا اور اس شعبے کی بھی ڈگریاں حاصل کر لیں اور یہی ڈگریاں ان کے معاش کا ذریعہ بنیں۔ شعبۂ دینیات میں لکچرر ہونے کے بعد انھوں نے داڑھی تو نہ رکھی مگر وضو اور نماز باجماعت کے ایسے پابند ہوئے کہ ایسی پابندی شاید ہی کچھ لوگ کرتے ہوں، کہیں بھی بحث کر رہے ہوں، کسی شدید اختلاف میں الجھے ہوئے ہوں، کسی جلسے میں ہوں، اسٹاف کلب میں ہوں، جہاں نماز کا وقت ہوا، اسکوٹر اٹھا کر قریب کی مسجد میں جا پہنچے اور باجماعت نماز ادا کر کے واپس آجاتے اور دوبارہ بحث و مباحثے میں الجھ کر اپنے فریق کو زیر کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے۔

تقریباً آٹھ دس برسوں سے ان میں ایک خاص قسم کی سیمابیت آگئی تھی، دن کا زیادہ تر حصہ اسکوٹر پر بسر ہوتا وہ اور اسکوٹر دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے اسکوٹر نے بھی حق رفاقت ادا کر دیا ان کے وجود کو وہ غریب اس وقت نہ سنبھال سکا جب ان کی روح نے ان کے جسم سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک طرف ان کا اسکوٹر زمین پر پڑا ہوا ہے اور دوسری طرف ان کا بے جان جسم، انھوں نے آخری سانس اسکوٹر پر ہی لی اور اسی سے اس وقت جدا ہوئے جب بے جان ہو چکے تھے۔

اقبال حسن خاں کا ظاہری وجود یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن کیا جا چکا ہے مگر وہ ہم کو بہت دنوں تک یاد آتے رہیں گے، جہاں کہیں بحث و تکرار ہو گی، کسی جلسے میں شرکا دو فریقوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے پر چیخ چلا رہے ہوں گے، طلبا کا کوئی جلسہ جلوس ہوگا، کہیں سے ہائے وائے، زندہ باد مردہ باد کے نعرے سنائی دے رہے ہوں گے تو اقبال حسن خاں ہم کو ضرور یاد آئیں گے اور ہم یہ محسوس کریں گے کہ وہ ابھی آکر کسی ایک فریق کی طرف سے زور زور سے بولنا شروع کر دیں گے۔

موجودہ عہد میں سیاست زندگی کا لازمہ بن چکی ہے اس لیے دانش گاہیں بھی "سیاست" سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ ان کا عملی نمونہ بنی ہوئی ہیں۔ ہماری دانش گاہ بھی اپنی سماج کا ایک حصہ ہے اس لیے یہاں بھی سیاست کا بول بالا ہے جو دوسری جگہوں پر ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ سیاست اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ، چیخ پکار، چھینا جھپٹی، کردار کشی اور الزام تراشی عہد حاضر کی سیاست کے وہ پہلو ہیں جن کے بغیر سیاست کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال حسن خاں یونیورسٹی کی سیاست میں گلے گلے شامل تھے، ان کا اپنا ایک مخصوص نظریہ اور مخصوص طرز عمل تھا جس سے بہتوں کو اختلاف بھی تھا مگر اس اختلاف کے باوجود ہم میں سے کسی نے بھی یہ نہ سوچا تھا کہ یہ شخص جو کہ چھلاوا کی طرح اپنے شب و روز گزارتا ہے اتنی آسانی سے مر جائے گا کہ چند قطرے دوا تک کا مرہون منت نہ ہوگا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے سے لے کر اپنے مرنے کے دن تک وہ چھلاوا کی طرح جیا اور جب وقت موعود آپہنچا تو چھلاوا ہی کی طرح اس طرح معدوم ہو گیا جیسے اس کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔

کبیر احمد جائسی

عبد الستار ایدھی

سید حامد ▽

عبد الستار ایدھی کا نام ہندوستان میں بہت کم لوگوں نے سنا ہوگا۔ عبد الستار گجرات کے رہنے والے ہیں جنھوں نے کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کا شیوہ ہے ہر حاجت مند کی دستگیری کرنا، ہر مصیبت اور تکلیف میں انسانوں کے کام آنا، کہیں کوئی حادثہ ہو جائے، کوئی آفت ارضی یا سماوی آ جائے ندیاں انسانوں کی بستیوں کو غرق آب کرنے پر تل جائیں سمندر کف بدہن دکھائی دے، وبائیں انسانوں کو کھیتوں کی طرح کاٹتی چلی جائیں۔ لاوارث نعشیں جنھیں کوئی اٹھانے والا کفنانے و دفنانے والا نہ ہو، جاں بلب مریض جنھیں ہسپتال لے جانے کا کوئی انتظام نہ ہو پا رہا ہو، عبد الستار ایدھی رحمت کے فرشتے کی طرح ان سب کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ قبل اس کے کہ فلاحی ادارے یا انتظامیہ یا پولس حرکت میں آئے یہ شخص حاجت روائی اور راحت رسانی کا کام شروع کر دیتا ہے۔ شروع میں وسایل کی تنگی تھی لیکن نفسی نفسی کے اس ماحول میں جو پاکستان اور ہندوستان پر چھایا ہوا ہے جب لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص ایسا بھی ہے جس کو اپنی کوئی غرض نہیں، جس کے دل میں درد ہے اور جس کے ہاتھوں میں کام کرنے کا سلیقہ ہے تو انھوں نے اسے وسایل فراہم کرنے شروع کر دیے۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ ان کی گاڑھی کمائی کا اس سے بہتر اور معتبر کوئی مصرف نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں مدر ٹریزا خدمت خلق کے لیے جانی جاتی ہیں۔ ان کا دھیان پہلی بار اس بات کی طرف گیا کہ غریبوں، معذوروں بیماروں، بے چاروں کے لیے موت کو آسان اور آخری ایام کو گوارا بنا دیں اور انھوں نے اپنی تنظیم [illegible] کے ذریعے یہ کر دکھایا۔ وہ ہماری محسنہ اور ممدوحہ ہیں، ان کا ہم پر احسان ہے۔ مقابلہ کرنا عام طور پر مناسب نہیں ہوتا۔ پھر کار ہائے خیر میں مقابلہ، مصیبتیں، حادثے، بیماریاں اور تکلیفیں دنیا میں اتنی ہیں کہ رفاہی فلاحی اور امدادی اداروں اور افراد کی تعداد کئی گنا بڑھ جائے تو بھی ناکافی ہوگی۔ خدمت کا میدان خالی پڑا ہوا ہے، حسرت سے انتظار کر رہا ہے ان لوگوں کا جن کے دل میں اپنے بھائیوں کا درد ہے

▽ سابق وائس چانسلر اے ایم یو- علی گڑھ ——— ہمدرد نگر- نئی دہلی-

اور جو ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن موازنہ کی سرسری نگاہ بھی یہ بتادے گی کہ مدر ٹریزا کا دائرۂ خدمت محدود ہے اور عبدالستار ایدھی کا بے کراں۔ یہ بھی کہ مدر ٹریزا کی خیر کردگی کی پشت پر مسیحی مشن ہے اور عبدالستار ایدھی تنہا کھڑا ہوا ہے۔ اس سادہ لوح ناتراشیدہ بے نفس اور بے لفظ انسان سے لاکھوں انسانوں کی امیدیں بندھی ہوئی ہیں۔ اسے کام سے کام ہے۔ اسے شہرت کی نہ آرزو ہے نہ جستجو۔ لیکن کیا اہلِ پاکستان نے اس صاحبِ خیر کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ کیا انھوں نے دنیا کو یہ بتا دیا کہ ایدھی نے اخلاص اور تنظیم کے ذریعے کیا کر دکھایا ہے۔ اہلِ پاکستان کو بھی الزام کیوں دیا جائے۔ اہلِ مشرق کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنے بڑوں، اپنے اہلِ اخلاص کی بڑائی کرنے کا طریقہ ہی نہیں آتا۔ ہم انھیں منظرِ عام پر لاتے ہی نہیں۔ ہم گونگے اور بہرے ہیں۔ زبان اور ابلاغ کے سارے وسائل تو اہلِ مغرب کے پاس ہیں، لہٰذا جسے وہ چاہیں بڑا بنادیں، جسے وہ چاہیں اس کی خدمات کا اعتراف دنیا سے کرالیں جس نام کو وہ چاہیں زبان زدِ عام و خاص کر دیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے پاس زبان ہے نہ قلم نہ حمیت، نہ وفاداری، نہ احسان مندی کا جذبہ اس کے برعکس بات کہی جائے تو وہ بھی ٹھیک اُترے گی۔ اہلِ مغرب اکابرِ مشرق میں سے جس کو چاہیں بڑا بنادیں، داغ دار کر دیں، اس پر نہایت فراست اور سلیقے کے ساتھ الزام لگادیں۔ پھر وہ غریب لاکھ فریاد کرتا رہے کوئی اس کی نہیں سنے گا۔ جاہلوں، بے الکلوں اور تفرقہ شعاروں کی شنوائی نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہوگی۔

لیکن ان حضور کا مدّعا کچھ اور ہی ہے۔ حال ہی میں جو اطلاعات آئی ہیں۔ ان سے پتہ چلا کہ کراچی کے بعض مسلمانوں نے اپنی روایتی "احسان ناشناسی" کا ثبوت دیتے ہوئے عبدالستار ایدھی کے خلاف ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا ہے، ان پر خیانت کا الزام لگایا، ان کی گاڑیوں کو توڑا، ان کی ایمبولینس کو بے دست و پا کر دیا۔ دوسرے ہی دن دل برداشتہ ہو کر عبدالستار نے اعلان کر دیا کہ پاکستان کی فضا خلوص اور خیر کو راس نہیں آتی۔ وہ اپنے فلاحی کاموں کی بساط لپیٹ کر پاکستان سے جا رہے ہیں۔ اب ان کی خدمت گاہ ہندوستان رہے گی۔ اعلان کا شایع ہونا تھا کہ لوگ جوق در جوق عبدالستار کے حضور میں گئے، معافی مانگی اور کہا کہ خدارا ہمیں چھوڑ کر نہ جایے۔

> "بےشک انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو چلّا اٹھتا ہے اور جب وہ آسودگی سے ہمکنار ہوتا ہے تو بخیل ہو جاتا ہے مگر وہ نمازی (ایسا نہیں کرتے) جو اپنی نماز پر ہمیشہ قایم رہتے ہیں اور جن کے مالوں میں معین حق ہے سایل اور محتاج کا۔"
>
> (معارج ۱۹-۲۵)

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ سرسید سے لے کر بٹوارہ اور آزادی تک احسان فراموشی اور محسن کشی کی تاریخ ہے یہ لوگ اہلِ خیر کو پہچانتے ہی نہیں۔ روایتی محبوب کی طرح جو شخص انھیں جتنا چاہتا ہے اتنا ہی اسے ستاتے ہیں اور ذلیل کرتے ہیں۔ دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن سمجھتے ہیں۔ خیر خواہ کی بدخواہی کرنے میں انھیں مزا آتا ہے ـــ ہر جگہ یہی ہوتا چلا آیا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ تقسیم کے بعد یہی روش ہمارے نوخیز

پڑوسی نے اپنائی۔

بہرکیف ہمیں عبدالستار ایدھی کے اس اعلان کو نعمت غیر مترقبہ سمجھنا چاہیے اور ان سے اصرار کرنا چاہیے کہ آئیں اور ضرور آئیں۔

اے آمدنت باعث آبادئ ما

تم آجاؤ تو ہمارا گھر آباد ہوجائے گا۔ اخلاص کا خانہ جو ہمارے یہاں خالی ہے اس میں رنگ بھر جائے گا خدمت سے یہاں کے مسلمانوں کو بھی دلچسپی ہوجائے گی۔ ہمیں عبدالستار کے پانو دھو دھو کر پینے چاہئیں، ہیرو پرستی کے لیے نہیں بلکہ خادم کو مخدوم بنانے کے لیے، اعتراف کرنے کے لیے، قدر کرنے کے لیے، تاکہ اوروں کو بھی اسی راہ پر چلنے کی توفیق ہو اور بے لوث اور منظم خدمت کی روایت جس نے اہلِ پاکستان کو سرد پایا، ہمارے یہاں جڑ پکڑ جائے۔ شاعر کی زبان میں ہم اپنے اس متوقع مہمان سے کہہ سکتے ہیں۔

گر بسر و چشم من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

(اگر تم میرے سر اور آنکھوں پر بیٹھ جاؤ
تو میں تمہارے ناز اٹھاؤں کہ تم نازنین ہو)۔

پھر خیال آتا ہے کہ پاکستان والے اپنے اس گران قدر سرمایہ سے ہاتھ کیوں دھونے لگے ہم بلائیں گے، آنکھیں بچھائیں گے تو اور کچھ نہ ہوگا تو ان قدر ناشناسوں کو اپنے اس شہری کی عظمت کا احساس تو ہوگا۔

"آپ سے (لوگ) دریافت کرتے ہیں کہ (اپنا مال) یہاں خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجیے کہ جو کچھ بھی مال تمہیں خرچ کرنا ہے سو وہ ماں باپ کے لیے اور قریبی عزیزوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے کرو اور جو نیکی بھی تم کروگے اللہ اس سے خوب واقف ہے۔"

البقرہ ۲۱۵۔

قسط اول

ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسایل

سلطان احمد اصلاحی ★

اسٹوڈنٹس اسلامک ویلفیر سوسائٹی لکھنؤ کے زیر اہتمام وہیں منعقدہ سیمنار ۲۹ فروری - یکم مارچ ۱۹۹۲ء میں پڑھا گیا یہ مقالہ جزوی ترمیمات اور بعض مباحث کے اضافے کے ساتھ اب ہدیۂ قارئین ہے۔ (مـ)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین الیٰ یوم الدین صلاۃ وسلاما دائما کثیرا کما یحبہ تعالیٰ و یرضاہ رب العالمین

ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسایل میں 'مسایل' کی بات مطلق ہے جس نے برصغیر ہند میں مدارس عربیہ سے متعلق جملہ مسایل و معاملات کا احاطہ کر لیا ہے۔ موٹے طور پر ان مسایل کی درجہ بندی تین عنوانات کے تحت کی جا سکتی ہے۔

۱۔ تعلیمی مسایل

۲۔ تربیتی مسایل اور

۳۔ انتظامی مسایل

آئندہ سطور میں ان تینوں طرح کے مسایل پر ان شاءاللہ ہم الگ الگ گفتگو کریں گے۔ ساتھ ہی عربی مدارس کی تخصیص سے یہ بات خود بخود واضح ہے کہ اس سے ہماری مراد مختلف مسالک اور مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے 'مدارس عربیہ' ہیں۔ جہاں فضیلت اور دورے تک کی منتہی تعلیم دی جاتی ہے۔ پرائمری اسلامی مدارس اسی طرح مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے مڈل اور ہائی اسکول وغیرہ اس کے دائرے میں شامل نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے متعلق اس مقالے میں اگر کوئی گفتگو آئے گی بھی تو وہ ضمناً اور تبعاً ہوگی۔ اصلاً ہماری گفتگو منتہی مدارس عربیہ کے مسایل اور ان کے حل سے ہی متعلق ہوگی۔ ساتھ ہی یہ عرض بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہماری یہ گفتگو تمام تر اصولی نوعیت کی ہوگی، جس کا مقصد خیر خواہی اور جذبۂ اصلاح کے سوا دوسرا نہیں۔ اس لیے مختلف مسایل کے تحت کسی خاص مدرسے کا نام لیے بغیر ہم بات بالکل اصولی انداز میں کہیں گے۔ ابھی اس

★ ادارہ تحقیقات اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

عمومی حیثیت میں اس کا انطباق جہاں جہاں ہو سکے وہ سب اس کے دائرے میں شامل ہوں گے۔ یہ حفظ نفس کے لیے تنقید برائے تنقید کا کوئی مظاہرہ نہیں۔ بلکہ اپنے ناقص فہم کی حد تک قرآن وسنت کی روشنی سے فیض حاصل کرتے ہوئے یہ صرف اور صرف بہتری احوال کی ایک کوشش ہے جس کا بس ایک ہی مقصد ہے کہ صحیح منصوبہ بندی اور وسایل کے بہتر استعمال سے ہندوستان میں مدارس عربیہ سے دین کا صحیح اور مطلوبہ کام لیا جائے جس سے کہ حسب وعدۂ الٰہی دنیا کی سرخروئی کے ساتھ مولیٰ کے حضور اس کی رضا اور خوشنودی کی امید باندھی جا سکے۔

۱- تعلیمی مسایل

جیسا کہ عرض کیا گیا مدارس عربیہ کے مسایل میں اولین اہمیت ان کے تعلیمی مسایل کو حاصل ہے، جس میں سرفہرست مسئلہ ان کے "نصاب تعلیم" کا ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ زینہ ہے جس کے ذریعے مدارس عربیہ اپنی منزل کو حاصل کرتے یا حاصل کر سکتے ہیں۔

نصابِ تعلیم کا مسئلہ

مدارسِ عربیہ کے نصابِ تعلیم کے مسئلے میں یوں تو ہمارے یہاں اب تک بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن غالباً زیادہ تر جو بات کہی گئی ہے وہ اس نصاب تعلیم میں جزوی اور فروعی ترمیمات اور تبدیلیوں کی بات رہی ہے۔ جب کہ ہمارے خیال میں مدارس عربیہ کے مطلوبہ مقاصد کے پیش نظر ان کے نصاب تعلیم میں انتہائی دوررس اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ جزوی پیوند کاری اور جزوی تبدیلیاں اس مقصد میں چنداں مفید اور معاون نہیں۔ آج ہندوستان میں مدارس عربیہ کی اچھی بڑی تعداد ہے جو اب تک اس ضمن میں اصلاح وترمیم کے اولین مطالبے منطق وفلسفہ کے غیر ضروری بوجھ سے اپنے کو آزاد کرنے یا رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری ناقص رائے میں وہ مدارس عربیہ کے واقعی مطلوبہ مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہیں۔ مدارس عربیہ کے مقصود ومطلوب میں حد درجہ مختصر اور اتنی ہی جامع بات یہ ہے کہ ان کے ذریعے حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسی ٹیم تیار ہو سکے جو آج کے ہندوستان میں اللہ کے آخری دین کی تبلیغ واشاعت اور اس کے غلبہ ونفاذ کی وہ خدمت انجام دے سکے جسے آج سے چودہ سو سال قبل آخری نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں تیار کردہ جماعت اس وقت کے عالم عرب اور عالم انسانیت میں انجام دینے میں کامیاب ہوئی تھی۔ آج کے دور میں دعوت اسلامی کے یہ تقاضے غیر معمولی طور پر بڑھ گئے ہیں جس کے لیے اسلامی علوم پر گہری اور مجتہدانہ نظر کے ساتھ چودہ سو سالہ تاریخ کے پہلو بہ پہلو اپنے ملک کی تاریخ، تاریخ عالم جس میں سب سے بڑھ کر یورپ کی تاریخ کے ساتھ اس کے پیدا کردہ علوم وافکار، فلسفہ، سماجیات، سیاسیات نفسیات وغیرہ نیز اس کے ایجاد کردہ نظریات اور نظام ہائے حیات سرمایہ داری، اشتراکیت سے لے کر امریکہ کے تازہ نئے عالمی نظام تک جملہ افکار ونظریات کی اس درجہ واقفیت ضروری ہے کہ ان پہ گفتگو کرتے ہوئے آدمی ان کا لحاظ رکھ سکے اور اپنے مخاطب کے ذہنی اور فکری پس منظر کی پوری رعایت سے اس سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ برصغیر ہند میں مدارس اسلامیہ کے تعلیمی مسایل کے سلسلے میں آگے ہمیں اور بہت سی باتیں کہنا ہیں اس لیے اسی اجمال پہ اکتفا کرتے ہوئے ہم گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس متن سے اس کی شرح خود بخود آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

۲- علوم آلیہ اور علوم عالیہ کی صحیح درجہ بندی۔

مدارس عربیہ کے نصابِ تعلیم میں مذکورہ مطلوبہ انقلابی تبدیلی مستقبل کا خواب ہے۔ حال کی صورت حال پر نظر کرتے

ہوئے مدارس دینیہ کا دوسرا اہم ترین تعلیمی مسئلہ 'علوم آلیہ اور 'علوم عالیہ' کی جگہ درجہ بندی ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں نحو و صرف، ادب عربی اور ایک زمانے میں اسلام کی عقلی توجیہ اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد برصغیر ہند پر مسیحی مشنریوں کی یلغار کے مقابلے کے لیے اس وقت کے نصاب تعلیم میں داخل کیے گئے منطق و فلسفہ وغیرہ کی حیثیت محض وسایل و ذرایع کی ہے۔ اصل مقصود قرآن و سنت میں درک و مہارت اور اس کی تکمیل کے لیے فقہ اسلامی اور فن عقاید و کلام سے مناسب واقفیت ہے اپنی ضرورت اور افادیت کے لحاظ سے یوں بھی ہمارے علماء اصول کے ہاں 'صلب العلم' اور 'ملح العلم' کی تقسیم کی گئی ہے۔ پہلی قسم کو اگر اصل و اساس اور راسخین فی العلم کا منتہائے کمال قرار دیا گیا ہے تو دوسری قسم کی مشغولیت کو وقت اور صلاحیت کا کوئی بہت اچھا مصرف نہیں سمجھا گیا ہے۔ دوسرے موقع پر امام شاطبی غرناطی م ۷۹۰ھ سعادتِ اخروی کے حصول کے لیے علوم شرعیہ میں بھی کچھ کو وسایل کی حیثیت میں قرار دیتے اور کچھ کو مقاصد کا درجہ دیتے ہیں اور پھر صراحت کرتے ہیں کہ جن علوم کو مقاصد کا درجہ حاصل ہے، ان کا مرتبہ و مقام اہل علم و دانش کی متفقہ رائے کے لحاظ سے بھی ان علوم سے بدرجہا فایق ہے جنھیں کہ یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ پہلی کی مثال میں وہ عربی زبان و ادب کے علم اور دوسری کی مثال میں علم فقہ کو پیش کرتے ہیں، جس میں پہلی کی حیثیت ذریعہ اور دوسرے کی مقصد قرار دیتے ہوئے اسے صاف لفظوں میں اول الذکر کے مقابلے میں اولیٰ اور افضل قرار دیتے ہیں۔ ہماری ناچیز رائے میں اس تقسیم کے لحاظ سے ایک پہلو سے اصول فقہ کو بھی صلب العلم' کے بجائے 'ملح العلم' اور بذاتہ مقصود و مطلوب علوم کے بجائے وسیلے کے علوم میں شامل کیا جانا مناسب ہے۔ جب کہ ہمارے یہاں اکثر مدارس عربیہ میں صورت یہ ہے کہ علوم آلیہ نے 'علوم عالیہ' اور ملح العلم نے 'صلب العلم' کی جگہ لے رکھی ہے۔ ایسا بہت کم مدارس میں ہے کہ ان کے نصاب تعلیم سے قرآن و حدیث پر براہ راست نظر اور ان سے مسایل کے استنباط اور مجتہدانہ قوت و بصیرت حاصل ہو سکے۔ یہاں تک کہ اپنے دائرے میں اس کی پوری اہمیت و افادیت کے اعتراف کے ساتھ مدارس کی مسلکی تعلیم کو بھی ثانوی درجے ہی کی چیز کہا جا سکتا ہے قرآن و سنت کی ایسی تعلیم جس سے کہ مثال کے طور پر طالب علم کے اندر مسلک اہل حدیث کی صداقت و حقانیت کا یقین گہرا اور پختہ ہو یا صحاح ستہ کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ اس کے ذریعہ فقہ حنفی کا دوسری تمام فقہوں پر راجح ہونا کالشمس فی النہار ثابت ہو جائے۔ اسلامی ریاست میں افتاء و قضا کی ضرورت سے اس کی جو بھی اہمیت و افادیت ہو جس کے لیے ریاست اپنی سرپرستی میں ایسے مدارس و جامعات کا قیام عمل میں لائے کم از کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں علوم دینیہ کی اس طرح کی مسلکی اور جماعتی تعلیم کو ثانوی اور فروعی ہی درجے کی چیز کہا جا سکتا ہے اور یہ بات بھی اس وقت ہے جب کہ اس مسلکی تعلیم سے تحزب اور گروہ بندی جیسے امراض پیدا نہ ہوں، جب کہ تجربہ کہتا ہے کہ کم از کم اس وقت تک تعلیم کا یہ انداز اپنے کو اس کمزوری سے دور رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔

۳۔ کتابوں کے بجائے فن پر توجہ

اکثر مدارس عربیہ میں علوم آلیہ ہوں کہ علوم عالیہ فن کے بجائے متعلقہ کتابوں پر توجہ دی جاتی ہے۔ نحو و صرف ادب عربی ہو کہ حدیث، فقہ اور قرآن ہر جگہ استاد کی کل توجہ کتاب کے کچھ صفحات حل کر دینے کی طرف ہوتی ہے، جس میں سب سے قابل عبرت صورت حال قرآن حکیم کی ہے جسے براہ راست حل کرنے کی بھی نوبت نہیں آتی۔ اس لیے کہ علم

پر مدارس عربیہ میں قرآن حکیم کو براہ راست نہیں بلکہ کسی تفسیر کی مدد سے پڑھا جاتا ہے۔ ادب عربی، حدیث اور فقہ و کلام وغیرہ کو تو کتابوں کے متن کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے لیکن کتاب اللہ کو اس حق سے بھی محروم کر کے اسے بعض تفاسیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے کتاب الٰہی سے زندہ و شعوری تعلق اس سے اثر پذیری (Inspiration) اور مسایل حیات کو اس کی روشنی میں حل کرنا تو الگ رہا، اس کے متن سے طالب علم کے اندر اس درجے کی مناسبت بھی نہیں پیدا ہو پاتی جتنی کہ مثال کے طور پر اس نصاب کے دیگر علوم کی کتابوں سے پیدا ہو جاتی ہے حالانکہ کتاب اللہ سے قطع نظر دوسرے تمام علوم کے سلسلے میں مطلوب و مقصود اسے بنانا چاہیے کہ کچھ کتابوں کی معرفت متعلقہ علوم سے مناسبت اور ان سے تعلق اور لگاو پیدا ہو جائے۔ حدیث و فقہ میں ان کے متون سے گہری واقفیت تو پیدا ہو ہی، ساتھ ہی متعلقہ کتابوں کے واسطے سے طالب علم ان فنون کا ذوق آشنا بن جائے یہ تو ہو سکتا ہے بلکہ شاید اسے ہونا بھی چاہیے کہ فن پر درک کے ساتھ استاد کی اس کی کسی ایک یا بعض کتابوں کے ساتھ خصوصی مناسبت اور لگاو ہو اور اس کی مناسبت سے درس میں ایسی ہی کتابیں اسے پڑھانے کے لیے دی جائیں۔ مشہور روایت کے مطابق علامۃ العصر انور شاہ کشمیریؒ نے صحیح بخاری کی شرح 'فتح الباری' حرفاً حرفاً تیرہ بار پڑھی تھی۔ نامور اساتذہ کی شہرت ہی ان سے متعلق درسی کتابوں سے ہوتی تھی اور اسی مناسبت سے مولانا شبیر احمد عثمانی، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ اور مولانا یوسف بنوری وغیرہ کی طرف سے مختلف کتب حدیث کی بلند پایہ شروح سامنے آئیں لیکن بعض خاص کتابوں کے مدرس ہونے کے ساتھ ان حضرات کو فن حدیث میں درک تھا جس کی وجہ سے متعلقہ کتابوں سے متن پر نظر کے ساتھ ان کے طالب علموں میں ساتھ ہی اس فن کا ذوق اور اس سے مناسبت اور لگاو بھی پیدا ہوتا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس عربیہ کے طلباء میں اسی طرح دوسرے تمام فنون کی کتابوں کے واسطے سے بھی متعلقہ فنون کا ذوق اور ان سے لگاو پیدا کیا جائے۔ مختلف فنون کے متون پر گہری اور عمیق نگاہ لابدی اور ناگزیر ہے لیکن کسی فن کا ذوق اس کی متعین کتاب کے علاوہ متعلقہ کتابوں کی وسیع دنیا سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ طالب علم کی اس پیاس کو وہی استاد بجھا سکتا ہے جس کے اندر متعین کتاب کے ساتھ اس فن کا ذوق ہو اور ایک یا چند کتابوں کی معرفت وہ اپنے محاضرات (Lectures) کے ذریعے طلبا کو اس پورے فن کی سیر کرا دے جس کے بعد آئندہ کے لیے اس کے لیے مزید مطالعے اور تحقیق و جستجو کی راہ آسان ہو جائے۔

۴۔ صحافت سے گریز

اندرون مدرسہ تعلیم و تعلم کی اس صحت مند فضا کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ کیمپس کے اندر ٹھوس علمی ماحول کا چلن ہو اور سارا دو ہو کہ عرلی سرسری اور سطحی صحافت سے گریز کیا جائے۔ دین کی خدمت کے لیے صحافت کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اگر اس کی ضرورت ہو تو مدرسے کے اندر اس کے الگ نصاب کا اضافہ کیا جائے جس کا اثر اس کے متعلقہ شعبے تک محدود ہو۔ مدارس کا ہمارا مطلوبہ مذکورہ نصاب اپنی جگہ، مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب کے ساتھ ہی انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی فضا میں ان سے متعلقہ علوم کی گونج ہونی چاہیے۔ حضرات اساتذہ کی تدریس کے لیے مکمل یک سوئی کے ساتھ ان کے علم کا پیمانہ چھلکے اور اس کا کچھ حصہ تحقیق و تصنیف کے خانے میں آئے تو اس تصنیفی سرگرمی کو بھی ان کے

زیر درس [illegible] سے متعلقہ کتابوں اور متعلقہ فنون کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ مدارس کی فضا میں ہلکی صحافتی سرگرمیوں کا غلبہ اور ان میں اخباری رنگ کا چھا جانا ان کے لیے سم قاتل ہے۔ بیدار مغز اور مخلص انتظامیہ جیسے مدارس کے پیش نظر مقاصد کا واقعی شعور ہو تو اس سلسلے میں کبھی بھی سہل انگاری اور ڈھیل کا شکار نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں مدارس عربیہ کا معاملہ عام طور پر دو انتہاؤں کے درمیان ہے۔ اکثر جگہ بالکل سناٹا ہے اور حدود مدرسہ میں تصنیف و تحریر کا کہیں سراغ نہیں اور کہیں ہے تو صحافت ہی صحافت ہے۔ صحیح صورت اعتدال کی ہے۔ مدارس کا قیام صحافت کے لیے نہیں ہوا ان کی تصنیفی اور تحریری سرگرمی کو اصلاً اور بنیادی طور پر زیر درس کتابوں کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ تدریسی اسٹاف کا سرگرم صحافت سے بالکل تعلق نہ ہونا چاہیے۔

۵۔ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ

ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کے تعلیمی مسایل میں ایک اہم مسئلہ ذریعۂ تعلیم (Medium of Instruction) کا ہے۔ خاص طور پر برصغیر ہند بشمول پاکستان و بنگلہ دیش کے پس منظر میں مدارس عربیہ کے ہمہ جہت مقاصد کے پیش نظر زبان کا مسئلہ بڑا اہم اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اردو کی اہمیت اپنی جگہ، مختلف علاقے کے لوگوں کے لیے وہی اہمیت اپنی اپنی علاقائی زبانوں کی ہے۔ عربی زبان تو مدارس کی بنیاد ہی ہے۔ انگریزی کی بین الاقوامی اہمیت کے ساتھ ملک کے رابطہ کی زبان کی حیثیت بھی اسی کو حاصل ہے۔ آج کے دور میں کسی ایک بین الاقوامی زبان پر اظہار خیال کی حد تک قدرت کے بغیر اپنی تمام تر علمیت اور قابلیت کے باوجود آدمی کی افادیت اور اس کی رسائی کا دائرہ بہت محدود رہتا ہے۔ اس مقصد سے مدارس عربیہ کے لیے بوجوہ انگریزی اور عربی میں سے موخر الذکر کا انتخاب ہی ممکن اور آسان اور اکثر اوقات اپنے پیش نظر مضامین کے لیے قریب تر ہو سکتا ہے لیکن یہ عجیب سانحہ ہے کہ اس نسبت سے اگر ۱۰۰٪ فیصد مدارس عربیہ کو ناکامی کا شکار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان کی درسیات کا تمام تر مواد عربی زبان میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود فصیح و بلیغ اور نمونے کی انشا داپنی جگہ مدرسہ کا پورا نصاب مکمل کرنے کے بعد بھی کام چلاؤ حد تک بھی اپنے پسندیدہ موضوعات کی نسبت سے اظہار خیال کی قدرت آدمی کو حاصل نہیں ہوتی۔ بعض مدارس عربیہ نے بول چال اور رواں دواں صحافتی زبان کو آگے بڑھایا ہے تو ان کا معاملہ اس لیے قابل اطمینان نہیں کہ انھوں نے یہ مہنگا سودا مضامین کی قیمت پر خریدا ہے۔ جب کہ مطلوب یہ تھا کہ مدارس کے اپنے موضوعات و مضامین پر درک بھی حاصل ہوتا۔ ساتھ ہی اردو یا کسی ایک علاقائی زبان کے ساتھ عربی میں اظہار خیال کی قدرت بھی حاصل ہوتی۔ اس سلسلے میں یونیورسٹیوں کا نمونہ قابل تقلید ہو سکتا ہے جہاں بعض اوقات کام چلاؤ زبان کی حد تک ہی سہی سائنس میڈیسن اور انجینئرنگ کے اپنے مضامین کے ساتھ انگریزی زبان میں اظہار خیال پر آدمی کو قابو ہو جاتا ہے۔ مدارس عربیہ کے ذریعہ تعلیم میں اس مقصد سے کیا نئے تجربے کیے جائیں جس سے یہ کمی دور ہو سکے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ صحیح خیالات کا اصل ارتقا آدمی کی مادری زبان میں ہی ہوتا ہے لیکن آج کے دور میں زندہ رہنے کے لیے آدمی کو کسی ایک بین الاقوامی زبان میں کام چلاؤ قابلیت پیدا کرنی ضروری ہے۔ عربی زبان کو مسلمانوں کی دینی زبان ہونے کا جو اعزاز حاصل ہے

وہ اس مقصد سے مزید ایک مہمیز اور محرک کا کام دے سکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مدارس میں قواعد کے ذریعے زبان کی تعلیم کے بجائے (Direct Teaching Method) کے تجربے کا آغاز کیا جائے۔

۶۔ آئندہ زندگی کا واضح نقشہ

مدارس اسلامیہ کا اس سے بھی بڑا اور سنگین تعلیمی مسئلہ ان کے طلبائے عزیز کے یہاں آئندہ کی زندگی کے لیے کسی واضح نقشے کا فقدان ہے جس نے کہ خاص کر آج کے حالات میں مدارس کے پورے تعلیمی ماحول کو بے دلی اور عدم سنجیدگی کا شکار کر دیا ہے ایک زمانہ تھا جب کہ بعض بڑے مدارس عربیہ میں جس کے بقایا شاید آج بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں گے اپنے قریبی حضرات اساتذہ کے اشارات سے یہ اندازہ کر لیتے تھے کہ فراغت کے بعد انھیں تدریس کے لیے کہاں جانا ہے اس طرح ان کی زندگی کا ایک متعین رُخ تھا۔ اس کے بعد اپنے اپنے مقامات پر دس بیس سال کی کامیاب مدرسی کے بعد امکانی طور پر انھیں مرکزی مدرسہ میں تدریس کا مستحق قرار دیا جاتا تھا۔ آج خاص طور پر قریب قریب تمام ہی بڑے مدارس کے کسی نہ کسی درجے میں یونیورسٹیوں سے الحاق کے باعث یکسوئی کی یہ فضا غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی ہے ہندوستان میں مدارس عربیہ کا قیام ایک خاص پس منظر میں مخصوص مقاصد کے تحت وجود میں آیا جس کے پیش نظر فضلائے مدارس کا اصل دائرۂ کار اور ان کی صلاحیتوں کی اصل جولان گاہ دینی مدارس اور دینی تحریکات کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب کہ مدارس کے یونیورسٹیوں سے الحاق نے واقعہ یہ ہے کہ ان کے مرکز ثقل کو ہی تبدیل کر دیا ہے۔ فضلائے مدارس عربیہ کا عصری جامعات سے استفادہ مطلوب اور مدارس کا عین مقصود ہے لیکن یہ چیز بڑی جاں فشانی اور منصوبہ بندی کی طالب ہے عصری علوم کو قرآن وسنت کی روشنی میں مدوّن کرنے کا یہ عین تقاضا ہے اسی طرح بیدار مغزی اور منصوبہ بندی ہو تو عصری جامعات کے مختلف شعبوں میں مدارس کے پسندیدہ مختلف موضوعات کے سلسلے میں بھی قابل قدر کام کرایا جاسکتا ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اس کے لیے فضلائے مدارس کا عصری جامعات میں ایک منصوبے کے تحت داخلہ کرایا جانا ضروری ہے۔ متعلقہ مدارس میں اس مقصد سے مستقل مرکز ہدایت (Guidance Bureau) کی ضرورت ہے جب کہ اس وقت عصری جامعات میں فضلائے مدارس کی بے مقصدیت کی جو صورت حال ہے بحیثیت مجموعی اسے تشویش ناک ہی کہا جاسکتا ہے جس کے پیش نظر اکثر و بیشتر احساس یہی ہوتا ہے کہ اس سودے میں نفع کم نقصان زیادہ ہے۔ قوم احتساب نہ بھی کر سکے تو اس سے اس کے اعتماد کو غیر معمولی دھکا لگ رہا ہے۔ مدارس عربیہ کا عین مقصد وجود اس سے خطرے میں ہے جس کی وجہ سے یہ مسئلہ فوری توجہ اور فوری مداوا کا طالب ہے۔[۱۸]

۷۔ اختصاص کی ضرورت اور اس سے متعلقہ مسائل

مدارس عربیہ کے تعلیمی مسائل میں آخری چیز ہمارے خیال میں ان کے طلبا کے اختصاص کا مسئلہ ہے۔ اس وقت اکثر مدارس عربیہ میں ان سے متعلقہ موضوعات میں اختصاص (Specialisation) کا یا تو سرے سے کوئی شعبہ ہی نہیں ہے یا اگر ہے بھی تو وہ اضمحلال اور عدم توجہی کا شکار ہے۔ مدارس عربیہ کے پیش نظر مقاصد کے پس منظر میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ قرآن وحدیث، فقہ و کلام، تقابل ادیان وغیرہ مختلف موضوعات کے تحت ان کے یہاں اختصاص کے شعبے قائم کیے جائیں اور اگر پہلے سے موجود ہوں تو ان کی کارکردگی کو مزید بہتر بنایا

جائے ساتھ ہی تمام مدارس عربیہ میں بلا استثنا، دعوت اسلامی کے اختصاص کا ایک شعبہ کھولنا چاہیے جس کے بعد طالب علم عالمیت اور فضیلت کا کورس کر لینے کے ساتھ اپنے پسند کے موضوع میں مزید مطالعہ و تحقیق سے لیس عملی میدان میں اتر آئے اور اسے اپنی عمر عزیز کے مزید دس بارہ سال یونیورسٹیوں کی خاک چھاننے میں نہ ضائع کرنے پڑیں۔ مدارس عربیہ کے ہمارے مطلوبہ نصاب کے تقاضے تو بہت زیادہ ہیں۔ مدارس کے موجودہ نصاب کے تقاضوں کے پیش نظر بھی اختصاص کے یہ شعبے اہل اور لائق اساتذہ کے بغیر مناسب کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے

——— اکثر مدارس میں یہ شعبہ ناکامی یا غیر اطمینان بخش کارکردگی کا شکار ہے تو اس کی وجہ مناسب رہنمائی اور اہل اساتذہ کی کمیابی ہے۔ مدارس عربیہ میں بہتر اساتذہ کی کمی کی تلافی ان کی موجودہ سہولیات میں قابل لحاظ اضافے سے پوری جا سکتی ہے۔ آگے انتظامی مسائل میں یہ مسئلہ چونکہ تفصیل سے آ رہا ہے اس لیے سر دست ہم اسی اشارے پر اکتفا کرتے ہیں۔

(جاری ہے)

"سرسید چاہتے تھے اس دار العلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلو سسٹم جاری کیا جائے اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اس کو کسی خاص علم میں جس کے سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے فیلوشپ دی جایا کرے اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ کے ہو۔"

مولانا حالی۔

بنگٹ اِدلین نہ رہے

سعید الظفر چغتائی *

ایک روسی مہمان سائنس داں کے خط سے اطلاع ملی کہ فروری ۱۹۹۳ء کے شروع میں لُند یونیورسٹی کے امی رٹس پروفیسر بنگٹ ادلین دل کے تیسرے دورے میں انتقال فرما گئے۔ میرے استادوں میں پہلا درجہ انہی کا تھا اور ایٹمی طیف شناسی میں اگر کوئی قابلِ قدر کام میں نے کیا ہے تو یورپ ہو یا ہندوستان، انہی کے طفیل، انہی کے زیرِ سایہ اور ان کی باریک بین اور نکتہ جو توجہ ہی سے انجام دیا ہے۔

ادلین ستمبر ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ چھ سات سال تحقیق میں منہمک رہ کر انھوں نے اپسالا یونیورسٹی میں نوبل انعام یافتہ مَنے سیگ بان کے شاگرد کی حیثیت سے وہ مقالۂ تحریری داخل کیا جو ۱۹۳۴ء سے آج تک زندہ اور یادگار ہے۔ ادلین نے برقلے ایٹموں کی طیف شناسی (spectroscopy) کو ایک باقاعدہ مضمون بنا دیا۔ زندگی بھر اسے فروغ دیتے رہے اس کے استعمال یا اطلاق سے سورج کے تاج (کرونا) سے نکلنے والی روشنی کی ماہیت متعین کی اور سورج کے باہر درجۂ حرارت وغیرہ طبیعی خواص کا صحیح اندازہ مہیا کیا۔

آخر بیسوں برس کی طرح طرح کی کاوشوں سے ان کے حیرت انگیز تخمینوں کی پوری تصدیق ہو گئی کہ کرونا کا حرکی درجۂ حرارت بیس لاکھ درجہ سل سیئس کے لگ بھگ ہے۔

ادلین اور ان کے درجنوں شاگردوں نے متعدد بار برقائے ایٹموں کا مطالعہ اپنی تجربہ گاہ میں بھی کیا اور فطرت کی ان تجربہ گاہوں میں بھی جنھیں گرم تارے اور زمین کے قطبی علاقوں کی سرد فضا کہتے ہیں۔ طبیعیاتی قاموسوں کا جو سلسلہ اسپرنگر فرلاغ نے مدتوں سے جاری کر رکھا ہے اس کی ۱۹۶۴ء میں چھپنے والی ۲۷ویں جلد اس مضمون پر ادلین کا اختصار و جامعیت میں شاہکار پیش کرتی ہے۔ حالانکہ ٹھوس حقیقتوں کی یہ ترتیب اور تہذیب انھوں نے کم از کم ۱۹۸۷ء تک تو ضرور ہی جاری رکھی۔ ۱۹۴۲ء میں نوبل انعام کے لیے ان کا نام تجویز ہوا اور جبھی سے شاید تیس برس تک وہ نوبل کمیٹی کے رکن رہے۔ امریکی، روسی، اسکینڈی نیویائی، جرمن، فرانسیسی اور برطانوی اکادمیوں کے رکن تھے اور تحقیق کے لیے متعدد بین الاقوامی تمغوں سے سجے تھے۔

---

* پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف فزکس - اے - ایم - یو - علی گڑھ

میں نے اپنی سائنسی تحقیق کا کام شروع تو لکھنؤ میں کیا تھا لیکن پیرس میں ایک سال سرگرداں رہنے کے بعد ۱۹۶۴ء سے علمی مشورے خط و کتابت کے ذریعے ادلین ہی سے حاصل کرتا رہا۔ ۱۹۶۷ء میں گرمیوں کی چھٹی ہوئی تو پانچ ہفتے جولائی سے ستمبر تک ان کے شعبے میں گزارے اور ۲ ستمبر کو واپس ہوا تو اسی دن سویڈن راستہ چلنے کا ملکی قانون بائیں کے بجائے دائیں کر رہا تھا۔ جولائی ۱۹۶۸ء سے استاد نے مجھے سیڈا کے سرکاری وظیفے پر بلا لیا اور میں وہیں سے اکتوبر میں علی گڑھ آگیا۔ پھر ہندوستان سے عبدالسلام کے اطالوی مرکز طبیعیات (تری است) گیا تو ۱۹۷۳ء ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۱ء میں وہیں سے ایک دو مہینے کے لیے لندن بھی ہو آیا اور وہ خام مواد تیار کر کے لاتا رہا جس کی ناپ جوکھ اور تطبیق علی گڑھ سے دس پی ایچ ڈی مقالے مرتب کرا چکی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

۱۹۸۱ء میں اسی کام کے لیے استاد مرحوم نے مجھے اسکینڈی نیویا کی سب سے بڑی ڈگری اور امتیازی انگوٹھی دلائی۔

ہنگٹ کے بجائی وائلن نواز تھے۔ کبھی کبھی لندن میں مظاہرۂ فن کرتے تو ہنگٹ سننے چلے جاتے۔ ورنہ طیفی لکیروں کے سوا کسی اور سے شناسائی نہ کی۔ یہی ان کا پیشہ تھا، یہی فن اور یہی شوق۔ مسز ادلین کا کہنا ہے کہ رات میں آنکھ کھل جاتی اور کوئی مسئلہ یاد آجاتا تو خواب گاہ سے اتر کر مطالعے کی میز پر جا بیٹھتے اور جب تک اس بارے میں جو بھی ممکن ہوتا کر نہ ڈالتے دوبارہ سونے نہ جاتے۔ تمام کاغذات اور کتابیں شیشوں کے دو الگ رکھتے۔ ایک دفتر میں۔ دوسرا گھر پر۔

گھر شعبے سے قریب تھا۔ ٹہلنے چلے جاتے۔ بارش ہوتی یا برف گرتا تو باران کوٹ کا استعمال کرتے مگر صبح نو بجے سے بعد دوپہر تک اور پھر سہ پہر میں پانچ بجے سے آٹھ نو بجے تک کے لیے آتے ضرور۔ معمول میں فرق تعطیل میں بھی کم پڑتا۔ نہیں آئے تو یا تو کسی مذاکرے میں شریک ہونے گئے ہیں یا لندن سے باہر ہیں۔

ہر منگل کو دس بجے کمرہ نمبر ۲ میں لکچر دیتے۔ طلبا کو اپنی کتاب سمجھاتے اور ریسرچ کرنے والوں کو اپنا نیا تحقیقی کام۔ اشاعت کے معاملے میں اتنے محتاط تھے کہ اپنا ستر فیصد کام خود نہیں چھاپا۔ دنیا بھر سے محققین کے خطوط آتے تھے۔ جواب میں اکثر مسودے بھیج دیتے۔ یہ کام میں بیس برس ہوئے کر رہا تھا، مطمئن نہ ہو سکا۔ اگر تمہارے کام کا نکلے تو بے تکلف استعمال کر لو۔ مسز مور سٹرلی کی مشہور عالمی ایٹمی طیف شناسی کی جدولوں کی تین جلدیں ہوں یا دوسرے معمولی کے عام تحقیقی مطبوعات، یہ اعتراف اکثر پڑھنے میں آتا ہے کہ فلاں جدول، اعداد و شمار یا نقشہ ادلین کے عطیات میں سے ہے۔ خود میرے مضامین میں اکثر نقشے ادلین نے اپنے ہاتھ سے نئے بنا کر شامل کر دیے۔ مگر مجھے ان کا اس طرح اعتراف کرنے کی اجازت نہ دی۔ میں صرف ایک موقع پر ان کا نام مصنف کے طور پر اپنے ساتھ شامل کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔

جوہری یا ایٹمی طیف شناسی کا کام اس لحاظ سے بہت مشکل ہے کہ یہاں کام صحیح ہوتا ہے یا غلط، بیچ کی شکل نہیں۔ بڑے بڑوں کے ہاں غلطیاں نکلتی ہیں۔ مگر استاد ایسا کام پیش کرنے کے دلدادہ تھے جس میں "دہرانے والا کچھ نہ ہو اور اضافے والا بہت کم۔" شاگردوں سے بھی یہی امید کرتے اور ہم لوگوں کا کوئی کام خراب نکلتا تو بہت برا مانتے مگر کہتے کچھ نہیں۔ صرف اشارہ کر دیتے کہ عقل مند کے لیے بہت ہوتا ہے۔

وہ سرتاپا شفقت تھے۔ فزکس ہی نہیں شاگردوں کی انگریزی تک ٹھیک کرتے اور پڑھاتے۔ اپنی تصنیفات ۱۹۴۲ تک جرمن میں، پھر جب سے انگریزی میں لکھیں۔ عام فہم مضامین سویڈش میں بھی چھاپے۔ فرانسیسی خوب جانتے تھے مگر میرے علم میں، علمی سطح پر استعمال نہیں کی۔ خود کو خوب لیے دیے رہتے۔ پروفیسر عبدالسلام نے تریاست بلایا تو جواب میں کہلا دیا: وہ جو کچھ کرتے ہیں میں اس کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ مگر تریاست میں جیسی فزکس ہوتی ہے وہ میرے ادارے کی فزکس سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے میرے وہاں جانے سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے گا۔ پھر جب ۱۹۷۳ میں فرانس کے نوبل انعام یافتہ "الفرڈ کاستلیر" وہاں کی سائنٹفک کمیٹی کے صدر ہوئے اور انھوں نے ایٹمی سالماتی اور لیزر طبیعیات پر تین ماہ کا سرمائی اجلاس منعقد کیا۔ تو ادلین نے چار میں سے ایک منتظم اور مقرر کی حیثیت سے دوبارہ وہاں ہفتے عشرے قیام کیا اور بس۔

زندگی میں صرف ایک بار مجھے جذباتی نظر آئے۔ آخر اپریل ۱۹۸۱ میں پونے دو گھنٹے کی جرح اور چالیس منٹ کی بند کمرے میں بحث کے بعد پروفیسر یار ٹلنسن نے اعلان کیا کہ میری تھیسس منظور کر لی گئی تو ادلین نے دس منٹ تقریر کی اور اس میں میرے دو خطوں کے اقتباسات پڑھے۔ پہلا جو میں نے ۱۹۶۶ میں پیرس سے لکھا تھا اور ایک دوسرا جو ۱۹۶۹ میں علی گڑھ پہنچتے ہی بھیجا تھا۔ کہنے لگے۔ ہندوستان والا خط پڑھ کر مجھے لگا کہ چھتنائی کی سیپ میں سات سال کی محنت مٹی میں مل گئی لیکن خوشی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اسے ایسے شاگرد مل گئے جنھوں نے ان حالات میں بھی اچھا خاصا کام کیا اور کل کا دن طلوع ہو سکا۔

صرف ایک ہی طرح موقعے یاد آتے ہیں جب وہ مسکرائے اور "دنیاوی باتوں" پر چند منٹ صرف کر سکے۔ ایک بار آپٹیکل سوسائٹی امریکہ میں میرا کام چھپا تو مس ورگا کا خط آیا کہ سوسائٹی کے رکن بن جاؤ۔ ادلین نے لکھا تو کسی پیکر حسن و شباب کے تصور سے اُن کا چہرہ دمک اٹھا۔ وہ آپٹیکل سوسائٹی کا میڈل لینے گئے تھے تو واشنگٹن میں جاپانی للی کے پھول کھلے تھے اور مس ورگا سے بھی ملاقات ہوئی تھی ——— مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ چینی میں "للی" کے معنی خوب صورت کے ہیں اور امریکہ کو "می کوا" یعنی لغوی اعتبار سے "خوب صورت ملک" کہتے ہیں۔

ایک اور موقعے پر لندن میں ملاقات ہوئی اور میں امپیریل کالج سے ان کے ہوٹل تک چہل قدمی کرتا ساتھ گیا تو ادلین نے لندن میں روایتی لباس اور انداز میں عورتوں کو دیکھنا بڑا مزا لے کر سنایا۔

> "ہنر اور فن اور علم ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے، مگر متعصب اپنی بدخصلت کی وجہ سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔"
>
> سید احمد

حضرت ادلین لتھوانیا میں پیدا ہوئیں۔ دونوں نے وسطی سویڈن کے جنگلات میں ایک بنگلہ خریدا تھا اور وہ چھٹیوں میں وہاں جایا کرتے تھے۔ اس بات پہ افسوس کرتے کہ اب بنگلے کے قریب آبادی ہو گئی ہے۔ کہنے لگے۔ پہلی رات وہاں سویا تو ایک بڑی سی ایسی شمالی چڑیا قریب کے درخت سے بولی جس کی آواز وہاں اور کبھی سنائی نہ دی تھی۔ لوگوں نے کہا: ادلین تمہیں خوش آمدید کہنے آئی ہے۔ آخری سانس لی تو معلوم نہیں کہاں تھے، کس عالم میں تھے اور کون استقبال کو آیا۔

میرے ذہن کے معماروں میں ادلین کے علاوہ علامہ اقبال (غائبانہ) عبدالماجد دریابادی پروفیسر واجپیئی، آلفرڈ کاستلیر اور عبدالسلام کا نام آئے گا۔ ان کے بعد بی۔ جی۔ گھوکھلے۔ بی این سشرما مرتضیٰ حسین، مولوی نور محمد اور مولوی تقی صاحبان کا۔

ادلین علم کے اعلیٰ منصب ہی پہ فائز نہ تھے دیانت کے پتلے بھی تھے۔ وہاں علمی حلقے پر سیاسی دباؤ تو خیر پڑتا ہی نہیں۔ ذاتی پسند و ناپسند بھی قدر و قیمت کے تعین پہ سایہ نہیں ڈالتے۔ کیا مجال مقبول ترین شاگرد کے لیے بھی ایک لفظ مبالغے کا لکھ دیں۔ میں نے یہ خوبی اپنے کئی ہندوستانی استادوں میں بھی پائی، لیکن صرف پروفیسر واجپیئی میں کمال کی حد تک دیکھی۔

"اگر غور سے دیکھا جاوے اور ٹھیک ٹھیک سمجھا جاوے تو بجز رفاہِ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیرِ دائم نہیں ہے۔ انسان کی بھلائی نہ نیکی کرنے والے کی موت سے ختم ہوتی ہے اور نہ اس زمانے کے انسانوں کے فنا ہونے سے فنا ہوتی ہے بلکہ نسل در نسل اور پشت در پشت آئندہ انسانوں میں چلی آتی ہے اور قیامِ دنیا تک قائم رہتی ہے اور اس لیے صرف وہی ایک نیکی ہے جس کو خیرِ دائم کہہ سکتے ہیں۔"

سر سید احمد

بھورے میاں

ریاض الرحمٰن خاں شروانی *

میرے بچپن میں ہمارے خاندان میں یونانی علاج کا رواج تھا۔ ایلوپیتھک علاج شاذ ہی کرایا جاتا تھا۔ میرے دادا صاحب فرماتے تھے کہ اطبّا نبض سے مرض کا پتا لگا لیتے ہیں، جب کہ ڈاکٹر اسے آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یوں تو مقامی طور پر اطبّا موجود تھے اور ہر بڑے زمین دار کے یہاں باہر کا طبیب بھی ملازم رہتا تھا لیکن مرض کی پیچیدگی یا طوالت کی صورت میں دہلی کے شریف خانی اطبا سے رجوع کیا جاتا تھا۔ طب یونانی کا دوسرا بڑا مرکز لکھنؤ تھا لیکن اس بارے میں بھی میرے دادا صاحب کا قول تھا کہ ہمارے مزاج سے دہلی کے اطبا کا طریقۂ علاج زیادہ قریب ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے شریف خانی اطبا کے معالج کا سلسلہ حکیم عبد المجید خاں (فرزند اکبر حکیم محمد محمود خاں) کے دور سے شروع ہوا تھا۔ ان کے بعد ان کی جگہ ان کے چھوٹے بھائی حکیم محمد اجمل خاں نے لے لی تھی مریض کو دہلی لے جا کر بھی انھیں دکھایا جاتا تھا اور دوران علاج اس کا اور تیمار داروں کا وہاں قیام رہتا تھا اور انھیں بھی اپنے یہاں تشریف لانے کی زحمت دی جاتی تھی اس خاندان کے اطبا کا یہ دستور تھا کہ وہ دہلی میں کسی مریض سے فیس نہیں لیتے تھے، نہ اپنے مطب میں اور نہ اس کے گھر پر اور اس میں شاہ و گدا کی تمیز نہیں تھی بلکہ اگر کوئی صاحب ثروت انھیں فیس پیش کرنے کی غلطی کر بیٹھتا تو اس کے علاج سے دست بردار ہو جاتے تھے۔ البتہ دہلی سے باہر جانے کی صورت میں علاوہ سفر خرچ کے دوسو، ڈھائی سو (یا اس سے بھی زیادہ) روپیے یومیہ کے حساب سے فیس وصول کرتے تھے لیکن بعض لوگوں سے ذاتی مراسم ہو جانے کی شکل میں اس رقم میں کمی بھی ہو جاتی تھی۔ بات ذرا دور چلی گئی، عرض یہ کر رہا تھا کہ جب حکیم محمد اجمل خاں کی مصروفیت ایک طرف ملکی سیاست میں ان کے انہماک اور دوسری طرف ریاست رام پور سے ان کے تعلق کی بنا پر بہت بڑھ گئی تو انھوں نے یہ خدمت اپنے بھتیجے حکیم محمد احمد خاں اور بھانجے حکیم غلام کبریا خاں عرف بھورے میاں کے سپرد کر دی۔ ہمارے گھرانے کے طبیب خاص ثانی الذکر قرار پائے اور پھر ان سے تعلقات کی نوعیت صرف مریض اور طبیب کی نہیں رہی بلکہ میرے والد صاحب سے ان کے دوستانہ روابط ہو گئے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو معالجے

---

* سابق صدر شعبۂ عربی - اے ایم یو - علی گڑھ

حبیب منزل، میرس روڈ - علی گڑھ

کے سلسلے میں بھورے میاں کا ہمارے یہاں آنا اور ہمارا دہلی جا کر قیام کرنا اکثر رہتا تھا۔ میرے ذہن میں ان کی خوش گوار یادیں آج تک موجود ہیں۔ لیکن خوش گوار تو میں اب کہہ رہا ہوں، ان دنوں تو بعض معاملات میں میں ان سے بہت نالاں بھی رہتا تھا۔

بھورے میاں بہت وجیہ، گورے چٹے، ذہین، مہذب اور سلیقہ مند انسان تھے۔ اپنے رنگ و روپ ہی کی وجہ سے غالباً ان کی عرفیت بھورے میاں ہو گئی تھی اور یہ اتنی مشہور ہو گئی تھی کہ اس کے مقابلے میں ان کے اصلی نام سے کم لوگ واقف تھے۔ ان کے طبیب حاذق ہونے میں بھی کلام نہیں۔ انھوں نے بڑے معرکے کے علاج کیے تھے۔ مثلاً میرے چچا صاحب کو ٹی۔بی تجویز کر دی گئی تھی اور ٹی۔بی اس زمانے میں (بلکہ بہت بعد تک) لاعلاج مرض سمجھا جاتا تھا۔ سنا ہے کہ میرے چچا صاحب بد پرہیز بھی بہت تھے لیکن اس کے باوجود بھورے میاں کے علاج سے انھیں شفائے کلی حاصل ہو گئی اور اس کے بعد وہ برسہا برس حیات رہے میں بچپن میں اکثر بیمار رہتا تھا اور اس لیے بھورے میاں سے میرا برابر سابقہ رہتا تھا۔ ایک طرف میں ان کی وجاہت اور سلیقہ مندی سے متاثر بلکہ مرعوب تھا اور دوسری طرف ان کے شدید پرہیز کرانے سے پریشان رہتا تھا۔ اس زمانے میں طب یونانی میں پرہیز کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ مریض کیا نہ کھائے بلکہ یہ تھا کہ کیا کھائے۔ عام طور سے کوئی ایک غذا مثلاً کھچڑی یا شوربہ پھلکا یا مونگ کی پتلی دال اور پھلکا کھانے کے لیے بتا دیا جاتا تھا اور پھر اس کا سلسلہ اس وقت تک برقرار رہتا تھا جب تک مرض کا ازالہ نہ ہو جاتا تھا۔ شریف خانی اطبا اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی سخت تھے۔ صبح، شام بدمزہ دوا کا قدح پینا اس پر مستزاد تھا۔ ظاہر ہے کہ آٹھ دس سال کا بچہ کسی ایسے شخص کو کیسے پسند کر سکتا تھا جو اس پر اتنا ظلم کرتا تھا۔ لیکن جب بھورے میاں کسی اور کے علاج کی غرض سے ہمارے یہاں تشریف لاتے تھے تو ان کی جو خاطر مدارات ہوتی تھی اس میں ہمارا بھی حصہ ہوتا تھا اور اس وقت وہ مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔

علاوہ دوا اور پرہیز کے میں ایک اور سبب سے بھی ان سے ناخوش رہتا تھا۔ میری عربی حال ہی میں شروع ہوئی تھی اور وہ ہمیشہ اس میں میرا امتحان لیتے تھے۔ بالخصوص بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی ترکیب ضرور کراتے تھے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس جملے میں فعل محذوف ہے اور وہ یہی جاننا چاہتے تھے کہ میں اس سے واقف تھا یا نہیں۔

وہ اتنے طاقت ور آدمی تھے کہ شدید سردی میں بھی ململ کا کرتا پہنتے تھے اور سردی کی بس اتنی رعایت کرتے تھے کہ کاندھوں پر اونی شال ڈال لیتے تھے۔ ورزش کے بہت پابندی سے عادی تھے اور اس میں مگدر گھمانا ڈنڑ لگانا اور بیٹھک کرنا سب ہی کچھ شامل تھا۔ ان کی نفاست پسندی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے برسل سے چکن پر اپنا مونوگرام بنوا کر منگایا تھا اور اس کے کرتے سلوائے تھے۔ ان کے دولت کدے کبریا منزل، بلی ماران میں دعوت کے موقع پر کھانے کی میز پر کھانا ایک ٹرین میں رکھ کر آتا تھا جو بیٹری سے چلتی تھی اور ہر مہمان کے سامنے رکتی تھی تاکہ وہ اس کے ڈبوں میں سے اپنی پسند کا کھانا نکال لے۔ کبریا منزل کے صحن میں کمروں سے متصل ایک چبوترہ تھا جس پر ایک طرف ایک چھوٹا سا حوض تھا، اس میں چھوٹی چھوٹی رنگا رنگ مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ ان کی سلیقہ مندی سے متعلق مجھے دو باتیں خاص طور سے یاد ہیں۔ وہ سلاد بہ نفاست سے پلیٹ میں سجاتے تھے اور اپنے مختصر سے چاندی کے صاف ستھرے پاندان میں سے کتھا [illegible] خوب صورتی

سے پان پر لگاتے تھے اس کی کوئی دوسری مثال آج تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ مرد تو علیحدہ رہے نفاست پسند اور سلیقہ مند خواتین بھی اس معاملے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ بالخصوص ان کی سجائی ہوئی سلاد کو چمچہ لگاتے ہوئے تامل ہوتا تھا کہ اس سے اس کے حسن میں فرق آجائے گا۔

جیسا کہ مذکورہ ہوا، دوسرے شریف خانی اطبا کی مانند بھورے میاں بھی دہلی سے باہر جانے کی صورت میں سفر خرچ اور بھاری فیس وصول کرتے تھے لیکن اس میں بھی ان کی شان یہ تھی کہ جتنے دن ان کا قیام کسی جگہ رہتا تھا قرب وجوار کے مریض ان کی حذاقت سے بغیر کسی فیس کے مستفید ہوتے تھے بلکہ ان کے نادار ہونے کی صورت میں وہ بعض قیمتی ادویہ خود اپنے پاس سے مفت دے دیتے تھے۔ فیس بس اس شخص سے لیتے تھے جس کے طلبیدہ جاتے تھے۔ ہم علی گڑھ سے تقریباً ۲۶ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں (حبیب گنج) میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے والد صاحب کو وہاں بھورے میاں کا تار ملا کہ فلاں تاریخ کو فلاں ٹرین پر علی گڑھ ریلوے اسٹیشن اپنی کار بھیج دیں والد صاحب کو تعجب ہوا کہ حکیم صاحب غیر طلبیدہ کیسے تشریف لا رہے ہیں لیکن بہرحال تعمیل ارشاد کی گئی جب حکیم صاحب علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر کار میں سوار ہوئے تو ڈرائیور کو حکم دیا کہ کاس گنج ضلع ایٹہ چلنا ہے۔ کاس گنج پہنچ کر جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر مرقوم پتے کی پوچھ تاچھ کرتے ہوئے ایک ایسی گلی میں پہنچے جس کے اندر کار نہیں جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس میں سے اتر کر پیدل چلتے ہوئے اور لوگوں سے دریافت کرتے ہوئے ایک ایسے گھر کے سامنے جا کر رکے جس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔

وہاں جا کر آواز دی کہ میں فلاں شخص ہوں اور دہلی سے آیا ہوں۔ ان کا نام سن کر ایک بڑھیا گھر میں سے نکلی اور کہا کہ بھیا کیوں مذاق کرتے ہو؟ اسے بڑی مشکل سے یقین آیا کہ وہ واقعی بھورے میاں تھے۔ قصہ یہ تھا کہ وہ بڑھیا بیوہ اور نادار تھی۔ اس کی ایک جوان لڑکی تھی جو بہت دن سے بیمار تھی اور کسی کے علاج سے اسے فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ اس بڑھیا نے کسی سے حکیم صاحب کا نام سنا اور انھیں خط لکھ دیا کہ یہ آرزو تھی کہ اپنی بیٹی کو آپ کو دکھا سکتی۔ لیکن نہ مجھ میں اتنی استطاعت ہے اور نہ لڑکی میں اتنی سکت کہ اسے دہلی لا سکوں۔ یہ خط ملنے پر، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، حکیم صاحب کاس گنج اس کے گھر پہنچے، نبض دیکھی، نسخہ لکھا اور دوا کے لیے ایک رقم اپنی جیب سے نکال کر اس کے حوالے کی اور علی گڑھ واپس تشریف لا کر جو پہلی ٹرین ملی اس میں دہلی کے کے لیے سوار ہو گئے اور موٹر ڈرائیور سے والد صاحب کو بس سلام اور شکریہ کہلا بھیجا۔ ان اطبا کا موٹو "افضل الاشغال خدمۃ الناس" تھا اور وہ اس پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔

اپنے بزرگوں کی مانند حکیم غلام کبریا خاں کا بھی قاعدہ تھا کہ انھیں مریض کا حال سننے سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ وہ نبض دیکھ کر مرض کی نوعیت اور کیفیت معلوم کر لینے کے قائل تھے یا بعض صورتوں میں زیادہ سے زیادہ ایک نظر قارورہ دیکھ لیتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ ہم نبض دیکھ کر مرض کے بارے میں غور کرتے ہیں اور مریض یا تیمار دار حال بیان کر کے ہماری توجہ دوسری طرف مبذول کرا دیتے ہیں جس سے تشخیص میں بجائے مدد ملنے کے رکاوٹ پڑتی ہے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ بعض اوقات پیچیدہ مرض کی صورت میں بار بار نبض دیکھنے پر بھی صحیح تشخیص نہیں ہوتی ہے لیکن کسی ایک مرتبہ لیا

ہوتا ہے کہ ادھر نبض پر انگلیاں رکھیں اور ادھر پیشانی میں ایک کوندا سا ہوا جس سے مرض کی صحیح صورت حال فوراً سمجھ میں آ گئی اور علاج آسان ہو گیا۔ ان کے ماموں زاد بھائی حکیم محمد احمد خاں، جو عمر میں ان سے بڑے تھے اور جنھیں وہ آکا بھائی کہتے تھے، بحیثیت نباض اپنے خاندان میں سب سے زیادہ ماہر سمجھے جاتے تھے لیکن بھورے میاں کا کہنا تھا کہ وہ اپنے مزاج کی سیمابیت اور غصے کی زیادتی کے بہ سبب جم کر علاج نہیں کر سکتے ہیں۔ تاہم جب بھورے میاں کو کسی مرض کی تشخیص میں تردد ہوتا تھا تو وہ مریض سے کہتے تھے کہ آکا بھائی کو نبض دکھا کر نسخہ لکھا لاؤ۔ وہ نسخہ دیکھ کر انھیں مرض کی تشخیص میں مدد مل جاتی تھی اور پھر وہ خود اپنے طور پر اس کا علاج کرتے تھے۔

بھورے میاں صرف طبیب حاذق ہی نہیں تھے بلکہ عربی کی تعلیم انھوں نے باقاعدہ حاصل کی تھی اور اس میں ان کی خاصی استعداد تھی چوں کہ ان کا حافظہ بہت قوی تھا، اس لیے انھیں عربی کے لاتعداد اشعار زبانی یاد تھے۔ عربی کے شعرا میں انھیں خاص دلچسپی متنبی سے تھی۔ انگریزی انھوں نے خود اپنے وقت سے پڑھی تھی اور اس میں بھی اتنی صلاحیت بہم پہنچائی تھی کہ علاوہ اخبار کے انگریزی کی ضخیم کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ دہلی کے شریف خاندانی اطبا صرف طبیب ہی نہیں رئیس بھی تھے اور اس لیے ان میں رئیسوں کے بعض عادات و اطوار پیدا ہو گئے تھے۔ چناں چہ بھورے میاں کی وہاں مصاحبین و ملازمین کثیر تعداد میں رہتے تھے اور ان کے بعض ملازمین منھ چڑھے ہوئے بھی تھے جن کا دوسرے لوگ بھی بہت خیال کرتے تھے۔ ان کے مصاحب خاص ایک صاحب احمد خاں نامی تھے جن کی صورت بہت نورانی تھی اور لباس بہت صاف ستھرا پہنتے تھے۔ وہ بہت پُرلطف آدمی تھے اور علمِ مجلسی سے بخوبی واقف تھے۔ کافی بوڑھے ہو گئے تھے لیکن دل جوان تھا اور اس لیے بوڑھوں، جوانوں اور بچوں میں یکساں ہر دل عزیز تھے۔ بھورے میاں چند سال آنریری مجسٹریٹ بھی رہے تھے لیکن جب کسی مجرم پر اس کے جرم کی پاداش میں جرمانہ کرتے تھے تو اس کے غیر مستطیع ہونے کی حالت میں اپنے ملازم خاص (جن کا نام میں بھول رہا ہوں) کو خاموشی سے حکم دیتے تھے کہ اس کا جرمانہ ان کی جیب خاص سے ادا کر دیا جائے۔ ان ملازم کو یہ بہت ناگوار ہوتا تھا لیکن تعمیل ارشاد کرنا ہی پڑتی تھی۔ بھورے میاں کے ایک بھانجے تھے حکیم عنایت الرحمٰن خاں، انھیں طبابت کی طرف بہت کم توجہ تھی اور ماموں سے ان کا تعلق بجائے خورد کے دوست کا محسوس ہوتا تھا۔ وہ بھی اکثر اپنے ماموں کے ساتھ رہتے تھے اور رنگ مجلس میں اپنی دل چسپ باتوں سے اضافہ

> " دشمن جو عیب صحیح یا غلط ہم میں لگاتا ہے، ہمارے فائدے سے خالی نہیں۔ اگر وہ ہم میں ہوتا ہے تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں اور اگر نہیں ہوتا تو خدا کا شکر کرتے ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔"
>
> سرسید

کا سبب بنتے تھے۔

بھورے میاں کا انتقال ۱۹۳۵ء میں قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۵، ۵۶ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کی موت کا ایک طبیب حاذق کی حیثیت سے تو ماتم کیا ہی گیا، ایک مخیّر رئیس کی حیثیت سے بھی دہلی کے باشندوں کو کم ملال نہیں ہوا۔ ان کی وفات کے بعد جب ہمارے یہاں کسی کے علاج کی ضرورت پیش آئی تو حکیم محمد احمد خاں کو طلب کیا گیا۔ وہ ایک مرتبہ تو تشریف لے آئے لیکن اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ اب اس گھر پر حق بھورے میاں کے بیٹوں کا ہے۔ چنانچہ پھر ہمیشہ ان کے بڑے فرزند حکیم محمود سعید خاں سے اس وقت تک مشورہ کیا گیا جب تک ایلوپیتھک طریقۂ علاج مروج نہیں ہو گیا۔ اگرچہ ذاتی مراسم ان کی وفات تک قایم رہے۔ اس واقعے سے حکیم محمد احمد خاں کی وضع داری، خورد نوازی اور پیسے کی طرف سے بے رغبتی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

نبی اکرمؐ نے فرمایا

"عہدِ گزشتہ میں قومیں اس لیے مٹ گئیں کہ جب ان میں سے کسی بڑے آدمی نے چوری کی یا کوئی اور جرم کیا تو اسے سزا دیے بغیر چھوڑ دیا گیا لیکن اس صورت میں غریب آدمی کو سزا دی گئی۔ واللہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو یقیناً اس کے ہاتھ کٹوا دیے جاتے۔"

تحفظِ حیات

وہاب تسنیم *

تحفظِ حیات (Conservation of Energy) کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ اُسے زندگی کو تباہ و برباد ہونے سے محفوظ رکھا جائے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ہم اُسے وسعت بخشیں، گہرائی دیں، توانا رکھیں اور شاد و خرم دیکھیں۔ قوت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو رفعتیں بخشتی ہے۔ کیوں کہ فطرت کی نظر میں قوت ہی اعلیٰ ترین نیکی ہے اور ضعیفی بدترین گناہ۔ جرمِ ضعیفی کی سزا یہاں مرگِ مفاجات ہے۔ زندگی صرف قوت سے محبت رکھتی ہے ؎

تقدیر کے منشی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

فطرت کو جس قوت سے محبت ہے وہ جسمانی توانائی یا تنومندی یا اسی طرح کی کوئی قوت نہیں اور نہ ہی ریاضت کشوں کی اخلاقی طاقت، یا دانش وروں اور سائنس دانوں کی ذہنی صلاحیت اس کی مقصودِ نظر ہے۔ زندگی کی پسندیدہ قوت، قوتِ برداشت (Stamina) ضبط و تحمل (Endurance) کی قوت ہے۔

جسمانی اور ذہنی طور پر لچک دار طرزِ عمل ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی ہے تھکن، ماندگی، بھوک پیاس، غم و غصہ اور دیگر اضطراری حالتوں میں خود پہ قابو رکھنے کی طاقت زندگی کی محبوب ترین متاع ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس طرح یہ مطلوبہ قوت حاصل کر سکتے ہیں ؟

حصولِ مقصد کی لگن جس قدر آسان ہے اسی قدر دشوار گزار بھی۔ سب کچھ قوتِ ارادی پر منحصر ہے۔ مقصد کی لگن اور منزل کی تڑپ جس قدر شدید ہوگی، قوتِ ارادی کی غماز ہوگی۔ صبر، قوتِ برداشت، استقلال اور مسلسل جدوجہد سے، جب ہماری قلبی، عضویاتی اور جسمانی طاقتوں کا غیر شعوری لگاؤ پیدا ہو جائے گا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مطلوبہ قوت ہم میں پیدا ہو گئی ہے۔ قوتِ ارادی سے عملاً جو لگاؤ پیدا ہو جائے گا وہ شعوری منزلوں کو جز بہ جز، درجہ بہ درجہ اور مرحلہ بہ مرحلہ انگیز کرنے کے بعد ہی... غیر شعوری طور پہ اپنی کارکردگی کے جوہر دکھاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ڈسپلن پر جز بہ جز، مشق اور مشق پر مداومت ہو۔ یہ ڈسپلن، خود اختیار کردہ ہے۔ اس سے زندگی کا ایک مزاج بن جاتا ہے اور زندگی کا یہ مزاج ایک فرد فرید کا بھی ہو سکتا ہے یا ایک جماعت کا بھی اور ایک

---

* لکچرر اردو، وی آر کالج - نیلور -

معاشرے کا بھی۔ اس قسم کا ڈسپلن یا اس طرح کی تربیت نفس ہر مہذب آدمی کے لیے ضروری ہے۔ ان حقایق سے اغماض برتنا ہی، جدید تعلیمات کی بنیادی غلطی ہے۔

تحفظ حیات کے جتنے بھی اصول ہیں ان میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی۔ ہمارے جسمانی اور ذہنی تقاضوں کے فطری سانچے میں ہماری روزمرہ کی زندگی کو ڈھال لینے ہی میں تحفظ حیات کا راز مضمر ہے۔ زمانے کے سرد و گرم کو انگیز کرنا، شاہ راہ حیات کے نشیب و فراز میں خداداد صلاحیتوں کا حسب ضرورت مظاہرہ کرنا۔ موسموں کی افراط و تفریط میں بھی معتدل مزاج رہنا، تحفظ حیات کی دلیل ہے۔ ایرکنڈیشنڈ دفتروں، فلیٹوں اور موٹر کاروں اور ریلوں کی مصنوعی فضا، اگرچہ آسودگی بخش ہوتی ہے مگر تحفظ حیات جس تندہی، جفاکشی اور جہد مسلسل کی طالب ہے، وہ یہاں نہیں ملتی ؎

بس وہ بھرپور زندگی ہے فراق
جس میں آسودگی نہیں ملتی

جسمانی یا ذہنی طور پر ہم جس کام کی قابلیت رکھتے ہیں اس میں امتیازی مہارت حاصل کریں۔ زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال اپنائے رکھیں۔ خاص طور پر آرام پسندی اور دل بہلائی کے بارے میں ہوشیار رہیں۔ اس ضمن میں من پسند وسایل کی دستیابی سے بہت ممکن ہے کہ زندگی آرام پسندی کی نذر ہو جائے۔

جانوروں اور انسانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کمزور اور ضعیف کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہاں تک کہ اپنے آبا و اجداد کی سرزمین پر بھی انھیں رہنے بسنے کا حق حاصل نہیں۔ نارمنڈی (Normandy) برٹانی (Brittany) اور انجو (Anjou) جیسے خوب صورت دولت مند اور قابل رشک فرانس کے صوبے والوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی زندگیوں میں تن آسانیاں، عیاشیاں

اور بیٹاپن پیدا کر لیا ہے۔ اگر انھوں نے اپنی موجودہ روش نہیں بدلی تو تاریخ اپنے آپ کو ضرور دہرائے گی۔ آج نہیں تو کل حیاتیاتی طور پر کوئی مضبوط قبیلہ یا قوم ان پر قابض ہو جائے گی۔ کل کی بہ نسبت آج جدید سہولتوں کے باعث جلاوطنی آسان ہو گئی ہے۔ آج پوری آبادی کو اس کی رہایش گاہوں سے نکال کر دور ایسے مقامات پر بھیج دینا، جہاں کی زمین سخت اور آسمان دور ہو، کا ناممکن نہیں رہا۔

فطرت نہ نشہ بازوں کو معاف کرتی ہے، نہ تن آسانوں کو؛ نہ عیش پسندوں کو اور نہ جفاکاروں کو۔ وہ تو ان کی طرف دار ہے جو سنجیدہ، متین، اعتدال پسند اور سرگرم عمل دانش ور اور فن کار ہوں۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ ؎

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

فطرت اُن کے ساتھ ہنستی کھیلتی ہے جو زندگی کے پل صراط سے، ہتھیلی پر سر لیے ہوئے کامیاب گزر جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کامیابی سے ہم کنار ہونے کی قابلیت کو بہر حال حاصل کرتے ہیں مگر جو لوگ سمندر کی موجوں اور طوفان کی لہروں سے ڈر کر ؎

اگر خواہی سلامت برکنار است

کو وطیرۂ حیات بنا لیتے ہیں۔ تحفظ حیات کے معرکۂ سخت میں وہ کسی نہ کسی صورت نقد جاں ہار آتے ہیں۔

(انگریزی سے آزاد استفادہ کے ساتھ)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲، شمارہ ۶ (جون ۱۹۹۳ء)

اقلیت کی شناخت

فرقہ پرستی اور سازشوں کا شکار

مظہرالدین فاروقی ★

شناخت (Identity) وہ مختصر سا پانچ حرفی لفظ ہے جو پہچان، تمیز یا واقفیت کے معنیٰ دیتا ہے۔ یہی وہ لفظ ہے جو ایک انسان کے وجود، اس کے دوسرے انسان سے تعلق اور فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ ہر انسان خواہ وہ بیٹا ہو یا باپ، عورت ہو یا مرد، چھوٹا ہو یا بڑا صرف شناخت کی بنیاد پر اپنا وجود رکھتا ہے۔ یہی وہ شناخت ہے جو ایک طرف تو انسان کے لیے طرۂ امتیاز ہوتی ہے تو دوسری طرف گمنامی کا باعث دنیا میں شناخت کی اپنی حیثیت مسلّمہ ہے۔ انٹرنیشنل ڈکشنری آف ایجوکیشن نے شناخت (Identity) کی تعریف Charles Rycroft کے الفاظ میں اس طرح بیان کی ہے۔

" The Sense of Continous being as an Identity dist-inguishable from all The Others" ۔

آج ہر ترقی یافتہ ملک اور قوم اپنی ایک خاص شناخت کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہی ایک حقیقت ہے جو ترقی و تنزل، شہرت و گمنامی، بہادری و بزدلی، بلکہ زندگی اور موت کا پیغام دیتی ہے۔ جب تک کوئی قوم وقت کی رفتار کے ساتھ، چلتے ہوئے بھی متاثر ہوئے بغیر اپنی شناخت برقرار رکھتی ہے دنیا اس کے وجود اور اہمیت کو ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے ورنہ محض اپنے وجود کے بارہا اعلانات و دعوے بے سود بے اثر ثابت ہوتے ہیں ۔

تاریخ اِنسانی اس بات کی شاہد ہے کہ ایک زندہ قوم اپنی پہچان بنائے رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں اپنی شناخت کو برقرار رکھنے اور اس کے ذریعے دوسروں کو متاثر کرنے کا عمل ایک "جہدِ مسلسل" کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ شناخت کی اہمیت اقلیت اور اکثریت کے عنوانات کے تحت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں اقلیت اور اکثریت کے موضوعات کسی نہ کسی حیثیت سے اپنا وجود رکھتے ہیں۔ کہیں ان کی بنیاد رنگ ہوتا ہے تو کہیں نسل، کہیں مذہب تو کہیں فرقہ۔ اقلیت

★ پرنسپل المدینہ کالج آف ایجوکیشن، محبوب نگر، آندھرا پردیش ۔

اور اکثریت کے مسایل اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کہ وہ ایک دوسرے کی تہذیب وتمدن، زبان اور مذہبی اقدار کو ناپسند کرتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثریت یہ چاہتی ہے کہ اقلیت کا مخصوص کردار اس کے لیے چیلنج نہ بنے بلکہ یہ اکثریت کے دھارے میں شامل ہوجائے اور اسی طرح سے اقلیت اپنے شناختی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ یہ عمل اکثریتی اور اقلیتی فرقوں کے درمیان ایک خلیج بن جاتا ہے اور اس طرح سے اقلیتی اور اکثریتی مسایل پیدا ہوتے ہیں (ڈیٹمن، نارمن، آر. سی ہارے اسٹریٹ اور سپجارٹی اور مینارٹیز، ۱۹۷۲ء سے ماخوذ)۔ اکثریت کے بعض ذہن اقلیت کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ وہ قومی دھارے یا عام دھارے سے کٹی رہتی ہے لیکن ان کا ذہن اس بات کی فکر نہیں کرتا کہ "..... آخر یہ عام دھارا کیا ہے! شاید بے کہے تحت یہ طے کر دیا گیا کہ اکثریتی فرقے کے مذہبی رسم و رواج، اس کی خواہشات، طرز زندگی، محبت، نفرت، غرض یہ کہ ہر چیز کی حرف بہ حرف نقل کرنا ہی عام دھارا ہے؟ (عابد رضا بیدار: دی ویلیڈیٹی آف انڈین مسلمان؛ سیکولر ڈیموکریسی: ستمبر ۱۹۶۸ء) تعلیم جس کو ذہنی بیداری روشن خیالی، قومی یک جہتی، بھائی چارگی، مذہبی رواداری اور انسانیت کی صلاح و فلاح کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ بھی فرقہ پرستی اور سازشوں کی لپیٹ میں آتی رہتی ہے۔ ہمارے سیکولر ملک کی درسی کتابیں اور اس کے اسباق قومی یک جہتی اور رواداری کے بجائے نفرت اور فرقہ پرستی کا زہر گھولتے ہیں۔" اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہماری درسی کتابوں میں سورماؤں کا انتخاب نمایاں طور سے فرقہ وارانہ رجحانات کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ اس سے دوسرا فرقہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ چونکہ تاریخ کے اوراق سے اس کے ماضی کو ختم کیا جارہا ہے اس لیے اسے خود اپنے ماضی کی تخلیق کرنی چاہیے۔" (الیس عالم خوندمیری: سیکولرزم ریلیجن اینڈ ایجوکیشن ۱۹۶۸ء) نتیجۃً" اقلیتی فرقہ نہ صرف یہ کہ اپنے ماضی سے فیضان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اس بات کی بھی جدوجہد کرتا ہے کہ اکثریتی فرقہ اس کے ماضی کو مٹانے نہ پائے۔ اس طرح ایک ایسا چکر چل پڑتا ہے جس کا کوئی اختتام نہیں۔" (مشیر الحق: مسلمان اور سیکولر ہندوستان ۱۹۷۳ء)

ہمارے ہاں اکثریت اور اقلیت کے مسایل علاقہ، زبان، مذہب و فرقہ کی بنیاد پر اپنا وجود رکھتے ہیں اور خاص طور پر مذہبی بنیادیں ان میں شدت پیدا کرتی ہیں۔ سوائے ہندوؤں کے مسلمان، عیسائی، سکھ پارسی وغیرہ مذہبی اقلیت کی تعریف میں آتے ہیں اور ان اقلیتوں میں مسلمان سب سے بڑی اقلیت ہے جس کی شناخت دوسری اقلیتوں کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے مسایل بھی سب سے مختلف ہیں اور آئے دن شدت کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔" یہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں اقلیت تہذیب و تمدن اور زبان کے اعتبار سے اکثریت سے غریب تر اور مذہبی حیثیت سے کمزور بھی ہے وہاں اقلیت اور اکثریت کے مسایل شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اکثریت جو اپنے کردار کو قومی دھارے سے تعبیر کرتی ہے وہیں اقلیتی کردار سے مشکوک نظر آتی ہے اور اس کا یہی ذہن اقلیتی کردار اور شناخت کی بقا کو غیر ضروری اور ناگوار سمجھتا ہے۔" (ٹی نفسز اڈا: الائی نیشن اینڈ سوشل سسٹم ۱۹۷۲ء سے ماخوذ)۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ مفاد پرست سیاست والوں اور فرقہ پرست قوموں اکثریتی اور اقلیتی

مسایل کے حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں بلکہ ان مسایل کا وجود اور ان کی شدت ہی ان کے عروج اور ان کی بقا کی ضمانت ہے۔ ان کو یہ گوارا نہیں کہ اقلیتیں اپنی مخصوص شناختوں کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھیں اور اکثریت و اقلیتوں کے خوبصورت رنگ برنگ دھارے مل کر ایک قومی دھارا (MAIN STREAM) بنے اور ہندوستان کی پر فضا ماحول میں قومی یک جہتی بھائی چارگی اور خلوص و محبت پروان چڑھے۔ ان کے سازشی ذہن وقت بے وقت نت نئے مسایل کو جنم دیتے ہیں۔ تاکہ اکثریت اور اقلیت کے جذبات کو بھڑکائیں اور ان کے درمیان ایک تناو کی کیفیت پیدا کر دے۔ اور اس طرح یہ اپنے ناپاک مقاصد کو حاصل کرتے ہیں۔ یہ مفاد پرست عناصر اقلیتی شناخت ان کی بقا اور ہر جائز جد و جہد کو اکثریت و ملک و قوم کے لیے ایک خطرے سے تعبیر کرتے ہیں اکثریتی طبقے کو اقلیت کے خلاف ورغلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ان موقع پرستوں کا نہ تو کوئی سیاسی کردار ہوتا ہے اور نہ ہی مذہبی اقدار ــــ بلکہ یہ اپنے مقصد کے لیے اپنے بنائے ہوئے اصولوں سے انحراف کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک طرف تو ملک و قوم کا دم بھرتے ہیں اور سالمیت، ایکتا یا اکھنڈتا کے خواب دیکھتے ہیں تو دوسری طرف قومی یک جہتی کے تناور درخت کو کھوکھلا اور کمزور کر دیتے ہیں۔

اقلیتوں کے خلاف کام کرنے والی یہ وہ قوتیں ہیں جو اپنی گھناؤنی سازشوں کے تحت اقلیت کو معاشی، تہذیبی، سیاسی اور لسانی اعتبار سے اس قدر کمزور اور کھوکھلا کر دینا چاہتی ہیں کہ وہ مذہب اور دوسری شناختی حیثیتوں کو کھو کر ایک بے جان اور مردہ حالت میں باقی رہیں۔ اس طرح ان کا نشانہ افراد پر نہیں بلکہ ان کی شناخت پر ہوتا ہے۔ گویا یہ اقلیت کے دشمن نہیں بلکہ اقلیتی کردار یا ان کی شناخت کے دشمن ہیں۔ موجودہ حالات اور نتائج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک و قوم اس کی سالمیت اور قومی یک جہتی کو نقصان پہنچانے والا ان سے بڑھ کر کوئی اور نہیں۔

ماہرین عمرانیات قومی یک جہتی کے تصور کو اسی وقت ممکن قرار دیتے ہیں جب کہ مختلف مذاہب یا فرقے، اپنی مخصوص خصوصیات اور شناختوں کے ساتھ اپنا وجود رکھتے ہوں اور ایک ایسے ماحول کی ضرورت محسوس کرتے ہوں جس میں ان کی اپنی تہذیب، تمدن، زبان اور دوسرے سماجی اور مذہبی اقدار کی بقا اور ترقی ممکن ہو۔ گویا قومی یک جہتی ایک ایسا خوشگوار ماحول ہے جس میں مختلف فرقوں کے لوگ اپنی مخصوص مذہبی و سماجی شناختوں کے باوجود محبت، خلوص اور بھائی چارگی کے جذبے کے تحت آپسی تعلقات بنائے رکھتے ہوں اور قومی مسایل کے حل کرنے میں ہر قسم کی قربانی، ایثار اور حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے ہوں۔ قومی یک جہتی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مختلف مذاہب یا فرقوں کے لوگ اپنی شناخت کھو دیں اور آپس میں ان کا اتصال ہو۔ یہ ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں یا آپس میں مرلوط ہو جائیں۔ ایسی کیفیت خود شکوک و شبہات، مخاصمت اور دوسرے مسایل کو پیدا کرتی ہے۔ مختلف تہذیبوں، اور شناخت کے وجود یا برقراری کے خلاف کسی بھی کوشش دھمکی یا سازش، قومی یک جہتی کے مقاصد کے مغایر اور دستور ہند کی علانیہ خلاف ورزی ہے۔

پروفیسر عبد الحمید صدیقی اپنی کتاب "میکاولی کا نظریۂ تعلیم" میں لکھتے ہیں کہ "دنیا کی کسی غاصب

قوم نے جب بھی اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے ایک کمزور قوم پر دست ظلم دراز کیا تو اُسے ایک لگے بندھے منصوبے (سازش) کے تحت اس امر کی کوشش کی کہ کس طرح مفتوح قوم کے فکر و نگاہ کو بدل دیا جائے۔ کیونکہ اس کے تبدیل ہو جانے سے پھر اس کا مقصد بآسانی حل ہو سکتا ہے۔ "تیر و سنان" افراد کو موت کے گھاٹ تو اُتار سکتے ہیں مگر قوموں کو فنا نہیں کر سکتے۔ قوموں کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایک ہی طریقہ ہے کہ انھیں "گنج گراں مایہ" سے محروم کر دیا جائے جس کے بل بوتے پر ان کا قومی تشخص برقرار رہتا ہے اور جس کے لٹ جانے کے ساتھ ہی وہ قومیں قومیں نہیں رہتیں بلکہ بے ضمیر انسانوں کی ایک بھیڑ بن جاتی ہیں جنھیں استعمار کی قوت جس طرف چاہے بے زبان جانوروں کی طرح میکانکی طور پر ہانک لے جاتی ہے۔ آج دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک میں رہنے والی سب سے بڑی اقلیت کو بے شمار مسایل کا سامنا ہے لیکن ان مسایل میں سب سے اہم مسئلہ ان کی شناخت کی برقراری اور حفاظت ہے۔ تاریخ انسانی اس بات کی شاہد ہے کہ جب کبھی قوت کے بل بوتے پر کسی فلسفہ یا مذہب کو پھیلایا گیا یا دبایا گیا تو اس کے نتائج دیرپا ثابت نہیں ہوئے بلکہ کچھ عرصے بعد الٹے ہی نکلے ہیں۔ جتنی قوت سے کسی چیز کو دبایا جاتا ہے تو اسی قوت سے وہ نہ صرف اپنی بقا کو قایم رکھتی ہے بلکہ اور آگے نکل جاتی ہے البتہ سازش اس قوت کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

ہندوستان کی اس اقلیت کو چاہیے کہ اپنے خلاف کی جانے والی علمی، تہذیبی، تمدنی اور مذہبی سازشوں سے باخبر رہے اور ان کا تدارک کرے۔ چاہے اس کے افراد کروڑوں کی تعداد میں ہی کیوں نہ ہوں لیکن اگر وہ تعلیمی اعتبار سے پست، اخلاق و کردار مذہبی و معاشی اعتبار سے ناتواں ہوں گے تو ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہو جائے گا۔

اقلیت کی شناخت یا مذہبی اقدار کی برقراری کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جدید زندگی، جدید علوم، سائنسی ایجادات کی مخالفت کی جائے یا سماجی پسماندگی، جمود اور روایت پسندی کا سہارا لیا جائے۔ ان کی انفرادیت یا شناخت تو خود ان کی رواداری، مساوات، امانت، دیانت، اخوت دانشوری، عدل و انصاف، وسیع النظری، پاکبازی روشن خیالی، وطن دوستی اور ان کے مذہبی اقدار میں پنہاں ہے۔ سید قطب کہتے ہیں:

> "ان کا مذہب انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں سے ہم آہنگ ہے۔ وہ ان کو ترقی سے نہیں روکتا وہ خود ترقی کا راستہ بتاتا ہے۔ البتہ وہ ہر عمل کے اصول کی تدوین کرتا، حدود متعین کرتا، خیر کی جانب رہنمائی کرتا، شر سے بچاتا اور جدیدیت و ترقی کو افراد کی شناخت کھوئے بغیر حاصل کرنے میں رہنمائی کرتا ہے۔"

(انسانی زندگی میں جمود و ارتقا، ۱۹۸۱ء سے ماخوذ)۔

اقلیت کو چاہیے کہ حالات کے تقاضوں کو سمجھے اور اپنی شناخت کو برقرار رکھے۔ اپنی انفرادیت اور مذہبی اقدار کو بنیاد بنا کر نئے زمانے اور نئے حالات سے مقابلہ کرے۔ ورنہ وقت اور حالات کے دھارے پر بہنے اور اپنی جڑوں سے کٹ جانے سے خود اس کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔

جدیدیت اور ترقی پسندی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آنکھ بند کرکے تقلید کریں بلکہ اپنی تاریخ، روایات، مزاج سماج اور مذہبی اقدار اور معیارات کو ملحوظ رکھ کر اس کو اپنائیں۔

اقلیتی نوجوانوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قوم اور ملک کو آج ان کی ضرورت ہے۔ دنیا کے ہر انقلاب کے محرک نوجوان ہی ہوا کرتے ہیں۔ معاشرے میں ان کی اہمیت ریڑھ کی ہڈی کے مماثل ہوتی ہے۔ آج کے سنگین حالات انھیں پکار رہے ہیں کہ وہ کاہلی سستی اور احساس کمتری کو ذہنوں سے نکال کر، علم و ادب، اخلاق و کردار کے زیور سے آراستہ ہو کر عمل کے میدان میں اُتریں اور معاشی بدحالی تعلیمی اور معاشرتی پسماندگی اور سماجی برائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور زندگی کے ہر شعبے میں ان کی اپنی شناخت کو برقرار رکھیں۔ اس طرح ان کی "امتیازی شناخت" ہی اُن کی بقا اور کامیابی کا تصور دے گی۔

"نامور کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے، جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا، مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھوس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ قیامی آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال رہتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجے سے اوپر ہیں انھیں لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرما میٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔"

سرسید احمدؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۶ (جون ۱۹۹۳)

ابو علی حسن ابن الہیثم ـــ علم بصارت کے بانی

عبدالباری ★

اس بات کا اعتراف نہ کرنا حقایق سے چشم پوشی ہوگی کہ یورپ نے حکمت، فلسفہ اور سائنس کو ترقی دے کر اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے مگر یورپ کی ان کامیابیوں کے پیچھے بنیادی طور پر مسلم سائنس دانوں کا ہی ہاتھ رہا ہے۔ مسلمانوں نے اسلامی دور اقبال میں نئے نئے سائنسی افکار و نظریات اور تجربات کو کافی ترقی دے کر آئندہ نسلوں کو نئی نئی راہیں دکھائیں۔ مغرب نے ان مسلم فلسفیوں اور سائنس دانوں کی کتابوں کا ترجمہ مغرب کی سبھی زبانوں میں کر کے اس سے استفادہ کیا اور آگے چل کر انھوں نے اپنی کوشش اور محنت سے اسے ترقی دی اور شاگردی کے بجائے صرف استادی کے ہی دعویدار نہ بنے بلکہ وہ اس سے آگے یہ کہنے لگے ہیں کہ مسلمانوں کا سائنس میں کوئی تعاون (CONT-RIBUTION) نہیں۔ مسلم سائنس داں آٹھویں صدی سے لے کر سترھویں صدی تک دنیائے سائنس کے امام رہے اور اس دوران مشکل سے ہی سائنس کا کوئی شعبہ ایسا ہوگا جس کی بنیاد انھوں نے نہ ڈالی ہو۔ ان ہی درخشاں ستاروں میں ایک نام ابو علی حسن ابن الہیثم کا ہے۔

ابو علی حسن ابن الہیثم بچپن ہی سے لوگوں کے مختلف نظریات و خیالات پر غور و فکر کرنے کے عادی تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ حقیقت ایک ہی ہے اور سارے لوگوں کو اسی تک پہنچنا ہے۔ چاہے وہ جن دوسرے طریقوں پر بھٹکتے ہوئے پہنچیں۔ جس ماحول میں ابن الہیثم نے آنکھیں کھولیں اور غور و فکر شروع کیا، اس کے لیے لازمی تقاضے کے طور پر پہلے پہل ان کو خدا، خدا کی رضامندی اور اس کی اطاعت و خوشنودی حاصل کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں طریقوں پر چل کر وہ ایک صاف ستھری زندگی گزار سکیں گے اور سائنس و فلسفہ کو کچھ دے سکیں گے۔ انھیں اصولوں پر عامل ہو کر جب ابن الہیثم نے فلسفہ اور سائنس کی اتنی تعلیم حاصل کر لی کہ صحت کے ساتھ خود مسایل کا استخراج کر سکیں تو وہ پھر ہمہ تن تحقیق و جستجو لعد نئی نئی دریافتوں میں معروف ہو گئے۔

ابن الہیثم کی پیدائش بصرے میں [illegible] میں ہوئی۔ اللہ نے انہیں عالی دماغ بنایا تھا [illegible]

★ اسلامیہ کالج، سیوان بہار۔

بچپن سے ہی تحقیق و جستجو کے عادی ہوئے۔ جفاکشی، حوصلہ مندی اور قناعت پسندی ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ حالانکہ ابن الہیثم ایک مقامی سرکاری دفتر میں ملازم تھے مگر ان کی طبیعت میں علم و حکمت اور تحقیق و جستجو سے جو طبعی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ سے وہ ملازمت سے وقت نکال کر علم ریاضی، علم طبیعیات اور طب کی کتابوں کا مطالعہ بہت ہی ذوق و شوق سے کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے مستقل مطالعے کی عادت کے ذریعے قابلِ رشک حد تک قابلیت پیدا کی اور علوم و فنون پر حاوی ہو گئے۔ وہ اپنے حوصلہ و محنت کے سبب بنیادی فزکس میں اعلیٰ تحقیقات کی طرف مائل ہوئے۔ انھوں نے فلسفہ، علم ریاضی علم طبیعیات، علم بصارت اور علم الہیات کو حاصل کرنے میں اپنی پوری توانائی لگا دی۔ ساتھ ہی انھوں نے عہد کیا کہ اپنی پوری زندگی کو مصروف رکھیں گے جس کے پیچھے ان کے تین واضح اور جامع مقاصد تھے۔

- اول یہ کہ صحیح علوم و فنون کا صحت کے ساتھ اتنا سرمایہ جمع کر لیں کہ علمی میدان میں ذوق رکھنے والوں کو اس سے واضح رہنمائی مل سکے۔
- دوم یہ کہ ان علوم و فنون میں ساری عمر کھپا دینا ہے۔ تاکہ یہ دل و دماغ سے اتر نہ جائیں اور ہمہ تن اس میں مشغول و مصروف رہیں۔ تاکہ اس میں زیادہ سے زیادہ کمال پیدا ہو سکے۔
- سوم یہ کہ یہ علمی سرمایہ ان کے بڑھاپے کی زندگی میں کام آسکیں اور جس سے قلب و ذہن کو اطمینان میسر ہو ساتھ ہی دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنیں۔

ابن الہیثم کی تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد علم ریاضی میں پچیس عدد اور علم طبیعیات و علم الہیات میں چوالیس عدد ہیں جب کہ مختلف رسالوں کی صورت میں ان کے تحقیقی مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کے سب ہی تحقیقی مضامین آج بھی اسی اہمیت کے حامل ہیں جس کے حامل پہلے تھے۔ ان کی تحقیقی کتابوں، نظریوں، تجربوں اور دریافتوں کے حوالے اور طریقے فرنچ، جرمن، انگریزی، رومن اور دیگر مغربی زبانوں میں یورپین، امریکن اور دیگر مصنفین کے مضامین میں کثرت سے ملتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی کتابوں اور مضامین کے تراجم لگ بھگ دنیا کی تمام زبانوں میں کیے گئے۔ یوں تو ابن الہیثم کی تصانیف فزکس، ریاضی اور علم الہیات وغیرہ کے تمام شعبوں میں اہم ہیں۔ مگر علم بصارت (OPTICS) میں ان کی تحقیقات کی جو دین ہے وہ آج بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی وہ کل تھی۔ ابن الہیثم کے مطابق روشنی ایک قسم کی توانائی ہے۔ دلیل کے طور پر سورج کی کرنوں، چراغوں اور آگ کی لَو میں روشنی اور حرارت کا ساتھ ساتھ ہونا اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ روشنی اور حرارت کی اصلیت اور حقیقت ایک ہے۔ انھوں نے اجسام کو بھی دو حصوں میں بانٹا ہے۔ ایک نور افشاں جسم (LUMINOUS BODY) اور دوسرے بے نور جسم (NON-LUMINOUS BODY) نور افشاں جسم وہ ہے جو خود روشنی دیتا ہے جیسے چراغ لیمپ وغیرہ وغیرہ اور بے نور جسم وہ ہے جو خود روشنی نہیں دیتا بلکہ اس پر روشنی پڑتی ہے اور تب وہ روشن ہوتا ہے اور دکھائی دیتا ہے۔ بے نور جسم کو بھی انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جس سے روشنی آر پار ہو جاتی ہے، جسے انھوں نے

شفاف جسم (TRANSPARENT) کہلاتے جیسے ہوا، پانی، صاف شیشہ وغیرہ۔ دوسرے نیم شفاف جسم (TRANSLUCENT) جس سے ہوکر اگر روشنی گزرے تو اس کی شعاعیں مدھم ہوجائیں۔ جیسے نہایت باریک کپڑا، رگڑے ہوئے شیشے وغیرہ اور تیسرے غیر شفاف جسم (OPAQUE) جس سے ہوکر روشنی گزر ہی نہیں سکتی جیسے لکڑی، لوہا وغیرہ۔ واقعہ یہ ہے کہ ابن الہیثم موجودہ علم بصارت کے بانی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان سے قبل دوسرے مسلم رومی اور یونانی سائنس داں یہ تسلیم کرتے تھے کہ چیزوں (OBJECTS) کو دیکھنے کے لیے آنکھ سے ایک روشنی نکلتی ہے جو اس چیز پر پڑتی ہے اور تب چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ افلاطون (PLATO) کا خیال تھا کہ کچھ دوسری کرنیں ہیں جو چیزوں کی طرف چلتی ہیں اور تب چیزیں دکھائی دیتی ہیں — ALEXENDRIANS کا کہنا تھا کہ روشنی آنکھ کے عدسہ (LENSE) سے نکلتی رہتی ہے اور تب چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ ATOMISTS نے چیزوں کو دیکھنے کی ATOMIC-THEORY دی۔ جب کہ حنین ابن الحق نے اپنے تحقیقی مقالے QUESTIONS ON THE EYE میں جو نظریہ دیا ہے وہ PLATO کی ہی طرح کا نظریہ ہے۔ ان کے مطابق چیزوں کے دیکھنے میں آنکھ کے LENSE ہی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ چیزوں کو دیکھنے والی قوت تو دماغ سے آتی ہے مگر چیزوں سے آنے والی کرنیں اسی آنکھ کے LENSE میں جذب (RECEIVE) ہوتی ہیں۔ الرازی نے بھی اپنے تحقیقی مقالے (MONOGRAPH) میں یہی لکھا ہے کہ آنکھ سے شعاعیں خارج نہیں ہوتیں۔ ارسطو کا نظریہ ابن الہیثم کے نظریہ کے قریب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن الہیثم نے اپنے انقلابی نظریے سے دنیائے سائنس کو جو دیا، اس نے اس وقت کے موجودہ تصورات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ آج بھی چیزوں کو دیکھنے کے لیے ابن الہیثم کی تھیوری ہی تسلیم شدہ (ACCEPTED - THEORY) ہے۔ ان کے مطابق چیزیں اس لیے دکھائی دیتی ہیں کہ سورج سے نکلی شعاعیں چیزوں سے ٹکرا ٹکرا کر آنکھ کے لینس پر پڑتی ہے اور تب دماغ کو اس کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اندھیرے میں رکھی ہوئی چیزیں اجالے میں موجود آنکھوں کو دکھائی دیتیں۔ جب کہ یہ ہوتا ہے کہ چیزیں اگر اجالے میں ہوں تو بھی اندھیرے میں موجود آنکھوں کو دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ہم عصر بہت سارے سائنس والوں نے اس نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا مگر البیرونی اور ابن سینا کی وسعت ذہن نے اسے سمجھا اور تسلیم کیا آج بھی چیزوں کے دیکھنے کی وہی تھیوری ہے جو ابن الہیثم نے دی تھی۔

ابن الہیثم نے بصارت (OPTICS) کے بہت سارے مسایل کو ریاضی کے ذریعے حل کرکے دنیائے سائنس کو آراستہ کیا۔ انھوں نے تجرباتی فزکس میں بھی بہت اہم کام کیے جن کی بہت لمبی فہرست ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو مرتب کرکے کتاب المناظر (THE OPTICAL SEROS) لکھی جو اپنے موضوع بنیادی فزکس (CLASSICAL PHYSICS) پر ایک شاہکار، علم طبیعیات کی اہم شاخ اور علم بصارت پر دنیا کی سب سے پہلی اور جامع کتاب ہے۔ اس کتاب نے چھ سو سال تک تمام سائنس والوں کو متاثر کیے رکھا۔ آج بھی مغربی سائنس داں اسے ماخذ (SOURCE) کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بہت سارے رومن یہودی اور مسلم سائنس دانوں نے جیسے روجر بیکن (ROGER-BECON) جون بیکم (JOHN PECKAM) لیوی بن جرسن (LEVI-BEN-GERSON) ویٹلو (WITELO) احمد بن ادریس القرمانی اور قطب الدین

البیرازی وغیرہ وغیرہ سائنس دانوں نے اس کو بنیاد (BASE) بنا کر اس تھیوری پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔

ابن الہیثم کا خیال تھا کہ روشنی ایک نور ہے جو خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے روشنی کے سفر کے لیے کسی واسطے MEDIUM کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھوں نے آنکھ کی بناوٹ، فریبِ نظر (OPTICAL ILLUSION) علم تناظر (PERSPECTIVE) دوربینی تصویر (BINO CULAR VISION) علم خاکہ کشی (VISION OF OUT LENS) رنگ (COLOUR) چھایا (SHADOW) سراب (MIRAGE) کیمرہ آبکیورا (CAMRA OBCURA) انعکاس اور انعطاف کے نظریے، علم مرایا (DIOPTRICS) CATOPTRICS ہالہ (HALOS) قوس وقزح (RAIN BOW) کہکشاں (MILKY WAY) دم دار ستارہ (COMMETS) اور AL-HAISHAM PROBLEMS وغیرہ عنوانات پر تفصیلی اور عمیق مطالعہ پیش کیا ہے۔

ابن الہیثم نے کروی (SPHERICAL) اور سلجمی (PARABOLIC) آئینوں (MIRRORS) پر بہت ہی کامیاب تجربے کیے ہیں۔ انھوں نے تجربوں کے ذریعے یہ دکھایا کہ انعکاس اور انعطاف کے زاویے کا تناسب ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا۔ انھوں نے LENSE کے MAGNIFYING POWER کی تشریح کی اور کرۂ ہوا میں انعطاف کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا۔ انھوں نے تجربے کے ذریعے دکھایا کہ صبح صادق (TWILIGHT) اس وقت شروع یا ختم ہوتی ہے جب سورج افق (HORIZON) سے انیس ڈگری نیچے ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر انھوں نے کرۂ ارض کی اونچائی ناپنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے BINOCULAR VISION کو بھی بڑی ہی تفصیل سے سمجھایا ہے۔

ابن الہیثم نے جن مسائل کو حل کیا آج وہ سات بڑے شعبوں (SUBJECTS) میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جیسے علم تشریح (ANATOMY) علم الاعضا (PHYSIOLOGY) - علم نفسیات (PHYCHOLOGY) علم ریاضی (MATHEMETICS) علم فلکیات (ASTRONOMY) - علم طبیعیات (PHYSICS) اور علم الٰہیات (METROLOGY) وغیرہ وغیرہ۔

روشنی کے انعکاس کے دونوں نظریے، شعاع واقع، عمودی خط اور شعاع منعکس تینوں ایک ہی سطح میں پائے جاتے ہیں اور زاویہ انعکاس (ANGLE OF INCIDENT) اور زاویۂ انعطاف (ANGLE OF REFLECTION) برابر ہوتے ہیں۔ ان کی دریافت کا سہرا اور تجربے کے ذریعے اس کا ثبوت بھی الہیثم کی دین ہے۔ آج بھی انعکاس کے ان دونوں قوانین کے تجرباتی ثبوت کا وہی طریقہ رائج ہے جو ابن الہیثم نے دیا تھا۔ انھوں نے ہوا میں روشنی کے زاویۂ وقوع اور پانی میں زاویۂ انعطاف میں جو فرق ہے اسے بھی بہت ہی اچھے ڈھنگ سے تجربے کے ذریعے دکھایا ہے اور تشریح کی ہے۔ کروی آئینوں پر ان کی تحقیقات ان کے شاندار کارناموں میں ایک ہے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ روشنی کی متوازی شعاعیں جب ایک شفاف مقعر آئینے پر پڑتے ہیں تو وہ منعکس ہو کر ایک خاص نقطہ پر پڑتے ہیں جسے انھوں نے ماسکہ کہا۔ اگر مقعر آئینے کے نقطۂ ماسکہ سے ذرا ہٹ کر ایک منور چیز رکھی جائے تو اس کا عکس الٹا اور مقعر آئینے کی دوسری سمت میں بنے گا۔ جیسے اگر پردے پر لیا جائے تو وہ عکس سیدھا نظر آئے گا۔ انھوں نے تجربات کے ذریعے یہ بھی دکھایا کہ اگر کسی اندھیرے کمرے کی چھت یا دیوار پر ایک چھوٹا سا سوراخ سورج کے رخ پر

ہو اور سوراخ کے دوسری طرف ایک پردہ اس طرح ہو کہ باہر کی روشنی کا عکس اس پردے پر پڑے تو وہ عکس الٹا بنے گا۔ ابن الہیثم کے اپنے مذکورہ بالا تجربات کی رہنمائی میں فوٹو کیمرہ ایجاد ہوا۔

الہیثم نے یہ بھی تجربے کے ذریعے دکھایا کہ کوئی چھڑی اگر پانی میں رکھی جائے تو وہ ٹیڑھی کیوں نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی تجربہ گاہ (LABORATORY) میں تجربہ کرکے دکھایا کہ سورج اور چاند افق پر بڑے کیوں نظر آتے ہیں اور کیسے نکلتے اور ڈوبتے ہیں۔ انھوں نے تجربے سے یہ بھی دکھایا کہ ستارے رات میں جھلملاتے کیوں ہیں اور اللہ نے انسان کو ایک آنکھ کے بجائے دو آنکھیں کیوں دی ہیں؟

ابن الہیثم کو خداوند قدوس نے زبردست صلاحیتوں سے نوازا تھا جسے انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے کافی ترقی دی۔ وہ نہ صرف علم ریاضی علم طبیعیات، علم فلکیات اور علم الہیات وغیرہ وغیرہ علوم وفنون کے ماہر تھے بلکہ باکمال انجینیر بھی تھے۔ مصر میں اسوان باندھ (ASWAN DAM) کا منصوبہ ان کے باکمال انجینیر ہونے کا مکمل ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مصر ایک زراعتی ملک ہے جس کی پیداوار کا مکمل انحصار دریائے نیل پر ہے۔ مصر میں سیلاب اور خشک سالی کے سبب زراعت کو کافی نقصان ہوتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے بصرہ ہی میں رہ کر دریائے نیل پر اسوان کے قریب جنادل (JANADIL) میں جو اب شلال (SHALAL) کہلاتا ہے کی طرف سے اونچے اونچے اور مضبوط باندھ باندھ کر ایک وسیع ڈیم بنانے کا منصوبہ بنایا تاکہ مصر سیلاب سے بچ سکے اور دوسری طرف خشک سالی کے وقت اس میں محفوظ پانی سے ہزاروں ایکڑ زمین سیراب کی جا سکے۔ مگر افسوس کہ اس وقت یہ منصوبہ کثیر رقم کے اخراجات جس کی متحمل مصری حکومت نہیں تھی کی بنا پر پورا نہ ہو سکا۔ اب وہ باندھ کئی حکومتوں کے اشتراک اور تعاون سے مکمل ہو چکا ہے جو آج بھی اس باکمال انجینیر کو خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔

ابن الہیثم کی تحقیقات اور کارناموں کی ایک لمبی فہرست ہے جس پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں انھوں نے ارسطو کے کاموں کا تجزیہ کیا، ان پر تنقیدیں لکھیں۔ گیلیلیو (GALALIO) کے بہت سارے کاموں کی بھی انھوں نے تلخیص (SUMARY) لکھی۔ ان کی کتابیں علم نباتات اور علم ادویات پر بھی بہت مشہور ہیں۔

ابن الہیثم نے CATOPTRICS پر جو تحقیقات کیں وہ الہیثم پرابلم (AL-HAISNAMI PROBLEM) کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک مستوی سطح کے دو نقطوں سے جب کسی دائرے (CIRCUMFERENCE) پر دو خط مستقیم ملتے ہیں اور اگر اس نقطے پر عمود کھینچا جائے تو ان دونوں خط مستقیم سے بنے زاویے برابر ہوتے ہیں اور وہ چوتھے ڈگری کا ایک مساوات (EQUATION OF FOUATH ORDER) ہوتا ہے جسے الہیثم نے ایک HYPERBOLA کے ذریعے حل کیا۔ انھوں نے یونانی کے CUBIC EQUATION کو بھی حل کیا جو بہت ہی مشکل تھا۔

قرآن حکیم کی اساس پر بنی دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی الازہر کو مرکز بنا کر ہی ابن الہیثم نے علم تحقیقات کیں۔ ابن الہیثم کی OPTICS پر بنیادی تحقیقات نے ہی نیوٹن (NEWTON) کو تحقیق کی بنیاد فراہم کی۔

بن الہیثم بہت ہی قناعت پسند تھے اور سادی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ ملک کے سارے لوگ ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ جب کبھی کسی نے ان کے رہنے سہنے کا معقول انتظام کرنا چاہا اور کثیر رقم نذر کی تو انھوں نے لوگوں کی قدردانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمیشہ نذر کی رقم واپس کر دی۔ کیوں کہ ان کو روزانہ کے معمول کے لیے اتنی کثیر رقم کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک بار ایک امیر نے جسے علم و حکمت سے بہت شغف تھا، چاہا کہ ابن الہیثم سے درس لے ابن الہیثم نے جو امرا اور بادشاہوں کے مزاج سے واقف تھے سوچا کہ اس کی مستعدی اور شوق کو جگائے رکھنے کا واحد ذریعہ ہے کہ اس سے درس کی فیس لی جائے۔ چنانچہ ابن الہیثم نے ماہانہ سو اشرفی طے کیا۔ اس امیر نے وہ فیس بخوشی دینا منظور کیا۔ جب اس کے درس و تدریس کا سلسلہ ختم ہو گیا تو ابن الہیثم نے اس کے علمی ذوق و شوق، مستعدی اور سعادت مندی کی تعریفیں کیں اور یہ کہہ کر ساری رقم واپس کر دی کہ میں رقم لے کر آپ کے علمی شوق کو جگائے رکھنا چاہتا تھا اور میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ کے نزدیک علم و حکمت کے مقابلے میں مال و دولت کی کیا حیثیت ہے۔ آپ میری آزمائش پر کھرے اترے۔ ابن الہیثم نے اس کو دعائیں دیں اور یہ کہہ کر رخصت کیا کہ

"اے میرے عزیز کارِ خیر کرنے میں
اجرت یا بدلہ لینا مناسب نہیں۔"

آخری دور میں ابن الہیثم نے قناعت کے ساتھ زاہدانہ زندگی گزاری اور کسی دربار سے انھوں نے کوئی تعلق نہ رکھا جو اس وقت کا رواج تھا۔ گزر اوقات کے لیے علم ریاضی و دیگر کتابوں کی نقل شائقین علم کے ہاتھوں فروخت کرتے اور اسی سے اپنی ضروریات پوری کرتے۔

علم بصارت سے متعلق گہری تحقیق اور نظریہ پیش کرنے والا یہ عظیم سائنس داں باسٹھ سال کی عمر میں سنہ ۴۲۱ھ / سنہ ۱۰۲۱ء میں اپنے رب حقیقی سے جا ملا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

بقیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۵۰

کو سرٹیفکیٹ دے کر وہ بچہ پیدا کر سکتے ہیں یا لڑکی۔ یہ پرمٹ دیتے وقت اس خاندان میں اور علاقے میں لڑکے اور لڑکی کے تناسب کو مد نظر رکھا جائے گا، جہاں تناسب یکساں ہوگا وہاں قرعہ اندازی یا لکی ڈرا ہوگا کہ لڑکا کس کی قسمت میں ہے۔ شاید یہ سب کچھ ہم اگلی صدی میں دیکھیں گے اگر زندہ رہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۲- شمارہ ۶ (جون ۱۹۹۳ء)

عَلَّمَ بِالْقَلَمْ

کیا تمام زبانوں کے رسم الخط آرامی (قدیم عربی) سے نقل کیے گئے ہیں

عقیلہ شاہین ★

قوت گویائی میں انسان کے ساتھ کچھ دوسری مخلوقات بھی شریک ہیں لیکن حروف کی ایجاد یعنی ہر آواز کے لیے ایک حرف مقرر کرنا اور پھر حرفوں کی ترتیب و تنظیم سے الفاظ بنا کر لکھنے کے معجزے کا صرف انسان ہی بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ کیونکہ "قوتِ گویائی تو قدرت کا ایک عطیہ ہے مگر لکھنے کی ایجاد انسانی عقل کا ایک حیرت ناک کرشمہ ہے۔"

یہ آخری جملہ رائے ہے حروف تحریر پر بیسویں صدی کے ایک بہت موقر عالم اور محقق DAVID DIVINGER کا جو ایک اطالین پروفیسر تھا۔ اس پروفیسر نے تمام دنیا کی معلوم تحریروں پر بیس سال تک تحقیق کے بعد ایک مستند اور ضخیم کتاب ۱۹۳۷ء میں THE ALPHABET کے نام سے پیش کی چونکہ اس کتاب میں فن تحریر پر کام کرنے والے تمام محققوں کے حوالے اور اسناد بھی موجود ہیں اس لیے ماہرین السنہ اور تحریر کے نزدیک اس کی حیثیت ایک دستاویز کی سی ہو گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بہت سی مغربی یونیورسٹیوں کے سوا بے نظام حیدرآباد کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے تعاون سے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ شایع کیا گیا۔ چند سال ہوئے کیمبرج یونیورسٹی اور دیگر مداحوں کی کوششوں سے اس کا نیا ایڈیشن بھی بڑی آب و تاب سے چھاپا گیا ہے۔ ٹورنٹو کی سینٹرل لائبریری میں یہ نیا ایڈیشن موجود ہے اور U. OF T. کی لائبریری میں پرانا نسخہ مل سکتا ہے۔ ڈیوڈ ڈیرنگر کی تحقیق نے تحریر کی دنیا کو ایک انقلاب سے روشناس کرنے کا حیرت ناک کام کیا ہے۔ کیونکہ اس نے پچھلے تمام نظریات کو رد کرتے ہوئے دنیا کی بیشتر زبانوں کے حروف کو ایک ہی ماخذ اور مرکز کی شاخیں قرار دیا ہے۔ تمام دنیا کے حروف تحریر کی حیثیت اس کی نظر میں کیا تھی، اس کے الفاظ میں یوں ہے :

"ایک دفعہ ایک صاحب علم پروفیسر نے مجھ سے دریافت کیا ؛ جب تم حروف تحریر کی بات کرتے ہو تو تمہاری مراد کس زبان کے

★ جنرل سکریٹری حلقہ اربابِ ذوق، ٹورنٹو، کینیڈا۔

حروف تحریر ہوتے ہیں۔ مصری، عبرانی،
لاطینی۔ چینی یا عربی۔"
"میں، حروف تحریر کی تاریخ میں
ان سب زبانوں کے حروف شامل کرتا
ہوں کیونکہ میری تحقیق کے مطابق یہ سب
ایک ہی ماخذ کی پیداوار ہیں۔" یہ میرا
جواب تھا۔"

تمام حروف تحریر کی بنیاد ایک ہونے کی جو دلیلیں مختلف تاریخی حقائق، ہر دور میں اقوام عالم کی تہذیبی کیفیت اور ان کے طرز تحریر کی درجہ بدرجہ ترقی و تبدیلی کی تصاویر اور پرانے کتبوں کی شہادتوں کے ساتھ پیش کی گئیں ہیں۔ مصنف کی کاوشِ فکر اور سچائی کی گواہ معلوم ہوتی ہیں۔

ڈیوڈ کی تحقیق کا خلاصہ مختصراً یہ ہے کہ جب انسان پر معلوم تاریخ کا ایک طویل عرصہ خطِ میخی اور خطِ تصویر کے تحت گزر چکا۔ مختلف علاقوں کی زبانیں بھی وجود میں آگئیں، مختلف ممالک کے درمیان تجارتی رابطے اور صنعت و حرفت کے تبادلے بھی ہونے لگے، یہاں تک کہ بہت سے پیغمبر بھی ہو چکے تب بھی انسان ایک ایسے ذریعے کا محتاج تھا جس کی مدد سے اپنی زبان سے ادا ہونے والی ہر آواز کو محفوظ کر سکے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ سے دو ہزار برس پہلے تک موجودہ فلسطین اور شام کے علاقوں میں، جو اس وقت کے تہذیب یافتہ علاقے تھے، جو سامی زبان بولی جاتی تھی، خطِ میخی کے استعمال سے کام چلاتی تھی۔

لیکن جب ۱۸۰۰ یا ۱۷۰۰ قبل مسیح میں جو کہ حضرت ابراہیمؑ کا بھی زمانہ ہے، سامی نسل کے چرواہے بادشاہ جن کو مغربی دنیا ہائیک سوس (HYKSOS) کے نام سے یاد کرتی ہے، مصر پر قابض ہوئے اور کم از کم ۵۰۰ سال تک حاکم رہے تو اس انقلابی دور میں یہ عظیم واقعہ بھی ظہور میں آیا کہ عام لوگوں کے درمیان ایک ملا جلا طرز تحریر وجود میں آگیا۔ یہ مصر کے حکمرانوں کی ایجاد بھی نہیں تھا اور اس کے موجد کا نام بھی ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے لیکن ڈیوڈ کی رائے میں وہ انسانیت کا سب سے بڑا محسن تھا۔

ہائیک سوس بادشاہوں کے وجود کی حضرت ابراہیم کے زمانے سے حضرت یوسف اور موسیٰ کے دور تک سید سلیمان ندوی کی کتاب "تاریخ ارض القرآن" سے بھی تصدیق ہوتا ہے۔ قرآن اس قوم کا "عمالقہ" کے نام سے بڑے صاحب سطوت بادشاہوں کے طور پر تذکرہ کرتا ہے۔ سید سلیمان ندوی ہائیک سوس کا اصلی وطن عرب کا علاقہ ثابت کرتے ہیں۔ بہرحال دنیا کی کسی قوم اور کسی خطے کے لوگوں نے یہ کارنامہ پیش نہیں کیا جو شام اور فلسطین کے سامی نسل کے باشندوں نے کیا۔ تمام دنیا والے کیا مصری کیا عراقی کیا وسط ایشیا والے، کیا وادیٔ سندھ کے باشندے، چین، وسطی امریکہ، سائپرس یہاں تک کے جاپان کے رہنے والے بھی صرف یک صوتی مفردات بنا سکے لیکن سامی نسل کے نابغہ لوگوں نے حروف کے آغاز کا وہ کرشمہ کر دکھایا کہ ماضی و حال کے تمام حروف تحریر انہی سے مستعار لیے ہوئے اور ان ہی کا عکس ہیں۔" (ترجمہ از ڈیوڈ ڈیرنگر)

اگرچہ اس متمدن دور میں تمام زبانیں اپنے رسم الخط میں تبدیلیاں لاتی رہیں گی اور شاید اپنے ماخذ و مرکز کو پہچان بھی نہ سکیں گی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کے برہمی (جو پراکرتوں اور سنسکرت کا طرز تحریر بھی ہے) حروف تحریر کوریائی حروف منگولیا کا طرز خط، یونانی، لاطینی، عبرانی، عربی، رومی

سب کے حروف تحریر کی بنیاد ایک اسی رسم الخط پر ہے جس کے موجد نے اسے کوئی نام کبھی نہیں دیا تھا اور اب محققین نے اسے آرامی کا نام دے دیا ہے۔

آرامی تحریر کی خصوصیات:

۱۔ یہ رسم الخط سیدھے ہاتھ سے شروع ہوتا تھا۔

۲۔ یہ رسم الخط بائیس نشانوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر ایک، ایک آواز کے لیے مخصوص تھا۔ کچھ نشانات قدیم میخی، تصویری اور ریگ صوتی رکنیوں والے طرز سے بھی لیے گئے تھے۔

۳۔ اس کے حروف صحیح کو عام زندگی سے متعلق کسی ایسی شے کا نام دیا گیا تھا جس کا سمجھنا مشکل نہ ہو اور جس سے اس شے کے نام کا آغاز ہو۔

۴۔ یہ حروف صحیح جس طرز پر تھے، آج بھی اسی طرز پر ہیں، البتہ ہم اُن کو آرامی نہیں بلکہ عربی کہتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے:

حروف صحیح CONSONENTS جدید نام معنے

ا۔ الف۔ سامی میں بیل۔ ب۔ بیت گھر
دد ھلتہ۔ دہلیز یا دروازہ۔ ی۔ ید۔ ہاتھ
ک۔ کف ہتھیلی۔ ع۔ عین۔ آنکھ
ف۔ فم۔ منھ ر۔ راس۔ سر
س۔ سن۔ دانت۔ ج۔ جمل۔ اونٹ
ن۔ نون۔ مچھلی۔ ق۔ قوفم۔ بندر
و۔ واؤ۔ کنڈا۔ ز۔ زاین۔ زیتون
ت۔ تتھ۔ گولا ل۔ لمد۔ استاد کی چھڑی۔
ص۔ صید، صود۔ مچھلی پکڑنے کی سلاخ
خ۔ خط باڑ۔
ح۔ ط۔ اور چند دوسرے حروف بعد میں شامل ہوئے۔

ڈیوڈ ڈیرنگر کے اس کلیہ پر بہت سے محققین کے متفق ہونے کے باوجود کچھ گوشوں سے اعتراض بھی ہوئے ہیں۔ اہم ترین اعتراض یہ ہے کہ اس رسم الخط میں مصوتے VOWELS نہیں ہیں لیکن ایک اور ماہر تحریر مارس ڈیوننٹ نے یہ دریافت کیا کہ واولس یا مصوتوں کا نہ ہونا ہی اس طرز تحریر کا مقبولیت کا باعث ہوا۔ کیونکہ مختلف علاقوں میں مقامی لہجے اور تلفظ کے مطابق اعراب پڑھ لیے جاتے تھے لیکن چونکہ بغیر مصوتوں VOWELS والی تحریر کو مکمل رسم الخط نہیں کہہ سکتے اس لیے مصنف نے ایسی تشریح کرنی ضروری سمجھی کہ عبرانی، عربی اور تمام سامی زبانوں کے الفاظ کی بنیاد ایک مادے یا روٹ (ROOT) پر ہوتی ہے اس لیے پڑھنے والے کو مسلمہ قاعدے کے مطابق تلفظ کا پہلے ہی اندازہ ہو جاتا ہے اور آرامی بھی ان ہی زبانوں کے دور اول کا نام ہے اس لیے وہاں بھی اعراب موجود ہونے کے باوجود اشد ضرورت پر ہی استعمال کیے جاتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنف مغربی زبانوں خصوصًا انگریزی میں VOWELS کی کثرت استعمال سے عاجز آ چکا تھا۔ اس لیے انگریزی رسم الخط سے سامی رسم الخط کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"VOWELS کے غلط سلط نشانات بیچ میں آ جانے سے صحیح انگلش بولنے کی کوشش کرنے والے ہمیشہ مشکل میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کے برخلاف تمام سامی زبانوں میں حروف صحیحہ CON-SONENTS کا تلفظ صدیوں سے ذرا بھی نہیں بدلا ہے۔" (صفحہ ۲۱۸)

مثلاً ک ت ب۔ کتب۔

آرامی طرز تحریر سے دنیا کی تمام زبانوں نے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا۔ خاص طور سے سامیین کی زبان نے

جو بعد میں قبیلۂ قریش کہلائے اور فصیح ترین عربی بولتے تھے۔ میرے خیال سے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مولانا سید سلیمان ندوی آرامی زبان اور اس کے طرز تحریر کو عربی یا قدیم عربی کہتے ہیں اور آرامی حروف تحریر کے ناموں سے ہم خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ سب حروف عربی ناموں سے متصف ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ اطلاع یہ بھی ہے کہ آرامی زبان دمشق کے قریب ایک پہاڑی قصبے ملولا میں اب بھی بولی جاتی ہے اور (عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

سامی زبانوں سے باہر جن زبانوں نے آرامی حروف کو اپنایا ان میں نستوری، مانوی، ہند آریائی (ایرانی) ترکی اور منگولی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پھر ہندوستان کی آریائی شاخ برہمی نے جو استفادہ کیا، اس کے بارے میں تمام محققین کی کم و بیش یہ رائے ہے کہ برہمی پر آرامی کے اثرات کی شہادتیں بہ کثرت ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ ہندوستان کی تاریخ کی طرح ان کی تحریر کی تاریخ بھی گوشۂ گمنامی میں رہی ہے اور یہاں کے محبانِ وطن اپنی تحریر کو برہمی اور ماقبل تاریخ قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جدید تحقیق سے پہلے مغربی محقق بھی آریوں کی آمد ۲۰۰۰ ق م خیال کرکے ان کی آغازِ تحریر کا زمانہ ۱۰۰۰ ق م اندازہ کرتے تھے مگر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۱ء تک، مگر جب ۲۵ سال کی کھدائی کے بعد ۳۲۵۰ ق م کی وادیٔ سندھ کی تہذیب دریافت ہو گئی تو اس نے سب مفروضے باطل کر دیے۔

۱۔ سندھ کی تہذیب کے سکوں، مہروں اور تعویذوں کی لکھائی جنوبی ایران یا عراق کی تو معلوم ہوتی ہے مگر آریوں سے ان کا کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔

۲۔ دوسری طرف برہمی تحریروں کی بنیاد آدھ حرفی آوازوں پر ہے — Semi Alphabet۔ رسم الخط کی ابتدا کے لیے ہر آواز کا ایک نشان مقرر کرنا ہی کافی نہیں بلکہ نشانات پر مشتمل تحریر کے قاعدے بنانا بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ برہمی اس طریقے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

۳۔ ویدک لٹریچر بھی تحریر سے متعلق کوئی شہادت نہیں دے پاتا کیونکہ ویدک منتروں میں پڑھنے سننے یا (ان سننے) کا ذکر تو ملتا ہے لکھنے کا ذکر کہیں نہیں ہے۔

۴۔ ہندوستان کی معلوم تاریخ میں تحریر کا ذکر صرف ۸۰۰ ق م میں ملتا ہے ڈاکٹر مجیب اشرف (مصنف ہندوستان کی سیکولر روایات) ویدوں کی تحریر کا زمانہ تقریباً یہی قرار دیتے ہیں۔

تمام تاریخی شہادتوں اور تہذیبی ماخذوں سے جو تھیوری مسلم ہوتی ہے اس کے تحت برہمی اور آرامی کے حروف تحریر میں مماثلت ثابت ہو جاتی ہے۔

۵۔ حروف تحریر کے تصور۔ حروف کی شکلوں کے ساتھ سیدھے ہاتھ سے شروع کرنے کا تصور بھی آرامی سے مستعار ہے۔

۶۔ آرامی تحریر کے Consonents مصمتے یا حروف صحیحہ الف کی آواز کے ساتھ صرف پڑھے جاتے ہیں لکھے نہیں جاتے لیکن برہمی نے جدت یہ کی کہ الف کی آواز اپنے حروف کے ساتھ ہی جوڑ دی۔ اس طرح اعراب یا Vowels (مصوتوں) کا جو مکمل تصور سامی آرامی زبان اور بعد میں عربی میں رواج پایا

برہمی اس کا احاطہ نہ کر سکی اور آج تک ماہرینِ تحریر کی نظر میں Semi Alphabet کہلاتی ہے۔ علاوہ ازیں برہمی آرامی رسم الخط کے تصور سے اس وقت تک استفادہ بھی نہ کر سکی جب تک اسے تخت و تاج کی تائید حاصل نہ ہوئی۔ آریوں اور برہمنوں کا پہلا زمانۂ عروج ۵۹۹ ق م میں مہاتما بدھ اور ۵۶۳ ق م میں مہاویر جین کے مذاہب بدھ مت اور جین مت کے آغاز کے ساتھ کمزور پڑ گیا اور عوامی دور شروع ہو کر پراکرتوں کو فروغ ہوا۔

- آریوں کے مذہب میں ہر صفت سے متعلق ایک دیوتا پایا جاتا ہے۔ علم کی بھی ایک دیوی سرسوتی موجود ہے لیکن تحریر کا کوئی دیوتا یا دیوی نہیں ملتی۔

اس طرح بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تحریر کا فن بدھوں کے ذریعے متعارف ہوا۔ بدھ مت والوں نے عوامی پراکرتوں میں ہندوستان کے جنوبی علاقوں سے لے کر افغانستان، وسط ایشیا اور چین تک ہر زبان میں اپنے کتبے اس علاقے کی پراکرت کی طرز تحریر میں نصب کرا لے اور لکھنے کا فن عوام تک پہنچایا۔

بدھوں کی ہی تحریروں میں لکھنے سے متعلق ایسی اصطلاحات پائی جاتی ہیں جو اس فن کی تدریس، مشق اور تربیت سے متعلق ہیں۔ مثلاً پلاکھا (لکھنے کی میز) لکھا کا (لکھنے والا) سیکھ صداتی (لکھنے کی مشق) ایک بچوں کی کتاب اکھاریکا (حروف بنانا) ایک قانون کی کتاب لیکھا اور بدھ کے ارشادات پر مشتمل کتاب سیلا ستا (Sila Sutta) کے حوالے سے محقق اپنے دعوے کی دلیل پیش کرتے ہیں۔

بدھوں کے کتبوں کی یہ خصوصیات قابلِ توجہ ہیں:

۱۔ ہر علاقے کی پراکرت میں لکھے جاتے تھے۔
۲۔ لکھائی سیدھے ہاتھ سے شروع ہوتی تھی۔
۳۔ بابل سے کثرتِ تجارت کے سبب سامی اور ہندی زبانوں کے بہت سے الفاظ مشترک تھے۔
۴۔ تحریر کے فن اور بدھ مت کی اشاعت کے سلسلے میں خواتین کے نام بھی آتے ہیں۔

ادھر برہمی دور کے ہندوستانی محقق مسٹر تلک اور مسٹر بال کرشنا ڈکشت ویدوں کا دور ۶۰۰۰-۷۰۰۰ ق م سے ۴۰۰۰ ق م تک بتاتے ہیں مگر دعووں کے سوا، تاریخی طور پر کچھ بھی ثابت نہیں کر سکے۔ ہر طرح کی کوششوں کے بعد برہمی تحریر کے بارے میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ طرز تحریر وادیٔ سندھ کی تہذیب کے ڈھائی ہزار سال بعد اور بدھ مت کی تحریری اشاعت کے بھی ۸۰۰ سال کے بعد وجود میں آیا۔

برہمی سے دیوناگری تک (آریوں کا دوسرا دور) چوتھی صدی ق م کے آغاز سے بدھوں کے زوال سے چندر گپت بکرماجیت کا ہندو راج شروع ہوا۔ ہندو آرٹ، مذہب، سائنس اور ادب کی اشاعت ہوئی اور ہندو مت کا عہد زریں قرار پایا۔ جس میں سنسکرت علم کی زبان بنی پراکرتوں میں کتبے لکھنا بند ہو کر ان کا رواج ہی ختم ہو گیا۔ سیاسی وجوہات سے سنسکرت گپتا رسم الخط کے نام سے رائج ہوئی اور تمام چینی ترکستان، وسط ایشیا، کش، ختن اور بلخ کے علاقوں میں مسلمانوں کی آمد تک جاری رہی۔ ایک جرمن محقق نے اس کو شمالی آریائی اور فرانسیسی ماہر نے مشرقی ایران کی زبان قرار دیا ہے۔ اہلِ ختن نے برہمی کے حروف ہی اختیار کر لیے۔ کیونکہ اس زمانے میں ختن میں پراکرت اور سنسکرت ہی بولی جاتی تھی لیکن انھوں نے اپنے تلفظ کے مطابق وہ حروف بھی سنسکرت میں شامل کر دیے تھے جو سامی یا آرامی اثرات کے تحت ان کی زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔

شروع شروع میں یہ صرف ایک محقق کی رائے تھی لیکن جدید تحقیق سے تمام سینٹرل ایشیا اور مشرقی ترکستان پر سامی زبان کے لاتعداد اثرات ثابت ہو گئے ہیں۔

گپتا رسم الخط کی ایک شاخ سِدھا متر Na[illegible] کہی جاتی تھی لیکن چھٹی صدی عیسوی میں ہن قوم نے حملہ کر کے ہندو تہذیب پر بُرا اثر ڈالا اور ان کی تحریری سرگرمیاں بھی ماند پڑ گئیں۔ ساتویں صدی کے آغاز ۶۰۶ء میں ہرش وردھن کی حکومت سے شمالی ہند میں اتحاد اور جنوب کی جزوی فتح کے بعد پھر سدھا متر کا کو ترقی ہوئی۔ کچھ نئے حروف مگدھی کی ایک شاخ کیوٹیلا سے مستعار لیے گئے۔ یہ کیوٹیلا ایک قدیم گجراتی بولی ناگری کی جانشین تھی۔ یہیں سے دیوناگری وجود میں آئی لیکن اس تحریر کے نمونے صرف ۸ویں صدی عیسوی سے ملتے ہیں۔ اس سے پہلے کے نہیں ملتے۔

اس رسم الخط نے دو سو سال تک بہت آہستہ ترقی کی۔ البتہ گیارہویں صدی عیسوی میں یہ خاصہ پختہ اور شمالی ہند کا مقبول رسم الخط بن گیا۔ اس دور کے نمونے کھجور کے پتوں پر لکھے ہوئے راجپوتانہ اور گجرات کے علاقوں میں دریافت ہوئے ہیں۔

دیوناگری کا رسم تحریر خاصہ جامع کہا جا سکتا تھا۔ اگر اس کے تمام CONSONENTS حروف صحیحہ کے ساتھ ایک A لگا ہوا نہ ہوتا۔ یہ الف کی آواز والا مصوتہ VOWEL اکثر پڑھا نہیں جاتا لیکن اسی ایک سبب سے اس رسم تحریر کو SEMI SYLLABARY نیم صوت رکنی کہا جائے گا۔

رسم الخط دیوناگری کے پچاس حروف ہیں جن میں سے ۱۴ VOWELS ہیں۔ دس تنفس والی آوازیں ہیں۔ تحریری حروف کے چھ یا سات مجموعے ادائیگی کے اعتبار سے بنائے گئے ہیں۔ O اور AU قسم کے VOWEL ۱۸ویں صدی میں اضافے کیے گئے ہیں۔

دیوناگری میں خالص مصمتے CONSONENTS نہیں پائے جاتے اس لیے اکثر دو یا تین CONSONENTS جوڑ کر ایک آواز بنائی جاتی ہے۔ اس کے کچھ اصول بھی ہیں لیکن اکثر بے ضابطہ طریقوں سے کام نکالتے ہیں۔ اکثر CONSONENT کے نیچے ایک آڑا خط ڈال کر فرق قائم کرتے ہیں جس کو سنسکرت میں ورام کہتے ہیں۔

جب کہیں نون غنہ کی آواز ادا کرنی ہوتی ہے حروف کے اوپر ایک نقطہ رکھ دیتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی دائرہ نما لکیر میں ایک نقطہ بھی اسی مقصد سے بعض حروف پر رکھتے ہیں۔ دیوناگری رسم الخط چونکہ سنسکرت ادب کی تحریر کے لیے وجود میں آیا تھا اور عام زندگی میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا اس لیے صدیوں سے اس کے قواعد جامد ہیں۔ بظاہر اس کا لکھنا آسان ہے لیکن روزمرہ کی اصطلاحات اور عوام کی زندگی کی عکاسی سے اس کا کم ہی واسطہ ہے۔

THE ALPHABET میں اردو اور دیوناگری کے رسم الخط سے صرف اتنی بحث کی گئی ہے کہ اُن کے مشترکہ ماخذ کا پتہ بتا دیا گیا ہے کہ دیوناگری ایک ہی طرز تحریر آرامی کی شاخیں کہی جا سکتی ہیں لیکن اردو کے مقابلے میں دیوناگری نے صحیح طور پر اپنی تحریر کے اصول مدوّن نہیں کیے ہیں چونکہ آرامی اور اس کے بعد عربی فارسی جن کی خصوصیات اردو کا ورثہ ہیں ایک عرصے تک حکومتوں اور انتظامات کی زبانیں رہتی ہیں اور ان کے ذریعے کئی مذاہب نے بھی اپنے اصولوں کی تبلیغ کی ہے اس لیے اُن میں عظیم طرز تحریر ہونے کی ساری صلاحیتیں آ گئی ہیں

"جس طرح تجارت کے ساتھ تاجروں کے ملکی جھنڈے سفر کرتے ہیں۔ اسی طرح مذاہب

کے ساتھ ان کا رسم الخط سفر کرتا ہے۔ یہ کلیہ آرامی کے حروف تحریر پر بالکل صادق آتا ہے کہ دُنیا کے پانچ بڑے مذاہب زرتشتیت یہودیت، عیسائیت، بدھ مت اور اسلام نے آرامی کو اپنا کر اس کا رسم الخط کو ساری دنیا کے رسم تحریر کا ماخذ بنا دیا۔"

ڈیوڈ ڈیرنگر۔

تحریر دیوناگری پر تبصرہ مصنف The Alphabet کے قلم سے پہلے آچکا ہے۔ رسم الخط اردو پر تبصرہ باقی ہے اردو کے زبان دانوں اور خطاطی کے ماہرین کا کہنا ہے

کہ اردو رسم الخط آرامی، عربی اور فارسی رسم الخط کے ذریعے سالہا سال کی بتدریج ترقی کے بعد اردو تک پہنچا ہے۔

۲۔ یہ رسم الخط نہایت منظم اور بڑی سوجھ بوجھ کا حامل ہے۔

۳۔ ماہر خطاطوں نے اس پورے رسم الخط کا پانچ بنیادی خطوط ا ب ں ر ل کے ساتھ تین نقطوں کی تنظیم، تین شوشوں اور تین اعراب میں احاطہ کر لیا ہے۔

۴۔ ایک خاص قاعدے کو مدّنظر رکھ کر حروف ملا کر لکھنے سے شارٹ ہینڈ سے بہت پہلے کا ایجاد کردہ شارٹ ہینڈ معلوم ہوتا ہے۔

۵۔ ہر قسم کی آواز کی ادائیگی کے لیے حروف اس رسم الخط میں موجود ہیں۔

۶۔ ایک دفعہ اس کے طرز تحریر سے مانوس ہونے کے بعد اس کا لکھنا اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ کسی تقریر کو ساتھ ساتھ قلم بند کیا جا سکتا ہے۔ مختصر نویسی میں کوئی رسم الخط اردو رسم الخط کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

۷۔ اردو تحریر کا ایک پورا لفظ اکثر زبانوں کے رسم الخط میں لکھے ہوئے ایک حرف کی برابر جگہ گھیرتا ہے۔

۸۔ اردو کے الفاظ اپنے اختصار کے سبب آنکھ میں ایک منفرد نقش چھوڑتے ہیں جس میں Vowels کی تفصیل پر بھی غور نہیں کرنا ہوتا۔ اس طرح اردو کے ہزاروں الفاظ چینی لکھائی کے کیریکٹروں کی طرح منفرد بھی ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پڑھنے والا جب چاہے ہجے کر کے الگ الگ حروف معلوم کر سکتا ہے اور جب چاہے بغیر ہجے کے روانی سے پڑھتا جائے۔

۹۔ زبانوں اور تحریر کے محقق اسلام سے متعلق چار زبانیں شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ اسلامی معلومات اور ادب و تاریخ کا بہت بڑا ذخیرہ انہی زبانوں میں ملتا ہے جن کا رسم الخط عربی ہے یہ چار زبانیں عربی، فارسی، اردو اور ترکی ہیں ۱۹۲۲ء کے بعد ترکی کو جدید بنانے کی دھن میں ترکی کا رسم الخط بدل کر انگریز کر دیا گیا۔ اب ستر سال بعد ترک اپنے عربی نام رومن حروف (انگریزی) میں لکھتے ہیں اور اس کا تلفظ بھی عجیب طرح کرتے ہیں۔ ان کی نئی نسل قرآن کو اس کی اصل زبان میں پڑھ ہی نہیں سکتی۔

اردو زبان بنیادی طور پر [illegible] میں عربی، فارسی الفاظ و اصطلاحات [illegible]

صوفیائے کرام کی تنظیم کے ذریعے فوج میں بھرتی ہونے والوں اور عوام میں تبلیغ کا نتیجہ ہے۔ چونکہ اسلام میں اللہ اور بندے کے درمیان پادری کی طرح کے ملّا، مولوی کا تصور نہیں ہے اس لیے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ ہر شخص قرآن کو خود اس کے اصل ماخذ سے پڑھے اور اسلام کو سمجھے۔ اسی سبب سے قرآن ڈیڑھ ہزار سال سے تحریفوں سے محفوظ رہا ہے، لیکن انگریزی تعلیم مروج ہونے کے بعد سے کچھ جدید شمالی ادارے کے انگلش اساتذہ کے ہاتھ میں چلے جانے سے اور کچھ نوابوں اور رئیس زادوں کی بدطواری کی مثالوں سے، کچھ مشنری اداروں اور کونونٹ اسکولوں کے حقارت آمیز مخالفانہ تنقیدوں سے مسلمانوں کی نئی نسل نے قرآن سے بیگانگی اختیار کرلی۔

آج کے دور میں ہندوستان سے بدھ مت کا صفایا مسلمانوں کے لیے سامان عبرت ہونا چاہیے۔ آج کل بدھ ہندو سماج میں اس طرح ضم ہو چکے ہیں کہ وہ ہندو مت کا ایک حصّہ سمجھے جاتے ہیں حالانکہ بدھ مت عوامی جمہور اور عوامی اقتدار کا علم بردار تھا اور ہندومت شروع ہی سے برہمنوں کی فضیلت اور مخصوص طبقوں کی معاشی اور معیشتی برتری کے اصول پر قائم ہے۔ چند سال سے اردو اکیڈمیوں کے فضیلت مآب دانش وروں نے ہندوستان میں یہ تجاویز پیش کی ہیں کہ:

۱۔ اردو کی کتابیں دیوناگری میں بھی چھاپی چاہییں اور اردو میں بھی۔

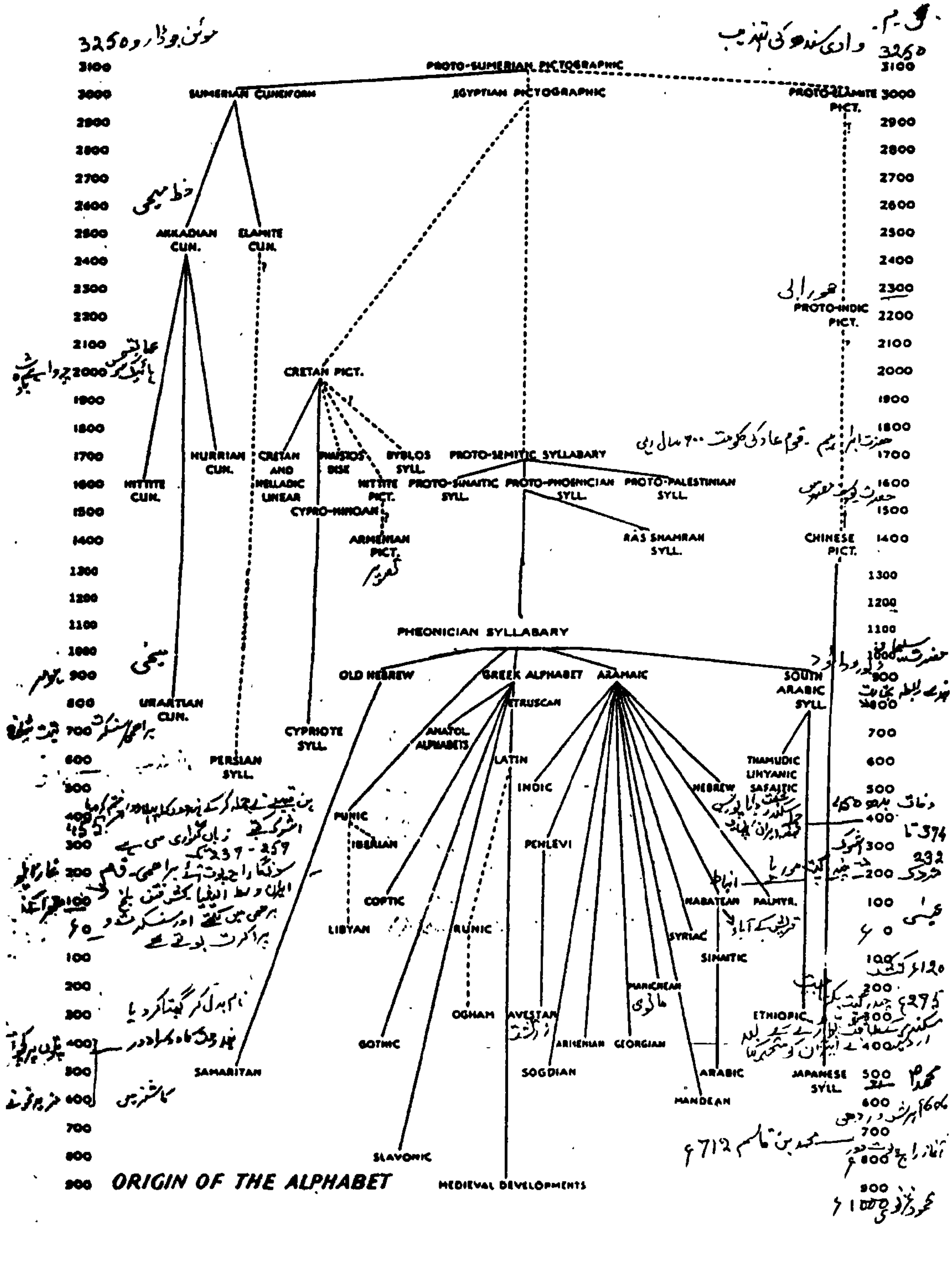
۲۔ اردو کا تمام تحریری سرمایہ دیوناگری میں منتقل کر دینا چاہیے تاکہ اردو بولنے والوں کی نئی نسل جو اردو پڑھ نہیں سکتی صرف بول سکتی ہے اپنے ورثے سے یکسر محروم نہ ہو جائے۔

۳۔ ہندوستان میں دیوناگری سے واقفیت روٹی روزی کے سوال کے تحت ملازمتوں کے حصول میں سہولت کی ضامن ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تجاویز شمالی ہند میں دیوناگری پڑھنے لکھنے والے باشندوں کے لیے مالی سیاسی اور سیکولر رواداری کے لحاظ سے بے حد مفید ہوں گی، لیکن کیا دیوناگری بھی سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان اور مشترکہ رسم الخط ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا اردو کا سارا ورثہ دیوناگری کے سوا باقی تیس بتیس رسم الخطوں میں بھی شائع کیا جائے گا؟ کیونکہ تمام باقی زبانیں دیوناگری سے بھی اتنی ہی دور ہیں جتنی اردو سے۔ اس لیے یہ عمل یعنی رسم الخط بدلنے کا ارادہ رسم الخط کے سوا ترجمے کی حدود میں بھی داخل ہو سکتا ہے جو اردو کے لیے ایک بہت ہی دور رس طریقۂ نشوونما ہوگا۔

ان حالات میں کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ دیوناگری کی سطح پر جو کچھ کیا جائے وہ دیوناگری تحریر کی ترقی کے لیے کیا جائے اور اردو زبان اور اردو رسم الخط کی بقا کے لیے خود اردو والے اپنے ذرائع و وسائل سے ایک تعلیمی پروگرام جاری کریں جس میں والدین اور رائے عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن (ناظرہ اور مطالب کے ساتھ پڑھانا بھی) شامل ہو ہمیشہ سے خاص طور سے انگریزی حکومت کے دور سے اردو تہذیب والوں میں اردو اور قرآن کی تعلیم کا گھروں پر انتظام ہوتا رہا ہے، اس لیے قرآن کو مرکزی حیثیت دینا ضروری ہے۔ کیوں کہ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"ہمیں پھر امام غزالی اور شاہ ولی اللہ



ORIGIN OF THE ALPHABET

کی ضرورت ہے۔"
ساتھ ہی ساتھ تمام زبان دانوں، دانشوروں
اکیڈمیوں کے ڈائرکٹر صاحبان، شاعروں، افسانہ نگاروں
مصنفین، نقادوں اور مقالہ نگاروں کو اس طرف
توجہ دلانی بہت ضروری ہے کہ نئی نسل کے قریب
اگر ان کو اردو پڑھنا اور لکھنا سکھانے سے ان کی ہتک
نہیں ہو جاتی۔ انھیں بھی اپنی فکری کاوشوں کے لیے
اردو بولنے والے نہیں بلکہ لکھنے والے اور صحیح پذیرائی
کر سکنے والے قارئین اور سامعین درکار
ہیں۔

حوالے

1. The Alphabet by David Diringer D. Litt
2. تاریخ ارض القرآن۔ سید سلیمان ندوی
3. قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات۔ ڈاکٹر مجیب اشرف
4. Science of Language. by John. P. Hughes.

"مسلمانوں کے زیر اقتدار عیسائیوں کی
حالت چنداں بے اطمینانی کا موجب نہ تھی
عرب بہت زیادہ روادار تھے۔ انھوں
نے مذہبی معاملوں میں کسی کو ہراساں
نہیں کیا۔ عیسائی اس ضمن میں عربوں کے
ممنون ہیں۔ وہ مسلمانوں کی رواداری کی
اور ان کے عدل و انصاف کی تعریف کرتے۔
اور ان کی حکومت کو جرمنوں اور فرنگیوں
کی حکومت پر ترجیح دیتے۔"

ڈوزی۔

لڑکا یا لڑکی

محمد اسلم پرویز *

زمانۂ قدیم سے ہی انسان کو اولاد کی خواہش رہی ہے اور حالات و ضرورت کے تحت کبھی یہ خواہش لڑکے کی ہوتی ہے تو کبھی لڑکی کی۔ جو لوگ بے اولاد ہوتے ہیں ان کی آرزو ہوتی ہے کہ کسی صورت وہ صاحب اولاد ہوں۔ جن گھرانوں میں بچے ہوتے ہیں وہاں خوش خبری کی توقع کے ساتھ ہی لڑکے کے لیے دعائیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ سماج کو بنانے میں عورت نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے لیکن سماج پر اجارہ داری شروع سے ہی مرد کی رہی ہے۔ سماج میں مرد کی اس اہمیت کی وجہ سے ہی لوگ اولاد نرینہ کی دعائیں کرتے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے لے کر انیسویں صدی تک کے میڈیکل لٹریچر میں پانچ سو سے زائد ایسے طریقے بیان کیے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے والوں کو ان کے حسب منشا جنس کی اولاد مل سکتی ہے۔ قدیم یونان کے طبیبوں کا خیال تھا کہ انسان کے داہنے فوطے سے لڑکا بنانے والا مادّہ نکلتا ہے جب کہ بائیں فوطے سے لڑکی بنانے والا مادہ نکلتا ہے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ اگر اختلاط کے وقت شمال کی سمت منھ رکھا جائے تو لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ اسی دور کے کچھ اور طبیبوں کا خیال تھا کہ پورے یا چڑھتے چاند کے دوران اختلاط سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اور سرد ہواؤں کے دوران بھی لڑکے کی پیدائش کی زیادہ امید ہوتی ہے۔ اس قسم کے بیشمار روایتیں اور نسخے ہم کو میڈیکل تاریخ میں ملتے ہیں لیکن ان کے پیچھے کوئی ٹھوس سائنسی مشاہدہ یا اصول نہیں ہے۔ اس قسم کی لغو و بے معنی باتیں انیسویں صدی تک کافی رائج تھیں لیکن جبھی علم جنسیات کی ترقی کے ساتھ انسان نے حقیقت کو جاننا شروع کیا۔

انسان کا جسم بھی دیگر جانداروں کی طرح ننھے ننھے سیلوں (خلیوں) سے مل کر بنتا ہے۔ جسم میں ان خلیوں کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو کسی بلڈنگ میں اینٹ کی ہوتی ہے۔ جس طرح لاکھوں اینٹیں مل کر اونچی اونچی عمارتیں بناتی ہیں، اسی طرح کروڑوں خلیے مل کر انسان یا کسی بھی جاندار کے جسم کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ خلیے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کو نہ تو آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے نہ محدب شیشے کی مدد سے۔ ان کو دیکھنے کے لیے خوردبین کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح شہد کی مکھی کا چھتا خانوں سے بنا ہوتا ہے، ایسی ہی شکل خلیے کی ہوتی ہے۔ یہ عموماً

---

* لکچرر ڈپارٹمنٹ آف باٹنی۔ ذاکر حسین کالج۔ اجمیری گیٹ۔ دہلی۔

جب کہ مادہ میں دو ایکس ہوتے ہیں۔ لہذا انڈوں میں تو صرف ایکس موجود ہوں گے جب کہ اسپرم (نر جنسی خلیے) دو طرح کے ہوں گے۔ وائی والے اور ایکس والے۔ انسان کی منی میں دونوں طرح کے اسپرم ہوتے ہیں۔ سائنس دانوں کے مطابق ایک عام آدمی کی منی میں ۵ء۵۱ فی صد وائی اور ۵ء۴۸ فی صد ایکس کروموزوم والے اسپرم ہوتے ہیں۔ اختلاط کے دوران (یا بعد میں) اگر ایکس کروموزوم والا اسپرم انڈے سے مل جاتا ہے تو یہ دو ایکس ہو گئے۔ یعنی ایک ایکس اسپرم میں تھا اور دوسرا ایکس تو انڈے میں ہوتا ہی ہے۔ دو ایکس کروموزوم کے ملنے سے چونکہ لڑکی بنتی ہے۔ اس لیے اس اختلاط سے وجود میں آنے والا بچہ مادہ ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر وائی کروموزوم والا اسپرم انڈے سے پہلے ملنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو دونوں مل کر ایکس وائی بن جاتے ہیں۔ یعنی وائی کروموزوم اسپرم سے آیا اور انڈے میں تو ایکس ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ ایکس وائی کروموزوم مل کر نر بناتے ہیں۔ اس لیے اس عمل سے لڑکا بنتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ لڑکا اور لڑکی بننے یا بنانے کا فارمولا ہے جسے ایسے لکھا جاسکتا ہے۔

لڑکی = X انڈے میں موجود + X اسپرم میں موجود

لڑکا = X انڈے میں موجود + Y اسپرم میں موجود



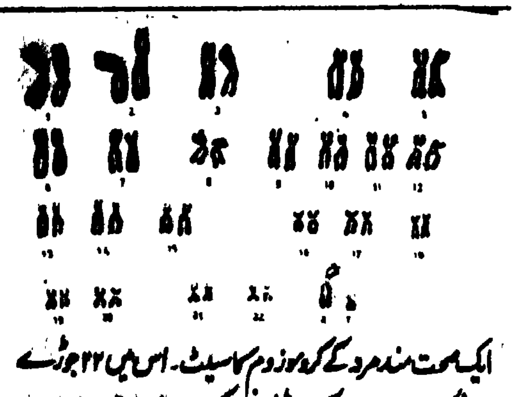
ایک صحت مند عورت کے کروموزوم کا سیٹ۔ اس میں بھی ۲۲ جوڑے جسمانی کروموزوم اور ایک جوڑا جنسی کروموزوم کا ہوتا ہے لیکن اس جوڑے میں دونوں کروموزوم ایکس قسم کے ہوتے ہیں۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورت میں لڑکا یا لڑکی دونوں کو ہی بنانے یا پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اصل چیز یہ ہے کہ مرد کا کون سا اسپرم اس کے انڈے سے جڑتا ہے اگر وائی والا جڑ گیا تو لڑکا ورنہ لڑکی۔ یہاں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ لڑکا یا لڑکی کی پیدائش کی اصل ذمہ داری مرد پر ہے نا کہ عورت پر۔ یعنی اگر کسی عورت کے صرف لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں، یا پہلی لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کے لیے عورت کو کسی بھی طرح ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اصل میں تو کوئی بھی ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے لیکن اگر کسی پر ذمہ داری آتی بھی ہے تو مرد پر آتی ہے۔ کیونکہ اگر لڑکی پیدا ہوئی ہے تو وہ مرد کے ایکس اسپرم کا نتیجہ تھی۔ عورت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ لاعلمی کی وجہ سے اکثر گھروں میں اس قسم کی لغو اور بیہودہ باتیں سننے کو ملتی ہیں جن میں عورت پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے لڑکی پیدا کر دی۔ حقیقت جاننے کے بعد



نر اور مادہ جنسی خلیے جن کے ملنے کا عمل اگلی تصویر میں دکھایا گیا ہے۔

گول، لمبوترا یا چوکور رہتا ہے۔ اس کے اندر ایک رقیق گاڑھا مادہ بھرا رہتا ہے جس کے اندر دیگر ننھے ننھے عضلات ہوتے ہیں۔ ہر خلیے کے بیچ میں ایک چھوٹی گیند کی شکل کا عضلہ ہوتا ہے جس کو نیوکلیس کہتے ہیں۔ اس کے اندر دھاگے کی مانند ایک اور چیز ہوتی ہے جس کو کروموزوم کہا جاتا ہے۔ ہر جاندار کے اندر کروموزوم کی تعداد مقرر اور یکساں ہوتی ہے۔ مثلاً ایک بلی کے جسم کے ہر خلیے میں ۳۸ کروموزوم ہوں گے جب کہ چوہیا میں یہ ۴۰ ہوتے ہیں۔ پیاز کے پودے کے ہر خلیے میں ۱۶ کروموزوم اور تمباکو کے پودے میں ۴۸ کروموزوم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کروموزوموں کی شکل، مزاج اور کیمیائی ترتیب بھی یکتا ہوتی ہے۔ اس طرح انسان کے جسم میں ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں۔ یہ ہمیشہ جوڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی انسان کے جسم میں ۲۳ جوڑے کروموزوم ہوتے ہیں (پیاز میں ۸ جوڑے ہوں گے) ہر جاندار کے مزاج، شکل اور خواص کی تفصیل کروموزوم میں ہی ہوتی ہے۔ انسان کے جسم میں جو ۲۳ جوڑے کروموزوم پائے جاتے ہیں ان میں سے ۲۲ جوڑے جسم کے بقیہ افعال کو کنٹرول کرتے ہیں جب کہ ۲۳واں جوڑا جنسی پہچان قایم کرتا ہے۔ اس جوڑے کے کروموزوم جنسی کروموزوم کہلاتے ہیں۔ عورت کے جسم میں صرف ایک قسم کے یعنی ایکس قسم کے جنسی کروموزوم ہوتے ہیں جب کہ مرد کے اندر دو طرح کے جنسی کروموزوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے بڑے والے کو ایکس اور چھوٹے کو وائی کروموزوم



ایک صحت مند مرد کے کروموزوم کا سیٹ۔ اس میں ۲۲ جوڑے جسمانی کروموزوم اور ایک جوڑا جنسی کروموزوم کا ہوتا ہے جس میں ایک ایکس اور وائی کروموزوم ہوتا ہے

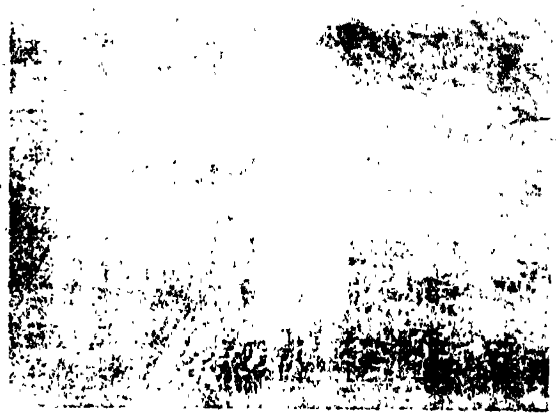
کہلاتا ہے۔ (تصویر دیکھیں)۔

بالغ انسان کے اعضائے تولید میں جب خلیے ایک خاص قسم کی تقسیم سے گزرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بننے والے خلیوں میں صرف آدھے کروموزوم ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ ہر کروموزوم کے جوڑے میں سے ایک کروموزوم ایک خلیے میں اور دوسرا کروموزوم دوسرے خلیے میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح ایک خلیے سے دو خلیے بنتے ہیں جن میں ۲۲ کروموزوم جسمانی اور ایک کروموزوم جنسی قسم کا ہوتا ہے۔ چونکہ عورت کے جسم میں دونوں جنسی کروموزوم یکساں یعنی ایکس قسم کے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے بننے والے تمام خلیوں میں ایکس لازمی موجود ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مرد کے سیل میں چونکہ ایک ایکس اور ایک وائی قسم ہوتی ہے۔ اس لیے تقسیم کے بعد ایک خلیے میں ایکس اور دوسرے میں وائی کروموزوم ہوتا ہے۔ یہی خلیے جنسی خلیوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ مادہ میں یہ خلیے انڈے کہلاتے ہیں، جب کہ نر کے جنسی خلیے اسپرم کہلاتے ہیں جو کہ ایک رقیق مادے کے ساتھ مل کر بہتے ہیں۔ مادہ خلیہ یا انڈا عموماً گول ہوتا ہے جب کہ نر خلیہ مختلف شکلوں کا ہو سکتا ہے لیکن عام طور سے اس کا ایک لمبوترا بیضوی سرا اور ایک دم ہوتی ہے۔ دم کی مدد سے یہ تیر سکتا ہے (تصویر دیکھیں)۔ ہم جانتے ہیں کہ مرد کا جسم ایکس اور وائی سے مل کر بنتا ہے

ایسی بےتکی باتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔

لڑکے یا لڑکی کے بننے کی تفصیل جاننے کے بعد سائنس دانوں کا یہ خیال ہوا کہ اب اس قدرتی عمل کو قابو میں کس طرح کیا جائے۔ اس کے لیے مرد کے اسپرم پر تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ وائی کروموزوم رکھنے والے اسپرم نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں اور تیز رفتار ہوتے ہیں اور ان کا وزن بھی کم ہوتا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں امریکہ کے ایک سائنس داں ڈاکٹر رونالڈ ایرکسن نے سب سے پہلے منی سے ایکس اور وائی قسم کے اسپرم الگ کیے تھے۔ اس کام کے لیے انھوں نے کچھ خاص قسم کی کیمیائی چھلنیاں بنائی تھیں جن سے وائی کروموزوم والے اسپرم اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے پہلے نکل گئے جب کہ سست رو ایکس کو پیچھے رہ گئے۔ اس طرح یہ دونوں قسمیں الگ ہو سکیں۔ ان سائنس دانوں نے اپنی طرح کے دیگر طریقوں سے ایکس اور وائی والے اسپرم الگ کر کے احتیاط سے رکھ لیے پھر ان کی مدد سے عورتوں کو مصنوعی طریقوں سے حاملہ کیا گیا جس کے نتیجے میں مطلوبہ جنس کا بچہ پیدا ہوا۔ اب تک اس قسم کے تجربوں میں سو فیصد کامیابی تو نہیں ملی ہے لیکن ۸۰ فی صد معاملات میں حسب خواہش بچہ پیدا ہوا ہے۔ اس وقت دنیا میں ایسے کئی مراکز ہیں جہاں یہ کام ہوتا ہے

ان میں سے ایک مرکز ہندوستان میں بمبئی میں بھی ہے۔ ڈاکٹر رونالڈ ایرکسن نے امریکہ میں کیلی فورنیا کے مقام پر گیمیٹرکس (Gametrics) لمیٹڈ کے نام سے ایک کمپنی کھول رکھی ہے، جہاں انسانوں اور دیگر جانوروں کی منی سے وائی کروموزوم والے اسپرم الگ کر کے ان سے اولاد پیدا کی جاتی ہے۔ آج کل سائنسی حلقوں میں یہ ایجاد بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ کچھ محققین کا کہنا ہے کہ اس کے غلط استعمال سے لوگ صرف اولاد نرینہ ہی پیدا کریں گے جس کی وجہ سے آبادی کا جنسی توازن بگڑ جائے گا جس کے نتیجے میں اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ دوسری طرف کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس کی مدد سے لوگ اپنی مرضی کا بچہ پیدا کر کے مزید بچوں کی پیدائش کو بلا خوف روک سکیں گے۔



اسپرم اور جنسی خلیہ (انڈے یا مادہ جنسی خلیہ) سے ملتے ہوئے۔ اس عمل کے نتیجے میں تخم یا نطفہ بنتا ہے جو اگلی نسل کی شروعات ہوتی ہے۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ لڑکے کی چاہ میں لڑکیاں اور لڑکی کی خواہش میں لڑکے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں جن سے خاندان پر بلا وجہ کا بوجھ پڑتا ہے۔ اگرچہ بحث جاری ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سائنس کی ہر دین اگر صحیح نیت اور مقصد سے استعمال ہو تو وہ رحمت ہے ورنہ پھر اس سے زیادہ تباہ کن بھی کوئی چیز نہیں لیکن چونکہ ایسی سائنس اور ایجادات تیزی سے پھیل رہی ہیں اس لیے آبادیوں میں جنسی توازن برقرار رکھنے کا صرف یہی طریقہ ہوگا کہ حکومت شادی کے وقت ہی نو بیاہتا

باقی صفحہ نمبر ۳۶ پر ملاحظہ فرمایئے۔

ماحول کا تعلیم و تربیت پر اثر

مقبول احمد *

اکثر ایک یا چند خاندانوں، شہر کے کسی حصے، گاؤں یا قصبوں میں کچھ ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے کہ صلاحیت اور قابلیت کو سامنے ابھرنے میں کافی آسانی ہوتی ہے۔ اس کی بہترین مثالیں، لکھنؤ میں فرنگی محل اور ندوہ، دیوبند میں دارالعلوم کے قریب کے محلوں کے خاندان، اعظم گڑھ کے چند گاؤں، بلگرام بہار میں ہیں۔ انگلینڈ میں آکسفورڈ و کیمبرج، امریکہ میں ہاورڈ اور کیلی فورنیا وغیرہ۔ یہ ماحول آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے مگر ایک دفعہ ہو جانے پر قابلیت اور اہلیت کو بڑھانے میں بڑا معاون ہوتا ہے۔

اس لیے بچوں کو اچھے ماحول کی سخت ضرورت ہے تاکہ ان کی صلاحیتیں اور قابلیتیں ابھر سکیں۔ ایک معین کی ہوئی پرسکون جگہ جہاں شور و غل نہ ہو، کمرہ چھوٹا ہی سہی مگر روشن اور بارونق ہو، ضروری ہے، تاکہ وہ پرسکون طور پر پڑھ سکیں۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ وہ کیا اور کیسی کتابیں پڑھ رہے ہیں، اس پر نظر رکھا جائے۔

ان میں شروع سے یہ عادت ڈالنی چاہیے کہ اپنے سبق کی مشکلوں کا حل وہ اسکول ہی میں اپنے استادوں سے رجوع کرکے پوری طرح دور کرلیں۔ اس کے لیے ان کے دل میں جھجک نہ ہونی چاہیے۔ والدین کا فرض ہے کہ جب بچے اسکول سے واپس ہوں تو ان کی کتابوں، کاپیوں اور نوٹس پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ اسکول میں کیا کر رہے ہیں۔ تعلیم بالغان کے بہت سے فائدوں کے علاوہ، یہ بھی ایک فائدہ ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

پڑھے لکھے والدین کا فرض ہے کہ اپنی استعداد کے مطابق ان کی مدد کریں اور ہوم ٹاسک کے وقت معین وقت پر ان کا موجود رہنا منافع بخش ہوگا ہو سکتا ہے کبھی کبھی، کسی اچھے استاد کی مدد ضروری ہو لیکن ٹیوشن کی ضرورت بہت کم پڑنی چاہیے۔ اصولاً اس سے دریغ کیا جائے۔ اونچے درجوں کے بچوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کی مدد کریں اور ایک اچھی روایت قایم کریں۔ کبھی کبھی سخت مضامین کو اگر ۲ یا ۳ بچے ساتھ مل کر پڑھیں تو کچھ آسانی ہو جاتی ہے بچوں کے اسکول اور محلے کے ساتھی، شریف دین دار ہوں اور ان کی استطاعت قریب قریب برابر

* سابق پروفیسر این آر ایس میڈیکل کالج، کلکتہ ۹۔ رپن سٹریٹ، کلکتہ۔

ہوتا کا احساس کمتری نہ ہو۔ احساس خودی کی بیداری اور بلندی کی بے حد ضرورت ہے جو کہ خود اعتمادی اور خدا پرستی اور سنت پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ "پدرم سلطان بود" پر۔

گھروں کے ماحول کو اس طرح بدل دیا جائے کہ شعر پڑھنے کی روایت پیدا ہو جائے جس طرح کہ بچے فلمی گانوں پر جان دیتے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ اچھے ماحول میں اور اچھی روایتوں سے علم کے فدائی ہو جائیں۔ اس کے لیے اصلاح معاشرہ و ماحول از حد ضروری ہے۔

ایک زمانے میں اگر مسلمان بچے علم حساب میں اچھے ہوتے تو ان کو "بنیا" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر کچھ ضروری چیزیں حفظ کرنے تو "رٹو طوطا" کہلاتا ہے۔ اس سے ان کی ہمت شکنی ہوتی ہے۔ یہ سب بند کرنا ہوگا۔

گھروں میں اچھی اور شستہ کتابوں کی بھرمار ہونا چاہیے جن کا تعلق مذہب، اخلاقیات، تاریخ اور دیگر مضامین سے ہو۔ کتابیں اچھی ہوں اور بہت ساری ہوں اور بہت قسم کی ہوں۔ خالی وقتوں میں ان کو سرسری نظر سے دیکھنے سے بھی فائدے ہیں اس سے بچوں میں ذوق مطالعہ پیدا ہوتا ہے۔ فحش کتابوں رسالوں اور اشتہارات کا گھر میں گذر بھی نہ ہو۔ وقت کی پابندی اور اچھی کتابوں کے مطالعے سے ہی علم کی پختہ بنیاد پڑتی ہے۔

"پارٹیوں" کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ کیونکہ پارٹیوں میں جا کر مغرب سے پہلے واپس آجانا تو خیر بری بات نہیں مگر مخلوط پارٹیوں میں جانا کسی طرح گوارا نہ کیا جائے یہیں سے تمام برائیوں اور بری عادتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ فحش ناولوں کا تذکرہ، فحش کتابیں کا پڑھنا، سگریٹ، شراب، سینما دیکھنا، وی۔سی۔آر، منشیات کی عادت اور دیگر بری باتیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ مگر باوجود تمام پابندیوں کے جب تک بالآخر کا احساس بچوں میں خود نہ پیدا ہو، ان سے مستقل بچنا محال ہے۔ اسی لیے مذہبی اور اخلاقی تعلیم اور گھروں کے ماحول اور اصلاح معاشرہ سخت ضروری ہے۔

آج کل ٹی وی، وی۔سی۔آر فلمیں عام ہیں۔ ان کا اثر تو خیر بچوں پر بڑی تیزی سے ہوتا ہے۔ سرمایہ داروں کی ہوس اور ان کو مقبول عام بنانے کی کوشش کی وجہ سے ان کی اخلاقی سطح گری ہوتی ہے جو قابل قبول نہیں۔ نیز اس چکر میں بچوں کا کافی وقت برباد چلا جاتا ہے۔ ان پر سخت کنٹرول کی ضرورت ہے اگر ضرورت ہو تو قفل بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اکثر ان کی اس قدر بلند آواز ہوتی ہے کہ نہ تو وہ لکھ پڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی ٹھیک سے سونا ہوتا ہے۔ اس حالت میں اگر امتحانات سر پر ہوں تو کیا حال ہوگا۔

بچوں کا کافی وقت اسکول میں صرف ہوتا ہے اس لیے ان کا معیار، اچھا ہونا ضروری ہے۔ اچھے اور معیاری اسکولوں میں ہمیشہ داخلے کی کوشش کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں مسلمانوں کے لیے معیاری اسکولوں میں رزرویشن ضروری ہے۔ ترقی کی بنیاد یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

بچوں کے لیے ان کے گھروں میں دلچسپی کے سامان مہیا کرنا چاہیے تاکہ اگر ماحول ساز گار نہ ہو تو بچے اپنے گھر میں کھیل کود اور تفریح کر سکیں۔ ایک زمانے میں کھاتے پیتے گھروں میں اتالیق کا رواج تھا ضروری ہے کہ اس کو پھر رائج کیا جائے۔ آج کل اکثر و بیشتر ناممکن نہیں ہوتا۔ اگر ہو سکے تو بڑا نافع ہوگا۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے تعلیمی وظیفے

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دہلی نے اپنی ٹیلنٹ سرچ اسکیم کے تحت ۱۹۹۴ء تعلیمی سال کے دوران قرض وظیفہ جاری کرنے کے لیے درخواستیں وصول کرنا شروع کر دی ہیں۔ قرض وظیفہ کے لیے صرف وہی مسلم طلبا درخواست بھیجیں جنھوں نے دسواں درجہ کم سے کم ۸۰ فی صد، بارہواں یا اس کے مساوی امتحان ۷۵ فی صد اور بی اے، بی ایس سی اور ایم اے ایم ایس سی وغیرہ ۷۰ فی صد نمبروں سے پاس کیا ہو، وظیفہ اسی ترتیب سے ۲۵۰ روپیے، ۳۵۰ روپیے اور ۵۰۰ روپیے ماہانہ دیا جائے گا۔

وظیفہ کی اسکیم، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے اپنے صدر حکیم عبدالحمید صاحب کے ایما پر ۱۹۸۶ء میں شروع کی تھی تاکہ ہندوستانی مسلمان، جو تعلیم میں بہت پچھڑے ہوئے ہیں، انھیں بھی دوسرے ہم وطنوں کی طرح تعلیمی میدان میں آگے لایا جائے اور وہ تعلیمی پس ماندگی سے نکل کر ملک کی تعلیم و ترقی میں زیادہ موثر کردار ادا کر سکیں۔ ۱۹۸۶ء سے اب تک ۱۹۹ مسلم لڑکے لڑکیاں اس اسکیم سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔ یہ طلبا جن ریاستوں سے تعلق رکھتے ہیں ان میں اتر پردیش، اڑیسہ، آسام، آندھرا پردیش، بہار، پانڈیچری، پنجاب، تامل ناڈو، جموں و کشمیر، چنڈی گڑھ، دہلی، راجستھان، کرناٹک، کیرالا، گجرات، گوا، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال، مہاراشٹر اور ہریانہ شامل ہیں۔

جو مسلم طلبا ان وظیفوں میں دلچسپی رکھتے ہیں اور تعلیم کا سلسلہ کسی مستند تعلیمی ادارے میں کم از کم ۹۵-۱۹۹۴ء تعلیمی سال تک جاری رکھ رہے ہیں، وہ سکریٹری، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۲ کے نام خط بھیج کر مقررہ درخواست فارم اور شرائط کا سرکلر منگوا سکتے ہیں۔ بھرے ہوئے فارم ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ء تک وصول کیے جائیں گے۔ جانچ کے بعد جن طلبا کے نمبر اپنی اپنی ریاستوں میں سب سے زیادہ ہوں گے، سوسائٹی انھیں اپنے خرچ پر نومبر ۱۹۹۳ء میں کسی وقت دہلی بلائے گی۔ دہلی میں دو دن قیام کرانے کے دوران ان کا انگریزی میں تحریری امتحان، معلومات عامہ (جنرل نالج) کا امتحان اور انٹرویو لیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی وظیفوں کا فیصلہ ہوگا۔ جو طلبا کامیاب ہوں گے انھیں ایک بانڈ بھر کر دینا ہوگا کہ تعلیم مکمل کرنے کے زیادہ سے زیادہ دو سال بعد سے قرض وظیفہ کی رقم وہ ماہ بہ ماہ انھیں قسطوں میں واپس کرنا شروع کر دیں گے جن قسطوں میں انھیں ملی ہوگی۔ منظور شدہ وظیفے کی رقم کی ترسیل جنوری ۱۹۹۴ء سے شروع ہو جائے گی۔ وظیفہ پانے والے طالب علموں کی تعلیمی پیش رفت کا ہر سال احتساب ہوگا اور صحیح پائے جانے پر ضرورت کے مطابق وظیفے کی میعاد اور رقم میں اضافہ کیا جائے گا۔

سید حامد

سکریٹری، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی

تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی، 110062

ہماری ایجنسیاں

۱۔ میسرز بک امپوریم
سبزی باغ۔ پٹنہ بہار

۲۔ میسرز مکتبہ معروف الاسلام
ریاض الدین امیر محمد۔
جمعیتہ کالونی۔ انصار محلہ
روم نمبر ۶۸۔ فورتھ۔ نظام پورہ
بھیونڈی۔ تھانے۔ مہاراشٹر

میسرز احمد حسین
جمال بک ڈپو
باری روڈ
گیا۔ بہار

میسرز مکتبہ عمر
بک سیلر اینڈ نیوز پیپر
مدینہ مسجد کمپلکس
بیجاپور۔

میسرز ثنائی بک ڈپو
پرانا قلعہ۔ سیوان بہار۔

میسرز کتاب سینٹر۔
شمشاد مارکیٹ۔ اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

میسرز آزاد کتاب گھر
ساکچی بازار۔ جمشید پور۔

میسرز طالب حسین
ایف ڈی ہائر سکنڈری اسکول
کاٹھ دروازہ
مراد آباد۔ اترپردیش

میسرز صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ
وارث پورہ۔
کامیٹی۔ مہاراشٹر۔

میسرز مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ
پرنسز بلڈنگ
ای۔ آر۔ روڈ۔ بمبئی۔

میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ بغیہ۔ فیروز آباد۔ یو۔ پی

میسرز ایجوکیشنل بک ہاوس
شمشاد مارکیٹ
اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

میسرز فردوسی کتاب گھر
بک سیلر اینڈ پبلشرز۔
بھوسپا چوک ۔ دھرواد

میسرز اسلامک بک سینٹر
جامعہ کمپلکس ۔ ایم آر۔ روڈ۔ بنگلور۔

میسرز محمد شمیع معرفت خورشید بک اسٹال
پار نوادہ ۔راجی روڈ۔ نوادہ

میسرز مکتبہ اسلامی
اپوزٹ بنے میاں درگاہ، شاہ گنج اورنگ آباد

میسرز اسلامیہ بک سیلر اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ
نیو مارکیٹ۔ ٹاٹا پور چوک ۔
بھاگلپور سٹی۔ بہار۔

میسرز النور بک ایجنسی
ہاوس نمبر ۱۔ ۱۱۔ ۱۱۷۔ ستان پورہ۔ ناندیڑ

میسرز صابری کتاب گھر
صابری محل ٹپہ ۔ شاہ آباد
گلبرگہ ۔ کرناٹک

میسرز سینٹرل نیوز ایجنسی پرائیوٹ لمیٹڈ
پوسٹ بکس ۲۱۴ ۔ نیو دہلی۔

میسرز سلطان بک ڈپو
ڈیزائن اینڈ پورٹریٹ ۔ ایم۔ بی اسکول۔ گیا۔

میسرز عبدالقیوم
اردو لائبریری۔ تحصیل گیٹ
گھنٹہ گھر۔ بدایوں

میسرز کتاب محل
تکیہ ۔ اعظم گڑھ۔

میسرز کریسنٹ بک
اردو بازار۔ دربھنگہ۔ بہار

میسرز مسٹر آر۔ ڈی۔ کے
معرفت اے۔ ڈبلیو خان
چارج مین ۵۸۴ وہیکلس فیکٹری۔ جبل پور۔

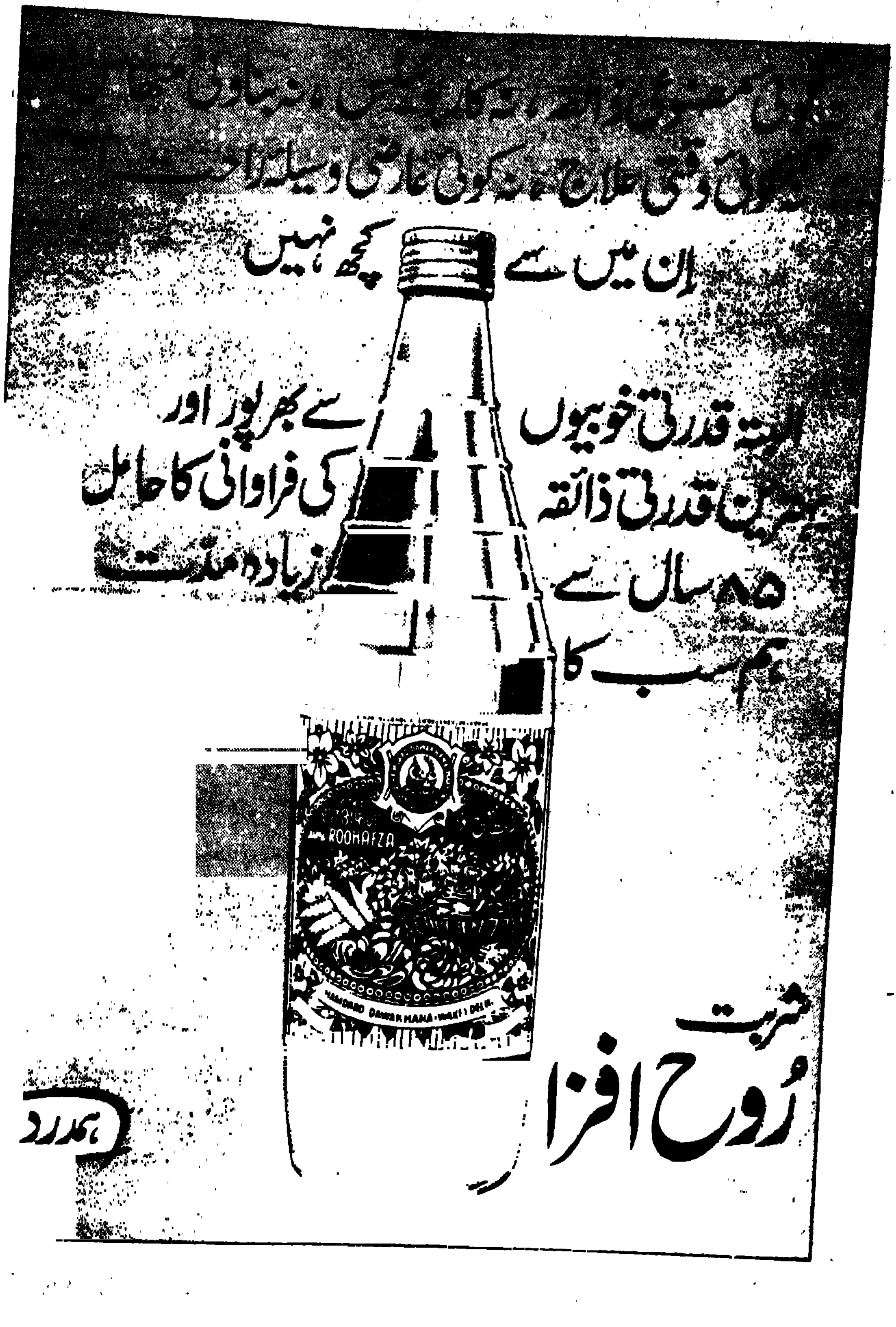
میسرز آزاد بک ڈپو
مین روڈ ۔ مدھوبنی۔ مدھوبنی، بہار۔

میسرز ایم ایچ بک سیلر
ہول سیلر اینڈ ریٹیلر۔ رحم گنج۔ دربھنگہ۔

میسرز ریان المن
ایجوکیشنل سوسائٹی۔ اسلام پورا
عادل آباد۔ (مہاراشٹر)

میسرز معرفت ایم وہاب قمی
بسیرا بھون۔ سی پی آئی آفس۔ گوڈا۔ بہار

میسرز راشد قریشی۔
۱۱-۴-۱۶۱۴-سکنڈ فلور۔ حیدرآباد۔


نہ کوئی وقتی علاج ، نہ کوئی عارضی وسیلہ راحت
ان میں سے کچھ نہیں
البتہ قدرتی خوبیوں سے بھرپور اور
بہترین قدرتی ذائقہ کی فراوانی کا حامل
۸۵ سال سے زیادہ مدت
ہم سب کا
ROOHAFZA
HAMDARD DAWAKHANA (WAKF) DELHI
شربت
روح افزا
ہمدرد

جلد ۱۲

شمارہ ۷

MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جولائی ۹۳ء

زر سالانہ :

انڈیا ... Rs. 45-00

بیرونی ممالک ... US $ 20.00 ہوائی ڈاک

US $ 9.00 بحری ڈاک

*

ترسیل زر کا پتہ :

مینیجر، تہذیب الاخلاق نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

EDITOR,

TAHZIBUL AKHLAQ &

NISHANT,

ALIGARH MUSLIM

UNIVERSITY,

ALIGARH. 202002

PHONE : 24827

* بانی

سرسید احمد خاںؒ

* سرپرست :

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

* مدیر

کبیر احمد جائسی

* نائب مدیر :

احمد مجتبیٰ قریشی

* انچارج سرکولیشن :

شفیق احمد

* ترتیب : سرفراز

مندرجات

(تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ مسلم یونیورسٹی ہر حال ان سے متفق ہو)

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ - پرنٹر پبلشر: کبیر احمد جائسی - مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ
نشانات - اے ایم یو - علی گڑھ - مطبع: اے ایم یو پریس - علی گڑھ

اداریہ

ایک زخم اور لگا۔ ۱۲؍۱۳ جون کی درمیانی شب میں ڈاکٹر چودھری رفعت اللہ خاں چیرمین ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن، جے این میڈیکل کالج مسلم یونیورسٹی نے اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۲؍جون کی شام بلکہ رات تک جن لوگوں نے ان کو پیکرِ حرکت بنا دیکھا تھا وہی لوگ ۱۳؍جون کی شام کو ان کے جسدِ خاکی کو یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر آئے۔ بے بس بزرگوں، دوستوں، شاگردوں اور چاہنے والوں نے آخری نذرانے کے طور پر تین مٹھی مٹی ان کی لحد میں ڈالی اور اپنے اپنے گھروں کو واپس آگئے۔ یہی ہوتا رہا ہے اور تا قیامت ہوتا رہے گا۔ آخری نذرانۂ محبت یا زندگی بھر کی محبت کا صلہ صرف تین مٹھی مٹی ہی تو مقرر ہے اور کچھ بھی نہیں۔ مٹی کا بلاوا کتنا سچا، کھرا مگر الم ناک ہے۔

انسان چلا جاتا ہے تو اس کی بہت سی وہ باتیں یاد آتی ہیں جو اس کی زندگی میں ہم کو قطعی غیر اہم اور معمولی نظر آتی ہیں۔ رفعت اللہ خاں کے مزاج میں بڑی تیزی اور عجلت تھی، تیز رفتاری سے چلنا، جلدی جلدی باتیں کرنا، بڑی ہی تیز رفتاری کے ساتھ موٹر چلانا، اپنی انگلیوں کو بہت ہی تیزی سے حرکت دیتے ہوئے مریضوں کو دیکھنا، سرعت اور تیز رفتاری سے کسی فیصلے پر پہنچنا یہ چیزیں ان کی شخصیت کا اس طرح سے حصہ بن گئی تھیں کہ ان کی زندگی میں ان کے غیر معمولی ہونے کی طرف ہمارا ذہن بھی نہ جاتا تھا مگر ان کی موت کے بعد اب خیال ہوتا ہے کہ ان کے مزاج کی یہ تیزی اور عجلت بے معنیٰ نہ تھی بلکہ خاص مقصد کے تحت ان کی طبیعت میں ودیعت کی گئی تھی، ان کی عمر کارکنانِ قضا و قدر نے ۴۸ سال آٹھ ماہ مقرر کی تھی اور اسی عمر میں ان کو وہ تمام کام کرنے تھے جو پچاس سال کی عمر پانے والے بہت سے لوگوں کے سپرد نہیں کیے جاتے اسی لیے وہ عجلت کے ساتھ اپنے تمام کام انجام دیتے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تحت الشعور میں یہ احساس پوشیدہ تھا کہ عرصۂ زندگی کم اور کام بہت ہیں، اس لیے سارے کام جلدی جلدی نمٹانے میں مصروف رہتے۔ وہ اس عجلت

اور تیزی کے باوجود جس کام کو بھی کرتے اس کے معیار پر اُن کی نظر رہتی اور ہر کام کو خوب سے خوب تر طور پر انجام دینے کی کوشش کرتے چاہے وہ پریکٹر شپ ہو یا ہیلتھ اسکیم کا کام یا مریضوں کا دیکھنا یا اسٹاف ایسوسی ایشن کی ذمہ داری۔ ہر جگہ تیزی اور عجلت کے باوجود معیار پر ہمیشہ ان کی نظر رہی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ لوگوں میں خاصے مقبول رہے۔

ان کی پیدائش مشرقی یوپی کے ایک ضلع گونڈہ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد ثانوی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں حاصل کی اور وہاں سے ہائی اسکول کیا۔ بعدازاں علی گڑھ آ گئے۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد کی ان کی ساری تعلیم علی گڑھ ہی میں ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے میڈیکل کالج کے فارغین کا جو پہلا بیچ نکلا اُن میں رفعت اللہ بھی شامل تھے، کشمیر ہاؤس نامی ہوسٹل میں رہائش کے لیے جو پہلا بیچ اس کا مکین بنا اُن میں بھی رفعت اللہ موجود تھے۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے امتحان میں پہلا تمغۂ امتیاز پانے والے بھی یہی رفعت اللہ تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد خوش قسمتی سے ان کا تقرر یہیں کے میڈیکل کالج میں ہو گیا۔ اسی میڈیکل کالج میں انھوں نے ترقی کے سارے زینے طے کیے۔ پروفیسر اور صدر شعبہ بنے، اسی میڈیکل کالج کے ایک کمرے میں انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور مرکر ہی اس سے جدا ہوئے۔

جانے والوں کی یاد بھولے بسرے آہی جاتی ہے مگر بعض جانے والے ایسے ہوتے ہیں جو برابر یاد آتے ہیں، رفعت اللہ بھی اُن لوگوں کو برابر یاد آئیں گے جن کا اُن سے ذرا سا بھی تعلق خاطر رہا ہے، چاہے وہ مریض کی حیثیت سے ہو، چاہے شاگرد کی حیثیت سے۔ چاہے رفیق کار کی حیثیت سے ہو چاہے دوست کی حیثیت سے رفعت اللہ کی یاد برابر آکر دلوں کو تڑپاتی رہے گی۔ واقعی اور حقیقی زندگی تو یہی ہے جو خواہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ اپنے بعد اپنی اَن مٹ یادیں چھوڑ جائے اور مرنے کے بعد بھی آشنا و بیگانہ کو اپنے وجود کا احساس دلاتی رہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی اہلیہ اور بچیوں کو صبر جمیل کی دولت عطا فرمائے اور ان کی خدمتِ خلق کے بدلے میں ان کو ابدی راحت نصیب کرے۔ آمین

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۷، (جولائی ۱۹۹۳ء)

ہندوستان کے معزز خاندان

سرسید احمد خاں ؒ

جو عنوان ہم نے اس مضمون کے واسطے تحریر کیا ہے گو بادی النظر میں اس کو دیکھنے سے ہندوستانیوں کو ایک نوع کی خوشی ہوگی اور ان کو اپنی عزت کے تصور کرنے کا موقع ملے گا لیکن جب وہ ہمارے اس مضمون کو نظر بصیرت سے دیکھیں گے تو بلاشبہ ان کو نہایت افسوس ہوگا۔ ہر ملک کے شرفا اس ملک کی عزت اور رونق اور کمال کا باعث ہوتے ہیں مگر ہم کو افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے شرفا کی حالت موجب ذلت و رسوائی ہے۔ جب ہم ان ملک کے نامی گرامی خاندانوں پر نظر ڈالتے ہیں جو ایک زمانے میں معدن علم و ہنر و مخزن فضل و کمال تھے تو اب وہی خاندان سب سے زیادہ ننگ و عار معلوم ہوتے ہیں اور جن لوگوں کے آبا و اجداد نے صرف علم و عقل کے سبب سے کبھی شرف حاصل کیا تھا وہی لوگ اب علم و عقل سے ایسے بے بہرہ ہیں کہ ان کو ننگ خاندان کہنا کچھ بے جا نہیں ہے مگر نہایت افسوس ہے کہ اب تک ایسے لوگوں کو اپنی خاندانی عزت اور قدیم عزت کی بربادی کا کچھ افسوس نہیں ہے بلکہ وہ بالکل نشہ غفلت میں سرشار ہیں اور جہل و خام فہمی کے مرض میں مبتلا ہیں بہت زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ جس قدر ان کے فضل و کمال اور خاندانی اعزاز کی کمی ہوجاتی ہے اسی قدر ان کے دماغ نخوت و تکبر کے بدبودار دھوئیں سے سیاہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہ ایک نہایت افسوس کے لائق حالت ہے۔ یہ وہ خیال کرتے ہیں کہ شرافت انسان کی کوئی جبلی صفت ہے جو ہمیشہ بقائے ذات تک باقی رہ سکتی ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنی ذات کو گویا ایک تودہ شرافت خیال کرنے سے متکبر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے خالی دماغ اس خیال سے بھرے ہوئے ہیں کہ ہمارے آبا و اجداد کی عزت بھی صرف اسی خیالی شرافت پر مبنی تھی جو ہم کو حاصل ہے اور اسی وجہ سے وہ اب تک اپنی ذات کو اسی قسم کی تعظیم کا مستحق خیال کرتے ہیں جس کے ان کے آبا و اجداد مستحق تھے۔ ان کی خیالی شرافت نے ان کو یہ سمجھا دیا ہے کہ دنیا کی تمام قسم کی عزتیں قومی شرافت کے تابع ہیں اور کوئی عزت نام کی شرافت پر غالب نہیں ہے اسی وجہ سے وہ اس بات سے بے پروا ہیں کہ اور کسی قسم کی عزت کو حاصل کریں۔ سب سے زیادہ بے پرواہ تحصیل علوم سے وہی لوگ ہیں جو قوم کے شریف کہلاتے ہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ان کو ایسا [illegible]

مسلمانوں کی قوم میں کوئی صرف اس بات پر نازاں
ہے کہ ہم سید ہیں، آل رسول ہیں اور ناز نے ان کو دین و
دنیا دونوں قسم کی عزت حاصل کرنے سے روک رکھا ہے
یہاں تک کہ وہ بداعمال سے نہیں ڈرتے اور عقبیٰ میں بھی
سید ہونے پر ناز کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ان کا خام خیال
ہے۔ سیدوں سے شیخ ہونا یا اور کسی قسم کی خاندانی
عزت رکھنا ایسی نعمت سمجھا گیا ہے کہ ایک شخص باوجود تمام
قسم کی ذلتوں کے بھی اپنے تئیں سب سے بہتر خیال کرتا
ہے اور یہ ایک بڑی خرابی اور نہایت سخت تاریکی ہے جس
سے ہماری نسلیں اس قدر خراب ہوگئی ہیں کہ اب ان میں
بجز صورت کے اور کسی طرح کا جانوروں سے فرق نہیں
رہا۔ برخلاف شرفا کے جو لوگ کمینہ کہلاتے ہیں وہ اپنے
تئیں علم و فضل کی دولت سے مالا مال کرتے چلے جاتے
ہیں اور انھوں نے اپنے تئیں باعتبار افعال و عادات کے
یقیناً شریف ثابت کر دیا ہے اور اس کا سبب وہی ہے
جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ جاہل شریف اپنے نفس سے
ایسے فریب کھائے ہوئے ہیں کہ ان کے نزدیک شریف
ہونا اور جامع جمیع صفات ہونا ایک معنی رکھتا ہے۔ پس
ان کو بعد شرافت کے اور کسی صفت کے حاصل کرنے کی
کیا ضرورت ہے اور جو لوگ اپنے تئیں شریف نہیں سمجھتے
وہ ضرور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم کو کوئی ایسی صفت حاصل
کرنی چاہیے جو ہم کو عزت والا اور صاحب وجاہت بنائے
پس اسی سبب سے یہ محروم ہیں اور وہ کامیاب ہوتے
چلے جاتے ہیں۔

علاوہ ایسے خاندانوں کے بعض اور خاندان اور
قسم کی عزتوں کے ساتھ مشہور ہیں، وہ بھی نہایت خراب
ہیں۔ مثلاً مسلمانوں میں کوئی خاندان نواب زادوں کا
ہے، کوئی خاندان امیرزادوں کا ہے، کوئی خاندان مفتی
صاحبوں کا، کوئی قاضی صاحبوں کا ہے اسباب انہیں خاندانوں
میں جس قدر ذلت سمائی ہوئی ہے ایسی کسی خاندان میں
نہیں ہے اور باوجود ذلت کے ایک خاندانی نخوت ایسی
چیز ہے کہ اس نے بالکل ایسی قوموں کو ذلیل و خوار کر دیا
ہے۔ نواب زادے اگرچہ بھیک مانگتے ہوں لیکن اب بھی
اپنے نام کے ساتھ نواب صاحب ضرور لگائیں گے گو ان کی
صورت و سیرت میں کوئی شان نوابی کی نہ ہو۔ مفتی صاحبوں
کا غلام بھی مفتی کہلاتا ہے اور قاضیوں کے گھر کے چوہے
بھی قاضی ہی ہوتے ہیں، گو اب مفتی اور قاضی ہونا دوسری
بات ہے، حرف شناس بھی نہ ہوں اور اس لقب
پر ان کو ایسا ناز ہے کہ اس کے سبب سے وہ ہرگز دنیا
میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ بات بالیقین ثابت
ہوگئی ہے کہ یہ لقب ہی ان کو عزت حاصل کرنے کے
مانع ہو گئے ہیں۔ وہ ضرور اس بات کا خیال کرتے
ہیں کہ جو عزت مفتیوں اور قاضیوں کو کبھی حاصل تھی وہ
اب بھی ہمارے واسطے ویسی ہی باقی ہے اور جس طرح پہلے
مفتیوں اور قاضیوں کے سامنے سب سر جھکاتے تھے
اب ہمارے سامنے جھکا دیں گے۔ پس یہ کیوں کر ہو سکتا
ہے کہ ہم کسی کے سامنے سر جھکا دیں؟ اور چوں کہ اعزاز
اور فخر کا حصول بغیر دوسروں کی اعانت اور بغیر فراہمی
اسباب کے ممتنع ثابت ہوگیا ہے اس لیے اس قسم کے
خیال کے لوگ بالکل وحشی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ یہ
بھی خیال کرتے ہیں کہ آباو اجداد میں سے صرف ایک
شخص کا ذی عزت ہو کر مر جانا تمام عمر بلکہ تا بقائے عالم
اس کی نسل کی عزت کے واسطے کافی ہے اور یہ سب
خیالات ایسے افسوس ناک ہیں کہ ان کے سبب سے
ہندوستان سب ملکوں کی بہ نسبت کمتر درجے پر
سمجھا جاتا ہے اور ہندوستانی شرفا کے خاندان تباہ
اور نیست و نابود ہوتے جاتے ہیں ایک اور بڑا نقصان
خیالی شرافت کے سبب سے یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ایسے

شخص میں نصیحت قبول کرنے کا مادہ بالکل نہیں رہتا اور اس کی دانست میں کوئی شخص ان سے زیادہ روشن رائے نہیں ہو سکتا اور یہ سب امور نہایت حسرت کا باعث ہیں۔

مولوی اور طبیب اور پیرزادے جو جو کل ہوتے ہیں ان کو بھی بہت زیادہ اُن کے آباؤ اجداد کی عزت نے تباہ کیا ہے جس کے سبب سے وہ آج اپنے کو عرش بریں پر خیال کرتے ہیں، گو ان کے سراپا برکات مجسّس کے لحد بالکل خیر و عافیت ہی کیوں نہ نکلے اور چوں کہ ہمیشہ سے لوگ ان کے سامنے سر جھکاتے چلے آتے ہیں، اس سبب سے وہ اپنے تئیں مادرزاد ولی اور صاحب کمال خیال کرتے ہیں اور زبانی لن ترانیوں سے وہ ایسا ہی کام نکالنا چاہتے ہیں جیسا کہ کوئی ہنرمند اپنے ہنر سے کام نکالتا ہو اور آخر کار وہ خود بھی خراب ہوتے جاتے ہیں اور ان کی بدولت صد ہا نعم فاسد ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ ہندوستان کے شرفا کی حالت نہایت افسوس کے لائق ہے۔

دیکھو ہندوستانیوں نے اپنی غفلت سے اپنا علم بھی ضائع کر دیا اور اپنی قومی عزت کو بالکل برباد کر دیا اور اب تعلیم و تربیت کو بالکل بھول گئے اور اگر ان کی خوش قسمتی سے دوسری حکمران قوم نے ان کی تعلیم و تربیت کی فکر کی تو اس کے ذریعے سے ہندوستان کے معزز اور شرفا نے بہت کم فائدہ اٹھایا۔ انصاف کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو جو فائدہ ہندوستان کے تھرڈ لوگوں اور متفرق خاندانوں نے سررشتۂ تعلیم سے حاصل کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی خواص نے نہیں حاصل کیا ہے۔ مسلمانوں کی قوم تو اس سے بالکل بے بہرہ ہے۔ جس شہر کے کالج یا اسکول کو جا کر دیکھو بلکہ اس کو بھی چھوڑ دو، تحصیلی یا حلقہ بندی کے مدارس میں جا کر تلاش کرو تو بہ نسبت ہندوؤں کے [illegible]

ہوگی اور اس میں بھی شریف اور معزز مسلمانوں کی اولاد نام و نشان کو نہ ہوگی اور اس کا سبب بجز ان کی نخوت اور غفلت کے کچھ نہیں ہے۔ اگر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کچھ مذہبی خیال اس کا مانع ہوگا تو یہ بالکل غلط ہے کیوں کہ جن لوگوں کی اولاد مدارس سرکاری میں نہیں جاتی ہم نے ان میں سے کسی ایک کو بھی نیک اور پارسا ایسا نہیں دیکھا کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کی طرف متوجہ ہو اور مسلمانوں کی مذہبی ہدایت کے موافق اس نے اپنے اخلاق پیدا کیے ہوں بلکہ وہی خرابی اور ذلت ان کو گھیرے ہوئے ہے جو ہمیشہ سے ایسے جہلا کو گھیرتی ہے اور وہ اسی میں مست ہیں اور دین و دنیا دونوں قسم کی عزت سے محروم ہیں۔ اگر کسی سے کہو کہ آپ کا لڑکا کچھ ریاضی حساب پڑھا ہے تو کہتے ہیں کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور اگر کہیں کہ صاحب قرآن حدیث پڑھا ہے تو کہیں کہ اجی صاحب ہم کیا اس کو مولوی بناتے ہیں۔ اب ان سے پوچھو کہ تم نے کیا بنایا ہے؟ مولوی تم نے نہیں بنایا، دنیادار تم نے نہیں بنایا، کیا گدھا بنایا ہے جو ہمیشہ دوسروں کا بوجھا اٹھاتا ہے؟ غرضیکہ ہندوستان کے شرفا اور علی الخصوص مسلمانوں کی اور اس میں بھی معزز اور نامور خاندانوں کی حالت نہایت خراب اور رونے کے لائق ہے۔ جس شہر کے محلے میں تم نگاہ کرو بہت ہی کم ایسے صاحبزادے نظر آویں گے جن کو دیکھ کر دل خوش ہو۔ اگر نظر آویں گے تو نہایت بدمعاش اور آوارہ اور بدصحبت نظر آویں گے اور دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم فلاں قاضی صاحب اور مفتی صاحب کے لڑکے ہیں۔ ہم نے ایسے لوگوں سے ملاقات کی ہے جن کو دیکھ کر ہماری آنکھ سے بے اختیار آنسو نکل آیا ہے [illegible] سے ایک شخص [illegible]

ان کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اپنے دادا احمد اللہ کا نام صحیح نہیں لے سکتے تھے۔ ہم نے ایک نواب زادے کو جو ابھی غدر میں تباہ ہوا ہے دیکھا تو اب ہم کو شبہ ہوا کہ شاید یہ کوئی تمباکو فروش ہے اور نام پوچھا تو بجائے یوسف خاں کے ای سف خاں بتایا۔ ہم نے انشاء اللہ خاں کے پوتے کو بھی دیکھا ہے جو بار بار کہتے تھے کہ ہم انشاء اللہ خاں کے پوتے ہیں اور ہم کو ان کی حالت اور صورت سے ہرگز اس بات کا یقین نہ ہوتا تھا کہ ایسے نامور کی نسل میں بھی ایسا شخص ہو سکتا ہے۔ ہم نے بادشاہ زادے بھی دیکھے ہیں جو گولا کبوتر کو سیٹی پر لگانے اور طوطوں کو پنجروں پہ اڑانے اور بٹیروں کو لڑانے کے سوا اور کوئی نشان شاہزادگی نہ رکھتے تھے اور جب ہم نظر کرتے تھے تو ہم کو خود اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ بلاشبہ یہ قوم ضرور تباہ ہونے کے لائق تھی اور خدا کا بڑا رحم تھا جو ایسے لوگ ہماری گردنوں کے مالک اور ہم پر حکمران نہ رہے۔ کیونکہ اگر ہمارے ایسے ہی حکمراں رہتے تو ہم اپنی زندگی کو کسی طرح انسان کی طرح بسر نہ کر سکتے تھے۔ جب ہندوستان کے شاہزادے ایسے ہوں تو اب قیاس کرنا چاہیے کہ اس کے مفلس زادے کیسے ہوں گے اور جب یہاں امیر و غریب سب ایسے ہوں تو کیوں کر خدا کا عدل و رحم اس بات کا مقتضی ہو سکتا تھا کہ وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ سے اس ملک کو نکال کر ایک دوسری قوم کے ہاتھ میں نہ دیتا۔ اس میں شک نہیں کہ شاہزادے بھی خدا کے بندے تھے مگر جو ان کے محکوم تھے وہ بندے تعداد میں ان سے بہت زیادہ تھے پس ایسے حاکموں کو اس قدر محکوموں پر ایسی حالت کے ساتھ کیوں کر باقی رکھ سکتا تھا؟

آدابِ مجلس

اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل (کر بیٹھ) جاؤ تو کھل (کر بیٹھ) جایا کرو اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔ اللہ تم میں سے ان لوگوں کے درجے بلند کرے گا جو ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔

(المجادلہ ۱۱)

مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ سے گفتگو

کردارکشی افراد ہی کی نہیں اداروں کی بھی ہوتی ہے، ۷-۸ اپریل ۹۳ء کی درمیانی شب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جو سانحہ پیش آیا تھا اور جسے طلبا پر جس وحشیانہ انداز سے گولی چلائی گئی تھی اس کو حق بجانب قرار دینے کے لیے دوسرے ہی دن سے یونیورسٹی کے خلاف گمراہ کن اخباری پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا تھا جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ وہی ایک "جھوٹ" عنوان بدل بدل کر، نئی نئی سرخیاں لگاکر، خوشنما اور دل آویز الفاظ کے قالب میں ڈھال کر اس تواتر اور تیز رفتاری سے بولا جا رہا ہے جیسے اس "جھوٹ" کے علاوہ "سچ" کچھ ہے ہی نہیں۔ ایڈیٹر تہذیب الاخلاق نے اس صورتِ حال پر آٹھ جون کی شام کو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد نسیم فاروقی صاحب سے جو گفتگو کی تھی وہ لکھ لی گئی تھی۔ ہم قارئین تہذیب الاخلاق کی آگاہی اور اطلاع کے لیے اس گفتگو کا متن ذیل کی سطور میں درج کر رہے ہیں۔

ادارہ

ایڈیٹر: ضلعی انتظامیہ کی طرف سے جس عدم اشتراک کا مظاہرہ ہو رہا ہے اس کے باوجود آپ موجودہ حالات سے کس طرح عہدہ برا ہوں گے؟

شیخ الجامعہ: میرے خیال میں "عدم اشتراک" کہنا درست نہ ہوگا، البتہ یہ بات ضرور درست ہے کہ ہم جتنا اشتراک یا یوں کہیے کہ جتنی مدد چاہتے ہیں وہ ہم کو نہیں مل رہی ہے۔ مثال کے طور پر میں بہت دنوں سے انتظامیہ کو اس طرف متوجہ کرا رہا ہوں کہ مولانا آزاد لائبریری اور آرٹس اور تھیالوجی فیکلٹی کی درمیانی جگہ پر کچھ فورس تعینات کر دی جائے تاکہ ان جگہوں پر کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہو سکے۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس بار بار مجھ کو اس بات کا احساس دلاتی تھی کہ یہاں پر حفاظت کا کچھ نہ کچھ انتظام ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو

کسی حد تک ان [illegible] کا حل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ
مطالبہ مان لیا گیا ہوتا تو اقبال حسن خان کو
اس طرح گولی مارنا آسان نہ ہوتا اور اگر قاتل کسی
کسی طرح گولی مار دیتے تو وہ اس طرح فرار نہ ہو سکتے
تھے جس طرح فرار ہوئے۔

ایڈیٹر: آپ نے جب سے وائس چانسلری کا چارج لیا ہے آپ کو بے پناہ مسائل کا سامنا رہا ہے آپ نے دو دو فرقہ وارانہ فسادات اور ان کی تباہ کاریاں دیکھیں، پھر طلبا پر پولیس فائرنگ کے بھیانک مسائل سے دوچار ہوئے۔ علاوہ بریں بعض مقامی یا یوں کہیے گھریلو مسائل بھی ہیں، آپ ان مسائل پر کس طرح قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں؟

شیخ الجامعہ: میرا بہت صاف الفاظ میں جواب یہ ہے کہ میرے سامنے مسائل نہیں آئے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات صرف میرا نہیں پوری قوم کا مسئلہ ہیں، اس سے میں ہی دوچار نہیں ہوتا پوری قوم دوچار ہوتی ہے۔ ۶ر دسمبر ۹۲ء کا واقعہ ہے، یہ بھی صرف ہمارا نہیں پوری قوم کا مسئلہ ہے۔ اس واقعہ پر جو ری ایکشن (ردعمل) پوری قوم کا ہے وہی ہمارا بھی ہے۔ کیونکہ ہم قوم سے علیحدہ اپنا کوئی انفرادی وجود نہیں رکھتے بلکہ اس سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ اگر ہم کو زور زبردستی سے اس سے الگ کر دیا جاتا ہے تو ہمارا وجود ہی ختم ہو کر رہ جائے گا۔ جہاں تک طلبا پر پولیس فائرنگ کا مسئلہ ہے یہ بھی صرف میرا ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ اپنے لاڈلوں کی جدائی پر جتنے آنسو میں نے بہائے ہیں قوم نے اس سے کم آنسو نہیں بہائے
ان کے والدین اور عزیزوں کے لیے جتنا [illegible] ہے قوم بھی اتنا ہی تڑپی ہے۔ جو کچھ بھی ہو چکا یا ہو رہا ہے خواہ وہ فرقہ وارانہ فسادات ہوں ۶ر دسمبر ۹۲ء کا واقعہ ہو یا ممبئی کے ہولناک واقعات۔ یہ سب پوری قوم کے ساتھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے جس کا ایک فرد میں بھی ہوں۔ اس لیے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ میں علی گڑھ آتے ہی مسائل میں گرفتار ہو گیا۔

ایڈیٹر: آپ جب حکومت، پولیس اور ضلع انتظامیہ سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کے سامنے مسائل پیش کرتے ہیں تو ایک فولادی شخص معلوم ہوتے ہیں مگر جب "اندرونی مسائل" سے آپ کا سامنا ہوتا ہے تو آپ کا انداز یکسر بدل جاتا ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

شیخ الجامعہ: (ہنستے ہوئے) دیکھیے گھر میں لڑائی جھگڑا نہیں کیا جاتا، گھر میں تو سب کو ساتھ لے کر، کبھی خوشامد اور دلاسہ دے کر تو کبھی چہرے پر تھوڑی سی سختی لا کر اور آنکھیں لال پیلی کر کے ایک دھاگے میں پروئے رہنا ہوتا ہے۔ ایسا اس لیے بھی کیا جاتا ہے کہ گھر کی بات گھر ہی میں رہے اور گھریلو مسئلے گھر والے ہی مل بیٹھ کر حل کریں تاکہ ہمارے مسئلوں کی گونج سڑکوں اور بازاروں تک نہ پہنچے۔ میں یہاں ایک بات آپ کو یاد دلانا چاہوں گا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا وائس چانسلر ہی صرف ایک ایسا وائس چانسلر ہے جو حکومت اور یونیورسٹی کی اعلیٰ انتظامیہ کے علاوہ پوری قوم کو جواب دہ ہے۔ آپ نے [illegible]

اظہار خیال کیا ہو یا اپنے منھ سے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے خلاف بیان جاری کیا ہو۔ اس کے برعکس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر علما کو بھی جواب دہ ہے اور قوم کے لیڈروں کو بھی۔ وقفہ وقفہ سے صوبائی اسمبلی ہو یا پارلیمنٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی کارکردگی ہی زیرِ بحث آتی ہے۔ ایک طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں کا وائس چانسلر ملت کا نمائندہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا سربراہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اسی کی تذلیل کی جاتی ہے، بے بنیاد الزامات کی بوچھار کی جاتی ہے، اس کے کیریکٹر پر نار وا حملے کیے جاتے ہیں۔ یہ دو عملی نہیں تو کیا ہے ایک زمانے میں یہاں کے اولڈ بوائز کی بڑی شہرت تھی، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھ کو جن اولڈ بوائز سے سابقہ پڑتا ہے ان میں سے چند لوگوں کے علاوہ زیادہ تر لوگ صرف تنقید کرتے ہیں۔ جہاں تک قوم کے لیڈروں کا معاملہ ہے ان کے بارے میں کیا کہوں؟ ہر مصیبت کی گھڑی میں یہ حضرات روپوش ہو جاتے ہیں، جب طوفان تھم جاتا ہے تو بیان بازی شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں کے طلبا پر فائرنگ کے بعد قوم کے لیڈروں کا جو عمل اور رویہ رہا وہ سب پر ظاہر ہے۔ اتنے بڑے حادثے کے باوجود طلبا اور اساتذہ کے اشتراک سے فائنل ایرز اور مقابلہ جاتی امتحانات بخیر و خوبی ہو گئے تو اب یہی لیڈران قوم یونیورسٹی کو بند کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں جو لوگ ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کر کے اس کو چلا نہیں سکتے وہ لوگ ایک بڑے جامعہ اور ترقی کرتے ہوئے ادارے کو بند کرنے کا "حکم" کیسے دیتے ہیں۔

ایڈیٹر: کیا آپ یونیورسٹی کی موجودہ رفتار ترقی سے مطمئن ہیں؟

شیخ الجامعہ: انسان ترقی سے مطمئن کبھی نہیں ہوتا وہ ابھی اور ابھی اور کہتا ہوا زندگی بھر آگے کی طرف بڑھتا رہنا چاہتا ہے۔ انسان ہونے کے ناطے میری بھی خواہش ہے کہ یہ ادارہ ابھی اور ترقی کرے اور ترقی کرے اور اس میں ان تمام علوم کے شعبے کھل جائیں جو آج تک کسی نہ کسی وجہ سے نہیں کھولے جا سکے ہیں، مجھ سے پہلے کے تقریباً سب ہی وائس چانسلروں نے اپنے اپنے زمانے کے اعلیٰ ترین علوم کے شعبے کھلوائے جس زمانے میں اس ادارے کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تھا اس زمانے میں لٹریچر (ادبیات) کلاسیکل لینگویجز (کلاسیکی زبانیں مثلاً سنسکرت، عربی اور فارسی) اور سائنسی مضامین بہت اہمیت رکھتے تھے سب سے پہلے ان شعبوں کو قائم کیا گیا، علم طب اس زمانے کا ایک اہم اور مفید علم تھا۔ اسی لیے یہاں طبیہ کالج کا قیام عمل میں آیا کر پھر انجینئرنگ کالج، پالی ٹیکنک، سائنسی مضامین کے نئے نئے شعبے، میڈیکل کالج، کمپیوٹر سائنس کا شعبہ ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور آج بھی چل رہا ہے گزشتہ پچھلے تین برسوں میں بھی بہت سے نئے نئے کورسز شروع کیے گئے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف انٹیگریٹیڈ اگریکلچر قائم ہو چکا ہے جس کے لیے دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپیے منظور ہو چکے ہیں۔ اس کے چار کورسوں میں سے دو اس سال شروع ہو رہے ہیں۔

۱۔ پلانٹ پروٹیکشن

1. Plant Protection

۲۔ ایگریکلچرل اکنامی اینڈ بزنس مینجمنٹ

2. Agricultural Eco.lomy &
Business Management

کمپیوٹر سائنس کے شعبے کے علاوہ کمپیوٹر انجینرنگ کے شعبے نے بھی کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ شعبۂ اردو کو ٹیکنکل ڈولپمنٹ آف انڈین لینگویجز (اردو، سندھی اور کشمیری زبانوں) کے لیے کام سپرد کیا گیا ہے اور ۲۵ لاکھ روپیے کی امداد سے اس کام کو شروع کر دیا گیا ہے۔

ایک اور اہم پروجیکٹ مینو اسکرپٹس (مخطوطات) کو محفوظ کرنے کا ہے۔ یہ پروجیکٹ ۱۰ لاکھ روپیے کی ابتدائی امداد سے عنقریب شروع کر دیا جائے گا۔ کیا یہ جائے گا کہ جدید تکنیک کے ذریعے نادر اور نایاب مخطوطوں کو ان کے اصل رنگ اور دوسری خصوصیات کے ساتھ کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا جائے گا تاکہ اگر وقت موسم، حادثے یا دیمک وغیرہ خدانخواستہ مخطوطوں کو کوئی نقصان پہنچا دیں، تب بھی ان کا وجود برقرار رہے اور لوگ ان سے محروم نہ ہونے پائیں۔

ایڈیٹر: پچھلے ڈھائی برسوں میں جو نئے کورسز شروع کیے گئے ہیں وہ کون کون سے ہیں؟

شیخ الجامعہ: پچھلے ڈھائی سالوں میں جو نئے اور Job-oriented کورسز شروع کیے گئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

بی ایس سی انجینرنگ (کمپیوٹر) —

1. B.Sc. Engineering (Computer)

ماسٹر آف فنانس اینڈ کنٹرول (ایم ایف سی)

2. Master of Finance & Control (MFC)

۳ ماسٹر آف ٹورزم ایڈمنسٹریشن (ایم ٹی اے)

3. Master of Tourism
Administration (MTA)

۴ ایم۔ اے ان ویسٹ ایشین اسٹڈیز

4. M.A. in West Asian Studies

۵ پی۔ جی ڈپلوما ان ٹرانسلیشن (فنکشنل ہندی)

5. P.G. Diploma in translation
(Functional Hindi)

۶۔ پی۔ جی۔ ڈپلوما ان اسٹریٹیجک اسٹڈیز

6. P.G. Diploma in Strategic
Studies

۷ ڈپلوما ان کمپیوٹیشن میتھمیٹکس

7. Diploma in Computation
Mathematics

۸ ڈپلوما ان ہارٹی کلچر

8. Diploma in Horticulture

۹۔ ڈپلوما ان فارمیسی

9. Diploma in Pharmacy

۱۰۔ کمپیوٹر ایپلی کیشن میں ایک سال کا پارٹ ٹائم ڈپلوما۔

10. One year part time Diploma
in Computer Application

اس کے علاوہ دو اور اہم کورسز جلد شروع ہونے جا رہے ہیں

۱۔ بیچلر آف آرکیٹکچر

1.. Bachelor of Architecture

۲۔ ایم ایس سی اینوائرمینٹل انجینرنگ

2. M.Sc. in Enovironmental
Engineering

مزید برآں مسلمانوں کے سماجی، معاشی اور تعلیمی حالات کے سدھار کے لیے عملی طور پر ایک سینٹر قایم ہوا، جس کا نام:
"دی سینٹر آف کوآرڈی نیشن فار کلچرل اینڈ ایجوکیشنل ایڈوانس مینٹ آف مسلمس آف انڈیا" ہے

The Centre of Co-ordination for cultural and Educational Advancement of Muslims of India

اس کے لیے سیڈ منی Seed Money کے طور پر تقریباً دس لاکھ روپیے جلد ہی ملنے والے ہیں

آٹھویں پلان پروپوزل میں یو۔جی۔سی نے مندرجہ ذیل ہاسٹلوں کی اور ان کی الگ الگ امدادی رقم دینے کی منظوری دی ہے۔

۱۔ گرلز ہوسٹل

1. Girls Hostel

Rs. 140.00 Lakhs

۲۔ ریسرچ اسکالرس ہوسٹل

2. Research Scholars Hostel

Rs. 50.00 Lakhs

۳۔ جونیئر ڈاکٹرس اینڈ نرسس ہوسٹل

3. Junior DOCtors & Nurses Hostel

Rs. 100.00 Lakhs

۴۔ طلبا کے لیے ایک الگ ہال جناب ندیم ترین کی دو کروڑ روپیے سے بھی زاید مدد سے بننے جا رہا ہے جس پر عملی کام بھی شروع ہو گیا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور پلانوں کے لیے کوشش ہو رہی ہے ان میں سے مندرجہ ذیل اہم ہیں۔

۱۔ انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹکنالوجی

1. Institute of Information Technology

۲۔ سینٹر فار فارن ٹریڈ۔

2. Centre of Foreign Trade

۳۔ سینٹر فار ٹریننگ، ریسرچ ڈویلپمنٹ ان ٹکنالوجی۔

3. Centre for Training, Re-search Development in Technology

کنٹرولر آفس میں امتحانات اور خاص طور پر سے داخلہ ٹسٹوں کے سارے کام کمپیوٹر کے ذریعے ہونے لگا ہے۔ دوسرے اہم دفاتر اور لون پی ایف P.F. Loans وغیرہ کے کام بھی کمپیوٹر سے جلد شروع ہونے والے ہیں۔

ایڈیٹر: بعض حلقوں کی طرف سے "داخلوں پر کنٹرول" کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی ایسی آوازیں سنائی دے جاتی ہیں اس مطالبے پر آپ کا ردعمل کیا ہے۔

شیخ الجامعہ: جو حضرات اس طرح کا مطالبہ فرماتے ہیں ان کی اکثریت داخلوں کے زمانے میں علی گڑھ میں موجود رہتی ہے۔ تقریباً سب ہی کے ہاتھ میں ایک ایک چٹ جس پر چند نام کہ ان کا فلاں فلاں کورس میں نامینیشن (نامزدگی) ہو جائے۔ جس کا امیدوار

میرٹ میں آگیا اور اس کا داخلہ ہو گیا وہ تو سال بھر کے لیے خاموش ہو گیا مگر نمبروں کی کمی کی وجہ سے جس کے امیدوار کو داخلہ نہ مل سکا وہ منہ بھر کا مخالف بن گیا۔ داخلوں پر کنٹرول کا مطالبہ کرنے والے حضرات کبھی یہاں آکر دیکھیں تو سہی کہ داخلوں کی درخواستیں ہوتی کتنی ہیں؟ ان سب امیدواروں کو کوئی بڑی سے بڑی حکومت کسی سرکاری یونیورسٹی میں بھی داخلہ نہیں دے سکتی۔ مسلم یونیورسٹی جیسے محدود وسایل رکھنے والے اداروں کے لیے تو یہ ناممکن ہے کہ داخلے کے لیے جتنی درخواستیں موصول ہوں ان سب کو قبول کر لیا جائے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو مسلمان طلبا اور طالبات یہاں داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں ان کی تعلیم کا کوئی متبادل انتظام سوچا جاتا۔ چند بڑے بڑے شہروں میں نئے نئے ادارے قایم کرکے ان کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جاتا۔ اس اصل مسئلے کی طرف تو کوئی دھیان نہیں دیتا لیکن یہاں کے داخلوں پر شک و شبہ کی نظر ڈالنے میں پیش پیش رہتا ہے۔ اگر اعتراضات کرنے والے حضرات واقعی ملت کا درد رکھتے ہیں تو یہاں آئیں، ہر چیز کا اپنی نظروں سے جائزہ لیں، ہر مسئلے سے واقف ہونے کی کوشش کریں۔ ایسے حضرات کسی حقیقی کمی یا خامی کی طرف اشارہ کریں گے تو یونیورسٹی انتظامیہ یقیناً اس کو درست کرے گی۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ داخلوں میں کبھی قسم کی بھی بدعنوانی نہیں ہوتی ہے۔

ایڈیٹر: آپ کا کافی وقت صرف ہو چکا آج کی گفتگو یہیں پر ختم کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ سے دوبارہ چند اور مسایل پر گفتگو کرنے کا موقع ملے گا۔

شیخ الجامعہ: میں دوبارہ ہی نہیں بار بار گفتگو کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ وقت مقرر کرکے جب چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔

ایڈیٹر: اس طویل گفتگو کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

شیخ الجامعہ: میں بھی آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے آکر مسایل پر بات کی۔

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا ہے یعنی اسی کے موافق اسی کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے جس طرح کہ پانی خود اپنی بنسالی میں آجاتا ہے، اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

سر سید احمد خاں

مطلع اتنا غبار آلود بھی نہیں

سید حامد *

انسان پریشانیوں میں گھر جائے اور کملانے لگے تو امید کی ذرا سی کرن بھی آب حیات کا کام کر جاتی ہے جس کسی کو جینے کا حوصلہ ہوتا ہے وہ بڑی مصیبتوں کا مقابلہ خم ٹھونک کر کرتا ہے اور چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو ڈھال بنا لیتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں پر بڑا وقت پڑا ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہر طرف سے حوصلہ فرسا خبریں آتی رہیں۔ مظلوم پر الزاموں کی یورش بھی ہو تو وہ بیچارہ کیا کرے۔ اس کے پاس کوئی چارہ اس کے سوائے نہیں رہتا کہ کمر ہمت کس لے اور دولت بیس کر میدان کارزار میں اتر آئے۔ میدان کارزار یعنی بے وہ مقابلے کی دنیا۔ مسلمانوں نے ہمہ نہیں کیا تو نہیں ہے لیکن کوشش کی آہٹیں مل رہی ہیں۔ قارئین مجھے معاف کر دیں اگر میں ان آہٹوں کی صدا کو اونچا کر کے دکھاؤں، یا سنواؤں۔

یہ دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمان ہندوستان کی آبادی کا تقریباً ۱۲ فی صد ہیں۔ آٹھ دس سال تک سول سروسز کے مقابلے میں ہر سال تقریباً ۱۰۰ کامیاب امیدواروں میں بارہ کے قریب مسلمان ہوتے تھے۔ گزشتہ دو تین سالوں میں یہ تعداد بڑھ کے ۲۲ تک پہنچ گئی۔ امسال کل ۷۶۱ امیدوار چنے گئے جن میں مسلمانوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے ۹۵ ہونا چاہیے تھی بس ۲۴ مسلمان کامیاب ہوئے یعنی ابھی منزل دور ہے لیکن یہ بات کیا کم ہے کہ چند سال ہوئے جہاں ہمارا تناسب ۱۱۲ اور ۱۵ ہوتا تھا، وہ اب ۳٪ ہو گیا ہے۔ ہم پروردگار کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ایک محاذ پر تو ہمیں رجعت قہقری سے چھٹکارا ملا اور ہم نے آگے کو بڑھنا شروع کر دیا خواہ وہ رینگنے کی ہی شکل میں کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب کے ایما پر اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی اعانت سے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے تعلیم آباد، سنگم وہار (جنوبی دہلی) میں جو مرکز اسول سروسز کے مقابلے کے لیے کھولا ہے وہ سال بھر کی مختصر مدت میں حوصلہ افزا نتائج سامنے لایا ہے۔ پچھلے سال اس نے آٹھ لڑکوں کو امتحان کی آخری منزل یعنی انٹرویو ٹیسٹ کے لیے تیار کیا۔ چار لڑکے کامیاب ہوئے۔ امسال جس جماعت کو وہ شروع سے تیار کر رہا تھا اس میں سے ۹ لڑکے دوسری منزل یعنی مین

تحریری امتحان میں کامیاب ہوئے اور ۱۲ لڑکے آخری منزل کی تیاری کے لیے ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان ۲۱ امیدواروں میں سے، اس نتیجے کے مطابق جو آج ۳ رجب ۱۹۹۳ء کو اخباروں میں شایع ہوا ہے ۱۳ بفضلہٖ کامیاب ہو گئے ہیں، ان میں دس مسلمان ہیں اور تین درج فہرست ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ فہرست حسب ذیل ہے:

ذکی احمد	انجم پرویز
اصغر سول	مظفر حسین
نور الدین انصاری	اظہر شمسی
اشتیاق حسین	شکیبہ وارثی
آر ڈی۔ نظیم	نظام
تامیزونادن	کے ایل مینا
سنجے بارا۔	

یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ہمدرد اسٹڈی سرکل سے جتنے مسلمان طالب علم اس سال کامیاب ہوئے ہیں، اتنے ہندوستان کے کسی دوسرے تربیتی مرکز سے نہیں ہوئے

یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ راقم سطور کی متواتر کوششوں کے بعد مرکزی سرکار نے مقابلے کے امتحانوں کے لیے تربیت کی اسکیم منظور کی تھی۔ یہ ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے زیر اہتمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں روبہ عمل آئی۔ ہندوستان بھر میں ۵۲ کوچنگ سینٹر کھولے گئے۔ جہاں تک سول سروسز کا تعلق ہے ان مراکز کے نتائج حوصلہ افزا نہیں رہے لیکن ان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان طلبا کو یہ اطلاع مل گئی کہ قوتِ بازو سے اچھی ملازمتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ چھوٹی ملازمتیں سرکاری اور نجی سیکٹر میں، ان مراکز کے تربیت یافتہ طالب علموں نے معقول تعداد میں حاصل بھی کیں۔ مقابلے کی ایک فضا تیار ہو گئی اس سے بہت بہتر نتائج حاصل ہو سکتے تھے۔ اگر ان تربیت گاہوں کے سربراہ خلوص، محنت، لگن اور بصیرت سے کام لیتے اور مسلم عوام اس پروگرام کا پورا فائدہ اٹھاتے۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے ہمدرد اسٹڈی سرکل کو قایم کرتے وقت ان کمیوں کو دور کر دیا۔ یہ اسکیم بغیر کسی بیرونی اعانت کے شروع کی گئی تھی لیکن بعد میں وزارتِ فلاح نے اپنی تربیتی اسکیم کے تحت اسے جزئی امداد دینا منظور کر لیا۔ ہمدرد اسکیم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں طلبا کے قیام و طعام کا انتظام بھی ہے۔ بہت بڑا کیمپس ہے۔ اس پروگرام کے تحت لائبریری، لکچر روم، ڈائننگ ہال، ایڈمنسٹریٹو بلاک اور پچاس کمرے، فرنیچر اور ضروریات کے ساتھ۔ ہر امیدوار کو ایک کمرہ الاٹ کیا جاتا ہے اور صبح سے رات تک ڈائرکٹر کے زیر نگرانی طلبا کو تیاری میں مصروف رکھا جاتا ہے۔ مختلف مضامین کے متخصصین لیکچر اور مذاکرات کے لیے بلائے جاتے ہیں یہ تاثر اب عام ہو گیا ہے کہ پرسنلٹی ٹیسٹ کی جتنی اچھی تربیت ہمدرد اسٹڈی سرکل میں ملتی ہے، اتنی ہندوستان میں کہیں نہیں

"آپ لوگ مجھ کو معاف کیجیے۔ آزادی روکنے سے لوگ اولاد کے قویٰ کو مضمحل کر دیتے ہیں۔ خیر جو گزر گیا وہ گزر گیا اب آئندہ نسلوں کا خیال کرنا چاہیے۔ شاید یہ سچی اچھی باتیں بُری لگتی ہوں مگر دلوں میں سوچیے کہ یہ باتیں آپ کی بھلائی کے لیے کی جاتی ہیں یا اور کسی غرض سے۔"

سر سید احمد خاں

ملتی۔ ان انٹرویو بورڈوں میں جو مشق کے لیے تشکیل دیے جاتے ہیں ہمیں مرکزی سروسز کے نوجوان افسروں کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات انوکھی سی لگتی ہے مگر یہ امر واقعہ کے مطابق کہ جہاں تک سول سروسز کا تعلق ہے یو-جی-سی کے ۵۳ اور وزارت فلاح کے ۲۹ مراکز نے مل کر بھی کامیابی کی وہ منزل طے نہیں کی جو ہمدرد اسٹڈی سرکل اپنی شیرخواری کے دوران طے کرپایا ہے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ محنت، باقاعدہ محنت اور لگن کلیدکار ہے، کوئی کام ایسا نہیں جو انجام نہ دیا جاسکے۔ افسوس اس بات کا ضرور ہے کہ مسلمانوں کی قیادت نے انھیں تعمیری کاموں سے سدا دور رکھا اور حکومت انھیں کھلونے دے کر بہلاتی رہی۔ کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ مسلمانوں کو تعلیم و تربیت اور مقابلے کے میدان میں اتار دیتی۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ آج کی سادہ سی کامیابی کل کی شاندار فتوح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

"بیشک تمہارے لیے ایک عمدہ نمونہ ہے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں جب کہ ان لوگوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سب سے بیزار ہیں۔ ہم تمہارے منکر ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض ظاہر ہوگیا جب تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آو۔ البتہ ابراہیم نے یہ اپنے باپ سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے استغفار ضرور کروں گا، اگر مجھے اللہ کے آگے تمہارے بارے میں کسی بات کا اختیار نہیں"

(الممتحنہ ۴-۶)

عبدالسلام کے دو عشق — مذہب اور سائنس

اسرار احمد*

نوبل انعام یافتہ پاکستانی سائنس داں پروفیسر عبدالسلام کی شخصیت ہر قسم کے تعارف سے بالاتر ہے۔ ان کی ذات میں کئی عظمتوں کا جمگھٹا ہے سائنس اور عالمی امن میں تاریخ ساز حیثیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر بھی ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ بڑے مذہبی انسان ہیں اور زندگی کا زیادہ تر حصہ مغرب کے مادہ پرست ماحول میں گزارنے کے باوجود مشرق کی روحانیت ان کی زندگی کی بنیاد ہے جس پر انھیں فخر ہے۔ اسی روحانیت نے ان کو منکسر المزاجی، رواداری اور دردمندی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچایا ہے اور ان کی شخصیت میں مقناطیسیت بھر دی ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ تیسری دنیا بالخصوص عالم اسلام کی علمی پسماندگی ہے۔ اس دکھ کے مداوے کے لیے انھوں نے خود کو وقف کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم اٹلی کے ایک روزنامے "کوریرے دی لا سیرا" کی ۱۳ نومبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں پروفیسر عبدالسلام کے بارے میں شائع ہونے والی ایک تحریر کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اہل مغرب پر ان کی شخصیت کے کیا اثرات ہیں اور وہ انھیں کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسرار احمد

بنیادی طبیعیات کے میدان میں دنیا کا ایک اہم مرکز انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس ہے جو ایک پاکستانی نوبل انعام یافتہ سائنس داں عبدالسلام کی سربراہی میں بخوبی چل رہا ہے۔ یہ مرکز ۱۹۶۴ء میں انٹرنیشنل اٹامک انرجی کے تحت قائم کیا گیا اور ۱۹۷۰ء سے یونیسکو بھی اسے چلانے میں شامل ہو گیا لیکن اس کے بجٹ کا زیادہ تر

---

* پروفیسر فزکس ڈپارٹمنٹ و سابق ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اے ایم یو علی گڑھ۔

حصہ جو تقریباً ایک سو ڈالر کے قریب ہے، اٹلی کی حکومت پورا کرتی ہے۔

یہ مرکز جسے ایک سپر یونیورسٹی بھی کہا جا سکتا ہے نظریاتی طبعیات میں اعلیٰ سطح تعلیم و تدریس کا اہتمام کرتا ہے حال ہی میں اس مرکز نے دو تجربہ گاہیں بھی قایم کی ہیں ان میں ایک مائیکرو پروسسر کی اور دوسری اونچے درجۂ حرارت کے سپر کنڈکٹر کی ہے۔

عبدالسلام کے مرکز سے ایک سو اکتالیس ممالک کے سائنس داں مستفید ہوتے ہیں۔ یہ سائنس داں یہاں اعلیٰ سطحی تعلیم اور ریسرچ کے لیے آتے ہیں اور سائنس دانوں کی بین الاقوامی کمیونٹی سے رابطہ قایم کرتے ہیں۔ ان سائنس دانوں میں زیادہ تر ترقی پذیر ممالک کے ہوتے ہیں۔ باقی (سابق) سوویت یونین مشرقی یورپ اور مغربی ممالک کے۔

عبدالسلام جو ۱۹۵۷ء سے امپیریل کالج لندن میں پروفیسر ہیں، اس مرکز کے خالق ہیں اور وہی اسے خوش اسلوبی سے چلا بھی رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس ذمہ داری کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اس کے باوجود انھوں نے عالمی سائنس میں اپنا اعلیٰ مقام برقرار رکھا اور اول درجے کا تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۷۹ء میں نوبل انعام بھی حاصل کیا جو انھیں ان کے خفیف نیوکلیائی اور برق مقناطیسی قوتوں کی وحدت کے انکشاف پر دیا گیا۔

فزکس کے میدان میں عبدالسلام کی تخلیقی کاوشیں جنیوا میں واقع تجرباتی فزکس کے مقتدر سائنس دانوں سے ینگ پانگ ملز کے مترادف ہیں۔ پہلے عبدالسلام نے ویک نیوٹرل کرنٹ کے وجود کی پیشن گوئی کی۔ اس کی صداقت ۱۹۷۳ء میں سرن (CERN) میں ہونے والے تجربات سے ثابت ہوئی۔ ان تجربات میں اٹلی کی ملانو یونیورسٹی کے ماہرین کا زیادہ حصہ تھا۔ اس کے بعد سلام نے انٹرمیڈیٹ وکٹر بوزان کے وجود کی پیشن گوئی کی جسے ۱۹۷۳ء میں سرن کے تجربات نے صحیح ثابت کیا اور جس پر کارلو روبیا اور سائمن وان دی میر کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔

فزکس میں گزشتہ بیس سالوں میں ہونے والے یہ انتہائی اہم کارنامے ہیں جن کو سلام نے بڑی خوب صورتی سے اپنی حالیہ کتاب "یونی فیکیشن آف فنڈامنٹل فورسز" (UNIFICATION OF FUNDAMENTAL FORCES) میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں ہائزنبرگ اور ڈیراک کے بھی لیکچرز شامل کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں سائنس داں اس صدی کے نصف اول کے سائنس کے معماروں میں سے ہیں۔ سلام یوروپ کی ان دو عظیم سائنس دانوں کے کارناموں کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ سلام کی اس کتاب میں جو گزشتہ دہائیوں میں بنیادی فزکس میں ہونے والے انکشافات کو بیان کرتی ہے کچھ داستانوں اور یادوں کا بیان بھی ہے جن سے سلام کی اسلام سے گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

سلام کے کیریر میں ۱۹۶۰ء کے آس پاس کے واقعات کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اٹلی کے نیوکلیر سوسائٹی کے صدر کارلو سال ویٹی (CARLO SALVETTI) کے بقول یہ بین الاقوامی سیاست کی آنکھ مچولی کا دور تھا۔ جنیوا میں ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۸ء اٹامک انرجی برائے امن کے موضوع پر منعقد ہونے والی کانفرنسوں کے بعد عالمی سطح پر عوام پر کنٹرولڈ نیوکلیر فیوژن پر ریسرچ کی اہمیت کا انکشاف ہوا۔ توانائی کے اس وافر ذخیرے کے حصول کی امید کے ساتھ ساتھ فطری طور پر یہ خواہش ابھری کہ دنیا کے دو سپر پاور فیوژن کی انرجی کے حصول میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ آئی۔ اے۔ ای۔ اے۔ (I.A.E.A) کے ہر ممکنہ کوشش تھی کہ دونوں بڑی طاقتیں اس مقصد کے حصول میں ایک دوسرے کے قریب آئیں لیک

ن کے مابین عدم اعتماد کے سبب یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اس لیے آئی۔ اے۔ ای۔ اے کے ارباب نے ذراتی طبعیات (Particle Physics) کے میدان میں ان دونوں بڑی طاقتوں کے باہمی تعاون کی بات سوچی۔ نظریاتی فزکس کا انتخاب فطری تھا کیوں کہ اس کا تعلق سائنس کی مبادیات سے تھا اور اس سے کسی ایک کے فوجی یا صنعتی راز کے انکشاف کا خطرہ درپیش نہ تھا۔ اس منصوبے کو متعدد ماہرین طبعیات کی ایک کمیٹی نے منظوری دی اس کے بعد جو مرحلہ درپیش ہوا وہ مستقبل کے مرکز کی جگہ کے انتخاب کا تھا۔ اطالوی مندوب نے ٹریسٹے کا نام پیش کیا جسے تقریباً سبھی نے ناپسند کیا لیکن اٹلی اپنی کوشش کرتا رہا اور بالآخر اس امر میں کامیاب رہا کہ مجوزہ مرکز ٹریسٹے میں قائم ہو۔ عبدالسلام اس مرکز کے ڈائرکٹر منتخب ہوئے۔

سلام کی کتاب ان کی اسلامی تہذیب سے گہری وابستگی کی آئینہ دار ہے۔ یہ کتاب ان دریچوں کو کھولتی ہے جن سے اسلام کا شاندار ماضی نظر آتا ہے وہ دور نظر آتا ہے جب مشرق علم و تہذیب بشمول سائنس کا گہوارہ تھا اور جب یورپ کے حکماء علم کی اشاعت کے لیے عربی کتابوں کے ترجمے کیا کرتے تھے۔ اسی طرح سلام کی فزکس بھی ان کی اسلامی تہذیب سے گہری وابستگی کی آئینہ دار ہے۔ فطرت میں موجود تشاکل، بظاہر مختلف نظر آنے والی قوتوں میں وحدت، ذرّات اور ضد ذرّات کی دنیا ان سب میں مشرق کی روحانیت کا پرتو ہے سلام کی فزکس کی اعلیٰ درجے کی تخلیقات اور ان کی اسلامی طریقۂ زندگی سے گہری وابستگی میں گہرا تعلق ہے۔ سلام کی مذہب سے وابستگی ان کے تخلیقی کاوشوں کے ساتھ ساتھ گہری ہی ہوتی گئی۔ اس لیے اس بات پہ متعجب نہ ہونا چاہیے کہ جب لندن میں سلام کو یہ خبر ملی کہ وہ نوبل انعام کے لیے منتخب کر لیے گئے ہیں تو انھوں نے سب سے پہلے مسجد میں جاکر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔

سلام انتہائی منکسر المزاج اور وضعدار ہیں۔ اور اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں شاید ہی کبھی کوئی بات کرتے ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی ذات سے متعلق چند داستانیں سننے میں آتی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک بیٹی صرف اس لیے امتحان میں فیل کر دی گئی کہ اس نے سلام کے ایک نظریے کو جواباً کلاس میں بیان کیا تھا۔ یا یہ کہ ان کی زندگی کفایت شعاری کی مثال ہے جس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کا ماضی رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے دور رہا۔ اسی طرح اٹلی میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارنے کے بعد بھی سلام اطالوی زبان کی صرف شُد بُد سے ہی واقف ہیں اور وہ آج تک ٹریسٹے کی آب و ہوا سے موافقت پیدا نہ کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلام کو سردی بہت لگتی ہے جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ وسط اگست میں بھی اوورکوٹ پہنے رہتے ہیں۔

موجودہ حالات و واقعات

مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ

خالد حامدی*

۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو اجودھیا میں کارسیوکوں کے ذریعے بابری مسجد مسمار کر دی گئی اور اس کے ساتھ ہی مذہب کے نام پر وحشت و بربریت کا ننگا ناچ ملک کے طول و عرض میں شروع ہوگیا، کیا یہ محض جذباتی ابال تھا یا کسی طویل المدت منصوبے کی ایک کڑی تھا؟ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے تعلق رکھنے والے مشہور مورخ پروفیسر سشیل سری واستو اجودھیا کی تاریخ پر سند کا درجہ رکھتے ہیں برطانوی عہد کے ریکارڈ اور فیض آباد گزٹ اور تاریخ کے حوالے سے اس قضیے پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

"یہ ۱۸۵۷ء سے قبل کی بات ہے کہ انگریزوں نے نواب اودھ کے اختیارات ختم کرنے اور اس علاقے میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کے لیے اجودھیا میں فرقہ وارانہ ماحول خراب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ قضیہ ۱۸۵۳ء میں رونما ہوا، بیراگیوں اور مہنتوں نے بابری مسجد کو رام جنم بھومی قرار دیتے ہوئے اس پر قبضہ کر لیا۔ صورت حال اس وقت اور خراب ہو گئی جب ان میں سے ایک مہنت نے جس کو اس کے ساتھیوں نے اپنی جماعت سے نکال دیا تھا، مخصوص مقاصد کے تحت لکھنؤ پہنچ کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اس مہنت نے مولوی امیر علی سے تعلقات بڑھائے، مولوی امیر علی مسجد واگزار کرانے کے لیے مسلمانوں اور رنگیلی ذات سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں کی ایک جمعیت کے ساتھ اجودھیا روانہ ہوئے، اسی دوران برطانوی ریزیڈنٹ نے گورنر جنرل کونسل سے اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے واضح احکامات جاری کرنے کی درخواست کی لیکن اس سلسلے میں کسی قسم کی پہل کرنے سے روک دیا گیا اور اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے نواب ہی کو مجبور کیا گیا۔ نواب اودھ اور علما کی جانب سے دی گئی تمام یقین دہانیوں وعدوں اور پیش آمدہ خطرات کی طرف توجہ دلائے جانے کے باوجود امیر علی اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ بالآخر نواب اودھ اور انگریزوں کی فوجوں سے ان کا تصادم ہوا اور امیر علی

---

* لکچرر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

اپنے ساتھیوں سمیت جاں بحق ہوئے۔ ان کا سر لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ کے پاس روانہ کیا گیا۔

۱۸۵۵ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پھر خون خرابہ ہوا، بابری مسجد واگزار کرانے کے ساتھ مسلمانوں نے ہنومان گڑھی پر بھی حملہ کر دیا لیکن کافی جانی نقصان کے ساتھ اس کو پسپا کر دیا گیا۔ اس کے جواب میں ہندوؤں نے بابری مسجد پر حملہ کر دیا اور اسے نقصان پہنچایا۔ بالآخر برطانوی حکومت کی مداخلت سے دونوں فریقوں کے مقامی بزرگوں نے مل کر ایک سمجھوتہ کر لیا جس کے تحت بابری مسجد میں فریقین کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادت کی اجازت دی گئی لیکن ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے اس سمجھوتے میں تبدیلی کر دی۔

جب فیض آباد میں غدر ہوا تو مقامی جاگیرداروں نے اس سلسلے میں ایک قسم کی غیر جانب داری کا مظاہرہ کیا لیکن ہنومان گڑھی کے مہنتوں نے نہ صرف یہ کہ انگریزوں کی حمایت کی بلکہ انھیں پناہ دی اور انگریز فوجیوں کو رسد فراہم کی۔ غدر کو دبا دینے کے بعد بطور انعام انگریزوں نے انھیں بابری مسجد کے سامنے نزول کی زمین کے مالکانہ حقوق عطا کیے اور مسجد کے سامنے ایک چبوترہ بنانے کی اجازت دے دی جسے "رام چبوترہ" کا نام دیا گیا۔ ان واقعات کے تجزیے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت نے جان بوجھ کر اپنے مفادات کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ اختلافات اور تقسیم کے بیج بوئے۔ ۱۸۵۹ء میں مسلمانوں کو صرف شمالی دروازے ہی سے مسجد کے اندر جانے کی اجازت دی گئی اور اس طرح واضح طور سے ۱۸۵۵ء کے سمجھوتے کی خلاف ورزی کی گئی۔ ان احکامات کی سختی سے تعمیل کی خاطر مسجد اور پلیٹ فارم کے درمیان تار لگا دیے گئے اور اس طرح مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیچ مستقل تنازعہ کا بیج بو دیا گیا۔"

Monthly "Probe India" Allahabad, January 1988, PP. 39-40)

انگریزوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کا انتقام لینے اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے گزٹ اور تاریخ کی کتابوں میں جھوٹ کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے لکھا کہ بابر نے بابری مسجد رام کی جائے پیدائش پر بنے ہوئے ایک قدیم مندر کو توڑ کر بنائی تھی اور اس طرح اس مسئلے کو براہ راست ہندو مذہب کی اساسی شخصیت سے وابستہ کر دیا گیا کئی مرتبہ رام چبوترے پر رام مندر بنانے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ آخر ۲۲، ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں مسجد اور چبوترے کی درمیانی دیوار توڑ کر رام، سیتا اور لچھمن کی مورتیاں مسجد میں رکھ دی گئیں، عدالت کی طرف سے اس پر تالا ڈال دیا گیا لیکن مورتیوں کے درشن اور پوجا کی اجازت باقی رہی۔

یہ قضیہ ملک گیر پیمانے پر اس وقت سامنے آیا جب یکم فروری ۱۹۸۶ء کو فیض آباد کے ضلع جج کرشن موہن پانڈے نے اپنے ایک فیصلے میں متنازعہ عمارت کا تالہ

کھولنے کا حکم دیا۔ تالا کھلوانے اور پوجا و درشن کو دور درشن پر تین دن دکھایا گیا۔ اس سے قبل حکومت شاہ بانو کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلے پر مسلمانوں کی عمومی ناراضگی کو محسوس کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں ایک بل پاس کرا چکی تھی جس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف مسلم پرسنل لا کو سامنے رکھا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر حکومت پر مسلم نواز ہونے اور فرقہ پرستوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے الزامات لگائے گئے تھے۔ حکومت کا تالا کھلوانے والا عمل، اس کے جواب میں ہندوؤں کے اعتراضات کو ختم کرنے کی ایک کوشش کے طور پر تھا لیکن بجائے اس کے کہ معاملہ سلجھتا اور الجھتا چلا گیا۔ ۴۰ سال سے ایک فتنہ جو عدالت کی فائلوں میں دفن تھا اور اس کے بارے میں صرف مقامی لوگوں ہی کو واقفیت تھی، ایک دم سے پورے ملک کی فضاؤں میں چھا گیا۔

شاید ملکی پیمانے پر مسلمانوں کا ردّ عمل اتنا شدید نہ ہوتا، اس لیے کہ بابری مسجد اور اس کی حقیقت کے بارے میں عام مسلمانوں کو کوئی علم نہ تھا لیکن خدا بھلا کرے سید شہاب الدین کا کہ انھوں نے اپنا سیاسی قد بڑھانے کے لیے اس مسئلے کو اس قدر اچھالا کہ وہ مسلمانوں کے لیے ایک جذباتی مسئلہ بن گیا۔ آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور آدم سینا وجود میں آئے تو دوسری طرف وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل حرکت میں آئے۔ محمد اعظم خاں اور مولانا مظفر حسین کچھوچھوی کے اشتعال انگیز کیسٹ مسلم آبادیوں میں گردش کرنے لگے۔ بابری مسجد کو واگزار کرانے کے لیے بوٹ کلب پر ۲ لاکھ سے زاید افراد پر مشتمل ریلی نکالی گئی جس میں کفن بر دوش حضرات بھی شریک ہوئے۔ اس کے جواب میں اوما بھارتی اور سادھوی رتھمبرا کے انتہائی زہریلے اور اشتعال انگیز اور غارت گری پر آمادہ کرنے والے کیسٹ پورے ملک میں پھیل گئے۔ یکم فروری ۱۹۸۹ء کو وشو ہندو پریشد کے ذریعے بلائی گئی سادھوؤں پر مشتمل دھرم سنسد نے ۹ نومبر کو رام مندر کی بنیاد رکھنے کا اعلان کیا۔ اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کی رضامندی سے شیلا نیاس عمل میں آیا۔ ۱۹۸۹ء کے جنرل الیکشن کے موقع پر راجیو گاندھی نے اجودھیا سے الیکشن مہم شروع کی اور رام راجیہ کا وعدہ کیا۔ انتخابات میں کانگریس نے شکست کھائی اور وی پی سنگھ بھارتیہ جنتا پارٹی اور بائیں بازو کی حمایت سے حکومت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ لال کرشن اڈوانی نے رام مندر کی تعمیر کے سلسلے میں رائے عامّہ کو ہموار کرنے کے لیے رتھ یاترا نکالی۔ اترپردیش کے وزیر اعلیٰ ملایم سنگھ یادو نے چیلنج کرنا شروع کیا کہ نہ تو بابری مسجد کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہاں مندر بنایا جا سکتا ہے اور اس طرح امن و امان کی صورت حال بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ امن و قانون کی فضا کو برقرار رکھنے اور کشیدگی کے ماحول کو کم کرنے کے لیے رتھ یاترا کو روکی گئی اور اڈوانی کو ان کی پارٹی سمیت گرفتار کر لیا گیا جس کے نتیجے میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے حکومت کی حمایت واپس لے لی حکومت کو استعفیٰ دینا پڑا۔ ۱۹۹۱ء کے وسط مدتی انتخابات میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے رام مندر کی تعمیر کو انتخابی موضوع بنا کر اور مینی فیسٹو میں شامل کر کے پارلیمنٹ کی ۱۱۹ سیٹیں حاصل کر لیں اور اس طرح بھارتیہ جنتا پارٹی پارلیمنٹ اور اسمبلی میں سب سے بڑی اور اپوزیشن پارٹی کے طور پر نمودار ہوئی۔ اس کے علاوہ اترپردیش، راجستھان، مدھیہ پردیش اور ہماچل پردیش جیسی چار ریاستوں میں اس کی حکومتیں بھی قائم ہو گئیں۔ پورے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فضا خراب کرنے کے لیے ایک بھرپور ہتھیار ہاتھ آ گیا۔ خطرناک فسادات

شروع ہو گئے۔ انسانی جان و مال اور آبرو کو پامال کیا جانے لگا اور کامیابیاں ان کے قدم چومنے لگی ——— ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ۳ لاکھ کے قریب کارسیوکوں نے سپریم کورٹ اور حکومت کے واضح احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے بابری مسجد کو زمین کے برابر کر دیا اور وہاں ایک عارضی مندر کھڑا کر دیا اور اس طرح اسلام، مسلمانوں اور ہندوستان کی شہرۂ آفاق مذہبی رواداری اور اتحاد و یک جہتی کے خلاف وہ سازش جس کی بنا ڈیڑھ سو سال قبل انگریزوں نے ڈالی تھی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ ملکی فضا پر فرقہ وارانہ جنون و دیوانگی کے مہیب بادل چھا گئے اور بھارتیہ جنتا پارٹی پارلیمنٹ پر قبضے کے لیے پر تولنے لگی۔

یہ حقیقت ہے کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا، تاریخ کو واپس نہیں لایا جا سکتا لیکن مسلمانانِ ہند کو غور کرنا چاہیے کہ فرقہ پرست پارٹیاں جو ایک عرصے سے تگ و دو کر رہی تھیں لیکن ملکی سطح پر ان کو کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں مل پا رہی تھی۔ ان کو آناً فاناً اتنی مقبولیت کیسے حاصل ہو گئی، اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں کن عوامل اور کن افراد کا ہاتھ رہا ہے؟ خود مسلمانوں کو اس سلسلے میں مذہبی نقطۂ نظر اور حکمتِ عملی کے پہلو سے کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ خود احتسابی اور جائزہ اشد ضروری ہے تاکہ آئندہ بہتر نتائج کے لیے غلطیوں کے امکانات کو کم سے کم تر کیا جا سکے۔

اندازے کی غلطی

جب بابری مسجد کے تالا کھلنے کا واقعہ ہوا تو مسلمان اس سے قبل شاہ بانو قضیے کے سلسلے میں پارلیمنٹ سے بل پاس کروا چکے تھے، اس لیے بابری مسجد قضیہ اٹھانے والوں لیڈروں نے یہ غلط اندازہ لگایا کہ وہ پہلے کی طرح حکومت پر عوامی دباؤ ڈال کر اس مسئلے کو بھی حل کرا لیں گے۔ یہ ان کی زبردست بھول تھی۔ اس لیے کہ دونوں معاملوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شاہ بانو مسئلہ اور مسلمانوں کے حق میں پارلیمنٹ سے منظور کرایا جانے والا بل صرف مسلمانوں سے متعلق تھا۔ اس قضیے میں کسی دوسرے فرقے پر اس کی زد نہیں پڑ رہی تھی۔ جب کہ بابری مسجد رام جنم بھومی کا مسئلہ مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کے نزدیک ان کی بنیادی مذہبی شخصیتوں سے وابستہ کر دیے جانے کے نتیجے میں جذباتی ہو گیا تھا۔

مسلمانوں کے نزدیک بابر بادشاہ کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی وہ مسلمانوں میں بہت مقبول بادشاہ کی حیثیت سے مشہور ہے اور نہ ہی بادشاہوں کے اقوال و اعمال کو اسلام میں مذہبی سند کا درجہ حاصل ہے۔ جب کہ رام ہندوؤں میں اوتار کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں اور عام ہندو کی زندگی کو رام اور ان کی شخصیت سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ غرض رام نے مذہبی، سماجی اور روایتی طور پر عام ہندو معاشرے پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اجودھیا مسلمانوں کے نزدیک مذہبی لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے جب کہ ہندوؤں کے نزدیک اس کی حیثیت وہی ہے جو مسلمانوں کے نزدیک مکہ و مدینہ کی ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک بابری مسجد کی ایک عام مسجد سے زیادہ کوئی اور مذہبی حیثیت نہیں تھی جب کہ رام جنم بھومی کی حیثیت سے شہرت پا جانے کے نتیجے میں عام ہندوؤں کے نزدیک اسے نہایت اہم مذہبی مقام کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ عام مسلمانوں کے نزدیک تو کیا خود اجودھیا کے لوگوں کے لیے بھی مذہبی نقطۂ نظر سے اس میں نماز پڑھنا ضروری نہیں تھا جب کہ ہندوؤں کے یہاں رام جنم بھومی قرار دیے جانے کی وجہ سے تمام ہندوؤں کے نزدیک وہاں کی تیرتھ کرنا اور درشن و پوجا کرنا انتہائی اہم مذہبی و جذباتی چیز بن چکا ہے۔

مسلم دورِ حکومت میں ایک عرصے تک اجودھیا اودھ کا دار الحکومت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں سے کافی آباد تھا لیکن اب وہاں مسلمانوں کی تعداد مشکل سے دو ہزار ہے اور وہ بھی بہت منتشر صورت میں، خود بابری مسجد کے قبضے کے آس پاس مسلم آبادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ بابری مسجد کے علاوہ اجودھیا میں دسیوں آباد و غیر آباد ویران مساجد ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ بابری مسجد کے بغیر مسلمانوں کو نماز کی ادائیگی میں کسی قسم کی دشواری ہوتی ہو جب کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو عوام کو مسلسل باور کرائے جانے کے بعد کہ یہی رام جنم بھومی ہے، ان کے نزدیک کوئی دوسری جگہ اس کا متبادل نہیں ہو سکتی ہے۔

اس قضیے کے سلسلے میں یہی وہ واضح فرق ہے جس کی وجہ سے مسلمان نوجوان سیاسی قیادت سے اندازے کی غلطی سرزد ہوئی اور وہ انگریزوں اور فرقہ پرستوں کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہایت ذہانت سے تیار کی گئی سازش کا شکار ہوتے چلے گئے اور جیسے جیسے انھوں نے اس قضیے کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، ہندو فرقہ پرست طاقتیں ان سے کہیں زیادہ ہزاروں گنا فائدہ اٹھاتی چلی گئیں اور اس طرح ۱۲ فیصد مسلمانوں کے عوامی دباؤ کے مقابلے میں اکثریت کا عوامی دباؤ اپنا کام کر گیا۔

معاملہ نافہمی

مسجد آباد ہو یا ویران یا بے حرمتی کا اندیشہ ہو یا اس کی حیثیت انتہائی مشتبہ کر دی گئی ہو یا کوئی شدید ضرورت آپڑی ہو وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی گہرائی تک قیامت تک کے لیے مسجد ہی رہتی ہے اور کسی بھی حالت میں اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ یہ چیز نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں اور نہ ہی عمل سے اس کا ثبوت ملتا ہے، محض ایک رائے ہے۔ اس مسئلے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ اختلافی مسئلے میں جہاں کسی فتنے کا اندیشہ ہو اس میں ہمیشہ اس رائے پر عمل کیا جاتا ہے جس سے فتنے کو ٹالا جا سکے اور یہ بات تو یقینی ہے کہ اس قسم کی اختلافی آرا صرف اسلامی حکومت میں ہی نافذ العمل ہو سکتی ہیں، وہ علاقے جہاں کی اکثریت اسلام کے اساسی امور سے نہ صرف غیر واقف بلکہ شدید غلط فہمیوں کی شکار ہو وہاں ایک اختلافی مسئلہ منوانے پر اس حد تک اصرار کرنا کہ اس کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت گری، آبرو ریزی اور اتلافِ جان کا اندیشہ ہو یا ہو رہا ہو اسلام کی نہایت غلط تشریح و تعبیر اور غلو فی الدین ہے جس کا خمیازہ ہمیں دنیا اور آخرت دونوں میں بھگتنا پڑے گا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

... ایاکم والغلوّ فی الدین، فانما اھلک من کان قبلکم الغلوُّ فی الدین۔

(سنن نسائی، کتاب مناسک الحج، باب التقاط الحصی / سنن ابن ماجہ، ابوالمناسک و متعلقاتہ باب قدر حصی الرمی / مسند احمد ا۔ ۲۱۵، ۳۴۷)

[دین میں غلو اور شدّت سے بچو کیوں کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی وجہ سے تباہ و برباد ہوئی ہیں]

قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُھَاجِرُوْا فِيْھَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا۔ (النساء ۴: ۹۷)

[جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض

کہیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم دوسری جگہ منتقل ہو جاتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے ۔"

ہجرت سے متعلق یہ آیت اس مسئلے میں بھی ہماری واضح رہنمائی کرتی ہے کہ کسی مقام پر عبادت ممکن نہ ہو تو اس جگہ پر اصرار کر کے اپنے آپ کو آزمائش میں مبتلا کرنے کے بجائے دوسری جگہ عبادت کرنی چاہیے، ورنہ اتلاف جان و مال کی صورت میں آخرت میں جواب دہی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء میں بلا مبالغہ سینکڑوں مسجدوں کو زمیں بوس کر دیا گیا اور ہزاروں مساجد پر قبضہ کر لیا گیا۔ دہلی، پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش کی ہزاروں مساجد اس کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیان ایڈورڈ پارک (موجودہ نام سبھاش چندر بوس پارک) ہے، یہاں مسجد اکبر آبادی واقع تھی۔ یہ مسجد شاہ جہاں کی بیوی اکبر آبادی بیگم نے بنوائی تھی۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ اسی مسجد میں رہتے تھے۔ بعض علما کی علمی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بھی یہی مسجد تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد یہ مسجد ڈھا دی گئی۔ اس مسجد کے کتبے کا ایک حصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد میں لگا ہے۔ امکان یہ ہے کہ سر سید کتبے کا یہ حصہ اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے ہوں گے۔ (آثار الصنادید، حصہ سوم: سر سید احمد خاں مرتبہ خلیق انجم ص ۳۶۰، دہلی، اردو اکیڈمی، ۱۹۹۰ء) اس مسجد کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ غدر کے ہنگامے اور فساد کی نذر ہو گئی لیکن ایک اور مسجد کے بارے میں ملاحظہ فرمایے جہاں آج کل پرانے دہلی ریلوے اسٹیشن ہے وہاں مسجد اورنگ آبادی واقع تھی۔ یہ شاہ جہاں کی ایک اور بیوی اورنگ آبادی بیگم نے تعمیر کروائی تھی، جب ۱۸۵۲ء میں یہاں ریل کی پٹری ڈالی گئی تو اس کو شہید کر دیا گیا۔ (آثار الصنادید، حوالہ سابق)۔ یہ مسجد اس وقت شہید کی گئی جب کہ مغل حکومت کا نام چل رہا تھا، دہلی مفتی صدر الدین آزردہؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا احمد علی سہارنپوریؒ اور مولانا محمد شاہ دہلویؒ جیسے علما و محدثین سے معمور تھی۔ یہ حادثہ شاق کس پر نہیں گزرا ہوگا لیکن ان حضرات نے کوئی تحریک نہیں چلائی۔ یہاں دو مساجد کا ذکر کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ پتہ نہیں کتنی تاریخی مسجدیں زد میں آئیں لیکن کبھی کسی انتہا پسندانہ رائے پر عمل کرنے اور قتل و غارت گری کا موقع دینے کی نا سمجھی نہیں کی گئی اور نہ ہی شریعت میں تمام مقبوضہ مساجد کو آزاد کرانے اور منہدم کی گئی مساجد کو دوبارہ تعمیر کرانے کا ہر حالت میں مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔

یہ تو ہوئی ہندوستان کی بات لیکن میں آپ کو لے چلتا ہوں اس عہد نبوی میں جس سے ہم روشنی حاصل کرتے ہیں اور جس کی بدولت آج ہم اسلام کی نعمت سے سرفراز ہیں، خانہ کعبہ جو سب سے قدیم مسجد یعنی بیت اللہ ہے جو اسلام کے اصل الاصول توحید کا بنیادی مرکز ہے جس کی نمائندگی دنیا کی تمام مساجد کرتی ہے جس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے جس کا حج کرنا ہر ذی حیثیت مسلمان پر فرض ہے۔ یہ وہ بیت اللہ ہے جو ہر مسلمان کو اللہ اور اس کے رسول کے بعد سب سے زیادہ محبوب ہے: اس میں آپ کی بعثت کے وقت ۳۶۰ بت تھے اور اس کا طواف مرد و زن عام طور پر ننگے ہو کر کرتے

تھے اس میں آپ اور آپ کے ساتھیوں کو نماز پڑھنے کی آزادی نہ تھی لیکن آپؐ نے اپنی دعوت میں جو تمام تر توحید ہی کے ارد گرد گھومتی تھی کبھی بھی اس مسئلے کو لے کر مہم نہیں چلائی کہ خانہ کعبہ کو ان بتوں سے صاف کرو، ننگے طواف کر کے بے حیائی نہ پھیلاو، ملّت ابراہیمی کے اصل وارث ہونے کی وجہ سے ہم زیادہ حقدار ہیں، اسے ہمارے حوالے کردو، بلکہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے سلسلے میں لوگوں کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا جب مکہؓ کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا اور باقی ماندہ افراد بھی آپ کے آگے سر تسلیم خم کر چکے تو آپؐ نے خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا اور بعد میں ننگے طواف کرنے کی ممانعت بھی کر دی گئی لیکن ایسی صورت میں بھی جب کہ آپ کو عرب کی اکثریت اللہ کا رسول اور اپنا رہنما تسلیم کر چکی تھی، محض لوگوں کے فتنہ میں مبتلا ہو جانے، دین اسلام سے بدگمان ہو جانے اور شر و فساد کے پھیل جانے کے اندیشے سے خانہ کعبہ کے سلسلے میں شدید خواہش کے باوجود آپ نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ وہ منصوبہ کیا تھا جس کی تکمیل کی آپ کو شدت سے خواہش تھی حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپؐ نے فرمایا:

" اگر تمہاری قوم نے جلد ہی اسلام قبول نہ کیا ہوتا تو میں خانۂ کعبہ کو ڈھا کر اسے اصل ابراہیمی بنیادوں پر استوار کرتا۔ اس لیے کہ قریش اس کی تعمیر صحیح طور پر نہیں کر پائے ہیں۔"

راوی کہتا ہے کہ یہ کام بعد میں اموی دورِ حکومت میں حضرت ابن زبیرؓ نے انجام دیا۔ (صحاح ستہ و مسند احمد)

یعنی دین کے معاملے میں بھی حکمت عملی کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، اس حکمت عملی کے تحت بہت سے ضروری امور بھی انجام نہیں دیے گئے یا ان کو معرضِ التوا میں ڈال دیا گیا۔ عہد نبوی کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمایے۔ مدینہ میں مسلمان کس قسم کے خطرات سے دوچار تھے۔ بیرونی خطرات تو تھے ہی اندرونی طور سے منافقوں اور یہودیوں کی ہر ممکنہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سازش کر کے اسلامی جمعیت کو منتشر و پریشان کیا جا سکے۔ منافقوں کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی اس میں بہت آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اوپر سے مسلمانوں کے ساتھ اور اندر سے دشمنوں سے ملا ہوا تھا۔ ایک موقع پر اس نے ورغلا کر مہاجروں اور انصاریوں کے درمیان نہ صرف یہ کہ لڑائی کروادی بلکہ جیسا کہ قرآن میں ذکر کیا گیا ہے (المنافقون، ۶۳: ۸) اس نے ان الفاظ میں باضابطہ علی الاعلان دھمکی دی کہ " ہم میں سے باعزت لوگ (انصار) ذلیل لوگوں (مہاجرین) کو مدینہ سے کھدیڑ دیں گے۔" انتہائی سنگین صورت حال تھی حضرت عمرؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ اگر آپؐ اجازت دیں تو میں اس منافق کی گردن اڑا دوں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں! رہنے دو، لوگ یہ پروپیگنڈہ کریں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

(صحیح البخاری کتاب التفسیر، باب قولہ سواء علیہم استغفرت لہم

" مسلمان جہاں کہیں بھی رہتا ہے اس ملک کا ایک جزو بن کر رہتا ہے اس کے آئین کا احترام کرتا ہے اس کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اس ملک کی بدخواہی میں شریک نہیں ہوتا وہاں کے رسم و رواج کی عرف عام کی پیروی کرتا ہے اور اس لحاظ سے اس ملک کا جزو اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کوئی غیر مسلم ہو سکتا ہے۔"

عبدالماجد دریابادی

ام لم تستغفر لہم)

اِسلام میں عمارت یا بھومی پوجا نہیں ہے بلکہ جہاں بھی نماز ممکن ہو وہاں نماز پڑھی جائے گی:

وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا
فثم وجہ اللہ (البقرہ ۲: ۱۱۵)

[مشرق و مغرب سب اللہ کے لیے تو جہاں بھی تم رُخ کرو وہیں اللہ ہے]۔

پھر اس مسجد کے سلسلے میں ہمارے موقف میں سختی کیوں ہو۔ ہمیں تو خود ہی انگریزوں کی اس سازش کو محسوس کرکے اس کو اپنے وقار کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے تھا اور کسی قابلِ عمل فارمولے کو تسلیم کر لینا چاہیے تھا لیکن بُرا ہو انتہا پسندی کا شدّت کا کہ ہمارے طرزِ عمل اور موقف کی سختی کو عام ہندوؤں کے نزدیک رام دشمنی پر محمول کیا جانے لگا۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ رام ہوں یا کرشن ہمارا رویہ نرمی کا ہونا چاہیے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں اس قوم میں نبی بنا کر بھیجے گئے ہوں۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

بے شک انسانوں میں باہم کبھی کبھی رنج ہو جانا ایک قدرتی بات ہے۔ ہندو اور مسلمانوں پر موقوف نہیں ہے۔ آپس میں ہندو ہندوؤں میں مسلمان مسلمانوں میں، بھائی بھائیوں میں، باپ بیٹوں میں، ماں بیٹیوں میں رنج ہوتا ہے۔ مگر اس رنج کو قایم رکھنا اور پکاتے جانا اور بڑھاتے جانا انسان کی، ملک کی، قوم کی، خاندان کی پوری بدبختی ہے۔ کیا مبارک ہیں وہ لوگ جو معافی چاہتے ہیں اور اس گرہ کو کھولنے میں جو محبت میں پڑ گئی ہے پیش قدمی کرتے ہیں اور اپنے بھائی یا ہم وطن یا ہم قوموں سے بے قصور ہونے پر بھی معافی چاہتے ہیں اور محبت کو ٹوٹنے نہیں دیتے او مقلب القلوب تو ہندوستانوں کے لوگوں کو اسی طرف پھیر دے"

[illegible] ۱۵ [illegible]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۲، شمارہ ۷، (جولائی ۹۳ء)

مسلمان کیا کریں؟

محمد اسحاق *

روزنامہ 'سیاست' میں ایک بہت ہی مفید بحث یہ چل رہی ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمان کیا کریں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر ایم اے مجید خاں اور ڈاکٹر بیگ احساس کے متوازن مضامین پڑھنے میں آئے جو ان حضرات کی دانش وری کا ثبوت ہیں، ان پر تبصرے بھی بہت خوب تھے۔ بابری مسجد کے حادثے کے بعد کئی ایک دانش ور، صحافی، قائدین اور دردمند لوگوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ہر محفل و مجلس میں ان باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کا اثر دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے لیکن ابھی ہاتھ پاؤں میں حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ فکر و دانش کی اتنی باتیں سامنے آچکی ہیں کہ اب صرف عمل کا میدان رہ گیا ہے جو ابھی بنجر ہی ہے۔ ہماری ہر بات کی تان "ایسا ہونا چاہیے" پر آکر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نیند میں کچھ کلبلانے لگے ہیں۔ ابھی اٹھنا اور چلنا باقی ہے کام کرنے کے بہت ہیں اور دور نہیں اپنے گھر کے باہر ہی ہیں اور ہمارے اطراف و اکناف میں ہیں، چند ضروری کام اجمالاً پیش ہیں۔ بس بسم اللہ کیجیے اور کام شروع کر دیجیے جس سے جو ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ بہت بڑا پروجیکٹ ہی لے کر اٹھیں۔ ہر چھوٹا بڑا کام جو ملت کے لیے آپ کریں گے وہ خود بڑا کام ہے۔

۱۔ ہر دردمند یہ ارادہ کرے کہ وہ روزانہ ایک دو گھنٹہ مسلمانوں کے فلاحی کاموں کے لیے وقت دے گا۔ اتنا نہیں ہو سکتا تو ہفتہ میں دو گھنٹے پوری تندہی کے ساتھ فلاحی کاموں میں عملاً حصہ لے۔

۲۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی سال بھر کی آمدنی کا کم از کم ایک فی صد ملت کے فلاحی کاموں کے لیے خوشی سے دے دے۔ سنتے ہیں کہ کرسچین مشنری اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے والے طلبا اپنی آمدنی کا پانچ تا دس فیصد مشنریز کی انتظامیہ کو پابندی سے ادا کرتے ہیں اور یہ ادارے اسکولوں اور دواخانوں کے ذریعے جو ملک کی خدمت کر رہے ہیں اس کی

* جاوید منزل، 11-4-644/6 بازار گھاٹ، حیدرآباد

تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

۳۔ اپنے محلہ، قصبہ میں ایسے بہت سے بچے ہیں جن کے ماں باپ اپنی غربت جہالت کی وجہ سے کبھی انھیں قریبی اسکول میں شریک کروانے کا خیال ہی نہیں آتا ایسے بچوں کو قریبی اسکولوں میں لے جاکر شریک کروایے۔ اگر توفیق ہوئی تو ان کی فیس، کتابوں، کاپیوں اور یونی فارم کا انتظام کر دیجیے۔ دیکھیے دو چار بچوں کو شریک کروانے سے سارے محلے میں کیا کچھ حرکت پیدا ہوگی۔ دیکھنے میں یہ کام بہت معمولی ہے لیکن یہ بچے جب بڑے ہوجائیں گے تو آپ کو یاد کریں گے کہ زندگی ان کی کیا سے کیا ہوگئی — یہ کام محلہ واری ایجوکیشن سوسائٹی منظم طریقے پر بھی کر سکتی ہے۔

۴۔ مسلمانوں میں سوشل سروس تنظیموں کا قحط ہے۔ ہر محلے، قصبات اور اضلاع میں سوشل سروس تنظیموں کی ضرورت ہے جو مستقل طور پر قائم ہوں اور وہ عام مسلمان آبادی بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی ہمدردی کے کام کرکے سماج میں اپنی عزت و وقار بڑھا سکتے ہیں۔

۵۔ مسلمانوں کی ۸۰ فی صد آبادی پڑھی لکھی نہیں ہے۔ سارے ملک میں یہ قوم تعلیم میں بہت پیچھے ہے۔ تعلیم کا میدان اتنا وسیع ہے کہ اگر کچھ لوگ اپنی زندگی کا مشن بنالیں تو اچھا ہے اس میں گزشتہ دس برس سے بہت کام ہو رہا ہے۔ یہ سب ساری مسلم قوم کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں لیکن یہ سب کام بیس پچیس فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ ابھی بہت کام باقی ہے۔

۶۔ مسلمانوں کا کوئی انگریزی روزنامہ نہیں ہے، جو قومی سطح کا ہو جس کا معیار بھی اونچا ہو۔ اگر ہماری آبادی ۱۲ کروڑ ہی مان لی جائے تو ان کی آواز، ان کے خیالات اور احساسات سے اہلِ وطن بے خبر ہیں۔ جہاں تک اردو اخبارات کا تعلق ہے سید حامد کے الفاظ میں "ہم ہی لکھتے ہیں اور ہم ہی پڑھ لیتے ہیں" (بلکہ ہم ہی خوش بھی ہوجاتے ہیں) دسمبر ۹۲ء کے واقعات کے بعد انگریزی پریس کا احسان ماننیے کہ ان اخبارات نے ایسے اچھے اداریے اور مضامین شائع کیے کہ شاید کسی مسلمان سے بھی یہ ممکن نہ تھا۔

دو چار برس پہلے مولانا ابو الحسن علی ندوی اور سید حامد نے قومی سطح پر ایک انگریزی اخبار نکالنے کی تحریک چلائی تھی، جس کے لیے ایک کروڑ پندرہ لاکھ روپیے کی ضرورت تھی اور چندہ کی اپیلیں سارے ملک کے مسلمانوں سے کی گئی تھیں۔ افسوس ہے کہ صرف ساڑھے سترہ لاکھ روپیہ جمع ہوا۔ سات لاکھ روپیے حیدرآباد سے جناب عابد علی خاں کی کوششوں سے وصول ہوے اور باقی سارے ملک سے دس لاکھ اور یہ ساری اسکیم ٹھپ ہوکر

رہ گئی۔ بارہ کروڑ سے زیادہ کی آبادی سے اتنا نہیں ہو سکا کہ وہ اتنی حقیر رقم بھی اتنے بڑے کام کے لیے جمع کر سکے! یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ہمارا اس زمانے میں ذرائع ابلاغ میں کوئی حقیر حصّہ بھی نہیں ہے۔ ہم میں ضرور سیکڑوں افراد ایسے موجود ہیں جو بغیر کسی مدد کے اکیلے یا چند حضرات مل کر بھی ایک اونچا انگریزی اخبار جاری کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم کس کو قصور وار ٹھہرائیں۔

۷۔ مسلمانوں کی الگ سیاسی تنظیم اس میں پنپ نہیں سکتی۔ یہ دور جمہوریت کا ہے، جمہوری نظام میں عددی اکثریت کا بول بالا ہے۔ ؎

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے
(علامہ اقبالؒ)

اس وقت پورے شعور کے ساتھ ہمیں ان سیاسی جماعتوں کا ساتھ دینا چاہیے جو حکومت بنا سکتے ہیں۔ پسماندہ طبقات، شیڈولڈ کاسٹس اور اقلیتوں کا اتحاد ۸۲ فی صد آبادی کا متحدہ محاذ بن سکتا ہے۔ اپنی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے بھی ہم ان کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ یہ بات تو اب نوشتۂ دیوار ہے کہ مسلمان اگر آنے والے دنوں میں ووٹ کی قوت جو جمہوری نظام حکومت میں "سیاسی ایٹمی طاقت" (POLITICAL ATOMIC POWER) کی حیثیت رکھتی ہے، بغیر کسی پروگرام اور واضح منصوبے کے استعمال کریں تو اس طاقت کو ضایع کر دیں گے۔ سیاست کو شجر ممنوع سمجھتے ہوئے مسلمانوں نے سخت غفلت کی اور اس کی سزا ابھی آج تک بھگت رہے ہیں۔ سیاست ایک کڑوا کسیلا پھل ہے جسے ملت کی صحت کے لیے ہضم کرنا ضروری ہے ——— یہ جو تجویز ہے کہ اہل وطن کے ساتھ ربط ضبط بڑھائیں اور ان کی غلط فہمیاں دور کریں۔ وہ سیاست کے راستے سے بہت آسان ہے، باقی سب طریقے اسی کے تحت آجاتے ہیں۔

"بے شک تم میں اللہ کے پیغمبر میں
اس کے لیے نیک نمونہ ہے جو
جو اللہ اور روز آخر کی توقع رکھتا ہو
اور اللہ کو بہت یاد کرے۔"
سورہ ۳۳ آیت ۲۱

سبز خون

محمد اسلم پرویز*

آج کل اگر کسی سے یہ سوال کیا جائے کہ اس وقت ہمارا ملک کس بحران سے گزر رہا ہے تو جواب آپ کو عموماً وہی ملے گا جس کا اخباروں میں چرچا رہتا ہے یعنی سیاسی اتھل پتھل، حزبِ مخالف کے الزامات اور حکومت کی تردید۔ اسی سیاسی صورت حال نے ایک مرتبہ پھر ہماری توجہ بہت سے بنیادی مسایل کی جانب سے موڑ دی ہے۔ کچھ ایسے مسایل جن سے غفلت برتنے کا نتیجہ ماضی میں ہم اور ہمارے علاوہ دوسری بہت سی قومیں بھگت چکی ہیں۔ کیا یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ اس وقت ملک کی ۲۰ سے زاید ریاستیں خشک سالی کا شکار ہیں۔ ۳۰ کروڑ سے زیادہ افراد قحط اور خشک سالی سے متاثر ہیں۔ ملک کے ایک بڑے حصے میں بارشوں کا دور دورہ نہیں ہے اور برسات کے آنے میں اس تاخیر کی نظیر گزشتہ صدی تک کہیں نظر نہیں آتی۔ ملک کی ۱۳ ریاستوں میں سورج کی تمازت سے زمین خشک ہو کر پھٹ چکی ہے۔ گاوں تو گاوں، شہروں میں بھی ایک دو گھنٹے پانی آتا ہے۔ نلوں پر لمبی لمبی قطاریں لگی نظر آتی ہیں۔ ندی، پوکھر، تالاب خشک ہو چکے ہیں۔ کنووں کا پانی دور ہوتے ہوتے آسمان کا تارہ ہو گیا ہے۔ گجرات ہو یا مہاراشٹر، اڑیسہ ہو یا آندھرا پردیش، کرناٹک ہو یا تمل ناڈو، کیرالا ہو یا راجستھان، یو۔پی کے علاقے ہوں یا ہریانہ کے۔ جدھر جایے آپ کو یہی نقشہ نظر آئے گا لیکن سیاست کی عینک لگائے ہماری ناعاقبت اندیش قیادت کو صرف اپنی گدّی اور ایوانِ حکومت کے لرزتے ستون نظر آ رہے ہیں۔ کہیں کرسی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد ہے تو کہیں کرسی کھینچنے کی سازش۔

تاریخ میں ایسی مثال ملنی مشکل ہے کہ جب ملک ایک زبردست تباہی کے دہانے پر کھڑا ہو جہاں بربادی یقینی نظر آئے اور اربابِ حکومت باہم دست و گریباں ہوں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی قرار داد میں ان خیالی طاقتوں کا ذکر اکثر آتا ہے جو ملک میں عدم استحکام پیدا کرنے پر تلی ہیں لیکن اس خطرے کا احساس کہیں نہیں نظر آتا جو سچ مچ عدم استحکام پیدا کر دینے والا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بھوکا پیاسا عام آدمی سب سے بڑا باغی ہوتا ہے۔ آج حکومت خود کفالت کے بلند بانگ

---

* لکچرار، باٹنی ڈپارٹمنٹ، ذاکر حسین کالج (دہلی یونیورسٹی) اجمیری گیٹ، دہلی۔

دعوے کرتی ہے، خوراک کے معاملے میں خود کفیل اور گوداموں میں محفوظ سوا دو کروڑ ٹن اناج کے ذخیروں کا اعلان کیا جاتا ہے لیکن پانی کے محاذ پر خود کفیلی کی صورتِ حال کیا ہے؟ پانی جیسی شے جس کو کسی پنج سالہ پلان کے تحت پیدا نہیں کیا جاتا جس کے بیش بہا خزانے قدرت نے وافر مقدار میں عطا کیے تھے وہ آج ہماری غلطیوں کی وجہ سے عنقا ہے۔ جس ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں، وہاں آج صاف پانی کا ایک چشمہ ڈھونڈنا بھی ایک مشکل کام ہے عوام کی صحت اور خوراک کے اجزا پر جب بحث ہوتی ہے تو حکومت اعداد و شمار پیش کرتی ہے کہ اوسطاً ایک صحت مند آدمی کو اتنے گرام پروٹین اور اتنی کیلوری توانائی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کتنے لیٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے یہ کوئی نہیں بیان کرتا۔ وہ پانی کتنا صاف ہو اور کہاں سے دستیاب ہو، یہ بھی کوئی نہیں بتاتا۔ آج آزادی کے چالیس سال بعد جب ہم پنج سالہ پلانوں پر عمل درآمد کر چکے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے لاکھوں افراد کو پانی بھی میسر نہیں ہے تو یہ نہ صرف ہمارے لیے ایک قابلِ شرم حقیقت ہے بلکہ یہ اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ کچھ اہم ترین معاملات میں ہماری منصوبہ بندی کتنی ناقص اور اس کا دائرہ کتنا تنگ رہا ہے۔ منصوبہ بندی کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ وقتی طور سے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا جائے، فوری تدارک کے علاوہ اہم قومی مسایل کے لیے طویل مدتی اور دور رس منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا ملک عرصے سے اپنی وسعت اور متضاد جغرافیائی و ماحولیاتی صورتِ حال کی وجہ سے بیک وقت خشک سالی اور سیلاب کا شکار ہوتا رہا ہے لیکن پانی کی اس غیر متوازن صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے حکومت ہر سال راحت کاری کارروائی کا اعلان کر دیتی ہے۔ ریاستی حکومتیں مرکز سے مدد کی درخواست کرتی ہیں (

مرکزی حکومت امداد دے کر سمجھتی ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا اور بس۔ یہی ہماری منصوبہ بندی ہے۔ ۱۰ اگست کو کانگریس مجلس عاملہ نے ملک کے بڑے حصے میں خشک سالی پر افسوس اور تردد کا اظہار کرتے ہوئے وزیر اعظم کو یہ اختیار دیا کہ وہ امداد یعنی راحت کے لیے ایک کمیٹی بنائیں یہ سچ ہے کہ متاثرہ افراد کی زیادہ سے زیادہ مدد ہونی چاہیے لیکن کیا ان کی قسمت میں یہی ہے کہ وہ خشک سالی یا سیلاب کے شکار ہوتے رہیں؟ کیا ان آفات کو قابو میں نہیں لایا جا سکتا؟ ان موضوعات کی جانب برسرِ اقتدار جماعت کی توجہ نہیں جاتی کوئی ملک گیر کانفرنس نہیں ہوتی، کبھی ماہرین کو یکجا کر کے ایکشن پلان نہیں بنایا جاتا۔ ہمارے ملک میں رہنماؤں کی صرف دو قسمیں ہیں ایک وہ جو برسرِ اقتدار رہنا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو برسرِ اقتدار آنا چاہتے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگ اپنے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اتنے سرگرداں اور معروف رہتے ہیں کہ ان مسایل کے بارے میں سوچنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے فوری نسخے یعنی راحت کاری سے کام چلا لیا جاتا ہے۔

خشک سالی اور سیلاب ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ پانی کی غیر قدرتی کمی سے خشک سالی اور زیادتی سے سیلاب آتے ہیں۔ پانی کی غیر متوازن صورتِ حال انسان کی حرکتوں کا ہی نتیجہ ہے۔ اس دنیا میں نظامِ قدرت کے تحت ہر چیز کا دوسری چیز کے ساتھ تعلق ہے جس کی وجہ سے قدرتی توازن قایم رہتا ہے۔ پانی کا توازن برقرار رکھنے میں جنگلات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ سطحی طور سے یہ بات اہم نہیں لگتی لیکن یہ حقیقت ہے کہ پانی زمین اور جنگل یا ہریالی کے بیچ ایک بہت اہم اور نازک رشتہ ہے جس میں کسی بھی قسم کی مداخلت یا تبدیلی تینوں کو ہی متاثر کرتی ہے اور یہی آج کل ہو رہا

ہے۔ پیڑ پودے چاہے ہریالی کی شکل میں ہوں یا جنگل کی۔ دونوں حیثیتوں میں یہ زمین پہ پانی کا نظام قایم رکھتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو پیڑ پودوں کی جڑیں کافی پانی جذب کرلیتی ہیں۔ ننگی زمین پر جب پانی گرتا ہے تو تیزی سے بہہ جاتا ہے جس کی وجہ سے زمین زیادہ پانی جذب نہیں کر پاتی۔ اس کے برعکس ہریالی مثلاً گھاس کے میدان میں سے پانی بہت سست رفتاری سے بہہ پاتا ہے جس کی وجہ سے پودے اور زمین زیادہ پانی جذب کر لیتے ہیں۔ زمین میں جذب ہونے والا یہ پانی نیچے جاکر پانی کی سوتیں بناتا ہے۔ اس طرح ہریالی سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ زمین زیادہ پانی کو جذب کرسکی۔ عام حالات میں پودوں کی جڑیں زمین میں سے پانی جذب کرتی رہتی ہیں۔ یہ پانی پودے میں سے گزر کر فضا میں ابخارات کی شکل میں شامل ہو جاتا ہے۔ اوسطاً ہر پودا اپنے جذب کیے ہوئے پانی کا ۹۹ فی صد حصہ فضا میں منتشر کر دیتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو پودے زمین کے اندر سے پانی کھینچ کر فضا میں منتشر کرتے رہتے ہیں۔ فضا میں منتشر پانی مناسب حالات کے تحت بادل بناتا ہے جس سے بارش ہوتی ہے اور یہی پانی پھر سے پودوں کی مدد سے فضا میں بھیج دیا جاتا ہے اور اس طرح یہ سلسلۂ توازن قایم رہتا ہے۔ اب اگر زمین ننگی ہو یعنی اس پر ہریالی نہ ہو تو بارش کا پانی مٹی کو کاٹ کر اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے اگر کسی کھلے میدان میں بارش ہو تو پانی کے قطروں کی چوٹ سے مٹی کٹتی ہے اور پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ننگی مٹی ہوا سے بھی کٹ کر اڑتی ہے۔ یعنی اگر ہریالی نہ ہو تو ہوا اور پانی دونوں ہی مٹی کو کاٹ کر ضایع کرتے ہیں۔

پودوں کی نشو و نما کے لیے اوپری سطح کی مٹی نہایت مفید اور زرخیز ہوتی ہے۔ قدرتی حالات کے تحت اس مٹی کے بننے میں کافی وقت لگتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک سینٹی میٹر سطحی مٹی ۸۰۰ سال کے عرصے میں تیار ہوتی ہے۔ اب اگر پانی کے ساتھ ۱۰ سینٹی میٹر مٹی بھی بہہ گئی تو قدرت کی ۸۰۰۰ سال کی محنت ضایع ہو گئی اسی وجہ سے یہ دیکھا گیا ہے کہ جن علاقوں میں سیلاب زیادہ آتے ہیں وہاں کی مٹی کی زرخیزی کم ہو جاتی ہے اور پیداوار بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح ہریالی کے نہ ہونے سے دوسرا نقصان یہ ہوا کہ زرخیز مٹی ضایع ہو گئی۔ چاہے وہ ہوا سے اڑی یا پانی سے بہی۔ اس مٹی کے کٹاو کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس علاقے کی زرخیزی کم ہو جاتی ہے اور وہاں کوشش کے باوجود پیڑ پودے نہیں لگائے جاسکتے جب ان علاقوں سے ہریالی ختم ہو جاتی ہے تو زمین سے پانی کو کھینچ کر فضا میں منتشر کرنے کا کام رک جاتا ہے جس کی وجہ سے نہ بادل بن پاتے ہیں اور نہ بارش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہریالی اور بارش کے بیچ ایک سیدھا تعلق بتایا جاتا ہے۔ بارشیں جب ایک عرصے تک نہیں ہوتیں تو دھیرے دھیرے یہ علاقے ریگستان میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ ریگستان ایسے سبھی علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں مٹی زرخیز نہ ہو، ہریالی ناپید ہو، زمین میں پانی کی کمی ہو اور بارشیں تقریباً نہ ہوتی ہوں۔ یہ سبھی خصوصیات ان علاقوں میں پیدا ہو جاتی ہیں جہاں سے ہریالی صاف کر دی جاتی ہیں۔ بالکل ایسا ہی ہمارے ملک کے کئی حصوں میں ہو رہا ہے۔ راجستھان میں جے پور کے علاقے میں ریگستان پھیل کر آبادی کے بالکل نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ سیاروں کی مدد سے لی گئی تصاویر سے یہ خطرناک صورتِ حال مزید واضح ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال کا ایک اور تاریک پہلو ہے۔ ہریالی کی غیر موجودگی میں جب مٹی کٹتی ہے تو وہ مدھر جاتی ہے نقصان کرتی ہے۔ ہوا میں شامل

یہ مٹی فضا کو گرد آلود اور بوجھل کرتی ہے جس سے ہوا کی تازگی ختم ہوتی ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہوا میں موجود اس مٹی سے الرجی کا شکار ہو کر سانس کی تکالیف کا شکار ہو جاتی ہے۔ پانی میں بہنے والی مٹی ہمارے ندی نالوں میں شامل ہو کر بہتے ہوئے دریاؤں تک پہنچتی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ دریاؤں کا پانی گدلا ہو جاتا ہے بلکہ دریاؤں میں موجود جانداروں کی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ ایسا گدلا پانی عموماً پینے کے لائق بھی نہیں رہتا۔ دریاؤں میں موجود اس مٹی سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ یہ جب دریاؤں کی تہہ میں بیٹھتی ہے تو دریاؤں میں پانی کی سطح اونچی ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ دریاؤں کو بھرتی رہتی ہے جس کی وجہ سے ان کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور دریاؤں کی پانی سمونے کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے ایک طرف تو ہریالی کے نہ ہونے کی وجہ سے پانی تیز بہتا ہے جس کے باعث زمین زیادہ پانی جذب نہیں کر پاتی اور پانی کی زیادہ مقدار بہہ کر دریاؤں میں آتی ہے دوسری طرف مٹی کے بیٹھنے کی وجہ سے دریاؤں کی پانی سمونے کی سکت کم ہو جاتی ہے۔ ان متضاد کیفیتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دریا اپنے کناروں اور باندھوں کو توڑ کر بہہ نکلتے ہیں اور سیلاب آجاتے ہیں۔ اگرچہ یہ سلسلہ کافی لمبا اور پیچیدہ ہے لیکن سبزے کے فقدان اور سیلاب کی آمد کے درمیان یہ تسلیم شدہ رشتہ ہے اور سیلاب آنے کی صرف اور صرف وجہ یہی مانی گئی ہے۔ یہ تباہ کاری یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کا اثر ہماری زندگی کے ایک اور شعبے پر پڑتا ہے ہمارے سبھی بڑے دریاؤں پر کہیں نہ کہیں باندھ تعمیر کیے گئے ہیں جن کی مدد سے بجلی تیار کی جاتی ہے اور ان کے جمع شدہ پانی کے ذخائر سے آب پاشی کا کام ہوتا ہے جب مٹی سے لدے دریا کا پانی باندھ پر پہنچتا ہے تو وہاں بھی یہ گاد آبی ذخیرے کی تہہ میں بیٹھ کر اس کی سطح اونچی کر دیتی ہے جس کی وجہ سے اس کی پانی جمع کرنی کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ پانی کم جمع ہوتا ہے تو بجلی کم بنتی ہے اور سینچائی بھی کم ہو پاتی ہے یعنی ان کی جملہ صلاحیت ہی کم ہو جاتی ہے۔ باندھ کی تہہ میں گاد بیٹھنے سے ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے باندھ کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس گاد کو باندھ کی تہہ سے نکالنا ناممکن اور اقتصادی نقطۂ نظر سے غیر منافع بخش ہے اس لیے یہ گاد رفتہ رفتہ جمع ہو کر باندھ میں پانی کی مقدار کم کرتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر تعمیر کے وقت ہیراکڈ ڈیم کی عمر کا تخمینہ ۳۸۶ سال دیا گیا تھا لیکن اب یہ عمر ۱۴۷ سال رہ گئی ہے۔ اسی طرح بھاکڑہ کی عمر ۴۰۳ سال سے کم ہو کر ۲۹۱ سال اور گاندھی ساگر کی ۹۳۰ سال سے اب صرف ۳۴۸ سال رہ گئی ہے اور ممکن ہے کہ اگر گاد بیٹھنے کی رفتار موجودہ اوسط سے زیادہ ہو گئی تو ان کی عمر اور کم ہو جائے گی۔ پانی جمع کرنے کی صلاحیت کم ہونے کی وجہ سے آب پاشی بھی کم ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے اندازے کے مطابق ہر سال ۲،۸۰،۰۰۰ ہیکٹیر کی سینچائی کے برابر پانی کم ہوتا رہتا ہے جس سے اوسطاً ۴۰۰ کروڑ روپیے سالانہ کا نقصان ہوتا ہے۔ ایک اور اندازے کے مطابق چھٹے پنج سالہ پلان تک مٹی کے کٹنے اور پانی کی غیر متوازن صورت حال کی وجہ سے لگ بھگ ۱۷٫۵ کروڑ ہیکٹیر زمین بیکار یا بنجر ہو چکی ہے۔ اگر یہ زمین زرخیز رہتی اور اس پر آدھا ٹن اناج فی سال فی ہیکٹیر کی بھی پیداوار ہوتی تو اس زمین سے ہر سال تقریباً ۹ کروڑ ٹن اناج حاصل ہوتا۔ ان تمام حقائق اور وجوہات کے تجزیے کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جنگلات کی اہمیت ہمارے لیے محض ایندھن یا لکڑی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہماری بقا

اور سایہ کا انحصار جنگلات پر ہے۔

یہ تو تھا پس منظر اب اگر ہم اپنے ملک میں جنگلات کی صورت حال کا جائزہ لیں تو حقیقت اور واضح ہو جائے گی۔ ہمارا ملک اور ہماری تہذیب زمانہ قدیم سے ہی مذہب کے زیر اثر رہے ہیں کوئی بھی دور مذہب سے دوری کا دور نہیں تھا۔ مذہب کوئی بھی ہو اس نے انسان کو امن و امان کی ترغیب دی اور جانوروں سے محبت سکھائی۔ پرامن اور سکون پسند انسان نے قدرت کے لازوال حسن کو پہچانا اور سراہا۔ جنگلات سے محبت کی اور ہریالی کو اپنایا۔ تقریباً ہر دور میں حکمرانوں نے باغ بھی لگوائے اور سایہ دار درختوں کا اہتمام بھی کیا۔ آبادیاں کم ہونے کے سبب جنگلات کی زمین کو حاصل کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی اور نہ ہی تجارت میں اتنی شدت تھی کہ لوگ جنگلات کی لکڑی کو بے تحاشہ صاف کرتے۔ جنگلات کے کاٹے جانے کا سلسلہ برطانوی دور حکومت میں شروع ہوا۔ ۱۸۷۸ء کے قانون کے تحت حکومت نے جنگلات کو سرکاری ملکیت قرار دے دیا۔ لکڑی کو کاٹ کر تجارت شروع کر دی گئی تاکہ برطانوی سامراج ہندوستانی وسائل سے پوری طرح فیض یاب ہو سکے۔ چوں کہ جنگلات سے تجارت مقصود تھی اس لیے قدیم اور روایتی درختوں کو کاٹ کر ان کی جگہ ایسے درخت لگائے گئے جو تیزی سے اُگنے کی صلاحیت رکھتے تھے یا پھر ان سے کوئی اور فائدہ ہو سکتا تھا۔ یہ سلسلہ آزادی تک جاری رہا لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا اس وقت بھی ہمارے ملک کے تقریباً ۴۴ فی صد حصے میں جنگلات موجود تھے۔ ماہرین سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ کسی بھی ملک کے ایک تہائی حصے پر جنگلات ہونا لازمی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو انگریزی کے دور حکومت کے خاتمے کے وقت تک، باوجود جنگلات کے استحصال کے، ہمارے جنگلات اور ملک کے کل رقبے کا تناسب ٹھیک ہی تھا لیکن آزادی کے بعد یہ تناسب بہت تیزی سے بگڑا، جس کی کئی وجوہات تھیں اور ہیں۔ اول یہ کہ ہر ریاست نے اپنے جنگلات کا بندوبست صرف اپنے نقطۂ نظر سے کیا۔ جنگلات کو قومی املاک کسی نے نہ سمجھا۔ اپنی ضرورت کے مطابق جنگلات صاف کیے اور حسب منشا لکڑی کاٹی۔ دوسرے بڑھتی ہوئی آبادیوں اور ان کی سرگرمیوں نے جنگلات پر کافی دباؤ ڈالا۔ ایک جانب تو بڑی آبادی کے لیے تجارت اور دوسری جانب کاشت کاری کے لیے زمین درکار ہوئی جو جنگلات کو صاف کر کے حاصل کی گئی۔ مویشیوں کی زیادہ تعداد نے بھی جنگلات پر دباؤ ڈالا۔ بڑھتی ہوئی صنعتوں کو لکڑی کی زیادہ ضرورت ہوئی جس سے جنگلات مزید متاثر ہوئے۔ علاوہ ازیں مقامی ٹھیکیداروں نے اور دیگر لوگوں نے غیر قانونی ڈھنگ سے چوری چھپے جنگلات میں سے کافی لکڑی کاٹی اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۵۱-۱۹۵۰ء سے ۸۰-۱۹۷۹ء کے درمیان ہم نے ۳۴ لاکھ ہیکٹر زمین پر سے جنگلات ایک دم صاف کر دیے اور آج یہ صورت حال ہے کہ ہر ایک منٹ میں ہماری دو ہیکٹر زمین پر سے جنگلات صاف کر دیے جاتے ہیں۔ یعنی صرف ایک دن میں تقریباً ۲۹۰۰ ہیکٹر علاقے سے جنگلات کاٹ دیے جاتے ہیں۔ آج اگرچہ سرکاری اعداد کے مطابق ہمارے ملک کے ۲۲،۷ فی صد حصے میں جنگلات ہیں لیکن اگر صحیح معنوں میں گھنے جنگلات کا تخمینہ لگایا جائے تو صرف ۱۰ فی صد علاقے میں جنگلات پائے جاتے ہیں آزادی کے وقت جنگلات کا رقبہ ہمارے کل رقبے کا ۴۴ فی صد تھا۔ آج یہ صرف ۱۰ فی صد ہے گویا ہمیں جنگل صاف کرنے کے لیے ہی آزادی ملی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں جنگلات کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے کیوں کہ

میدانی علاقوں میں جنگلات صاف ہونے سے جو مٹی کٹتی ہے وہ ہوا یا پانی کو ہی متاثر کرتی ہے لیکن پہاڑی علاقوں سے جب مٹی کٹتی ہے تو اس کی وجہ سے چٹانیں کھسک جاتی ہیں جن سے کافی جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔
کوہ ہمالیہ کا سلسلہ جو مشرق سے مغرب تک ۲۴۰۰ کلو میٹر کے طول میں پھیلا ہوا ہے۔ بہ نسبت دیگر پہاڑی سلسلوں کے نوزائیدہ اور کم عمر ہے جس کی وجہ سے اس کی بنیادیں اور پتھریلاپن ابھی کچا ہے۔ مختلف اسباب کی وجہ سے جب ان پہاڑوں پر سے ہریالی صاف کی جاتی ہے تو یہ پہاڑ فوری طور سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے حادثات پورے علاقے کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ ہریالی کی کمی سے بارشیں کم ہوتی ہیں جس سے خشکی بڑھتی ہے اور نقصان ہوتا ہے ایک اندازے کے مطابق گزشتہ برسوں میں جنگلات کے قتلِ عام کی وجہ سے کوہ ہمالیہ میں بارش میں ۱۸ فیصد کمی ہو چکی ہے۔ اس قدرتی سبز پوشاک کی تباہی کے سبب مسوری کا اوسط درجۂ حرارت جو کہ ۱۹۵۰ء میں ۲۵ رہتا تھا اب ۳۳ ڈگری رہتا ہے۔ مسوری کے موسم میں اس تبدیلی کا بڑا سبب دہرہ دون کی گھاٹی سے جنگلات کا صاف ہونا ہے اور اس صفائی کا سہرا کان کنوں کے سر ہے جنھوں نے معدنیات نکالنے کی غرض سے حقیقی معنوں میں دہرہ دون کی گھاٹی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا اور یہ سب کام باقاعدہ سرکاری لائسنس کے تحت ہوئے۔ گزشتہ سال وہاں کے عوام کے زبردست احتجاج کے بعد ان کان کنوں کی سرگرمیوں پر روک لگائی گئی ہے لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے
اسی طرح گڑھوال، کماؤں، نیل گری کے علاقے نیز جموں و سری نگر کے گرد و نواح میں مختلف ایجنسیوں کے ہاتھوں جنگلات کا قتل عام ہو رہا ہے اور اتنی سب صحرا بات

اُٹھتا جا رہا ہے۔
یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال کو قابو میں کرنے کے لیے حکومت کیا کر رہی ہے؟ جنگلات کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ توقع کی جاتی ہے کہ حکومت جنگلات سے متعلق کوئی قومی پالیسی تشکیل دے گی جنگلات سے لکڑی حاصل کرنے کے لیے ایک متوازن طریقہ اختیار کیا جائے گا جس کی رو سے جتنے درخت صاف کیے جائیں کم از کم اتنے یا کچھ زیادہ درخت لگائے جائیں درخت کاٹنے کی ایک عمر مقرر ہو، غیر قانونی کٹائی کی سختی سے حوصلہ شکنی ہو اور ایسا کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں، زیادہ سے زیادہ شجر کاری ہو اور ان کی دیکھ بھال کی جائے۔ کان کنی کے طریقوں کی ترتیب ہو۔ کان کنی کرنے والوں پر لازم ہو کہ وہ کان کو استعمال کے بعد بند کر دیں، جگہ کو مسطح کریں اور اس پر پھر سے درخت لگا دیں۔ حکومت اپنے ترقیاتی پروگراموں کو اس طرح مرتب کرے کہ ان سے جنگلات تباہ نہ ہوں خاص طور سے پہاڑی علاقوں کے ترقیاتی پروگراموں پر خاص نظر رکھی جائے۔ کیوں کہ وہاں کم از کم ۶۶ فی صد حصے میں جنگلات ہونے لازمی ہیں۔ ورنہ پہاڑی سلسلے ناپائیدار ہو جائیں گے۔ اسی طرح بڑے بڑے ڈیم کو بنانے کا سلسلہ بند ہو کیوں کہ ان کی وجہ سے ہزاروں ہیکٹیر علاقہ زیرِ آب آتا ہے۔ لاکھوں درخت کاٹے جاتے ہیں اور ان سب نقصانات کے باوجود ان سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جس کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ حالات کے ان تقاضوں کے تحت حکومت نے اگرچہ کچھ اقدامات کیے ہیں لیکن وہ مسئلے کی سنگینی کی مناسبت سے ناکافی ہیں۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ ہو کہ حکومت خود مسئلے کی نزاکت سے واقف نہیں یا پھر خوش فہمی میں مبتلا ہے ورنہ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایک طرف

داپنے آپ ترقیاتی پروگراموں کے نام پر ہزاروں لاکھوں درختوں کو صاف کرنے کی اجازت دے۔ جنگلات کی اہمیت کا اندازہ آں جہانی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کو تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں کچھ اقدامات کیے بھی تھے جنگلات سے متعلق قانون میں ۱۹۸۱ میں تبدیلی کی گئی جس کے تحت ریاستی حکومتوں سے یہ اختیارات لے لیے گئے کہ وہ اپنے جنگلات کی زمین کو اپنی مرضی سے استعمال کر سکیں۔ ان کے لیے جنگلات کی زمین کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال کرنے سے پہلے مرکز سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہوگیا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اقدامات کیے گئے لیکن خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ ان کے دورِ حکومت میں بھی مختلف لوگوں نے پانی کے غیر متوازن نظام کو بہتر بنانے کے لیے کچھ تجاویز رکھیں جو کہ طویل المدت منصوبہ بندی کا حصہ بن سکتی تھیں لیکن اس سمت میں کوئی قومی پالیسی تشکیل نہ کی جا سکی۔ موجودہ وزیراعظم نے اپنے وزراء اور وزارتوں میں تبدیلیاں کیں، نئے نئے ناموں سے وزارتیں بنیں لیکن اس کے بعد بھی صورت حال جوں کی توں رہی۔ ۱۹۸۶ میں ماحولیاتی تحفظ سے متعلق ایک قانون بھی پاس کیا گیا۔ غیر قانونی طریقے سے جنگلات کاٹنے پر پابندی عاید ہوئی۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے سزا کا اعلان ہوا لیکن اس قانون کا نفاذ سختی سے نہیں ہوا۔ جنگلات کے گھٹنے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے وزیراعظم نے ہر سال ۵۰ لاکھ ہیکٹیر زمین پر شجر کاری کرنے کا نشانہ مقرر کیا لیکن جیسا کہ حالات سے ظاہر ہو رہا ہے، یہ نشانہ صحیح معنوں میں پورا ہونا مشکل ہے۔ اول تو اس کے لیے مطلوبہ زمین کی قلت ہے، پھر اتنی تعداد میں بیج اور کونپلیں تیار کرنے کا فی الحال کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس کام کے لیے ہر سال ۶۰۰۰ کروڑ روپیے کی رقم درکار ہے۔ یعنی پورے ساتویں منصوبے میں لگ بھگ ۳۰۰۰۰ کروڑ۔ جب کہ سماجی شجر کاری کے لیے ساتویں منصوبے میں کل ملا کر زیادہ سے زیادہ ۴۰۰۰ کروڑ روپیے مہیا کیے جا سکتے ہیں جو کہ تخمینے کا دسواں حصہ ہیں۔ یہ کیسی منصوبہ بندی ہے اور کیسے تخمینے ہیں؟ یا محض عوام کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ اکثر یہ اعلان سننے میں آتا ہے کہ فلاں جگہ اتنی تعداد میں درخت لگائے گئے، لیکن کوئی بھی شخص جسے شجر کاری کے سلسلے ذرا سی معلومات ہے، یہ بخوبی جانتا ہے کہ درخت لگانے سے زیادہ ضروری اس کی دیکھ بھال ہے۔ کوئی سرکاری ایجنسی یہ اطلاع نہیں دیتی کہ گزشتہ ماہ یا سال بھر پہلے جو درخت لگائے گئے تھے ان میں سے کتنے باقی بچے ہیں۔ جن حالات اور جن علاقوں میں یہ کام ہو رہا ہے، وہاں اگر ۱۰ فی صد درخت بھی جڑ پکڑ لیں اور بڑے ہو جائیں تو یہ کسی معجزے سے کم نہ ہوگا کیوں کہ جہاں خشک سالی کا دور دورہ ہو، جانور چارے کی تلاش میں ہر ہری چیز پر منھ مارتے پھریں، اسکولوں سے محروم بچے کھلے میدانوں میں کھیلنے اور کھیل میں پودے توڑنے کے عادی ہوں، وہاں بغیر کسی حفاظت اور دیکھ بھال کے ان درختوں کا قایم رہنا معجزہ ہی ہو سکتا ہے تاہم یہ اچھی کوشش ہے، وقت کی اہم ضرورت ہے اور کیے کردہ اور ناکردہ گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ ضرورت تو یہی ہے کہ جنگلات کاٹنے سے زیادہ ان کو بچانے پر زور ہونا چاہیے لیکن غالباً ہماری حکومت کا موقف یہ ہے کہ گناہ بھی کرتے رہو اور گنگا بھی نہلاتے رہو، تاکہ پاپ دھلتے رہیں۔ ابھی چند ماہ قبل ایک کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے وزیراعظم نے جنگلات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ان کے کٹنے سے سیلاب اور مٹی کے کٹاو کے مسئلے پیدا

ہوتے ہیں۔ بقول ان کے "یہ ہماری معیشت پر ایک بوجھ ہے کیونکہ ترقیاتی پروگراموں نے ماحولیاتی مسایل کو قطعاً نظرانداز کر دیا ہے"۔ جس وقت عوام کے سامنے یہ بیان آیا اسی وقت وزیراعظم کے مشیر نربدا ساگر ڈیم پروجیکٹ کے "سیاسی" پہلوؤں پر غور کر رہے تھے۔ انھیں یہ فکر قطعاً نہیں تھی کہ اس "ترقیاتی" پروگرام سے ماحول اور جنگلات کو کیا نقصان ہوگا۔ جنوری میں وزیراعظم کا مذکورہ بالا بیان آتا ہے اور اپریل میں نربدا ساگر ڈیم پروجیکٹ کو حکومت منظوری دے دیتی ہے۔ اخبارات اور مبصر لکھتے ہیں کہ یہ فیصلہ زبردست "سیاسی لین دین" کے بعد ہوا جس میں مدھیہ پردیش کی حکومت کامیاب رہی اگرچہ اس ڈیم کا سنگ بنیاد مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں ۲۳ ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو رکھا گیا تھا لیکن کئی رکاوٹوں اور مخالفتوں کی وجہ سے یہ معاملہ رکا ہوا تھا۔ حکومت نے خود یہ فیصلہ کیا تھا کہ جن ترقیاتی پروگراموں کا ماحول سے سیدھا تعلق ہوگا، ان کو ماحولیات سے متعلق وزارت سے پاس کرانا ضروری ہوگا لیکن نربدا ساگر ڈیم کو وزارت ماحولیات سے اجازت نہ ملنے کے باوجود منظوری دے دی گئی۔ اس پروجیکٹ کے تحت پانی کا ایک عظیم الشان ریزروائر بنے گا جس میں ۳۰،۰۰۰ مربع کلومیٹر کے علاقے سے آیا ہوا پانی جمع ہوگا۔ یہ کھنڈوا ضلع میں دریائے نربدا پر تعمیر ہوگا۔ پانی کا یہ عظیم ذخیرہ جمع ہونے کے لیے جو جگہ گھیرے گا نیز جو علاقہ اس کی وجہ سے زیر آب آئے گا اس میں بسے ہوئے ہزاروں افراد جن میں زیادہ تر آدی باسی ہیں اور لاکھوں درخت نادر و نایاب قسم کے برساتی جنگل اور کئی آثار قدیمہ غرقاب ہو جائیں گے۔ کیا یہ جنگلات کا قتل عام نہیں ہے؟ اسی طرح ابھی جون کے مہینے میں ٹہری ڈیم کو حکومت کی طرف سے منظوری عطا کی گئی۔ یہاں بھی وزارت ماحولیات کی ۱۲۰۰ [illegible]

نظرانداز کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ معاملہ ابھی عدالتِ عالیہ میں زیر سماعت بھی ہے لیکن حکومت نے اس پروجیکٹ کی تعمیر کا معاہدہ ایک روسی کمپنی سے کر بھی لیا ہے اور کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ ایک طرف تو حکومت قلم کی ایک جنبش سے لاکھوں درخت کٹوانے کی اجازت دے دیتی ہے تو دوسری طرف شجرکاری کے لیے ڈھول پیٹے جاتے ہیں۔ یہ کیسی پالیسی ہے؟ اور پھر وزیراعظم اور دیگر وزرا کے وہ بیان جن میں ماحول کی دہائی دی جاتی ہے؟ حکومت کو چاہیے کہ وہ اب بھی سبق لے اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے جامع منصوبہ تیار کرے۔ کسی مسئلے سے آنکھیں موند لینے یا اس کی تشہیر کرنے یا صرف دہائی دینے سے اس کا حل نہیں نکلتا، محض شجرکاری کے پروگرام بھی اس پیچیدہ صورت حال کو حل نہیں کر سکتے۔ جنگلات اور آبیات سے متعلق ایک قومی پالیسی تشکیل دینا ہوگی۔

اگر عوام اس پروگرام میں شریک نہیں ہوئے تو محض حکومت اتنے بڑے پیمانے پر شجرکاری کرانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ جنگلات کا معاملہ انفرادی طور پر طے نہیں ہوگا بلکہ پورے ملک کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنا ہوگا۔ ملک کے مختلف حصوں میں بیک وقت خشک سالی ہوتی ہے اور سیلاب آتے ہیں، کچھ دریا اپنی بساط سے زیادہ پانی لے کر چلتے ہیں تو کچھ میں پانی دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اگر کسی مصنوعی نہر کی مدد سے ان سب یا کچھ دریاؤں کو آپس میں ملا دیا جائے تو بڑی حد تک یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے ۱۹۶۰ء کے اوایل سے اس قسم کی اسکیمیں زیر بحث ہیں۔ گنگا کاویری لنک کینال یا "گارلینڈ کینال" پر کافی مباحثے ہوئے ہیں۔ حکومت نے ان اسکیموں کو مہنگا قرار دیا۔ [illegible] ۱۲۰۰ [illegible]

روپیے سے زیادہ رقم سیلاب کی تباہی سے نپٹنے کے لیے خرچ نہیں کر رہے ہیں؟ اور پھر خشک سالی اور مٹی کے کٹاؤ سے ہونے والے نقصانات کا اگر اندازہ لگایا جائے تو لگ بھگ ایک ارب ۶۴ کروڑ روپیے سالانہ کا نقصان ہمیں ہر سال بھگتنا پڑتا ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ ہم ایک مرتبہ کسی مکمل اسکیم کو چن کر اس پر عمل کر لیں پینے کے پانی کی کمی کو دور کرنے کے لیے ہمیں فوراً سمندروں کی طرف توجہ کرنا چاہیے کم از کم ہر ساحلی شہر میں سمندری پانی کو صاف کرنے کا انتظام کرنا ہوگا اور اس کام کے لیے ہم ایٹمی یا شمسی توانائی کا استعمال کر سکتے ہیں لیکن یہ ثانوی اقدامات ہیں، بنیادی ضرورت جنگلات کی حفاظت کی ہے تاکہ قدرتی طور سے پانی کا نظام قایم رہ سکے۔ زمینیں بنجر ہونے اور خشک سالی کی وجہ سے ماضی میں کئی تہذیبیں فنا ہو چکی ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی کے سائنس دالوں نے ثابت کیا ہے کہ مایا، میسوپوٹامیہ، موہن جوداڑو اور ہڑپا کی تہذیبیں اسی وجہ سے نیست و نابود ہو گئی تھیں۔ قبل اس کے کہ اس فہرست میں ہمارا بھی نام لکھا جائے، ہمیں سبق لینا چاہیے کیوں کہ خونِ ناحق سبز ہو یا سرخ رائیگاں نہیں جاتا۔

"قومی ترقی صرف تعلیم پر منحصر ہے۔ مذہبی تعلیم عقبیٰ کی ترقی کے لیے ہے، دنیوی تعلیم دنیوی ترقی کے لیے ہے مگر مشکل یہ ہے کہ تعلیم بغیر روپے کے نہیں حاصل ہوتی اور روپیہ بغیر تعلیم کے حاصل نہیں ہوتا۔ گو کہ بہت سی صورتوں میں جاہلوں کے پاس بھی آجاتا ہے مگر حاصل کرنے اور آجانے میں بڑا فرق ہے۔ آجانے سے قومی عزت نہیں ہوتی بلکہ حاصل کرنے سے قومی عزت ہوتی ہے۔"

سر سید احمد خاںؒ

قسط نمبر ۲

ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسایل

سلطان احمد اصلاحی *

ایک مسلمان کی زندگی میں اگر تعلیم کے ساتھ تربیت کی اہمیت مسلم بلکہ بسا اوقات اس پر مقدم ہے تو مستقبل کے مطلوبہ نمونے کے مسلمان کی حیثیت سے ہمارے مدارس اسلامیہ کے مسایل میں بھی اسے اہمیت اور اقدامیت کا یہی مقام حاصل ہونا چاہیے۔ دین کی تعلیم اگر 'علم' ہے تو تربیت، 'عمل' کا دوسرا نام ہے اور معلوم ہے کہ عمل کے بغیر علم کی حیثیت لاشۂ بےجان کی ہے اور یہ وہ پھول ہے جو خوشبو سے خالی ہو کر ہر طرح کی قدر و قیمت سے یکسر عاری اور فارغ ہوتا ہے۔ طلباے مدارس اسلامیہ کے اس اہم ترین مسئلے کے حل کی سب سے پہلی کڑی اساتذہ اور طلبا ہر ایک میں مقصد کی لگن اور اپنی مقصدیت کا شعور ہے۔

۱۔ مقصد کی لگن اور مقصدیت کا شعور:

تعلیم کے ساتھ آج کل مدارس عربیہ میں عام طور پر جو تربیت کا انحطاط ہے اور جس نے واقعے کے طور پر ایک سنگین مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے اس کی بڑی وجہ شاید یہی ہے کہ مدارس عربیہ کے اساتذہ و طلبا دونوں ہی کے اندر اپنے مقصد کی لگن کی کمی اور مقصدیت کا فقدان ہے۔ اساتذہ کے اندر کوئی مشنری جذبہ ہے نہ طلبا کے اندر کسی منزل پر پہنچنے کی دھن، جس کی وجہ سے مدارس کی پوری فضا پر تعلیمی و تربیتی اضمحلال اور مردنی کی ایک فضا چھائی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں مدارسِ عربیہ کی پوری تاریخ میں اس سنگین نوعیت سے غالبًا اس سے پہلے کبھی اس صورت حال کا سامنا نہیں ہوا۔ تعلیم کے آخری دو تین سالوں ہی سے طالب علم کا ذہن ڈانواڈول رہنے لگتا ہے۔ اکثریت یونیورسٹی کا خواب دیکھنے لگتی اور ان کے لیے پر تولنے لگتی ہے۔ باقی لوگوں کا رُخ خلیج کی طرف ہوتا ہے جس میں علم دین کی طلب ثانوی، طلب دنیا مقدم ہوتی ہے۔ اب وہ لوگ بچتے ہیں جو اپنے کو کسی کا نہیں سمجھتے تو وہ کسی مکتب یا مدرسے یا امامت او خطابت سے اپنی قسمت کو وابستہ کر لینے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے فوج کا دستہ اگر بھاگنے ہی پر کمربستہ ہو تو بڑے سے بڑے جرنیل کی شعلہ بار تقریر اور دلوں کو گرما دینے اور جذبات کو تڑپا دینے والی کوئی موثر سے موثر گفتگو بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ورنہ اگر بے مقصدیت کی یہ کیفیت

---

* ادارہ تحقیقات اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

نہ ہو تو دارالاقامہ کے تربیت کے امکانات اپنی جگہ ہیں جس پر گفتگو آگے آئی ہے۔ قرآن و حدیث کے علمی دروس و محاضرات میں بھی تربیت و اصلاح کی وہ بھرپور خوراک دی جا سکتی ہے جو تدریس سے فارغ اوقات بلکہ فراغت کے بعد کی پوری زندگی کے لیے بالکل کافی و شافی ہو۔ تربیت کے اس اولین اصولی نکتے کے ساتھ اب اس کے دوسرے تکنیکی پہلوؤں پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔

۲۔ دارالاقامہ کے مسائل

منتہی مدارس عربیہ جو اصلاً اس مقالے کا موضوع ہیں ان کا کردار عام طور پر اقامتی ہے۔ جہاں طلبا کے لیے دارالاقامہ اور ہوسٹل کی سہولیات فراہم ہیں۔ کچھ مدارس میں صرف عربی درجات کے طلبا کی رہائش کا انتظام ہے دوسرے وہ ہیں جہاں ساتھ ہی پرائمری درجات کے کم عمر طلبا کے لیے بھی دارالاقامہ کی سہولیت فراہم کی گئی ہے۔

الف: اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ کہ مختلف عمروں کے طلبا کے ہوسٹل علیحدہ اور قابل لحاظ فاصلے پر ساتھ ہی ان کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا انتظام دوسروں سے الگ اور بالکل علیحدہ ہونا چاہیے۔ اسلام چودہ سال سے کم عمر بچوں کے لوح ذہن کو جنسی اعتبار سے بالکل سادہ اور صاف دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس عمر کے بچوں کا ہوسٹل اس سے اوپر عمر کے طلبا سے بالکل علیحدہ اور فاصلے پر ہو۔ ساتھ ہی ان کی طعام گاہ، بیت الخلاء اور غسل خانے بھی بڑے لڑکوں سے الگ اور دور ہونے چاہئیں جس سے کہ بڑی عمر کے طلبا سے ان کا اختلاط کم سے کم ہو اور دوسرے مصالح کے علاوہ ان کی کبھی کبھار کی غیر محتاط گفتگو یا جنسی بلوغ کے دوسرے مظاہر سے ان کی اس پہلو سے ذہنی سادگی متاثر نہ ہو اور ان کی فطری معصومیت اور بھولے پن کو زیادہ سے زیادہ اپنی اصلی حالت پر برقرار رہنے میں مدد ملے۔ ساتھ ہی چودہ سال سے اوپر کے طلبا کے دارالاقامہ کو ترجیحی طور پر (SINGLE SEATED) ہونا چاہیے؟

ب۔ دارالاقامہ کا دوسرا مسئلہ معمر، اہل اور متاہل افراد کے ذریعے طلبا کی نگرانی و تربیت کا ہے۔ اکثر مدارس عربیہ میں حضرات اساتذہ کے لیے رہائش کی سہولت ہے نہ رہائشی الاؤنس ملتا ہے۔ اس لیے دیہاتوں اور قصبوں سے ملحق مدارس کے اساتذہ عام طور پر شام کو اپنے اپنے گھروں کو چلے جانا پسند کرتے ہیں۔ اتفاقیہ مدرسہ میں قیام ان اساتذہ کا رہ جاتا ہے جو وطن سے دور ہونے کے سبب روزانہ گھر جانے سے قاصر ہوتے ہیں ادھر مدارس میں عام چلن ہو گیا ہے کہ ہر طرح کی عمر کے طلبا کی نگرانی و تربیت کا کام اضطراراً کنوارے ایسے ہی حضرات اساتذہ سے لیا جاتا ہے مزید تشریح کی حاجت نہیں۔ ایسے غیر متاہل افراد سے طلبا کی نگرانی و تربیت کا نازک ترین کام لینا اصول کے خلاف ہے۔ متاہل اساتذہ پر بھی یہ کام ترجیحی طور پر نسبتاً معمر اساتذہ یا اتالیق حضرات سے لیا جائے۔ جس میں اس ایک دفعہ کا اضافہ بھی مناسب ہے کہ ساتھ ہی انہیں اس مقصد سے قرآن و سنت کی تعلیمات اور اسلامی ماہرین تعلیم و تربیت کی آرا کے ساتھ معاصر نفسیات اطفال اور فن تعلیم و تربیت سے بھی مناسب واقفیت اور آشنائی ہونی چاہیے۔ نگرانی و تربیت کا یہ اہتمام دینی اصولوں کی رعایت کے ساتھ خوب کڑا اور چوکس ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی لحاظ ضروری ہے کہ نگراں حضرات اپنے کام میں ترغیب و ترہیب کا جیسا کہ اصول دین کا تقاضا ہے، مناسب امتزاج رکھیں اور صرف ڈانٹ ڈپٹ سے ہی نہیں اپنی بے لوثی، کردار اور عمل سے اپنے زیر نگرانی و زیر تربیت طلبا کو متاثر کرنے کی کوشش کریں۔

ج۔ اس سلسلے میں تیسری چیز سینئر طلبائے مدارس عربیہ کے لیے متوازن دعوتی و تحریکی سرگرمی کے مواقع کی فراہمی ہے۔ ہندوستان میں مدارس عربیہ کا قیام ہی اس مقصد سے ہے کہ ملک پر انگریزی راج کے تسلط کے بعد عصری تعلیم سے امّت کی روحانی اور معنوی حیات و بقا کا جو سوال پیدا ہو گیا تھا، مدارس کے متوازی نظام سے اس کی کمی کی تلافی کر کے اس چیز کا اہتمام کیا جائے۔ اس کا تقاضا ہے کہ فضلائے مدارس عربیہ کو دعوتِ دین اور اصلاح امّت کا جو کام فراغت کے بعد اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے مکتب، مدرسہ، امامت، خطابت اور تحریک اور جماعت کے پلیٹ فارم سے کرنا ہے مناسب اور متوازن طور پر اس کا آغاز مدرسے کی زندگی سے ہی ہو جائے اس کے لیے خاص طور پر منتہی طلبائے مدارس عربیہ کے ذریعے اندرون مدرسہ قرآن و حدیث کا درس اور تربیتی تقریریں کرائی جانی چاہییں۔ ساتھ ہی مدرسہ کے گرد و نواح میں انھیں وفود کی شکل میں یا تنہا بھیج کر بھی ان سے اس خدمت کو انجام دلایا جانا چاہیے۔ خود مدارس کو اس سے جو دینی اور دنیوی فائدہ ہوگا وہ اپنی جگہ مدارس کی بالعموم دینی اضمحلال اور مردنی کی موجودہ فضا کو اس سے بدلنے میں بہت زیادہ مدد اور معاونت حاصل ہوگی۔

د۔ دین میں صفائی ستھرائی کی جو اہمیت ہے اس کے سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حدیث میں طہارت و نظافت کو آدھا ایمان قرار دیا گیا ہے طلبائے مدارسِ عربیہ کی تربیت کا باب نامکمل رہتا ہے اگر اس اہم ترین مسئلے کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ اس سلسلے میں پہلی ضروری بات تو یہ ہے کہ طلبا کے اندر طہارت و نظافت کے اسی ذوق کو پیدا کرنے اور پروان چڑھانے کے لیے ان کے معلم و مربی حضرات اساتذہ و اتالیق کو اس کی طرف توجہ کرنی ہوگی۔ اولاد اپنے ماں باپ کے بعد جن کا رنگ سب سے زیادہ قبول کرتی ہے وہ اس کے اساتذہ اور نگراں ہی ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس پہلو سے اگر حضرات اساتذہ و اتالیقان میں کمی ہوگی تو اس کے زیر تربیت و نگرانی طلبا پر اس کا لازمی اثر پڑے گا۔ اپنے زیر نگرانی طلبا کو اس کا خوگر بنانے کے لیے انھیں خود اپنا نمونہ دکھانا ضروری ہوگا۔ اس کے لیے دوسری ضرورت صفائی و ستھرائی کے اسباب و وسایل کی فراہمی کی طرف مناسب توجہ ہے۔ جب کہ عام طور پر مدارس عربیہ میں یہ شعبہ بے توجہی کا شکار نظر آتا ہے۔ پہلی ضرورت ہے کہ طلبا کی تعداد کے لحاظ سے پانی کی فراوانی ہو اور وضو کے ساتھ جاڑوں میں نہانے کے لیے بھی گرم پانی کا وافر لازمی اہتمام ہو۔ ساتھ ہی اس کے مطابق بیت الخلا اور غسل خانے بھی کافی سے زیادہ ہوں اور ان کی صفائی ستھرائی کے معیاری انتظام کا مناسب بندوبست کیا جائے۔

جنسی تربیت کا اہتمام:

مدارس عربیہ کے تربیتی مسایل پر حقیقت کے اعتبار سے نہیں صرف نمبر کے لحاظ سے آخری چیز ان کے طلبائے عزیز کی جنسی تربیت کا اہتمام ہے۔ ہر چند کہ ادھر چند سالوں سے ملک میں اوسط تعلیم کی شرح میں اضافے کے ساتھ مدارس کی اوسط تعلیم میں بھی اضافہ ہے جس کے ساتھ ہی ان میں داخلے کے خواہش مند طلبا کی عمریں بھی پہلے کے مقابلے میں کافی کم اور اس کے نتیجے میں نسبتاً طلبا کم عمر میں فارغ بھی ہونے لگے ہیں لیکن اس کے باوجود فراغت کی اوسط بیس بائیس سال سے آج بھی کم نہیں ہے اور نہ اس سے کم ہو سکتی ہے اور نہ ہونا چاہیے جب کہ معلوم ہے اور قرآن و سنت کے اشارات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ پندرہ سال کے بعد لڑکے کے اندر جنسی احساسات ابھرنے لگتے اور اس کی علامات ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ

بھی وہ باقاعدہ احکام شرعیہ کا مکلف ہونے لگتا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس عمر کے طالب علموں کو اگر نماز روزے کی ترغیب دی جاتی ہے، اسلامی اخلاق و آداب اور اسلامی لباس اور اسلامی طرز معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی طرف اسے بار بار اور لگاتار متوجہ کیا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس عمر میں جب کہ دوسری چیزوں کے بالمقابل اس کو اسی کی شاید کچھ زیادہ ہی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی جنسی تربیت کی طرف بھی اس طرح توجہ نہ دی جائے۔ درین حالیکہ کلاس میں قرآن، حدیث اور فقہ کا جو درس لے رہا ہوتا ہے اس میں اس کے مسایل زیر بحث آتے ہیں اور اس کی لوح دماغ ان سے سادہ اور ناآشنا نہیں رہ جاتی ہے۔ جنسی تربیت میں جنسی مسایل کی مناسب واقفیت بھی شامل ہے جیسا کہ ہمارا مطلوب ہے معمر اور متاہل اساتذہ اور نگراں حضرات کے ذریعے طلبا کی اس پہلو سے تربیت بہت آسانی کے ساتھ اور بے ضررانہ انداز میں کی جا سکتی ہے۔ سردست مدارس عربیہ کا یہ شعبہ بالکل ہی بے توجہی کا شکار ہے اور اسی پہلو سے اس کی طرف بڑھی ہوئی توجہ اور اہتمام کی ضرورت ہے۔

۴۔ غیر اقامتی طلبا کے مسایل

یہ تو رہے مدارس عربیہ کے اقامتی طلبا کے مسایل دیہات اور قصبات کے مدارس میں اچھی بڑی تعداد ان طلبا کی ہوتی ہے جو مختلف اسباب سے دار الاقامہ میں نہ رہ کر روزانہ اپنے گھروں سے آتے اور جاتے ہیں ان کی تربیت کا معاملہ بعض پہلوؤں سے آسان اور بعض دوسرے پہلوؤں سے اتنا ہی مشکل ہے۔ ایسے طلبا کا گھر اگر پڑھا لکھا اور ماحول دینی ہو تو اکثر اوقات ان کی نگرانی اور تربیت دار الاقامہ سے بہتر انداز میں کی جا سکتی ہے جو کہ خاص طور پہ دین دار اور دین کا درد رکھنے والے ماں باپ کو اپنی اولاد کی نسبت سے ہو سکتی ہے شاذ و نادر ہی کوئی اتالیق اور نگراں اس میں اس کا شریک و سہیم ہو سکتا ہے۔ دار الاقامہ کی اس کمی کو دوران درس حضرات اساتذہ اپنی موثر گفتگو اور عمومی تربیتی نہج و انداز سے ہی کر سکتے ہیں۔

غیر اقامتی طلبا کے لیے عام طور پر تعلیمی مسایل میں بھی اقامتی طلبا کے مقابلے میں دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے تعلیم کے ساتھ تربیت کی بھی اس متوقع کمی کو گھر کے معاون اور سازگار ماحول سے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال حضرات اساتذہ اور مدرسہ کی انتظامیہ دونوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ غیر اقامتی طلبا کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق سمجھیں اور تعلیم کے ساتھ ان کی تربیتی کے معاملے میں جن امکانی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے بروقت اور موثر طور پر حل کرنے کی کوشش کریں۔

۵۔ لباس اور داڑھی کا مسئلہ

مدارس عربیہ کے تربیتی مسایل پر ہمارے خیال میں آخری مسئلہ زیر تعلیم طلبا کے لباس اور داڑھی کا رہ جاتا ہے جس کے سلسلے میں اس وقت عام طور پہ مدارس دینیہ میں تشویش ناک غفلت اور کوتاہی کی صورت حال پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اسلام میں لباس اور وضع قطع کی جو اہمیت ہے معلوم ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی اور سہل انگاری اور غیر اقوام کی نقالی کو تشبہ، ان سے مشابہت و ہم رنگی اختیار کرنے کا اہم ترین مظہر قرار دے کر ایسے لوگوں کو نہیں کی جمعیت کا ایک فرد اور ملت اسلامیہ سے باہر اور غیر متعلق قرار دیا ہے۔ دین کا ذوق اور شعور اور اس [illegible] کے دل کی آواز بنانے کی کوشش کی اہمیت [illegible] وضع قطع کے مسئلے میں

اس اصول کی اہمیت کو اسی طرح تسلیم کرتے ہوئے ہمارے خیال میں مدارس عربیہ کو اس معاملے میں بالکل ہی دقیانوسی اور قدامت پرست ہونا چاہیے۔ لباس اور وضع قطع کو مدرسے کے یونی فارم کا ایک حصہ بنانا چاہیے اور اندرون مدرسہ ہی نہیں بیرونِ مدرسہ بھی اس کی خلاف ورزی پر معطلی اور اخراج کے سخت ترین اقدام میں بھی کوئی باک اور جھجک نہیں ہونی چاہیے[۹] فضلائے مدارسِ عربیہ کے عصری جامعات میں آجانے کے بعد لباس اور وضع قطع کے پہلو سے جو زبوں حالی ہے کہ قمیص پاجامہ تو اترا ہی داڑھیاں بھی ۹۰٪ فی صد سے زیادہ چہروں پر صاف ہیں اس کی ایک اور شاید اہم وجہ یہ بھی ہے کہ خود مدرسہ کی زندگی میں اس کی واقعی اہمیت اور عملی سنجیدگی کا مطلوبہ اہتمام نہیں رہ گیا ہے۔ اندریں صورت مدارس عربیہ کا یونیورسٹیوں سے الحاق کا معاملہ تو قابلِ غور بن جاتا ہے ' اس کے باوجود اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ہدایات کی کھلی خلاف ورزی لوگ عصری جامعات میں کریں تو یہ ان کا دردِ سر اندرون مدرسہ اس انحراف اور عملی بغاوت کی ہرگز ہرگز اجازت نہ ہونی چاہیے۔ کفر دنیا میں جہاں چاہے پھیلے حدود کعبہ میں ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہیں ہوسکتی ہے۔

۳۔ انتظامی مسایل

مدارس عربیہ کا تیسرا اہم مسئلہ مدرسہ کے مناسب انتظام و انصرام کا ہے جس کے تحت حضرات اساتذہ اور طلبا پوری یک سوئی اور انہماک سے اپنی تعلیم و تعلم کے کاموں میں لگے رہیں۔ یوں تو کسی مدرسے کا نظم و انصرام اصلاً اس کے اسٹاف اور انتظامیہ کی ذمہ داری ہے لیکن اگر بہتر کارکردگی کے لیے بہتر انتظام کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور مدرسے کی بدنظمی اور بدانتظامی سے اکثر اوقات اس کے طلبا کا سب سے زیادہ متاثر ہونا ناگزیر اور فطری ہے۔ اس پہلو سے مدارس عربیہ کے انتظام انصرام سے اس کے عزیز طلبا کا بھی ایک حد تک متعلق ہونا بالکل کھلی ہوئی اور سامنے کی بات ہے

۱۔ انتظام میں طلبا کی مناسب شمولیت

جیسا کہ عرض کیا گیا کسی بھی دوسرے ادارے اور انجمن کی طرح مدارس عربیہ کے مناسب انتظام و انصرام کی ذمہ داری اصلاً ہے تو اس کے اسٹاف اور انتظامیہ ہی کی لیکن ایک پہلو سے اس کے سب سے اہم اور طاقتور عنصر کی حیثیت سے اس میں طلبا کی شمولیت بھی اسی درجے میں ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ انتظام کو اپنے اوپر مسلط اور اپنے کو بیورو کریسی کے بالکل رحم و کرم پر محسوس نہ کریں بلکہ فضا ایسی ہو کہ وہ اپنے کو اس کا شریک کار اور اس کا ایک حصہ خیال کریں جس میں ان کے جذبات و احساسات کا مناسب طور پر لحاظ کیا جاتا ہو اور ان کے مسایل اور دشواریوں کو ہمدردی اور توجہ کے ساتھ سنا جاتا اور پوری مستعدی اور تندہی سے اس کے ازالے کی فکر کی جاتی ہو۔ خلاصے کے طور پر اسٹاف اور انتظامیہ کا رویہ ان کے ساتھ آقا کا نہیں دوست ۔ (FRIENDS NOT MASTERS) کا ہو۔ اس سلسلے میں دوسری انتہا وہ ہوتی ہے جس کا مظاہرہ بعض اوقات عصری جامعات میں دیکھنے کو آتا ہے کہ روایتی انتظامیہ پردے میں اندرون کیمپس طلبائے یونین کا دور دورہ ہوتا ہے یہ الگ ہے کہ بعض دوسری سخت گیر انتظامیہ طلبائے یونین سے اس کا بدلہ اصل مع سود کے واپس لے لے اور بعد کے زمانے میں اس کو اس کے جائز حق سے بھی محروم کر کے اس کو بالکل معطل اور مفلوج بنائے رکھے۔ مدارس عربیہ میں ان دونوں انتہاؤں سے بچتے ہوئے معاملہ راہ اعتدال کا ہونا چاہیے اور انتظام و انصرام کی اصل ذمہ داری اسٹاف

ہ انتظامیہ ہو مگر طلبائے عزیز کو بھی اس میں شریک کار بنایا جانا چاہیے اور ان کے جائز مطالبات اور جائز حقوق کا پورا پورا تحفظ ہونا چاہیے، دین اور دنیا دونوں کے مصالح کا یہ تقاضا ہے۔ دوران تعلیم طلبا کی ہمہ جہتی صلاحیتوں کو نشوونما و پروان چڑھانے کا مدرسے کا جو اہم ترین مقصد اور اس کا نصب العین ہوسکتا ہے اس کا بھی تقاضا ہے کہ مدرسے کی فضا میں ان کو مجبور محض بنا کر رکھنے کے بجائے مناسب حدود میں ان کو کام کی پوری آزادی ہونی چاہیے اور ماحول ایسا بننا چاہیے کہ دوران تعلیم ان کی دیگر صلاحیتوں کے ساتھ ان کی انتظامی لیاقت و صلاحیت کو بھی بھرپور طریقے پر پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملے۔

۴۔ اساتذہ اور انتظامیہ کی اعلیٰ ظرفی اور بلند نگاہی

اس سلسلے میں دوسری بات جو ہے تو بہت ہی نازک اور اہم لیکن اس کی اہمیت اور اس کا لحاظ بھی اتنا ہی ضروری اور ناگزیر ہے اور وہ یہ کہ مدارس عربیہ میں اس کے اساتذہ ہوں کہ انتظامیہ کے افراد ہر ایک کے سلسلے میں بجا طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے تئیں حد درجہ مخلص اور سراپا نصیحت اور سراپا خیر خواہی ہوں گے۔ دو مسلمانوں کے اندر محبت و دوستی اور اتحاد و یگانگت کے لیے اسلام اور انسانیت کا رشتہ ہی کچھ کم نہیں ہے لیکن جب کہ اسی کے ساتھ خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا طاقت ور ترین نقطۂ اشتراک بھی ان کے درمیان شامل ہو جائے تو پھر تو اس صورت میں ان کی دوستی و محبت اور ان کا اتحاد و یگانگت بالکل مثالی اور نمونے کا ہونا چاہیے لیکن اس حقیقت واقعہ کے باوجود دوسری دینی تحریکات اور اداروں کی طرح مدارس عربیہ میں بھی بسا اوقات یہ تکلیف دہ صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے کہ اساتذہ اور انتظامیہ باقاعدہ دھڑے بندی کا شکار اور ایک گروہ کی پوری قوت دوسرے کو زک پہنچانے پر لگی ہوتی ہے۔ اس نامبارک و نامراد لڑائی اور مقابلہ آرائی سے قطع نظر اور اللہ کی پناہ مانگتے ہوئے ایسا ہونا بہت زیادہ مستبعد نہیں معلوم ہوتا کہ سرد جنگ کے انداز میں اسٹاف اور انتظامیہ محاذ آرائی کا شکار ہوں اور اپنے اپنے انداز میں ایک گروپ دوسرے پر بالادستی اور اپنی فتح مندی کے لیے کوشاں ہو لیکن احتیاط کی بات یہ ہے کہ اساتذہ اور انتظامیہ کی یہ سرد یا کھلی لڑائی، اس کا دائرہ انتہائی سختی کے ساتھ حضرات اساتذہ کرام اور معزز ارکان انتظامیہ تک ہی محدود رہے اور ان میں سے کوئی ایک گروہ طلبائے عزیز کی زندگیوں کا سودا کرتے ہوئے انھیں اپنے مقصد کے لیے استعمال نہ کرسکے۔ اگر دور زوال کے ایجاد کردہ اس مقولے

المعاصرۃ اصل المنافرۃ

پر حدود مدرسہ کے اندر عمل کرنا ہی ضروری ہو تو بہر حال یہ خط امتیاز ہرگز ہرگز مٹنے نہ پائے کہ اسٹاف اور انتظامیہ کی باہمی چپقلشوں اور عداوتوں سے طلبائے عزیز کا کچھ لینا دینا نہیں۔ اسٹاف اور انتظامیہ کی بیت کیوں کر ہو اور ان گھٹیا حرکتوں میں وقت ضائع کرنے سے ان کو کیوں کر بچایا جائے۔ یہ مسئلہ ہے تو بہت سنجیدہ اور اہمیت کا حامل جس کے لیے دوسرے تمام دینی اداروں اور تحریکات کی طرح مدارس کے اساتذہ و اسٹاف اور انتظامیہ کے لیے اہلیت کی مطلوبہ شرایط کو سخت سے سخت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ مسئلہ بعد کا ہے۔ سردست تو یہ حضرات اتنا کام کریں کہ اپنی لڑائی میں طلبا کو شامل نہ کریں۔ اپنی شکست اور فتح کے مسئلے کو وہ جیسے چاہیں حل کریں۔ اپنے نامطلوب چھوٹے مقاصد کے لیے طلبائے عزیز کی زندگیوں سے کھیل

کران کے مستقبل کو داؤں پر نہ لگنے دیں۔ ساتھ ہی اس میں خاص طور پر مدارس کے منتہی طلبا کی ذہانت اور فراست ایمانی کا تقاضا ہے کہ چونکہ عملاً طلبا برادری پر انھیں کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں اور موافق یا مخالف ان کے کسی فیصلے سے پوری طلبا برادری کا متاثر ہونا عین فطری ہوتا ہے، اس لیے ان کی خوبی اور بیدار مغزی کی بھی اس میں جانچ ہے کہ وہ جو کچھ بھی ہو جائے اسٹاف اور انتظامیہ میں سے وہ کسی کو اپنا حلیف یا حریف نہ بنائیں وہ اپنے مثالی اصول پسندانہ طرز عمل سے اسٹاف اور انتظامیہ کے لیے سوچ کا موقع فراہم کر دیں کہ اپنے واقعی حدود کار اور اپنے صحیح مرتبے و مقام کا لحاظ دین و دنیا ہر ایک کے اصولوں کا تقاضا ہے۔ ایمان ہی نہیں آدمی کی ذہانت کا امتحان بھی ہے کہ زندگی میں کبھی کوئی دوسرا شخص یا گروہ اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکے۔ اس کا کردار ہمیشہ اصولی رہے اور کسی بے اصولے کی ہمت نہ ہو کہ وہ اس سے اس کے اصولوں کے سودے بازی کا کوئی آسرا لگا سکے۔

۳- نمائندہ انتظامیہ کی ضرورت، مدرسے کا بھرپور جمہوری نظام اور اندرون مدرسہ مکمل جمہوری فضا کی بحالی۔

مدارس عربیہ کے انتظامی مسائل کے حل میں اسٹاف اور اساتذہ کی اعلیٰ ظرفی اور بلند نگاہی کے ساتھ دوسری ضرورت مدرسے کے انتظام و انصرام کے لیے نمائندہ انتظامیہ کی ضرورت جس کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ مدرسے کے اندر بھرپور جمہوری نظام اور اندرون مدرسہ مکمل جمہوری فضا بحال ہوگی۔ افسوس ہے کہ اس وقت عام طور پر مدارس عربیہ کا نظام اس سلسلے میں غیر معمولی طور پر ابتری اور زبوں حالی کا شکار ہے۔ یہ عجیب سانحہ ہے کہ جو دین سب سے بڑھ کر آزادی فکر و نظر کا نقیب ہو جس نے سلطان جابر کے روبرو حق و انصاف کی بات کہنے کو سب سے بڑا جہاد قرار دیا ہو اور جمہوریت اور جمہوری فضا عین جس کے خمیر میں شامل ہو، اسی دین کے سب سے نمائندہ ادارے مدارس دینیہ میں جمہوری نظام اور جمہوری فضا کی بحالی کی بات کی جائے لیکن عام طور پر صورت حال یہی ہے کہ مدارس کی انتظامیہ نمائندہ نہ ہو کر اکثر و بیشتر مجبور و بے بس (CAPTIVE) ہے۔ اولاً تو انتظامیہ کا طریقۂ انتخاب ہی نرالا ہے کہ کسی وسیع تر دائرہ انتخاب سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے کہ ایک طے شدہ میقات کے بعد اس کے ذریعے سے نئی انتظامیہ کا انتخاب عمل میں آتا اور اس طرح نئے اور تازہ دم لوگوں کے آنے اور جانے کا سلسلہ لگا رہے۔ اس کے برعکس انتظامیہ میں ایک بار جو شخص آگیا وہ عام طور پر تاحیات اس کا ممبر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس سے بڑی دوسری کمی یہ کہ کسی وجہ سے انتظامیہ کی اگر کوئی جگہ خالی ہوتی ہے تو وہ اپنے سے بڑے دائرۂ انتخاب تک راجع نہ ہو کر اسی انتظامیہ کے معزز ارکان کو خالی شدہ نشست کے انتخاب کا بھی اختیار تمیزی حاصل ہوتا ہے۔ اس انتظامیہ کی تشکیل میں بھی عام طور پر یہی کوشش دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ ناظم مدرسہ کی ذاتی طور پر وفادار ہو اور اس سے متعلق شخص خاص طور پر اسی حلقے سے تعلق رکھتا ہو جس کا کہ وہ مثال کے طور پر مدرسے کا نمائندہ ہو۔ چنانچہ اگر کسی مدرسے کا مثلاً حدیث میں امتیاز ہو تو کسی باہری حلقے کے آدمی کا حدیث پر کام کتنا ہی وقیع اور بھاری کیوں نہ ہو، اس کی انتظامیہ یا مجلس علمی کی رکنیت کا شرف اس حلقے سے متعلق دوسرے شخص ہی کو حاصل ہوگا گو کہ اس کا کام پہلے شخص کے مقابلے میں اس سے بہت کم اور ناقابل لحاظ ہو۔ یہی بات مثال کے طور پر ادب عربی، تفسیر اور مدارس کے دیگر امتیازی مضامین کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی

ہے نتیجے کے طور پر اس مفلوج اور مجبور انتظامیہ کا اثر مدرسے کے پورے نظام پر پڑتا ہے اور مدرسے کا پورا نظام نیچے سے اوپر تک برائی کے ایک چکر (Vicious Circle) میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ دوسری مصیبت اعزازی ذمہ داران مدارس کی ہے۔ عام طور پر مدارس عربیہ کی نظامت و اہتمام کا عہدہ اعزازی اور بلا تنخواہ ہوتا ہے جس کے لازمی نتیجے کے طور پر ایسا ناظم یا مہتمم کسی وقت کا پابند نہیں ہوتا کہ شاں کے طور پر اپنے دفتر میں وہ آٹھ یا دس گھنٹے گزارے اور اپنی مفوضہ ذمہ داری کی ادائیگی کا پابند اور کوتاہی کی صورت میں عند اللہ و عند الناس جواب دہ ہو۔ اہتمام و نظامت کا یہ شرف عام طور پر شہرت یافتہ یا جگادری ان علما حضرات کو ہوتا ہے جن کا ایک قدم مدرسے میں تو دوسرا اندرون ملک و بیرون ملک دوروں پر ہوتا ہے یا پھر یہ اعزاز نامراد دورِ جاگیرداری کے ان بقایہ جات کے حصے میں جاتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہنوز کاروبار یا ملازمت کی ذمہ داریوں سے محفوظ رکھ کر ان کے اوقات کو خالی رکھا ہے۔ دیہاتی اور قصباتی مدارس کے پس منظر میں یہ عہدہ ایسے لوگوں کو بھی مل جاتا ہے جو وقت دے سکیں تو اچھا برا مدرسے کا کچھ نہ کچھ کام ضرور کر سکتے ہیں لیکن اپنی متنوع مصروفیات میں ان کے لیے وقت کا فارغ کرنا ہی سب سے مشکل کام ہے اور اس روایت کی پاسداری بھی بہر حال ضروری ہے کہ مدرسے کا کام ہو نہ ہو اس سے پیسے لے کر بہر حال کام نہیں کرنا ہے۔ ایسے اعزازی مناصب کی دینی حیثیت اپنی جگہ کہ سیدنا ابوبکرؓ و عمرؓ اگر کفاف لے کر خلافت راشدہ کی ذمہ داری سنبھال سکتے ہیں اور قرآن ضرورت مند کے لیے یتیم کے مال کی نگرانی پر بھی معاوضہ لینے کی اجازت بلکہ اسے صاف طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے تو دینی اداروں کی بالمعاوضہ ذمہ دارانہ خدمت میں مصنوعی حیثیت کے مظاہرے کے علاوہ حکمت اور مصلحت کا کون سا پہلو ہے۔ اعزازی خدام مدارس کو معاوضہ دلانے ہی پر اصرار نہیں اصل مسئلہ وقت دینے اور مفوضہ ذمہ داریوں کی دیانت دارانہ ادائیگی کا ہے۔ اعزازی ذمہ دارانہ مدارس ہماری سر آنکھوں پر لیکن مدرسے میں وقت انھیں دوسرے اسٹاف سے بڑھ کر دینا چاہیے اور اگر ان کے عہدے کسی کام کے بغیر عہدہ برائے عہدہ نہیں ہیں تو اگر مدرسے کا دوسرا اسٹاف ہفتے دس دن اپنی ڈیوٹی سے غائب ہو کر جواب دہی و احتساب اور تنخواہ کی کٹوتی سے بچ نہیں سکتا تو ان اعزازی حضرات ذمہ داران مدارس کے لیے اس سے بچاؤ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔ مدارس سے ان کی طویل بے تعلقی اور غیر حاضری کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ادارے کا نظام عملاً بیورو کریسی کے حوالے ہو جاتا ہے جو ناظم یا مہتمم مدرسہ تک اپنی مخصوص پہنچ بنا کر عملاً اس کے پورے نظام پر اپنے پنجے گاڑ دیتی ہے جس کے نتیجے میں اس صلاحیت سے محروم طلبا اور اساتذہ کی اکثریت اسی بیورو کریسی کے رحم و کرم پر جیتی ہے۔ بیدار مغزی کی کمی یا خوشامدی مزاج کی کمزوری یا ان دونوں کا نامبارک اشتراک اس کی بدولت مدرسے کی پوری فضا زبان بندی اور جبر کا ایسا نظام قایم ہوتا ہے جس کے لیے آہنی دیواروں اور آہنی پردوں کا استعمال سوے ادب ہو تو صورت واقعہ سے اس کا کوئی ٹکراو نہیں ہو سکتا۔ زبان بندی اور جبر کی اس فضا میں صلاحیتیں جیسی کچھ پروان چڑھ سکتی ہیں اس کے سلسلے میں کچھ کہنے کی حاجت نہیں ہے۔ صورتیں دیکھ کر ترس آتا ہے کہ پرواز میں کوتاہی کا مقصد ہے تو کم سے کم رزق میں تو وسعت ہوتی۔ یہ کیا ستم کہ طائر لاہوتی کا رزق بھی برائے نام اور اس کے پر بیچارے کو بھی بالکل کاٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس درد کا دستاویز یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ترجیحی طور پر مدارس عربیہ کے نظام

اعزازی ذمہ داران مدارس کی روایت کا خاتمہ عمل میں لایا جائے۔ حالات اجازت دیں تو اعزازی مہتمم ناظم و مہتمم مدرسہ کا مستقل دفتر ہو اور پورے اسٹاف مدرسہ کے مقابلے میں سہولیات کے اضافے کے ساتھ اس کے اوقات کار سب سے زیادہ مصروف اور گھرے ہوئے ہوں۔ مدارس دینیہ کی مناسب کارکردگی اور ان کی بہتری احوال کے لیے برائے نام یا بالکل کام نہ کرنے والے اعزازی ذمہ داروں کے بجائے ترجیحی طور پر بامشاہرہ ہمہ وقتی ذمہ داروں کی ضرورت ہے جو مدرسے کے کام سے اپنے کو اس قدر تھکائیں کہ اس کے بعد وہ کوئی دوسرا کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ اسی صورت میں مدارس کے نظام پر ان کی گرفت مضبوط اور اس کے اندرونی نظام میں مطلوبہ جمہوری فضا کی بحالی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ کم سے کم بات یہ ہے کہ اعزازی نظامت کے اصرار کی صورت میں اس کا بہ وجوہ قائم مقام بامشاہرہ ہمہ وقتی نائب ہو جس کی موجودگی میں اصل ذمہ دار کی کوئی کمی محسوس نہ کی جاسکے جو اپنی بیدار مغزی اور خداداد صلاحیتوں کو کام میں لاکر پیران کلیسا کو کلیسا سے ہمیشہ کے لیے اٹھاتے ہوئے ناظم اعلیٰ اور اس کی ذیلی انتظامیہ کے درمیان پردے کو بالکل چاک کر دے جس کے نتیجے میں اندرون مدرسہ ہر شخص کو اس کا جائز حق مل جائے اور کسی شخص کے ساتھ ظلم و استحصال کی کوئی صورت اختیار نہ کی جائے۔

(جاری ہے)

اُن کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھ کا کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور اُن کے کان ہیں لیکن وہ اُن سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے۔ یہی لوگ (اپنے مقصد) سے غافل ہیں۔

(الاعراف ۱۷۹)

مولانا عبدالمجید ندوی چند ذاتی تاثرات ومشاہدات

محمد عارف اصلاحی *

انسان کی زندگی میں کچھ چیزیں پیش آتی ہیں جو اس کے ذہن کے پردے پر ایسے نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتی ہیں جو ہمیشہ تازہ رہتے ہیں، مٹائے نہیں مٹتے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں دوران طالب علمی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھی مولانا عبدالمجید ندوی مرحوم ومغفور کی ذات اور ان کی ذہن سازی کا طریقہ دلکار۔

مولانا عبدالمجید ندوی مرحوم ابن حاجی امام علی صاحب کی پیدائش ۲۵ جون ۱۹۳۹ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک موضع چکیا حسین آباد میں ہوئی اور ۵۲ سال کی عمر میں ۲۳ مئی ۱۹۹۱ء کو اپنے ایک شاگرد کی بارات میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے رانی کی سرائے اعظم گڑھ میں ایک سنگین کار حادثے میں شہید ہوگئے۔ مرحوم کی زندگی کا آغاز بھی مدرسے سے ہوا اور اختتام بھی وہیں سے۔ انتقال کے وقت مولانا مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز تھے۔

مولانا نے عربی کی ابتدائی تعلیم مدرسۃ الاصلاح اور ندوۃ العلما لکھنؤ سے حاصل کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب اور بی اے کیا۔ ایم اے (عربی) پرائیویٹ طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ کچھ دن تک دارالمصنفین شبلی منزل اعظم گڑھ میں رہ کر علمی استفادہ کیا۔ نیشنل انٹرمیڈیٹ کالج محمد پور (صدر) اعظم گڑھ میں چار سال تک عربی کے اسسٹنٹ لیکچرار رہے۔ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں مولانا حبیب اللہ ندوی صاحب کے ساتھ رہ کر تالیفی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔ مدرسۃ الاصلاح میں چار سال صدر مدرس کے فرائض انجام دے کر ایک سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات (سنی) کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا اور سب سے آخر میں ایک مرتبہ پھر مدرسۃ الاصلاح کا رخ کیا اور وہاں کے معیار تعلیم کو بلند کرنے اور بہتر نظم ونسق کی خاطر پوری یکسوئی اور دلجمعی سے نئے نئے اصلاحی وترقیاتی پروگرام بنانے اور انھیں نافذ کرنے میں اپنی جان کھپادی۔ مولانا کی انتظامی صلاحیت کے سبھی لوگ قایل تھے لیکن اس کے علاوہ تحقیقی وتصنیفی لیاقت واستعداد سے بھی بھرپور تھے۔ مولانا کے چند مقالات ملک کے مشہور علمی مجلوں میں شائع ہوئے ہیں اور کچھ ایسے بھی مقالات

---

* ۹۹ - شنشاد الملک عبداللطیف ہوسٹل، سرسید ہال (ساؤتھ) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہیں جو ترتیب و تکمیل کے مرحلے میں رہ گئے۔ مقالات کے علاوہ کچھ کتابچے بھی منظر عام پر آکر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً معیار حق اور مسئلۂ عصمت انبیاء وغیرہ۔

خدائے عز وجل نے مولانا مرحوم کو بڑے صفات و کمالات سے نوازا تھا۔ ذہانت وفطانت، دوراندیشی و بلند نظری، ہمت وجرأت اور ذوقِ لطیف خدا تعالیٰ کی طرف سے خوب ملا تھا۔ آپ ٹوپی اور شیروانی کے نیچے لمبے اور پتلے دبلے جسم کے اندر زبردست عمل وارادہ اور فیصلے کی قوت رکھتے تھے۔ ان کا نظام عدل وانصاف پر مبنی اور طلبا کے تئیں برتاؤ بڑے بھائیوں کا سا مشفقانہ تھا۔ مسکین طلبا پر ترس کھاتے، جاسوسوں سے طبیعت مکدر کر لیتے، شریفوں سے محبت کرتے۔ نیکوں کو اپنے مخصوص جملوں سے زیر کرتے پھر اٹھاتے، بدخصلتوں کی اصلاح کرتے، دہشت گردوں اور غنڈوں کا پوری ہمت وجرأت سے مقابلہ کرتے۔ کبھی کسی مصلحت کے شکار نہیں ہوئے اور نہ کبھی کسی گھمنڈی اور ریاکار شخص کو پسند کیا۔ حلقۂ احباب مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق افراد سے نہایت وسیع رکھا اور خود سدا بہار بنے رہے۔

ندوی صاحب کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ ۱۹۷۸ء میں ہماری کلاس دوم عربی میں انگریزی کے گھنٹے میں آئے۔ مولانا نے ہم کو انگریزی کے علاوہ عربی انشاء، المختصر للقدوری، ہدایہ اولین، مجموعے متون اصولیہ اور البلاغۃ الواضحہ پڑھایا۔ مدرسے کی ملاقاتوں کے علاوہ باہر بھی مولانا سے میری ملاقاتیں رہیں۔ اس دوران میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے ان میں سے صرف چند وہ تحریر کر رہا ہوں جن کا تعلق مولانا کے طریقۂ اصلاح وترتیب سے ہے تاکہ طلبا کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے جو لوگ کچھ کام کر رہے ہیں ان کے سامنے کچھ اچھے نمونے آجائیں۔

ایک مرتبہ مبارک پور اعظم گڑھ میں آل انڈیا مشاعرہ تھا، مگر وہاں شرکت کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی کہ مشاعرے کے دو روز سہ پہر میں مدرسہ کے ایک ممبر کے انتقال کی خبر ملی۔ طلبا کو مرحوم کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی اجازت دے دی گئی۔ بس پھر کیا تھا طلبا کی مراد بر آئی۔ ہم گیارہ طلبا پروگرام کے مطابق میت کی نماز جنازہ میں شرکت کے بعد مشاعرہ بھی سن آئے۔ صبح دس بجے پہنچے تو آنکھیں رات کے مشاعرے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ دوپہر تک ہمارے ان ساتھیوں نے جو اس مشاعرے میں شرکت سے چوک گئے تھے، مولانا کے سامنے اس بات کی تصدیق بھی کر دی کہ ہماری شب گزاری کہاں ہوئی ہے۔ لہذا اسی روز شام کو ہم لوگ طلب کر لیے گئے۔ ندوی صاحب کا سوال صرف ایک تھا کہ ہم نے رات بھر میں کیا کیا اور کیا سیکھا۔ کسی کو اس موقع پر لب کھولنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ہم سب ہاتھ باندھے اور سر جھکائے کھڑے تھے۔ غالباً ہم لوگوں کے چہروں سے خود سکینت ظاہر ہو رہی تھی۔ ندوی صاحب کو ہنسی آگئی۔ چھڑی اٹھائی، تب اسی وقت ایک طالب علم نے مشاعرے میں سنا ہوا ایک شعر سنا دیا۔ اس پر مولانا نے ہم سب طلبا کو مسکراتے ہوئے ایک ایک چھڑی کی سزا دی سوائے اس طالب علم کے جس نے ایک شعر سنا دیا تھا۔ سمجھانے لگے کہ "تم لوگوں نے اتنی دور کا سفر کیا اپنے اساتذہ سے جھوٹ بولے، رات بھر کی نیند قربان کی، اپنے آپ کو تھکایا اور حاصل کچھ بھی نہیں؟ کہیں بھی رہو ہمیشہ آنکھ کان اور دل ودماغ کو کھلا رکھو اور کچھ نہ کچھ حاصل کرتے رہا کرو۔" ندوی صاحب کے سمجھانے اور سزا دینے کے اس طریق سے ہم لوگ بہت متاثر ہوئے کیونکہ دوسرے نگراں کے نزدیک اس جرم کی سزا مدرسے سے اخراج تھا اور اگر یہ سزا مل جاتی تو شاید ہمیں شرمندگی

نہ ہوتی بلکہ مدرسے اور نگراں کے تئیں بغاوت کے جذبات ہمارے اندر پیدا ہوتے۔

ایک طالب علم جو نہایت ذہین اور جمالیاتی حسن سے مالا مال اور وہاں کے نگراں کی زبان میں مخرب اخلاق لٹریچر کے مطالعے اور اخلاقی قدروں اور قانونی بے ضابطگیوں کا مرتکب تھا، جب بورڈنگ ہاوس کے نگراں کے قابو میں نہ آسکا یا نگراں صاحب اُسے اپنی ٹوپی نہ پہنا سکے تو ایک روز اس کی عدم موجودگی میں اس کے کمرے سے اس کا پاندان اٹھالے گئے (وہ طالب علم پان کھانے کا بھی شوقین تھا) اور مدرسے کے اخلاقی اقدار کو توڑنے کے جرم میں بورڈنگ ہاوس سے خارج کر دیا اس طالب علم کو پتہ چلا تو اس نے اپنے پاندان کی گمشدگی کے علاوہ ایک آدھ مزید سامان کے چوری ہوجانے کی بھی شکایت ندوی صاحب سے کر دی (ندوی صاحب اس وقت صدر مدرس اور بورڈنگ ہاوس کے نگران اعلیٰ تھے) آپ نے معاملے کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے چند دنوں کے بعد اپنے بغل والے کمرے میں اسے جگہ دے دی اور اس پر کڑی نگاہ رکھنے لگے۔ یعنی اسے اپنے مشاہدے میں (UNDER OBSERVATION) رکھا۔ اس کی طرف سے جب مطمئن ہو گئے تو نگراں مذکور کا توا گرم کرنے لگے۔ جب خوب گرم ہو گیا تو اس پر ایک روز مرحوم برس پڑے۔ "یہ مدرسۃ الاصلاح ہے ......

...... یہاں بچوں کو سنورنے اور صحیح تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ انھیں آپ لوگ گناہ اور خباثت کے ساتھ نکالتے ہیں۔ کیا چاہتے کہ یہی خباثت وہ دوسری جگہ بھی لے جائیں اور اسی میں لت پت رہیں"

اس کے بعد مولانا نے دھیرے دھیرے اس کو اپنا اہمیت جتا کر احساس ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا اور اس مرض کو متعدی ہونے سے بچالیا۔ مولانا ہمیشہ ایسے شریر طلبا (مولانا کے نزدیک یہ طالب علم مساکین اور نیک نہیں تھا بلکہ شریر تھا) کو جو اپنی شرارتوں اور مختلف حرکتوں کی وجہ سے عام نگراں اساتذہ کے یہاں قابل اخراج ہوتے تھے، ہمیشہ اپنے سے قریب رکھتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ مولانا ایسے طلبا سے بہت پر امید رہتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ مدرسے میں شرارت یا اسٹرائک جیسی بری حرکت ذہین لڑکے ہی کر سکتے ہیں۔ جب انھیں کسی مثبت کام کی طرف رہنمائی نہیں ملتی تو ان کا عمل تخریبی ہونے لگتا ہے۔ یہ ان کے بڑوں کی مہارت اور صلاحیت پر منحصر ہے کہ ان کی ذہانت و فطانت کا رخ کیوں کر تعمیری کاموں کی طرف پھیر جائے۔ چنانچہ جن طلبا کی نکیل نگراں سے چھوٹ جاتی ہے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے۔

۷۹-۱۹۷۸ء میں منشی مطبخ کی نا اہلی کی وجہ سے ہم طلبا کو ان سے بڑی شکایتیں رہا کرتی تھیں۔ خود مولانا بھی ان سے تنگ آچکے تھے، پھر بھی ان کی عزت نفس کا پاس لحاظ رکھتے کبھی کسی موقع پر ڈانٹ دیتے تو کبھی ان کے اوپر تفریحی انداز میں مسکرا بھی دیتے لیکن کبھی اپنے عہدے کا فائدہ حاصل نہیں کیا۔ اتفاق سے ایک روز کھانا کم پڑ گیا۔ طلبا کسی طرح کھانا کھا کر ڈائننگ ہال سے اپنے اپنے کمروں کو لوٹ چکے تھے۔ سب سے آخر میں جب آپ ڈائننگ ٹیبل پر پہنچے (ندوی صاحب نے شاید ہی کبھی طلبا سے پہلے کھانا کھایا ہو) تو خود منشی جی نے بھنا ہوا انڈا اور روٹیاں سامنے لاکر رکھ دیا۔ ندوی صاحب نے معلوم کیا کیا آج آپ نے یہی سالن طلبا کے لیے تیار کرایا تھا۔ منشی جی نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ سبزی دال ختم ہو گئی تھی اس لیے یہ صرف آپ کے لیے منگایا گیا ہے۔ ندوی صاحب کو ان کا یہ طرز عمل ناپسندیدہ لگا اور ان سے تہدیداً فرمایا کہ

جب دوسرے اساتذہ نے طلبا نے یہ سالن نہیں کھایا ہے تو میرے اندر کیا خاص بات ہے جو آپ نے میرے لیے یہ اہتمام کیا اور یہ میرے لیے جائز کیسے ہو سکتا ہے"؟ منشی جی نے از راہ خوشنودی کہہ دیا کہ مولوی صاحب یہ میں نے اپنے پیسے سے منگوایا ہے"۔ اس پر آپ بہت خفا ہوئے اور منشی جی کو بہت ڈانٹا کہ کیا آپ نے مجھے فقیر سمجھ لیا ہے یا میں آپ کا رشتہ دار ہوں۔ اسے آپ لے جایئے۔ چاہے خود کھایئے یا پھینک دیجیے اس کا حساب مطبخ کے رجسٹر میں نہیں ہونا چاہیے۔ اس روز آپ نے یہ مخصوص کھانا نہ کھا کر منشی جی اور دیگر اساتذہ کو یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ مدرستہ الاصلاح کے طلبا و اساتذہ اور صدر مدرس سبھی کی ڈائننگ ٹیبل ایک ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے بحیثیت صدر مدرس اپنے لیے کسی امتیازی سلوک کو کبھی روا نہیں رکھا۔ چنانچہ اکثر میں نے دیکھا کہ جب کوئی طالب علم آپ کے لیے لوٹے میں پانی پہنچانے کی کوشش کرتا تو بہت ڈانٹتے اور کہتے کہ کیا تم یہاں پانی بھرنے کے لیے میرے نوکر ہو۔ اگر وہ پھر بھی بضد ہوتا تو اس سے مزید دس بیس لڑکوں کے لوٹے بھرواتے۔ اس کے برعکس کبھی کبھی کسی لڑکے سے اپنے نہانے کے لیے کئی بالٹی پانی بھرواتے۔ وہ لڑکا اس کام کو ہنسی خوشی کرتا۔

ایک مرتبہ مولانا درجہ سوم کو عربی پڑھا رہے تھے ایک طالب علم، جو ہم میں سب سے چھوٹے قد کا تھا اور بہت بھاگ دوڑ کی خصوصیت کی بنا پر مولانا اسے چوہا کہتے تھے، عبارت پڑھتے پڑھتے ایک جگہ ایسا اٹکا کہ اشارے دیے جانے کے باوجود قطعاً آگے نہ بڑھ پایا مولانا تفریح کے موڈ میں آ گئے اور "تم کیا ہو" زور زور سے کہتے اور اس کی "مسکینی" پر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے۔ اس پر میں نے چوہا یوں کہا کہ مولانا" کو غلط فہمی ہوئی۔ آپ نے اس کا قصور وار مجھے نہ سمجھ کر ایک دوسرے طالب علم کو سمجھ لیا جو بہت دیر سے اپنی دونوں ٹانگوں میں سر جھکائے غیر درسی کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ مولانا نے اس کو کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کرا دی۔ وہ طالب علم دوران درس غیر درسی کتاب کے مطالعے کو اپنی غلطی سمجھ کر اٹھک بیٹھک کرنے لگا۔ ابھی وہ پانچ چھ مرتبہ بھی اٹھا بیٹھا نہ ہوگا کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور کھڑے ہو کر اپنے کان پکڑ کر اس حرکت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس وقت میں نے ندوی صاحب کے چہرے پر شدید غصے، حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کو واضح طور پر محسوس کیا۔ آپ نے مجھے پوری نظر گھور کر دیکھا اور صرف اتنا کہا کہ "وہ صرف میرے لیے چوہا ہے، دوسروں کے لیے شکیل"۔ طلبا اگر ایک دوسرے کو بُرے القاب سے نوازتے تو آپ سخت ناپسند کرتے اور فوراً تنبیہ کرتے۔

ایک مرتبہ میں ۱۹۹۰ء کی موسم گرما کی تعطیل میں انجمن طلبائے قدیم مدرستہ الاصلاح شاخ علی گڑھ کی طرف سے کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے مولانا کے کمرے پہنچا۔ آپ اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد ضروری باتیں ہوئیں اس کے بعد مولانا کی آنکھ لگ گئی اور میں بھی سو گیا لیکن ظہر کی اذان ہوئی تو مولانا نماز کے لیے جانے لگے۔ آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں جلدی سے اٹھنے لگا۔ مولانا نے فرمایا تم تھوڑا آرام کر لو۔ کونے میں پانی رکھا ہے اٹھ کر نماز پڑھ لینا۔ مجھ پر نیند کا شدید غلبہ تھا، نماز کے لیے اٹھنا گراں گزر رہا تھا لیکن مولانا کے انداز تبلیغ سے اتنا متاثر ہوا کہ پھر نہ سو سکا۔ یہ میری اور ندوی صاحب کی آخری ملاقات تھی۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور تمام مسلمانوں خصوصاً دینی و ملّی جذبہ رکھنے والے حضرات کو ان صفات سے متصف کرے۔

اترپردیش کے دس اسکولوں میں جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان کے نتیجے پر

تینتالیس ۴۳ ہونہار بچوں کو شیروانی انعامات ۱۹۹۳ء

احمد رشید شیروانی *

اترپردیش کے ہمارے کچھ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اور ہیڈ مسٹریس صاحباؤں نے جونیر ہائی اسکول بورڈ امتحان ۱۹۹۳ء کے رزلٹ مستعدی کے ساتھ بھیجے۔ ان میں سے دس اسکولوں کے ہونہار ترین طلبا وطالبات کے لیے الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ وجیب انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائریکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے دلی دعاؤں کے ساتھ انعامات بھیجے گئے۔ ان کے نام پیش ہیں۔

اسلامیہ عربیہ جونیئر ہائی اسکول
دھام پور۔ ضلع بجنور۔

۱۔ کماری شبنم جہاں سلمہا
۲۔ ممتاز عالم سلمہ
۳۔ کماری زیبا سلمہا
۴۔ وسیم احمد سلمہ
۵۔ محمد افضال سلمہ
۶۔ کماری شبنم خانم سلمہا

نیشنل جونیئر ہائی اسکول ودھیٹر وخرد وکلاں
ضلع مظفر نگر۔

۱۔ کماری ثمر حیات سلمہا
۲۔ کماری روبینہ انجم سلمہا
۳۔ امت کمار سلمہٗ
۴۔ شمیم احمد سلمہ
۵۔ کماری شبنم بانو سلمہا
۶۔ امیر عالم سلمہٗ۔

جونیئر ہائی اسکول حاتم سرائے۔
سنبھل۔ ضلع مرادآباد

۱۔ محمد کامران خاں سلمہ
۲۔ لال بہادر سلمہٗ
۳۔ مدثر حسین سلمہٗ
۴۔ راج پال سنگھ سلمہٗ
۵۔ محمد اسد سلمہٗ

رحمانیہ گرلز جونیئر ہائی اسکول۔ بدایوں

۱۔ کماری صدف منقرب سلمہا

---

* سکنات شب ملیہ، نئی دہلی۔

۲- کماری روبینہ سلمہا
۳- کماری تبسم سلیم سلمہا
۴- کماری سلمیٰ خاں سلمہا

ایس ایس اے جونیئر ہائی اسکول
اتراسی کلاں۔ مراد آباد

۱- یوسف علی سلمہ
۲- سریمپرن سنگھ سلمہ
۳- ذاکر علی سلمہ
۴- نظام الدین سلمہ

نسواں جونیئر ہائی اسکول
بانس پار بہوروا۔ ضلع بلیا۔

۱- کماری ثمینہ خورشید سلمہا
۲- کماری گلناز پروین سلمہا
۳- کماری صبیحہ فاطمہ سلمہا
۴- کماری ممتا کماری سلمہا

قادریہ نسواں جونیئر ہائی اسکول
رسڑا۔ ضلع بلیا۔

۱- کماری رنجنا سنگھ سلمہا
۲ کماری شاہ جبیں سما سلمہا
۳ کماری مہرالنسا سلمہا
۴- کماری رضیہ سلطانہ سلمہا

ظفر میموریل مسلم گرلز جونیئر ہائی اسکول
سیتاپور۔

۱- کماری زینت عطا سلمہا۔

۲- کماری شبانہ پروین سلمہا
۳- کماری یاسمین بانو سلمہا
۴ کماری سمیتا سعیدی سلمہا

ایک آنہ فنڈ جونیئر ہائی اسکول
لکھنؤ

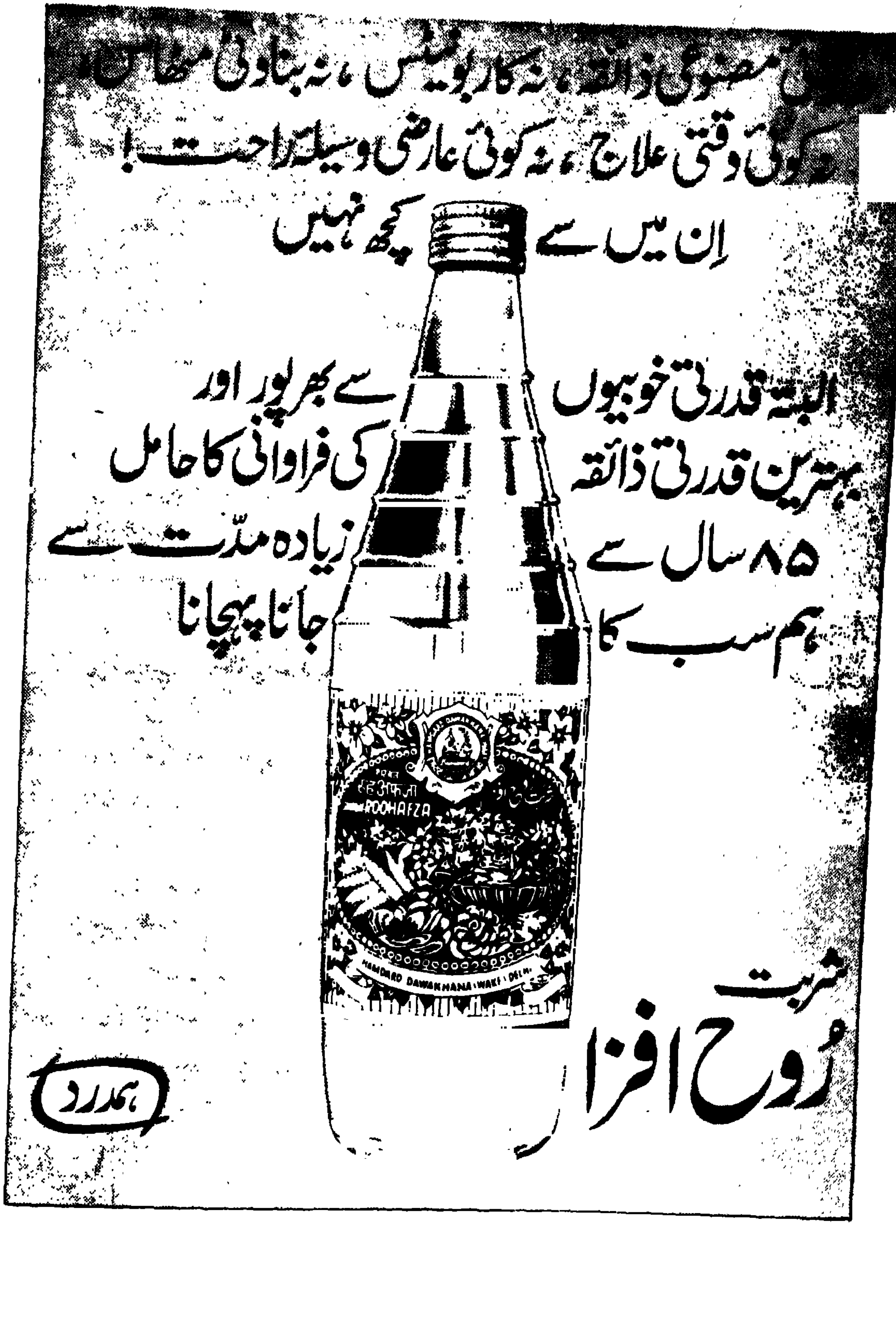
۱- کماری رفعت افضل سلمہا
۲ کماری افروز جہاں سلمہا
۳ کماری رینو گوئل سلمہا

مسلم گرلز جونیئر ہائی اسکول۔
فتح پور۔

۱- کماری زیبا مظہر سلمہا
۲- کماری خوشنما بانو سلمہا
۳- کماری شبانہ عزمی سلمہا

باقی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان وصاحبائیں بھی ہمارے فارموں کا انتظار کیے بغیر سادہ کاغذ پر لکیریں کھینچ کر، خانے وکالم بنا کر ان میں ۱۹۹۳ اسکالرز لسٹ و مطلوبہ معلومات بھر کر برائے کرم جلد از جلد بھیج دیں۔ تاکہ ہونہار بچوں کے لیے انعامات بھیجنے میں تاخیر نہ ہو سکے۔

تو کیوں ہے تابع تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں
علامہ اقبال


مصنوعی ذائقہ ، نہ کاربونیٹس ، نہ بناوٹی مٹھاس
کوئی وقتی علاج ، نہ کوئی عارضی وسیلۂ راحت !
اِن میں سے کچھ نہیں
البتہ قدرتی خوبیوں سے بھرپور اور
بہترین قدرتی ذائقہ کی فراوانی کا حامل
۸۵ سال سے زیادہ مدّت سے
ہم سب کا جانا پہچانا
ROOHAFZA
HAMDARD DAWAKHANA (WAKF) DELHI
شربت
رُوح افزا
ہمدرد

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ۸

جلد ۱۲

اگست ۹۳ء

بانی ... سرسید احمد خاںؒ

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

تزئین	...	نائب مدیر	...	انچارج سرکولیشن
سرفراز		احمد مجتبیٰ قریشی		شفیق احمد

زرِ سالانہ :
انڈیا Rs. 45·00
بیرونی ممالک US $ 20·00 ہوائی ڈاک
عام ڈاک US $ 8·00

ترسیل زر کا پتہ : Phone : 24827
ایڈیٹر، تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ
Editor, TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH. 202002

مندرجات

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: کبیر احمد جائسی۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت اے ایم یو علی گڑھ۔ پریس: اے ایم یو پریس علی گڑھ

اداریہ

کسی بڑے طوفان کے خاتمے کے بعد حالات کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ہی معمول پر آتے ہیں۔ ایسا ہونا نہ تو غیر فطری ہے نہ باعثِ تعجب۔ ۷، ۸؍ اپریل کی درمیانی شب میں مسلم یونیورسٹی کے طلبا پر جو بے جا پولیس فائرنگ ہوئی تھی وہ اگرچہ ناقابلِ فراموش ہے مگر وقت اور زمانے کے طفیل اس رِستے ہوئے زخم پر کھرنڈ نمودار ہو گیا ہے۔ زخم کے رِستے رہنے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب اس رِستے ہوئے زخم پر کھرنڈ نمودار ہو جاتی ہے جس کے سوکھ کر گر جانے کے بعد زخم بھر جاتا ہے اور اس کی جگہ پر واضح یا غیر واضح ایک نشان باقی رہ جاتا ہے جو زخم کو یاد دلایا کرتا ہے۔ یہی دنیا میں ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حالات بھی رفتہ رفتہ معمول پر آ رہے ہیں۔ سارے فائنل کلاسوں کے امتحانات تو اسی زمانے میں ہو گئے تھے جب طوفان کی ہلاکت خیزی کے مناظر نگاہوں کے سامنے تھے۔ اب تو ان کلاسوں کے نتائج کا بھی اعلان کیا جا چکا ہے۔ سالِ اوّل اور سالِ دوم کے تمام درجات کی ۱۶؍ جولائی سے پڑھائی ہو رہی ہے۔ ان درجات کے امتحانات ان شاء اللہ اگست میں ہو جائیں گے۔ یونیورسٹی میں ہر سال جتنے مقابلہ جاتی امتحانات ہوتے ہیں وہ بھی بخیر و خوبی انجام پذیر ہو چکے ہیں اور ان امتحانات میں سے بعض کے کامیاب طلبا کی فہرست بھی منظرِ عام پر آ چکی ہے اور نئے داخلوں کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ ان باتوں نے ان عناصر کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے جو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پولیس فائرنگ کے نتیجے میں یونیورسٹی برادری اس طرح منفعل ہو جائے گی کہ اس کا سارا تعلیمی و تدریسی پروگرام یک قلم موقوف ہو جائے گا اور موجودہ تعلیمی سال کو ”صفر سال“ قرار دینا پڑے گا۔ جب اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی، امتحانات ہو گئے، نتائج کا اعلان بھی ہو گیا، سال اول و دوم کے طلبا یونیورسٹی کیمپس میں واپس آ کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تو اب یہی عناصر یونیورسٹی کو سربازار رسوا کرنے کے مذموم عمل میں انتہائی تن دہی اور چالاکی سے سرگرم ہو گئے ہیں۔

قارئین تہذیب الاخلاق کو یاد ہوگا کہ گزشتہ ماہ چند اخبارات نے مسلم یونیورسٹی کے داخلوں میں ”گھپلوں“ کا ”انکشاف“ کر کے بزعم خود یونیورسٹی کو بدعنوانیوں اور بے ایمانیوں کا مسکن و مامن قرار دیا تھا اور اس بات کی کوشش کی تھی کہ یہاں کے پورے نظام پر ایک سوالیہ نشان بنا کر چھوڑ دیں۔ حالانکہ خود یونیورسٹی نے ایسے افراد کے خلاف پولیس میں شکایت درج کرائی تھی جو لوگوں کو گمراہ کر کے ایک طرف تو یونیورسٹی کو بدنام کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی جیبیں بھرنے کا انتظام بھی۔ اب یہ سارا معاملہ پولیس میں ہے وہی اس کی تفتیش کر رہی ہے اور وہی اصلی مجرموں کو ڈھونڈھ نکالے گی اور ملکی قوانین کے مطابق ان کو قرار واقعی سزا دلوائے گی۔ یونیورسٹی کا کام، یونیورسٹی کے نام پر لوگوں کی جیبیں خالی کروانے

والوں کو پولیس کے حوالے کرنے کا تھا جو انجام دیا جا چکا۔ اب پولیس اپنا فرض ادا کرے گی اور وہی سماج کے ان مجرموں کے چہروں سے نقاب بھی اٹھائے گی۔

مذکورہ کیس کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ایک صاحب نے ہمت کر کے اپنا کیس بھی پیش کیا جو پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ ان بزرگ کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے بقول خود کسی طالبِ علم کو ہزاروں میں رقم دی تھی کہ ان کے بچے کا داخلہ یونیورسٹی میں کروا دے۔ ان بزرگ کو کیا کہا جائے جنھوں نے جانتے بوجھتے اپنی ہزاروں کی رقم دریا برد کر دی۔ یونیورسٹی میں جو داخلہ جاتی امتحانات ہوتے ہیں ان کی کاپیوں پر کوڈ نمبر ڈال کر ممتحنین کے پاس بھیجا جاتا ہے اور یہ بات کسی بھی ممتحن کے علم میں نہیں ہوتی کہ وہ جس کاپی کو جانچ رہے ہیں اس کے لکھنے والے کا رول نمبر کیا ہے؟ کس علاقے کا ہے؟ اس کا مذہب کیا ہے یا اس کا نام کیا ہے؟ اس مرحلے کے بعد ممتحنین مارکس فیٹ امتحانات کے دفتر میں داخل کر دیتے ہیں۔ بعد ازاں ان کاپیوں کی ڈی کوڈنگ ہوتی ہے۔ پھر کمپیوٹر کے ذریعے تمام طلبا کی میرٹ کے لحاظ سے فہرست تیار کر لی جاتی ہے۔ جب یہ کام ختم ہو جاتا ہے تو ایک کمیٹی کٹ پرسنٹیج طے کرتی ہے۔ اس پرسنٹیج سے اوپر کے طلبا کی ایک دوسری فہرست بنتی ہے۔ اب جس جگہ جتنی سیٹیں ہوتی ہیں اوپر سے اتنے ہی طلبا لے لیے جاتے ہیں اور یوں ایڈمیشن لسٹ تیار ہو جاتی ہے جو بعد میں نوٹس بورڈ پر آویزاں کی جاتی ہے۔ اس پورے عمل میں جو کاپیاں جانچنے والا ہے وہ اصلی رول نمبر سے ناواقف رہتا ہے اور جو ایک شخص رول نمبر سے واقف ہو سکتا ہے اس کا عمل دخل نمبر دینے کے عمل میں نہیں ہوتا۔ یہ تمام باتیں لوگوں کو معلوم ہیں پھر بھی نہ جانے کیوں لوگ آمادہ ہو کر اپنے "تعاون" کو بجائے اس کے کہ ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے دیں روپیے کی دیوار کے سہارے کھڑا کرنے کی کوشش میں ان کو کہیں کا نہیں رکھتے۔

اب اگر کوئی شخص باولا ہو کر اپنے امیدوار کے داخلے کے لیے کسی شخص کو خواہ وہ کوئی بھی ہو کوئی رقم دیتا ہے تو یہ صرف اس کی نادانی ہے۔ دنیا کا ہر کام صرف روپیے کے بل پر نہیں کیا جا سکتا، اگر ایسا ہوتا تو سیٹھ اَنکو مَل جھنکو مل اپنی دولت کے زور پر طبیبِ حاذق، نامور مورخ یا شہرہ آفاق مصنف ہوتے۔ روپیے کی ناقدری اور بے وقعتی دیکھیے کہ وہ انسان کو سیٹھ انکو مل جھنکو مل تو بنا سکتا ہے عالم فاضل نہیں۔ اس لیے وہ تمام لوگ جو روپیے پیسے کے بل پر اپنے لڑکوں کو انجینیر اور ڈاکٹر بنانے کے درپے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنے لڑکوں کو علم کی دیوی کے قدموں میں ڈال دیں، ان کی تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کریں، ان کو آزاد ہندوستان کا ذمہ دار شہری بنانے کی کوشش کریں اور اپنے "ہتھکنڈوں" کو اپنے بعد والی نسل کو منتقل نہ کریں تاکہ جو نئی نسل ابھر کر سامنے آئے وہ سینہ تان کر فخر سے یہ کہہ سکے یہ سب کچھ ہم نے اپنی محنت لگن اور مسلسل تربیت سے حاصل کیا ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ ہماری محنت کا نتیجہ ہے۔ ہماری ڈگری ہمارے خونِ جگر کی کمائی ہے۔ یہ وہ خریدی ہوئی ڈگری نہیں ہے جس کا بازار میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے

سر سید احمد خاں

جب کہ ہم کسی قوم کو تہذیب کی طرف مایل کرتے ہیں تو ہم کو ضرور ہے کہ ہم یہ بھی بتا دیں کہ اس قوم کو کن کن چیزوں میں تہذیب کرنی چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ہمارے خیال میں آتا ہے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر ان کو متوجہ ہونا چاہیے:

اول آزادیِ راے:

مسلمانوں کی راے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند رہتے رہتے ایسے پست اور پامال ہو گئے ہیں جس کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ پس جب تک کہ راے کی آزادی اُن میں پیدا نہ ہوگی اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آنے کی۔

دوم درستیِ عقاید مذہبی۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے عقاید مذہبی جو اُن کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جو ان کے دلوں میں ہیں اور جن کا ان کو یقین بیٹھا ہوا ہے، وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقاید شرکیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس ان کی تہذیب کرنا اور اپنے عقاید کو سنت اسلام کے مطابق کرنا اور اسی پر یقین رکھنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

سوم خیالات و افعال مذہبی

ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں حالاں کہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ یا تو وہ خود بدعت ہیں یا رسومات و خیالات کفر و شرک ہیں جو باعث ہمارے نامہذب ہونے کے ہیں۔ پس ہم کو مہذب ہونے کے لیے ان کی تہذیب درکار ہے۔

چہارم، تدقیق بعض مسایل مذہبی

ہمارے مذہب کے بعض صحیح اور اصلی مسایل ایسے ہیں جن کی پوری پوری تحقیق و تدقیق اب تک نہیں ہوئی اور اگرچہ وہ مسایل فی نفسہ صحیح و درست ہیں، الا بیان واضح اور تحقیق کامل نہ ہونے کے سبب علوم عقلیہ کے برخلاف اور تہذیب و شائستگی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ پس ہم کو ان کی تشریح و تفسیر میں تہذیب کرنی چاہیے

پنجم، تصحیح بعض مسایل مذہبی

ہم کچھ شک نہیں کرتے کہ بعض مسایل ایسے بھی ہیں یا یوں کہو کہ بعض ایسے مسایل کا ہونا ممکن ہے جن میں متقدمین نے غلطی کی ہو۔ پس ان کو بحث میں لانا اور ایک امر صحیح ٹھہرانا ہمارے لیے ضرور ہے۔

ان تمام چیزوں کو جو مذہب سے متعلق ہیں ہم نے تہذیب و شائستگی میں اس لیے داخل کیا ہے کہ قوم کے مہذب ہونے پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ پس جس قدر جس قوم کے مذہب میں نقص ہے اتنا ہی اس کی پوری تہذیب میں نقصان ہے۔

ششم، تعلیم اطفال۔

مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانہ گزشتہ اور حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقۂ تعلیم معین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔

ہفتم، سامان تعلیم۔

ہمارے لیے صرف طریقۂ تعلیم معین کرنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ آپس کی مدد اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سامان بھی مہیا کر دینا ضرور ہوگا۔

ہشتم: عورتوں کی تعلیم

کچھ شبہ نہیں ہے کہ قومی تہذیب و شائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضرور ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور ان کی دست کاری سکھلانے کے لیے کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیے۔

نہم، ہنر و فن و حرفہ۔ ا

اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلانا و ترقی دینا قومی تہذیب کے لیے ایک بہت بڑا جزو ہے۔

یہ تمام باتیں وہ تھیں جو مجموعاً و منفرداً ہر شخص سے اور کل قوم سے علاقہ رکھتی تھیں، اب ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہر ایک شخص کی ذات سے علاقہ رکھتی ہیں مگر ان کا اثر کل قوم پر ہوتا ہے اور ہر ایک میں ان باتوں کے ہونے سے قومی تہذیب و شائستگی قرار پاتی ہے۔

دہم، خود غرضی۔

سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خود غرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی۔

اس مقام پر ہم کو ایک کہانی یاد آئی۔ انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خود غرضی اختیار کی تھوڑی دیر بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا۔ پاؤں نے کہا کہ میں کیوں چل کر غذا بہم پہنچاؤں۔ ہاتھوں نے کہا کہ ہم کیوں غذا کو منہ تک پہنچاویں۔ آنکھوں نے کہا کہ ہم اس میں کی بال مکھی کیوں دیکھیں۔ ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا بساندا ہونا میں کیوں سونگھوں۔ منہ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلوں۔ سب آپ آپ چپکے چپکے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جوں توں گزر گئے، پھر تو پاؤں لڑکھڑانے لگے ہاتھ کانپنے لگے، منہ ہلانے کی طاقت نہ رہی۔ آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا۔ تب تو گھبرائے کہ یہ کیا ہوا۔ اس وقت عقل کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔ تم نے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہم کو کیا مطلب ہے۔ حالاں کہ حقیقت میں وہ تمہارا ہی کام تھا اور اس کا نقصان تمہارا ہی نقصان تھا۔ پس جس قوم کے لوگوں میں خود غرضی ہوتی ہے جیسا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہے تو وہ اب آپ اپنے تئیں برباد کرتی ہے۔

یازدہم، عزت اور غیرت

غیرت اور عزت یہ دونوں آپس میں ایسی ملی ہوئی ہیں کہ کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ جس کو عزت ہے اس کو غیرت ہے، جس کو غیرت ہے اس کو عزت ہے۔ اب مسلمانوں میں ان دونوں چیزوں کی کمی کیا بلکہ وہ معدوم

ہوگئی ہیں۔ اگرچہ میری اس بات سے لوگ متعجب ہوں گے کہ مسلمان کیوں کر ایسے ہیں؟ اگر ابھی ان کو کوئی گالی دے جان نکال لیں، مرجائیں پر اپنی شان نہ جانے دیں۔ شادی بیاہ میں ہرگز ناک کٹائی نہ ہونے دیں۔ روپیہ قرض لیں اور شادی دھوم سے کریں۔ اگر باوا مر گیا ہے تو اس کی فاتحہ اور چہلم کی تودہ بندی میں کبھی دریغ نہ کریں۔ پھر کیوں کر ان کو اپنی عزت یا غیرت کا خیال نہیں ہے۔

یہ سب باتیں سچ ہیں، مگر یہ سب شیطانی اور جھوٹی عزت اور غیرت ہے؟ جو اصلی اور اخلاقی عزت ہے ہم اس کا ذکر کرتے ہیں۔ کس کو اس بات کی غیرت ہے کہ ہم کو کوئی جھوٹا خیال کرے۔ کس کو اس بات کا خیال ہے کہ ہم آپس میں اور معمولی باتوں میں بھی سچ کی عزت پر بٹا نہ لگائیں۔ کون ہے جو بلحاظ اپنی اخلاقی عزت کے کسی برائی کے فعل سے بشرطیکہ اس میں سزائے دنیاوی کا اندیشہ نہ ہو بچ کر اپنے تئیں معزز رکھنا چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اور قوموں میں یہ نقص نہیں ہے۔ مگر بلا شبہ اتنا کہتے ہیں کہ مہذب و شائستہ قوموں میں نہ خدا کے ڈر سے بلکہ اپنی عزت کے ڈر سے ان باتوں کا بہت خیال ہے۔

دوازدہم: ضبط اوقات۔ ہماری قومی تہذیب و شائستگی میں اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہر ایک کو اپنے خاص کاموں میں اپنی خاص اوقات کا اور جو کام عام قوم سے متعلق ہیں، ان میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہیے کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے۔

سیزدہم: اخلاق

بالفعل مدار اخلاق ہم لوگوں میں اس پر رہ گیا ہے کہ جس کسی سے ملے کچھ ہنس کر سلام کیا، کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں، دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنائیں کچھ اپنی جھوٹی نیازمندی کا اظہار کیا، کچھ ان کی جھوٹی تعریف کی آؤ بھگت کی اور دل میں کہا کہ خوب اُلّو بنایا۔ جب وہ چلا گیا تو یا تو بُرا کہنے لگے یا جو باتیں کی تھیں ان کا نقش بر آب کا سا بھی نشان نہ تھا۔

یہ سب باتیں انسان کے دل کو اور اس کے اخلاق کو خراب کر دیتی ہیں۔ بلاشبہ ہم کو سب سے جھک کر اور خندہ پیشانی سے ملنا چاہیے، مگر وہیں تک جہاں تک کہ انسانیت کا مقتضیٰ ہے، مگر اس کو مکاری کی حد تک نہ پہنچانا چاہیے۔

چہاردہم۔ صدق مقال

یہ تو وہ صفت ہے کہ جو انسان کو قطب و ابدال کے درجے سے بھی بڑھا دیتی ہے مگر یہاں ہمارا مطلب دنیاوی باتوں میں سچے پن کا ہے۔ ضرور ہے کہ سب لوگ سچ میں عزت سمجھیں۔ ایک شخص دوسرے کی بات کو سچ سمجھے، تا کہ قائل کو قبل کلام اس بات کی غیرت ہو کہ سامع میرے اس قول کو جھوٹ نہ سمجھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں سے خوش طبعی میں کہتے ہیں کہ کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ آپس میں ایک دوست دوسرے کو کہتا ہے کہ میاں کیوں جھوٹ بکتے ہو۔ ان باتوں سے جھوٹ کے عیب اور جھوٹ کے طعنے کی غیرت دل سے جاتی رہتی ہے جو بڑا سبب ذلت قومی اور نامہذب اور ناشائستہ ہونے قوم کا ہوتی ہے۔

پانزدہم۔ دوستوں سے راہ و رسم

ہماری راہ و رسم جو دوستوں سے ہے اس میں بھی نہایت نقص ہیں۔ ہم آپس میں اس طرح پر نہیں ملتے جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں بلکہ اس طرح پر ملتے ہیں جیسے حیوان آپس میں ملتے ہیں۔ ان تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنی ایک بڑا امر ضروری ہے۔

شانزدہم۔ کلام۔

طرز گفتگو اور سیاق کلام بھی جزو اعظم تہذیب

شایستگی کا ہے جس کی ہم میں بہت کسر ہے۔ ہمارے کلام میں وہ الفاظ جو مہذبانہ گفتگو میں ہوتے ہیں، نہایت کم مستعمل ہیں اور اس لیے اس کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔

ہفتدہم - لہجہ

اس کو بھی تہذیب میں بڑا دخل ہے۔ اکھڑ لہجہ یا اس قسم کی آواز جس سے شبہ ہو کہ آدمی بولتے ہیں یا جانور لڑتے ہیں، ناشایستہ ہونے کی نشانی ہے۔ کسی قدر اس پر بھی ہم کو توجہ درکار ہے۔

ہیژدہم - طریق زندگی

یہ تو ہمارا ایسا ابتر و خراب ہے کہ ہم بے مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کا طریق زندگی ہمارے طریقِ زندگی سے نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔

نوزدہم - صفائی

بدن اور گھر اور لباس سب کی صفائی تہذیب میں داخل ہے۔ انگریزی مثل ہے کہ خدا اور خدا کے بعد صفائی مسلمانوں کے ہاں بھی حدیث ہے کہ

"الطہور شطر الایمان"

[پاکیزگی نصف ایمان ہے]

مگر ہم مسلمان بہت کم اس کی طرف متوجہ ہیں، صورت دیکھو تو واہ واہ، گھر دیکھو تو سبحان اللہ۔ اس لیے ہم کو صفائی پر توجہ کرنے کی بھی بڑی ضرورت ہے۔

بستم - طرزِ لباس

لباس کی قطع اور وضع درست ہونی بہت بڑی نشانی تربیت یافتہ ہونے کی ہے۔ دیکھ لو کہ تمام دنیا میں جس قدر وحشیانہ پن کم ہوتا گیا اسی قدر لباس کی درستی ہوتی گئی۔ پس ہم کو اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو کر دیکھنا چاہیے کہ کس قسم کی ترمیم کے لائق ہے۔

بست و یکم - طریق اکل و شرب - اگر ہم تعصب نہ کریں اور انصاف سے دیکھیں تو ہمارا طریقہ اکل و شرب ایسا ہے کہ جو قومیں ہم سے زیادہ صفائی سے کھاتی ہیں جب وہ ہم کو کھاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو ان کو قے آتی ہے۔

بست و دوم - تدبیر منزل

ہماری تدبیر منزل یعنی انتظام خانہ داری ایسا ابتر و خراب ہے جس میں نہایت درجے کی اصلاح و ترقی کی حاجت ہے۔

بست و سوم: رفاہ عورتوں کی حالت میں

غیر قوموں نے ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ جیسا کچھ خیال کیا ہے اور لکھا ہے اس میں یقینی بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں ہیں مگر جو اصلی حالت عورتوں کی بلاشبہ ترقی کے لائق ہے اور ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ بہت سی اصلاح اور تہذیب کا محتاج ہے۔

بست و چہارم: کثرتِ ازدواج

اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کم ہے مگر پھر بھی زیادہ ہے اور نہایت نالائقی سے اور خدا و خدا کے رسول کے حکم کے برخلاف برتا جاتا ہے۔ یہ ایسی بدخصلت مسلمانوں میں جاری ہے جس کی بدولت اسلام کو شرمندگی و بدنامی ہے۔

بست و پنجم: غلامی

اگرچہ ہندوستان میں انگریزوں کی بدولت غلامی کی بدرسم موقوف ہو گئی ہے، مگر ہمارے مہذب و شایستہ ہونے کے لیے صرف اس کا موقوف ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ہمارے دل میں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ درحقیقت یہ رسم خلاف مسلمانی مذہب کے تھی اور فی نفسہ خراب و نالائق تھی۔ اس لیے ہم کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

بست و ششم: رسومات شادی

جو رسومات شادی کی ہم مسلمانوں میں رائج

ہیں، ایک بھی ان میں سے مذہب اسلام کی رسم نہیں ہے اور جیسی نالائق اور نامہذب وہ رسمیں ہیں شاید ہی اور کوئی رسم اس سے زیادہ ناشایستہ اور نامہذب ہوگی۔

بست و ہفتم : رسومات غمی۔

اسی طرح رسومات غمی کا حال ہے کہ برخلاف مذہب اسلام کے ہم نے نامہذب و ناشایستہ رسمیں اختیار کرلی ہیں۔

خدا رحمت کرے مولوی اسماعیل پر جن کی بدولت بہت سی نامہذب و ناشایستہ رسمیں شادی و غمی کی ہم میں سے چھوٹ گئی ہیں مگر اس پر بھی بہت کچھ باقی ہیں جن کی تہذیب پر ہم کو متوجہ ہونا چاہیے

بست و ہشتم۔ ترقی زراعت

زراعت کی ترقی اور کاشت کاروں کی حالت کی بہتری قومی ترقی اور تہذیب میں بڑا اثر رکھتی ہے اور اس میں ہم کو بہت کچھ کرنا ہے۔

بست و نہم۔ تجارت

یہ سب سے آخری جزو ہے قومی ترقی اور تہذیب و شایستگی حاصل کرنے کا اور ہم مسلمانوں میں سے یہ امر بالکل متروک ہوگیا ہے پس ہم کو اپنی قوم میں اس کا رواج دینا اور عمدہ اصولوں پر اس کو قائم کرنا ایک بہت بڑا امر واسطے تہذیب و شایستگی حاصل کرنے کا ہوگا۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ یہ تمام دنیا کی چیزوں کی ترقی ہم سے کیوں کر ہو سکتی ہے، اس لیے کہ اگر ہم متوجہ ہوں گے اور تہذیب و شایستگی حاصل کرنے پر دل لگا دیں گے تو سب کچھ ہم سے ہو سکے گا۔ یہ باتیں ظاہر میں بہت سی معلوم ہوتی ہیں لیکن آپس میں ایک ہی ہیں۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زندگی کے آخر میں بھی اپنے لیے اسی منصب کا دعویٰ کیا، جس سے انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تھا اور میں یہ یقین رکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اعلیٰ ترین فلسفہ اور سچی مسیحیت ایک روز یہ تسلیم کرنے پر متفق ہوں گے کہ آپ ایک پیغمبر تھے، خدا کے سچے پیغمبر۔"

(پروفیسر باسورتھ اسمتھ)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۸ (اگست ۹۳ء)

تعلیم اور تربیت

سید حامد*

تعلیم کو تربیت سے الگ کرنا دونوں کو ان کے فایدوں سے جدا کر دینا ہے۔ ماں باپ اگر یہ سمجھنے لگیں کہ انھوں نے بچوں کو اسکول میں داخل کر دیا اور ان کا فرض ادا ہو گیا تو یہ بڑی بھول ہوگی۔ نئی کھیتی کا جو تجربہ ہندوستان نے کیا، آگے چل کر ہرا انقلاب کہلایا۔ اس کی مثال سامنے رکھیے تو یہ بات بالکل کھل جائے گی۔ تعلیم بنا تربیت کے وہی اثر رکھتی ہے جو مصنوعی کھاد بنا سینچائی کے۔ کسان نے بھول کر ایسا کیا تو سارا کھیت جل کر رہ گیا۔ اسی طرح تربیت پر دھیان نہ دیا جائے تو تعلیم انسان کی شخصیت اور زندگی کی اعلیٰ قدروں اور اطوار و اخلاق کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ تعلیم کی آبیاری تربیت سے ہوتی ہے علم کا ظرف تربیت سے آتا ہے، اس کی افادیت تربیت سے بڑھتی ہے۔

ہمارے دور کی بے اقداری، بداطواری اور کج اخلاقی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تعلیم کو تربیت سے الگ کر دیا۔ ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ تعلیم ہمارے بچوں کے اخلاق کو خود بخود سنوار دے گی۔ غافل اس سے کہ قانون قدرت بہت کم اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کام خود بخود ہو جائیں۔ ہر کام کے لیے عمل درکار ہوتا ہے کوشش کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہلدی اور پھٹکری لگے بنا رنگ چوکھا نہیں آتا۔ خود خالق کائنات کو جو قادرِ مطلق ہے کائنات کو وجود میں لانے کے لیے "کُن" کہنا پڑا تھا۔

یہ بات بھی ہم سب پر کھلی ہوئی ہے کہ انسان کی زندگی میں سیکھنے کا سلسلہ بچپن سے شروع ہوتا ہے۔ بچہ آنکھیں کھولتا ہے؛ حواس کے دروازے وا کرتا ہے اور سیکھنا شروع کر دیتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے سنتا ہے، چھوتا ہے، سونگھتا ہے، چکھتا ہے، اسی سے وہ اس بڑی اور روشن دنیا کی واقفیت بہم پہنچاتا ہے جس میں وہ ماں کے تنگ و تاریک رحم سے نکل کر داخل ہوا ہے۔ اپنے آس پاس جو کچھ بچہ کو نظر آتا ہے اسی پر اس کی آگہی، گرفت، سوجھ بوجھ اور ایک حد تک اس کی شخصیت اور کردار کی بنیاد پڑتی ہے۔ جو کچھ اس کے کانوں میں پڑتا ہے۔ اس کا اتنا اثر تو وہ نہیں لیتا جتنا وہ آنکھوں سے دیکھنے کا لیتا ہے، لیکن اس طرح وہ بولی سمجھتا ہے، زبان کے قفل کھولتا ہے اور اپنے

* سابق وائس چانسلر، اے ایم یو۔ علی گڑھ۔ ــــ سکریٹری، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار۔ نئی دہلی

اپنے تجربے، احساس اور فکر کو زبان کے ذریعے ادا کرنے
کی لیاقت حاصل کرتا ہے۔ سُنے ہوئے پر وہ اس طرح ایمان
نہیں لاتا جس طرح دیکھے ہوئے پر۔ اسی فرق میں تعلیم اور
تربیت کا راز چھپا ہوا ہے۔ تربیت میں تلقین اور ہدایت
شامل ضرور ہے لیکن تربیت دینے کا سب سے موثر
ذریعہ اپنے عمل سے مثال سامنے لانا ہے۔

اگر آپ یہ نہیں چاہتے کہ آپ کا بچہ آپ سے
آپ کی بُرائیاں اور کمزوریاں سیکھے تو نہ انھیں چھپانے
نہ اُن برائیوں کی عام طور پر مذمت کرنے سے کام چلے
گا۔ ماں باپ لاکھ جتن کریں اپنے عیب اپنے بچوں سے
نہیں چھپا سکتے اور اگر آپ اُن خامیوں کو جو آپ کے کردار
میں ہیں بُرا بھلا کہتے ہیں اور بچے کو ان سے دور رہنے کی
ہدایت کرتے ہیں تو کچھ ہی دنوں میں بچے کے دل میں آپ کی
کسی بات کی وقعت نہیں رہے گی۔ یہی نہیں، آپ سے اُسے
جو عقیدت ہے وہ گھایل ہو جائے گی۔ آپ سے وہ
ریاکاری اور دو رُخی منسوب کرنے لگے گا۔ اس طرح ایک طرف گھر کا
آئینہ گرد سے اٹ جائیگا۔ گھر والوں کی سنگت خوشی اور کشش کھو بیٹھے گی۔
دوسری طرف دنیا کے ساتھ بچے کے تال میل میں رکاوٹ آئے گی۔ زندگی
سے وہ بچھڑا ہوا یا سہما ہوا رہے گا۔ اچھائی پر سے اس کا عقیدہ اُٹھ
جائے گا۔ بھلی منساہت اور خیر اندیشی سے وہ کترائے
گا۔ زندگی پر اس کی گرفت ڈھیلی رہے گی۔ وہ یک سوئی
جو قدرت کے رموز چاک کر دیتی ہے، جو کسبِ فضیلت
کا سب سے بڑا وسیلہ ہے، اس کے پاس پھٹکے گی بھی
نہیں۔ اس کے قدم بھٹکیں گے، اس کی آنکھیں ویران
ہو جائیں گی۔ وہ آسمان پر بادل کے بے آب ٹکڑوں یا
اس کے پیچھے کٹی ہوئی پتنگ کی طرح آوارہ بھٹکتا رہے گا
محبت، عقیدت، سچائی، اعتماد، خیر خواہی اس سے
کوسوں دور رہے گی۔

اسی لیے یاد رکھیے کہ ہر چند زبان کبھی کبھی شامل
ہو جائے، تربیت عمل سے اور مثال سے دی جاتی ہے
تعلیم سکھاتی ہے، تربیت دکھاتی ہے۔ لہٰذا وہ ماں باپ
جو بچے کا بھلا چاہتے ہوں (اور کون نہیں چاہتا) انھیں چاہیے
کہ اچھے سے اچھا بن کر اپنے بچوں کے سامنے آئیں، بُرے مفہوم میں
نہیں بلکہ خود کو اچھا بنا کر، اپنی کمزوریوں، خامیوں اور
بُری عادتوں کو بھرسک دور کر کے۔ ورنہ ان کی نصیحت
کھوکھلی ہو گی اور ان کی تربیت بے کار، بے اثر۔ گھر میں
دوسروں کی بُرائی ہو گی تو بچہ اُن کی بُرائی کرے گا اور
بُرائی کرنے والوں کی بھی۔ اس نے کہیں یہ دیکھ لیا کہ ایک
صاحب آپ سے ملنے آئے، منہ پر آپ نے اُن کی تعریف
کی اور پیچھے بُرائی تو اُن کے ساتھ ساتھ آپ بھی اپنے
بچے کی نظر سے گر جائیں گے اور وہ اس دنیا سے بھی بدگمان
ہو جائے گا جسے وہ اپنے والدین کی شخصیات کی توسیع
سمجھتا ہے۔ اس کے ننھے ذہن و حواس کے لیے دنیا آپ
ہی ہیں۔ دنیا سے اس کی پہلی مڈبھیڑ آپ کی ذات
کی شکل میں ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ آپ پر ہے کہ یہ مڈبھیڑ
بھیانک، بدنما اور جھوٹی دنیا سے ہو یا ایک ایسی دنیا
سے جو خوشنما، پاکیزہ، سچی اور دلکش ہے۔ کردار بنانے
میں یہ پہلے نقش سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سیاسی رہنماؤں کو ہم سب دیکھتے اور سنتے ہیں۔ کتنی
حقارت سے دیکھتے اور کیسی بے یقینی سے سنتے ہیں
اس لیے کہ جو وہ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ جب قول و فعل
میں تال میل نہ ہو تو شخصیت پھٹ جاتی ہے اور اس کی
دراروں میں ہر طرف سے گرد و غبار اور نجاست آ کر
بیٹھ جاتی ہے۔ زنہار آپ پر ریاکار ہونے کا ایک پل
بھی شبہ نہ ہونے پائے ورنہ بچہ ہاتھوں سے گیا
وہ یا تو بدگمانی اور بد اندیشی کے بھنور میں پھنس جائے گا
یا خود وہ برائیاں اختیار کرے گا جو اس نے اپنے گھر میں
دیکھی ہیں۔ دونوں صورتوں میں انجام تباہی ہے۔ سوءِ ظن

کے ہاتھوں میں نہ کردار کبھی پنپا ہے، نہ شخصیت نے فروغ پایا ہے اور دانستہ بُری راہ پر پڑ جانے والوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔

انسان کی شخصیت کے جامہ میں تعلیم اور تربیت کی حیثیت تانے بانے جیسی ہے۔ دونوں میں سے صرف ایک پر بھروسہ کر لیجیے تو دھاگے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ یاد رکھیے کہ علم گمراہ کر سکتا ہے اگر اس کو حدود میں نہ رکھا جائے اور اس کو جذب کرنے کے لیے زمین تیار نہ کی جائے۔ بے مدعا اور متفرق اور بے شیرازہ علم کے بار تلے انسان کا ذہن دب جاتا ہے، کچلا جاتا ہے عقل بھی کبھی کبھی دھوکا دے جاتی ہے۔ نفسانیت کی تابع فرمان بن جاتی ہے۔ بس ایک ضمیر ہے جو شخصیت کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ انسان کو گمراہ ہونے اور بھٹکنے سے بچاتا ہے اور بھلے بُرے کے درمیان امتیاز کرنا سکھاتا ہے۔ یہ ضمیر خدا کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے لیکن اسے بالیدگی اور طاقت انسان کے صدیوں کے تجربے اور معاشرے کے صالح نقطۂ نظر سے ملتی ہے۔ انسان کے جو دیرینہ تجربات اور نیک و بد کے جو پیمانے اگلی پیڑھیوں سے پہنچتے ہیں، انھیں ابتدا میں بچوں تک پہنچانے کا کام تربیت ہی کرتی ہے۔ تربیت کا یہ کام ہے کہ ازلی قدروں اور ابدی حقیقتوں کو بچے کے ذہن میں پیوست کر دے اور ضمیر کے بیج کی جو ہر انسان دنیا میں اپنے ساتھ لاتا ہے آبیاری کرے تاکہ وہ راست روی، سوجھ بوجھ اور انسان دوستی کے برگ و بار لائے۔ تربیت نہ ہو تو علم بے مہار ہو جاتا ہے۔

آپ چھوٹتے ہی پوچھ بیٹھیں گے کہ تربیت کن کن باتوں کی دی جائے۔ یہ بحث لمبی ہو جائے گی۔ میں یہ کہہ کر دم سادھ لوں گا کہ تربیت کا رُخ اخلاق اور اطوار دونوں کی طرف ہوتا ہے۔ بنیادی اخلاقی قدریں آشکار ہیں، انھیں گنانے کی ضرورت نہیں، رہے اطوار، ان کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان کا رشتہ دراصل اخلاق سے جڑا ہوا ہے۔ اطوار میں لباس کی سجاوٹ، لب و لہجہ کا بانکپن، گفتار کا حسن، نشست و برخاست کی دلکشی رفتار کی رعنائی، آداب محفل، سب کچھ آ جاتا ہے۔ لیکن اخلاق کی طرح اطوار میں کلیدی اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ ہمارے قول و فعل سے کسی کو نقصان یا تکلیف نہ پہنچے، کسی کا دل نہ دکھے۔ اخلاق و اطوار کی کسوٹی یہی ہے زندگی کی کوئی بنیادی حقیقت ان شاعروں کی نگاہ سے چھپی نہیں رہتی۔ چنانچہ شاعر کہہ گیا ہے۔

مباش درپے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

[کسی کو ستاؤ مت اور جس کسی بات کو چاہے کر ڈالو کہ ہمارے مسلک میں دل آزاری کے سوا کوئی گناہ ہے ہی نہیں]۔

تربیت دیتے وقت اس بات کو سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے کہ انسانیت عبارت ہی بے آزاری سے ہے۔

بے آزاری انسانیت کا منفی پہلو ہے۔ اس کا مثبت پہلو یعنی تصویر کا دوسرا رُخ دوسروں کی مدد کرنا ہے۔ اپنی بساط بھر، ہر ممکن طریقے سے۔ اگر انسان انسان کی مدد نہ کرے تو آفاتِ ارضی و سماوی اور حشرات الارض اور بہائم اس کو پیس ڈالیں، کھا جائیں۔

ادب اور لحاظ، حیا اور حجاب کی تربیت ضرور دیجیے ان کی اہمیت سے جو انکار کرے وہ تہذیب کا منکر ٹھہرایا جائے گا۔ یہ صفات انسان کو جانوروں سے الگ کرتی ہیں لیکن ہم شرقیوں کے یہاں ان کی داستان اور وزن کو زیادہ بڑھا دیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے بوجھ کے تلے پیش قدمی، حوصلہ اور سوچنے اور بولنے کی آزادی

کھلی جاتی ہے۔ ان پر زور کی افراط کے باعث شخصیت لنشوو نما سے محروم ہوجاتی ہے۔ لوگ اہل تردد بن جاتے ہیں ایسے لوگوں کو دنیا نا اہل پیشہ سمجھ کر اپنی راہ سے ہٹا دیتی ہے۔ یہ لوگ اپنی بات کہتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ لہٰذا ان کی کوئی سنتا نہیں۔ ان کی بات کانوں تک نہیں پہنچتی۔ یہ اپنے حق سے ہمیشہ محروم رہتے ہیں۔ اپنا حق مانگنے اور حاصل کرنے کا حوصلہ ان میں نہیں رہتا۔ ان کی نقل وحرکت کے علاوہ ان کا تخیل ان کی قوت اختراع ان کی طاقت پرواز سب سکڑ کر رہ جاتے ہیں بندشیں انھیں پھیلنے اور پھلنے پھولنے نہیں دیتیں "اطاعت شعاری" ان کو غور وفکر کی آزادیوں سے بھی محروم کردیتی ہے۔ جمود سارے معاشرے پر چھا جاتا ہے۔ سعادت مندی، تابعداری بن جاتی ہے۔ یہ بندشیں قانون قدرت کے خلاف ہیں۔ قویٰ میں ان سے زنگ لگ جاتا ہے۔ ارتقا کی راہیں یہ بند کردیتی ہیں۔ انسان اپنی ذات میں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ ارتباط کا ہاتھ وہ دوسروں کی طرف نہیں بڑھا پاتا۔ اس چمک سے وہ محروم رہتا ہے جو ذہنوں کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ادب لحاظ، حیا، حجاب، لاریب یہ برحق ہیں لیکن ہم سے یہ کس نے کہا تھا کہ ان کے ضمن میں اعتدال کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیں۔ اعتدال کو چھوڑنے سے ہی اچھائی برائی میں بدل جاتی ہے۔

تعلیم کی طرف بعد از خرابیٔ بسیار ہم نے دھیان دینا شروع کیا ہے۔ ضروری ہے کہ ہم تربیت کو اس کے ساتھ لے کر چلیں۔ تربیت کے ذریعے اپنے بچوں کے عادات اطوار، اخلاق و اقدار اور معیار کو سنواریں۔ بچوں کو دل آزاری کرنے سے بچائیں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا سکھائیں، بتائیں کہ بزرگوں کا ادب کرو اور حوصلہ دیں کہ آگے بڑھو، بات کھل کر کہو، قدم بے جھجک بڑھاؤ اپنے امکانات اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤ کہ زندگی کھیل ہی اسی کا ہے لیکن دوسروں کو روند کر آگے نہ بڑھو، انسانیت کا دامن زنہار ہاتھ سے نہ دو۔ یاد رکھو اگر تردد کو عناں گیر ہونے دیا تو ایک قدم آگے نہ بڑھ سکو گے۔ ہزاروں برائیاں بچوں میں اس لیے در آتی ہیں اور پختہ ہوجاتی ہیں کہ وہ اپنے ماں باپ سے کھل کر بات نہیں کر پاتے، ان کو اپنا ہمراز نہیں بناتے۔ کوئی رفاقت باپ بیٹے اور ماں بیٹی کی رفاقت سے زیادہ دلکش اور بار آور اور پاکیزہ اور پُر تعمیر نہیں ہوتی۔ بچوں کو وقت کی قدر کرنا سکھایئے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہے۔

"اور چھوڑ دو گناہ کے ظاہر کو (بھی) اور اس کے باطن کو (بھی)۔ بے شک جو لوگ گناہ کما رہے ہیں، انھیں عنقریب بدلہ مل جائے گا اس کا جو کچھ کہ وہ کرتے رہتے ہیں"

(الانعام ۱۲۰)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲، شمارہ ۸ (اگست ۹۳ء)

رحمت کے فرشتے

محمد مسعود عالم قاسمی *

آپ نے نوبل انعام یافتہ مدر ٹریسا کی خدمات کے واقعات سنے اور پڑھے ہوں گے۔ ذرا مدر شبیلہ کی کہانی سنیے۔

شبیلہ خاتون کے شوہر سراج الحق موتی ہاری ہاسپٹل میں کسی شدید مرض کے باعث زیر علاج تھے شبیلہ خاتون نے اپنے شوہر کو اطلاع دیے بغیر ایک ایک کر کے اپنے سارے زیورات بیچ ڈالے، مگر انھوں نے یہ زیورات اپنے شوہر کے علاج کی خاطر نہیں بیچے بلکہ معذور، اپاہج اور محتاج بچوں کی تعلیم و کفالت کے لیے انھوں نے جو اسکول قایم کر رکھا ہے اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے بیچے۔ شبیلہ اور ان کے شوہر خود لاولد ہیں اس لیے ان کے اسکول میں ایسے معذور بچے داخل ہیں جن سے ان کا کوئی خونی رشتہ نہیں بلکہ ان میں اکثریت غیر مسلموں کے بچوں کی ہے۔ ان بچوں سے ان فرشتہ صفت خاتون کا صرف ایک ہی رشتہ ہے وہ ہے رحمت، شفقت اور خدمت کا۔

شوہر اور اولاد کی محبت کے بعد عورتوں کی محبت زیوروں سے ہوتی ہے ۔ مگر اس خاتون نے معذور بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کے لیے اپنے زیورات بیچ کر ایک ایسی مثال قایم کی ہے جو ہر ہندوستانی خاتون کے لیے مشعل راہ ہے۔ اسی لیے صوبہ بہار کے ترہت اور سارن ڈویژن کے کمشنر جناب اے۔ کے بسواس نے ہندوستان ٹائمز پٹنہ ایڈیشن مورخہ ۱۶ رمئی ۹۳ء میں اس انمول ہیرے کا فراخ دلانہ تعارف کرایا ہے اسے "اینجل آف مرسی یعنی" رحمت کے فرشتے" کا عنوان دیا ہے اور اس پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔

صوبہ بہار کے ضلع مشرقی چمپارن میں موتی ہاری سے ۲۵ کلومیٹر دور ڈھاکا پولیس اسٹیشن کے تحت واقع ایک گاؤں کرسہیا کی رہنے والی یہ فیملی بہت زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں ہے اور نہ کسی مشہور کالج یا یونیورسٹی کی سند یافتہ ہے، بلکہ گاؤں کی رہنے والی سیدھی اور سادہ سی فیملی ہے جس کی مالی حالت بھی بہت زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ سراج الحق خود بھی ایک عام دیہاتی ہی ہیں پان اور کھینی (کچی تمباکو) کھلانے والا ہائی اسکول سے بھی کم تعلیم یافتہ پیشے کے اعتبار سے پھل پھول کی نرسری چلانے والا کون کہہ سکتا ہے کہ قومی تعمیر کا اہم پتھر ہوگا۔ مگر

---

* ناظم دینیات ــــ اے ایم یو علی گڑھ

انھوں نے اپنے لیے جو راہ پسند کی وہ بہت روشن ہے۔
سراج الحق لاولد ہیں۔ انھوں نے دوسری شادی نہیں کی
حالانکہ ان کی بیوی نے بھی دوسری شادی کا مشورہ دیا مگر
ان کا کہنا ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں
پانچ سال پہلے انھوں نے خواب میں اپنی والدہ مرحومہ کو
دیکھا۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ بیٹے غریب اور اپاہج بچوں کی
دیکھ بھال کرو۔ تمہارے بیٹے اور بیٹیاں وہی ہوں گے
خوش رہو اور غمگین نہ ہو۔ سراج الحق کا کہنا ہے کہ
اس وقت سے میں اکثر اپاہج بچوں کو خواب میں روتے
دیکھتا تھا۔ وہ مجھ سے کہتے چچا اٹھیے اور ہمیں اپنی محبت
اور شفقت عنایت کیجیے۔ ہم بے سہارا ہیں، ہم محتاج ہیں
بالآخر ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور ۱۹۸۹ء میں انھوں
نے اپاہج بچوں کا گھر اور اسکول قائم کر لیا اور اس کا نام
رکھا "لیاقت سراج الحق سرو دیے عباسیہ وکالنگ
ودھیالیہ"۔

پہلا معذور بچہ جو ان کے اسکول میں داخل ہوا اس
کا نام اپندر رائے یادو ہے۔ یہ بچہ دونوں ہاتھوں سے
معذور ہے مگر اب وہ شبیلہ اور سراج الحق کی تربیت
کے نتیجے میں خود سے کھاتا بھی ہے، کپڑے بھی دھوتا
ہے اور صفائی بھی کرتا ہے۔ سراج الحق بہت ہی مخلص اور
شریف انسان ہیں۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ ان معذور
بچوں کی صفائی اور خدمت میں وہ کوئی عار تو محسوس
نہیں کرتے تو انھوں نے کہا:

"یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ان معذور
بچوں کے ذریعے اپنی خدمت کا موقع دیا۔"

معذور بچوں کی تعداد سراج الحق کے یہاں روز بروز بڑھتی
گئی اور اپریل ۱۹۹۳ء میں ان بچوں کی تعداد ایک سو نو ہو گئی
یہ بچے سراج الحق کو ابا اور شبیلہ کو امی کہنا چاہتے ہیں
مگر وہ خود کو چاچا اور چاچی کہلوانے ہیں۔

ان بچوں کو کھلانا پلانا یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ اس
کے لیے مالی وسائل کی ضرورت ہے سراج الحق کے پاس جس
کی کمی ہے۔ ان کے پاس صرف ڈیڑھ ایکڑ زمین ہے۔
سراج الحق کے پاس پھل پھول کی ایک نرسری ہے اس میں
الائچی، باسمتی، تیزپتہ، سندل، گولمرچ، سندور، سالونا
کافور اور اسی طرح کی قیمتی اشیاء کے پودے ہیں۔ باسمتی
کی پتی اگر عام چاول میں رکھ دی جائے تو اس میں باسمتی
کی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی آمدنی سے
سراج الحق معذور بچوں کی کفالت میں مدد لیتے ہیں۔

ان ایک سو نو ۱۰۹ بچوں کی کفالت کے لیے سراج الحق
کے پاس کوئی معقول اور متعین ذریعۂ آمدنی نہیں ہے
ان معذور بچوں کے والدین کبھی ان کو دیکھنے آتے ہیں تو
کچھ غلہ دے جاتے ہیں۔ اس وقت اس اسکول کو اوسطاً
پانچ لاکھ روپیے سالانہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ مقامی
حضرات بھی کچھ مدد کرتے ہیں۔ حال ہی میں سنٹرل بینک
آف انڈیا نے بچوں کے لباس، غذا، دوا اور نقدی
وغیرہ کی شکل میں اسکول کی مدد کی ہے۔

اس اسکول میں بہار کے علاوہ نیپال کے بھی
معذور بچے داخل ہیں جن میں ہندو اور مسلمان دونوں
ہیں بلکہ ۱۰۹ بچوں میں مسلمان بچے صرف ۳۳ ہیں۔ باقی
۶۶ بچے ہندو ہیں۔ یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہی نہیں قومی تعمیر
کی روشن مثال بھی ہے۔ ابھی تک اسکول میں بچیوں کا
انتظام نہیں ہے کیوں کہ اس کے لیے الگ عمارت کی
ضرورت ہے جس کا سراج الحق کے پاس سرمایہ نہیں
ہے۔

سراج الحق اور ان کی اہلیہ شبیلہ خاتون اس
حد تک حوصلہ مند ہیں کہ وہ ان ناجائز اور لاوارث بچوں
کو اپنانے کے لیے بھی تیار ہیں جن کو کنواری مائیں رات
کی تاریکی میں جنگل میں پھینک آتی ہیں۔ وہ اس سلسلے

میں یہ اعلان کرنے جا رہے ہیں کہ جو کوئی ایسے بچوں کو لائے گا اسے پانچ سو روپیے دیے جائیں گے۔

سراج الحق کے بیان کے مطابق ان بچوں کی اکثریت پاؤں سے معذور ہے۔ اس کے بعد وہ بچے ہیں جو ہاتھ سے معذور ہیں۔ پانچ بچے گونگے اور بہرے ہیں۔ دو نابینا ہیں۔ ساگر رام راوت جو اس اسکول میں باورچی ہے اس کی شادی سراج الحق نے شاردا سے کرائی ہے جو دونوں پاؤں سے معذور ہے۔

سراج الحق نے جب معذور بچوں کا یہ گھر اور اسکول شروع کیا تھا تو ان کے گاؤں والے انھیں پاگل سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ تم ڈوم اور چمار کے بچوں کو لے کر ان کی پرورش کرتے ہو۔ مگر اس شخص نے اپنی محنت اور خدمت کا جو ثبوت پیش کیا اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ علاقے کے با اثر اور عقل مند لوگ سراج الحق کے قریب آنے لگے ہیں۔ ان کے اسکول کی منیجنگ کمیٹی کے ممبر بننا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ہمارا درد سر ہے تاکہ وہ اس اسکول پر قابض ہو سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ اور پرائیویٹ ذرائع سے پیسہ حاصل کریں گے مگر سراج الحق کو اس میں معذوروں کی خدمت کے نام پر منافع خوری کی بو نظر آتی ہے۔

اسی لیے سراج الحق اور شبینہ خود ہی استقلال کے ساتھ انسانی محبت اور خدمت کی اس روشن راہ گزر پر سرگرم سفر ہیں۔ اس طرح کی مثالیں اگر مسلم معاشرے میں بڑھنے لگیں تو ہندوستان سے نفرت اور فرقہ وارانہ منافرت کو کم کیا جا سکتا ہے اور انسانی خدمت تو خود ہی بڑا ثواب ہے۔ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اس لیے اللہ کا محبوب بندہ وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔"

"بے شک اللہ عدل کا اور حسن سلوک کا اور قرابت داروں کو (ہر طرح کی امداد) دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے اور حد سے متجاوز برائی سے اور نازیبا کلام سے اور ظلم (وسرکشی) سے ممانعت کرتا ہے۔ وہ تمہیں یہ نصیحت کرتا ہے تاکہ تم کو یاد دہانی ہو جائے۔"

(النحل ۹۰)

موجودہ حالات و واقعات

آخری قسط

مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ

خالد حامدی*

امن وامان کی قدر وقیمت

جس کسی قوم یا گروہ کے بارے میں منصوبہ بند طریقے سے باقاعدہ فلسفے اور نظریے کی صورت میں ایک عرصے سے یہ پروپیگنڈا کیا جارہا ہو کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمارے دھرم، ہماری سبھیتا (کلچر) کو برباد کیا، ہمارے مندروں کو ڈھایا، ہماری عورتوں کی آبروریزی کی، لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا، بھارت ماتا کو لوٹ مار کر کے کنگال کر دیا اور آخر میں اس کے ٹکڑے کر کے اپنے لیے ایک علیحدہ ملک بھی حاصل کر لیا اور پھر بھی یہ ہمارے سینے پر مونگ دلے جا رہے ہیں۔ یہ شدید قسم کی غلط فہمیاں کیا رنگ لاسکتی ہیں، اس کا مشاہدہ آج ہم کر رہے ہیں، گویا مسلمانوں کے نیچے بارود بچھا دیا گیا ہے بس کہ اس میں چنگاری لگتے ہی سب کچھ بھک سے اُڑ جاتا ہے۔ اس صورت میں اشتعال وجذباتیت کے مقابلے میں امن وامان کی اہمیت اور قدر وقیمت اور بڑھ جاتی ہے تاکہ ایک طرف ہم اپنے رویے اور کردار کے ذریعے اور دوسری طرف تبادلۂ خیالات کے ذریعے ان غلط فہمیوں کو رفع کرسکیں اور نفرت وتعصب کے بارود کو بے اثر بنا سکیں۔

عالم گیر الٰہی اصولوں پر مبنی جماعت اور قوم کے لیے امن وامان کی فضا اتنی ضروری ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ اپنے نہایت واضح حقوق اور مفادات سے دستبردار ہو کر بظاہر دب کر امن وصلح کو خریدنا پڑتا ہے تاکہ نفرت و تعصب پر مبنی فضا کا خاتمہ ہوسکے اور انسانی جان و مال کا ضیاع رک جائے اور ایسا ماحول پیدا ہو جس میں افہام وتفہیم کی گنجائش باقی رہے۔

اس سے کہیں زیادہ سخت حالات تھے جو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کو درپیش تھے، الزام تھا کہ آپؐ اصل دینِ ابراہیمی سے ہٹ گئے ہیں، قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے، لوگوں کو آپس میں لڑا کر قتل و غارت گری کی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ نفرت وتعصب کا ایک لاوا تھا جو آپؐ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف امڈ امڈ کر آرہا تھا۔ ایسے ماحول میں آپ اشارۂ خداوندی سے مدینہ سے مکہ صحابہؓ کے ساتھ ذوالحجہ کے مہینے (حرام و محترم مہینوں میں سے ایک جس میں جنگ ممنوع ہے) میں طواف وعمرہ کے لیے روانہ ہوتے ہیں، مکہ کے

---

* لکچرر، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

لوگوں میں ایک کہرام برپا ہو جاتا ہے، "ہم ان بے دینوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، ان سے جنگ کریں گے۔ ان کو تہس نہس کر دیں گے۔" آپؐ حدیبیہ کے مقام پر رک جاتے ہیں۔ آپؐ یقین دلاتے ہیں کہ ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ خانۂ کعبہ کے طواف وعمرہ کے لیے آئے ہیں، ہمارے ساتھ قربانی کے جانور ہیں اور ہم احرام باندھے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے روایتی ہتھیار نیام بند تلوار کے کوئی اور ہتھیار ہمارے پاس نہیں۔ ہم صرف اور صرف طواف وعمرہ کرنا چاہتے ہیں جو ہر عرب کر سکتا ہے لیکن نفرت وتعصب اور اشتعال کی اس فضا میں قانونی ودستوری زبان کون سنتا ہے۔

مکہ کے امن پسند حضرات اپنے وفد آپؐ کی خدمت میں بھیجتے ہیں۔ گفت وشنید کے بعد طے ہوتا ہے کہ صلح کر لی جائے لیکن ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ صلح کے لیے کون سی شرطیں رکھی گئیں:

۱۔ مسلمان اس سال بغیر طواف وعمرہ کے واپس جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں اور مکہ میں تین دن سے زیادہ قیام نہ کریں۔

۳۔ ہتھیار لے کر نہ آئیں، صرف روایتی تلوار ساتھ لا سکتے ہیں لیکن وہ بھی نیام میں اور نیام تھیلے میں ہونی چاہیے۔

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں، اگر کوئی مسلمان مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو روکا نہ جائے۔

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو اسے واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں آجائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

یہ شرائط کتنی سخت ہیں لیکن امن وامان اور صلح وآشتی کی خاطر ان کو قبول کر لیا گیا۔ ابھی یہ شرائط صلح تحریر میں نہیں آئی تھیں کہ مسلمانوں پر ایک اور آزمائش آپڑی۔ حضرت ابوجندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اسلام لا چکے تھے اور اب تک مکہ والوں کی قید وبند میں طرح طرح کی اذیتیں برداشت کر رہے تھے، کسی طرح بھاگ کر یہاں پہنچے اور مسلمانوں کے سامنے آکر گر پڑے۔ ان کے پیروں میں بیڑیاں تھیں اور جسم زخموں سے لہولہان تھا۔ کفار مکہ کے نمائندہ سہیل نے کہا کہ محمد! صلح کی شرائط کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے۔ ابوجندل کو شرائط صلح کے مطابق میرے حوالے کر دو۔ آپ نے فرمایا کہ صلح تو ابھی تحریر میں نہیں آئی ہے اور نہ ہی اس پر دستخط ہوئے ہیں۔ سہیل نے کہا کہ ٹھیک ہے تو پھر ہمیں یہ صلح منظور نہیں ہے، آپؐ نے ان سے طرح طرح سے اصرار کیا۔ ان سے کہا کہ اچھا انھیں اسی علاقے میں رہ جانے دو لیکن سہیل راضی نہیں ہوئے آخر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا یہ مطالبہ بھی تسلیم کرنا پڑا۔ حضرت ابوجندلؓ کا سارا جسم زخموں سے چور تھا۔ انھوں نے اپنا بدن کھول کر سارے زخم دکھلائے اور کہا کہ

اے مسلمانو! میں اسلام لا چکا ہوں
کیا مجھے پھر دوبارہ ظلم وستم کے ماحول
میں بھیجنا چاہتے ہو۔

لیکن اللہ اور اس کے رسول کے آگے کسی کو یارا نہ تھا اس کے علاوہ جب صلح نامہ تحریر کیا جانے لگا تو اوپر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا گیا۔ اس پر پھر سہیل نے اعتراض کیا اور اصرار کر کے اپنے یہاں مروجہ طریقے باسمک اللھم لکھوایا۔ اس کے بعد یہ جملہ تھا هٰذا ما قاضٰی علیہ محمد رسول اللہ

[یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد اللہ کے رسول نے کیا ہے]

اب لفظ رسول اللہ پر اعتراض کیا گیا۔ سہیل نے کہا کہ

اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول تسلیم کرتے ہوتے تو پھر جھگڑا ہی کیا تھا۔ آپ اسے بدل کر اس کی جگہ اپنے والد کا نام لکھیے

آپ نے فرمایا:

اگرچہ تم نہیں مان رہے ہو لیکن خدا کی قسم میں اللہ کا رسول اور فرستادہ ہوں۔

اور پھر آپ نے ان کا یہ مطالبہ بھی مان لیا۔

یہ وہ حالات تھے اور یہ وہ صلح کی شرطیں تھیں جو ایک طرح سے مسلمانوں پر تھوپی گئی تھیں مسلمانوں کے جذبات و احساسات مجروح تھے، دل داغ داغ تھے لیکن اسلام، مسلمانوں اور عام انسانی مفادات کے تحت بحکم خداوندی اس صلح کے ذریعے امن و آشتی کی راہ ہموار کی گئی! غرض اس صلح کے بعد آپ مدینہ واپس ہوئے۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ اللہ کی طرف سے خوش خبری دی گئی:

انا فتحنا لک فتحا مبینا (الفتح ۴۸:۱)

["ہم نے تمہیں نہایت واضح فتح سے سرفراز کیا ہے"]

ملاحظہ فرمائیے کہ کہاں بظاہر ذلت آمیز شرائط پر مبنی یہ صلح اور کہاں فتح کی خوش خبری۔ مسلمان جس چیز کو شکست و عار سمجھ رہے تھے، خدا نے اسے فتح قرار دیا۔ کیوں کہ بعد کے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ خدا کا فرمان ہرگز غلط نہیں ہو سکتا۔

اب تک مسلمانوں اور کفار کے درمیان نفرت، تعصب، ...

وجہ سے ان میں سلام کلام اور ملاقات و گفتگو سب بند تھی۔ اب صلح ہو جانے کی وجہ سے راستے کھلے، آمد و رفت شروع ہوئی، دل کے غبار کم ہوئے۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے، ان سے اسلامی امور پر تبادلہ خیال کرتے۔ ہر مسلمان اخلاص، حسنِ عمل اور اخلاق و کردار کا جیتا جاگتا نمونہ تھا، اس سے لوگوں کے دل اسلام کی طرف کھنچتے گئے۔ مورخین بتاتے ہیں کہ اس معاہدۂ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہ لائے تھے۔ آں حضورؐ نہ تو اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہوئے اور نہ ہی آپ نے اس کو اپنے وقار کا مسئلہ بنایا۔

ایک دوسرا واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ فتح مکہ کے بعد طائف کے باشندے بنو ثقیف جو قلعہ بند ہو گئے تھے ان سے معرکہ آرائی ہوئی۔ آپ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ بیس روز کے محاصرے میں شدید جنگ کے باوجود قلعہ فتح نہیں ہو سکا۔ مشورے کے بعد آپ نے محاصرہ ختم کر کے مدینہ آ گئے۔ کچھ دن کے بعد بنو ثقیف کا ایک نمائندہ وفد آپ کی خدمت میں مدینہ آیا اور اس نے کہا کہ ہماری قوم اسلام قبول کرنا چاہتی ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے زکوٰۃ اور جہاد سے اپنے کو مستثنیٰ کرنے کی بات کہی۔ زکوٰۃ سال بھر کے بعد مال داروں پر واجب ہوتی ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے ہر شخص پر واجب نہیں ہے اور جس پر واجب ہو تو صرف ضرورت کے وقت ہوتا ہے، ہر وقت نہیں۔ اس لیے وسیع ترین مفاد میں انھیں ان دو امور کے لیے مجبور نہیں کیا گیا اور اس طرح امن و امان کی فضا کی بحالی و برقراری کو فوقیت دی گئی کیوں کہ یہ معلوم تھا کہ اس وقت اپنی نفسیات کی تسکین اور اس بھرم کو رکھنے کے لیے کہ ہم نے بھی اپنی بات منوائی ...

جب اسلام قبول کرلیں گے تو وہ زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ خود حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ:

"جب وہ ایمان لے آئیں گے تو زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔"

(سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ، باب ما جاء فی خبر الطائف)۔

حالات نے بتایا کہ آپؐ کا اندازہ بالکل صحیح تھا، وہ اسلام پر اتنی مضبوطی سے قائم ہوئے کہ حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں جب پورا عرب مرتد و باغی ہوگیا تھا یا وہ زکوٰۃ کی ادائیگی نہ کرنے کا عہد کرکے مرکز کی نافرمانی پر اتر آیا تھا تو یہ مکہ اور مدینہ کے علاوہ طائف کے لوگ ہی تھے جو مرکز مدینہ کے مطیع و فرماں بردار رہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے رہے اور سب کے ساتھ مل کر فریضۂ جہاد بھی ادا کرتے رہے۔

اس طرح اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہمیں نہ تو بات کا بتنگڑ بنانا چاہیے نہ کسی معاملہ کو اپنے جھوٹے وقار کا مسئلہ بنانا چاہیے اور نہ ہی اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو کر سمجھ میں آنے والی بات کو رد کرنا چاہیے۔

اصل مقصد سے انحراف

مسلمان اس بات کے دعوے دار ہیں کہ وہ اس پیغام کے امین ہیں جو تمام بنی نوع انسان کے لیے ان کے خالق، مالک اور حاکم اللہ نے اپنے آخری رسول حضرت محمدؐ کے ذریعے بھیجا ہے، یہ مصیبت زدہ اور بے چین انسانیت کی دکھ بھری آواز کا خدائی جواب ہے یہ مظلوموں کا سہارا ہے، ظالموں کے لیے چیلنج ہے۔ برائیوں اور خرابیوں کے لیے موت کا پیغام ہے۔ اچھائیوں اور نیکیوں کے لیے فصلِ بہار ہے، روٹھے ہوئے انسانوں کو ان کی پیدا کرنے والی ہستی سے ملانے کی کوشش ہے، کائنات کو بنی نوع انسان کے تابع کرکے اسے ایک اعلیٰ اور بلند تر مقام پر فائز کرنے کا الٰہی منصوبہ ہے۔ انسانوں کے مابین کھینچی گئی نفرت و انتقام، تعصب، خوں ریزی، ظلم و ستم پر مبنی حد بندیوں کو ختم کرنے کی زریں تدبیر ہے۔ اسلام کو اپنی زندگی میں قبول کرنے والے اسی الٰہی مشن کے امین ہیں۔ یہ امانت خاتم النبیینؐ رحمۃ للعالمین آخری حج میں ایک لاکھ مسلمانوں کی موجودگی میں ان کے سپرد کر چکے ہیں اور ان سے یہ وعدہ لے چکے ہیں کہ وہ اس امانت کا خود حق ادا کرتے ہوئے اسے دوسرے اللہ کے بندوں تک پہنچائیں گے اور اس پر آپؐ نے اپنے اللہ کو گواہ بنایا تھا لیکن افسوس صد افسوس ہم نہ صرف اس امانتِ الٰہی سے غافل ہو چکے ہیں بلکہ اس امانت کو اپنی زندگیوں سے کھرچ کر پھینک چکے ہیں۔ ہم نام کے مسلمان ہیں۔ ہمارے افعال و اعمال چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ ہم اسلام کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ ہمارے درمیان سے ایمانداری اور بے ایمانی، غلط و صحیح، ظلم و ستم، حق و انصاف، برائی و اچھائی اور حلال و حرام کا فرق و امتیاز مٹ چکا ہے غرض دنیا کی وہ کون سی برائی ہے جو ہم میں نہیں پائی جاتی ہے۔ انسانیت کے ایک قیمتی عنصر کی حیثیت رکھنے والے اب دنیا کی انتہائی بے مصرف شئے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

مساجد توحید کی علم بردار اللہ کا گھر ہیں لیکن توحید اور اس کے اثرات سے ہماری زندگیاں خالی ہیں۔ ہم ایک اللہ کا نام ضرور لیتے ہیں لیکن ہماری دعائیں، ہماری صدائیں، ہماری منتیں، ہماری آرزوئیں و تمنائیں، ہماری فریادیں اور ہمارے سجدے سب دوسروں کے نام وقف ہو چکے ہیں

کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس برصغیر میں ہماری شناخت مسجد سے زیادہ قبروں کے سجادہ نشیں و نگہباں، عرسوں کے شیدائی قوالی اور گانوں کے رسیا، تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے کے ماہر اور مذہب کے نام پر لایعنی رسوم و روایات پر کاربند کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ غرض مساجد کی اہمیت اور ان کی معنویت ہماری زندگیوں سے خارج ہو چکی ہے۔ اب مسجدیں ناجائز زمینوں پر بھی تعمیر ہونے لگی ہیں۔ ان میں حرام کا پیسہ بھی لگایا جاتا ہے اور وہ ہماری لایعنی سیاست اور اکھاڑ پچھاڑ کا مرکز بن چکی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اینٹ پتھر سے نہیں بلکہ ہمارے اندر تقویٰ اور زندگیوں میں اس کی کارفرمائی سے دلچسپی ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ کو ہمارے وجود اور ہماری عبادت گاہوں کی ذرہ برابر پرواہ نہیں ہے۔ وہ اپنے پیغام کی ترسیل کے سلسلے میں ہمارا محتاج نہیں ہے۔ وہ ہمارے علاوہ دوسروں کے ذریعے اسلام کی خدمت لے سکتا ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ
يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ
قَدِيْرًا (النساء ۴: ۱۳۳)

[اے لوگو! اگر وہ چاہے تو تمہیں ہٹا کر دوسروں کو لے آئے اور اللہ اس پر پورے طور سے قادر ہے]

اشتعال کے بجائے اعراض اور صبر و استقامت

ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال میں ایسے لوگوں کا غلبہ ہو گیا ہے جو مسلمانوں کے خلاف نفرت و تعصب کو ایک فلسفہ کی صورت میں پیش کرتے رہے ہیں۔ مندر و مسجد کے اس قضیے نے اس فلسفے میں جان پیدا کر دی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف اس وقت چاروں طرف بارود بچھی ہوئی ہے۔ ایک مخصوص گروہ کی طرف سے اشتعال انگیزی کی کوششیں مسلسل جاری رہیں گی۔ ان کی طرف سے پوری کوشش ہوگی کہ مسلمانوں سے جذبات میں کوئی حرکت سرزد ہو یا وہ کسی ردِ عمل کا مظاہرہ کریں اور پھر اس بہانے وہ اس بارود میں چنگاری لگا دیں۔

ایسے موقع پر پوری کوشش اس بات کی کی جانی چاہیے کہ اس صورتِ حال سے مکمل طور سے اعراض کیا جائے، اشتعال انگیزی کے مقابلے میں خاموش رہا جائے، صبر کیا جائے، انھیں معاف کر دیا جائے اور اس جیسی صورتِ حال میں اسلامی اصولوں کی سختی سے پابندی کی جائے۔ آں حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ میں اس سے بھی زیادہ خراب حالات کا سامنا تھا۔ ان کے ساتھ انتہائی بدترین غیر انسانی سلوک روا رکھا جا رہا تھا۔ وہاں کوئی مسجد نہ تھی، خانہ کعبہ جو سب سے قدیم مسجد تھی، اس میں تو کیا گھروں میں بھی نماز پڑھنا مشکل تھا۔ ایسی صورت میں کوئی تصادم مول نہیں لیا گیا بلکہ کہا گیا کہ

كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔
(النساء ۴: ۷۷)

[کوئی بزور کارروائی نہ کرو بلکہ نماز قائم کرو]

لوگوں نے چھپ چھپ کر نمازیں پڑھیں لیکن آپ نے کسی ظلم و ستم کے جواب میں لوگوں سے نرم بات کی اور ان کے کام آئے۔ کیوں کہ اس قسم کی صورتِ حال کے لیے یہی حکم دیا گیا ہے

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ
هَجْرًا جَمِيْلًا (المزمل ۷۳: ۱۰)

[جو وہ کہہ رہے ہیں اس کو برداشت

کرو اور انھیں خوب صورت طریقے سے طرح
دے جاؤ]۔
فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ
بَعِيدًا وَنَرَاهُ قَرِيبًا (المعارج ۷۰: ۵،۷)
[اس صورت حال کو نہایت خوب صورتی سے
انگیز کرو۔ بلاشبہ وہ اسے (عذاب کو)
بہت دور سمجھ رہے ہیں لیکن ہم اسے نہایت
قریب دیکھ رہے ہیں]
وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ
كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۔(آل عمران ۳: ۱۲۰)
[اگر تم صبر و استقامت سے کام لوگے
اور اللہ سے ڈر کر غلط کاموں سے
بچتے ہوئے زندگی بسر کرو گے تو ان کی
چالیں اور سازشیں تمہیں کچھ بھی نقصان
نہ پہنچائیں گی]۔
وَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ
(الزخرف ۴۳: ۸۹)
[ان سے درگزر کرو اور ان سے
نرم بات کہو]
فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ
(الحجر ۱۵: ۸۵)
[ان سے نہایت خوب صورت انداز
میں درگزر کرو]۔
خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ
عَنِ الْجَاهِلِينَ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ
مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ
بِاللَّهِ (الاعراف ۷: ۱۹۹-۲۰۰)
[انھیں معاف کردو، بھلائی کا حکم کرو
جاہلوں سے چشم پوشی اور اعراض سے
کام لو۔ اگر شیطان تمہارے جذبات مشتعل
کرنا چاہے تو تم اللہ کی پناہ میں آجاؤ]

ایسا کیوں کہا گیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جہاں اس قسم کی اشتعال انگیز فضا ہو، وہاں اس کے جواب میں ویسی ہی کسی کارروائی سے اس فضا کو تقویت ملتی ہے، غلط فہمیوں کا ایک طوفان امڈ پڑتا ہے بات کا بتنگڑ اور رائی کا پربت بنایا جاتا ہے اور
اس طرح امن و سکون کی فضا کو خاکستر کرنے کی پوری ۱۳
تیاریاں ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان قرآنی ہدایات پر عمل کرکے جان و مال کے نقصان کو کم سے کم کیا جائے۔

اس کے علاوہ دوسرا علاج یہ ہے کہ آپ میں کردار کی پختگی ہو، آپ کا کردار نمونے کا کردار ہو، آپ اپنے قول میں کھرے و سچے، معاملات میں دیانت دار اپنے عہد اور وعدے کے پاسبان، لوگوں کے دکھ درد میں شریک، رشوت، جھوٹ، بے ایمانی و ناانصافی سے کوسوں دور ہوں۔ آپ بہترین رشتے دار، بہترین پڑوسی، بہترین دوست، بہترین تاجر، بہترین گاہک بہترین طالب علم، بہترین ملازم، بہترین مالک اور بہترین شہری ہوں۔ آپ مظلوموں کے حامی اور ظالم کے خلاف ہوں چاہے وہ آپ کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، آپ غریبوں، مسکینوں، یتیموں، بیواؤں، مجبوروں، بے کسوں اور مسافروں کے کام آتے ہوں۔ آپ کے یہاں عدل و انصاف اور اچھائی اور برائی کے دو پیمانے نہ ہوں کہ آپ اپنے لیے کچھ اور دوسروں کے لیے کچھ اور، اپنا سختی سے محاسبہ کرتے ہوں، اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوں، اس پر نادم ہوتے ہوں، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو آپ کے نزدیک یکساں طور سے محترم ہوں، آپ مانگنے اور مطالبہ کرنے کے بجائے دینے

والے اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت کرنے والے ہوں
انسانیت کے ہمدرد وخیر خواہ وہی خواہ ہوں لوگوں کو یہ احساس
ہو کہ آپ انسانیت کے قیمتی جوہر ہیں۔ آپ کے نہ رہنے یا
ضائع ہو جانے سے انسانیت کا قیمتی گوہر ضائع ہو جائے گا۔

مکہ میں حالات کی انتہائی سختی کی وجہ سے آں حضورؐ
نے مسلمانوں کو اجازت دی تھی کہ وہ حبشہ ہجرت کر کے
جا سکتے ہیں۔ انھیں حالات سے تنگ آکر حضرت
ابوبکرؓ بھی حبشہ کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں
انھیں مشہور سردار ابن الدغنہ ملا۔ وہ اسلام نہیں لایا
تھا۔ اس نے پوچھا:

ابوبکر! کہاں جا رہے ہو؟

حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا:

میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، میں کسی
دوسرے علاقے میں جا رہا ہوں۔ وہاں
میں اپنے رب کی عبادت کروں گا —

ابن الدغنہ نے کیا کہا غور سے سنیے۔

"ابوبکر! تم جیسی شخصیت نہ تو اس طرح نکلتی
ہے اور نہ نکالی جاتی ہے، تم تو غریبوں و
مفلسوں کے کام آتے ہو، رشتوں کی
پاسداری کرتے ہو۔ بے سہاروں کا سہارا
بنتے ہو، مہمانوں کی خاطرداری کرتے ہو اور
برے وقت میں لوگوں کے کام آتے
ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ واپس
چلو اور اپنے علاقے ہی میں اپنے رب کی
عبادت کرو۔"

ابن الدغنہ آپ کو لے کر مکہ واپس آیا اور رات میں
سرداران قریش میں سے ایک ایک کے پاس جا کر حضرت
ابوبکرؓ کے مذکورہ اوصاف بیان کیے اور کہا کہ تم ایسی
خوبیوں والے شخص کو بستی سے نکال رہے ہو۔ (صحیح البخاری
باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ المنورہ)

دیکھیے عبادت نے ان کے اندر کیسے انسانی اور اخلاقی اوصاف
پیدا کر دیے تھے۔ ہمارے مخالفوں یا دوسرے مذاہب
کے لوگوں کو اس سے کیا دلچسپی کہ ہم کتنی نمازیں پڑھ
رہے ہیں، یا کتنے روزے رکھ رہے ہیں۔ ان کے
نزدیک یہی وہ عالم گیر پیمانے ہیں جس سے وہ کسی بھی شخص
کے بارے میں اچھی یا بری رائے قائم کر سکتے ہیں حقیقت
یہ ہے کہ ہماری عبادات کے اثرات ہماری زندگیوں سے
سے ختم ہو گئے ہیں پورے طور سے کوشش کرنی چاہیے
کہ ہم میں کردار کی بلندی پیدا ہو اور ہم اخلاقِ حسنہ پر
عامل ہوں۔

اپنا جائزہ لیجیے اور محاسبہ کیجیے کہ ٦ر دسمبر کے
بعد آپ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئیں۔ آپ نے بھی تو
کہیں ویسا ہی نہیں کیا جیسا کہ اوروں نے مسجد کے ساتھ
کیا۔ آپ نے تو ان بے قصوروں کے خون سے ہاتھ نہیں رنگا
آپ نے تو لوٹ مار نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ جذبات و
اشتعال میں بہت سی غلطیاں ہوئیں۔ احکاماتِ الٰہی
سے تجاوز کیا گیا۔ مندروں کو نقصان پہنچایا گیا، ان کی
بے حرمتی کی گئی۔ معصوم و بے قصور ادھر بھی زد میں آئے
جان و مال کا اتلاف ادھر بھی کیا گیا۔ آپ اس کی
تاویل کریں گے۔ میرے بھائی تاویل مت کیجیے۔ آپ کے
پاس مشعلِ ہدایت ہے۔ آپ دوسروں کے لیے نمونہ ہو سکتے
تھے۔ آپ کو تو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ اچھے برے ہر قسم کے حالات
میں اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھیں گے اور احکامات
الٰہی کی پابندی کریں گے۔ کیوں کہ آپ کو خدا کے یہاں
جواب دہ ہونا ہے۔ ان حرکات کا نتیجہ کیا نکلا۔ آپ نے
دیکھ لیا، آپ کو کوئی سو گنا اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ خیر جو
ہوا اس کا جائزہ لیجیے، غلطیوں کا اعتراف کیجیے۔ غلط
افراد پر نظر رکھیے۔ ان کو اپنی سوسائٹی سے علاحدہ کیجیے

نقصانات کی تلافی کی کوشش کیجیے۔ لوگوں سے اچھا سلوک کیجیے اور آئندہ سے عہد کیجیے کہ اب یہ غلطیاں نہیں ہوں گی۔

مذہبی معاملات میں جذبات و سیاست کا عمل دخل

ایک عام آدمی یہ سوال کرسکتا ہے اور وہ اس میں حق بجانب ہوگا کہ بھائی یہ سب باتیں آپ ہی بتا رہے ہیں، ہمیں تو لوگوں نے اور ہی کچھ بتایا ہے کہ اسلام اور مسلمان دونوں خطرے میں ہیں اور ہم تمہارے نجات دہندہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں نے بابری مسجد کے قضیہ کو خراب کیا جن کا نہ دین سے تعلق تھا اور نہ مسجد و نماز سے اور نہ ہی وہ دین کا علم رکھتے تھے۔ انھیں اپنی سیاسی دکان چمکانی مطلوب تھی۔ اخبارات کی سرخیوں میں آنا تھا، لیڈروں کی صف میں اپنا نام لکھوانا تھا اور اسلام اور مسلمانوں کو خطرے میں دکھا کر عرب امداد حاصل کرنی تھی اور انسانی خون کے دریا میں اپنی سیاسی کشتی چلا کر پارلیمنٹ اور اسمبلیوں تک پہنچنا تھا یا حکومت سے اپنے ذاتی مطالبات پورے کروانے تھے سو انھوں نے یہ سب حاصل کرلیا یہ وہ حضرات تھے کہ انھوں نے علمائے کرام سے ذرا بھی مشورہ نہ کیا۔ علمائے کرام نے ان سے جو بات کہی اس کو ماننے سے انکار کردیا اور کہا کہ یہ لوگ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ ان کی ہمتیں پست ہوگئی ہیں۔ یہ بزدل ہیں۔ مسائل اب ہم اپنے زور بازو سے حل کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزمائش اور کشمکش کے موقع پر یہ لوگ دور ہی رہے اور عوام کو آگے لے جاکر ان کی گردنیں کٹواتے رہے۔

ایسے حالات میں جب کہ چاروں طرف سے آہیں چیخیں اور سسکیاں آرہی ہوں، انسانی خون پانی سے زیادہ بے وقعت ہوچکا ہو، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو نہ بخشا جارہا ہو، انسانی اقدار پامال ہورہی ہوں چاروں طرف دیوانگی کا دور دورہ ہو۔ ایسے ماحول میں اس سال جنوری میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ دہلی میں منعقد ہوئی ہے، دوسری انجمنوں اور کمیٹیوں کے مقابلے میں اس کا حال نسبتاً بہتر تھا کہ اس میں ایسے علماء بھی ہیں جو تاریخ انسانی سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں قوموں کے عروج و زوال سے باخبر ہیں، قرآن و حدیث پر گہری نظر ہے۔ ان کی آواز انسانیت کے نام ایک پیام کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اسلام کو قومی نسلی جغرافیائی یا لسانی دائرے میں قید نہیں رکھا ہے، ان کا ارادہ تھا کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں گے، قرآن و حدیث کے مطابق ایسی تدبیر سامنے آئے گی جو انسانیت کے رستے ناسوروں کا فی الفور مداوا ثابت ہوسکے گی، لیکن برا ہو جذباتیت، سطحیت اور لیڈری کے خمار کا کہ مجلس عاملہ کے ایک ممبر نے خصوصی مندوبین کے نام سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بلا لی جو دو دن بعد آل انڈیا ملّی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی آئی تھی۔ مذکورہ ممبر نے مائک اپنے قبضے میں رکھا صدرِ محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی کو بولنے کا ذرا بھی موقع نہ دیا۔ خصوصی مندوبین کے نام سے مدعو کیے گئے حامیوں کے ذریعے جذباتی ماحول پیدا کرکے اپنی مرضی سے فیصلے کروالے اور مسجد و مندر کے قضیے کو حل کرنے کے لیے ایک ایسی کمیٹی تشکیل کروائی جس میں اکثر وہ چہرے ہیں جن کی جذباتیت اور بے تدبیری ہی سے اس مسئلے نے انتہائی بھیانک روپ اختیار کیا ہے۔ اللہ رحم فرمائے ہمارے ان خود ساختہ لیڈروں پر جو اپنی لیڈری برقرار رکھنے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کو خطرے میں دکھا کر عرب امداد حاصل کرنے کے لیے سب کچھ داؤں پر لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

میں نے اس مضمون میں قرآن، حدیث، اسوۂ رسول اور تاریخ سے مثالیں دی ہیں اور آپ

باقی صفحہ نمبر ۴۴ پر ملاحظہ فرمایے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲، شمارہ ۸ (اگست ۹۳ء)

دریاباد کے اطبّا اور حکیم آفاق مرزا

سعید الظفر چغتائی *

طب یونانی، جو جدید علم معالجہ کی ماں ہے اور قدیم ویدک طریقِ علاج کی بیٹی یا بہن، کم از کم ہندوستان کے مسلم معاشرے میں ایک سماجی روایت بن گئی تھی۔ اچھا طبیب اپنے فن کے علاوہ لیکن اُس کے واسطے سے فارسی عربی، فلسفہ، منطق اور نجوم سے واقف ہوتا تھا۔ کیونکہ مرض کی تشخیص اور دواؤں کی تجویز کے لیے اُسے مریض کی طبیعت اور موسمی حالات وغیرہ بہت سی باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا تھا۔ اسی رعایت سے، پہلے احترام کی نظر سے اور پھر بے تکلفانہ عوامی استعمال میں، اسے "حکیم" کہتے تھے۔ "حکیم جی" کے مطب کی سماجی اہمیت تھی۔ وہ صبح سے رات گئے تک عوام و خواص کے لیے کھلے رہتے وہاں اوسط درجے کے تعلیم یافتہ اور دنیا دیکھے اپنی فرصت کا وقت تبادلۂ خیالات میں گزارتے اور یہ سرچشمۂ فیض کئی حیثیتوں سے مسلسل اُبلا اور بہا کرتا۔

میں نے ہوش سنبھالا تو دریاباد میں حکمت یعنی طبابت کا بول بالا تھا۔ خود محلہ مغلان کے حکیم آبن اور تصدق حسین اُٹھ چکے تھے، مگر نام ابھی زندہ تھا۔ دھاک تھی حکیم عبد الحسیب کی جو گھسیاری منڈی لکھنؤ میں مطب کرتے تھے اور آٹھویں دسویں دریاباد آتے تو تانگہ کتابوں سے بھرا ہوتا۔ اپنے صاحب زادے امین صاحب کو جرمنی بھیج کر ڈپلوما دلوا چکے تھے جس کے باعث وہ "حکیم ڈاکٹر امین" کہلاتے تھے۔ چودھری صاحبان میں سراج الدین عرف مجّے بارہ بنکی میں مطب کرتے تھے وہیں مسلم لیگ کی سیاست میں داخل ہوئے اور آزادی کے بعد ہی پاکستان چلے گئے۔ کبھی دریاباد آتے اور مریض بھی دیکھ لیتے۔ مولانا عبد الماجد کے بڑے بھتیجے اور داماد حکیم عبد القوی عرف آخلب میاں پابندی سے ہر جمعے کو آتے اور مولانا کے انتقال کے بعد برسوں تک مفت نسخے لکھے جاتے رہے۔ صرف ادھر چند برس سے صحت کی خرابی نے ان کا یہ معمول چھڑا دیا تھا، لیکن لکھنؤ میں کچہری روڈ پر (جو اب ڈاکٹر بی۔ این ورما روڈ ہو گئی ہے) مطب آخری دم تک کھولتے رہے۔

ان حضرات کے علاوہ دریاباد میں مقامی اسپتال کے سرکاری ڈاکٹر تھے اور تین مستقل طبیب: محلہ پیرزادگان میں حکیم عبد الحمید، محرران میں حکیم رفیع الزماں

---

* چیرمین شعبۂ فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اور منطق میں حکیم آفاق مرزا۔ ان تینوں میں یہ سطریں لکھتے وقت صرف حمید میاں زندہ ہیں جن کے چھوٹے بھائی عبدالمجیب انتقال سے چند برس پہلے ہی علالت کے سبب سے "چوراہے" کی اپنی مشہور دکان بند کر دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

حکیم رفیع الزماں "طب و جراحت" ہی کے نہیں، عربی ادب کے بھی فاضل تھے۔ انھوں نے بھوپال اور مالوہ کے کئی عالموں سے پڑھا تھا لیکن دریاباد واپس آکر سن ١٩٣٠ء یا ١٩٣٢ء سے دن رات طبابت ہی کے ہو رہے تھے۔ گاہے ماہے مولانا کی قبل مغرب نشست میں جا بیٹھتے یا کسی اخبار یا رسالے کی ورق گردانی کر لیتے۔ اس کے سوا کوئی علمی مشغلہ نہ تھا، مگر کوئی باذوق آجاتا تو آخر عمر تک حماسہ، متنبی، سبعہ معلقات یا ابن ربیعہ کے دس بیس شعر برجستہ سنا دیتے۔ ایک دو بار عربی کی "تعلیم بالغان" کا بھی حق ادا کیا۔ ورنہ صبح ہوتی، سہ پہر یا رات، وہ تھے اور مطب۔ رات کے تین بجے بھی کوئی آنتہ پر آکر آواز دیتا تو حکیم صاحب دس منٹ میں تیار ہو، ضروری دوائیں ساتھ لے کے سوار ہو جاتے اور میلوں دور کسی گاؤں میں تڑپتے مریض کو دیکھ آتے۔ آخر میں چہرے اور حلق کے کینسر میں مبتلا ہو کر لگ بھگ ٨٥ سال کے سن میں وفات پائی۔

حکیم آفاق مرزا (١٩١٠ء ـــ ١٩٩٠ء) کی دھج سب سے نرالی تھی۔ خان بہادر میرزا یوسف بیگ کے تیسرے صاحب زادے، سردار میرزا کے چھوٹے بھائی علاء الدین احمد خاں علائی شاگردِ غالب اور والیٔ لوہارو کے نواسے غضنفر الدولہ نواب مینڈو خاں کی پوتی کے پوتے تھے۔ فرنگی محل لکھنؤ میں مفتی سلامت اللہ، مفتی محمد شفیع اور حیات اللہ انصاری وغیرہ سے پڑھا اور مولوی کی سند لی۔ ساتھ ہی ساتھ طب کے اسباق میں بھی داخل ہو گئے اور کبھی کبھی استادوں کی غیر موجودگی میں اپنی زربفت کی اچکن ٹوپی کا جلوہ دکھا آتے تھے۔ ایک دن درجے میں موجود تھے کہ حکیم شمس الدین آپہنچے اور ان سے انھوں نے ایک دو سوال پوچھ ڈالے۔ ایک لفظ نہ بتا سکنے کی خفت پر استاد کی مشفقانہ تنبیہ مستزاد ہوئی۔ بات دل کو لگ گئی اور جب سے اتنا جی لگایا کہ کئی مضامین میں امتیاز سے پاس ہوئے اور سونے کے تمغے پائے۔ فارغ التحصیل ہوئے تو ١٩٣٣ء ہو گا۔

حکیم آفاق مرزا اس مزاج کے تھے کہ جائیداد سے اپنی کفالت کریں اور اپنے فنِ طب سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچائیں لیکن وسایل نہیں رہ گئے تھے باقاعدہ مطب قایم کرنے کی کوشش کئی بار کی، نوجوانی میں بھی اور عمر پختہ پر بھی۔ مفردات کے دلدادہ تھے۔ زیادہ تر نسخے انھی پر مبنی لکھتے۔ اپنے دکان دار کو خاص ہدایتوں کے ساتھ لکھنؤ بھیج کے مفرد دوائیں منگواتے اور انھی کے ایک حصے سے اپنے مرکبات تیار کراتے۔ علاج میں دواؤں سے زیادہ تدبیریں کرتے۔ مالش، سینک، احتیاطیں خوب بتاتے۔ بھیڑ جمع نہ کرتے اور چاہتے کہ عام مریض کسی اور کو دکھائیں لیکن جو اصرار کرتا اور حکیم صاحب اس کی عقیدت کے قایل ہو جاتے اس بیمار پر اپنے عزیزوں کی سی توجہ دیتے۔ گھنٹوں مریض کے بستر سے لگے بیٹھے رہتے اور جب تک حالت قابلِ اطمینان نہ ہو جاتی، گھر واپس نہ آتے۔ ڈاکٹر صاحبان کہتے ہیں، حکیم لوگ ٹائی فائڈ کا علاج کیا جانیں لیکن آفاق مرزا میعادی بخار کی تشخیص جتنی جلد اور شرطیہ کر لیتے اور اس کا جتنا اچھا علاج کرتے، اس کی مثال میرے علم میں نہیں۔ وہ اعضا کی تشریح اور افعال

کے عالم تھے۔ میعادی مریض کو بالکل ہلکی غذا دیتے تاکہ آنتوں پر بوجھ نہ پڑے اور اس حالت میں کوئی دست آور دوا نہ دینی پڑے جو مرض زدہ آنتوں میں چھالے ڈال سکتی ہو یا سوراخ کر سکتی ہو اور جان کے لالے پڑ سکتے ہوں۔ میں نے ان کے کئی مریضوں کو شل یا مفلوج ہاتھ پاؤں اور منہ اور گلے پر ٹٹنس جیسے اثر کو خشک یا دوا ملے گرم پانی کی مسلسل سینک اور دوا ملے تیلوں کی مالش سے اچھا ہوتے دیکھا۔

آفاق مرزا کا مطب زیادہ دن نہ چل سکا۔ ایک توان کا خاصے کا مزاج، خالص اور تازہ دواؤں پر زور اور پھر طبیعت کا علاج سے زیادہ تعلیم کی طرف رجحان.... مریض الف بے سے بھی واقف ہوتا تو اسے بتلاتے کہ اُس کا مرض کیا ہے۔ اُسے انھوں نے کن علامتوں سے پہچانا۔ ایسے موقع پر تشخیص میں اناڑی کیا کیا غلطیاں کر بیٹھتا ہے۔ جالینوس، ابن سینا اور رازی نے اس بارے میں کچھ لکھا ہے یا نہیں۔ وہ دوائیں کیا دے رہے ہیں اور کیوں۔ ان کے ہم عصر حریف کیا بتاتے اور کیا دوا دیتے وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ غریب اپنی جان سے بیزار ہو جاتا اور جب تک ایسی ہی کڑی نہ آپڑتی، حکیم صاحب کے در دولت کی دہلیز دوبارہ نہ نانگتا۔

خوش لباس تھے اچھی لیکن تھوڑی غذا پسند کرتے۔ زندگی اور معاملات میں سلیقے، ترتیب اور خوش اسلوبی کے قایل تھے۔ بھونڈا پن کہیں نظر آتا تو مشکل سے برداشت کرپاتے۔ انھیں دیکھ کر بعض نوجوان بے ساختہ کہہ اٹھتے، ایسے نستعلیق بزرگ کم دیکھنے میں آئے۔ انھیں اپنی چیزیں بہت عزیز تھیں۔ جوتے، ٹوپیاں، اچکنیں، چھڑیاں سبھی متعدد اور بانکی رکھتے تھے۔ پائیں باغ کے بیل تک کی تعریف کرتے اور چاہتے تھے کہ سننے والا کہے، اس کی بے مثالی میں کیا شک ہے۔

استادوں میں حکیم شمس الدین کے گرویدہ تھے کہ وہ نسخہ بہت مختصر لیکن تیر بہ ہدف لکھتے تھے۔ چند مفردات اور کبھی تو صرف ایک ہی۔ زندگی اصولی مدتوں دن میں صرف کھچڑی کھاتے اور شام کو شوربہ پھلکا۔ کہتے کہ ان کے برعکس حکیم عبدالحلیم تھے۔ لمبا نسخہ لکھاتے۔ شاگرد لکھ رہے ہیں اور حکیم صاحب کی زبان پر تلازمہ بندھا ہے

برگِ نیلوفر، برگِ یاسمن، برگِ حنا، برگِ کاسنی۔

پھولوں پر آئے تو

گل بنفشہ، گل لاجورد، گل نسترن

جڑ تک پہنچے تو

بیج کاسنی، بیج بادیان، بیج کرفس، بیج کبیر۔

اپنی عربیت سے بھی مکرا مکرا کے مریض کو مرعوب کرتے۔ حکیم امین سے آفاق مرزا کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ انھی نے آزادیٔ ہند کے بعد یو۔پی سرکار کے طبیہ کالج لکھنؤ میں لکچرر مقرر کرایا تھا اور جب تک یہ

> "کیا ہماری قوم میں جن کے اسلاف کے ناموں کی شہرت دنیا کے ہر ایک حصے میں گونج رہی تھی اور جن کے سیف و قلم کی نام آوری کے نشان شہروں میں اور دنیا کے ایک بڑے حصے میں اب تک پائے جاتے ہیں اتنی عزت اور ہمت بھی باقی نہیں رہی ہے کہ اپنی قوم کی تباہ حالت کی درستی پر توجہ کریں۔"
>
> سر سید احمد

ادارہ قائم رہا، حکیم آفاق بڑی خوش اسلوبی سے تعلیمی فرائض انجام دیتے رہے کہ پیشے سے بڑھ کر طب پڑھانے کا انھیں شوق تھا۔ ان کے شاگردوں میں ردولی کے حکیم حسن اچھو نے بڑا نام پیدا کیا۔ اسی زمانے میں "ہمدردِ صحت" کے لیے مضامین لکھے اور یہ سلسلہ دریاباد واپسی کے بعد بھی بہت دن تک جاری رہا۔

حکیم صاحب اپنی طالب علمی کے زمانے میں بیدم شاہ وارثی اور مجذوب صاحبان کا شعر پڑھنا یاد کرتے تھے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا، اب تو خلوت ہو گئی

جس پر زائرِ حرم حمید صدیقی نے دوسرا مصرع
"آج مستحکم محبت ہو گئی"
لگایا۔ انھیں شعر اسی زمانے سے اسی ماحول کے حوالے سے یاد تھا۔ جب شاعر دوسرا مصرع پڑھتے ہی کھو جاتا اور دیر تک حواس میں نہ آتا۔ حمید صدیقی ان کے ہم سبق بھی رہے تھے۔ ان کے اور ان کی شاعری کے بہت قایل تھے "گل بانگِ حرم" اکثر اپنے مخصوص ترنم میں پڑھا اور سنایا کرتے۔

انگریزی فلموں اور ہلکے پھلکے افسانوی یا معلوماتی ادب کے شوقین تھے۔ غالب کے خطوط اتنی بار پڑھے تھے کہ خود بھی ایک خاص رنگ کے خط لکھنے لگے تھے۔ دو بار پیٹھ پہ خطرناک پھوڑے نکل چکے تھے آخر عمر میں جگر اور گردے متاثر ہو گئے۔ خون کی کمی ہوتی گئی۔ چہرے اور پیروں پہ ورم رہنے لگا اور انھی پیچیدگیوں نے مرض الموت کی شکل اختیار کی جولائی ۱۹۹۰ء کو میڈیکل کالج لکھنؤ میں وفات پائی اور دریاباد کے آبائی قبرستان میں اپنے دادا حافظ اصغر بیگ کی بنوائی مسجد کے مینار تلے دفن ہوئے۔

"انسان کو ناپنے کے لیے مختلف پیمانے مختلف زمانوں میں وضع ہوئے ہیں۔ ابتدا میں تو وہی انسان بڑا مانا جاتا تھا جس کے بازوؤں میں طاقت اور جس کے دل میں حوصلہ ہوتا تھا۔ تہذیب آگے بڑھی تو ذہن نے جسم پر اپنی بالادستی منوانی شروع کر دی۔ اب وہی آدمی ناپنے پر زیادہ نکلتا تھا جو عقل کو کام میں لے کر سماج میں طاقت اور اثر حاصل کر لیتا تھا۔ علم کو اور فروغ ہوا تو وہ زمانہ بھی آگیا جب علم اختیار کا پیش خیمہ بن گیا اور جہاں یہ دونوں الگ الگ بھی رہے وہاں علم کو اختیار اور اقتدار کے مساوی درجہ دیا گیا۔ ان ایام میں عالموں اور استادوں، مصنفوں اور شاعروں کی بڑی قدر ہوئی۔"

سید حامد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۸ (اگست ۹۳ء)

ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسایل

سلطان احمد اصلاحی ★

۴- اسٹاف کے مسایل کا مناسب حل

ہندوستان میں مدارس عربیہ کے انتظامی مسایل کے حل میں اسی سے ملتی جلتی دوسری بات یہ کہ مدارس کے اسٹاف خاص طور پر حضرات اساتذہ کے مسایل کی طرف فوری توجہ دی جاے۔ اس وقت بالعموم یہ عجیب و غریب صورت دیکھنے میں آتی ہے کہ تقریباً بلا استثنا مدارس کی عمارتیں عصری کلیات و جامعات کو شرماتی نظر آتی ہیں لیکن برعکس ان کے یہاں حضرات اساتذہ کے مشاہرے انتہائی قلیل اور ناقابل لحاظ ہیں۔ ملکی قوانین سے تو اس صورتِ حال کا صحیح ٹکراو ہے ہی کہ اس سے کم سے کم قانونِ اجرت (Minimum Wages Act) کی صریح خلاف ورزی تو ہوتی ہی ہے، دین و دیانت اور حق و انصاف کا تقاضا بھی اسے مشکل ہی سے قرار دیا جا سکتا ہے۔ مدرسے کے معاونین اور چندہ دہندگان کی طرف سے غالباً ایسی کبھی کوئی شرط سامنے نہیں آئی کہ ان کی دی ہوئی رقم سے صرف لق و دق عمارتیں بنوائی جائیں اور اسٹاف کے مسایل کو پوری بے دردی کے ساتھ نظر انداز کیا جاے۔ استاذ کا پیٹ بھرا اور ذہن مطمئن ہو تو سادہ اور معمولی عمارت میں بھی اس کی کارکردگی قابلِ رشک اور اطمینان بخش ہوگی۔ پیٹ خالی اور ذہن پریشان ہو تو تاج محل کے نقش و نگار بھی اس سے یکسوئی اور لگن سے کام لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کا دینی نقص اپنی جگہ کہ اگر لمبی اور شاندار عمارتیں علاماتِ قیامت سے ہیں تو ذاتی دائرے ہی میں انھیں محدود کیوں کیا جاے۔ دینی اداروں اور مدارس دینیہ میں تو اسے اس سے بڑھ کر اس کی علامت باور کیا جانا چاہیے۔ ضرورت ہے کہ مدارسِ عربیہ میں تعمیرات کے بجٹ کو غیر معمولی طور پر ہلکا کرتے ہوے سادہ اور معمولی عمارتوں سے کام چلا کر جس سے کہ عام طور پر اس کے اسٹاف اور اساتذہ کی اپنے آبائی گھروں سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے، فوری طور پر ان کے مشاہروں کے اسکیل میں قابلِ لحاظ اضافہ کیا جاے۔ انتظامیہ کے سالانہ تبرعات کے بجاے گریڈ سسٹم نافذ کیا جاے جس سے ایک ترتیب سے اپنے آپ مشاہروں میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس کے ساتھ ہی لازمی طور پر تمام اسٹاف کے لیے لازمی پی۔ ایف (P. F.) اور رہائش اور سفر کے

★ ادارۂ تحقیقات اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور- علی گڑھ۔

ناؤنس کا اضافہ کیا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی عید اور بقرعید میں حسب سہولت ترجیحی طور پر ایک پوری اور نصف مشاہرے کی اضافی امداد ملنی چاہیے۔ رہائش کے سلسلے میں اصل کوشش تو یہ ہو کہ رہائشی کوارٹرس مدرسے کی طرف سے فراہم کیے جائیں۔ بصورت دیگر اس کا الاؤنس مختلف مقامات کے لحاظ سے اس طرح تجویز کیا جائے کہ اسی الاؤنس سے گزر اوقات کے لیے کام چلاؤ مکان کا انتظام ہو جائے اور مشاہرے کے کسی قابل لحاظ حصے کو اس میں شامل کرنے کی نوبت نہ آئے۔ سفر الاؤنس مع فیملی پسندیدہ تو یہ ہے کہ پورا ہر سال ملے۔ دوسری صورت میں وسایل کی رعایت سے اس میں تخفیف کرتے ہوئے اس کے وقفے اور اضافی شرائط میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔ حالات کے لحاظ سے اساتذہ واسٹاف کے لیے مکان کے لیے قرضے اور دیگر فلاحی اسکیموں کی بابت بھی سوچا جانا چاہیے۔

۵۔ وصولی چندہ سے اساتذہ وطلبا کا عدم تعلق۔

مدارس عربیہ کی مالیات ہی کا دوسرا مسئلہ اساتذہ وطلبا کو تحصیل چندہ سے غیر متعلق اور دور رکھنے کا ہے جب کہ اس وقت صورت یہ ہے کہ رمضان شریف کے موسمی چندے میں حضرات اساتذہ واسٹاف مدارس عربیہ کے سرگرم حصے کے ساتھ مدارس کی وقتی اور ہنگامی ضرورتوں میں طلبا کی چندہ مہم کے علاوہ اس موسمی مہینے میں بھی ان کی خدمات کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ حضرات اساتذہ واسٹاف کے دائرۂ جہد و عمل میں اپنے حوصلے اور ہمت کے لحاظ سے ہند کے ساتھ بیرون ہند بھی اس طرح شامل ہے۔ چندے کی اس مہم میں کمیشن کے مسئلے سے ہٹ کر جو بعض صورتوں میں وصول کنندہ کے حق میں ۵۰ فی صد تک چلا جاتا ہے۔ اس برائی سے محفوظ مدارس میں بھی یہ مسئلہ مختلف پہلوؤں سے فوری توجہ کا طالب ہے۔ سرفہرست معاملہ فن میں مہارت اور تدریس کے لیے یک سوئی اور ارتکاز کا ہے۔ علمی ذوق کے حامل اساتذہ بھی اپنی ضرورت یا ادارے کی مصلحت سے اس کام میں لگیں گے تو اس پہلو سے ان کا متاثر ہونا یقینی ہے۔ سنجیدہ علمی ادارے کا یہ سب سے بڑا ممکنہ خسارہ ہے۔ عام طور پر اس فن میں مہارت ایسے حضرات اساتذہ ہی کو ہو سکتی ہے جن کا علمی ذوق ثانوی یا حالات کے نتیجے میں ثانوی بن چکا ہوتا ہے۔ اس کا بہترین حل ہے کہ ایسے حضرات کو چندے کے کام کے لیے ہی فارغ کر کے ان کے پسند کے میدان میں ہی ان کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ غیر کمیشنی مدارس میں جہاں رمضان شریف کے موسمی چندے پر دوہری تنخواہ یا یومیہ الاونس کی سہولت ہے، غالباً علمی ذوق کے حامل اساتذہ بھی اپنی عید الفطر کی ضرورت سے بسا اوقات طبیعت پر جبر کر کے اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ اس جبر سے ان کی رہائی کی بہترین صورت ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر ایک پوری اور نصف اضافی تنخواہ کا ضابطہ بنایا جائے جیسا کہ دینی تحریکات اور دینی اداروں میں اب عام طور پر اس کا رواج ہو چلا ہے۔ عید الفطر کے موقع پر اس دُہرے مشاہرے سے حضرات حفاظ مدارس کے بالمعاوضہ تراویح پڑھانے کی برائی کا بھی بڑی حد تک سدّباب ہو سکتا ہے، جس کے لیے عام پر بڑے شہروں کا قصد کیا جاتا اور تقریباً ٹھیکے کی صورت پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ ختم قرآن کے لیے ہاتھ پاؤں مارے جاتے ہیں۔

اساتذہ واسٹاف کے چندے کی دوسری بڑی خرابی انتظامی پہلو سے ہے۔ اندرون مدرسہ جن اساتذہ کو یہ ساکھ (Good will) حاصل ہو جائے کہ وہ بڑے چندے وصولنے والے اور ان کے دم قدم

سے مدرسہ قائم ہے، فطری طور پر مدرسے کی انتظامیہ ان
کے اوپر اپنا مطلوبہ کنٹرول قائم کرنے میں کامیاب نہیں
ہوسکتی بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ اکثر و بیشتر وہ تدریس اور دوسرے
معاملات میں بھی ان کی کھلی لاپرواہیوں کو نظر انداز کرنے
اور طرح دینے کی عادی ہو جائے۔ دانش مندی اور
مصلحت کا تقاضا ہے کہ حضرات اساتذہ واسٹاف
کو وصولی چندہ سے مستثنیٰ کر کے اس کا تمام تر بار ذمہ داران
مدارس اور ان کی مختلف کمیٹیوں کو اٹھانا چاہیے۔ ورنہ
سوال یہ ہے کہ جب ان مدارس کو حضرات اساتذہ کی
وصولی چندہ ہی سے چلنا ہے تو پھر بالادست انتظامیہ
اور کمیٹیوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اساتذہ واسٹاف
کو اپنے میں سے ہی مدرسے کا ناظم، نائب ناظم اور ممبران
کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جب کہ صورت یہ ہے کہ یونیورسٹی
کے پروفیسرس تو اس کی اعلیٰ اختیاراتی باڈی اکیڈمک
کونسل (A.C.) اور ایکزیکٹو کونسل (E.C.) کے پورے
با اختیار ممبر ہوسکتے ہیں لیکن کسی مدرسے کا اسٹاف
ممبر ہونا کسی شخص کی سب سے بڑی نا اہلیت-Disqu
alification کی سند ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ اس کی کسی
اختیاراتی مجلس کا ممبر نہیں ہوسکتا بلکہ اگر پہلے رہا بھی ہو
تو اسٹاف میں آجانے کے بعد اس کا اس سعادت
سے محروم ہوجانا یقینی ہے[13]۔

٦- قدیم طلبا انجمنوں کا مطلوبہ کردار

انتظامی مسایل میں آخری بات قدیم طلبا
انجمنوں کے مطلوبہ کردار کی ہے۔ بعض مدارس کے دستور
پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں انتظامیہ
کے موجودہ ڈھانچے سے بالاتر ایک انتخابی دائرے کا
واضح تصور تھا اور اسی دائرے سے ایک وقفہ کے بعد
اس کے اجلاس عمومی میں اس انتظامیہ کا انتخاب عمل میں
آتا تھا، جس کی ممبری کے لیے مدرسے سے تعلق رکھنے والے
گرد و نواح کے لوگوں کے لیے اس وقت کے لحاظ سے ایک
قابل لحاظ فیس مقرر تھی۔ موجودہ حالات میں خاص طور
پر ملک کے دیہاتی اور قصباتی پس منظر میں یہ چیز بہت
پریشان کن اور مسایل کو پیدا کرنے والی ہے۔ شہری
پس منظر میں بھی اس کی پیچیدگی نمایاں اور یہ مسایل
ہی پیدا کرنے والی چیز نظر آتی ہے۔ آج جب کہ
بڑے مدارس عربیہ اپنا ایک دور گزار چکے ہیں اور ہر
ایک کی ایک قابل لحاظ کھیپ تیار ہو چکی ہے جو مادر علمی
کے مقاصد سے بہتر طور پر آگاہ اور بجا طور پر اس سے
تعلق خاطر رکھتی ہے آج کے حالات میں انتظامیہ کے اس
مطلوبہ وسیع تر دائرے کو قدیم طلبا انجمنوں سے بطریق
احسن پورا کیا جاسکتا ہے اور اندرون اور بیرون ملک
انھیں اپنے متعلقہ مدارس کے لیے بطور بنیاد Base کے
استعمال کیا جاسکتا ہے اور علمی و انتظامی مدرسے
کے ہر دو شعبے میں ان سے بہت قابل قدر اور مفید
اور نتیجہ خیز تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے۔

قدیم طلبا انجمنوں کو اس کے لیے خود بھی ضرورت
ہے کہ وہ اپنے کو متحرک اور فعال بنائیں۔ یہ صرف ان کے
متعلقہ مدارس ہی کی نہیں خود ان کی بھی ذمہ داری ہے
کہ وہ اپنے مادر علمی کے معاملات و مسایل سے اپنے
کو بے گانہ نہ رکھیں۔ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے
ساتھ اخلاقی ہی نہیں ان کی دینی ذمہ داری محسوس ہوتی ہے
کہ وہ اپنی مادر علمی کے معاملات و مسایل سے اپنے کو متعلق
رکھیں اور اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے ان کی امداد و
اعانت میں دریغ نہ رکھیں۔ وما علینا الا البلاغ
ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی
الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔ وآخر دعوانا
ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ
الکریم وآلہ وصحبہ اجمعین الی یوم الدین

حواشی

۱ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابواسحاق الشاطبی م ۷۹۰ھ الموافقات فی اصول الشریعہ: ۱/۷۷-۸۵ مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر (بدون سنہ) مع حواشی الشیخ عبداللہ دراز۔ خلاصے کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جس سے دین و دنیا کے مصالح کے حصول کا مقصد شرعی براہ راست حاصل ہو۔ وہ صلب العلم اور جس سے یہ مقصد حاصل نہ ہو اسے 'ملح العلم' کا نام دیا جانا مناسب ہے۔

۲ الشاطبی: الاعتصام: ۳/۲۴۹، مطبعۃ المنار، مصر، طبعۂ اولی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء اس کے اصل الفاظ ہیں: وایضًا فان علوم الشریعہ منہا ما یجری مجری الوسائل بالنسبۃ الی السعادۃ الاخرویہ ومنہا ما یجری مجری المقاصد، والذی یجری مجری المقاصد اعلیٰ مما لیس کذلک بلانزاع بین العقلاء، ایضًا کعلم العربیۃ بالنسبۃ الی علم الفقہ، فانہ کالوسیلۃ، فعلم الفقہ اعلیٰ

۳ ہندوستان میں مدارس عربیہ کے قیام سے مطلوبہ مقاصد کی کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے ہمارا کتابچہ: مدارس میں سائنسی تعلیم، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ باراول، دسمبر ۱۹۹۰ء

۴ اس مسئلے کی بھی مزید تفصیل کے لیے دیکھا جائے ہمارا کتابچہ مذکورہ، محولہ بالا۔

۵ تفصیل کے لیے ہمارا دوسرا کتابچہ 'جنسی تعلیم کا مسئلہ اور اسلام'، مطبوعہ اسٹوڈنٹس اسلامک پبلی کیشنز نئی دہلی۔ باراول۔ اپریل ۱۹۸۹ء

۶ مشہور حدیث رسول اللہ علیہ وسلم 'الطہور شطر الایمان' الخ۔ صحیح مسلم جلد ۱، کتاب الطہارۃ باب فضل الوضوء، مطبوعہ عامرہ، مصر، (بدون سنہ) مع تصحیح وحواشی محمد ذہنی۔

۷ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا کتابچہ مذکور، جنسی تعلیم کا مسئلہ اور اسلام، محولہ بالا

۸ مشہور حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام 'من تشبہ بقوم فہو منہم'، ابوداؤد جلد ۲، کتاب اللباس، باب لبس الشہرہ، مطبع مجیدی، کان پور، ۱۳۴۵ھ، نیز مسند احمد: ۲/۵۰- میمنہ، مصر، ۱۳۱۳ھ۔ خیال رہے کہ مسند احمد میں یہ ایک طویل روایت کا آخری ٹکڑا ہے جس میں بعثت محمدیؐ کا مقصود و مطلوب قیامت تک کے لیے مخالفین اسلام پر بزور شمشیر وسنان اس کا غلبہ و استیلاء بتایا گیا ہے۔ بعثت بالسیف لیعنی یعبد اللہ لا شریک لہٗ وجعل رزقی تحت ظل ... وجعل الذلہ والصغار علی من خالف امری اور اس کے بعد ہے۔ ومن تشبہ بقوم فہو منہم جس سے لباس اور وضع قطع کے سلسلے میں اسلام کی بڑھتی ہوئی حمیت وغیرت مندی کا اندازہ آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے مخدوم ومحترم مولانا عبدالمجید ندوی شہیدؒ نے اپنے دوسرے دور صدارت میں مدرسۃ الاصلاح میں ٹوپی کو طلبہ کے یونیفارم کا جزء قرار دے کر حدود مدرسہ کے باہر بھی اس کی خلاف ورزی۔

کو متعلق طالب علم کی مدرسہ سے معطلی یہاں تک کہ اخراج کی انتہائی سزا کا مستوجب ٹھہرایا تھا۔ افسوس کہ ان کا یہ اصلاحی مشن دورِ طفولیت ہی میں تھا کہ مولا کے یہاں سے ان کا بلاوا آگیا اور یہ مبارک آغاز اپنے انجام کی تعبیر پانے سے قاصر رہا۔

۱۰؎ افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر۔ ابوداؤد جلد ۲۔ کتاب الملاحم۔ باب اولمر والنہی مطبع مجیدی کانپور ۱۳۴۵ھ۔ نیز ابن ماجہ، ابواب الفتن۔ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر جس کے اس باب میں دوسری روایت میں 'کلمۃ عدل' کے بجائے 'کلمۃ حق عند سلطان جائر' کے الفاظ ہیں۔

۱۱؎ سورہ نساء کی آیت کریمہ ۶ کے الفاظ: ومن کان غنیاً فلیستعفف ومن کان فقیراً فلیأکل بالمعروف، کا یہ صاف اشارہ ہے جس میں معاملے کو خالصتاً ان کے اختیار تمیزی پر چھوڑتے ہوئے یتیموں کے اولیا کو احتیاج کی صورت میں ان کے مال سے اپنا حق المحنت لینے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور اس کی تفسیر میں راجح طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ بعد میں مالدار ہو جانے کی صورت میں ولی کے لیے اس لیے ہوئے معاوضے کو لوٹانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۵۳، مکتبہ تجاریہ کبریٰ مصر ۱۳۵۶ھ۔ اس موقع پر یہ بات دلچسپی کی ہے کہ خلیفۂ دوم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت میں بیت المال سے اپنے کفاف کو اس آیت کریمہ کا مصداق قرار دیا تھا۔ یہ الگ ہے کہ اپنے مرتبہ و مقام اور اپنی بڑھی ہوئی احتیاط کے مزاج سے بشرطِ مال داری ساتھ ہی اس کی واپسی کا عزم بھی ظاہر کر دیا تھا۔ چنانچہ آپؓ نے فرمایا تھا: "انی انزلت نفسی من ھذا المال منزلۃ والی الیتیم، ان استغنیت، استعففت، وان افتقرت، استقرضت فاذا ایسرت قضیت" ابن کثیر: ۱/۴۵۴۔ محولہ بالا (میں نے ریاست کے اسی مال کے سلسلے میں اپنے کو بالکل یتیم کے والی کے درجے پر رکھا ہے۔ اگر مجھ کو کشادگی حاصل رہی تو اس سے کچھ نہیں لوں گا۔ لیکن اگر ضرورت مند رہا تو احتیاج بطور قرض اس سے اپنا کام چلاتا رہوں گا۔ بعد میں حالات نے گنجائش دی تو اس قرض کو پورا پورا ادا کر دوں گا)۔ افسوس کہ انتقال کے وقت بھاری طور پر مقروض ہونے کے باعث آپ کی یہ خواہش شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکی۔

۱۲؎ بخاری۔ جلد ۱۔ کتاب الایمان۔ باب سوال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الاسلام والایمان الخ۔ اصح المطابع۔ دہلی۔ نیز مسلم جلد ۱۔ کتاب الایمان۔ باب الایمان ماہو وبیان خصالہ۔ ایضاً باب الاسلام ماھو وبیان خصالہ۔

۱۳؎ گذشتہ سے پیوستہ رمضان شریف میں نیپال کے مدرسۃ الاصلاح کے ایک ایسے ہی طالب علم کو دیکھ کر اس کی اس حالت پر افسوس کے ساتھ مدرسہ کی انتظامیہ کی لاپرواہی اور

قوم کی غفلت پر رونا آیا۔ ایسے نظام سے وابستہ طلباے مدارس عربیہ میں کیا غیرت اور عزت نفس پیدا ہو سکے گی۔

۱۴ کمیشن پر زکوٰۃ کے مسئلے پر مولانا عبداللہ قاسمی کے بہترین معتدل مقالے کے حوالے سے 'زیرعنوان کمیشن پر زکوٰۃ کی فراہمی' مطبوعہ ترجمان اسلام بنارس۔ اپریل۔جون ۱۹۹۲ء، شمارہ دوم۔ کمیشن کے عدم جواز کا قایل یہ مقالہ کتابچے کی صورت میں اشاعت کے لایق ہے۔

۱۵ مثال کے لیے (اس وقت ممنوعہ) جماعت اسلامی ہند اور ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ۔

۱۶ برائی اس لیے کہ تمام فقہا کے اتفاق سے تعلیم قرآن پر تو اجرت جائز لیکن تلاوت قرآن پر اجرت کے جواز کا کوئی قایل نہیں۔ اس کے ایک حوالے کے لیے: فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۴/ ۳۱۵ طبع سعودی عرب۔ ترتیب: عبدالرحمٰن بن قاسم و ابنہٗ محمد۔

۱۷ مولانا عبدالمجید ندوی شہید مرحوم صدرالمدرسین مدرسۃ الاصلاح، سراے میر، اعظم گڑھ پہلے عرصے تک مدرسے کی انتظامیہ کے ممبر رہے لیکن مادر علمی میں مذکورہ منصب کو قبول کر لینے کے بعد اپنے دونوں ادوار میں مدرسہ کی انتظامیہ میں ان کی شمولیت کا سوال کبھی زیرغور نہ آسکا۔

۱۸ مدرسہ مذکور کا دستورالعمل جس میں اس کی صراحت ہے۔ مطبوعہ حمیدیہ پریس سراے میر، اعظم گڑھ۔ منظور کردہ دسمبر ۱۹۲۸ء

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۸، (اگست ۱۹۹۳ء)

پہلی نیوٹرینو آبزرویٹری

محمد زکریا ورک ★

کنیڈا کے شہر اسڈبری کے قریب دنیا کی سب سے پہلی نیوٹرینو آبزرویٹری کی تعمیر کا پہلا مرحلہ مکمل ہوچکا ہے۔ اس آبزرویٹری کی تعمیر پر ۶۱ ملین ڈالر خرچ کا تخمینہ ہے اور اس کا مقصد کائنات میں پائے جانے والے ایک بنیادی ذرّے نیوٹرینو (NEUTRINO) کا مطالعہ ہے۔ زمین کی سطح سے دو کلومیٹر گہرائی میں اس آبزرویٹری کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اس آبزرویٹری کی عمارت کے اندر ایک بہت بڑا تالاب ہوگا جس میں سات ہزار ٹن عام استعمال کا پانی ہوگا، ایک ہزار ٹن ہیوی واٹر (HEAVY WATER) اور دس ہزار کے قریب روشنی کو محسوس کرنے والے ULTRA-SENSITIVE LIGHT DETECTOR آلات نصب ہوں گے۔

اس تجربہ گاہ کی تعمیر انجینئرنگ کے لحاظ سے یہ کینیڈین انجینئرز کا ایک فقید المثال کارنامہ ہوگا۔

سائنس دان امید کرتے ہیں کہ یہ تجربہ گاہ ۱۹۹۵ء تک کام شروع کر دے گی اور اس کے کام کرنے کی میعاد صرف سات سال یعنی سن ۲۰۰۲ء تک ہوگی۔ اس زبردست تجربے میں کینیڈا، امریکہ اور برطانیہ کے ہم سائنس داں حصّہ لیں گے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ نیوٹرینو ایک سب اٹامک پارٹیکل ہے جو عظیم دھماکے یا بگ بینگ (BIG BANG) کے تاریخ ساز واقعہ کے دوران وجود میں آیا تھا۔ اس پارٹیکل کو تلاش کرنے اور سمجھنے سے کائنات کے آغاز اور پیدائش کا پیچیدہ مسئلہ سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ نیز اس کا ایک اضافی فائدہ یہ ہوگا کہ کائنات کے ختم ہونے کے مسئلے کو سمجھنے میں بھی بہت مدد ملے گی۔

اس سلسلے میں ابھی تک جو نظریاتی کام ہوا ہے اس کے مطابق یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا نیوٹرینو کا وزن بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کا ماس (MASS) کتنا ہے؟ یہ جاننا اس لیے ضروری ہے تاکہ اس بات کا جواب دیا جا سکے کہ کائنات مزید پھیلتی رہے گی یا پھر خود بخود ایک روز اپنے آپ میں سکڑ جائے گی؟ اس سوال کے جواب کے لیے نیوٹرینو کا وزن معلوم کرنا اشد ضروری ہے۔

یاد رہے کہ نیوٹرینو اور نیوٹران کے ٹکرانے سے الیکٹران جنم لیتے ہیں جو ہیوی واٹر کے

★ کنگسٹن، کینیڈا۔

اندر روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز سفر کرتے ہیں۔ نیز اس عمل سے ریڈ ایشن (RADIATION) بھی پیدا ہوتی ہے۔

اس رصدگاہ میں جو ULTRA-SENSI - TIVE LIGHT DETECTOR نصب کیے گئے ہیں وہ نیوٹرینو اور نیوٹران کے مابین تصادم کے عمل کو دن میں دس مرتبہ دیکھ سکیں گے۔ کنگسٹن شہر کی مشہور یونیورسٹی کوئنس (QUEEN'S) کی طبیعیات کے پروفیسر آرتھر میکڈانلڈ کے مطابق یہ عمل روشنی کی ایک موہوم لہر کو محسوس کرنے کا ایک جان جوکھوں والا تجربہ ہوگا۔ پروفیسر میکڈانلڈ اس رصدگاہ کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس جگہ ہونے والے تجربات کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہم جان سکیں کہ سورج اپنی انرجی خود بخود کیسے پیدا کرتا ہے۔

لیبارٹری کے اندر کام کرنے والے سائنس داں خاص قسم کا لباس زیب تن کریں گے جو از حد صاف ستھرا ہوگا۔ نیز بلڈنگ کی تعمیر میں خاص قسم کا بلڈنگ مٹیریل استعمال کیا گیا ہے تاکہ کسی قسم کی ریڈی ایشن (RADIATION) باہر نہ نکل سکے۔ کیونکہ ریڈیو ایکٹیویٹی (RADIO- ACTIVITY) کی موجودگی میں نیوٹرینو کی تلاش مشکل ہو جائے گی۔

احکامِ الٰہی سے استہزا

"اور جب تو اُن لوگوں کو دیکھے جو ہماری نشانیوں کو (مذاق و تفریح کا) شغلہ بناتے ہوں تو اُن لوگوں سے کنارہ کش ہو جا۔ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر شیطان تجھے بھلا دے، تو یاد آجانے کے بعد (ایسے) ظالم لوگوں کے پاس مت بیٹھ۔"

(الانعام ۶۸)

اردو یونیورسٹی

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے ....

عبدالمتین ★

اردو یونیورسٹی پر براہ راست گفتگو کرنے سے پہلے چند عمومی باتیں ذہن میں رہنا ضروری ہیں۔ پہلی یہ کہ کوئی بھی مسئلہ خود مختار اکائی نہیں ہوتا ہے۔ معقول حل کی تلاش کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر مسئلہ کا دیگر مسایل کے سیاق وسباق میں جائزہ لیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ قومی مزاج میں تبدیلی روزمرہ کا معمول نہیں ہے۔ لہٰذا اس مزاج سے صرف نظر کرکے ہم محض انفرادی خواہش کا اظہار کرسکتے ہیں مسایل کا تجزیہ یا حل تجویز نہیں کرسکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسایل سے متعلق سبھی فریقین کی ماضی میں کارکردگی کا بھرپور مطالعہ کیا جائے۔ تیسری بات جو شاید زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ مسایل کا حل تلاش کرنے سے قبل ہمارے فکری تصورات بہت واضح ہونے چاہییں اگر ایسا نہیں ہے تو بے ربط آرا کا اظہار لازمی ہے۔ مثلاً اردو یونیورسٹی پر بحث سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں سے اردو کے تعلق کی نوعیت کیا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو ہندوستان کی سماجی زندگی میں ہم کس حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان امور میں فکری تذبذب تجزیہ اور حل دونوں کو بیک وقت متاثر کرے گا۔

کسی ادارے کی غایت اور قیام کے امکان کا انحصار تجویز پیش کرنے والوں کی منشا اور نیت پر ہے۔ کیوں کہ مطلوبہ وسایل دینے اور وسایل کی فراہمی میں وہی کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ ان کی اہمیت اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ان کا تعلق ایوانِ اقتدار سے بھی ہو جیسا کہ معلوم ہے کہ اردو یونیورسٹی کا صور مرکزی حکومت کے ان وزیر شہیر نے کانپور میں پھونکا تھا۔ آپ معمر سیاست داں ہیں۔ مدھیہ پردیش میں کابینہ کی تشکیل کے سلسلے میں راجیو گاندھی سے ہدایات لینے حاضر ہوئے تھے کہ حکم ہوا کہ پنجاب کے گورنر ہو کر چلے جاو۔ چلے گئے۔ پھر راجیو گاندھی نے مرکزی کابینہ میں شامل کیا۔ راجیو گاندھی نے بابری مسجد کا تالا اپنے اثر سے کھلوایا، وہاں پوجا کی اجازت دی گئی اور بہ نفس نفیس اجودھیا جاکر مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بعد اپنی انتخابی مہم کا آغاز اجودھیا سے رام راج کے نعرے سے کیا۔ اس دور میں بھی وزیر شہیر کابینہ میں اہم منصب پر فائز رہے اور اپنے سرپرست کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا۔ راجیو گاندھی کے انتہائی قریب ہونے کی بنا پر وہ ہمیشہ سے ان کے انتہائی بھروسے

★ ۴- زکریا مارکیٹ، نزد میڈیکل کالج، علی گڑھ - (یوپی)

ے قابلِ اعتماد ساتھی رہے ہیں علاوہ بریں وہ سیاسی سوجھ بوجھ ر داؤں پیچ سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وقت کی نزاکت درحالات کے تقاضوں کے تحت خود کو حلیف اور حریف ابت کرنے میں ان کو حد درجہ کمال حاصل ہے۔

ب اردو یونیورسٹی کا اعلان بھی شاید اس سلسلے کی ایک ڑی ہو۔ کسی ضرورت کے تحت اس کا اعلان ہوا اس کے بعد مکمل خاموشی۔ غالب امکان یہ ہے کہ جنوری ۱۹۹۶ میں پھر اس یونیورسٹی کی اہمیت کا احساس ان کے دل کو بے چین کر دے گا۔ اس درمیان میں متعلقہ حضرات نہایت اطمینان سے اس مسئلے کے تمام مضمرات کا سنجیدگی سے جائزہ لے سکتے ہیں۔ یقین رکھیے کہ مذکورہ وزیرِ شہیر کے طفیل ہمیں یہ اطمینان حاصل رہے گا۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ ہماری سیاست کا عام انداز ہے۔ بات صحیح ہے لیکن بعض سیاست دانوں کے یہاں یہ انداز اکتسابی نہیں وہبی ہے۔

یونیورسٹی نام ہے اعلیٰ تدریسی اور تحقیقاتی ادارے کا جہاں دو قسم کی تحقیقات کا انتظام ہوتا ہے ایک وہ جن کا تعلق سماج کی فوری ضرورت سے ہے اور دوسری محض طلبِ علم یا انفرادی شوق کی تکمیل کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں تک دوسری قسم کی تحقیقات کا تعلق ہے تو یہ ان ترقی یافتہ ممالک کے لیے موزوں ہے جو پہلی ضرورت پوری کر چکے ہوں اور جنھیں وافر وسائل مہیا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہم اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ عہدِ وسطیٰ یا محض اردو ادب پر تحقیق کے لیے ایک عالی شان ادارہ قائم کریں اور ساری توجہ اس پر مرکوز کر دیں ہماری فوری ضرورت سائنسی، تکنیکی اور طبی مضامین ہیں اور ان سے متعلق تحقیق ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ان علوم کی تعلیم اردو کے ذریعے اس ملک میں بھی ممکن نہ ہو سکی جہاں یہ سرکاری زبان ہونے کے ساتھ اکثریت کی مادری زبان بھی ہے۔ محض شدید خواہش اور پُرخلوص جذبے اردو زبان کو سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لائق نہیں بنا سکتے اور نہ ہی چند مترجمہ کتابوں سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے متعلقہ زبان میں مطلوبہ مضامین سے متعلق بھرپور علمی روایت ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ معلم اور متعلم اس زبان سے ذہنی مناسبت رکھتے ہوں اور طویل عرصے تک ان کا اس زبان سے فکری تعلق رہا ہو۔ ظاہر ہے یہ سب چیزیں ہمارے یہاں موجود نہیں ہیں۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان اپنی عروسِ نو کو اپنے جذبات سے ورڈزورتھ (W. WORDSWORTH) کی زبان میں آگاہی بخشتا ہے اور یہ نیک بخت میرا بائی کے محاورے میں اس کا جواب دیتی ہے۔ ایسی حالت میں یونیورسٹی سطح پر اردو میں تعلیم کی بات انتہائی مضحکہ خیز ہے اور اہلِ سیاست کی انتہائی غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دارانہ روش کی علامت۔ یا پھر نہ معلوم کن کن نشیبی جگہوں کو انھوں نے تاک رکھا ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہمیں موقع سے فائدہ اٹھانا نہیں آتا ہے۔ اردو یونیورسٹی بہر حال ایک اضافہ ہوگی۔ بعض کو ملازمت ملے گی اور بہتوں کو تعلیم، لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ بعض وجوہات سے ملک میں ہماری وہ حیثیت نہیں ہے کہ دوسروں کے مفاد کے لیے استعمال ہوئے بغیر ہم موقع سے فائدہ حاصل کر لیں۔ معمولی فائدے کے لیے بھی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور نہ جانے کس کس کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا قیمت کا آنکنا بہت ضروری ہے پھر اگر مطمحِ نظر چند ملازمتیں ہیں تو بحث لاحاصل ہے کیوں کہ چند کو ملازمت مل جانے کے معنی چند ہزار بھی نہیں ہیں مسلم یونیورسٹی کا تدریسی عملہ سو سال کے طویل عرصے کے

بعد قریب دو ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ مزید ایک ہزار کو اردو یونیورسٹی میں ملازمت مل جانے سے باقی ۱۵ کروڑ پر مشتمل اردو داں طبقے کا مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا بلکہ اس ادارے کے فارغ طلبا ملازمت کے لیے بہت بڑا مسئلہ ہوں گے۔ ان کے مقابلے میں بڑھیا بھی (اگر وہ کہیں ہے) اپنی سوت کی پونی کو عزیز جانے گی۔ یہ ملک کی معیشت پر بار ہوں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقلیتی طبقے میں ایسے تعلیم یافتہ افراد کی کثرت جو ملک کی عام ضرورتوں میں نہ کھپائے جا سکیں خود اقلیت کے مفاد میں نہیں ہے۔ بسا اوقات یہ اپنی تعلیم کی قیمت کچھ اس انداز سے وصول کریں گے کہ ہمارے پاس جزبز ہونے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ اب رہا اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی ماہرِ فنِ تعمیر ایک شاندار عمارت کا نقشہ بنائے جو ہر ممکن ضرورت پوری کرنے کے ساتھ جمالیاتی حس کی بھی تسکین کرتا ہو لیکن وہ اس پر اصرار کرنے لگے کہ دوسری منزل پہلی منزل سے پہلے بنائی جائے۔ اردو یونیورسٹی میں داخلے کے لیے جس قسم کے تربیت یافتہ طلبا درکار ہیں وہ موجود نہیں ہیں۔ چند شہروں کو چھوڑ کر اردو کی تعلیم کا ابتدائی درجوں میں کوئی انتظام نہیں ہے اور جہاں ہے بھی تو وہ ناقص ہے۔ اس نقص کا تعلق متعلقہ افراد میں احساسِ ذمہ داری کے فقدان سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ خارجی حالات سے ہے۔ اساتذہ کی تقرری اور تبادلوں میں دانستہ کی گئی غیر معمولی تاخیر سے طلبا میں بے رغبتی پیدا ہونا فطری امر ہے اور شاید اربابِ حل وعقد کا یہی منشا ہے۔ پھر مستقبل میں ترقی کے راستے مسدود دیکھتے ہوئے شاید ہی کوئی ذہین شخص اپنی پوری زندگی بحیثیت معلم کے اپنے کو اردو سے وابستہ کرنا چاہتا ہے۔

اردو یونیورسٹی کا ایک مضر اثر اور بھی ہے جو ممکن ہے بعض حضرات کو مبالغہ لگے۔ اس جامعہ کا تعلق محض ایک زبان سے ہوگا۔ غالب امکان یہ ہے کہ یہاں معلم اور متعلم کا تعلق اس وسیع اور عریض دنیا سے علمی سطح پر اتنا نہیں ہو سکے گا جتنا ان اداروں میں ممکن ہے جہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ "ہر آن نئی شان" والی دنیا میں اب ضروری ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں ہو رہے علمی اور تکنیکی کاموں سے فوری اور گہری واقفیت ہو۔ ذہنوں کے باہمی تعلق اور دوسروں کے خیالات سے آگاہی سے علم نے ہمیشہ ترقی کی ہے اور انسانی تہذیب آگے بڑھی ہے۔ اسی تعلق سے ہمیں وژن حاصل ہوتا ہے۔ چوں کہ ہمارے یہاں دنیا کی دیگر اہم زبانیں سیکھنے کے ذرائع نہیں ہیں اس لیے انگریزی پر انحصار ہماری مجبوری ہے۔ اردو یونیورسٹی کے فارغ طلبا استفادے کے اس ذریعے سے محروم رہیں گے۔ ان کے مستقبل کا اندازہ موجودہ دینی مدارس یعنی آزادی کے بعد کے ماحول میں موجود مدارس سے متعلق حضرات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ کلیہ نہیں ہے لیکن پبلک مجالس میں ان میں سے بہتوں کی تقریروں کے بلند صوتی آہنگ میں اور زیرِ بحث موضوع میں کوئی مناسبت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ شاید یہ نفسیاتی پیچیدگی کا اظہار ہے جو معلومات کے ذرائع محدود ہونے اور عصری مسائل سے محدود آگاہی کے سبب وجود میں آتی ہے۔ اس بات کی تائید برادرانِ وطن کے ہندی اخبارات سے ہوتی ہے جن کے مضامین کا معیار وہ نہیں ہوتا ہے جو اندرونِ ملک انگریزی کے اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین کا ہوتا ہے۔

ممکن ہے بعض ماہرینِ تعلیم کچھ بھاری بھر کم حوالوں کے ساتھ یہ بات کہیں کہ علم خود اپنا انعام ہے اپنے آپ میں مقصد ہے اور یہ کہ ٹھوس علمی کام مالی منفعت کی فکر سے بلند ہو کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ بات

بالکل صحیح ہے لیکن اردو یونیورسٹی پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے۔ اصل میں ہر بات سماج میں چند افراد پر مشتمل ایسا طبقہ ہوتا ہے جو اپنی بنیادی ضرورتوں کو باعزت طریقے سے پورا کرنے کے بعد خاصہ وقت اور وسائل بچا لیتا ہے تاکہ حالات کے مد و جزر سے متاثر ہوئے بغیر اپنے علمی شوق کی تکمیل کر سکے۔ یہی طبقہ سماج کی آبرو ہوتا ہے اور ٹھوس عملی کام کرنے کا اہل۔ برطانوی دور کے ہمارے معاشرے میں یہ طبقہ موجود تھا لیکن بعض تاریخی عوامل نے اسے معدوم کر دیا اور اگر حالات اسی سست رفتار سے تبدیل ہوئے تو مستقبل قریب میں اس بات کا امکان کم ہے کہ اردو یونیورسٹی کو اس قسم کے افراد میسر آسکیں گے۔

ان سب باتوں کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ اردو کے لیے ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہیے لیکن ترجیحات میں انتشار بیماری بھی ہے اور مہلک بیماری کی علامت بھی۔ اردو ہم سے ہے، ہم صرف اردو سے نہیں ہیں اور اردو کے وجود میں آنے سے پہلے بھی ہندوستان میں مسلمان موجود تھے اور ان کی تہذیب خود ان کے لیے قوت کا اور دوسروں کے لیے کشش کا سبب تھی اور یہ سب ایک ہزار سال بعد تخلیق کیے ہوئے دعوے نہیں ہیں۔ البیرونی (۱۰۳۰ء میں ہندوستان آیا) اور ابن بطوطہ (چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں رہا) کے کارناموں، ضیاء الدین برنی وغیرہ جیسے عصری مورخین کے یہاں یا صوفیا کے ملفوظات میں یہ تہذیب پوری آب و تاب کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ شاید آخر الذکر تصانیف ہمارے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوں۔ مثال کے طور پر حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات صدی، امیر حسن کی فوائد الفواد یا میر خورد کی سیر الاولیا صوفیا کی اسلامی تعلیمات ہی کو نہیں بلکہ مسلمانوں کی معاشرت یعنی تہذیبی زندگی کو اپنے میں سموئے ہوئے ہیں۔ کتنے

کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے وجود میں آنے سے پہلے بھی مسلمانوں کے خیالات شائستہ اور اطوار نستعلیق تھے اور وہ اس لیے کہ جن اقدار و عقاید نے ان کے سماجی برتاو کا تعین کیا وہ دلکش اور دل پذیر تھے لہٰذا ان اقدار کی آمیزش سے وجود میں آنے والی تہذیب کا دلکش ہونا لازمی تھا۔ اس امر کو سمجھنے کے لیے مختلف زبانوں کے ہم عصر ادب کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ امیر خسرو (۱۲۳۵-۱۳۲۴ء)، چاند (۱۱۲۶-۱۱۹۲ء) اور کبیر (۱۴۴۰-۱۵۱۸ء) کا یا فیضی (۱۵۴۷-۱۵۹۵ء) ابو الفضل (۱۵۵۱-۱۶۰۲ء)، سورداس (۱۴۸۳-۱۵۶۳ء) اور تلسی داس (۱۵۳۲-۱۶۲۷ء) کا تقابلی مطالعہ اس بات کو واضح کر دے گا کہ اقدار کے اختلاف کی وجہ سے ایک ہی خطے میں اور ایک ہی زمانے میں وجود میں آنے والا ادب ایک دوسرے سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔ اس وضاحت سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اردو زبان کا مسئلہ ہمارے لیے محض اس لیے اہم ہے کہ یہ زبان ہماری تہذیب اور اقدار سے وابستہ ہو گئی ہے۔ اس تہذیب کے تحفظ کی سمت کا بنیادی کام اردو یونیورسٹی کا قیام نہیں بلکہ اردو کی ابتدائی تعلیم کا انتظام ہے لہٰذا ہمارا مطالبہ سرکار سے یہ ہونا چاہیے کہ شمالی ہند کے ہر سرکاری اسکول میں اردو کی لازمی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے۔ اس سلسلے میں اب تک کہ جھجک اور معذرت خواہانہ رویے نے ملک کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ انتہائی نامعقول ماحول میں ہر وقت معقولیت پر اصرار کرنا کوئی معقول بات نہیں ہے۔ ملک کی آزادی کو ۴۰ سال گزر چکے ہیں، ایک پوری نسل اس آزادانہ ماحول میں پرورش پاکر اس انداز سے بالغ ہوئی ہے کہ شہر شہر چرچہ ہو چلا ہے۔ بازار سے لے کر اعلا ترین عدالت اور قانون ساز اداروں تک

ایک انتشار ہے۔ عدالت عالیہ میں وکلا احتجاجاً نہیں گئے کہ ان کو ایک معزز جج کی تقرری پر اعتراض ہے، جن کے دامن پر بقول ان کے مالی بد دیانتی کے الزامات ہیں ۔ ۹ اپریل ۱۹۹۳ کے اخبارات میں خبر ہے کہ آسام اسمبلی میں کچھ معزز ارکان کو پولس نے ایوان کے اندر سے گرفتار کر لیا کیوں کہ انھوں نے ایوان میں کرسیاں توڑیں، مائیکروفون توڑ دیے اور عجیب بانکپن سے اسپیکر کے کمرے میں داخل ہوے۔ ایک خاتون ممبر پارلی منٹ کسی بات پر اتنا خوش ہوئیں کہ دو لاکھ کے مجمع میں دوسرے ممبر پارلی منٹ کے جو خیر سے ایک عظیم پارٹی کے صدر بھی ہیں، کاندھوں پر جا بیٹھیں اور بہت دیر تک بیٹھی رہیں۔ محترم کا دور صدارت ویسے بھی 'یگانہ' روزگار ہے۔ ملک پر ان کا یہ احسان کیا کم ہے کہ انھوں نے مستقبل کو امکانات کی تاریکی سے نکالا اور نو خیز سیاست دانوں کا مسئلہ حل کر دیا۔ ایسی حالت میں ملک کے ماہرین تعلیم، ماہرین اخلاقیات اور ماہرین عمرانیات سے یہ دریافت کیا جانا چاہیے کہ وہ اس مکمل انتشار کی فکری بنیادیں کیوں نہیں تلاش کر رہے ہیں۔ ان میں اتنی اخلاقی جرات کیوں نہیں ہے کہ مرض کو اس کے صحیح نام سے پکاریں۔ تپ دق کو زکام کہہ کر مریض کو تسلی دی جا سکتی ہے، مرض کا علاج نہیں کیا جا سکتا اردو داں طبقے کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی تہذیبی ذمہ داری کو محسوس کرے اور بتائے اپنے کردار سے بتائے کہ ملک کی فلاح وبہبود کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ اردو تہذیب کو مزید نظر انداز نہ کیا جائے۔ ملک کے ہر بہی خواہ کو یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ ملک کا مفاد اس میں ہے کہ تمام اسکولوں میں ہندی کے ساتھ اردو ادب کے مطالعے کا معقول انتظام کیا جائے تاکہ اہلِ ملک اظہار رائے اور اختلاف کے شائستہ طریقوں سے واقف ہو سکیں اور شگفتگی، نفاست اور رواداری جیسی صالح تہذیبی اقدار سے ملک کا سماج آشنا ہو سکے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ علامہ اقبال نے اسلامی عقاید پر قایم رہتے ہوے رام کو خراج عقیدت پیش کیا اور غالب کے خطوط میں ۱۲۲ خط ہرگوپال تفتہ اور ۳۵ خط منشی شیونرائن آرام کے نام ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے خالص ہندو مذہبی تیوہاروں پر طویل اور خوب صورت نظمیں لکھیں۔ بعض ہندوؤں نے بھی نعتیں اور منقبتیں لکھیں لیکن فارسی اور اردو میں شاعری میں استعاروں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ دل فریب حسن کو ایمان شکن اور کافر حسن کہا گیا۔ یہ سب اردو تہذیب میں رواداری کے بیّن ثبوت ہیں۔ اس کے برعکس متقابل ادب کا مطالعہ کیا جائے تو تخیل کو حبس دم ہونے لگتا ہے۔ اصل میں رواداری کے دعوے کرنا اور ہے اور غیر شعوری طور پر رواداری کا اظہار کچھ اور شے ہے۔ سرمہ لگانا اور ہے اور سرمگیں آنکھیں کچھ اور ہی ہوتی ہیں۔ اردو کو لازمی مضمون کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ابتدائی درجات میں ایک سے زیادہ ہندوستانی زبانیں پڑھانے سے بچوں کے تحت الشعور میں یہ حقیقت سرایت کرے گی کہ ہمارا سماج ایک سے زیادہ زبانوں اور مذاہب پر مشتمل ہے۔ اس سے شاید تنگ نظری میں کچھ افاقہ ہو۔

غالب اندیشہ ہاے دور دراز سے پریشان تھے۔ اس لیے کہ ان کی نگاہ دور رس خدا جانے کیا کیا دیکھ رہی تھی۔ ہم کو زمانہ فائدہ ہاے دور دراز کی بحث میں الجھائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ محکوم کی فوری مسایل سے بے خبری حاکم کے لیے ہمیشہ سکون کا باعث ہوتی ہے۔ اردو یونیورسٹی کی بحث شاید اسی سکون کے حصول کی جانب ایک کوشش ہے۔

ہمارے بچے اور ان کی تربیت

ضیاء الرحمٰن اعظمی *

عام طور سے دیکھنے میں آتا ہے کہ ہمارے والدین اپنے بچوں کے رہن سہن اور طور طریقوں پر ہمیشہ شکوہ سنج رہتے ہیں۔ یہ بچے جب کچھ بڑے ہو جاتے ہیں اور نوجوانی کی سرحد پر قدم رکھتے ہیں تو ان بڑوں کی شکوہ سنجی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ دن رات کڑھتے اور انھیں کوستے رہتے ہیں۔ انھیں نہ اُن کا سونا جاگنا بھاتا ہے، نہ اُن کا اٹھنا بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ ان کے لباس و پوشش سے، ان کے دوست احباب سے — مختصر یہ کہ ان کی پوری طرز زندگی اور معاشرت سے انھیں وحشت اور بیزاری رہتی ہے یہ بڑے اپنے بچوں کو فرماں بردار، مطیع، حلیم اور خاکسار دیکھنا چاہتے ہیں لیکن عموماً انھیں اس کے برعکس پاکر وہ طعن وطنز کا ہدف بناتے ہیں۔ ردّ عمل کے طور پر یہ بچے اور بھی باغیانہ روش اپنا لیتے ہیں اور مزید گستاخ ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف بڑوں کی وحشت و تنفر میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ غرض گھر میں سکون و طمانیت کی جگہ ایک دائمی تناؤ کی فضا قائم رہتی ہے۔ اور والدین اس دائمی عذاب میں سلگتے رہتے ہیں۔

لیکن آپ ذرا غور و فکر سے کام لیں اور معاملات کا تجزیہ کریں تو صاف پتہ چلے گا کہ یہ دائمی عذاب کی فضا خود ان ہی کی آفریدہ ہوتی ہے۔ بچوں کو خراب کرنے، انھیں گستاخ و بے دماغ بنانے میں ان ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کی نورانیوں کو تاریکی میں بدل دینے کا سبب وہ خود ہوتے ہیں۔ قبل اس کے کہ اوپر کیے گئے دعوے کی دلیل پیش کی جائے، ضمناً بچوں کی اہمیت کا ایک تاریخی پس منظر پیش کرنا نامناسب نہیں ہوگا۔

پچھلی صدی اور اس سے پہلے کی صدیاں بچوں کے ساتھ ناروا سلوک اور ناانصافی کی صدیاں تھیں بڑوں کی نگاہ میں خواہ وہ والدین ہوں یا اساتذہ، ان بچوں کی کوئی شخصیت نہیں تھی، ان کا اپنا کوئی وجود نہیں تھا۔ بڑوں کے آگے مدتوں سے چلا آرہا یہ وحشیانہ اور غیر نفسیاتی اصول کہ "ڈنڈے کا عدم استعمال بچوں کو خراب کر دیتا ہے" ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کا موجب رہا۔ آخر ۱۸ ویں صدی میں فرانس کے مشہور

* لکچرر، شعبۂ تعلیمات، شبلی نیشنل کالج۔ اعظم گڑھ

دانش ور روسو، جو بچوں کی نفسیات کا راز داں تھا، ان زیادتیوں کے خلاف چیخ اٹھا اور بڑوں کو للکارا کہ وہ اپنے ہاتھ کھینچ لیں۔ اس نے پہلی بار بتایا کہ بچوں کی بھی اپنی شخصیت ہے، اپنا وجود ہے۔ اس نے نعرہ دیا کہ ہر بچے کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ روسو اور اس کے ہم نواؤں ہی کا یہ اثر ہے جو آج دنیا کے ہر ملک اور ہر سماج میں بچوں اور ان کی نفسیات کو سمجھا جا رہا ہے۔ آج انھیں ان کا مقام واپس مل رہا ہے۔ آج بچہ اسکول میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ استاد، پرنسپل، حکام اور نصاب وغیرہ۔ یہ سب اس کی شخصیت کے فروغ اور تکمیل کے آلے ہیں۔ یقیناً بچے قوم کی میراث ہوتے ہیں۔ اس کی تہذیب، اس کے تمدن اور اس کی ساری اچھی بری قدروں کے پاسدار ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی جیسی اٹھان ہوگی قوم اسی رعایت سے ان کے ہاتھوں محفوظ یا غیر محفوظ ہوگی۔ چنانچہ آج خصوصاً مغرب میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا جا رہا ہے کہ ان کی شخصیت مجروح نہ ہونے پائے۔ ان کے تشخص کو ٹھیس نہ پہنچے اور کسی طور پر ان کی دل آزاری نہ ہو بلکہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ محبت کا معاملہ اور دل جوئی کا اہتمام ہو۔

لیکن افسوس کہ ہمارے والدین اور بڑے بوڑھے اس نئی روشنی سے بے خبر ہیں اور بے حس محض ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو غریب اور ناخواندہ ہیں اور بالعموم دقیانوس بدعقیدہ اور رجعت پسند ہیں۔ دوسری طرف کچھ پڑھے لکھے "اونچے لوگ" ہیں جو اکثر ماڈرن اور اپٹوڈیٹ ہیں۔ پہلی قسم کے والدین کی زندگی عموماً غیر صحت مند اور گھناونی ہوتی ہے۔ وہ ہر دم آپس کی لڑائی بھڑائی، گالی گلوچ اور دریدہ دہنی میں مبتلا رہتے ہیں۔ دوسری قسم کے والدین ماڈرن بننے کے جنون میں فیشن پرستی اور عریانیت کی گندگی میں گرفتار ہوتے ہیں لیکن سب سے بڑی تعداد ہمارے ان بڑوں کی ہے جن کی بدکرداری اُن کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے جن کی ہمہ وقت کی رشوت خوری، جھوٹ، مکر اور فریب کاری اور جن کی ہر دم کی جملہ بے ایمانیوں کی گھناونی حرکتیں نیم روز کی طرح بچوں پر روشن رہتی ہیں۔ ستم یہ کہ اکثر اوقات گھر میں اپنی ان غلط کاریوں کے چرچے بھی ہوتے رہتے ہیں، کبھی چوری چھپے کبھی علانیہ و فخریہ۔ آپ خود سوچیے ایک ایسا خاندان جہاں جھوٹ بولنا، جعل سازی اور بے ایمانی کرنا فخر کی بات سمجھی جاتی ہو، ایسی فضا کے پروردہ بچوں کے آگے سچائی اور ایمان داری کی باتیں کرنا ان سے کسی دوسرے سیارے کی زبان بولنے کے سوا کیا ہوگا۔ وہ غریب ایک نامعلوم ذہنی انتشار و پراگندگی کا شکار رہتے ہیں اور ان کی شخصیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خانوں میں بٹ جاتی ہے۔ گھر اور اسکول کی متضاد فضائیں ان کے توازن کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ اپنے بچوں کے ایک خطرناک قسم کے دشمن وہ لوگ بھی ہیں جو احساسِ برتری یا احساسِ کمتری میں گرفتار رہتے ہیں۔ اول الذکر جھوٹی بڑائی کے خول میں تیدا اپنے بچوں کا محلے اور پڑوس سے میل جول کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ وہ ہر دم انھیں احساس دلاتے رہتے ہیں کہ تم دوسروں سے برتر اور افضل ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ سب سے الگ تھلگ، تنہائی اور اکیلے پن کی غیر فطری زندگی گزارنے لگتا ہے اور آخر اپنے سماج میں نکو بن کے رہ جاتا ہے۔ وہ بچہ جو ایک لائق نوجوان کی شکل میں ابھر سکتا تھا اب وہ ایک کھلی ہوئی بیمار شخصیت کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ ایسے بچوں کی جس تعداد شدت کے ساتھ ان خطوط پر تربیت ہوگی اُسی شدت

سے ان کی شخصیت میں کجی، بے راہ روی اور ایب نارملیٹی (غیر معمولی پن) وجود میں آئے گی۔ ناز اور نخوت تکبّر اور رعونت اور غرور و بد دماغی جیسی صفات خبیثہ ان کا مقدر ہوں گی۔ احساس برتری کی انتہائی شکل عموماً دیوانگی پر منتج ہوتی ہے۔ دوسری طرف احساس کمتری کے سائے میں پروان چڑھے ہوئے بچّے بالکل مسکین و مجبور اور یتیم سے ہوتے ہیں۔ ان کا بچپن سہما سہما اور گھبرایا سا رہتا ہے۔ ان کی بات لنگڑی اور لرزیدہ ہوتی ہے اور ان کی بیمار جوانی محرومی اور مایوسی کا پیکر ہوتی ہے۔ اوپر مذکور مختلف رنگوں کے والدین کے زیر سایہ بچوں کی شخصیت میں توازن نہیں رہ پاتا۔ ان کی اٹھان کج ہوتی ہے۔ یہ بچے گھر اور خاندان کے لیے دردسر بن جاتے ہیں اور اہل خاندان کے ساتھ محلے ٹولے اڑوس پڑوس اور پھر پورے معاشرے کو اس ایبنارمل شخصیت کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ والدین اپنے بچوں کو جذباتی ہیجان میں مبتلا کرنے اور ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کے ذمّہ دار ہیں ان کو غیر صحت مند اور غیر متوازن زندگی گزارنے پر مجبور کرنے کا گناہ بھی انھیں کے سر ہے۔ یہ بڑے بوڑھے اپنی جہالت، اپنی کم نگاہی اور اپنی ناعاقبت اندیشی کے باعث اپنے بچوں کی خوشیوں اور ان کی زندگی کا سودا کرتے ہیں۔ اپنی غلط زندگی کا غلط نمونہ پیش کرکے یہ خود اپنے ہاتھوں اپنے بچوں کی خوشیوں کی راہ میں درد کے کانٹے بچھاتے ہیں۔ ان کا حال و مستقبل برباد کرتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر دشمن، ظالم اور بے حس کوئی اور نہیں۔

گھر اور خاندان بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی نشو و نما کا سب سے اولین اور موثر ادارہ ہے۔ یہاں وہ دانستہ اور نادانستہ، شعوری اور لاشعوری طور سے اپنے بڑے بوڑھوں سے لمحہ لمحہ سیکھتے رہتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات، ان کے طور طریقوں اور ان کی گفتار و کردار کا وہ پل پل مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ساری اچھی بُری عادتوں کے اثرات ان کے اوپر مرتب ہوتے رہتے ہیں جو ان کی شخصیت کو ایک رخ، ایک جہت دے دیتے ہیں۔ پھر ان بڑوں کو اپنے بچوں سے شکایت کیوں ہو؟ آخر یہ بچے ان ہی کے تو نقش قدم پر چلیں گے۔ جیسا سانچہ ہوگا ویسے ہی تو سکے ڈھلیں گے۔ خراب، کہنہ و بوسیدہ اور از کار رفتہ سانچوں سے عمدہ سکّوں کی توقع فضول ہے ــــــ غلط نمونوں کے سائے میں بچوں کے کردار نہیں سنورتے۔ کردار سازی کے لیے ایک اور ہی فضا درکار ہے۔ کلیوں کو مسکرانے اور خوشبو بکھرنے کے لیے بادِ سموم کی نہیں بادِ بہاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر کی عمدہ تربیت بچوں کے رجحان اور مزاج کے لیے بادِ بہاری ہے۔ والدین اور بڑوں کی نظروں کا فیضان دنیا کی ہر تربیت سے بلند اور موثر ہوتا ہے۔

بقیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۲۴

کے سامنے موجودہ حالات ہمارے سابقہ و حالیہ اقدامات اور اس کے نتائج کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلام کے مطابق لائحۂ عمل کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے کہ آپ ان خود ساختہ لیڈروں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور حالات کو مزید ابتر سے ابتر ہونے دیتے ہیں یا اللہ اور اس کے رسول کے احکامات پر عمل کرکے دنیا اور آخرت میں سرفراز بھی ہوتے ہیں اور انسانیت کے لیے ایک مشعل راہ کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۸ (اگست ۹۳ء)

افسوس کیسے کیسے سخن ہائے گفتنی

الطاف حسین خاں شیروانی ★

بچپن ہی سے مجھے یہ شوق تھا کہ قابل حضرات کی صحبت میں جاؤں، ان کی باتوں کو سنوں، ان سے کچھ سیکھوں اور ان کی عمدہ باتوں کو اختیار کروں۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے تجربات بھی ہوئے اور ان بزرگوں سے بہت کچھ حاصل بھی ہوا۔ ایک عمل سب میں مشترک پایا وہ تھا ان کا اخلاق۔ محبت سے بٹھایا۔ شفقت سے پیش آئے اور رخصت کرتے وقت اپنی نئی تصنیف کا ایک نسخہ عنایت فرمایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ملاقات کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں۔

موصوف کا بنگلہ الہ آباد میں دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ میں پہنچا تو بڑی بے تکلفی سے ملے معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بہت پرانی شناسائی ہے۔ عمر تو کافی تھی لیکن تندرستی اچھی تھی۔ ٹائی و سوٹ میں تھے مجھے ان کو دیکھ کر اپنے ایک ہم وطن مان سنگھ صاحب (پہلے ہندوستان ڈی۔ آئی۔ جی اور شاگرد رشید مولانا ظہور الاسلام صاحب فتح پوری) یاد آگئے، جو وقت کے بڑے پابند تھے۔ موصوف صبح اندھیرے میں غسل کرنے اور جاڑوں تک میں چھ بجے صبح ناشتہ کی میز پر بیٹھ جانے اور ٹھیک وقت پر گھوڑے یا موٹر میں سوار ہو کر اپنے لگائے باغ (چمن باغ جس کے ایک حصے کا نام اپنے استاد کے نام پر ظہور باغ رکھا تھا) روانہ ہو جاتے تھے بالکل یہی کیفیت یہاں نظر آئی۔ جاڑے کے ایام تھے ڈاکٹر صاحب اپنے روزانہ کے کاموں کے کئی مراحل طے کر چکے تھے یعنی نہانے کے بعد ٹہلنے کا کام ہو چکا تھا۔ ناشتہ کی تیاری تھی کہ میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب پورے وقت جرمنی کے اپنے استادوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ہادی حسن صاحب علی گڑھ کی ملاقات کا ایک جملہ آج تک بھول نہ سکا۔ مرحوم نے فرمایا:

"آب خالص میں جو لطف و تازگی ملتی ہے وہ شراب پینے سے نصیب نہیں ہوتی معلوم نہیں کیوں لوگ شراب کا استعمال کرتے ہیں۔ انھیں اس میں کیا مزا ملتا ہے۔"

اس مضمون کا محرک بدرالحسن بدر فتح پوری کا وہ جملہ ہے جو انھوں نے حسرت موہانی کے سلسلے میں کہا تھا:

★ ڈائرکٹر ڈاکٹر تاراچند میموریل ریسرچ سینٹر، ۸۳ بی، فتح پور۔ (یوپی)

"مجھ سے یہ واقعہ سن لیجیے شاید میرے بعد پھر کوئی سنانے والا نہ رہ جائے گا۔"

اب ہم اُن واقعات پر نظر ڈالتے ہیں جو کسی وجہ سے اب تک تحریر میں نہیں آسکے اور انسانوں کے ساتھ قبر میں دفن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

۱- فتح پور کی ایک محفل میں جس میں خان بہادر عبدالرؤف بھی موجود تھے۔ بدرالحسن بدر تشریف لائے اور فرمانے لگے: مجھ سے یہ واقعہ سن لیجیے شاید میرے بعد پھر کوئی سنانے والا نہ رہ جائے گا۔ بدر فتح پوری گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور میں مولانا حسرت موہانی کے ہم سبق تھے۔ اس وقت گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر گارڈنر تھے۔ لڑکوں کا ایک جلسہ ہوا، جس میں لڑکوں کی تقریریں ہونا تھیں۔ موضوع تھا "تلوار اور قلم میں کس کو فضیلت حاصل ہے۔" حسرت تلوار کی موافقت میں تھے۔ حسرت نے اپنی تقریر میں کہا کہ تلوار کو قلم پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ قلم سیاہ رُو کرتا ہے اور تلوار سرخ رُو۔ ہیڈ ماسٹر صاحب حسرت کی اس دلیل سے بہت خوش ہوئے اور حسرت کو اوّل انعام سے نوازا گیا۔ (راوی ضیا احسنی فتح پوری)

۲- یہ بات ۴۶-۱۹۴۵ء کی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سو ڈیڑھ سو طلبا منظر عالم کی قیادت میں قصبہ دھام پور ضلع بجنور گئے۔ ان ہی ایام میں مولانا حسرت موہانی بھی وہاں قیام پذیر تھے۔ ایک طالب علم راو مختار علی خاں نے مولانا حسرت سے حضرت نیاز فتح پوری کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا مولانا نیاز فتح پوری ملحد ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے فرمایا نیاز صاحب کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ حقیقت میں نہ وہ ملحد ہیں نہ کافر بلکہ وہ ایک شوخ ادیب ہیں جو علما کو چھیڑ کر انھیں مضامین لکھنے پر مجبور کرتے ہیں تاکہ ان کے رسالے نگار کے لیے برابر مضامین ملتے رہیں۔ مولانا حسرت نے اس موقع پر غالب کا یہ مصرع دہرایا ؎

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ

مولانا حسرت نے فرمایا نیاز کے اندر بچپن ہی سے شوخی اور شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ نہ کافر تھے اور نہ ملحد بلکہ وہ ایک کٹر مسلمان تھے۔ میں نے ان کے ساتھ روزہ بھی افطار کیا ہے اور ان کے ساتھ نماز بھی پڑھی ہے۔ (راوی وحیدالدین خاں متین علیگ عرف ڈبلو خاں)

۳- یہ واقعہ ۱۹۳۵ء کا ہے۔ میرے ایک عزیز آغا علی خاں صاحب رئیس الہ آباد کشمیر جا رہے تھے۔ جب دہلی سے گاڑی روانہ ہوئی تو لوگوں میں کانا پھوسی ہوئی کہ اس ڈبے میں علامہ اقبال بھی سفر کر رہے ہیں۔ علامہ آنکھ بند کیے خاموش بیٹھے تھے۔ آغا علی خاں صاحب نے علامہ کی خدمت میں پہنچ کر سلام عرض کیا اور قریب ہی بیٹھ گئے۔ علامہ کی خیریت دریافت کی۔ علامہ نے فرمایا حکیم نابینا سے علاج کی خاطر دہلی آیا تھا۔ آغا علی خاں صاحب نے ان سے ان کے تازہ کلام سنانے کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی اور علامہ نے تسخیر فطرت کا پہلا بند میلادِ آدم ترنم کے ساتھ سنایا۔ سناتے وقت یہ احساس ہو رہا تھا کہ علامہ پر عجیب کیفیت

سی طاری ہے۔ (راوی آغا علی خاں رئیس الہ آباد)

۴ خان بہادر عبدالروف فرمانے لگے کہ گیہوں کی خریداری کے سلسلے میں میں یو۔پی حکومت کی طرف سے پنجاب گیا۔ میرے ساتھ میرے ایک دوست ریاض الدینؒ صاحب بھی تھے۔ جب سرکاری کاموں سے فرصت مل گئی تو میں نے ریاض الدین صاحب سے مشورہ کیا کہ لاہور آکر ڈاکٹر اقبال سے ملاقات نہ کرنا بڑی بدنصیبی ہو گی ریاض الدین صاحب بھی علامہ سے ملنے کے مشتاق تھے۔ چنانچہ ہم دونوں جاوید منزل پہنچے۔ غالبًا یہ بات ۱۹۳۶ء کی ہے۔ علامہ اقبال ایک بغیر بستر کے پلنگ پر گاؤ تکیہ لگائے آرام فرما تھے۔ سامنے حقہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہم لوگوں نے سلام کیا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ غالبًا علامہ کسی خیال میں غرق تھے۔ پلنگ کے قریب پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کافی دیر کے بعد ہم لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ تعارف ہوا۔ وطن دریافت کیا جب فتح پور بتایا گیا تو خوش ہوئے۔ پھر منطق یا فلسفہ کے ایک مسئلے پر گفتگو شروع کر دی جو آخر وقت تک چلتی رہی ہم لوگ اس گفتگو کو بالکل نہ سمجھ پا رہے تھے۔ کافی دیر علامہ کی خدمت میں بیٹھ کر چلنے کی اجازت لی اور جاوید منزل سے روانہ ہو گئے۔

(راوی خان بہادر عبدالروف ہسوی)

۵۔ سرسید احمد خاں بزرگان دین اور علماء حق میں کافی مقبول تھے۔ فتح پور میں مولانا نور محمد صاحبؒ خلیفہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے فرمایا کہ سرسیّد احمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے اصرار کر کے پوچھا کہ آپ کو یہ علم اتنی جلدی کیسے ہوا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ میں نے رات خواب میں دیکھا ہے کہ فرشتے آسمان میں سرسید کی روح کو حلۂ بہشتی میں لپیٹے لیے جا رہے ہیں صبح اٹھتے ہی مولاناؒ نے عوام کو ان کے انتقال کی خبر دی۔ (فتح پور کے بزرگوں سے یہ روایت ملتی ہے)

۶۔ حیاتِ جاوید میں مولانا الطاف حسین حالی نے سرسیّد احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

" سرسیّد کے بڑے بھائی سیّد محمد خاں ضلع فتح پور ہنگام میں منصف تھے۔ ۱۸۴۵ء میں سرسیّد فتح پور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے۔ سیّد محمد خاں ہنگام سے دسہرے کی تعطیل میں دلی آئے وہاں اس وقت بخار کی فصل تھی سیّد محمد خاں کو بخار آنے لگا۔ . . . . ایک دن سیّد احمد سعید کو جو اس وقت خانقاہ میں سجادہ نشین تھے بلایا اور ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور تیسرے دن انتقال کیا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے جو سرسیّد کو ان کی تعزیت کا خط بھیجا تھا اس میں یہ شعر لکھا تھا ؎

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

(ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۴۵)

اس سلسلے میں فتح پور میں بلندہ کے خاندان سے ایسی روایت بھی ملتی ہے کہ

" منشی عبدالرحمٰن صاحب پرگنہ ہسوہ ضلع فتح پور کے نام سرسید احمد خاں کا ایک خط تھا جس میں سرسید نے یہ لکھا تھا کہ اگر آپ کے خاندان کا کوئی فرد علی گڑھ برائے تعلیم آئے تو اس سے فیس نہیں لی جائے گی کیوں کہ منشی عبدالرحمٰن صاحب (رئیس بلندہ) نے علی گڑھ کالج کی بڑی مالی مدد

کی تھی۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ سرسید منشی عبدالرحمٰن
صاحب کے پاس بلندہ بھی آئے تھے (ایسا گمان
ہوتا ہے کہ سید محمد خاں منصف بہنگام
ضلع فتح پور سرسید اور منشی عبدالرحمٰن رئیس
ضلع فتح پور کی ملاقات کا واسطہ بنے) سنا ہے
کہ اس خاندان کے کوئی صاحب وہ خط لے کر
علی گڑھ گئے تھے، پھر پتہ نہ چلا وہ خط کہاں گیا
میں وہ خط نہیں دیکھ سکا ہوں۔

ڈاکٹر تارا چند کی میری ملاقاتوں میں دو باتیں
یاد رہ گئیں۔

۱- بیچارے پروفیسر محمد حبیب کیسے تصنیف کا زیادہ
کام کرتا۔ ان کے سپرد دو شعبہ جات تھے۔ ایک
شعبہ تاریخ اور دوسرے شعبۂ سیاسیات
اتنے کاموں میں وقت کہاں ملتا ہے۔

۲- مشرق میں ڈاکٹر عسکری صاحب (پٹنہ
یونیورسٹی) اور مغرب میں ڈاکٹر عابدی صاحب
(دہلی یونیورسٹی) فارسی کے ان شعرا کے سلسلے
میں اچھا کام کر رہے ہیں جنھوں نے ہندوؤں
اور ہندوستان سے محبت کا اظہار اپنے کلام
میں کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے
دوآبہ میں آپ نے بھی یہی راستہ اختیار کیا
ہے۔ اس وقت ہم سب کو ہندوؤں اور
مسلمانوں کو محبت کی بھولی بسری داستانیں
سنانا ہے تاکہ سینوں میں نرم گوشے پیدا
ہوں اور شک و شبہ کا ماحول چھٹے۔

(گفتگو ۱۶- اسٹینلی روڈ- سول لائن الہ آباد)

عبداللہ یوسف علی آئی سی ایس فتح پور میں
کلکٹر تھے۔ ان کے نام پر ایک کلب قایم کیا گیا تھا
جو آج بھی یوسف کلب کے نام سے مشہور رہے
جہاں ضلع کے حکام اور شہر کے حضرات شام کے
وقت جمع ہوتے ہیں۔ اس کلب کے ممبر ہمارے
خاندان کے افراد بھی رہے۔ انہی میں عبدالقدوس
خاں صاحب رئیس سے عبداللہ یوسف علی نے
بتایا کہ میری انگریز بیوی سے ایک لڑکا تھا جو لندن
سے آئی۔سی۔ایس پاس کر کے ہندوستان آرہا
تھا لیکن راستہ میں اس کا انتقال ہو گیا میں بمبئی
اس کو لینے گیا تھا۔ جہاز رکا۔ سب مسافر اترنے
لگے۔ میں بندرگاہ پر کھڑا اپنے بیٹے کا انتظار
کرتا رہا۔ جب سب مسافر اتر چکے تو ایک بکس
پکڑ کر لایا گیا اور میرے قریب ہی رکھ دیا گیا
میں نے جہاز کے ایک انگریز ملازم سے لڑکے
کے متعلق دریافت کیا اس نے جواب دیا یہ جو
آپ کے سامنے بکس رکھا ہے یہ اسی لڑکے کا
جسد خاکی ہے۔ راستہ میں اس کا انتقال
ہو گیا ہے۔ مجھ پر کیا بیتی اس کا اندازہ دوسرا
نہیں کر سکتا۔ جب حواس درست ہوئے تو
میں نے سمجھ لیا کہ اللہ پاک کو مجھ سے کوئی
بہت بڑا کام لینا ہے، اس لیے اس سخت
امتحان میں ڈالا گیا۔ میں لاہور واپس آیا اور
وہاں قرآن کا انگریزی ترجمہ تکمیل کو پہنچایا۔
(انگریزی کا یہ ترجمہ پوری دنیا میں مشہور ہوا
اور اس ترجمہ کو پڑھ کر ہزاروں لوگ مشرف
بہ اسلام ہوئے)۔

(راوی نواب محمد شیر خاں پسر عبدالقدوس
خاں صاحب رئیس فتح پور)

۹- علامہ نیاز فتح پوری سے میری ملاقات
لکھنؤ میں ہوئی، بہت عزت سے پیش آئے
ایک ایک کو پوچھتے رہے۔ کہنے لگے اماں پٹھانوں

نے کیا تلوار کی جگہ قلم پکڑ لی ہے۔ میری کتاب پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنے قلم سے بڑی ہمت افزا تحریر لکھی۔ کہنے لگے۔ ہمت نہ ہارنا، جوہر قابل ہو، کام کرتے رہنا۔ علامہ فرمانے لگے میری زندگی پر لندن کی ایک میگزین میں ایک مضمون شایع ہوا ہے۔ میں نے تمہارے فتح پور کے نام کو لندن تک پہنچا دیا۔ آگے تم لوگ جانو۔

دوسری ملاقات خان بہادر عبدالروف صاحب کی کوٹھی میمن منزل بدر باغ علی گڑھ میں ہوئی۔ غالباً قادیان سے واپسی تھی علی گڑھ میں اتر پڑے۔ دو دن قیام رہا۔ عبدالروف صاحب یہ کہتے ہوئے نیاز صاحب سے رخصت ہوئے۔ بھئی خاں صاحب نیاز صاحب آپ کے ہم وطن ہیں ان کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے میں تو چلا بلڈنگ ڈپارٹمنٹ۔ نیاز صاحب اس دوسری ملاقات میں کافی کمزور ہو چکے تھے یہ غالباً ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ گفتگو تو بہت رہی لیکن علامہ کا یہ جملہ آج تک یاد ہے کہنے لگے عوام کی اصلاح کے لیے اللہ پاک علماے دین کو مقرر کرتا ہے اور علماے سو کی اصلاح کے خاطر مجھے مقرر کیا گیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے دین کے معاملے میں میرا کیا مقام ہوگا۔ علماے دنیا اور دے ہی کیا سکتے ہیں سوائے کافر بنانے کے۔ جہاں تک علماے حق کا تعلق ہے میں اُن کے پیروں کی خاک ہوں۔ موصوف فتح پور کو بہت یاد کرتے تھے۔[۲]

حواشی

لہ اس سلسلے میں چند بزرگوں کے نام نامی پیش خدمت ہیں:

۱۔ پروفیسر ضامن علی، الٰہ آباد یونیورسٹی (موصوف میرے والد کے بھی استاد تھے)۔ ۲۔ ڈاکٹر حفیظ سید الٰہ آباد۔ ۳۔ ڈاکٹر تاراچند الٰہ آباد۔ ۴۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب الٰہ آباد۔ ۵۔ علامہ نیاز فتح پوری لکھنؤ۔ ۶۔ ڈاکٹر سعید حسن الٰہ آباد۔ ۷۔ ڈاکٹر محمد شبیہ حسن الٰہ آباد۔ ۸۔ مجنوں گورکھ پوری، گورکھ پور۔ ۹۔ ڈاکٹر ہادی حسن علی گڑھ ۱۰۔ پروفیسر محمد حبیب علی گڑھ۔ ۱۱۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی علی گڑھ ۱۲۔ میکش اکبرآبادی آگرہ۔ ۱۳۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ۱۴۔ شاہ معین الدین ندوی۔ ۱۵۔ صباح الدین عبدالرحمن اعظم گڑھ ۱۶۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی الٰہ آباد۔ وغیرہ

کہ علامہ اقبال کو پتھری کی شکایت تھی جس کا کامیاب علاج حکیم نابینا صاحب نے کیا۔ اس پر حکیم صاحب کو بطور شکریہ دو شعر لکھ کر بھیج دیے۔

ہے دو روحوں کا نشیمن یہ تن خاکی مرا — ایک میں ہے سوز و مستی ایک میں ہے تاب و تب
ایک جو اللہ نے بخشی ہے مجھے صبح ازل — دوسری وہ آپ کی بھیجی ہوئی روح الذہب

روح الذہب یہ ایک دوا ہے جو حکیم صاحب نے ان کے علاج میں استعمال کی۔ تفصیل سے دیکھیے: اطبا اور ان کی مسیحائی۔ حکیم محمد مختار اصلاحی۔ ص ۱۸۷

۳۔ سابق پرنسپل گورنمنٹ ہائی اسکول، علی گڑھ

۴۔ سر سید احمد خاں کی تفسیر قرآن کا فارسی ترجمہ ایران سے شایع ہو گیا ہے۔

۵۔ ان کی تین تصانیف مشہور ہیں:

۱۔ انگریزی ترجمہ قرآن شریف
۲۔ برطانوی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ
۳۔ ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات ازمنہ وسطیٰ میں۔

۶۔ ایک بار فتح پور تشریف لائے، جب واپسی کے لیے بس اسٹینڈ پہنچے تو موصوف نے آنسوؤں کے ساتھ یہ شعر پڑھا ؎

کوئی دامن چھڑا دے تو آگے بڑھوں
لپٹی جاتی ہے قدموں سے خاک وطن

اور اللہ نے حکم فرمایا ہے کہ) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک رکھنا۔ اگر تیرے سامنے ان دونوں میں سے ایک یا وہ دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اُف بھی نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے ادب کے ساتھ بات چیت کرنا۔"

(بنی اسرائیل ۲۳)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۸ (اگست ۹۳ء)

قسط اوّل

مدرسۃ الاصلاح میں طبی کتابوں کا ذخیرہ

محمد عارف اصلاحی ★

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ برصغیر کا اس لحاظ سے ایک منفرد ادارہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں قرآن کریم کی محققانہ تعلیم ہوتی ہے، علم حدیث کو اس کا اصل مقام دیا جاتا ہے اور صرف و نحو اور عربی ادب پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ کسی سیاسی، نیم سیاسی، مذہبی یا گروہی تنظیم کی کوئی چھاپ نہیں ہے اور تقلید محض سے یکسر آزاد ہے۔ یہاں پر تعلیم تو صرف فضیلت تک دی جاتی ہے لیکن محل وقوع وسیع و عریض کیمپس اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے والے نصاب کی تیاری کی طرف منتظمین کے رجحانات اس کے یونیورسٹی بننے کے امکانات کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح میں دو اہم لائبریریاں ہیں۔ ایک عربی کتب خانہ یا مکتبہ مدرسۃ الاصلاح اور دوسری لائبریری دارالمعلومات کے نام سے موجود ہے جو انجمن طلبا کے زیر انتظام ہے۔ اس میں مختلف موقر و معتبر پرانے قومی اور بین الاقوامی رسایل و جرائد کی فائلوں کے علاوہ تاریخ اجتماعیات، دینیات، سیرت، ادب اور قرآنیات وغیرہ جیسے فنون پر چار ہزار سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ چند طبی کتابیں "فارسی کتب" کی تختی کے نیچے اس گوشے سے کسی اہل نظر کی نظر کرم کی طالب ہیں جہاں "سوویت جائزہ" اور کچھ دوسرے غیر علمی رسالے اور پرچے موجود ہیں۔ عربی کتب خانہ جس کا انچارج وہاں کا صدر مدرس ہوتا ہے اس میں ادب عربی، تاریخ ادب عربی، عمرانیات، صرف و نحو احادیث اور قرآنیات وغیرہ علوم پر موجود کتابوں کے علاوہ فن طب کی بھی پچاس کے قریب اپنی قدامت کے باعث بہت اہم کتب و رسایل الماری کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ کسی کا ہاتھ نہ پڑنے کی وجہ سے یہ کتابیں انتہائی خستہ حالت میں کرم خوردہ ہیں ان میں سے کچھ، جو بہتر حالت میں کہی جا سکتی ہیں، اس قدر غبار آلود ہیں کہ بغیر جھاڑ پونچھ کیے ان کے نام بھی نہیں پڑھے جا سکتے۔ مدرسۃ الاصلاح پر طب کی تعلیم کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے غالباً جویان علم کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ مدرسہ میں بھی طبی کتب کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ ورنہ مدرسۃ الاصلاح کے شمال مشرق میں دو کلومیٹر کے فاصلے پر ابن سینا طبیہ کالج میں بھی ایک لائبریری ہے جس میں دو ہزار سے زاید طبی و نیم طبی اور مذہبی و غیر مذہبی کتابیں ہیں اور

★ کرولی، سرائے میر، اعظم گڑھ

ان سے طب نظری وعملی پر نظر رکھنے والی قدیم وجدید ذہنیتوں کی حامل ایک جماعت برابر استفادہ کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ مدرسے کے مشرق میں اکتیس کلومیٹر دور شبلی اکیڈمی دار المصنفین میں بھی ہزاروں وقیع مذہبی ادبی وسیاسی تصنیفات وتالیفات کے بیچ سیکڑوں لوگ علمی وتحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں الحاوی الکبیر اور طب العرب ARABIAN MEDICINE سمیت طب کی دوسوتین (۲۰۳) کتابیں موجود ہیں۔

چنانچہ خیال ہوا کہ طب کے طالب علموں اور اہل علم حضرات کے لیے ان کا تعارف کسی مجلہ میں کرادوں تاکہ وہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کتابوں کے قریب آئیں اور کتابیں دیمک اور گرد وغبار سے پاک ہوجائیں۔ مدرسے کی دونوں لائبریریاں ابھی جدید کیٹلاگنگ سسٹم پر پوری نہیں اترتیں۔ لہذا میں صرف کتاب کا نام صاحب کتاب کا نام، ذریعۂ اظہار کے لیے کون سی زبان اختیار کی گئی ہے، سن طباعت اور نہایت اختصار کے ساتھ کچھ کتاب کے فن کے بارے میں بھی ذکر کر رہا ہوں۔

۱۔ کتاب العمدة فی الجراحة

ابو الفرج بن یعقوب بن اسحاق عرف ابن قف کرکی (۶۳۰ - ۶۸۵ھ)۔

جلد اول و دوم

زیر نظر نسخہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد سے ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ میں پہلی مرتبہ کا چھپا ہوا ہے اس پوری کتاب میں کل بیس مقالے ہیں اور ان میں تمام وہ معلومات ہیں جن کی ضرورت ہر جرّاح کو پڑتی ہے۔ علمی حیثیت سے مصنف نے اس میں ان تمام احکام ومسایل کو بیان کر دیا ہے جو اس وقت اہل علم کے درمیان زیر بحث تھے۔ مصنف نے قدیم وجدید کی روشنی میں خود ایک نتیجہ نکالا ہے۔

جلد اول ۲۷۳ صفحات میں گیارہ مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مقالہ سرجری کی تعریف اور اغلاط کی بحث کے لیے مخصوص ہے۔ دوسرے مقالے میں اعضا کے مزاج کو بیان کیا ہے اور اعضائے بسیطہ کی تشریح (اناٹومی) بھی ہے۔ تیسرے مقالے میں اعضاء آلیہ کی تشریح ہے۔ چوتھے مقالے میں ان امراض کا ذکر ہے جن کے بارے میں جاننا ہر جراح (سرجن) کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ پانچویں مقالے میں خون (دم) کی خرابی سے پیدا ہونے والے اورام جیسے امراض اور پھر ہر ایک کی علامت کا ذکر ہے۔ چھٹے ساتویں اور آٹھویں مقالے میں بلغمی صفراوی اور سوداوی امراض کا بیان ہے۔ نویں مقالے میں ان امراض کا ذکر ہے جو ایک ہی مادہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ دسواں مقالہ ان کلی امور کے بیان کے لیے ہے جن کو جزوی طور پر فوری علاج کے وقت جاننا چاہیے اور گیارہویں مقالے میں ان مفردات کو ذکر کیا ہے جن کی ضرورت جراح کو سرجری کے وقت پڑسکتی ہے۔ جلد اول میں مرض کی ماہیت، تاریخ، نوعیت اسباب وعلامات وغیرہ کا بیان ملتا ہے جب کہ جلد دوم میں اس کا علاج اور حفاظتی تدابیر وغیرہ کا بیان ہے۔ ہر فصل کے آخر میں مولف نے واللہ اعلم بالالتزام لکھا ہے۔

مولف کرک میں پیدا ہوا اور دمشق میں ۵۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کتاب کے اشتہار میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

"یہ ایسے طبی نکات سامنے لاتی ہے جو ہم کسی اور عربی کی متداول کتاب میں نہیں پاتے۔"

۲۔ الاحکام الشرعیہ للاعمال الطبیہ

ڈاکٹر احمد شرف الدین کی ۲۴۰ صفحات کی یہ تالیف حسان حتحوت کی تصدیر کے ساتھ کویت ٹائمز سے چھپی ہے۔ مولف نے خود ان کی زبان میں "شریعت کے اصل مصادر۔ قرآن وسنت" کی روشنی میں طبی وجراحی طور طریقوں سے بحث کی ہے کتاب کے پورے موضوع کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے باب میں بنیادی طبی معالجات وجراحیات کے سلسلے میں شریعت کے احکام کو بیان کیا گیا ہے اور دوسرے باب میں بعض جدید میڈیکل اور سرجیکل عملیات، جن کے بارے میں کوئی نص صریح موجود نہیں ہے مثلاً زرع ——— IMPLANTATION والعاش صناعی ——— کے تئیں شریعت کے حدود وقیود کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے پہلے باب میں سب سے پہلے انسانی جسم کی حرمت کے لیے ایک فصل قائم کرکے بیان کیا گیا ہے کہ انسان خواہ زندہ ہو یا مردہ، دونوں حالتوں میں محترم ہے اور اس کے قابلِ احترام ہونے کا ہی تقاضا ہے کہ وہ بیمار ہو تو اس کا علاج ومعالجہ کیا جائے اور آخر میں صفحہ ۲۰۲ پر لاوارث لاشوں کا بغرضِ علم چیرنا پھاڑنا — DISSECTION — آنکھوں کے بینک کا قیام، انتقال دم اور زرع IMPLANTATION سے متعلق تین فتوے مجریہ دار الافتاء مصر اور تین فتوے مجریہ مجلس فتوی ازہر دیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری صفحات میں مولف کی دیگر کتابوں کا بھی ذکر ہے جن میں سے زراعۃ الاعضاء والقانون الحدود الانسانیہ والشرعیہ والقانونیہ للانعاش الصناعیہ اور ۱۹۸۱ء میں کویت سے شائع شدہ مجلہ "الحقوق والشرعیۃ" ہیں۔ فرانسیسی زبان میں بھی مولف کی بارہ کتابیں ہیں۔

۳۔ الفاظ الادویۃ

۱۴۷ صفحات کی یہ تصنیف فارسی زبان میں ہے۔ زیر نظر نسخہ ۱۲ رجب ۱۲۷۲ھ میں باہتمام حافظ غیاث الدین مرتضوی پریس سے چھپا ہوا ہے۔ مقدمے کے بعد مصنف نے مخدرات، مسہلات، قابضات اور مفتتات وغیرہ کی تعریف بتائی ہے اور ہر ایک کی مثال بھی دی ہے۔ پھر قیراط، مثقال، تولہ، ماشہ اور اوقیہ وغیرہ کا پیمانہ عام فہم زبان میں بتایا ہے۔

۴۔ بستان المفردات

زیر نظر نسخہ فصل نہم سے پہلے صفحہ ۹۳ تک چھپا ہوا ہے۔ ۳۲۸ صفحات کی مفردات طب کی اس بہترین اور مفید کتاب کے فصل نہم میں بعض دواؤں کے اخذ کرنے کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں صیدلہ میں استعمال ہونے والے خاکے بھی دیے ہیں۔ فصل دہم میں ہندی عربی فارسی طب میں رائج اوزان کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اوقیہ ساڑھے سات مثقال کا مثقال ساڑھے چار ماشہ کا، ماشہ آٹھ رتی کا اور رتی تین جو متوسط کے برابر ہے۔ اہل ایران اور بیدک اطباء کے ہاں جو پیمانے رائج تھے ان کی بھی ایک فہرست ہے۔ پھر باب الالف سے باب الیاء تک دواؤں کے فارسی ہندی اور عربی زبان میں معروف نام، رنگ، بو، ذائقہ، اس کے مضرات، مصلحات، بدل، نسبت ستارہ اور نفع خاص وغیرہ کو مختصر طور سے بیان

کیا گیا ہے اور اس کے افعال و خواص مع طریق استعمال، دوا کی عمدگی اور مرجح کتاب کو بہ تفصیل ذکر کیا ہے۔ زیادہ تر مرجح مخزن الادویہ کو بنایا گیا ہے۔ باب الالف میں چورانوے دواؤں کا ذکر ہے۔

خاتمہ کے فصل دوم میں بعض دواؤں کے جوہر اور عرق کشید کرنے کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ بستان المفردات کا زیر نظر نسخہ حرف حرف القاف تک ہے، آگے کے اوراق غائب ہیں۔ اس کتاب کے اشتہار کے لیے یہ الفاظ ملے ہیں۔

"بستان المفردات میں طبی لغات کے علاوہ ضروری مرکبات، ایلوپیتھک طب کے خاص نسخہ جات، نادر و نایاب مجربات کے خاص نسخہ جات و تجربہ شدہ کشتہ جات کے متعلق بہت کچھ ہے۔"

۵۔ مخزن الادویہ فارسی برحاشیہ تحفۃ المؤمنین

منشی بھگوان دیال صاحب عاقل کے زیر اہتمام منشی نول کشور کان پور کے پریس سے اپریل ۱۹۰۰ء میں دوسری مرتبہ کی چھپی ہوئی ہے۔ صاحب تصنیف سید محمد حسین علوی شیرازی ابن سید محمد ہادی عقیلی علوی نے اظہار کے لیے فارسی زبان اختیار کی ہے۔ یہ کتاب طب کے پانچ فنون پر مشتمل تمام بڑے اور اہم طبی مسایل پر محیط ہے۔ کتاب میں متقدمین و متاخرین حکما کے اقوال بھی ہیں۔ یہ کتاب مفردات و مرکبات کے موضوع پر ایک بیش بہا موتی سمجھی جاتی رہی ہے۔ صفحہ ۵۱۲ پر فصل القاف مع الواو میں یوں ہے۔

"قوفی بضم قاف و سکون واو و کسر فا ماہیت آن حیوان بحری شبیہ بصورت انسان ست در شکل و انفحہ آن در قوت مانند جند بادستر طبیعت آن گرم و خشک افعال و خواص آن خوردن گوشت آن جہت صرع و اختناق رحم نافع و فرق میان انفحہ آن و میان انفحہ حیوانات دیگر آنست کہ چون آب بر انفحہ حیوانات دیگر ریزند و بعد از زمانی آب آنرا بروی انفحہ آن ریزند بہ زودی آنرا بگداز دو آب گرداند بخلاف انفحہ حیوانات دیگر کہ این خاصیت ندارد"۔ صفحہ ۶۵۲ سے فرہنگ مخزن ہے۔

تحفۃ المومنین کے ساتھ مخزن الادویہ کا ایک دوسرا نسخہ بھی لمبی تقطیع میں منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے مارچ ۱۸۷۴ء مطابق محرم ۱۲۹۱ھ میں پہلی مرتبہ کا طبع شدہ موجود ہے۔ مخزن الادویہ کی جلد اول (۱۰۳۲ صفحات) ستمبر ۱۸۴۴ء میں حاجی محمد خاں شیرازی کے حسب ارشاد تیسری مرتبہ کی طبع شدہ ہے۔ جلد دوم کے دو نسخے موجود ہیں ان میں سے ایک نسخہ، ۶۴ سے پہلے کے صفحات کو کھو چکا ہے۔ اسی طرح ایک نسخہ اور بھی ہے جس کے اوراق انتہائی دیمک زدہ ہیں۔

۶۔ مجمع الجوامع ذخائر التراکیب

حکیم سید محمد حسین خاں کی یہ مجمع الجوامع قرابادین کبیر کے نام سے مشہور ہے۔ کتب خانے میں ۷۴۴ صفحات کی بوسیدہ اور خستہ حالت میں صرف جلد دوم موجود ہے۔ پھٹے ہوئے اوراق کی پیوند کاری دوسرے کاغذ سے اس طرح کر دی گئی ہے کہ کچھ سطریں اور جملے اس کی زد میں آ گئے ہیں۔ زیر نظر نسخہ فارسی زبان میں رمضان ۱۲۴۹ھ کا حسب ایما حاجی مرزا محمد مہدی اصفہانی طبع شدہ ہے۔

۷۔ قرابادین اعظم:

حکیم محمد اعظم خاں کی اس فارسی تصنیف کا زیر نظر نسخہ باہتمام محمد عبدالرحمٰن ابن حاجی محمد روشن خاں نظامی پریس کان پور سے ۲۸ جون ۱۸۹۳ء میں چھپ کر تیار ہوا۔ کتاب میں اطبائے متقدمین و متاخرین کے مجرب طبی نسخے جمع کیے گئے ہیں۔

۸۔ قرابادین احسانی

یہ حکیم احسان علی موہانی کی ۱۶۸ صفحات کی مفردات و مرکبات کے موضوع پر وہ تصنیف ہے جس میں غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے اور زبان کھڑی اردو ہے۔ پہلی مرتبہ منشی رام کمار بھارگو کے حکم سے زیر اہتمام کیسری داس سیٹھ اگست ۱۹۲۸ء میں مطبع نظامی سے چھپی ہے۔ پوری کتاب تین مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مقالہ کلیات ادویہ سے متعلق ہے۔ دوسرے مقالے میں دو فصلوں کے تحت ادویہ غذائیہ اور اغذیۂ دوائیہ سے متعلق حضور ﷺ کی قولی و فعلی احادیث نقل کی گئی ہیں۔ احادیث قولی میں سے ایک بطور نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ صفحہ ۳۲ کی پہلی سطر یوں ہے

بقر: فارسی۔ مادہ گاؤ۔ ہندی گائے ۔

فرمایا جناب رسول اللہ صلعم نے البقر لحمہا داءٌ و لبنہا دواءٌ۔ یعنی گوشت گائے کا موجب امراض ریحی و سوداوی کا ہے، دودھ اس کا دافع امراض سوداوی و حار کا ہے۔"

حاشیہ میں اس عبارت کا صحیح ترجمہ کر کے حدیث کا مرتبہ بتا دیا گیا "یہ حدیث نہیں ہے"۔ اسی طرح جہاں بھی حدیث کو نقل کیا ہے اس کی صحت و سقم کو بھی واضح کر دیا ہے۔ اخیر میں دواؤں کو بہ آسانی یاد کرنے کی خاطر ایک جدول تیار کی گئی ہے۔ اس کتاب میں اکثر نسخے اطبائے متقدمین کے منقول ہیں۔ قرابادین احسانی کا ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ایک دوسرا نسخہ بھی کتب خانے میں موجود ہے جو شعبان ۱۳۲۶ھ کا چھپا ہوا ہے۔

۹۔ حل المعضلات المشکلۃ فی اصول علم الادویہ

اسے محمد عبدالحلیم ابن حکیم حاجی مولانا محمد عبدالعزیز لکھنوی نے ۱۹ رجب ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا اور پہلی مرتبہ حکیم قاری سید قمر علی کی نگرانی میں فیض احمد پریس لکھنؤ سے ربیع الاول ۱۳۴۳ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ دراصل ملا سدید الدین جازرونی کی کتاب کی تشریح ہے عربی میں۔ زیر نظر نسخہ الفن الثانی (الباب الاول) کلام کلی فی الادویہ المفردہ سے شروع ہوتا ہے۔

۱۰۔ طب احسانی

حکیم احسان علی موہانی کی ۱۱۶ صفحات میں معالجات کی بہترین کتاب ہے۔ پوری کتاب میں ایک مقدمہ دس مقالے اور ایک خاتمہ ہے۔ مقدمے میں ہے "علم طب کا معدوم تھا۔ سب سے پہلے حکیم بقراط یونانی کو ملا اور حکیم جالینوس سے زندہ اور بہ زکریا رازی سے جمع اور بوعلی سینا سے مکمل ہوا۔" تیسرا مقالہ امراض اطفال کے سلسلے میں ہے اور خاتمہ میں ان اشیا کے خواص و مزاج کی بحث ہے جو ہندوستان میں بیشتر بطور غذا مستعمل ہیں۔ طب احسانی کے دو نسخے موجود ہیں ایک منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے حکیم خواجہ محمد حسن کے حواشی کے ساتھ باہتمام کیسری داس سیٹھ اپریل ۱۹۳۵ء میں چھٹی مرتبہ کا چھپا ہوا ہے اور دوسرا نسخہ بھی حواشی کے ساتھ مصطفائی پریس سے رجب ۱۲۸۱ھ میں بار سوم کا ہے۔ اوراق بہت ہی کرم زدہ ہیں۔ طب احسانی، قرابادین احسانی اور مجربات رضائی تینوں ایک ساتھ مجلد ہیں۔

[باقی آئندہ ماہ کے شمارے میں ملاحظہ فرمایئے]

ایک مکمل ہیلتھ ٹانک ، بلکہ اور بھی بہت کچھ !



سنکارا

آپ کی صحت کے لیے ایک بھرپور ٹانک

سنکارا لازمی عناصر، جڑی بوٹیوں اور وٹامنوں کا نادر مرکب ہے ۔ اس میں آئرن ، کیلشیم اور زنک کی کافی مقدار ہے ۔ اتنا ہی نہیں ، سنکارا میں الکحل بالکل نہیں ہے ۔ سنکارا آپ کی کس طرح مدد کرتا ہے ؟

اسکول جانے والے بچوں کے لیے :

سنکارا بھوک اور ذہنی توانائی بڑھانے میں مدد کرتا ہے ۔ اس کی وجہ ہے سنکارا میں موجود مقوی عناصر (بالخصوص زنک اور آیوڈین) جو دماغ کے خلیوں کو بڑی مقدار میں غذا فراہم کرتے ہیں ۔ یہ قوتِ حافظہ کی اصلاح بھی کرتا ہے ۔

حاملہ خواتین کے لیے :

سنکارا حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے ۔ اس میں ماں اور بچہ کی صحت کے لیے ضروری فولک ایسڈ ، وٹامن بی ۱۲ ، آئرن ، کیلشیم اور زنک کافی مقدار میں ہیں ۔

بالغوں کے لیے :

دباؤ اور تناؤ بھری اس دنیا میں سنکارا مہلک امراض سے حفاظت کا سب سے بہترین ذریعہ ہے ۔ سنکارا دورانِ خون کو معمول کے مطابق رکھنے اور جگر کے اطراف میں کثافتوں کے جمع ہونے سے روکنے میں مدد کرتا ہے ۔

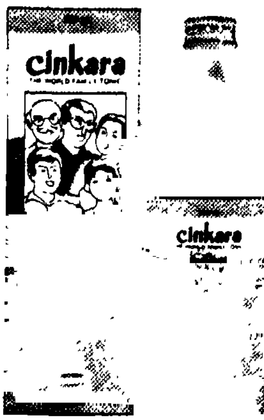
ضعیفوں کے لیے :

سنکارا ضعیفوں کے لیے قابلِ مثال اور طاقت بحال کرنے والا ٹانک ہے ۔ اعتدال میں کمی آجانے کے سبب پیدا ہونے والے امراض اور ضعیفی میں پریشان کرنے والی بیماریوں سے حفاظت کرتا ہے ۔ ان میں اکثر امراض کا سبب خراب اور غیر متناسب غذا ہے ۔

تو آج ہی سنکارا لے آئیے ۔ یہ پورے خاندان کے لیے قابلِ مثال صحت بخش ٹانک ہے ۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن ، کیلشیم ، زنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ ۔

Reputed brands of tonics	Iron (mg)	Calcium (mg)	Zinc (mg)	Alcohol content percent (V/V)	Contents per unit pack
1	–	12.4	–	12.00	400
2	–	–	–	11.0	240
3.	9.68	–	–	–	454
4	13.00	–	–	–	200
5.	21.50	–	0.00682	5.5	200
6.	16.709	–	–	–	300
7.	–	–	–	–	200
8.	7.63	–	0.50	–	100
9.	5.60	9.50	–	9.5	300
Cinkara	**20.00**	**19.07**	**2.00**	**Nil**	**500**



لازمی بنیادی عناصر ، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

ہمدرد

سنکارا

مشہور عالمی فیملی ٹانک ، ہر موسم میں سب کے لیے

جلد ۱۲

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ۹

ستمبر ۹۳ء

بانی ... سر سید احمد خانؒ

Phone: 24827

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

Editor, TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH. 202002

زر سالانہ :

انڈیا	Rs. 45·00
بیرونی ممالک ہوائی ڈاک	US $ 20·00
عام ڈاک	US $ 8·00

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ پبلشر: کبیر احمد جائسی۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق
اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ مطبع: اے ایم یو پریس۔ علی گڑھ

اداریہ

افسوس ہے کہ ۳۰ اگست کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک اولڈ بوائے اور استاد ڈاکٹر ممتاز علی خاں سابق ریڈر شعبۂ فارسی نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا اور مسلم یونیورسٹی کی اسی زمین میں استراحت فرما ہوئے جہاں اُن کے اساتذہ اور احباب پہلے ہی سے محو خواب راحت ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ممتاز صاحب ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ضلع ایٹہ کے ایک مشہور قصبۂ سہاور میں وہاں کے ایک بڑے زمیں دار احمد اللہ خاں صاحب مرحوم کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی تعلیم کے بیشتر مراحل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طے کیے۔ اسی درس گاہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے بعد ۱۹۶۳ء میں شعبۂ فارسی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ بیس برسوں تک اس شعبے کی آبیاری کرنے کے بعد ۱۹۸۲ء میں اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے نہ تو اپنی ملازمت میں توسیع کے لیے کوئی کوشش کی نہ ہی ماہانہ پینشن قبول کی جو اُن کا حق تھا۔ پینشن نہ لینے کی وجہ انھوں نے راقم الحروف سے یہ بتلائی تھی کہ جس درس گاہ نے اُن کو علم دیا، اپنے یہاں استاد بنا کر اُن کو پذیرائی کی، اُن کو عزت اور شہرت عطا کی، اس کو کچھ دینا چاہیے اس سے کچھ لینا نہیں چاہیے۔

ممتاز صاحب کا تعلق افغانوں کے اس قبیلے سے تھا جو بنگش کے نام سے معروف ہے۔ بنگش قبیلہ یا خاندان تمام افغانی قبائل میں ممتاز و افضل سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس خاندان کے ایک فرد یوسف علی خاں، سلطان محمود غزنوی یا اس کے لڑکے مسعود کے ساتھ وارد ہند ہوئے تھے۔ وہ جس سلطان کے ساتھ آئے تھے اُس کی فوج کے جنرل تھے۔ ہندوستان آتے ہی مذکورہ سلطان اور والیٔ بلرام ضلع ایٹہ راجہ بَل سے سخت جنگ ہوئی جس میں یوسف علی خاں کی حسن کارکردگی سے سلطان کو فتح نصیب ہوئی۔ اس کے صلہ میں سلطان نے ریاست سہاور اُن کو عطا کی اور وہیں قیام کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح بنگش افغانوں کا یہ قبیلہ سہاور ضلع ایٹہ میں آباد ہوا اور آج بھی آباد ہے۔

ممتاز صاحب کے اجداد میں ایک صاحب چودھری محمد علی خاں نام کے گزرے ہیں جو ایک بڑے تعلقہ دار اور نواب فرخ آباد کے گہرے دوست تھے۔ اسی گہری دوستی کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اُن پر مقدمہ چلا، اختتام مقدمہ پر اُن کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا اور سرکاری جائداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی جب ہر طرف امن و امان ہو گیا اور حکومت کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہو گیا تو ڈپٹی کلکٹر ایٹہ کی سفارش

پر چودھری محمد علی خاں صاحب کی جائداد کا ایک جز ان کے بڑے بیٹے چودھری نور اللہ خاں کے حق میں واگذار ہوا۔ یہ وہی جائداد ہے جس کے کچھ حصے ممتاز علی خاں صاحب کے حصے میں آئے تھے۔

ممتاز صاحب کا ننھیال وہ شیروانی خاندان ہے جس کے افراد اپنی بہت سی خصوصیات آج بھی باقی رکھے ہوئے ہیں۔ ممتاز صاحب کی والدہ صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کی صاحب زادی اور الحاج عبید الرحمٰن خاں شیروانی کی بہن تھیں۔ پٹھان اور شیروانی خونوں کی آمیزش سے ممتاز صاحب کا پیکر تیار ہوا تھا۔ ان کی شخصیت میں دونوں قبیلوں کے خصائص کی جھلک ملتی تھی اور یہ طے کرنا مشکل تھا کہ کون سی خصوصیت کس خصوصیت پر غالب ہے۔

میں ممتاز صاحب کا شاگرد رہا ہوں اور دو علمی کاموں میں ان کا معاون بھی۔ ۱۹۶۹ء میں جب ان کے دادا کے بھائی چودھری عبد الحمید خاں صاحب کی منظوم کتاب کنز الآخرت کا جدید ایڈیشن شائع ہو رہا تھا تو انھوں نے اس کی تصحیح کا کام میرے سپرد کیا تھا اور اس کام کا اس زمانے کے لحاظ سے ایک اچھا خاصہ معاوضہ بھی دیا تھا اس کتاب کی تصحیح میں خاصا وقت صرف اس لیے ہوا تھا کہ ممتاز صاحب ایک ایک لفظ کی بار بار تحقیق کرواتے اور جب تک ان کو یہ اطمینان نہ ہو جاتا کہ اب متن بالکل درست ہو گیا ہے آگے نہ بڑھنے دیتے۔ یہ ممتاز صاحب کی کدّ و کاوش ہی کا نتیجہ ہے کہ کنز الآخرت کی دوسری اشاعتوں میں کتابت و طباعت کی جو غلطیاں رہ گئی تھیں وہ سب کی سب دور ہو گئیں اور اس کے سارے اشکالات کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کے دوسرے علمی کام میں میں نے ۱۹۷۰ء میں معاونت کی تھی، جب ان کا تحقیقی مقالہ شائع ہو رہا تھا۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے اور اس کا انڈکس ممتاز صاحب نے مجھ سے بنوایا تھا اور حسب سابق اس کا معقول معاوضہ بھی دیا تھا۔

ممتاز صاحب بڑے خصوصی مزاج کے حامل تھے۔ ان کی زندگی بڑی منظم تھی اور تمام کام کے اوقات متعین تھے۔ ان کے جاگنے، سونے، کام کرنے اور ٹہلنے کے اوقات میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوتی اور کبھی کسی مجبوری کی بنا پر اوقاتِ کار میں تبدیلی ہو جاتی تو ان کو گراں گزرتا۔ وہ ایک محنتی اور مخلص استاد تھے۔ ڈاکٹر شمعون اسرائیلی صاحب کے شعبۂ فارسی سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے "متون" پڑھانے کا کام اپنے ذمّہ لے لیا تھا۔ وہ بڑی محنت سے قدیم و جدید متون کا درس دیتے اور اس کے لیے خاصی تیاری کرتے۔ جب تک ایک ایک لفظ کی تحقیق نہ کر لیتے آگے نہ بڑھتے۔ ڈیوٹی کے اتنے پابند تھے کہ علی گڑھ کی سردی میں بھی جب ان کا پہلا پیریڈ ہوتا تو وہ طلبا سے پہلے ہی کلاس میں پہنچ جاتے اور اگر ہم میں سے کسی کو کلاس میں آنے میں دیر ہو جاتی تو ہمارے دیر سے آنے پر اپنی ناگواری کا اظہار کرتے۔

وہ ایک باعمل مذہبی انسان تھے۔ اسی جذبے کے تحت وہ برسوں جماعت اسلامی ہند کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب ملک میں ایمرجنسی نافذ ہوئی تو جماعت اسلامی کے ارکان کو گرفتار کیا گیا تھا۔ علی گڑھ میں جو لوگ اس سلسلے میں گرفتار ہوئے تھے ان میں ممتاز صاحب بھی شامل تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ

جماعتِ اسلامی سے برگشتہ ہو چکے تھے۔ گرفتاری کے بعد اس بات کی بہت کوشش ہوئی کہ وہ جماعت سے مستعفی ہو جائیں تو اُن کو رہا کر دیا جائے مگر انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ انھوں نے قید و بند کے مصائب کو بڑی پامردی اور استقلال کے ساتھ جھیلا پھر رہائی کے کچھ عرصے کے بعد جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ نہ معلوم کیوں وہ جماعت سے اس طرح برگشتہ ہوئے کہ بارہا مجھ سے اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا تھا کہ عمر کا جو حصہ میں نے جماعت اسلامی میں گزارا تھا وہ رائیگاں ہو گیا۔

ادھر چند برسوں سے ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں جب ان کا مرض نہ آسکا تو انھوں نے اس کو وہم قرار دینا شروع کر دیا حالانکہ ان کو یہ خاص تکلیف آنکھوں کے سامنے تھی کہ بسا اوقات وہ اُٹھنے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ پاتے۔ علاج معالجہ تو سب کچھ ہوا مگر مرض کی اصل کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس طرح زندگی کے آخری چند سال گزارنے کے بعد وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی اہلیہ محترمہ، بچیوں اور صاحبزادوں صبغت اللہ خاں (ایڈوکیٹ الہ آباد ہائی کورٹ) بدل الرحمٰن خاں (استاد (10+2) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، منظر علی خاں (انجینیر مقیم ایران) اور امتیاز علی خاں (لکچرر انجینیرنگ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو صبرِ جمیل کی دولت سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین

دوسرا حادثہ پروفیسر محمد ہارون صاحب چیرمین سول انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ، انجینیرنگ کالج مسلم یونیورسٹی کا سانحۂ ارتحال ہے۔ پروفیسر ہارون صاحب Soil testing کے لیے شہر سے باہر ایک علاقے میں گئے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے کچھ افراد بھی تھے۔ واپسی میں ان کی جیپ اُلٹ گئی اور پروفیسر ہارون صاحب اس کے نیچے آگئے۔ جب جیپ سیدھی کی گئی تو وہ زندہ تھے۔ ان کو بہ عجلت تمام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں لایا گیا لیکن یہاں آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۵۲ سال تھی۔ یہ ۲۶؍ اگست کا واقعہ ہے۔ دوسرے دن ان کی تدفین یونیورسٹی کے قبرستان میں ہوئی۔ ہارون صاحب گوشہ نشین، خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان تھے۔ اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ان کی اہلیہ اور بچیوں کو صبر عطا کرے۔

بشیر احمد عباسی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۹ (ستمبر ۹۳ء)

خود غرضی اور قومی ہمدردی

سر سید احمد خاںؒ

پہلا لفظ تو بہت پُرانا ہے، مدت سے ہم سنتے چلے آئے ہیں، مگر یہ پچھلا لفظ شاید چند روز سے پیدا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یکم شوال ۱۳۰۱ نبوی کے بعد اس کی پیدائش ہوئی ہے۔ مگر ضرور ہے کہ پچھلے زمانے میں بھی اس کی جگہ کوئی اور لفظ بولا جاتا ہوگا۔

پچھلے زمانے پر جب ہم نگاہ کرتے ہیں تو قومی ہمدردی کی بہت سی نشانیاں پاتے ہیں۔ جدھر جاؤ ادھر ہزاروں کھنڈرات، مسجدوں اور پلوں اور کنوؤں اور مہمان سراؤں کو پاؤ گے۔ ہزاروں لاکھوں روپے لگا کر لوگوں نے قوم کے آرام کے لیے مہمان سرائیں بنوائی تھیں، مسجدیں بنوائی تھیں کنوئیں کھدوائے تھے، پل بنوائے تھے جن کے نشانات اب بھی پائے جاتے ہیں۔ سنہری مسجدیں بنوائیں جن کے بڑے بڑے بُرج سونے کے کام سے مغرق تھے۔ نرے سنگ مرمر کی مسجدیں بنوائیں جو موتی مسجدوں کے نام سے مشہور ہوئیں چینی کی کام دار سراؤں کے دروازے مسجدوں کے گنبد تیار کرائے جو آج تک اسی آب و تاب سے موجود ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کیسی بڑی بڑی عالی شان خانقاہیں تعمیر کیں، ان کے بنانے میں لاکھوں روپے خرچ کیے، دیہات معافی کی جاگیریں دے دیے جن کی لاکھوں روپے کی آمدنی قومی ہمدردی میں صرف ہوتی تھی۔ ہاں مدرسہ وغیرہ بنانے کا اس قدر خیال نہ تھا مگر پھر بھی مدرسے جاری کیے تھے۔ جب تاریخ کی کتابوں کی بہت تلاش کرو تو معلوم ہوگا کہ فیروز شاہ کے وقت میں کوئی مدرسہ تھا اور کچھ زیادہ نشان نہیں ملتا۔ دلی کے پرانے کھنڈرات میں تلاش کرو تو اکبر کے عہد میں ماہم انگہ کی بنائی ہوئی مسجد اور اس کے گرد کوٹھریاں پائی جاتی ہیں جس کو لوگ ماہم انگہ کا مدرسہ مشہور کرتے ہیں۔ غالباً اس میں چند لڑکے قرآن حفظ کرتے ہوں گے۔ نہایت مشہور اور پر رونق شاہ جہاں کے عہد میں بھی چند لداؤں کی کوٹھریاں شاید پچیس تیس ہوں جامع مسجد کے نیچے بنی ہوئی تھیں جو دارالبقا کے نام سے مشہور تھیں اور لوگ کہتے ہیں کہ شاہجہانی مدرسہ تھا اور غالباً جس قدر ادعیہ مثل ختم خواجگان و ختم بخاری اور ختم دلائل الخیرات واسطے سلامتی شاہ جہاں کے ہوتے تھے وہ سب اسی میں ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ مدرسوں کے بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ بہت سے طالب علم متفرق مسجدوں میں رہتے تھے۔ تیل بتی ان کو مطالعے کے لیے ملتی تھی۔ نذر و نیاز، مردوں کی فاتحہ، سویم، چہلم، بیماریوں کے صدقوں کی بہت روٹیاں مسجدوں کے طالب علموں

کو مل جاتی تھیں۔ ان کا نمونہ ہمارے زمانے تک بھی موجود تھا
فتح پوری اور پنجابی کٹرا اور کشمیری کٹرا کی مسجدوں اور شاہ
عبدالعزیز صاحب کے مدرسے اور حضرت شاہ غلام علی
صاحب کی خانقاہ میں سے بہت سے طالب علم مردوں کی روٹیاں
کھانے اور فاتحہ درود پڑھنے کو ملتے تھے۔ اب بھی قومی ہمدردی
میں کچھ کسر نہیں ہے۔ دیکھو اس گئے گزرے زمانے میں
بھی مسلمانوں نے کیسی ہمت کی ہے۔ کس قدر روپیہ خرچ
کرکر جامع مسجد دہلی کی مرمت کی ہے۔ دلی کی پرانی عیدگاہ
کا چبوترا بڑھایا جاتا ہے اس کا فرش درست کیا جاتا ہے
تاکہ قوم کو نماز پڑھنے میں زمین کا اچان نیچان تکلیف
نہ دے۔ سہارنپور میں دیکھو کئی لاکھ روپیے خرچ
کرکر جامع مسجد نئی بنائی ہے اور پرانی مسجد کو چھوڑ دیا
ہے۔ دیوبند میں دیکھو کیسی عالی شان مسجد بنائی جاتی
ہے۔ اس زمانے میں اگلے زمانوں سے بھی زیادہ مدرسے
جاری ہوتے جاتے ہیں۔ دیکھو پنجاب میں کتنے مدارس اسلامیہ
جاری ہوئے۔ دہلی میں اسلامی مدرسہ جاری ہوا، لکھنؤ
میں مدرسۂ اسلامیہ قایم ہوا۔ دیوبند کے مدرسے کا
تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ افتخار العلماء و فخر الکملا امام اعظم عہد
شیخ زماں و صاحبین دوراں مدرس و مہتمم ہیں۔ پھر
سہارنپور میں، انبیٹہ میں مدارس اسلامیہ موجود ہیں۔
غرض کہ بہت سی جگہ مدارس جاری ہیں۔ پھر قومی ہمدردی
کے لفظ کو نیا لفظ کہنا صحیح نہیں۔ ہاں شاید یہ ترکیب لفظی
نئی ہو۔ مگر اسی مضمون کا پہلے بھی ضرور کوئی لفظ ہوگا جو ہماری
یاد سے جاتا رہا ہے۔ جب کہ ہم یہ باتیں سنتے اور خیال کرتے
ہیں تو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ بے شک ہم لوگوں
میں قومی ہمدردی قدیم سے چلی آتی ہے۔ اور اب بھی بہت
پائی جاتی ہے مگر جب زیادہ غور کرکے دیکھتے ہیں تو وہ
سب دھوکا ہی دھوکا پایا جاتا ہے (قطع نظر اس بحث کے
کہ یہ کام قوم کو مفید ہیں اور قوم کو اس کی ضرورت ہے
یا اس سے زیادہ اور چیزوں کی ضرورت ہے) جب ان لوگوں
کے جنھوں نے یہ کام کیے اور کر رہے ہیں دل سے پوچھو تو
معلوم ہوگا کہ وہ یہ تمام کام اس خیالی جوش میں کر رہے
ہیں کہ ہم بڑے ثواب کے کام میں معروف ہیں اور ثواب
کی گٹھریاں باندھ رہے ہیں۔ مرتے ہی یہ سب کام ہم کو
بہشت میں لے جاویں گے اور بہشت میں بڑے بڑے
درجے پاویں گے۔ تاج ہمارے سر پر ہوگا اور ایک موتی
کا محل جنت میں ملے گا، حوریں تصرف کو ہوں گی جن
کو ہمارے سوا کسی نے چھوا بھی نہیں ہوگا۔ پھر ان کی تعداد
چار پر بھی محدود نہ ہوگی۔ بے انتہا جتنی چاہو۔ غلمان بھی
نہایت خوب صورت معلوم نہیں تصرف یا خدمت کو ملیں
گے۔ باغ ہوگا، میوہ ہوگا، نہریں ہوں گی، شراب ہوگی
پئیں گے اور چین کریں گے اور کہا کریں گے کہ حافظ نے
کیسا غلط یہ شعر کہا تھا ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

ہم بھی نہایت ادب اور صدق دل سے کہتے ہیں کہ
یہ سب کچھ ہوگا۔ خدا ہم کو بھی نصیب کرے، مگر
یہ تو فرمایئے کہ یہ سب کام خود غرضی کے ہیں یا قومی ہمدردی
کے۔ کوئی کہے، میں تو نہ مانوں گا کہ یہ کام قومی ہمدردی
کے ہیں۔ یہ تو بالکل ایسے ہی کام ہیں جیسے کہ ایک رند
مشرب دنیا میں اپنی عیشوں کے حاصل کرنے کو کرتا ہے
اس میں اور ان میں اتنا فرق ہے کہ انھوں نے نقد
کو نسیہ پر چھوڑا ہے اور دوسرے جہان میں ان عیشوں
کے حاصل کرنے کی لالچ سے یہ کام کیے ہیں۔ غور کرنے کی
بات ہے کہ باغبانوں سے اپنے چین کے لیے مزدوری
دے کر باغ لگوانا، مزدوروں کو مزدوری دے کر اپنے
آرام کے لیے محل چنوانا۔ کلال کو دام دے کر اپنی عیاشی
کے لیے شراب کھچوانا اور علاوہ اس کے روپیہ خرچ

کر کر سامانِ عیش اور لذائذ نفسانی کا جمع کرنا کیا قومی ہمدردی گنی جاوے گی؟ نعوذ باللہ ہرگز نہیں۔ یہ تو عین خودغرضی ہے۔ پھر وہ باتیں جو ثواب کے لالچ سے کی جاتی ہیں کیوں قومی ہمدردی گنی جاویں گی اور اگر ہم سے پوچھو تو ثواب بھی نہیں۔ "گدھے کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پُن"۔

اسلام کا صحیح مسئلہ یہی ہے کہ اسی کام کے کرنے میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہے۔ دیکھو کوئی اجر ہجرت سے زیادہ نہ تھا جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ فتح مکہ کے بعد کچھ بھی نہ تھا۔ جیشِ اسامہ کی تیاری کے لیے جو چار ٹکے کا اسباب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر اب اس کی برابری کوہ احد کے برابر سونا بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سچا اصول مذہب اسلام کا ہے مگر کوئی بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا۔

قوم کی حالت اور اسلام کی حرمت کیسی ہی خراب ہوتی جاوے اس کے اسباب پر غور کرنے اور اس کے رفع کرنے کا کسی کو خیال نہیں ہے۔ اپنے خیال کے مطابق جو اپنے ثواب اور دوسرے جہان میں اپنے چین کرنے کا کام سمجھتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ پھر کس طرح خیال ہو سکتا ہے کہ وہ قومی ہمدردی کے کام ہیں بلکہ ٹھیٹ خودغرضی ہے اور امید ہے کہ وہ بھی حاصل نہ ہوگی۔

"ہمیں چاہیے کہ اپنے بچوں کو ایسی تربیت دیں کہ ان کا ردِعمل جذباتی ہونے کے بجائے عقلی، ان کی گفتگو پرجوش ہونے کے بجائے مدلل ہو۔ وہ سادہ دلی سے ہر بات کو باور کرنے کی جگہ تحقیق کے خوگر ہو جائیں، ہر بات ہر افواہ، ہر دعویٰ کو پہلے عقل کی کسوٹی پر پرکھیں پھر اس پر یقین کریں"

سید حامد

دوسروں سے کیجیے امید کیا؟

سید حامد *

عنوان سے آپ یہ مفہوم نکالیں گے کہ دوسروں پر تکیہ کرنے، ان کی راہ دیکھنے کے بجائے ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ جو مشکلیں ہماری راہ میں آئیں انھیں خود حل کرنا چاہیے کہ جواں مردی کا تقاضا اور زندہ رہنے کا طریقہ یہی ہے۔ جو لوگ دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں، انھیں اپاہج بنتے دیر نہیں لگتی بھروسہ صرف اسی پر کرنا ہے جس نے ہمیں پیدا کیا اور جو ہمیں پروان چڑھاتا ہے، ہماری حفاظت کرتا ہے اور اس پر بھروسہ کرنے اور اس کا شکر کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اس نے ہمیں جو طاقتیں اور صلاحیتیں دی ہیں ان پر زنگ نہ لگنے دیں۔ انھیں اپنی اور دوسروں کی بھلائی کے لیے استعمال کریں، زندگی کا اصول بھی یہی ہے اور عبادت کا ڈھنگ بھی یہی۔ آلیور کرامویل کی یہ بات دہرانے لائق ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرو اور بارود کو خشک رکھو۔ بارود سے مراد ہے طاقت، صلاحیت، چوکسی، تیاری۔ جو لوگ دوسروں پر تکیہ کرتے ہیں، عمل کی طاقت آہستہ آہستہ ان سے چھن جاتی ہے، حوصلے اور ارادے سے وہ محروم ہو جاتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو نشو و نما دینے اپنے کردار کو مضبوط کرنے اور خلق خدا کی خدمت کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو جو پروردگار نے دی ہیں گرم عمل رکھیے۔ انسان کو اللہ نے اپنی شبیہ میں بنایا ہے۔ اس کے امکانات بے کراں ہیں، لامحدود ہیں۔ یہ ظالم اور جاہل ان امکانات کے عشر عشیر کو بروے کار نہیں لاتا۔ طرح طرح کے سہارے اور کاہلی اور بے عملی اور خودشکنی کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے۔ جو افراد یہ راہ اختیار کرتے ہیں وہ منزل پر پہنچنے سے بہت پہلے کمھلا جاتے ہیں۔ وہ اُن لوگوں سے جن پر وہ بھروسہ کرتے ہیں ہر قدم پر دھوکا کھاتے ہیں۔ لہٰذا معیار دانش یہی ہے کہ دوسروں سے امید نہ کیجیے، امید اپنے قویٰ سے کیجیے اور اس خدا سے کیجیے جس نے آپ کو اُن طاقتوں سے لیس کیا ہے۔

جس اصول اور جس لائحۂ عمل کا ذکر اوپر آیا ہے، اس کی حیثیت قطب نما کی ہے لیکن منہاج

---

* سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ تغلق آباد، ہمدرد نگر، نئی دہلی

جو بات کہنے چلا تھا وہ دراصل اس سے قدرے مختلف تھی۔ اس مصرع کو جسے میں نے عنوان بنایا ہے دوسرے ڈھنگ سے پڑھیے تو میری نیت کھل جائے گی میرا مدعا واضح ہو جائے گا۔ پہلی بار (یعنی پہلے پیراگراف کے نقطۂ آغاز کے طور پر) جب ہم نے یہ مصرع پڑھا تھا تو استفہام کا رُخ امتناعی تھا یعنی دوسروں سے ہرگز امید نہ رکھیے۔ اب جو ہم وہی مصرع پڑھیں گے تو دوسرا ہی مفہوم نکلے گا۔ یعنی بہت سی باتیں زندگی میں ایسی ہیں جن میں ہم دوسروں سے امید رکھ سکتے ہیں (ہر چند کہ ان پر تکیہ نہیں کر سکتے) ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان سے جائز طور پر ہم کیا امیدیں رکھ سکتے ہیں اور اگر ان میں سے کچھ امیدیں پوری نہ ہوں تو ہمارا رُخ ان لوگوں کے تئیں کیا ہونا چاہیے۔ کیا اس بنا پر کہ وہ پورے طور پر ہماری امیدوں اور خواہشوں کے مطابق نہیں ہیں۔ ہمیں ان سے ناطہ توڑ لینا چاہیے۔ کیا ایسے لوگوں سے ہم کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ کیا ہم اپنے دل میں ان کے لیے سدا شکایت اور کدورت کو سلگائے رکھیں۔

جی چاہ رہا تھا کہ اس بات کی پرتیں نجی یا انفرادی امیدوں کے تجزیے سے کھولی جائیں لیکن اس طرح بات بڑھ جائے گی۔ اس لیے میں براہ راست نفسِ مضمون پر آتا ہوں یعنی ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان کے دوسرے فرقوں اور جماعت کے افراد سے کیا امید رکھنی چاہیے۔ کیا وہ صرف ان فرقوں کو (یا افراد کو) اپنا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھیں جو ہمارے زاویۂ نگاہ سے ہر بات میں اتفاق کرتے ہوں۔ کیا ہم ان لوگوں کو دشمن سمجھ بیٹھیں جو ہماری بعض باتوں کو پسند نہیں کرتے؟ کیا ہم ان افراد کو جو ہمارے بعض عقاید یا اعمال یا فیصلوں کے نکتہ چین ہیں، متعصب مان کر چلیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ ان سارے سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ ہمارے دوسرے مذاہب والے اہلِ وطن اگر ہماری ہر بات ہر عقیدے کو صحیح مانتے تو مشرف بہ اسلام کیوں نہیں ہو جاتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے سوچنے کا ڈھنگ ہمارے سوچنے کے طریقے سے بہت مختلف ہوگا۔ تہذیب کا تقاضا بھی یہی ہے کہ سب ایک رنگ میں نہ رنگ جائیں چمن میں رنگ رنگ کے پھول کھلیں۔ ہمیں یہ بات شروع سے ہی مان لینی چاہیے کہ اس وسیع ملک کی کثیر آبادی میں بیشتر افراد کو مسلمانوں کی بہت سی باتوں، عقیدوں اور طریقوں سے اختلاف ہوگا۔ کیا ہم ان سب کو اپنا دشمن اور بدخواہ مان کر چلیں۔ ایسا کرنا بڑی نادانی کی بات ہوگی۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ جو ہم سے سو فی صد اتفاق نہیں کرتا وہ ہمارا دشمن ہے، ہمارا برا چاہتا ہے۔ اس قسم کے طرزِ فکر سے ہمیں بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہم بالکل الگ تھلگ ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے ہمیں شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جس شخص پر اس کے گھر میں شبہ کیا جائے اس کو خدا ہی بچائے۔ یہ ہمارا فرض بھی ہے کہ جو شبہات ہماری بابت راہ پا گئے ہیں ان کو نرم استدلال سے دور کریں لیکن یہ ایک الگ ہی موضوع ہے جس پر آگے کسی صحبت میں بات ہوگی۔

اس وقت تو میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ہم ان لوگوں کی تلاش میں سر نہ کھپائیں جو ہر بات میں ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ ایسے لوگ ہمیں نہیں ملیں گے۔ مرحوم مالک رام اور جگن ناتھ آزاد جیسے لوگ آپ کو کہاں دستیاب ہوں گے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ جن لوگوں سے ہمارا واسطہ ہے، جن افراد کو ہم پرکھنے چلے ہیں وہ نسبتاً فراخ دل اور روشن خیال اور انسان دوست ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو ہم ان کی قدر کریں ان کو اپنے دل میں تھوڑی سی جگہ دے دیں، کم از کم ان کو شبہ کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ میری دانست میں ہمارے

وطن میں ایسے افراد بہت سے ہیں۔ بہت سے افراد کے دل و دماغ اور خواب وخیال، وابستگی اور التفات، ہمدردی اور خیر اندیشی کا دسواں حصہ ہمیں مل جائے یہ اس سے بہت بہتر ہے کہ تھوڑے افراد بالکل ہمارے ہو جائیں۔ روشن خیالی کی قید کو بھی تھوڑی دیر کے لیے ہٹا دیجیے اس کی جگہ وہ بھلمنساہت اور رواداری رکھ دیجیے جو ہندوستان کی پرم پرا رہی ہے تو دسویں حصّے کے حساب سے کروڑوں نا مسلمان ہمارے ہمدرد اور مددگار نکلیں گے۔

سامنے کی مثال کیوں نہیں لیتے۔ ایودھیا اور اس کے خوں ریز شاخسانوں کے تعلق سے ہندوستان کے انگریزی پریس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ اتنا اونچا میعار غیر جانب داری کا شاید ہی کسی دوسرے ملک میں دیکھنے میں آیا ہو۔ اب یاد کیجیے کہ یہی اخبار اور یہی صحافی بعض اہم مسایل میں ہم سے شدید اختلافات رکھتے تھے۔ شاہ بانو کیس اور یکساں سول کوڈ کے مسئلہ میں انھوں نے مسلمانوں کے مسلک پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ کیا اس وجہ سے ہم ان کو اپنا دشمن مان لیں اور ان کی ساری ہمدردیاں ہاتھ سے جانے دیں۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہمیں جہاں بھی روشنی کی کرن نظر آئے اسے بڑھ کر لپک لیں۔ جو پہلو اچھائی اور خیر اندیشی کا دکھائی دے اسے حرزِ جاں بنالیں۔ رواداری اور روشن خیالی کے سلسلے میں جو کچھ ہمدردیاں ہمیں نصیب ہوں ان کو سینے سے لگالیں۔ کوشش یہ کریں کہ ہماری جن باتوں کے خلاف وہ لوگ ہیں جو بعض دوسرے امور میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں، یاد دے چکے ہیں، ان کو ہم اپنا نقطۂ نظر سمجھائیں۔ اگر جن باتوں پر اعتراض ہوا ہے وہ دین کی بنیادی باتیں نہیں ہیں تو ہم خود ان پر نظر ثانی کریں اور اگر وہ بنیادی باتیں ہیں تو ہمیں اپنے نکتہ چینوں کے روبرو ان کی وضاحت کریں۔

امید اتنی ہی کرنی چاہیے جتنی جائز ہو، قوانین قدرت اور انسانی فطرت کے مطابق ہو۔ اس سے زیادہ امید رکھنا بصیرت اور تجربے کے منافی ہوگا۔ یہ روش اختیار کی تو مایوس ہونا پڑے گا اور بدد لی تعلقات کے لطف کو کرکرا کر دے گی اور دوست دشمن کی تمیز ناممکن ہو جائے گی۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہمدردی اور رواداری کے جو اپنے وطن کے دل میں ہمارے لیے ہیں، انھیں بٹورے، جمع کیجیے اس کی میزان لگائیے تو حیرت میں رہ جایے گا کہ اتنا بڑا جمِ غفیر ہمارے ساتھ ہے جس کی دسترس دولت تک ہو وہ کنگال کیوں بنا رہے۔

❖ ❖ ❖

> "سیّد احمد خاں اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت میں چلے گئے، دیکھو ہماری قومی عمارت کے ستون ہل رہے ہیں، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس وقت طاقتِ گویائی کہاں سے لاؤں۔
>
> علامہ شبلی نعمانی

قدرت کی سب سے پیچیدہ مشین

محمد زکریا ورک *

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (من عرف ربہ فقد سکت)" کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ مضمون ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ م۔ ز۔ و

قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے انسانی دماغ ایک ایسی پیچیدہ مشین ہے جس کا سمجھنا انسان کے لیے ابھی تک ایک عقدۂ لاینحل بنا ہوا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں لوگ دل کی حرکت ختم ہونے پر ہر انسان کو مردہ تصور کرتے تھے مگر جدید طبی سائنس کے مطابق دل کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ دماغی موت (برین ڈیڈ) کا واقع ہونا بھی ضروری گردانا جاتا ہے۔ انسانی دماغ کے عجائبات میں سے ایک ناقابلِ بیان اور ششدر کر دینے والی چیز اس کی برین پاور ہے۔ برین پاور کی وجہ سے انسان نے گاڑی کے انجن، لیزر آلات سے لے کر ایٹمی ہتھیار تک بنائے ہیں ہر روز، ہر آن دنیا میں نت نئی ایجادات منصۂ شہود پر آ رہی ہیں۔ انسان میں جستجو کا شوق قدرت نے ابتدائے آفرینش سے ایسا رکھا ہے کہ پارے کی طرح انسان بیقرار رہتا ہے۔ ہر وقت پوری مستعدی کے ساتھ یہ دماغ قدرت کے راز جاننے میں مصروف کار ہے، دیکھنے میں یہ ہے کیا؟ صرف ۴۶ اونس گوشت کا لوتھڑا۔

انسانی دماغ کی محیر العقول طاقت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دماغ کو سمجھنا یا اس کے راز جاننا خدا کو سمجھنے یا خدا کے راز یعنی فطرت کو جاننے سے کم نہیں ہے۔ یہ گوشت کا لوتھڑا جس میں خون ذرہ برابر بھی نہیں ہوتا ہے بجلی کی لہروں سے کام کرتا ہے اور اس کو چلانے کے لیے بجلی کی صرف ۲۰ واٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۲۰ واٹ سے گھر میں بجلی کا بلب بھی روشن نہیں ہوتا ہے۔

انسانی دماغ میں یادداشت کا حصہ ایک جزو لاینفک ہے۔ ہمارا دماغ ۱۰۰ بلین بٹ کی معلومات کا ذخیرہ اپنے اندر اسٹور کر سکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک

---

* کنگسٹن، کینیڈا۔

برٹش انسائیکلوپیڈیا کے اول و آخر تمام مضامین کے حروف ابجد سے ۵۰۰ گنا زیادہ معلومات کا ذخیرہ دماغ میں اسٹور ہو سکتا ہے۔ ہماری یاد داشت ۱۰۰ بلین نیوران (NEU-RON) اور ۱۰۰ ٹریلین کنکشنوں کی مرہون منت ہے۔

انسانی دماغ بچپن سے لے کر بلوغت تک تو سائز میں قدرے بڑھتا رہتا ہے مگر بلوغت سے لے کر ۶۵ سال کی عمر تک یہ سائز میں سکڑنا شروع ہو جاتا ہے اور وزن میں قریب ایک اونس کم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسانی دماغ اربوں خلیوں cells سے بنا ہوا ہے اور روزانہ قریب تیس ہزار سے پچاس ہزار تک خلیے ضایع ہو جاتے ہیں۔ جسم کے دوسرے حصوں کے سیل بھی روزانہ ضایع ہوتے ہیں، مگر قدرت کے نظام کے مطابق یہ سیل خود بخود دوبارہ پیدا ہوتے رہتے ہیں جب کہ دماغ کے سیل دوبارہ پیدا نہیں ہوتے ہیں۔

بیس سال سے لے کر ۲۹ سال تک انسان کی یاد داشت عروج پر ہوتی ہے مگر اس کے بعد یہ زوال پذیر ہونا شروع ہو جاتی ہے، بڑے بڑے نامور سائنس دانوں نے جو سائنس کی تھیوریز پیش کیں یا دریافتیں کیں اس وقت ان کی عمر بیس سال سے لے کر ۲۵ سال کے درمیان تھی، اس ضمن میں آئزک نیوٹن اور آئن اسٹائن اور ڈاکٹر عبدالسلام کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارا دماغ غیر معمولی قسم کی انفارمیشن مختلف حصوں میں اسٹور کرتا ہے چنانچہ ایک مدت تک یاد رہنے والی باتیں ذہن سے مٹتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھے لوگوں کو پرانی باتیں تو آسانی سے یاد آجاتی ہیں مگر صبح ناشتے میں کیا کھایا تھا وہ یاد نہیں رہتا ہے۔

پانچ عدد سے سات عدد تک کا ہندسہ انسان آسانی سے یاد رکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر فون نمبر چھ سے سات عدد کے ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل نمبر پر پانچ سکنڈ کے لیے نظر دوڑائیں اور پھر دیکھیں اس میں سے آپ کو کیا یاد رہتا ہے۔

۶۱۴۹۲۰۸۱۳۰۶۰۵۳۸۱۵

شارٹ ٹرم میموری صبح کے وقت دوپہر کی نسبت ۱۵ فی صد زیادہ ہوتی ہے جب کہ لانگ ٹرم میموری دوپہر کے وقت زیادہ ہوتی ہے۔

فوٹو گرافک میموری لوگوں میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ کم سن بچوں میں یہ عموماً زیادہ ہوتی ہے جوں جوں بچے عمر میں بڑے ہونا شروع ہوتے ہیں اور زبان پر عبور حاصل کرنا شروع کرتے ہیں فوٹو گرافک میموری ضایع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ انگلستان کے مشہور تاریخ دان ٹامس میکالے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قدرت نے انھیں فوٹو گرافک میموری سے وافر رنگ میں نوازا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے علم تاریخ پر بہت ساری کتابیں بغیر کسی ریفرنس بک کے تحریر کیں۔ مزید براں یہ کہ وہ ایک کتاب کا مکمل باب لفظ بہ لفظ صرف ایک بار پڑھنے کے بعد زبانی سنا سکتا تھا۔ ایک دلچسپ اور عجیب واقعہ اس بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے ایک دوست کے ساتھ شرط کو جیتنے کے لیے مشہور کتاب Paradise Lost کو صرف ایک رات میں زبانی یاد کر لیا تھا۔

یادداشت کا ریکارڈ

دنیا میں یادداشت اور رفقید المثال حافظہ کا ریکارڈ رنگون برما کے ایک شخص Bhamdanta Vicittasara کے سر ہے اس نے مئی ۴، ۱۹ء میں بدھ مت کی مقدس کتاب سے ۱۶۰۰۰ صفحات زبانی تلاوت کیے۔

امریکہ میں ۹۵ فی صد لوگ ، ۵.۱ [illegible]

ایک سو تیس تک نمبر حاصل کرتے ہیں۔ I.Q میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کا ریکارڈ میسوری اسٹیٹ کے شہر سینٹ لوئیس (St. Louis) کی دس سالہ لڑکی Marilyn Jarvik کے سر ہے جس نے ۲۲۸ نمبر حاصل کر کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ اتنی ذہانت کے لوگ دس لاکھ میں سے صرف ایک شخص ہوتا ہے۔ انسان جب سوچ رہا ہو تو خون کی گردش دماغ کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔

آئن اسٹائن کا دماغ

انسانی دماغ اپنی صفائی خود بخود لگاتار کرتا رہتا ہے اور یہی صفائی اور نفاست درحقیقت دماغ کی سُپر پرفارمینس کا راز ہے۔ اس صفائی سے مراد یہ ہے کہ جب دماغ کے نیوران بیماری زخم یا بڑھاپے سے مر جاتے ہیں تو یہ مردہ نیوران زندہ نیوران میں یوں گھل مل جاتے ہیں گویا زندہ نے مردہ کو کھا لیا ہو یوں دماغ کی Main-tenance مسلسل ہوتی رہتی ہے۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں ایک ریسرچ سائنس داں نے آئن اسٹائن کے لیبارٹری میں محفوظ دماغ پر تجربات کر کے اس بات کا پتہ لگایا ہے کہ آئن اسٹائن کے دماغ میں نیوران Neuro Glial Cells عام انسان کی نسبت ۷۳ فی صد زیادہ تھے۔

دنیا میں تجربات سے اور مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ بہت سارے لوگ I.Q کے ٹیسٹ میں تو کم نمبر حاصل کرتے ہیں مگر وہ ایک خاص مضمون جیسے ریاضی، میوزک یا آرٹ میں بہت خداداد قابلیت رکھتے ہیں ایسے لوگ ذہنی طور پر کمزور ہوتے ہیں مگر ایک خاص علم میں مہارت کے باعث ان کو Idiot Savant کہا جاتا ہے۔

ایسے خبطی لوگ "عالم فاضل یعنی Idiot Savant کیوں ہوتے ہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ ایسے لوگوں کے دماغ کے نصف بائیں حصہ کو پیدائش سے قبل دوران حمل یا پیدائش کے دوران چوٹ لگ جاتی ہے، چنانچہ بائیں حصہ دماغ کو دائیں حصہ کی نسبت پرورش پانے میں زیادہ دیر لگتی ہے۔ اس دوران دایاں نصف حصہ بڑا ہو جاتا ہے اور بعض صورتوں میں تو یہ Over Develop ہو جاتا ہے اور یوں ایسے دماغ والے انسان کی دماغی صلاحیتیں مافوق الفطرت انسان کے برابر ہوتی ہیں۔

گی نس بک آف ریکارڈ کے مطابق دماغ کے حجم اور ذہانت میں کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ عام آدمی (۲۰ سے ۵۵ سال تک) کے دماغ کا وزن تین پاؤنڈ اور ۲۰۲ اونس ہوتا ہے جو عمر بڑھنے سے گر کر تین پاؤنڈ اور ۱۰۱ اونس تک آ جاتا ہے۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو امریکہ کی ریاست فلوریڈا کے ایک ڈاکٹر Thomas Hegert چیف میڈیکل آفیسر ڈسٹرکٹ نمبر ۹ نے ایک پچاس سالہ آدمی کے دماغ کا موت پر وزن کیا تو یہ چار پاؤنڈ ۸۰۲۹ اونس نکلا۔ آج تک کسی انسان کا اس وزن کا دماغ نہیں دیکھا گیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ انسانی دماغ رفتہ رفتہ وزن میں بڑھتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۶۰ء میں انسانی دماغ کا وزن عموماً تین پاؤنڈ ۵۰۴ اونس ہوتا تھا جو کہ ۱۰۰ سال گزرنے کے بعد تین پاؤنڈ ۲۰۲ اونس ہو گیا ہے۔ عورتوں کا دماغ اوسطاً ۲ پاؤنڈ اور ۱۰۸ اونس ہوتا ہے جو کہ اب ۲ پاؤنڈ ۲۰۶ اونس تک بڑھ گیا ہے۔

بعض انسانوں کے دماغ ریاضی کے سوالات حل کرنے کے معاملے میں سپر کمپیوٹر کے مشابہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ بھارت کی ایک خاتون شکنتلا دیوی نے لندن امپیریل کالج میں ۸ جون ۱۹۸۵ء کو مندرجہ ذیل ہندسے کو اپنے دماغ میں ضرب دے کر کمپیوٹر سے پہلے جواب

پیش کر کے شکست دے دی

۷,۶۸۶,۳۶۹,۷۷۴,۸۷۰

×

۲,۴۶۵,۰۹۹,۷۴۵,۷۷۹

تفنن طبع کی خاطر اس سوال کا جواب یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۸,۹۴۷,۶۶۸,۱۷۷,۹۹۵,۴۲۶,۴۶۲,۷۷۳,۷۳۰

غبی لوگ:

دنیا میں عورتوں کی نسبت غبی انسانوں کی نسبت مردوں سے کم ہوتی ہے۔ دنیا میں ہونے والے چند ایک "مافوق الفطرت" انسانوں کے واقعات یہاں بیان کیے جاتے ہیں۔

△ جارج اور چارلس جڑواں بچے تھے جو مدت حمل سے تین ماہ قبل پیدا ہوئے تھے ان کو incubator میں ۶۰ روز تک رکھا گیا۔ بچپن میں ہی یہ دونوں بچے ذہانت و فطانت میں دنیا کے لیے ایک اچنبھا تھے۔ یہ بچے چند سکنڈ میں بتلا سکتے تھے کہ ۴۰,۰۰۰ سال قبل فلاں تاریخ کو کون سا دن تھا اور ان کی زندگی میں کس روز کیسا موسم تھا وہ یہ بھی بتلا سکتے تھے کہ ایک سے لے کر تین سو تک کیسے گنا جا سکتا ہے مگر جب ان کو ضرب یا تقسیم نفی کرنے کا پوچھو تو اُن کو کچھ نہیں آتا تھا۔ جب ڈاکٹروں نے ان جڑواں بچوں کے جسم کو آپریشن کر کے علیحدہ کر دیا تو ان کی یہ صلاحیت اور حیران کن یادداشت معدوم ہو گئی۔

۱۹۲۰ء میں ایک آدمی جس کا نام کتابوں میں صرف 'K' سے آتا ہے۔ اس کی عمر ۳۸ سال تھی مگر اس کی ذہنی عمر صرف گیارہ سال تھی مگر اس کی یادداشت بہت زبردست تھی۔ اس کی ایک قابلیت یہ تھی کہ امریکہ کے ہر شہر کی آبادی جو پانچ ہزار سے زیادہ تھی اس کی کل آبادی اس کو یاد تھی پھر ہر صوبے کے دارالحکومت کا نام، تحصیل کا نام، تحصیل کی آبادی اس کو یاد تھی۔ امریکہ کے ۲۰۰۰ ہوٹلوں کے نام، ان کے جائے وقوع ایڈریس اور ان کے کمروں کی تعداد اس کو یاد تھی۔

△ ایلونزو کلے مینس Alanzo clemens کو تین سال کی عمر میں گرنے سے دماغ پر چوٹ آئی اور اس کا I.Q صرف چالیس تھا مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایلونزو مٹی سے گھوڑے گائے یا کتے کے sculptors اتنی حیرت ناک تفصیل سے بناتا تھا کہ گویا اصل جانور سامنے کھڑا ہو آج اس کے بنائے ہوئے sculptors تین ہزار امریکی ڈالر سے ۴۵,۰۰۰ ڈالر تک فروخت ہوئے ہیں۔

△ ایک امریکی خاتون Leslie Lemke جو آنکھوں سے نابینا تھی اور Mentally Retarded تھی اس میں موسیقی کی ناقابل یقین صلاحیت پائی جاتی تھی وہ Piano بڑے سلیقے سے حیران کن طریقے پر بجاتی تھی۔ وہ کسی بھی میوزک نوٹ کو ایک بار سن کر دوبارہ بجا لیتی تھی۔ اسے نئے نئے میوزک نوٹ چشم زدن میں یاد ہو جاتے تھے۔

△ اٹھارویں صدی میں ایک شخص Jedediah Buxton کے نام کا گزرا ہے۔ اس کو لوگ بجلی کا کیلکولیٹر کہا کرتے تھے۔ جب اسے ریاضی کا کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ دیا جاتا تو وہ اسے فوراً حل کر دیتا۔ مثلاً ایک دفعہ اس سے پوچھا گیا کہ ایک چیز میں کتنے کیوبک ایک انچ کے ہوں گے جب کہ اس مذکورہ چیز کے تین اطراف ہوں۔ درج ذیل سوال کا جواب جو ۲۸ ہندسوں پر مشتمل تھا اس نے فوراً دے دیا

۲۳,۱۴۵,۷۸۹ × ۵,۶۴۲,۷۳۲ × ۵۴۹۶۵

دماغ کی ساخت

انسانی دماغ دو حصوں میں بٹا ہوا ہے جن کو Hemisphere کہا جاتا ہے۔ دائیں طرف کا دماغ جسم کے بائیں طرف کو کنٹرول کرتا ہے جب کہ دماغ کا بائیں طرف کا حصہ جسم کے دائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔ دماغ کے دونوں حصے ایک دوسرے سے بالکل مشابہت رکھتے ہیں۔ دونوں حصوں میں سے اگر ایک کو چوٹ آ جائے تو انسان میں بہت ساری Disabilities پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس چیز کی وضاحت کے لیے دماغ کے دونوں حصوں کا Function یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

لیفٹ برین ڈیمیج

وہ لوگ جن پر فالج کا حملہ ہوتا ہے وہ عموماً قوت گویائی سے محروم ہو جاتے ہیں کیوں کہ دماغ کے بائیں حصے کے مفلوج ہونے پر خون کی گردش جسم کے اس طرف ہونا بند ہو جاتی ہے۔ دماغ کا وہ حصہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے اور جس کا نام Left frontal Cortex ہے اس کو اگر کسی وجہ سے نقصان یا چوٹ آ جائے تو چہرے کے Muscle زبان، جبڑا اور حلق میں تعاون مفقود ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک اور حصہ جس کا نام Wernick's Area ہے جو Auditory cortex سے ذرا آگے موجود ہوتا ہے اس کو اگر چوٹ آ جائے تو انسان کی بول چال کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے اور اگر لفظ منہ سے بگڑ بگڑ کر ادا ہوتے ہیں۔

جس شخص کے دماغ کے بائیں حصے کو چوٹ آئے اور چاہے وہ بولنے سے محروم ہو جائے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسا شخص بڑی آسانی سے ترنم سے گا سکتا ہے کیونکہ گانے کی صلاحیت کا تعلق دماغ کے دائیں حصے سے ہوتا ہے اگر Auditory cortex اور Wernick's Area کے درمیان کنکشن کو نقصان پہنچے تو انسان الفاظ کی پہچان (Word-Deafness) سے محروم ہو جاتا ہے۔ یعنی ایسا شخص پڑھ لکھ اور بول تو سکتا ہے لیکن کوئی اس سے بولے تو وہ ادا ہونے والے لفظوں کو سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔

دماغ کے بائیں حصے کو نقصان پہنچنے پر اکثر لوگ معروف انسانی ناموں کو دہرانے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ دماغ کا دایاں حصہ لوگوں کے چہروں کو پہچانتا ہے لیکن نام بائیں حصے میں کنٹرول ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ نارمل لوگ بھی ایک شخص کے معروف چہرے کو دیکھنے پر اس کا نام یاد کرنے پر دقت محسوس کرتے ہیں اور بعض کف افسوس ملتے ہیں کہ میں نے اس کو کہیں دیکھا ہے لیکن نام یاد نہیں آ رہا ہے۔

رائٹ برین ڈیمیج

دماغ کے دائیں حصے کو چوٹ لگنے پر لوگ اکثر معمولی سے معمولی معمہ یا سوال کو حل کرنے میں دقت محسوس کرتے ہیں یا ان کو شہر کا نقشہ دیکھ کر سڑک کا راستہ معلوم کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے ایسے لوگ بعض کسی بڑی عمارت یا آفس بلڈنگ میں جا کر گم ہو جاتے ہیں جب کہ وہ بعض دفعہ اپنے گھر میں بھی گم ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں میں دیکھا گیا کہ ایسے لوگوں نے کھانے کے دوران پلیٹ میں سے صرف دائیں طرف سے کھایا اور بائیں طرف کا بالکل چھوڑ دیا یا جب وہ صبح کے وقت شیو کرنے لگے تو چہرے کے دائیں طرف شیو کی اور بائیں طرف بالکل بھول گئے۔ جب ایسے لوگوں سے کہا جائے کہ گھڑی کی تصویر بنائیں تو انھوں نے گھڑی کا صرف دایاں حصہ بنایا۔ ایک مریض کو جس کا دائیں طرف کا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کرتا تھا اسے بائیں بازو کا احساس

رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ ان واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دائیں طرف کا حصہ دماغ تصاویر بائیں آنکھ سے بناتا ہے اور پھر ان کے مطابق جسم کے دوسرے اعضا کام کرتے ہیں۔

Right brain processes images from the left eye.

ایسے لوگ جن کو یہ مرض لاحق ہو جائے اگر ان میں سے کوئی موسیقار ہو تو بعض اپنا آلہ موسیقی بجانا بھول گئے اور بعض جو گلوکار تھے وہ گانا بھول گئے۔

یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں میں چہرہ پہچاننے کی قابلیت ختم ہو گئی۔ اس مرض کا نام Prosopagnosia ہے۔ بعض شدید صورتوں میں مریض اپنا چہرہ پہچاننے سے بھی محروم ہو گئے۔ ہاں بعض مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ دوست کا چہرہ نہ پہچانا جائے گا مگر جوں ہی دوست نے بولنا شروع کیا تو نام اور چہرہ فوراً یاد آ گیا۔ یاد رہے کہ آواز پہچاننے کی قابلیت دماغ کے بائیں حصے میں ہوتی ہے۔

لوگ بائیں ہاتھ سے کیوں لکھتے ہیں۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جو لوگ بائیں ہاتھ سے لکھتے اور کام کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دورانِ حمل ایسے لوگوں کے دماغ کو ذرا سا نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس نقصان کی وجہ سے دماغ کو آکسیجن کی کمی ہوتی ہے۔ جڑواں بچوں میں اعصابی بیماریوں کا ہونا عام بات ہے۔ کیوں کہ رحم کے اندر ان کی پرورش کے لیے جگہ کم ہوتی ہے اور ایسے جڑواں بچے اکثر لیفٹ ہینڈڈ "Left handed" ہوتے ہیں۔

جو لوگ Mentally Retarded ہوں یا جو مرگی کے مریض ہوں اور وہ بچے جن میں سیکھنے کی صلاحیت کم ہو Learning Disability ایسے بچے اکثر بائیں ہاتھ والے ہوتے ہیں۔

دنیا کے بعض بڑے بڑے مشاہیر اور نامور انسان بائیں ہاتھ والے تھے۔ لیونارڈو ڈے ونچی، مائیکل اینجلو، بنجمن فرینکلن اور صدر امریکہ جارج بش اور بل کلنٹن۔

بائیں ہاتھ والے لوگوں کو مندرجہ ذیل امراض لاحق ہوتے ہیں:

سر درد، الرجی، ہکلانا اور پڑھنے میں دقت۔ Migraine, Allergies, Dyslexia-Stuttering, Thyroid, Disorders

بائیں ہاتھ والے لوگ فالج جیسی بیماریوں سے جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بولنے کے لیے ایسے لوگ دماغ کے دونوں حصوں کو زیادہ استعمال کرتے ہیں جب کہ دائیں ہاتھ والے لوگ دماغ کا بایاں حصہ بولنے کے لیے کم استعمال کرتے ہیں

دماغ یا میڈیکل اسٹور۔

انسانی دماغ ایک محیر العقول اور نت نئی دوائیوں کا کارخانہ ہے۔ محیر العقول اس لیے کہ یہ اپنے اندر خود بخود پچاس سے زیادہ دوائیاں مینوفیکچر کرتا ہے۔ یہ دوائیاں ہماری یادداشت، ذہانت سونے، جاگنے، سوچنے، جارحانہ مزاج نیز تخلیقی (creativeness) کے مختلف پہلوؤں کو کنٹرول کرتی ہیں۔ ایسی چند معروف دوائیوں کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں کیا جاتا ہے۔

اینڈورفین Endorphin

یہ دوائی دماغ کے اندر بنتی ہے اور درد کم کرنے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ فائدگی

میں اس کا متبادل مورفین دوائی ہے مگر اینڈورفین
طاقت میں تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ یہ درد ختم کرنے
والی دوائی دماغ سے اس وقت خارج ہوتی ہے
جب ہم ورزش کرتے یا ہنستے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ
ہم جب جی بھر کر ہنستے ہیں تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس
کرتے ہیں۔

سیروٹونین (Serotonin) یہ دوائی انسان
کے موڈ کو کنٹرول کرتی ہے جن لوگوں کے دماغ میں یہ
دوائی کم پیدا ہو۔ ان کو ڈپریشن واقع ہو جاتا ہے
جو لوگ ایسے کھانے کھاتے ہیں جن میں کاربوہائیڈریٹ
زیادہ ہوں وہ پھل اور مختلف سبزیاں کثیر مقدار
میں کھاتے ہوں ان میں یہ دوائی مناسب مقدار میں
موجود ہوتی ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض افراد
جنھوں نے زندگی میں کوئی قتل کیا تھا۔ ان کے دماغ
کا جب لیبارٹری میں مشاہدہ کیا گیا تو دیکھنے میں آیا
کہ ان کے دماغ میں سیروٹونین عام انسانوں کی نسبت
کم مقدار میں تھی جو لوگ ڈپریشن کے مرض کا شکار ہوں
ان کا علاج ڈاکٹر سیروٹین سے کرتے ہیں۔

ڈوپامین (Dopamine)

اس دوائی کی کثرت انسانی کو جوشیلا اور
باتونی بنا دیتی ہے۔ امریکہ کی اسٹین فورڈ یونیورسٹی
میں ریسرچ کے دوران یہ بات مشاہدے میں آئی کہ
جو لوگ شرمیلے ہوتے ہیں ان میں ڈوپامین کی مقدار
کم تھی۔

بھوک کو جو ہارمون کنٹرول کرتا ہے اس کا
نام cholesystokinen ہے۔ لیبارٹری میں چوہوں
پر تجربات کے دوران یہ بات مشاہدے میں آئی ہے
کہ جن چوہوں کے جسم میں یہ دوائی کم تھی ان کو بھوک
بہت لگتی تھی اور جو چیز ان کے سامنے آئی اس کو
ہضم کر جاتے تھے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ مستقبل
قریب میں اس دوائی کے انسانی جسم میں زیادہ پیدا
کرنے یا گولی کی صورت میں جسم میں داخل کرنے سے
موٹاپے کا علاج کیا جا سکے۔

چائے اور کافی انسانی دماغ کے خاص حصے
Cerebral cortex پر بہت جلد اثر انداز ہوتی
ہے۔ کافی پینے سے یک سوئی Concentration
یادداشت کے بڑھانے نیز ری ایکشن ٹائم یک لخت
پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔

انسانی دماغ کے اندر ایک لاکھ سے زیادہ
کیمیائی رد عمل ہر وقت وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں
ان کی بنا پر جسم کی توانائی کا ایک کثیر حصہ استعمال
ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سوچنے اور دماغ
سوزی کرنے میں اتنی ہی کلوریز calories ضائع
ہوتی ہیں جتنی کہ عام ورزش کرنے سے۔ شاید یہی وجہ
ہے کہ انسان اگر دیر تک سوچ بچار کرتا رہے تو تھکاوٹ
محسوس کرنا ایک فطری بات ہے۔

اگر خون میں آئرن کی کمی ہو تو دماغ کو آکسیجن
کم مقدار میں ملتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یک سوئی
(concentration) اور توجہ کا عرصہ - Atten-
tion span انسان میں کم ہو جاتا ہے
اور بعض لوگ تو چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ماحول
کی فضا میں اگر کیڈمیم cadmium / یا سیسہ
lead زیادہ مقدار میں موجود ہو تو سانس لینے کے
عمل سے یہ دونوں دھاتیں ہمارے دماغ پر اثر انداز
ہوتی ہیں۔ کیڈمیم سگریٹ کے دھویں اور سیسہ کار
کے ایگزاسٹ exhaust پائپ میں سے
نکل کر فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ اس لیے سگریٹ
اور کار کے دھوئیں سے پرہیز مناسب ہے۔ ورزش

کرنے سے جسم کو آکسیجن ۳۰ فی صد زیادہ ملتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری دماغی اہلیت Mental efficiency قدرے بڑھ جاتی ہے۔

دماغ کی مسلّم الثبوت موت کب واقع ہوتی ہے؟ لیبارٹری میں کیے جانے والے تجربات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دماغ کی وفات انسان کے مرنے کے ۳۰ گھنٹے بعد واقع ہوتی ہے۔ اتنے گھنٹے ہمارا دماغ (Electrical wave Signals) بجلی کی لہر دل کے سگنل پیدا کرتا رہتا ہے

دماغ ایک فارمیسی

دماغ کے اندر چند ایک پیدا ہونے والی معروف دوائیوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

1. Acetyl choline
2. Norepine-Phrine
3. Seron-Tonin
4. Dopa-Mine
5. Glutmate Gamma
6. Aminobutyric Acid
7. Endorphins
8. Enkephalins

دماغ پر ریسرچ اور تحقیقات کے بعد مندرجہ ذیل علوم کا بیسویں صدی میں اضافہ ہوا ہے۔

1. Neurology.
2. Psycho Biology.
3. Neuro-Surgery
4. Psychiatry.

سر کے اندر پانی کا ایک عجیب واقعہ

کینیڈا کے موقر روزنامہ گلوب اینڈ میل ٹورنٹو نے اپنی ۳۰ دسمبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں ایک عجیب و غریب واقعہ شائع کیا ہے۔ انگلستان کی یونیورسٹی آف شیفیلڈ University of Sheffield میں ایک اسٹوڈنٹ کا طبّی معائنہ یونیورسٹی کا ایک میڈیکل ڈاکٹر کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس طالب علم کا سر ضخامت میں کافی وسیع و عریض تھا۔ ڈاکٹر نے سر کی پیمائش کی تو وہ ½۲۴ نکلا۔ ڈاکٹر کو بہت پریشانی ہوئی۔ اس چیز کا ذکر اس نے ایک اور ڈاکٹر جان لوبر John Lober سے کیا جو کہ نیورالوجسٹ تھا۔ دوسرے ڈاکٹر نے اس دماغ کا اسکین Scan کیا تو سر کے اندر پانی بھرا ہوا تھا۔ اس مرض کو طبّی زبان میں Hydro-cephalus کہا جاتا ہے جس کے عام معنی یہ ہیں سر کے اندر پانی، اس اسٹوڈنٹ کے سر کے اندر دماغ کا معمولی سا Cerebral Tissue تھا۔ اس مرض کے لوگ عموماً Mentally Retarded ہوتے ہیں مگر یہ نوجوان نارمل زندگی گزار رہا تھا۔

دماغ میں مقناطیس کے ذرّے

کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی۔ پاسا دینا Pasadena میں ماہرین نے انسانی دماغ کے اندر بالکل ویسے ہی مقناطیس کے ذرے پائے ہیں جیسے کہ ماہرین نے پرندوں اور جانوروں کے دماغ میں پائے تھے۔ کبوتر، سالمن مچھلی اور وہیل مچھلی کے دماغ میں مقناطیس کے ذرّے اس حد تک پائے جاتے ہیں کہ وہ اس کی بنا پر زمین کی مقناطیسی فیلڈ کے اندر اپنا راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔ یہ چیز قدرت نے ان پرندوں اور جانوروں کی فطرت میں ودیعت کی ہوئی ہے جو کہ اب انسان کے دماغ کے اندر بھی حتمی طور پر دریافت ہوئی ہے۔

کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ کے ایک اسکالر کرش ونک Kirschvink کا کہنا ہے کہ یہ مقناطیس کے

ذرے دماغ کے اندر کیا خاص رول ادا کرتے ہیں۔ نیز یہ خلیے کہ اندر کہاں چھپے ہوتے ہیں۔ یہ بات ابھی زیر تفتیش ہے۔ ہاں اس سے ایک عقدہ حل کرنے میں ضرور آسانی ہوئی ہے کہ دماغ کے سرطان اور بجلی کی بڑی بڑی تاروں اور کھمبوں کے پاس رہنے والے گھروں میں جو Electro-Magnetic Field پیدا ہوتی ہے۔ اس کا اثر انسانی جسم پر کیا ہوتا ہے۔ نیز یہ امر دماغ کا سرطان پیدا کرتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دماغ میں مقناطیسی کے ذروں اور بجلی کی لہروں سے جو ردعمل پیدا ہوتا ہے وہ دماغ کے خلیوں کو تہس نہس کر دیتا ہے؟ نیز گھروں کے اندر فرج، الیکٹرک استری، واشنگ مشین، مائیکرو ویو سے جو E.M.F پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سرطان سے کیا تعلق ہے؟ مغربی ممالک میں ماہرین اس بات کا شدت سے لوگوں میں یہ احساس پیدا کر رہے ہیں کہ بچوں کو ٹیلی وژن ۱۰ فٹ کے فاصلے سے دیکھنا چاہیے۔ بہت سے بچوں کی نظر کیوں کمزور ہوتی ہے اس کا ٹیلی وژن سے کیا تعلق ہے؟ اس بات کا حتمی ثبوت ابھی نہیں ملا ہے۔

کبوتروں اور انسانی دماغ میں موجود مقناطیس کے پارٹیکلز کا حجم اگر ایک جیسا ہو تو بات حیران کن ہوگی کہ یہ ذرے قطب نما کا کام کیسے کرتے ہیں؟ مقناطیس کے جو ذرے انسانی دماغ میں پائے گئے وہ مقناطیسی دھات کے تھے۔ ان کو لوڈ اسٹون Lodestone بھی کہا جاتا ہے۔ ان ذروں کا سائز ۱/۱۰،۰۰۰،۰۰۰ انچ تھا۔ شاید ان کے چھوٹے سائز کی وجہ سے اس سے پہلے ان کی دریافت نہ ہو سکی۔ یہ ذرے یوں تو دماغ کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ مگر سب سے زیادہ ان کا جھرمٹ دماغ کے Meninges میں پایا گیا۔ مزید معلومات کے لیے ٹورنٹو اسٹار کا ۱۱ مئی ۱۹۹۲ء کا شمارہ مطالعہ کریں۔

دماغ کے مختلف حصوں کا کام

عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ ہماری روح دماغ میں سکونت پذیر ہوتی ہے۔ انسانی دماغ تین حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔

1. Cerebrum. 2. Cerebellum.
3. Brain-Stem.

پڑھنے لکھنے کی اہلیت، ذہانت اور ججمنٹ Cerebrum میں مقیم ہوتے ہیں۔ یہ دماغ کے اوپر کا حصہ ہے۔ Cerebellum کا سائز Cerebrum کا 1/8 ہوتا ہے۔ دماغ کے دوسرے حصے کی وجہ سے ہم اپنا توازن برقرار رکھتے ہیں نیز پٹھوں سے کام لیتے ہیں۔ برین اسٹیم جسم کے اندر بھوک پیاس نیند وغیرہ کو ریگولیٹ کرتا ہے۔

دماغ کا ایک حصہ جب دوسرے کو کوئی پیغام بھیجتا ہے تو اس مقصد کے لیے دو قسم کی انرجی استعمال ہوتی ہے۔ ایک تو الیکٹریکل اور دوسری کیمیکل۔ ایک سیل سے دوسرے سیل تک پیغام Neuro-Transmitter کے ذریعے جاتا ہے شروع میں پیغام بجلی کے ذریعے سفر کرتا ہے مگر اپنی منزلِ مقصود تک یہ کیمیکل پاور کے ذریعے پہنچتا ہے۔

انسان صرف آنکھ سے نہیں دیکھتا ہے۔ دیکھنے کے لیے آنکھ اور دماغ دونوں کا آپس میں رابطہ رکھنا ضروری ہے۔ آنکھ باہر کی دنیا کی انفارمیشن لے کر دماغ تک پہنچاتی ہے۔ اس کے بعد ہمارا دماغ اس انفارمیشن کو مختلف رنگوں میں Process کرتا ہے۔

دماغ کے دونوں Hemisphere اسپیشلائزڈ کام سرانجام دینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس لیے

ایک حصہ اگر علیل ہو جائے تو یہ دوسرے حصہ کا ہرگز متبادل نہیں ہو سکتا ہے۔ مثلاً دماغ کا بایاں حصہ اگر اسٹروک سے مفلوج ہو جائے تو انسان قوتِ گویائی کھو بیٹھے گا۔ کیونکہ بایاں حصہ بولنے کی اہلیت کو کنٹرول کرتا ہے۔ بایاں حصہ Rational, Logical & Emotional حصہ ہوتا ہے جب کہ دایاں حصہ Analytical Holistic & Intuitive ہوتا ہے۔

کیا انسان الفاظ کے بغیر سوچتا ہے؟

البرٹ آئن اسٹائن نے ایک بار کہا تھا کہ وہ الفاظ کے جانے کے بغیر سوچتا ہے۔ اس کے سوچنے کا عمل کلیر امیجز clear images میں ہوتا تھا جو وہ اپنے دماغ کے اندر Manipulate کرتا تھا۔

انسان کے نروس ہونے کا تعلق دماغ سے براہ راست ہے۔ انسان نروس ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یا معدے میں طوفانِ نوح برپا ہو گیا ہو۔ نروس ہونے کا ماخذ دراصل ہمارے اعصاب ہیں مثال کے طور پر اگر آپ کو ٹیلی ویژن پر کوئی رات گئے یہ بات کہے کہ آپ کو ایک بہت بری خبر ملنے والی ہے تو یہ پیغام ہمارے دماغ میں سے Adrenal Gland کو جاتا ہے اور Epinephrine کی دوا ہمارے دوران خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ ہمارا دل دھک دھک کرتا ہے۔ دماغ میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ انسان بے چینی سے ٹہلتا ہے۔ اس صورت حال میں مبتلا انسان کو نروس کہتے ہیں۔

جب ہارمون ہمارے خون میں شامل ہوتے ہیں تو چند منٹ کے لیے تو وہ ایکٹیو رہتے ہیں۔ چاہے اس کے مابعد فون پر شخص یہ کہے کہ میں تو صرف مذاق کر رہا تھا۔ اس بات کے باوجود کہ وہ شخص مذاق کر رہا تھا ہمارا جسم نروس رہتا ہے۔ کیونکہ خیال عمل جتنا طاقتور ہوتا ہے

A Thought Is As Powerful As a deed

ایک دانا شخص نے یہی بات ایک اور رنگ میں نہایت حکمت سے یوں کہی ہے

Words Are Clothes That thoughts wear

دماغ کا نروس سسٹم ہماری تمام Activities کو کنٹرول کرتا ہے۔ جیسے جسم کا حرکت کرنا، جسم کے اندر کے اعضا دل، کلیجہ، تلی کا کام کرنا۔ ہمارے جذبات کا دارومدار نروس سسٹم پر ہوتا ہے۔ اس سسٹم کے دو حصے ہوتے ہیں:

۱۔ سینٹرل نروس سسٹم جس میں دماغ اور ریڑھ کی ہڈی شامل ہے۔

۲۔ بیرونی نروس سسٹم جس میں سومیٹک (Somatic) اور آٹومیٹک سسٹم شامل ہیں۔ سومیٹک سسٹم سے ہم باہر کی دنیا سے تعلق برقرار رکھتے ہیں۔ جب کہ آٹومیٹک کے ذریعے جسم کے اندر کی دنیا پر کنٹرول برقرار رکھا جاتا ہے۔ جیسے سانس لینا، پیشاب کرنا، پسینہ آنا، خوف طاری ہونا وغیرہ وغیرہ۔

کیا عورتوں اور مردوں کے دماغ ایک جیسے ہوتے ہیں؟ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ دونوں دماغ ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ ان میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ پیدائش سے پہلے جس طرح "میل ہارمون" اور "فی میل ہارمون" پیدائش کے تناسل کو ڈیولپ کرتے ہیں، بعینہٖ یہی ہارمون دماغ کی ساخت اور حجم پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

ڈالس لیکسیا Dyslexia کی بیماری
جن لوگوں کو لاحق ہوتی ہے وہ لفظ SAW کو WAS پڑھتے
ہیں اور OIL کو '710' دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگ تتلاتے
بھی عام ہیں۔ بائیں ہاتھ والے لوگوں میں اس بیماری کا ہونا
اچنبھے کی بات نہیں ہے۔

دماغ کی تصویر بنانے سے متعلق ٹیکنالوجی اب اس
قدر ترقی کر چکی ہے کہ اب ایکس رے، ریڈیو ایکٹیوٹی اور
ریڈیو ویو کے ذریعے دماغ کی اعلیٰ رنگ میں تصاویر بنائی
جاسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں جو مشین استعمال کی جاتی ہیں
ان میں سے (Computerized Axial Tomogra C.A.T
(Positron Emission Tomography) P.E.T اور phy (
قابل ذکر ہیں۔ دماغ کا نقشہ بنانے کے لیے یا اگر دماغ
میں رسولی یعنی ٹیومر پیدا ہو جائے تو ایسی ٹیومر کا سائز جائے
مقام اور مزید باتیں جاننے کے لیے یہ مذکورہ Sca-
nners بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

برین ویو

دنیا میں برین ویو کا تصور ۱۹۲۹ء میں جرمن نفسیات
داں ہانس برگر Hans Berger نے پیش کیا۔ اس نے
دماغ میں بجلی کا موجود ہونا ریکارڈ کیا۔ پھر ۱۹۳۲ء میں
برطانوی فزیالوجسٹ ایڈگر ایڈریا Edgar Adria
کو اس بات پہ نوبل پرائز عطا ہوا کہ اس نے ایسی دماغی
ایکٹیویٹی کا Demonstration کے ذریعے ثبوت
مہیا کیا۔ آج کے زمانے میں ہر کوئی یہ بات تسلیم کرتا ہے
کہ دل کی طرح دماغ بھی بجلی کی کرنٹ متواتر پیدا کرتا ہے
دل کی نسبت دماغ میں بجلی کے کرنٹ قدرے خفیف
ہوتی ہے مگر اسے (Electro-Encephalo Graph)
E.E.G. کے ذریعے ریکارڈ کیا جاسکتا ہے۔ E.E.
G. سے زیادہ ایڈوانس مشین جو اب ایجاد ہوئی ہے اس
کا نام BEAM ہے یعنی Brain Electrical Activity

سائنس داں کہتے ہیں کہ برین ویو چار قسم کی ہوتی ہے
الیفا Alpha بیٹا Beta ڈیلٹا Delta اور
تھیٹا Theta انسانی برین ڈیڈ کب ہوتا ہے؟ اگر
ایک انسان کے حواس خمسہ میں سے چھونے اور آواز کی
حس جاتی رہی۔ نیز اس کا جسم حرکت نہ کرے نیز اعضا کام
نہ کریں سانس بند ہو گیا ہو EEG منفی میں ہو تو ایسا
شخص برین ڈیڈ قرار دیا جائے گا۔

الیزھائمر ALZHEIMER سے بچاؤ۔

سائنس دانوں نے تازہ تحقیقات جو الیزھائمر بیماری
کے بارے میں کی ہے اس کے مطابق اس بیماری سے بچاؤ
کا بہترین علاج اور دفاع کتابیں اخبار پڑھنا، لکھنا
ریاضی کے سوال حل کرنا ہے۔ نیز ہر وہ ایسا عمل جس سے
دماغ کا استعمال ہو۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ لوگ
جو تعلیم یافتہ تھے۔ ان میں اس بیماری کا کم ہونا فطری امر ہے
پڑھنے لکھنے سے دماغ کے استعمال سے دماغ کے
اندر ایک فطری دفاعی نظام پیدا ہو جاتا ہے جس سے
اس بیماری کا پیدا ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹی آف
کیلی فورنیا سان ڈیگو کے پروفیسر رابرٹ کاٹزمین (Ro-
bert Katzman) نے اپنی تحقیق پر جو مضمون رسالہ
Neurology میں شائع کیا ہے اس کے مطابق ہمارے
دماغ کو فطرت نے یوں بنایا ہے کہ "Use it or Lose it"
ہمارا دماغ جس چیز سے سیکھتا سوچتا اور یاد رکھتا ہے اس چیز کا
نام Synapse ہے جو کہ درحقیقت دو خلیوں کے درمیان
کنکشن کا نام ہے۔ اس کنکشن کی وجہ سے ہمارے خلیے
آپس میں کمیونیکیٹ کرتے ہیں۔ اگر انسان پڑھتا لکھتا رہے
تو یہ Synapse مضبوط رہتے ہیں۔ اگر انسان پڑھے
لکھے نہیں تو یہ کنکشن غیر استعمال سے کمزور ہو جاتے
ہیں اور انسان کو الیزھائمر ہو جاتا ہے۔

گھر کا ماحول اور تعلیم

محمد اسحاق*

بہت عرصے پہلے ایک ضلع کے مستقر پہ لائبریری ویک' منایا گیا، جس میں کلکٹر، ضلع کے عہدہ دار، شہری اور وکلا شریک تھے۔ اس احقر کو اس جلسے میں کچھ کہنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ وہ بچہ بڑا ہی بدقسمت ہے جو اپنے گھر میں کوئی کتاب، رسالہ یا اخبار برسوں میں کبھی دیکھ نہیں پاتا۔ اسی زمانے میں ضلع پریشد کے چیرمین نے ایک خوب صورت مکان پہاڑی پر نیا نیا تعمیر کروایا تھا۔ اس مکان کے ہر کمرے میں فرش پر خوبصورت الماریوں میں کھلونے، آرائش و زیبائش کی چیزیں سجی ہوئی تھیں لیکن کسی الماری میں کوئی کتاب نہ تھی۔ میرا اسی طرف اشارہ تھا کہ دولت مند لوگ خوب صورت، عالی شان مکانات تعمیر کرتے ہیں لیکن وہاں کوئی ایک الماری کتابوں کے لیے نہیں ہوتی۔ اس گھر میں کالی داس یا شیکسپیر، ٹیگور، غالب یا اقبال کا کہیں گزر نہیں ہوتا۔ بہت سی ایسی شاہکار کتابیں ہیں جو ہمارے تہذیب و تمدن کے ہزاروں میل کے سفر کو چند برسوں میں مختصر کر دیا۔ جو بچے ان گھروں میں پرورش پا کر بڑے ہوتے ہیں وہ اپنے تہذیبی ورثے اور مشاہیر کے شاندار علمی کارناموں سے بے خبر رہ جاتے ہیں۔

جس گھر کے بڑے اکثر فلمی رسالے، جاسوسی ناول اور ادنیٰ قسم کا لٹریچر پڑھتے ہیں وہی بچوں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ بعض طلبا ان رسالوں کو چھپا کر اپنے ساتھ اسکول لاتے ہیں۔ کلاس روم میں آٹھ دس طلبا ان رسالوں کی تصاویر دیکھنے یا پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ گھنٹہ ختم ہوجاتا ہے اور کیا سبق پڑھایا گیا وہ ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ گاندھی جی نے لکھا ہے کہ فحش لٹریچر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب اس کا چسکا لگ جائے تو پڑھنے والا فحش سے فحش ترین لٹریچر کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔

ہمارے علم میں ایک بزرگ ایسے بھی ہیں جو روزانہ کسی پان کی دکان سے جاسوسی ناول کرایہ پر لاکر پڑھتے جب تک وہ جاسوسی پنجہ ختم نہ ہوجاتا انھیں چین نہ آتا۔ یہاں تک کہ باتھ روم میں بھی وہ کتاب ان کے ساتھ ہوتی اور وہ مطالعے میں مصروف رہتے۔ اس شوق کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ ان کے بچے بڑے ہوگئے۔ گھر کے ماحول کی مجرمانہ فضا کا اثر ان کے اخلاق

* ریٹائرڈ پرنسپل، جاوید منزل، مکان نمبر ۱۱-۴-۶۱۴، حیدرآباد۔

اور آداب پر پڑے بغیر نہیں رہا۔ ان کے بچے اونچی کرسیوں تک پہنچ جانے کے بعد بھی ان کے قول و فعل سے یہ سارے برے اثرات آج بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

جس گھر کا ماحول پڑھے لکھے لوگوں کا ہوتا ہے وہاں پر بچوں کے برتاؤ، اٹھنے بیٹھنے، بات چیت کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذہانت و صلاحیت کے مطابق ترقی کرتے ہیں۔ کسی اعلیٰ ملازمت کے لیے جب یہ انٹرویو کے لیے آتے ہیں تو ان کے اچھے خاندان اور ماحول کے اثرات صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ جاہل خاندان کے امیدواروں کو پہچان لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ دراصل ہندوستان میں پسماندہ طبقات، شیڈولڈ کاسٹ کو اگر واضح تحفظات نہ دی جاتیں تو آئی۔ اے۔ ایس میں ہر سال ان طبقات کے شاید ایک دو افراد ہی منتخب ہو سکتے جب کہ ہر سال ۱۵۰ سے زاید امیدواروں کی کھیپ منتخب ہو جاتی ہے۔

گھر کے ماحول میں پڑھنے کے لیے بچوں کے لیے علیحدہ کمرے، میز، کرسی، روشنی، ہوا اور پرسکون فضا کی سخت ضرورت ہے۔ ان خاندانوں کے بچے جو تنگ و تاریک گھروں میں یا صرف ایک ہی کمرے میں رہنے کے لیے مجبور ہیں، ان کی تعلیمی ترقی کا ریکارڈ کبھی شاندار نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس ماحول سے بھی کبھی کبھی کوئی ایک ذہین طالب علم کسی طرح اوپر آجاتا ہے لیکن ایسے حادثات شاذ و نادر ہیں۔ ایسے ذہین طالب علم دوسروں کے مقابلے میں احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہر بڑے اور اونچے مقام پر پہنچنے کے لیے اندرونی شدید جذبہ، حوصلہ اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر کے ماحول نے انھیں پہلے ہی چھوٹا بنا دیا ہے تو وہ خود اپنے کو کب بڑا بنا سکتے ہیں۔ احساس کمتری کی دوسری شکل یہ بھی ہے کہ وہ اپنی کامیابیوں کی داستانیں وقت بے وقت بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اب اسٹار ٹی۔ وی عام ہونے کے لیے کیا دیر ہے۔ پروگرام صبح سے رات کے ۱۲ بجے تک چلتے ہی رہتے ہیں۔ بھلا ہو باہر کے بچوں کا جو اپنے ضعیف ماں باپ کی دلچسپی کے لیے اسٹار ٹی وی لگا کر چلے گئے ہیں۔ اس گھر میں جو بچے ہیں وہ صبح سے شام تک اس باکس کے سامنے سے ٹلتے ہی نہیں۔ انھیں پڑھنے لکھنے اور ہوم ورک کے لیے وقت کہاں ملے گا۔ بچے بڑے ہر قسم کا پروگرام ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔ پست معیار کے گانوں، SUSPENSE ڈائیلاگ، مار دھاڑ، ڈسکو ڈانس نے گھر کے ماحول کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ٹی۔ وی پروگرام ختم بھی ہو جائے تو اس ڈرامے کے اچھے یا برے اثرات دل و دماغ پر تا دیر قائم رہتے ہیں۔ ایسے میں پڑھنے کا موڈ آجانا کوئی کرشمہ ہی ہو سکتا ہے۔ بچے بہت دیر تک نقل کرتے ہیں اور ڈسکو ڈانس دیکھ کر بڑے بھی واہ واہ کرتے ہیں۔ ایک سال تک اس ماحول میں پھنسے رہنے کے بعد کسی طالب علم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کوئی بڑی کامیابی سے سرفراز ہوگا، بے کار سی تمنا ہے۔ پھر والدین کو یہ کہتے ہوئے بھی سنیں گے کہ جب سے ٹی وی آیا ہے، بچے کا دل پڑھنے لکھنے میں نہیں لگتا آخر اس ماحول کا ذمّہ دار کون ہے؟ جب کہ خود والدین کو بغیر ٹی۔ وی اور ویڈیو کیسٹ کے چین نہیں آتا بلکہ گھر ویران نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ٹی۔ وی کے بہت سے اچھے پروگرام بچوں کے لیے نہ صرف ضروری ہیں بلکہ ان کے عام معلومات اور خود اعتمادی کے لیے بہت کار آمد ہیں۔ یہاں صرف پروگراموں کو کنٹرول کرنے کا سوال ہے۔ حال ہی میں ایک چھٹی جماعت کی لڑکی اپنی ماں کے ساتھ آئی جو ہمیشہ کلاس میں تیسرے اور چوتھے نمبر پر آرہی ہے۔ آخر وہ کلاس میں اوپر کیوں

نہیں آتی۔ اس لڑکی نے فوراً جواب دیا کہ ان کے ماں باپ اچھے پیسے والے ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ ان کا مقابلہ تو ہم کر ہی نہیں سکتے۔ جب کہ میری ماں کہیں پر نوکر ہے اور باپ رکشا چلاتا ہے جو مہینے میں دو چار روز گھر کی صورت دیکھتا ہے۔ یہاں پر وہی گھر کے ماحول کی بات بنیادی ہے جو عام طور پر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے

گھر کی خوش حالی، ماں باپ کے طرز زندگی اور بچوں کے ساتھ سلوک کا بھی بچوں کی تعلیم و تربیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ جس گھر کا ماحول خوش گوار ہے، ماں باپ میں موانست ہے جو ایک دوسرے کی راحت کا خیال رکھتے ہیں وہ بچے سچ مچ خوش نصیب ہیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ خاندان دولت مند بھی ہو۔ وہ بچے بڑی مصیبت میں ہیں جہاں پر ماں باپ آپس میں جھگڑتے، ایک دوسرے کو طعن و تشنیع سے نوازتے رہتے ہیں۔ جہاں پر دونوں کا غصہ چڑھ گیا بس گھر کے ماحول میں زلزلہ ہی آ گیا۔ اس ماحول میں بچے کیا خاک پڑھیں گے۔ بعض گھر ایسے بھی ہیں جہاں پر نہ تو غصہ ہے اور نہ زلزلے کے آثار ہیں لیکن سارا گھر خاموش ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھر کی فضا کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ یہ ایک پوشیدہ راز ہے اس کو ٹینشن (TENSION) یا تناؤ کہتے ہیں۔ کچھ واقعات ایسے ہیں جن کا تذکرہ کوئی نہیں کرتا لیکن ہر ایک اپنی جگہ خاموش ہے یا پھر ابا جان کا مزاج ہی ایسا ہے کہ سب دم سادھے بیٹھے ہیں ـــــ ایسے ماحول میں تعلیم کا کام رک جاتا ہے۔ یہ سکتہ کا عالم بھی پڑھنے لکھنے کے لیے مناسب نہیں۔ جو بچے مسلسل اس ماحول میں رہتے ہیں، اچھے تعلیمی ریکارڈ کے باوجود شدید احساس کمتری کے کرب میں مبتلا رہتے ہیں ان کے دل و دماغ پر دن رات تناؤ کی سی کیفیت رہتی ہے۔ ایسے ماحول سے خدا کی پناہ۔

بعض والدین کو بچوں کو نصیحتیں کرنے کا شوق مرض کی حد تک ترقی کر جاتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے یہ لوگ مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں اس سے بچے پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ دوسرے ذہین بچوں کی مثالیں دینا اچھا ہے لیکن یہ نہ سوچیے کہ آپ کا بچہ محض مثال دینے سے اچھا ہو جائے گا۔ اس کے لیے دوسری اور باتیں ضروری ہیں۔

بعض والدین ہر بات پر مار دھاڑ پر اتر آتے ہیں۔ غصہ بری بلا ہے بچے ہمیشہ سہمے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ گونگے ہو جاتے ہیں۔ یہ کسی انٹرویو کا سامنا کر نہیں پاتے۔ یہ طلبا کبھی اسکول کے تقریری مقابلوں میں حصہ نہیں لیتے۔ ان کی شخصیت کی نشوونما ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔

یہ مضمون جتنا آسان اور عام ہے اتنا ہی زیادہ اہم اور عالی شان ہے اور بھی بہت سی باتیں آپ کے تجربے میں ہوں گی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں اپنے دوستوں، رشتہ داروں، ملک کے جھگڑوں اور دوسرے مسایل سے بہت دلچسپی ہے اور خود اپنے گھر کے ماحول سے بے خبر ہیں کیا آپ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنے بچوں کے لیے بہتر ماحول دے سکیں تاکہ ان کی شخصیت میں نکھار آئے اور وہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکیں۔

مستقبل کی تاریخ کو رنگ کون دے گا؟

خورشید احمد ٭

ہر کنبے کو بچوں کی شکل میں قدرت ایک سادہ محضر بلینک ڈگری عطا فرماتی ہے، تاکہ وہ اپنے گروہ، قوم اور تہذیب کی مستقبل کی تاریخ خود مرتب کریں۔ یہ بات مسلّم شدہ ہے کہ کسی قوم، گروہ، تہذیبی اور نظریاتی گروپ کی بقا اور استحکام اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے گروپ کو مسلسل ایسے ممبران فراہم کرتا رہے جو اس کی تہذیب و کردار کے نہ صرف آئینہ دار ہوں، ان کی پہچان ہوں بلکہ اس آئیڈیالوجی اور کردار کو دلی طور پر لگن اور اطمینان کے ساتھ، اپنی کامیابی سربلندی اور ارجمندی کا تنہا سرمایہ سمجھتے ہوں۔ اس کی بقا، پہچان برتری کے لیے جاں نثاری کے جذبے سے سرشار ہوں اور اس کا ایسا نمونہ پیش کریں کہ اوروں کو نقل کی ترغیب ملے۔

جب بچہ اپنی تہذیب اور ادب (مینرس) سیکھنے کے مرحلے سے گزر رہا ہوتا ہے اس وقت والدین کی دلچسپی بچے کے ساتھ، والدین کی عادت و کردار کا نمونہ طریقۂ ابہام تفہیم، کنٹرول، اپنے بزرگان سلف کے ادب سے تذکرے ان کی ماڈلنگ کے لیے، حیاتیاتی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کا اپنا یا انداز، ڈیفنس میکنزم میں اپنایا پروفا سطریقہ اور مختلف سچویشن میں ردعمل کے منفرد انداز، انٹرپرسنل ریلیشن کا انوکھا انداز، پروقار پہناوا، بات چیت کا انداز، ان کا ظاہر ان کا باطن، مشغلہ کامیابی اور ناکامی کا تصور اور اپنی حیثیت کا ادراک (سیلف کان سپٹ) اور اس کا استحکام، بچوں کی شخصیت کو ایک مخصوص رخ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اپنی تہذیب سیکھنے کے مواقع سے محرومی بچوں کے لیے تباہ کن ہوتی ہے۔ نہ صرف اس کے لیے بلکہ قوم کے لیے بھی، یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب اس میں عقلیت (ریزنینگ) کی صلاحیت بیدار ہونے کا مرحلہ شروع ہوتا ہے جو اس کو مختلف حالات اور مرحلوں سے جوجھنے کے لیے عہدہ برا ہونے کے لیے متبادل راہوں کی تلاش اور متبادل گولس کے تعین کی سوجھ بوجھ کو جلا عطا ہوتی ہے۔ بچے میں محبت گرم جوشی دوستانہ رویہ لوگوں سے محبت کرنے کی صفت، بیدار ہونے کا یہی زمانہ ہوتا ہے۔ پھر تعلیم اور تربیت کا دور اساتذہ کا ماڈل، ان کا رویہ

٭ [illegible] علی گڑھ

ہم سبق اور ہم اسکول اور ٹیچرس کا رویہ، ان کی ہمت افزائی، ہمت افزائی، جذبات کو تعمیری رُخ دینے کا اقدام ان کے ضمیر کی بیداری، تمناؤں اور خواہشات کو تعمیری رخ دینے اسکول کی غیر جانب دار ڈسپلن نافذ کرنے والی قوت، کیری کولم، تعلیم کے ساتھ طلبا کا لگاؤ مقابلے میں ہمت افزائی اور برابر کا برتاؤ ان کی شخصیت کو جلا دیتی ہے۔ یہ اجتماعی کوشش ایسے افراد کی تیاری میں اہم عنصر ہیں جو کسی بھی گروپ کو اس کے معیار اور بقا کے ضامن ممبران کی فراہمی کے جن میں لیڈر بھی ہوتے ہیں اور فالور بھی اپنے رول سے مطمئن اپنے گروپ ملّت کے گولس کے حصول کے لیے مضبوط رشتوں میں جٹے ہوئے ذاتی مفادات سے بہت اوپر متحدہ مقصد کے لیے ہر ذاتی مصالح اور مفاد کی قربانی یقین محکم اور عمل پیہم کے ساتھ۔

ماضی قریب میں سر سید اور ان کے رفقا کے کارنامے اور تذکرے کتابوں اور دلوں میں محفوظ ہیں۔ ایک راستہ دکھانے کو۔

اس کشمکش مسلسل کے دور میں ملّت ایک دور سے گزر رہی ہے اور سوال ابھرتا ہے:

ہمارے مستقبل کے سادہ محضر پہ
ہماری تاریخ کون لکھے گا
ہم یا کوئی اور؟
فیصلہ کون کرے؟

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۲ شمارہ ۹ (ستمبر ۹۳ء)

دینی مدارس کا طریقۂ تدریس

مظفر حسین غزالی *

دینی مدارس کے قیام اور ان میں رائج تعلیم کے پیچھے ایک عظیم مقصد کارفرما ہے اور یہ عظیم مقصد نوجوان نسل میں دین اور دینی علوم کی بصیرت پیدا کرنا ہے تاکہ وہ دوسرے علوم کی تدوین بھی دینی نقطۂ نگاہ سے کرسکیں۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے جو آلاتِ تعلیم استعمال کیے جائیں گے وہ بھی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ آلاتِ تعلیم میں جہاں مدرسہ، نظام، نصاب، استاد اور تعلیمی مواد شامل ہے وہیں طریقۂ تدریس بھی اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ بہترین مدرسہ، نصاب، طلبا اور تعلیمی مواد موجود ہو لیکن طریقۂ تعلیم مناسب نہ ہو تو مطلوبہ مقاصد کا حصول ممکن نہیں۔

قدرتی طور پر ہر علم تین منزلوں سے گزرتا ہے پہلی منزل کو تدوین کہتے ہیں یعنی علم کا بحیثیت علم مدون ہونا یا یوں کہا جائے کہ متفرق اینٹوں کو ایک ترتیب میں رکھ کر دیوار کو تیار کرنا اس کو بنانا تدوین کہلاتا ہے لیکن یہیں کام ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کی کاٹ چھانٹ کرنا، اس کے نقش و نگار کو سنوارنا اور ان کی نوک پلک درست کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ اس کو تنقیح علوم کی ترقی یا تہذیب کا مرحلہ کہنا چاہیے۔ ہر علم پر پہلے دور کے بعد دوسرا دور گزرتا ہے۔ اس کے بغیر علم کی نہ دیوار بن پاتی ہے اور نہ ہی اس کے نقش و نگار اور نوک پلک درست ہو پاتے ہیں، اسی لیے ان دو مرحلوں کے گزرنے کے بعد تیسرا مرحلہ آتا ہے جس کو بلوغ یا تکمیل کا دور کہتے ہیں۔ اس مرحلے کے گزرنے کے بعد علم اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ اب اس کو بڑھانا، پھیلانا اور درس و تدریس کے ذریعے استوار کرنا ہوتا ہے اسی کو بلوغ و تکمیل کا زمانہ کہتے ہیں۔ قدرتی طور پر اسلامی علوم بھی ان تینوں ادوار سے گزر چکے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے بعد اچانک ان علوم کو، جو تکمیل کی منزل تک پہنچ چکے تھے، گہن لگنا شروع ہوا یعنی جو درخت تہذیب و تدوین کا پھل پھول رہا تھا اس کی شاخیں ساتویں صدی ہجری تک کمال مرتبہ تک پہنچ چکی تھیں وہ بجائے اس کے کہ پھلتا پھولتا اچانک اس کا بیت جھڑ شروع ہوگیا اور درخت بڑھنے کی جگہ گھٹنے لگا۔ یا یوں کہا جائے کہ اسلامی علوم کا عالمگیر سطح پر تنزل شروع ہوگیا۔ اگر

---

* ۳۸-۳۷ اے۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اس دور کا تجزیہ کیا جائے تو دو چیزیں نمایاں طور پہ سامنے آتی ہیں۔ ایک اجتہاد کے دروازے کا بند ہونا جس کی وجہ سے نصاب کی تغیر پذیری قایم نہ رہ سکی اور جمود پیدا ہو گیا اور دوسری چیز طریقۂ تدریس میں واضح تبدیلی۔ اس کی وجہ سے اساتذہ اور طلبا کا پورا زور کتابوں کی طرف ہو گیا اور کسی بھی فن کے مسایل فروع کے استحضار کی تلافی کے لیے اس فن کی بہت سی کتابیں رکھ کر کی گئی جس کی وجہ سے نصاب ثقیل ہو گیا جب کہ یہ نصاب کا تقاضا نہ تھا۔ طریقۂ تدریس کی تبدیلی نے یہ صورت حال پیدا کر دی۔

ساتویں صدی کے بعد کے اکابرین نے اعلیٰ درجات کے نصاب میں مشکل عبارت، پیچیدہ تراکیب اور مغلق متن والی کتابیں ماضی میں شاید یہ سوچ کر داخل نصاب کی گئی تھیں کہ ان کی تعلیم سے طلبا میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور قوت تنقید بیدار ہوگی۔ کیوں کہ جب کتاب کی عبارت کو حل کرنے اور اس کے معنیٰ و مفہوم کو متعین کرنے میں طالب علم اور استاد کو محنت کرنی پڑے گی تو اس میں تحقیق کے ساتھ تنقید کی صلاحیت اور خود اعتمادی کا ملکہ پیدا ہو جائے گا طالب علم مشکل سے مشکل مضمون کو سمجھ سکے گا اور مغلق سے مغلق کتاب کو پڑھ سکے گا۔ ان کتابوں کو پڑھانے کے لیے طریقۂ تدریس یہ اختیار کیا گیا تھا کہ طالب علم پہلے خود کتاب کو پڑھتا، اس کا مفہوم متعین کرتا پھر وہ یہ سوچتا کہ اس کے نکالے ہوئے مفہوم پر کیا کیا ممکنہ اعتراضات ہو سکتے ہیں، ان کا جواب سوچ کر استاد کے درس میں شریک ہوتا۔ استاد ہر طالب علم کو بولنے کا پورا موقع دیتا تھا کہ وہ اپنا مفہوم پیش کرے اگر کوئی طالب علم بحث میں حصہ نہیں لیتا تھا تو وہ غبی اور کند ذہن شمار کیا جاتا۔ استاد کے سامنے مفہوم متعین کیے جاتے تھے۔ صرفی، نحوی، عقلی، فکری جس قدر بھی اعتراضات اور شبہات اس مفہوم پر ذہن میں آ سکتے تھے وہ طلبا اور استاد کے سامنے پیش کرتے تھے۔ استاد ان سب کے جوابات دیتا تھا۔ گھنٹوں یہ ذہنی ورزش جاری رہتی تھی۔ جب تک پوری طرح اطمینان نہیں ہو جاتا تھا درس ختم نہیں ہوتا تھا۔ استاد اپنی جگہ نہیں چھوڑتا تھا۔ درس ختم ہونے کے بعد ہر طالب علم اس سبق کو دہراتا تھا۔

ہر سبق روزانہ پیشگی حل مطالب، اس کا درس مع ردّ شبہات اور اعتراضات، پھر حجرے میں سبق کا اعادہ تین مرحلوں سے گزرتا تھا۔ اس طریقۂ تدریس میں کسی امتحان کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی کیوں کہ طلبا میں حصول علم کا جذبہ حاوی رہتا تھا۔ طلبا میں اس طریقۂ تدریس سے اظہار بیان پر قدرت اور قوت گویائی پیدا ہو جاتی تھی۔ ابتدائی و ثانوی درجات کے لیے جو طریقۂ تدریس اختیار کیا گیا تھا اس میں سبق کو زبانی یاد کرنے پر زیادہ زور ہوتا تھا صبح کا وقت عموماً نئے سبق کے لیے اور شام کا وقت سبق دہرانے اور آموختہ یاد کرنے کے لیے ہوتا تھا۔ استاد اس وقت تک نیا سبق نہیں دیتا تھا جب تک کہ پچھلا سبق یاد نہ ہو جائے۔ پھر دھیرے دھیرے جس طرح بچے تعلیم میں ترقی کرتے جاتے تھے ان کے سبق دہرانے کا وقفہ طویل ہوتا جاتا تھا اور آخر میں ہفتہ میں ایک دن بچوں کے سبق دہرانے کے لیے ہوتا تھا۔ کئی مدارس میں جمعرات کا دن ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے ہوتا ہے۔ اس دن بچوں کا جلسہ، اجتماع، مذاکرہ یا کسی خاص موضوع پر کسی استاد کی تقریر ہوتی۔ ہم نصابی سرگرمیوں میں بچے خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔

موجودہ مدارس میں ابتدائی و ثانوی کے لیے

توکسی حد تک یہی طریقۂ تعلیم رائج ہے اور ہم نصابی سرگرمیاں بھی لگ بھگ اسی طرح ہیں لیکن اعلیٰ درجات کے طریقۂ تدریس میں بہت اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مندرجہ بالا طریقۂ تدریس کو کرتنزل کے نتیجے میں اپنایا گیا تھا لیکن اس طریقہ کو اپنائے جانے کے نتیجے میں بھی کچھ اہم شخصیات پیدا ہوئیں جو خال خال تھیں۔ ان میں سے بعض نے اس طریقۂ تعلیم کی خامیوں کو محسوس کیا جیسے علامہ ابن خلدون یا علامہ ابن تیمیہ۔ ان حضرات نے بھی طریقۂ تعلیم کو درست کیے جانے کی بات کی۔ یہ چند افراد تھے جن کی نظر اس تبدیلی کی طرف گئی اور انھوں نے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ان کی کوششوں کا اثر وقت کی عام رفتار پر نہیں پڑا۔ نتیجۃً تعلیم کا معیار روز بروز گرتا گیا اور بڑے بڑے ائمۂ فن نے اپنی پوری زندگی کتابوں کی شرح لکھنے اور تلخیص کرنے میں گزار دی۔ اس کے نتیجے میں اجتہاد کی جو صلاحیت پچھلی چھ صدیوں میں پیدا ہوئی تھی وہ ختم ہوگئی اور اسلامی علم وفن کے جو کارخانے قایم ہوے تھے وہ ایک بنیادی انقلاب سے زایل ہوگئے اور درس وتدریس کا ایک نیا ڈھنگ شروع ہوگیا۔

اس نظام میں کتابوں کا مقام شرح اور تلخیص نے لے لیا اور پورا علم کتابوں تک محدود ہوگیا۔ یہ تبدیلی جہاں طریقۂ تدریس کی تبدیلی کی وجہ سے آئی وہیں سہل پسندی نے بھی اس صورت حال کو پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا جب کہ قدما کے یہاں جو طریقۂ تعلیم رائج تھا وہ تھا املا کا۔ املا عربی کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ املا کے معنی ٹھیک وہی ہیں جسے آج کالجوں میں لکچر کہتے ہیں۔ طریقہ یہ تھا کہ ایک صاحب علم کوئی مخصوص کتاب اپنے سامنے نہیں رکھتا تھا۔ وہ بیٹھتا تھا اور طالب علم اس کے سامنے بیٹھتے تھے۔ طلبا کاغذ قلم لے کر بیٹھتے تھے۔ استاد کے پیش نظر جو موضوع ہوتا مثلاً علم ادب حدیث، تفسیر وغیرہ وہ اس پر زبانی تقریر کرتا تھا اور جو طلبا اس کے حلقۂ درس میں بیٹھے ہوتے تھے وہ سنتے تھے اور اس تقریر کی خاص خاص باتیں لکھ لیتے تھے۔ پھر انھیں جمع کر کے ان پر مدلل بحثیں ہوتی تھیں۔ طلبا تقریر پر سوالات کرتے، اپنے اشکالات پیش کرتے اور استاد کی باتوں سے ادب کے ساتھ اختلاف بھی کرتے تھے۔ استاد ان سب باتوں کو سنتا پھر ان کے جوابات دیتا، اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے دلیلیں پیش کرتا۔ طلبا جب تک مطمئن نہ ہوجاتے یہ علمی مجلس برخاست نہ ہوتی۔ ذہین اور مستعد طلبا ان باتوں کو یاد کر لیتے اور اپنی بیاض میں نوٹ کر لیتے تھے۔ آج کل جو کتابیں ملتی ہیں مثلاً قاری کی کتاب شریف مرتضیٰ کی کتاب وغیرہ، یہ وہی نوٹس ہیں جو لکچر کے وقت مستعد طالب علموں نے لیے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ طریقۂ تدریس کتنا بلند تھا۔ یہ دورِ عروج کا طریقۂ املا دھیرے دھیرے عربی مدارس سے بالکل مفقود اور ناپید ہوگیا۔

تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم میں صرف ونحو اور ادب یا اس قسم کی جو چیزیں ہیں ان کو پڑھانے کے لیے بھی املا کا طریقہ رائج تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طریقے میں بہت وسعت ہے۔ بات چیت سوال وجواب یا کسی واقعے کی مدد سے اس بات کا آغاز کرنا یہ ایسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے طلبا ہوشیار رہتے ہیں اور لکچر میں دلچسپی لیتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اجتماعی تعلیم وتربیت میں عموماً اسی طریقے سے کام لیتے تھے۔

تدریس کے معاون سامان میں کتاب کا نمبر آخر میں آتا ہے۔ کتاب کو اس کے جائز مقام پر رکھنا تو درست

ہے لیکن محض کسی کتاب پر کسی فن کی تدریس کی بنیاد رکھنا میرے خیال میں درست نہیں۔ البتہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ طلبا کو کچھ چنی ہوئی کتابوں کے نام موضوع میں مہارت پیدا کرنے کے لیے بنائے جائیں تاکہ طلبا نے جو کچھ سیکھا ہے ان کتابوں کے پڑھنے سے ایک طرف وہ یکجا ہو جائے اور دوسری طرف ان کے غور و فکر کے لیے کچھ نئے گوشے ہاتھ آجائیں اس خارجی مطالعے سے طلبا کو عبارت کے حل کرنے کی مشق ہوتی ہے اور مسایل کو از خود حل کرنے اور اس حل یا مفہوم کو متعین کرنے کے لیے تحقیق کرنے کی ان میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ استاد سے انھیں اس سلسلے میں بھی رہنمائی مل سکتی ہے لیکن اگر پورے نظام تعلیم کی بنیاد کتابوں پر رکھ دی جائے تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو آج کے دینی مدارس کا ہے۔ ایسی صورت میں طالب علم کا پورا وقت نصاب کی کتاب کے متن کو سمجھنے اس کی عبارت کو حل کرنے اور ترکیبوں کے مطالب سمجھنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کتاب کے اوراق کھلے ہوتے ہیں اور دماغ کے سارے دروازے جو اس موقع پر کھلنا چاہییں وہ بند ہوتے ہیں۔ دماغ کسی ایک معین کتاب میں بند ہو جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس کتاب کو کس طرح حل کرے۔ اس حل کی تلاش میں وہ شرح اور حواشی کی طرف رجوع کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بارہ سے چودہ برس اپنا دماغ کھپانے کے بعد اسے چند کتابوں کا علم حاصل ہوتا ہے اور علوم حاصل نہیں ہوتے۔ چند کتابوں کا علم حاصل کرنے میں اور نفس علم حاصل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے تجربے سے معلوم ہوا کہ اس تبدیلی سے جو بظاہر بہت معمولی تبدیلی تھی تمام تر اعتماد کتابوں پر ہوتا گیا اور وہ جو پچھلا طریقہ املا کا تھا اور زبانی درس کا تھا وہ روز بروز ختم ہوتا گیا۔

علم تفسیر، علم حدیث اور عربی ادب کے موجودہ طریقۂ تدریس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان علوم کو پڑھانے میں جتنا وقت اور محنت صرف کی گئی وہ رائیگاں چلی گئی۔ طلبا کے ہاتھ اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ وہ چند کتابوں سے واقف ہو گئے۔ علم تفسیر پڑھنے والا شخص قرآن اور اس کے فن تفسیر سے واقف نہیں ہو پاتا۔ اس کی وجہ سے وہ قرآن سے اس طرح استفادہ نہیں کر پاتا جس طرح کرنا چاہیے۔ یہی حال علم حدیث کا ہے۔ علم فقہ کے طریقۂ تدریس میں کچھ ایسی بنیادی تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے مسلکی اختلافات میں شدت پیدا ہو گئی اور مسلک کی بنیاد پر امت میں کئی مکتب فکر بن گئے اور امت میں انتشار پیدا ہو گیا قدما کے یہاں مسلکی اختلافات ہوتے ہوئے بھی عام اتحاد کی فضا موجود تھی، وہ ایک دوسرے کے مسلک کا احترام کرتے تھے بلکہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک مسلک کا امام دوسرے مسلک کے امام کی سرزمین میں پہنچا تو اس نے اپنے مسلک پر احتراماً اس امام کے مسلک کو ترجیح دی جس کی سرزمین میں وہ گیا تھا اور اس نے اسی طریقے سے وہاں قیام کے دوران احکام کی پابندی کی لیکن طریقۂ تدریس کی تبدیلی کی وجہ سے دھیرے دھیرے یہ فضا مکدر ہوتی گئی۔ اس وقت فقہ کی تعلیم کا جو طریقہ رائج ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ استاد کے مسلک سے طلبا واقف ہوتے ہیں اور استاد اپنے مسلک کی برتری کی پوری کوشش کر کے طلبا پر ظاہر کرتا ہے۔ پھر دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ مثلاً حنفی مسلک کے ماننے والوں کا مدرسہ ہے تو اس میں تمام کتب فقہ حنفی مسلک سے متعلق ہی شامل نصاب ہوتی ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان تمام کتابوں میں سے ایک

سے موضوعات پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً نورالایضاح میں اگر بیع کا باب پڑھایا گیا تو ہدایہ میں بھی بیع کا باب پڑھایا جائے گا یا باب طلاق پڑھایا گیا تو دوسری کتابوں میں سے بھی اس باب کو پڑھایا جائے گا۔ ان تمام کتابوں میں ایک اور دلچسپ بات نظر آتی ہے کہ اگر بیع کا باب ہے تو اس میں غلاموں کی خرید و فروخت کی مثالیں دی گئی ہیں اول تو یہ کہ چند کتابوں تک علم کو محدود کرنا ہمارے نظام تعلیم کا نقص ہے لیکن اگر مدارس کی یہ مجبوری ہی ہے تو پھر ان کتابوں کو از سر نو مرتب کرانا چاہیے جن میں عصر حاضر کی مثالیں دی جائیں۔ دوسرے تدریسی طریقے کی تبدیلی پر بھی غور کیا جائے تاکہ مسلکی اختلافات کے باوجود عام اتحاد کی فضا قائم ہو سکے۔

رہا عربی ادب کا معاملہ تو اس کے بارے میں بھی یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ قیمتی وقت صرف کرنے کے بعد بھی طالب علم میں ادبی ذوق پیدا نہیں ہو پاتا۔ اس کا علم قدیم ادبا و شعرا کی چند تحریروں تک محدود رہتا ہے علم تفسیر، علم حدیث اور عربی ادب کی تعلیم و تدریس کا آئیے الگ الگ جائزہ لے لیا جائے تاکہ طریقۂ تدریس کی تبدیلی کے کیا کیا اثرات ہمارے دینی مدارس پر پڑے یہ واضح ہو جائے۔

علم تفسیر (قرآن) کا طریقۂ تدریس۔

عام طور پر مدارس میں قرآن مجید پڑھانے کے بجائے قرآن کی بعض تفسیریں پڑھائی جاتی ہیں، یا پھر قرآن کے ترجمے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قرآن کو براہ راست قرآن سے سمجھنے کی کوشش بہت کم کی جاتی ہے۔ قرآن کو پڑھانے میں ایک کوتاہی یہ بھی ہوتی ہے کہ اسے دیگر علوم کی کتابوں کی طرح پڑھایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے طلبا کے اندر یہ شعور پیدا نہیں ہو پاتا کہ جس کتاب کو وہ پڑھ رہے ہیں وہ دوسری کتابوں کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ کتاب ان پر رازِ حیات کھولنا چاہتی ہے۔ کائنات اور زندگی کی رنگارنگی میں جو وحدت پائی جاتی ہے اسے سمجھانا چاہتی ہے اور اپنے حاملین کو عالم انسانی کے پاسبان اور نگراں کی حیثیت سے دنیا میں دیکھنا چاہتی ہے۔

قرآن کو قرآن سے نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی طلبا کی زندگی میں کوئی امید افزا تبدیلی نظر نہیں آتی۔ نہ قلب میں فراخی آتی ہے اور نہ وسعت پیدا ہوتی ہے، نہ قرآن ان کے لیے نغمۂ کیف و سرور بنتا ہے اور نہ ہی ان میں قرآن کا مزاج - Quranic Attitude - پیدا ہو پاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں قرآن سے استفادہ کرنے کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہو پاتی۔ اسی وجہ سے قرآن طلبا کی زندگی کے لیے نور ہدایت نہیں بن پاتا۔

اس کیفیت کے پیدا ہونے میں طلبا کی کوتاہی سے زیادہ طریقۂ تدریس کا دخل ہے کیوں کہ اس نظام تعلیم میں قرآن کو قرآن سے پڑھانے کے بجائے تفسیروں کے پڑھانے پر زیادہ زور ہے۔ عام طور پر بیضاوی، جلالین اور کشاف کی تفسیریں پڑھائی جاتی ہیں اور ان تفسیروں میں بھی آیات احکام پڑھائی جاتی ہیں جب کہ قرآن میں آیاتِ احکام کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کا بڑا حصہ اُن آیتوں پر مشتمل ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کا اور دوسرے علوم کا ذکر کیا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں سے بحث کی ہے کیوں کہ قرآن پوری زندگی کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے اس لیے اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بہت سے گوشے ہیں جن کا مطالعہ کرنے اور غور کرنے سے انسان پر اللہ تعالیٰ کے بہت سے راز کھلتے ہیں اور ہدایت کے نور کا متلاشی ہدایت یاب ہو جاتا ہے۔

ہمارے مدارس میں رائج تفاسیر کے مفسرین نے

ان میں آیاتِ احکام کی تفسیر پر اتنا زور کیوں صرف کیا ہے یہ ایک بحث طلب نکتہ ہے لیکن اتنی بات ذہن میں ضرور رکھنی چاہیے کہ یہ تفسیر جس زمانے میں لکھی گئیں اس وقت اسلامی یا مسلم حکومتیں تھیں اور ان حکومتوں کو قاضیوں کی ضرورت تھی۔ دینی مدارس اس ضرورت کو پورا کرتے تھے اس لیے مدارس کے نصاب میں اس مقصد کے لیے معاون کتب کا شامل کیا جانا ضروری تھا اور اسی غرض سے یہ تفاسیر بھی نصاب میں شامل کی گئی تھیں۔ اس وقت کے لحاظ سے یہ Up-to-Date چیز تھی لیکن آج حالات اور معاشرے کی ضرورت کے مطابق تفاسیر نصاب میں شامل کی جانی چاہییں؟

تفاسیر کا نقص اپنی جگہ لیکن قرآن اور علم تفسیر کو پڑھانے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اس نے بھی اس کمی کو پورا نہ کیا۔ اس لیے طالب علم تفسیر سے واقف نہیں ہو پاتے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ فن تفسیر ہے کیا چیز، جو تفسیریں لکھی گئی ہیں ان میں کیا کمیاں ہیں یا ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ اصول تفسیر کیا ہے؟ ایک مکمل اور اچھی تفسیر کسے کہا جا سکتا ہے وغیرہ۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کیوں کہ ہمارا سارا دار و مدار بیضاوی، جلالین اور کشاف پر ہے۔ طالب علم کو بیضاوی جلالین اور کشاف کی لفظی عبارت، اس کے مرجع اور ضمائر کا علم تو حاصل ہو جاتا ہے نہ کہ علم تفسیر کا بلکہ اس کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ درس و تدریس میں علمی قوت کمزور ہو گئی جس کی وجہ سے نہ قرآن کا علم حاصل ہوا نہ تفسیر کا۔ اگر طریقۂ املا کا اختیار کیا جاتا تو یہ کیفیت پیدا نہ ہوتی کیوں کہ اس طریقے میں کتابوں سے زیادہ فن پر زور دیا جاتا ہے۔ البتہ کتابوں سے استفادے کی اس طریقے میں پوری گنجائش ہوتی ہے۔ بس استاد اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ طلبا ایسی کتابیں پہلی سطح پر نہ پڑھیں جو اُن کی فکری و ذہنی نشو و نما کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں۔ استاد طلبا کی رہنمائی کرتا ہے اور طلبا خود تحقیق و تلاش علم کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی اشتراق سے فن میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔

علم حدیث کا طریقۂ تدریس

شاہ ولی اللہؒ سے پہلے ہندوستان کے دینی مدارس میں علم حدیث کی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ اس زمانے میں فقہ اور علوم عقلیہ کی تعلیم کا غلبہ تھا۔ شاہ ولی اللہ کی کوششوں سے علم حدیث کی تعلیم کا رواج ہوا اور مدارس میں اس کی تعلیم ہونے لگی۔ آج کسی نہ کسی حیثیت سے مدارس میں حدیث کی تدریس کا کام ہو رہا ہے۔ اگر جائزہ لیا جائے تو تین قسم کے مدارس نظر آتے ہیں۔

اول وہ مدارس جو مختلف درجات میں اصول ستہ کی تعلیم دیتے ہیں اور مقررہ نصاب تک ان کتابوں کو پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوم وہ مدارس جن میں اصول ستہ سے منتخب ابواب پڑھائے جاتے ہیں لیکن کسی کتاب کو مکمل نہیں پڑھایا جاتا۔ بس تبرک کے طور پر اصول ستہ کے یہ ابواب پڑھائے جاتے ہیں۔

سوم وہ مدارس ہیں جو آخری درجہ (سال فراغت) میں اصول ستہ کے علاوہ حدیث کی بعض دوسری کتب کو بھی ایک ہی سال میں پڑھا دیتے ہیں۔ یہ تعلیم زبانی ہوتی ہے اور اسے دورہ حدیث کہا جاتا ہے ان مدارس میں بھی حدیث کی تعلیم تبرکاً ہی ہوتی ہے۔

ان تینوں قسم کے مدارس میں علم حدیث کی تدریس کے بارے میں کوئی بات کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ علم کوئی بھی ہو اس کی تعلیم جب تک تدریجاً نہیں ہوگی اس وقت تک اس سے وہ فوائد حاصل نہیں ہوں گے جو ہونے چاہییں۔ کیوں کہ ہر علم کا اپنا ایک مزاج

ہوتا ہے۔ اس علم کی تدریس کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو۔

پہلی اور دوسری قسم کے مدارس میں علم حدیث کا جو نصاب رائج ہے اس سے طالب علم کے سامنے تدریجاً احادیث کا کچھ ذخیرہ آجاتا ہے۔ اس کو حدیث کے متن اور اس کی عبارت کے حل کرنے کی کچھ نہ کچھ مشق بھی ہو جاتی ہے لیکن علم حدیث ایک فن کی حیثیت سے نہ اس کے سامنے آتا ہے اور نہ ہی وہ اس حیثیت سے حدیث کے علم کو حاصل کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علموں میں اجتہاد کی صلاحیت پیدا نہیں ہو پاتی۔ باوجود اس کے کہ وہ مدرسے سے فارغ ہو جاتا ہے۔ اس پورے عرصے میں وہ جو کچھ سیکھتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ پڑھی ہوئی حدیثوں کے ظاہری معنی و مطالب سے واقف ہوں یا پھر استاد کے متعین کیے ہوئے معنی و مطالب سے وہ واقف ہوتے ہیں۔ اس طرح کے طالب علموں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں علم حدیث پر عبور حاصل ہے اور وہ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں یا ابواب کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابوں یا ابواب کی احادیث کے معنی و مطالب آزادی سے متعین کر سکتے ہیں۔ انھیں شرح اور لغات کی ضرورت ہوگی کیوں کہ ان کی پوری قوت اصل علم کے بجائے حل عبارت پر صرف ہوتی ہے۔ یہ کمزوری دراصل کتابوں پر اعتماد کے نتیجے میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے قدما نے اعلیٰ علوم کی تعلیم کے لیے زبانی درس (لکچر) کا طریقہ ہی اختیار کیا تھا۔

آخری قسم کے مدارس وہ ہیں جن میں تبرکاً حدیث کی تعلیم ہوتی ہے۔ بعض مدارس میں اسے دورۂ حدیث کہا جاتا ہے۔ دورہ کا طریقہ ہندوستان کے زیادہ تر مدارس میں رائج ہے۔ اس طریقے کے رواج پانے میں یہ فکر کارفرما رہی ہے کہ طالب علم کے سامنے سے ایک بار حدیث کا پورا ذخیرہ گزر جائے۔ اس طریقے میں قرأت کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان کے بعض بڑے مدارس میں احقر کو دورۂ حدیث کے درس میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بہت قریب سے اس طریقۂ تدریس کے مشاہدے کا موقع ملا۔ دورہ کے درس میں ایک طالب علم حدیث کی قرأت کرتا ہے اور باقی سب طالب علم خاموشی سے سنتے رہتے ہیں۔ کئی ایسے طالب علم بھی دیکھنے کو ملے جنھوں نے اس درس میں سونے کو غنیمت جانا تھا اور وہ سو رہے تھے۔

ایسے مدارس جن میں دورہ کا طریقہ رائج ہے ان میں قرأت کرنے کے لیے ایک یا دو ایسے طالب علم چنے جاتے ہیں جو عبارت کو صاف اور جلدی پڑھ سکیں۔ درس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ یہ طالب علم قرأت کرتے ہیں اور استاد کچھ ضروری مقامات پر سند و متن سے متعلق بعض امور کی توضیح و تشریح کرتے ہیں۔ شروع کے ایک دو مہینوں میں استاد مختلف موضوعات اور ابواب پر شرح و بسط سے روشنی ڈالتے ہیں تاکہ طالب علم کو اس فن کے اہم مسایل سے مناسبت پیدا ہو جائے لیکن اس طریقہ سے کبھی علم حدیث ایک فن کی حیثیت سے طلبا کے سامنے نہیں آتا۔ اس لیے ان میں مطلوبہ صلاحیت پیدا نہیں ہوتی جس کا نتیجہ ہوتا ہے علمی ناکامی۔ اس علمی ناکامی کی وجہ سے وہ ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

عربی ادب کی تدریس

قدیم زمانے میں جب کہ عربی سرکاری زبان بھی تھی اور علمی بھی اور بہتوں کی مادری زبان بھی عربی ہی تھی۔ اس وقت اقصائے چین سے لے کر اندلس تک عربی زبان بولی، پڑھی اور لکھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ طالب علم مکاتب میں عربی زبان و لغت اور اس کے قواعد کا علم حاصل کر کے مدارس یا اساتذہ کی درس گاہوں

میں جاکر کسی مخصوص فن کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔

اس وقت پڑھائی جانے والی عربی زبان عوام الناس کی زبان بھی تھی اور معیاری زبان بھی اور اس کو پڑھانے کے لیے طریقۂ املا اختیار کیا جاتا تھا۔ اس طریقے سے طالب علم عربی ادب، عربی بلاغت اور عروض سے نہ صرف واقف ہو جاتا تھا بلکہ اس میں ادب پر تنقید کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس وقت کے عربی ادب اور بلاغت کی تعلیم کے معیار کا اندازہ دلایل الاعجاز و اسرار البلاغت سے ہوتا ہے۔

موجودہ مدارس کے نصاب تعلیم کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کہاں سے گر کر کہاں آ گئے ہیں۔ ان مدارس میں عربی ادب کے نام پر جو کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں وہ قدیم ادب سے متعلق ہیں۔ ان میں قدیم شعرا کا کلام اور قدیم زبان ہے۔ نیز اس میں زبان کے قدیم مسایل پر گفتگو ہوئی ہے۔ زمانے کے تغیرات کی وجہ سے موجودہ زبان قدیم زبان سے مختلف ہے۔ اس بات کا احساس مدارس کے لوگوں کو شاید ہے کیونکہ نصاب تعلیم میں مسایل ضروریہ کے استحضار کی تلافی فن کی بہت سی کتابیں رکھ کر کی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک طرف نصاب ثقیل ہو گیا اور دوسری طرف فن کے مباحث و مسایل کے استحضار کے لیے سارا مدار کتابوں کو سمجھنے اور سمجھانے تک محدود ہو گیا۔ اس لیے طالب علم زبان کی حیثیت سے عربی کو نہیں سیکھ پاتے۔

نصاب میں کوئی ایسی کتاب شامل نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ ادب پر تنقید کس طرح کی جانی چاہیے اس کے اصول و مبادی کیا ہیں۔ اس وجہ سے مدارس سے فارغ ہونے والے طلبا میں ادب پر تنقید کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو پاتی۔ دوسری نصاب کی کمی یہ ہے کہ اس میں جدید عربی ادب کو کوئی مقام نہیں مل سکا ہے اس لیے مدرسے کا طالب علم عربی زبان و ادب اور بلاغت و عروض پڑھنے کے باوجود اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ بلاتکلف اپنے جذبات و خیالات کا اظہار عربی زبان میں کر سکے۔

معلوم ہوا کہ اس طریقۂ تدریس اور نصاب سے مطلوبہ صلاحیتیں پیدا نہیں ہو پا رہی ہیں۔ طلبا کی بنیاد کمزور ہے۔ اسی وجہ سے وہ اسلام کے بنیادی ماخذ قرآن و حدیث سے استفادہ و استدلال نہیں کر پاتے جس کے نتیجے میں اجتہاد کا فقدان ہو رہا ہے اور ملت کے نئے نئے مسایل میں رہنمائی کرنے والے مجتہد موجود نہیں ہیں۔ ان مدارس سے امید تھی کہ ملت کو رہنما ملیں گے لیکن ان پر کروڑوں روپیہ ملت کا خرچ ہونے کے باوجود بھی یہ ملت کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔

اس کمی کو دور کرنے اور مدارس پر ہو رہے خرچ کو کارآمد کرنے کے لیے باصلاحیت طلبا تیار کرنے پڑیں گے۔ ان مدارس میں باصلاحیت طلبا اس وقت تک تیار نہیں ہو سکتے جب تک کہ نصاب تعلیم اور تدریسی کتب کی تبدیلی کے ساتھ طریقۂ تدریس میں تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ طریقۂ تدریس بدلنے سے پورا نظام بدل سکتا ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ ان مدارس سے مطلوبہ صلاحیت رکھنے والے طلبا نکل سکیں گے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲ - شمارہ ۹ (ستمبر ۹۳ء)

کولمبس ــ ایک عظیم جہازراں

ابو سعد *

کرسٹوفر کولمبس کی پیدائش اٹلی کے مشہور شہر جنیوا (Genoa) میں ۱۴۵۱ء میں ایک جُلاہے کے گھر ہوئی کولمبس کے والد اور گھر کے دیگر افراد اُونی کپڑے بنتے تھے اس کا دل اپنے باپ کے کاموں میں نہیں لگتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی سمندری سفر کا بے حد شوقین اور دلدادہ تھا ہر وقت سمندری سفر کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ کولمبس کم عمری میں بحیرۂ روم کو پار کرنے کا خواب دیکھنے لگا تھا۔ وہ صرف چودہ سال کی عمر میں ایک کامیاب ملاح بن چکا تھا۔ ۱۳ اگست ۱۴۷۶ء کو جب اس کے بحری جہاز میں آگ لگی تو وہ ایک چپو (Oar) کی مدد سے تیر کر پرتگالی ساحل پر بآسانی پہنچ گیا تھا۔

۱۴۸۴ء میں کولمبس نے بحری راستے سے ہندوستان جانے کی تجویز شاہ پرتگال کے سامنے رکھی لیکن پرتگال کے بادشاہ نے اس کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ چنانچہ ۱۴۸۶ء میں کولمبس نے اسپین کے بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ آئیزابیلا سے ملاقات کی اور بحری راستے سے ہندوستان پہنچنے کے لیے مالی اعانت کی درخواست کی۔ چونکہ اس وقت شاہ اسپین غرناطہ میں مسلمانوں سے ایک خوفناک جنگ میں الجھا ہوا تھا اس لیے وہ کولمبس کی درخواست پر توجہ نہ دے سکا۔ ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی فتح کے بعد بادشاہ نے کولمبس کو تین بحری جہاز سانتا ماریہ (Santamaria)، پنٹا (Pinta) اور نینا (Nina) مہیا کرایا۔ سانتا ماریا (۱۱۷ فٹ لمبا) کا کپتان کولمبس، پنٹا (۵۰ فٹ لمبا) کا کپتان مارٹن الونسو پنزو اور نینا (۵۰ فٹ لمبا) کا کپتان ونسٹ یانز پنزو تھے۔

آج سے پانچ سو سال قبل ۳ اگست ۱۴۹۲ء کو شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ آئیزابیلا کی سرپرستی، مالی امداد اور حوصلہ افزائی سے تین بحری جہازوں کا چھوٹا بحری بیڑہ اسپین کی ایک چھوٹی بندرگاہ پالوس سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوا۔ ۱۲ اگست کو یہ بیڑا کیناری جزائر (Canary Islands) پہنچا۔ کولمبس ان جزیروں سے اس ملک کی طرف گامزن ہوا جسے اُن دنوں سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔

اس عظیم سفر کی شروعات سے قبل کولمبس نے پٹولمی اور ادریسی کی تصانیف کا مطالعہ کیا تھا اور یہ

* سینئر لکچرر گورنمنٹ پی جی کالج کوٹ دوار - گڑھوال (یوپی)

نتیجہ اخذ کیا تھا کہ:

۱۔ زمین گول ہے۔

۲۔ اسپین کے مغربی ساحل سے ہندوستان کے مشرقی حصوں کی زمینی دوری بہت زیادہ ہے

۳۔ اسپین اور انڈیا کے بیچ سمندری دوری بہت کم ہے۔

۴۔ ایک ڈگری کی لمبائی ۵۶ ۲/۳ میل ہے۔

۵۔ اسپین اور ہندوستان کے درمیان زمینی دوری ۲۸۲ ڈگری اور سمندری دوری صرف ۷۸ ڈگری ہے۔

ان تمام غلط حساب سے کولمبس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کیناری جزیروں سے انڈیا کی دوری ۳۹۰۰ میل ہونی چاہیے۔ جب کہ تقریباً یہی دوری اسپین اور امریکہ کے بیچ ہے۔ زمین کے بیضوی ہونے کے یونانی نظریہ ٹولمی اور ادریسی کی تصنیفات اور نقشوں کو بنیاد مان کر کولمبس اس نتیجہ پر پہنچا کہ کیناری جزیروں سے مغرب کی سمت جانے پر ایک چھوٹے بحری راستے کے ذریعے بھارت اور جنوب مشرقی ایشیا کے دیگر ممالک تک پہنچا جا سکتا ہے چنانچہ عربی اور پرتگالی ملاحوں کے تجربوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کولمبس نے کیناری جزائر سے مغرب کی سمت ایک عظیم سفر کا آغاز کیا۔

یہ سفر کولمبس اور اس کے ساتھیوں کے لیے بہت ہی پریشان کن اور صبر آزما تھا۔ ان کو کئی بار خطرناک طوفانوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن کولمبس اور اس کے ساتھیوں نے ہمت نہیں ہاری۔ کولمبس ایک بڑا جانباز انسان تھا۔ اس میں طاقت کے ساتھ ہمت اور ہمت کے ساتھ ارادہ اور مستقل مزاجی تھی۔ وہ مشکل سے مشکل کام کرنے سے بھی گھبراتا نہ تھا اور جب تک کامیاب نہ ہو جاتا اپنے ارادے سے باز نہ آتا تھا۔

تقریباً دو مہینے کے کٹھن اور خطرناک سفر کے بعد کولمبس کا بحری بیڑہ بحر اٹلانٹک کو عبور کر کے ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء کو بہامہ جزائر کے گواناہانی (Guanahani) جزیرے پر پہنچا۔ یہ جزیرہ اب سان سلواڈور (San Salvador) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کولمبس نے گواناہانی کے علاوہ اور کئی چھوٹے چھوٹے جزیروں کو دریافت کیا۔ سمندری سفر کے دوران کولمبس نے ۱۳ ستمبر ۱۴۹۲ء کو مقناطیسی فرق (Magnetic Variation) کا مشاہدہ کیا جو ایک اہم دریافت تھی۔

کولمبس کا بحری بیڑہ ۱۲ نومبر ۱۴۹۲ء کو اسپین کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں وہ ہیٹی (Haiti) پہنچا۔ اس جزیرے کی قدرتی خوب صورتی سے وہ بہت متاثر ہوا۔ کولمبس نے اس جزیرے کا نام اسپینولا (Espanola) رکھا۔ اسپین پہنچنے پر وہاں کے بادشاہ اور ملکہ نے اس کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

کولمبس ۱۳ اکتوبر ۱۴۹۳ء کو دوسری بار نسبتاً ایک بڑے بحری بیڑے کے ساتھ نئی دنیا کی طرف روانہ ہوا۔ دوسرے سفر میں اس نے جمیکا اور کیوبا کی دریافت کی۔ کولمبس نے وہاں کے مقامی باشندوں کو سونے تلاش میں ناکام رہتے تو انھیں سخت سزائیں دیں۔

کولمبس کو یہ مکمل یقین تھا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا کے جزیروں پر پہنچا ہے۔ اس لیے یہاں سونا کثیر مقدار میں ملنا چاہیے۔ ۱۴۹۴ء میں اس نے ٹینا (Taina) قبیلے کے پانچ سو لوگوں کو گرفتار کر کے اسپین بھیج دیا۔ ان گرفتار شدہ قبائلیوں میں کئی لوگوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تقریباً ۳۰۰ افراد کو سیویلے (Seville) میں فروخت کیا گیا۔ اس طرح غلاموں کی تجارت کا آغاز ہوا

کولمبس نے اپنے تیسرے سفر کے دوران ٹرینیڈاڈ اور جزائر کیپ ورڈے (Cape Verde) اور چوتھے سفر کے دوران مارٹینک جزیرے (Martinique) کی کھوج کی۔ اس طرح کولمبس ہندوستان (جو اس وقت سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا) تو نہیں پہنچ سکا لیکن اس کی ہمت اور اولوالعزمی سے مغربی نصف کرہ (نئی دنیا جسے بعد میں امریکہ کہا گیا) دریافت ہوگیا۔ مغربی نصف کرہ کی دریافت نے علم جغرافیہ کی سرحدوں کو کئی گنا وسیع کردیا۔

کولمبس نے جو نئی دنیا دریافت کی وہ عرب جغرافیہ دانوں خصوصاً ادریسی کی تصنیف اور نقشوں کا مرہون منت ہے لیکن افسوس در افسوس کہ ۱۴ ویں صدی عیسوی کے بعد عربوں میں کوئی ایسا شخص نہ پیدا ہوا جو کہ مسلمان جغرافیہ دانوں کی تصانیف کا فائدہ اٹھا سکتا۔

کولمبس کو مالی امداد اور حوصلہ افزائی کرنے والا شاہ فرڈیننڈ وہی بادشاہ ہے جس نے اسپین سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے کی قسم کھائی تھی اسپین میں مسلمانوں کو شکست دینے کے بعد ہی اس بادشاہ نے کولمبس کو مالی اعانت کی تاکہ وہ ایک بڑی بحری مہم پر روانہ ہوسکے۔

سقوط غرناطہ کے بعد جب اہل یورپ کو ہوش آیا تو انھوں نے بحری سفروں میں حقیقی جاں بازی سے کام لے کر نئی دریافتیں شروع کیں تو تجارتی راستوں میں بھی بے انتہا تبدیلی واقع ہوگئی۔ اس کا اثر مسلمانوں کی دولت اور تجارت پر بھی پڑا۔ چونکہ پرانے بحری تجارتی راستوں پر عربوں اور ترکوں کا قبضہ تھا۔ اس لیے اہل یورپ کے دلوں میں یہ شوق موجزن ہوا کہ مشرق کو جانے والے نئے تجارتی راستے دریافت کیے جائیں۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے سیکڑوں چھوٹی بڑی مہم کی شروعات کیں۔ کولمبس کی کامیاب بحری مہم کے بعد امریگو ویسپکی (Amerigo Vespucci) واسکوڈی گاما، میگیلان (Magellan) فرانسس ڈریک (Francis Drake) اور تسمان وغیرہ نے نئے نئے مقامات کی تلاش کی۔

یوروپی اقوام نئے اور پرانے بحری راستوں پر اس طرح حاوی ہوگئیں کہ مسلمان انتہائی کوششوں کے باوجود آج تک ان راستوں پر قابض نہ ہوسکے پوری دنیا کے تمام مسلم ممالک ان یوروپی قوموں کے کسی نہ کسی شکل میں غلام بنے ہوتے ہیں۔ ان یوروپی قوموں نے نئی دنیا کے اصلی اور مقامی باشندوں کی تہذیب و ثقافت کو مٹا ڈالا۔ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ اس نئی زمین پر لاکھوں کی تعداد میں افریقہ سے کالوں کو غلام بنا کر لایا گیا، جن میں بہت سے کالے مسلمان تھے ان لوگوں کو مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔

ایک تنہا کولمبس نے یوروپی اقوام کو براعظم امریکہ کا مالک بنا دیا۔ کولمبس کو مرے ہوئے تقریباً پانچ سو سال ہوچکے ہیں، لیکن اس کی روح، اس کا ذوق تجسس ابھی تک زندہ ہے۔ یہ ذوق اور تجسس یوروپی اقوام میں منتقل ہوچکا ہے لیکن ہم مسلمان اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

خواجہ حسن نظامی — ایک سماجی مصلح

حسن ضیاء *

اس صدی کے نصف اول میں جن اہل نظر نے مسلم معاشرے کے مسایل اور سماجی برائیوں کو اپنی توجہ اور غور و فکر کا موضوع بنا کر فکر کے نئے چراغ روشن کیے ان میں خواجہ حسن نظامی دہلوی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

اپنے بعض بزرگوں اور معاصرین مثلاً اکبر الہ آبادی اقبال اور حسرت موہانی سے وہ بعض اعتبارات سے فکری ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں اکبر کی قدامت پسندی بھی ہے، اقبال کا سا درسِ عمل بھی۔ ان کی صحافیانہ تحریروں میں بطور خاص حسرت موہانی کا سا مسلم نواز اور مسلم پرست رویہ بھی ہے۔ یہ محض مماثلت اور تقابل کے ظاہری پہلو ہیں۔ خواجہ صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر نظر ڈالیں تو ان کا اپنا مزاج اور رنگ الگ نظر آتا ہے جو ان کی جداگانہ شناخت وضع کرتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۸۷۸ء کو حضرت نظام الدینؒ دہلی کے ایک غریب خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد سید عاشق علی کا گزر بسر درگاہ حضرت نظام الدین کے چڑھاووں پر تھا۔ بچپن میں حسن نظامی معمولی اجرت پر درگاہ کے زائرین کی جوتیوں کی رکھوالی کیا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کی تعلیم روایتی اور مکتبی طرز کی ہوئی۔ عربی فارسی اور اردو زبانوں پر انھیں اچھی مہارت تھی۔ آگے چل کر اردو کے صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے ان کی شخصیت کا ارتقا، تکمیل کے منازل سے ہم کنار ہوا۔ حصول علم کے معاملے میں درسی تربیت سے کہیں زیادہ ذاتی کوششیں نامساعد حالات میں ان کی ممد و معاون رہیں اور انھیں کے بل بوتے پر انھوں نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ خواجہ صاحب کو انگریزی زیادہ نہیں آتی تھی لیکن حالاتِ حاضرہ سے خود کو باخبر رکھنے کے لیے وہ انگریزی اخبار بھی پڑھ کر سنا کرتے تھے۔ ان کی خداداد ذہانت کو ان کے گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے نے چار چاند لگا دیے تھے۔ ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزری لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان معروفیات کے ساتھ ساتھ ان کے مشاغل میں دعائیں بنا کر فروخت کرنا اور گنڈے تعویذ کرنا بھی شامل تھا

★ سی-۱۹۷، قدوائی نگر، ایسٹ، نئی دہلی ۱۰۰۲۳

گو عمر کا ابتدائی حصہ مالی دشواریوں میں گزرا مگر بعد کی زندگی خوش حالی اور فارغ البالی سے عبارت نظر آتی ہے۔ بحیثیت صاحب قلم اور تاجر ان کی آمدنی معقول تھی۔ ان کے مریدوں کا وسیع حلقہ بھی ان کی خوش حالی کے اسباب میں سے تھا خواجہ صاحب کا انتقال ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو دہلی میں طویل علالت کے بعد ہوا۔ ان کی نجی زندگی کو دیکھیں تو ہر طرف گرمیٔ عمل کا دور دورہ نظر آتا ہے اور ان کے صبح و شام گوناگوں مصروفیات سے پُر نظر آتی ہیں۔ ان کے یہاں دائرۂ حیات تصنیف و تالیف تک محدود نہیں ہے اس میں زندگی کا ہر رنگ جلوہ گر ہے اور ان کی دلچسپیاں ہزار رنگ رکھتی ہیں۔

بحیثیت صاحب قلم، ادب کی دنیا میں خواجہ صاحب کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ وہ انشا پرداز بھی ہیں صحافی بھی، خاکہ نگار بھی ہیں سوانح نگار بھی۔ ان کے قلم کی زرخیزی اور تنوع حیرت ناک حد تک کم مثال ہیں۔

ان کی بعض تحریریں وقتی اور تجارتی نوعیت کی ہوسکتی ہیں لیکن بحیثیت کالم نگار اور انشا پرداز (Essayist) خواجہ صاحب وقت کی کسوٹی پر کھرے اترے ہیں اور یہی حیثیت ان کے ادبی مرتبے کے تعین کی بنیاد ہے۔ گو ان کی مختلف النوع تصانیف کی کل تعداد سیکڑوں میں ہے۔

زیر نظر مضمون میں خواجہ حسن نظامی کی ان تحریروں کا ذکر مقصود ہے جن کا تعلق سماجی اصلاح سے ہے ان کے رسالے منادی میں (جس کی اشاعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے) اور ان کے کتابچوں میں سماجی اصلاح کے موضوع پر ان گنت تحریریں ملتی ہیں مُفلسی کا مجرب علاج، جیسے کتابچے خاص کر مسلم معاشرے میں پھیلی برائیوں اور لعنتوں کے گہرے مشاہدے اور ان کے سماجی شعور کی غمازی کرتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام سماجی لعنتوں پر قلم اٹھایا اور سماج کو اصلاح کی جانب راغب کرنے کی بھرپور سعی کی۔

مفلسی کا مجرب علاج میں تضیع اوقات اور فضول خرچی سے خبردار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ زندگی کا ایک منٹ بھی بیکار ضائع نہ ہو، اس کے بعد اپنے مصارف کو دیکھنا چاہیے اس میں کتنی فضول خرچی ہوتی ہے اور ایسے کتنے خرچ ہیں کہ اگر ان کو بند کر دیا جائے تب بھی گزارہ ہوسکتا ہے کچھ ضرورت نہیں کہ کھانے میں کئی قسم کے سالن ہوں۔ اگر قرض کا بار ہے تو ایک ہی سالن پر گزر اوقات کرلینی چاہیے۔ ایسا ہی لباس میں بھی سادگی اور کفایت شعاری کا خیال رکھنا چاہیے۔" ص ۸

بے معانی رسوم اور رواجوں کو ترک کر دینے کے وہ زبردست حامی تھے۔ منادی میں اس بارے میں اکثر لکھتے رہتے تھے۔ خوشی کی زندگی کے زیر عنوان اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں... ہر شہر یا کم از کم ہر برادری کے لوگ مجتمع ہوں رسوم کی ایک فہرست بنائی جائے جو رسوم متفقہ رائے سے متروک ہوسکیں انھیں ترک کیا جائے۔

باقی ماندہ رسوم کے متعلق متفقہ طور
سے تجویز کیا جائے کہ کسی آمدنی
کا آدمی ان پر کیا صرف کرے
اس طرح مصارف کی حد بندی
سے بہت آسانی پیدا ہو جائے
گی۔"

خواجہ صاحب کے یہاں محنت مزدوری
ن حلال کمانے کا ذریعہ ہیں ان میں ذلت کا
ئی پہلو انھیں نظر نہیں آتا۔ وہ محنت کی قدر
(Dignity of Labour) کے قایل ہیں۔
س بارے میں لکھتے ہیں:

"صنعت وحرفت کو اگرچہ تعلیم کی
طرح عزت اور کرسی نشینی کا شرف
حاصل نہیں لیکن اس میں ذرا
بھی شبہ نہیں کہ یہ بھوک کا تیر
بہدف علاج ہے۔ غربا کے لیے
اس سے زیادہ بہتر اور کوئی ذریعہ
معاش نہیں ہے۔ صنعت وحرفت
کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس
لیے صدہا ایسی حرفتیں ہیں جن کو غربا
کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جاسکتا
بلکہ متوسطین بھی ان کا فائدہ
اٹھا سکتے ہیں"
(خوشی کی زندگی۔ صفحہ ۳۸)

محنت مزدوری کی اہمیت کو اجاگر کرتے
ہوئے ۴ر نومبر ۱۹۳۲ء کے روزنامچے میں لکھتے
ہیں:

"میں تو آج کل کامل درویش
اس کو سمجھتا ہوں جو حلال روزی
کے لیے محنت کرتا ہو۔ معاملہ کا
سچا ہو اور دوسروں کو فائدہ
پہنچانے کا کام کرتا ہو۔ ورنہ جماعت
کی پابندی اور عبادت کر لینے اور
خدمتِ خلق کے لیے وقت نہ
بچانا کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ تاہم
اب بھی مسلمانوں کی اکثریت ان
ہی باتوں کو پسند کرتی ہے اور
میرے خیال کے آدمی بہت
کم ہیں۔"

خواجہ حسن نظامی کا ایک سبق آموز کارنامہ
یہ ہے کہ انھوں نے درگاہ میں بیٹھ کر چڑھاوے
اور نذریں وصول کرنے کے اپنے استحقاق پر
ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ خود محنت کر کے آمدنی کے
ذرایع پیدا کیے۔ ان کے روزنامچے ان کی شبانہ
روز کی محنت اور کام کی لگن کا پتہ دیتے ہیں
کام کا یہ معمول اکثر بیماری کی حالت میں بھی برقرار
رہتا تھا۔

ان کی تحریر کی ایک خوبی ان کی صاف گوئی
اور کھلاپن (Candour) ہے۔ اردو میں ایسی
مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔ اکثر روحانی شخصیات
خواہ کتنا ہی تاجرانہ ذہن کیوں نہ رکھتی ہوں مگر اس
کے سرِعام انکشاف سے شرماتی ہیں مگر حسن نظامی
تجارت کو محنت سے کھانے کمانے کا ذریعہ خیال
کرتے ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۳۲ء کے روزنامچے میں
یوں رقم طراز ہیں:

میرا ہر خرچ اصول تجارت کے
ماتحت ہے۔ یعنی ایک کا خرچ
دو کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

اس لیے میں فضول خرچ نہیں
ہوں، البتہ کنجوسی کو دل کی قوت
کے لیے کمزور کرنے والا
سمجھتا ہوں۔"

خواجہ حسن نظامی کے اصلاحی خیالات
کی یہ محض ایک جھلک ہے۔ ہزاروں صفحات
پر محیط ان کی تحریروں میں سے بیشتر کا موضوع
بھلے ہی براہ راست اصلاح نہ ہو مگر بین السطور
میں اسی جذبے کی کارفرمائی مثبت اور
تعمیری انداز میں نظر
آتی ہے۔

"ہماری قوم میں صرف دو باتوں کی
کمی ہے۔ اول یہ کہ تمام قوم میں بلکہ
تمام مسلمان قوموں میں اور ان کی تمام
آبادیوں میں بچوں کی تعلیم کا خیال
کم ہے اور بالتخصیص اس تعلیم کا جو
کہ ضرورت حال کے زمانے میں ہے
گویا کہ مطلق نہیں۔ دوسری بڑی آفت
یہ ہے کہ لوگ جو کچھ کرنا کچھ چاہتے ہیں
مختلف خیالات اور مختلف طریقے اختیار
کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ لوگوں کی
کیا حالت ہو گئی ہے۔ بجائے اس کے
کہ موٹی بتی کا چراغ روشن کریں۔ اس
کا ایک تار الگ الگ کر کے جلاتے
ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا کے بہت
سے حصوں میں روشنی پھیلاتے ہیں مگر
ایسی روشنی پلک جھپکانے تک کو سجھو تو
نہیں، پھر وہی اندھیرے کا اندھیرا ہے۔"

سر سید احمد خاں

آخری قسط

مدرسۃ الاصلاح میں طبی کتابوں کا ذخیرہ

محمد عارف اصلاحی *

۱۲ طب اکبر فارسی: کتب خانے میں اس کے تین نسخے موجود ہیں لیکن صرف دو ہی مکمل ہیں اور دونوں اپریل ۱۸۸۰ء مطابق جمادی الاول، ۱۲۹۷ھ میں تیسری مرتبہ کے منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے چھپے ہوئے ہیں۔ مصنف محمد اکبر عرف محمد ارزانی ابن میر حاجی محمد مقیم ہیں۔ جلد اول کے ایک نسخہ کے آخری صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے "بروز پنجشنبہ تاریخ ۱۳ اکتوبر ۱۸۹۲ء مطابق ۲۱ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ جلد اول طب اکبر ختم شد"۔ اسی طرح جلد دوم کے آغاز کی تاریخ ۲۳ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ دی ہوئی ہے۔ پوری کتاب نظری و عملی طبی مقالات پر مشتمل ہے۔ جلد دوم امراض کبد سے شروع ہوتی ہے۔

۱۳ طب اکبر اردو: یہ طب اکبر فارسی کا ترجمہ ہے جسے محمد حسین صدیقی نانوتوی نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ مترجم نے اپنے ترجمے کی بابت صفحہ ۷۷۹ پر اس طرح وضاحت کی ہے۔ "اس حقیر نے حتی الامکان شرح اسباب، سدیدی اور اقسرائی سے دیکھ کر ترجمہ کیا ہے۔ اگر کہیں غلطی ہو تو اس کا یہ سبب ہے کہ طب اکبر میں اکثر ان کتابوں کے مضامین ہیں جن کا ملنا دشوار ہے" کتاب کے نام کے سلسلے میں کہتے ہیں "اس ترجمہ کا نام تاریخی سن ہجری کے موافق مظاہر العلاج ۔۱۲۸۱۔ رکھا گیا اور اس نام کو جناب فضیلت مآب بحر علوم مولانا محمد یعقوب صاحب سلمہ اللہ نے تجویز فرمایا" اور مولانا محمد یعقوب صاحب اس کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔ اس ترجمہ میں رعایت ترجمہ تحت لفظی کی نہیں ہے اور اتباع الفاظ مصنف کا بھی بالکل نہیں چھوڑا البتہ کہیں کہیں توضیح مطالب کی وجہ سے کچھ الفاظ زاید ہو گئے ہیں۔

طب اکبر جلد اول کا ایک نسخہ اور بھی موجود ہے جسے حضرت شاہ محمد ارزانی طب اکبر فارسی کو اردو زبان میں منتقل کیا ہے اور ملک سراج الدین پرنٹر و پبلشر نے استقلال پریس لاہور کشمیری بازار سے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں کل بارہ ابواب ہیں اور ہر باب میں چند فصلیں۔ پہلے باب میں ۲۸ فصلوں کے تحت امراض سر کا ذکر ہے اور بارہویں باب میں معدے کے امراض کا بیان ہے جو ۳۳ فصلوں کے تحت ہے۔ اس کے علاوہ طب اکبر (جلد دوم) کا ایک نسخہ اور بھی ہے جس کے ناشر الحاج شیخ غلام حسین اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور ہیں۔

علاج الامراض، حکیم محمد شریف خاں دہلوی کی یہ فارسی تصنیف حکیم خلیل الدین حیدر کی تصحیح کے ساتھ احمدی پریس میرٹھ سے ۱۲۷۷ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے منشی خلیل الدین حیدر کے قطعہ تاریخ طبع کا آخری مصرعہ یوں ہے۔

صد شکر کہ نسخۂ شفا طبع نمود ۱۲۷۷ھ

کتاب کے صفحہ ۴، ۵ پر ادویہ کی درجہ بندی کے طریقے

* کرولی، سرائے میر۔ اعظم گڑھ۔

مع اشکال وخلے کے بتائے گئے ہیں۔ پوری کتاب کے اندر بیس مقالوں میں مختلف فصلوں کے تحت حروف تہجی کے اعتبار سے مرکبات کا ذکر ہے مثلاً لبوب کے بارے میں صفحہ ۲۶۲ پر یوں ہے، "لبوب آبریشم از اختراع بعضے متاخرین تقویت گردہ و باہ کند و تولید منی بافراط نماید۔ مغز بادام، مغز حبۃ الخضرا، مغز حب الزلم، مغز حب الفلفل مسک، بہمن سفید، تخم خشخاش، دارچینی، زنجبیل، دار فلفل کبابہ، قرنفل، ورق نقرہ، تخم ہلیون، خولنجان از ہر یک نیم تولہ زعفران یک تولہ، مغز فندق، مغز چلغوزہ، مغز پستہ، تودری سرخ، تودری زرد ہر یک تولہ و نیم نارجیل شقاقل ہر یک چہار تولہ، ابریشم خام یا دسیر عالمگیری آبریشم مقرض پنج تولہ گلاب نیم سیر عسل سہ چند سمہ"

۱۴۔ شرح الاسباب والعلامات

حکیم نفیس بن عوض کی جملہ امراض کے اسباب و علامات بتانے والی یہ کتاب (دو جلدوں میں) عربی زبان میں ہے۔ جلد اول امراض معدہ پر ختم ہوتی ہے اور جلد ثانی کا آغاز جگر کے امراض سے ہوتا ہے۔ کتب خانے میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔ ایک بہ تصحیح و تحشی حکیم مولوی سید محمد صادق علی لکھنوی جولائی ۱۸۷۹ء میں منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے چھپا ہوا ہے اور دوسرا نسخہ (دونوں جلدوں کے ساتھ) جنوری ۱۸۹۸ء میں اسی پریس سے تیسری مرتبہ کا شائع شدہ ہے۔ تصحیح کا انتظام پریس والوں نے خود کیا ہے۔

۱۵۔ الادمان (Addiction) مظاہرہ وعلاجہ

ڈاکٹر عادل دمرداش کی ۳۱۸ صفحے کی یہ کتاب عالم المعرفہ نیشنل کونسل آف کویت فار آرٹس، لٹریچر س اینڈ کلچرس کی جانب سے شوال ۱۴۰۲ھ مطابق اگست ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ اپنے سلسلے کی ۵۶ ویں کڑی ہے اور چودہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں خمر و مخدرات ادمان (Addiction) اس کے اسباب، غلط استعمالات، خمر افیون اور اس کے مرکبات اور تدخین (Smoking) پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اس پوری کتاب میں ۷۷ حوالوں سے کام لیا گیا ہے۔

۱۶۔ کنوز الصحۃ و یواقیت المنحۃ

محمد تونسی ابن سلیمان کی ۲۴۸ صفحات کی یہ کتاب عربی زبان میں میمنہ پریس مصر سے جمادی الاول ۱۳۲۱ھ میں منظر عام پر آئی ہے۔ شروع کے ۱۳ صفحات نہایت پیلے اور بادامی رنگ کے ہو گئے ہیں اور باقی اس کے بعد کے صفحات تو نہایت بوسیدہ کمزور اور خاکستری رنگ کے ہو گئے ہیں جیسے کسی بھٹی کی چمنی کے پاس مدتوں پڑی رہی ہے۔ کتاب جیسا کہ نام سے واضح ہے، صحت کے انمول رازوں کو وا کرتی ہے۔

۱۷۔ اکسیر اعظم:

مکمل چاروں جلدیں موجود ہیں اور چوتھی جلد کے بھی تین نسخے ہیں۔ ایک نسخہ باہتمام محمد عبدالرحمن ابن حاجی محمد روشن خاں اواخر ربیع الآخر ۱۲۹۰ھ میں نظامی پریس کان پور سے شائع ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ فروری ۱۸۸۵ء میں منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے دوسری مرتبہ کا طبع شدہ ہے اور تیسرا نسخہ جون ۱۹۰۶ء مطابق ۱۳۲۵ھ میں منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے بار سوم کا چھپا ہوا ہے۔ جلد چہارم امراض ظہر و اطراف تا معالجات سموم مع جدول فہرست تحقیقات معانی اوزان و ادویہ مرکبہ پر مشتمل ہے۔ جلد سوم امراض کبد سے شروع ہوتی ہے اور جلد دوم کا آغاز لب و کنج دہن سے ہوتا ہے اور جلد اول، دوم، سوم منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے بار سوم کی طبع شدہ ہیں۔ صاحب اکسیر اعظم حکیم محمد اعظم خاں رامپوری نے مقدمے میں قانون، کامل الصناعۃ، ذخیرہ خوارزم شاہی، اقسرائی، نفیسی، فردوس الحکمت، حاوی کبیر،

برء الساعۃ اور ریاض العلاج وغیرہ سے کتاب کی تیاری
میں مدد لینے کا اعتراف کیا ہے۔ کتاب کی زبان فارسی
ہے۔

۱۸۔ محیط اعظم:

جلد اول رجب ۱۳۱۳ھ میں زیر اہتمام محمد عبدالرحمٰن بن حاجی محمد روشن خاں مطبع نظامی کان پور سے طبع شدہ ہے۔ شروع کے صفحہ ۸ تک قوانین ادویہ کے سلسلے میں مقدمہ ہے۔ محیط اعظم جو تحفۃ المومنین اور مخزن الادویہ جیسی ایک تصنیف ہے جس میں ادویہ مفردہ کے یونانی، ہندی، انگریزی نام، افعال و خواص اور ماہیت و مزاج کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں حکیم محمد اعظم خاں نے ۶۸ معتبر و مستند کتابوں سے حکما متقدمین و متاخرین کے اقوال و تجربات کو بھی شامل کیا ہے اور مختلف ویدک تقویم سے بھی سہارا لیا ہے۔ کتاب کی زبان فارسی ہے۔

۱۹۔ رموز اعظم۔

کتب خانے میں اس کی صرف جلد دوم موجود ہے۔ زیر نظر نسخہ حسب فرمائش شیخ ذکراالدین و نذیر حسین دہلی کے افتخار پریس سے فارسی زبان میں طبع شدہ ہے۔ جلد دوم مقالہ سیزدہم در امراض کبد و مرارہ و طحال سے شروع ہو کر صفحہ ۲۲۴ پر سموم ملدوغہ گزیزاین در حشرات پر ختم ہو جاتی ہے۔

۲۰۔ مطب علوی خاں

زیر نظر نسخہ نومبر ۱۸۸۳ء میں منشی نول کشور پریس کان پور سے چھپا ہوا ہے۔ کتاب میں تمام امراض بدن کے علاج کے سلسلے میں اصول و قواعد بیان کیے گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ میں صفحہ ۹۲ سے محمد بدرالدین ابن خواجہ جمال الدین کا فارسی زبان میں رسالہ بحران بھی ہے۔ مطب علوی کے ساتھ ترجمہ میزان الطب اور رسالہ قارورہ بھی مجلد ہیں۔ ترجمہ میزان الطب حکیم محمد اکبر ارزانی کے رسالہ میزان الطب کا اردو ترجمہ ہے اس کے مترجم مولانا محمد حامد علی خاں شاہ آبادی ہیں۔ صفحہ ۲۰۸ سے آگے ان بعض رسایل کے بھی ترجمے ہیں جو میزان الطب کے ملحقات میں شامل ہیں۔ مثلاً رسالہ دلایل النبض، رسالہ دلایل البول، رسالہ بحران اور رسالہ قارورہ۔ آخر میں اس کی تاریخ طبع از جناب منشی بھگوان دیال عاقل یوں نقل ہے۔

چھپا وہ ترجمہ میزان طب کا اردو میں
کہ لوح دہر میں ہرگز نہیں ہے جس کا جواب
لکھو جو فکر ہے تاریخ طبع کی عاقل
چھپی ہے طب میں یہ عمدہ ہے بے نظیر کتاب

رسالہ قارورہ کے مترجم سید غلام یحییٰ نے اپنے رسالے کے بارے میں خود وضاحت کی ہے " اسی لحاظ سے عاصی حقیر نے کتاب مبسوط طب اکبر کو بطریق سوال و جواب زبان اردو میں ترجمہ کیا و اتمام کو پہنچایا ہے اور اس رسالے کو بھی واسطے فہم و انکشاف مطالب دقیقہ کے اسی نہج پر ترتیب دیتا ہے"۔ نسخہ ہذا نومبر ۱۸۹۱ء میں منشی نول کشور پریس کان پور سے پہلی مرتبہ کا چھپا ہے۔ رسالہ دلایل النبض کے مصنف علامہ یوسفی ہیں اور رسالہ کل دس صفحے کا ہے۔ رسالہ دلایل البول بھی علامہ یوسفی کا فارسی زبان میں سات صفحے کا ایک رسالہ ہے اس کے خاتمے پر فارسی کے دو اشعار یوں درج ہیں۔

احکام بول راچو زدہ فکر یوسفی
بہر تو جمع کرد و جمیع برادران
تاریخ سال تا کہ شود روشنت بدان
قارورہ گیر چار صد و سی فزا بران"

رسالہ بحران کو حکیم بدرالدین ابن خواجہ جمال الدین نے
مولانا حکیم منصور علی خاں مرادآبادی کی فرمائش پر لکھا
تھا جو باہتمام جناب مولانا حبیب الرحمٰن ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ
مطابق مارچ ۱۹۱۴ء میں قاسمی پریس دیوبند سے طبع
ہوا۔ آخرالذکر تینوں رسالے (دلائل النبض، دلائل
البول، رسالہ بحران) انجمن طلبا مدرسہ کی لائبریری
دارالمعلومات میں محفوظ ہیں۔

۲۱۔ میزان الطب

حکیم محمد اکبر ارزانی کی ۱۸۴ صفحات کی اس فارسی
تصنیف کے دو نسخے مدرسے میں محفوظ ہیں۔ ایک عربی
کتب خانے میں اور ایک دارالمعلومات میں۔ اس کے
اندر تین مقالے ہیں۔ پہلا مقالہ چاروں کیفیتوں کی علامات
کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ دوسرا مقالہ مفرد و مرکب ادویہ
اغذیہ کے بیان میں ہے اور تیسرا مقالہ امراض اور
ان کے علاج سے بحث کرتا ہے۔

۲۲ مجربات رضائی

سید رضا حسن جعفری بن سید ہدایت حسین
عرف سید ریحان کے فارسی زبان میں مجربات ہیں۔
مقدمہ میں طبی اوزان دیے ہوئے ہیں۔ حروف
تہجی کے اعتبار سے مرکبات کے مفرد اجزاء مع اوزان
خواص اور طریقۂ استعمال ہیں۔ زیر نظر نسخہ منشی نول
کشور پریس کان پور سے ۱۸۶۸ء میں چھپا ہے۔

۲۳۔ مجرباتِ اکبری

اس میں محمد اکبر ابن حاجی میر محمد مقیم نے علاج و
معالجہ سے متعلق فارسی زبان میں اپنے تجربات جمع کیے
ہیں۔ زیر نظر نسخہ کے صفحہ ۱۶۰ سے آگے کے اوراق ضائع
ہو گئے ہیں۔ کتاب کرم خوردہ ہے۔

۲۴۔ تجرباتِ اکملی

محمد اصغر ابن حاجی میر مقیم کی ۱۹۱ صفحات پر
مبسوط فارسی کی زیر نظر کتاب تجربات اکملی مرتضوی پریس
لکھنؤ سے شایع شدہ ہے۔ کتاب کی شروعات "در
ترکیب خوردن ہلیلہ باعتبار فصول سال" سے ہوتی ہے
اور خاتمہ "طریق خوردن سیماب" پر ہوتا ہے۔ کتاب
دیمک زدہ ہے۔

۲۵۔ سدیدی

یہ علاء الدین علی ابن ابوحزم قریشی کی کتاب
"موجز القانون" کی شرح ہے جسے سدید کازرونی نے
تیار کیا ہے۔ اس کے دو نسخے کتب خانے میں موجود
ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب "الفن الثالث" سے شروع
ہوتی ہے۔

۲۶ اقصرائی

اس کے تین مکمل نسخے موجود ہیں۔ ۱۸۷۷ء،
۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۸ء کے) اقصرائی بھی موجز القانون کی
شرح ہے۔ شرح کی زبان عربی ہے اور حاشیے سے
مزین کیا ہے۔ جمال الدین اقصرائی نے جلد اول کے
مقدمے میں لکھا ہے کہ جب انھوں نے حکیم ابوالحسن قرشی
عرف ابن نفیس کی کتاب موجز القانون کا مطالعہ شروع
کیا تو اس میں جگہ جگہ اشکالات پیش آئے لہٰذا یہیں
سے انھوں نے طلبائے طب کے فائدے کی خاطر اور خود
حصول ثواب کی نیت سے اس کی شرح لکھنے کا ارادہ
کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے کئی مستند
تصانیف کی طرف رجوع کیا۔ مثلاً قانون، حاوی، کامل
اور حکیم نجیب الدین سمرقندی کی تالیفات میں سے بہت
کچھ حاصل کیا اور اس کا نام حل الموجز رکھا کیوں کہ یہ
موجز کے اشکالات کا حل پیش کرتی ہے۔ صاحب کتاب
نے موجز کے مقاصد اور قاعدے کلیے کو بھی ذکر کیا ہے
اقصرائی دونسخوں پر مَن ــــ سے لکھا ہوا ہے اور
ایک پر سَن ــــ سے۔

۲۷- النفیسی

نفیسی جو کلیات و معالجات کے فن پر ملا نفیس بن عوض ابن جمال الدین کی عربی زبان میں علاء الدین علی ابن ابو الحزم قرشی کی کتاب موجز القانون کی شرح ہے، کے چار نسخے یہاں کتب خانے میں موجود ہیں۔ ایک نسخہ بہ تصحیح ابو الفیض محمد یوسف یوسفی پریس فرنگی محل سے شوال ۱۳۲۸ھ میں بار دوم کا چھپا ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ بہ تصحیح مفتی محمد ایوب بحسن انتظام محمد ادریس انصاری جنوری ۱۹۲۶ء میں بار چہارم کا چھپا ہوا ہے، جب کہ تیسرا نسخہ باہتمام محمد عبدالرحمن نظامی پریس کان پور سے ذی الحجہ ۱۲۸۸ھ میں طبع شدہ ہے۔ ان کے علاوہ ایک چوتھا نسخہ غیر مکمل ہے۔ نفیسی کو حاشیہ سے مزین مولوی عبدالعلیم نے کیا ہے۔

۲۸ موجز القانون

علاء الدین علی ابن حزم قرشی کی اس عربی تصنیف کے بہ تصحیح سید محمد حسن تین نسخے کتب خانے میں موجود ہیں۔ (جولائی ۱۸۹۳ء، مارچ ۱۹۰۹ء اپریل ۱۹۲۴ء کے چھپے ہوئے) موجز القانون میں طب کے جزء نظری کے قوانین ہیں۔ ارکان، اخلاط، مزاج، ارواح، قویٰ اور اعضا کا ذکر ہے اور ادویہ مفردہ اغذیہ کے بھی احکام ہیں۔ اس کے علاوہ ان مخصوص امراض کا بھی بیان ہے جو کسی ایک عضو کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔

۲۹ شرح موجز القانون

یہ مولانا شیخ جمال الدین اقسرائی کی وہ شرح ہے جو انھوں نے اقسرائی کے طرز پر علاء الدین علی ابن حزم قرشی کی موجز القانون کی تشریح کے لیے تیار کیا تھا میں نے مطالعے کے دوران موجز القانون اور اس شرح کے متون میں بہت سی جگہوں پر لفظی اختلاف پایا۔ شرح موجز کی زبان عربی ہے لیکن رسم الخط اردو ہے متن کے لیے قال المؤلف کے الفاظ ہیں اور تشریح کے لیے شارح نے اقول کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کتاب نہایت بوسیدہ اور اوراق اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ مڑے ہوئے کو اس کی اصل جگہ واپس لانے کی کوشش میں اس سے ایسے جدا ہو جاتے ہیں جیسے ماہر درزی اپنی تیز قینچی سے کپڑے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دے۔

۳۰۔ الموجز المحشی بالحشیہ الجدیدہ

موجز القانون کی یہ شرح جسے حکیم ابو سعید محمد عبدالمجید خاں نے کیا ہے، مجتبائی پریس دہلی سے ۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۲ھ میں چھپی ہے۔ ۴۸۸ صفحات میں یہ کتاب نامکمل ہے۔

۳۱ ترجمہ قانون شیخ بوعلی سینا

یہ ترجمہ فروری ۱۸۹۹ء میں نول کشور پریس کانپور سے پہلی مرتبہ کا چھپا ہوا ہے۔ صفحہ ۲۴۳ پر مترجم کی جانب سے ایک خاتمہ ہے جس میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ ترجمے کی ابتدا قصبۂ کنتور میں یکم ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ ہوئی اور ۱۴ رجب ۱۳۰۲ھ کو بمقام لکھنؤ تمام ہوا۔ اس ترجمے کے علاوہ ایک اور ترجمہ مولوی حکیم سید غلام حسنین کا بھی ہے جسے فروری ۱۸۸۰ء میں منشی نول کشور کے حسب ایما زیور طبع سے آراستہ کیا گیا۔ جلد پنجم میں دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ چند مقالوں پر مشتمل ان مرکبات کے سلسلے میں ہے جن کی تراکیب مختلف قرابادین میں مذکور ہیں اور دوسرے حصے میں جملہ امراض میں مجربات اور کا بیان ہے۔ جلد چہارم میں ان امراض سے بحث کی گئی ہے جو کسی عضو میں بالتخصیص نہیں ہوتے بلکہ عمومی ہوتے ہیں۔ جلد چہارم سات فنون پر مشتمل ہے جن میں حمیات بحران اور اورام و بثور اور قروح وغیرہ علیحدہ علیحدہ بیان کیے

گئے ہیں۔ جلد چہارم دسمبر ۱۸۹۱ء کی طبع شدہ ہے۔ اس کے مترجم نے کامل الصناعہ کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

۳۲۔ حسابات القانون

شیخ الرئیس بوعلی سینا بخاری کی مشہور زمانہ کتاب القانون کا حیات سے متعلق ایک علیحدہ رسالہ ہے جسے سید محمد عبدالاحد نے مجتبائی پریس دہلی سے بتصحیح حکیم مولوی محمد عبدالرزاق عربی حاشیہ کے ساتھ رجب ۱۳۱۳ھ میں شایع کیا ہے۔ اس کے دو نسخے یہاں پر ہیں۔ دوسرا نسخہ بتصحیح حکیم محمد واصل خاں باہتمام محمد عبدالاحد ۱۳۲۲ھ میں چھپا ہوا ہے۔

۳۳۔ قانونچہ

حکیم حاذق محمد ابن محمود چغمینی کا یہ مشہور و معروف عربی طبی رسالہ ۱۹۰۹ء میں زیر اہتمام رام جی رحمت رب صمد ابو الحسنات قطب الدین تیسری مرتبہ کا طبع شدہ ہے۔ ۹۲ صفحات کا یہ رسالہ ایک مقدمہ اور دس مقالوں پر مشتمل ہے۔ رسالے کے اندر امور طبعیہ، تشریح بدن انسانی احوال بدن اور ان کے استدلال، نبض و بول، حفظان صحت کی تدابیر، امراض رأس وظاہر بدن اور ماکولات و مشروبات وغیرہ کے متعلق الگ الگ مقالے ہیں۔ یہ قانونچہ انجمن طلبا کی لائبریری دارالمعلومات میں محفوظ ہے۔

۳۴۔ ترجمہ قانونچہ

اسے مولوی حکیم غلام حیدر نے عربی رسالے قانونچہ سے اردو میں منتقل کیا ہے اسی کے ساتھ حنین ابن اسحاق کے عربی رسالہ قبریہ کا بھی اردو ترجمہ جلد بند ہے۔

۳۵۔ رسالہ قبریہ

قبر سے برآمد کیا جانے والا بقراط کا یہ مختصر سا رسالہ امیر المومنین مامون رشید کے زمانہ میں حنین ابن اسحاق نے یونانی زبان سے عربی میں منتقل کیا۔ اس میں بقراط کے پچیس اہم تجربات محفوظ ہیں جنھیں ابوالطب بقراط نے اپنا سرمایۂ حیات سمجھا تھا۔ اس رسالے کی وجہ تسمیہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب بقراط کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے شاگردوں سے وصیت کی کہ اس کے ان ۲۵ احکام و مسایل طبی کو جو اس کی زندگی کا ماحصل ہیں ہاتھی دانت کے ڈبے میں بند کر کے محفوظ طریقے سے اسی کے ساتھ قبر میں دفن کر دیا جاے۔ چنانچہ شاگردوں نے وصیت کی تعمیل کی۔ بہت زمانے کے بعد اس کا علم جب اور لوگوں کو ہوا تب روم کے بادشاہ نے اس بیش قیمت خزینہ کو باہر نکلوایا۔ ان پچیس احکام میں سے ایک یہ ہے " اگر مریض کے چہرے پر ورم ہو، سبب نامعلوم ہو اور اس کا بایاں ہاتھ اس کے سینے پر پڑا رہے تو جان لو کہ اس کی موت تیرہ دنوں کے اندر ہو جاے گی خاص کر جب مریض ابتدائے مرض میں اپنے نتھنے سے کھیلتا ہو یعنی بار بار اس کا ہاتھ نتھنے پر جاتا ہو" یہاں رسالہ قبریہ کے دو نسخے ہیں ایک دارالمعلومات میں اور دوسرا عربی کتب خانہ میں۔ دونوں ایک ہی سال اور ایک ہی پریس (۱۹۰۹ء نامی پریس لکھنو) سے چھپے ہوے ہیں۔ اس رسالے کے ساتھ دسمبر ۱۸۹۱ء کا طبع شدہ رسالہ قانونچہ بھی جلد بند ہے۔

۳۶۔ مفرح القلوب

یہ دو جلدوں میں ہے اور اس کے تین نسخے یہاں پر موجود ہیں۔ ایک نسخہ ماہ اپریل ۱۸۸۶ء میں پانچویں بار کا منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شایع شدہ ہے جس کے خاتے پر "شرح وافی قانونچہ لب ست" لکھا ہوا ہے۔ دوسرے نسخے کے بارے میں "نسخہ در شرح کلیات طبیہ و معالجات طبیہ" لکھا ہوا ہے۔ صاحب کتاب حکیم محمد اکبر ارزانی نے فارسی زبان میں اسے پانچ مقالوں میں مرتب کیا ہے پہلا مقالہ امور طبیعیہ کے سلسلے میں دوسرا تشریح (اناٹومی) کے لیے تیسرا اعمال بدن ... اور پانچواں ... کے بیان کے ...

۳۷ رسالہ تریاق اکبر

یہ رسالہ غالباً جناب حکیم اصغر حسین کا تیار کردہ ہے۔ زیر نظر نسخہ حکیم خواجہ محمد حسن صاحب کے حواشی کے ساتھ کانپور پریس کان پور سے ربیع الاول ۱۲۷۳ھ میں شائع ہوا ہے۔

۳۸ کفایۂ منصوری و رسالہ چوب چینی

پہلی مرتبہ قاسمی پریس دیوبند میں مولانا منصور علی خاں مراد آبادی کی فرمائش پر باہتمام مولانا حبیب الرحمٰن صفر ۱۳۳۴ھ کی چھپی ہوئی ہے۔ یہ کتاب میں نے دارالعلوم میں دیکھی ہے۔

۳۹ حدود الامراض

حکیم محمد اکبر ارزانی کا ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ ابوالحسنات قطب الدین احمد کے زیر اہتمام مارچ ۱۹۰۹ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع شدہ ہے۔

۴۰ علم الابدان۔

فن طب نظری میں جامع کلیات و جزئیات علم الابدان حکیم واجد علی کی ۷۰ صفحات کی یہ فارسی تصنیف جون ۱۸۹۰ء میں اودھ اخبار پریس لکھنؤ سے پہلی مرتبہ کی چھپی ہوئی ہے۔

۴۱ بحر الجواہر

جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ کی طبع شدہ حافظ ابوالحسنات خواجہ قطب الدین احمد کے حاشیے کے ساتھ محمد ابن یوسف الطبیب الہروی کی عربی۔ اردو طبی لغت بحر الجواہر کے تین نسخے یہاں موجود ہیں۔ ایک نسخہ علم الابدان اور حدود الامراض کے ساتھ مجلد ہے اور دو علیحدہ علیحدہ ہیں۔

۴۲ نظرۃ وعیان وتبیان فی مقالۃ "اسماء اعضاء الانسان"

یہ ابوالحسین احمد ابن فارس ابن زکریا ابن حبیب الرازی القزوینی [illegible]

ڈاکٹر فیصل دبدوب نے پیش کیا ہے اور دمشق سے مجمعۃ اللغۃ العربیہ نے مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق ۱۹۶۷ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں انسانی اعضاء کے لیے فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں مستعمل الفاظ کے معانی عربی زبان میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کو مجمع اللغۃ العربیہ دمشق نے مکتبہ مدرسۃ الاصلاح سرا[illegible] کو ہدیہ کیا ہے۔

۴۳ الحشرات الناقلۃ للامراض

مختلف بیماریوں کو پھیلانے کے ذمہ دار کیڑے مکوڑوں سے متعلق تفصیلات پیش کرنے والی ڈاکٹر ابوالحب کی یہ کتاب رمضان ۱۴۰۲ھ میں المجلس الوطنی للثقافۃ والفنون والآداب کویت کی جانب سے طبع ہوئی ہے۔ کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر ابوالحب نے وضاحت کی ہے کہ انھوں نے مدرسۃ الطب الاستوائی لندن کے استاد ڈاکٹر بوزفاین کی کتاب کے طرز پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب کا نام

ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس سلسلے میں دسیوں مقالوں اور کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے جن میں سے ایک

بھی ہے۔ پوری کتاب جامعہ بغداد سے ۷۹-۱۹۷۸ء میں شائع شدہ کتاب "الحشرات الطبیہ والبیطریۃ" اور عالمی ادارۂ صحت کی رپورٹوں جدولوں اور خاکوں سے مزین ہے۔ آخر میں "جماعات ضد الملاریا" کے عنوان سے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ پورے عالم میں ملیریا کے خلاف [illegible]

۴۴ [illegible] احمد سکندرپوری کی تصنیف یاقوتی [illegible]

★ عثمان پاڑہ، علی گڑھ

یہ نسخہ بفرمائش حکیم محمد عبدالقدوس سکندرپوری نظامی
پریس کان پور سے ۱۲۹۷ھ میں چھپا ہے۔ یا قوتی
ماحصل مجموعہ ہے استاد حکیموں وطبیبوں مثلاً
مسیح الدولہ حکیم مرزا محمد علی اور حکیم علی حسین خاں وغیرہ
کے تجربات کا۔ کتاب کے آخر میں یہ اعلان ہے " یہ
کتاب بموجب قانون بستم ۱۸۴۷ء کے داخل ہی رجسٹری
گورنمنٹ ہوئی "

۴۵۔ امرت ساگر

کتاب کا خاتمۃ الطبع صفحہ ۷۶۴ پر اس قسم کے
جملے ہیں۔ " چنانچہ بموجب خواہش شائقین کے منجانب مصارف
کثیر ماہر زبان سنسکرت و بھاکھا فارسی واردو پنڈت
پیارے لال صاحب کاشمیری عرف رگو مترجم زبان بھاکھا
اور سنسکرت و اردو مطبع ہذا نے بہت خوبی سے ترجمہ
کیا اور علامات وتشخیص امراض کو کمال ہی تشریح اور
تصریح سے رقم کیا ہے۔ الحاصل وہی ترجمہ اردو امرت
ساگر مذکور مطبع عالی جناب منشی نول کشور صاحب واقع
کان پور میں سرپرستی عالی جناب منشی پراگ نرائن صاحب
بھارگو مالک مطبع دام اقبالہ بماہ جون ۱۹۰۲ء بار ہشتم
زیور طبع سے آراستہ ہوا۔" پیارے پنڈت لال صاحب
نے صفحہ ۷۷۴ پر کتاب کے متعلق لکھا ہے " ..... لہٰذا
مترجم کتاب ہذا نے نہایت مشقت اور جاں فشانی سے
اکثر کتب سنسکرت مثل نگھنٹ، باگبھٹ، چرک، سشترت،
رام نبود، بھاوپرکاش وغیرہ کی اعانت سے جس سے مجموعہ
ہذا تیار ہوا ہے، ایک کل مشکل الفاظ کا فرہنگ تیار
[illegible] کہ اردو پڑھنے

میں دقت واقع ہوتی تھی کل کتاب کے ناگری حرفوں میں
علیحدہ لکھے تاکہ عمل کے وقت صحیح طور سے زبان سے
نکلیں اور اس فرہنگ میں اکثر معلمان علم بیدک کی
بھی مدد لی گئی اور کئی دوائیں کہ معدوم ہو گئی ہیں اور
ان کے عوض میں اور مشہور دوائیں استعمال کی جاتی
ہیں ان کی تشریح بھی بشرح بسیط فرہنگ ہذا میں درج
کی گئی ... اور بہت محنت اور مشقت سے علم بیدک
کے محاورات بھی حل کر کے لکھے۔

۴۶۔ تحفۃ العاشقین

۲۸۸ صفحے کا فارسی زبان میں یہ رسالہ
۲۴ محرم ۱۲۹۰ھ کو اسلامی پریس بمبئی سے شائع ہوا
ہے۔ رسم الخط اردو ہے۔ یہ ایک ایسا تفریحی طبی رسالہ
ہے جس میں دنیائے حسن وعشق کو رنگین بنائے رکھنے
کے لیے جام صحت اور محبوب کی مہندی کا ذکر ہے کتاب
بہت دلچسپ ہے۔

۴۷۔ تاریخ اطبائے بہار

جلد اول صفحات ۱۹۲ء اسے صاحب کتاب
حکیم محمد اسرارالحق نے ۱۵ مئی ۱۹۸۲ء کو برائے لائبریری مدرسۃ
الاصلاح ہدیہ کیا ہے جو عربی کتب خانے میں محفوظ ہے۔
مدرسۃ الاصلاح کے عربی کتب خانے مکتبہ مدرسۃ
الاصلاح میں متذکرہ بالا کتابوں اور رسالوں کے علاوہ
رفیق منزل موچی دروازہ لاہور سے ہر ماہ پابندی سے
حکیم محمد شریف ایچ پی ایل ایل کی ادارت میں شائع ہونے
والے موقر طبی رسالے " الحکیم " کی ماہ نومبر ۱۹۲۷ء سے
ماہ اکتوبر ۱۹۳۰ء تک کی مجلد فائلیں بھی محفوظ ہیں۔

... حل کیا۔ اس
... اہم تجربات محفوظ ہیں جنہیں ابوالطب

تیسرا اصال بدن ...
ہذا مہر حفظان صحت کے بیان کے لیے ہے

جہیز کی بلی پر چڑھتی معصوم دلہنیں

شاہد قمر آفریدی ایڈوکیٹ*

جہیز ایک ایسی بیماری ہے جو سماج کے ہر طبقہ کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی جہیز کی بڑھتی ہوئی لعنت سے بے حد پریشان ہیں چھوٹے سے لے کر بڑا آدمی تک اپنی اولاد کی شادی کے لیے فکر مند رہتا ہے لیکن جب طرفین میں شادی کے موقع پر لین دین کی باتیں ہوتی ہیں تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ معاملات سلجھنے کے بجائے اور بھی الجھ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی دلہنیں والدین کی مفلسی پر خودکشی کر لیتی ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ہمارا وجود سماج کے لیے ایک بوجھ ہے۔ بہت کم ایسے شریف دولہے ہوتے ہیں جو بغیر کسی جہیز اور مطالبات کے شادی کرتے ہیں۔

جہیز کے سلسلے میں نمبر ۲ طریقے کے امیروں نے اس رسم کو اور بھی بڑھاوا دیا ہے کہ اس طرح ان کا کالا دھن بھی سفید ہو جاتا ہے، برادری میں ان کی ناک اور بھی اونچی ہو جاتی ہے۔ وہ قابل پڑھے لکھے لڑکے کو ماہر شکاری کی طرح پہلے تو تاکتے رہتے ہیں پھر اپنا جال اس کو جکڑنے کے لیے پھینکتے ہیں۔ منگنی کے نام پر اسکوٹر و دیگر قیمتی تحائف وغیرہ دینا تو ان کے لیے معمولی بات ہے اور دلہن کی رخصتی کے موقع پر کار کا وعدہ اس پڑھے لکھے دولہے کو لالچی بنا دیتا ہے۔ اس طرح دولہا نیلام ہو جاتا ہے اور متوسط گھرانے کی وہ غریب لڑکیاں جو شکل و صورت کے اعتبار سے خوب صورت اور سیرت کے اعتبار سے اعلیٰ کردار کی ہوتی ہیں وہ بے چاری گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں کہ کب مناسب شادی کا پیغام آئے۔ پھر وہ غریب شخص اپنی حیثیت سے زیادہ لڑکی کی شادی کے موقع پر جہیز دیتا ہے اور خود مقروض رہ کر باراتیوں کو خوش کرنے کے لیے اچھا کھانا پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ساس سسر کے پھر بھی منھ ٹیڑھے رہتے ہیں خوش قسمتی سے اگر اچھے گھرانے میں شادی ہو گئی جہاں نیکی ایمان داری اور شرافت جیسی اعلیٰ قدریں موجود ہیں تو یہ شادی باغ و بہار کا نمونہ بن جاتی ہے اور بدقسمتی سے اگر لڑکے کے گھرانے کے لوگ بدخصلت واقع ہوئے تو زندگی بھر معصوم دلہن کڑھتی رہتی ہے۔ اور اس طرح ایک خاندان برباد ہو جاتا ہے۔

ہر لڑکی کے والدین و متعلقین اس کے رشتے کے لیے ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ لڑکا ہر اعتبار سے اچھا ہو۔ کبھی کبھی ان کی یہ پرکھ بھی لڑکی کو بوڑھا بنا دیتی ہے اور

---

* عثمان پاڑہ، علی گڑھ

ان حالات میں پھر کہیں الٹا سیدھا رشتہ عجلت میں کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ امید افزا نہیں نکلتا۔

ہم روزانہ اخبارات، اور میگزینوں وغیرہ میں پڑھتے ہیں کہ شادی کے موقع پر جہیز کی مانگ پر بارات واپس لوٹ گئی دلہن نے خودکشی کر لی یا جلاد دولہے نے معصوم دلہن کو جلا کر مار ڈالا۔ وغیرہ۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جہیز کے مطالبے پر صنف نازک ہی زیادہ متاثر ہوتی ہیں یہ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ لڑکے نے خودکشی کی ہو۔

انجینیر، ڈاکٹر، سائنس داں، آئی اے ایس آفیسر وغیرہ تک راہیں طے کرنے کے لیے یقیناً والدین اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیتے ہیں مگر شادی کے عین موقع پر کچھ بھاری ترطیں یہ سہانا سپنا بکھرا دیتی ہیں۔ امیر طبقہ ہو کہ غریب طبقہ دونوں ہی جہیز کی لعنت سے محفوظ نہیں ہیں۔ سماج میں اس بڑھتے ہوئے کینسر کا آخر علاج کیا ہے؟ اس کے لیے ہم نوجوانوں کو سوچنا ہو گا اور فلاحی تنظیمیں بنانا ہوں گی، بلا تفریق مذہب اور بغیر امتیاز کے۔ سرکار اس سلسلے میں بہت دانشمندانہ قدم اٹھا رہی ہے۔ ریڈیو، ٹی۔ وی پر جہیز کے لالچی افراد سے متعلق نصیحت آمیز ڈرامے، کہانیاں پیش کرتی ہے جو عام زندگی کے لیے ایک مفید چیز ہے۔ اس سلسلے میں قانون بھی بنا دیا گیا ہے۔ عمل کہاں تک ہوتا ہے

اب یہ ہمارے نوجوانوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے لیے کس سطح پر سوچتے ہیں۔

یوں تو بزرگوں نے نئی نسل کو روشنی عطا کی ہے لیکن زمانہ بدلا، طور طریقے بدلے، اب بزرگ گھر کے کونوں اور کمروں میں پڑے رہتے ہیں نئی نسل ان سے مشورہ نہیں لیتی اور جیسا جی کرتا ہے وہ طریقہ اپناتی ہے جس کے نتیجے میں یہ نادانی بزرگوں سے لاتعلقی خاندان کے اندر مسایل پیدا کر دیتی ہے، چین و سکون ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا بزرگوں کو اس طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے مشورے پر غور کرنا چاہیے۔ اور اگر کسی مسئلے پر رائے میں اختلاف ہے، تو ان سے پیار و محبت سے سمجھاتے ہوئے وضاحت کیجیے کہ اب آپ کے دور کی چیزیں بدل رہی ہیں۔ ان حالات میں ایسا ہی مناسب ہے تو وہ

جہیز کی لعنت کو ختم کرنا سمجھیے کینسر کی بیماری پر قابو پانے کے مترادف ہے اور اس طرح جہالت بھی کوڑھ کی بیماری ہے۔ جہاں تک کوشش ہو سکے تعلیم حاصل کرنا چاہیے کہ اس سے اندھیرے ختم ہوتے ہیں اور روشنی میسر آتی ہے۔

زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے ان سنہرے اصولوں کو اپنانا چاہیے تاکہ ہم دوسروں پر کبھی بوجھ نہ بن سکیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"جس کو یہ پسند آتا ہے کہ
لوگ اس کے سامنے تعظیم سے کھڑے
رہیں اس کو اپنی جگہ دوزخ میں
ڈھونڈھنی چاہیے۔"

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲ شمارہ ۹ (ستمبر ۹۳ء)

اتر پردیش کے تیرہ جونیئر ہائی اسکولوں میں

مسلم بچے سات فی صد آگے بڑھ کر بھی آٹھ فیصد پیچھے چلے گئے

احمد رشید شروانی *

چارٹ میں ہمارے تیرہ جونیئر ہائی اسکولوں کے ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء کے رزلٹ پیش ہیں۔ یعنی یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ کہاں کسی اسکول میں گزشتہ تعلیمی سال کے دوران آٹھویں کلاس کی سطح پر مسلم بچے تعلیم میں آگے بڑھے تو کتنے اور اگر خدانخواستہ آگے بڑھنے کی بجائے الٹے پیچھے گئے تو کتنے پیچھے گئے۔ نتائج کے ساتھ ایک آخری کالم یہ دکھانے کے لیے بڑھا دیا گیا ہے کہ ہر ایک اسکول میں آٹھویں کلاس کے بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد میں کتنا اضافہ ہوا یا کتنی کمی آئی۔

جونیئر ہائی اسکول امتحان

۱۹۹۲ء شریک امتحان	۱۹۹۲ء پاس تعداد	۱۹۹۲ء فرسٹ ڈویژن تعداد	۱۹۹۲ء فرسٹ ڈویژن فی صد	جونیئر ہائی اسکول کا نام۔ مقام۔ ضلع	۱۹۹۳ء شریک امتحان	۱۹۹۳ء پاس تعداد	۱۹۹۳ء فرسٹ ڈویژن تعداد	۱۹۹۳ء فرسٹ ڈویژن فی صد	فیصد اضافہ/کمی
				مسلم					
۱۶	۱۲	۳	انیس	حاتم سرائے، سنبھل مرادآباد	۲۷	۲۵	۷	چھبیس	انتہر
۱۵	۱۵	۶	چالیس	فیض عام گرلز۔ چندوسی، مرادآباد	۲۳	۲۳	۱۱	اڑتالیس	ترین
۳۵	۳۳	۱۴	چالیس	ایک آنہ فنڈ۔ لکھنو۔	۴۴	۴۲	۲	پانچ	چھبیس
۳۳	۳۳	۴	بارہ	یاسینیہ۔ گنائیڈیہہ۔ پرتاپ گڑھ	۳۸	۳۸	۶	سولہ	پندرہ

* ۱۲۔ اے کناٹ پلیس، نئی دہلی

۴۴ ۴۴	۲۱ ۴۴	۵ ۲۷	اکیس اکسٹھ	عربیہ فیضان العلوم، بہادرگنج، غازی پور امامیہ۔ رسڑا۔ بلیا	۲۷ ۴۷	۲۴ ۴۷	۱۰ ۲۷	سینتیس ستاون	تیرہ سات
۱۷۰	۱۶۳	۵۹	پینتیس	چھ میں مسلم کا ٹوٹل (اضافہ والے)	۲۰۶	۱۹۹	۶۳	اکتیس	تینتیس
۹	۹	۲	بائیس	ایس ایس اے انٹراسی کالاں مرادآباد	۹	۹	۳	تینتیس	برابر
۴۰	۳۹	۱۹	اڑتالیس	نیشنل دودھیڑو۔ مظفرنگر	۳۹	۳۹	۲۰	اکیاون	تین
۲۷	۲۷	۵	انیس	اسلامیہ۔ شیوپتی نگر۔ سدھارتھ نگر	۲۶	۲۵	۱۴	چون	چار
۲۵	۲۵	۱۸	بہتر	نسواں۔ بھورا۔ بلیا	۲۳	۲۳	۷	تئیس	آٹھ
۳۷	۳۷	۱۰	ستائیس	صابر میموریل۔ دریاباد۔ بارہ بنکی	۳۳	۳۳	۶	اٹھارہ	گیارہ
۱۱	۱۱	۵	پینتالیس	قادریہ گرلز۔ رسڑا۔ بلیا	۹	۹	۵	چھپن	اٹھارہ
۲۱	۲۱	۱۱	باون	اسلامیہ۔ گنگولی۔ غازی پور	۱۵	۱۵	۳	بیس	انتیس
۱۷۰	۱۶۹	۷۰	اکتالیس	سات میں مسلم کا ٹوٹل (کمی والے)	۱۵۴	۱۵۳	۵۸	اڑتیس	نو
۲۳۷	۳۳۱	۱۲۹	اڑتیس	تیرہ میں مسلم کا ٹوٹل	۳۶۰	۳۵۲	۱۲۱	چونتیس	سات
۲۱۲	۲۰۸	۵۰	چوبیس	تیرہ میں غیر مسلم کا ٹوٹل	۲۴۴	۲۴۲	۴۴	اٹھارہ	پندرہ

مثلاً ۱؎ سرکاری جونیر ہائی اسکول حاتم سرائے سنبھل ضلع مرادآباد میں آٹھویں کلاس کے بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد ۱۹۹۲ میں سولہ سے بڑھ کر ستائیس ۲۷ ہوگئی۔ گیارہ عدد کا یہ اضافہ انہتر فی صد ہے۔

۲؎ فیض عام گرلز جونیر ہائی اسکول چندوسی ضلع مرادآباد میں مسلم بچیوں کی تعداد پندرہ سے بڑھ کر تیئس ہوگئی۔ آٹھ عدد کا یہ اضافہ ترپن فی صد ہے۔

۳؎ اسی طرح ایک آنند جونیر ہائی اسکول لکھنؤ میں پینتیس سے بڑھ کر چوالیس یعنی چھبیس فی صد زیادہ۔

۴؎ یاسینیہ جونیر ہائی اسکول گناٹیڈیہ، ضلع پرتاب گڑھ میں تینتیس ۳۳ سے بڑھ کر اڑتیس یعنی پندرہ فی صد زیادہ

۵؎ عربیہ فیضان العلوم جونیر ہائی اسکول بہادر گنج ضلع غازی پور میں چوبیس سے بڑھ کر ستائیس یعنی تیرہ فی صد زیادہ اور

۶؎ امامیہ جونیر ہائی اسکول رسڑا ضلع بلیا میں ۴۴ سے بڑھ کر ۴۷ یعنی سات فی صد زیادہ۔ گویا چھ اسکولوں میں ملاکر آٹھویں کلاس کی سطح پر مسلم بچوں کی تعداد ایک سو سڑسٹھ ۱۶۷ سے بڑھ کر دو سو چھ ۲۰۶ ہوگئی۔

انتالیس ۳۹ عدد کا یہ اضافہ تئیس فی صد ہے۔ اضافے کی یہ رفتار اطمینان بخش کہی جا سکتی ہے۔

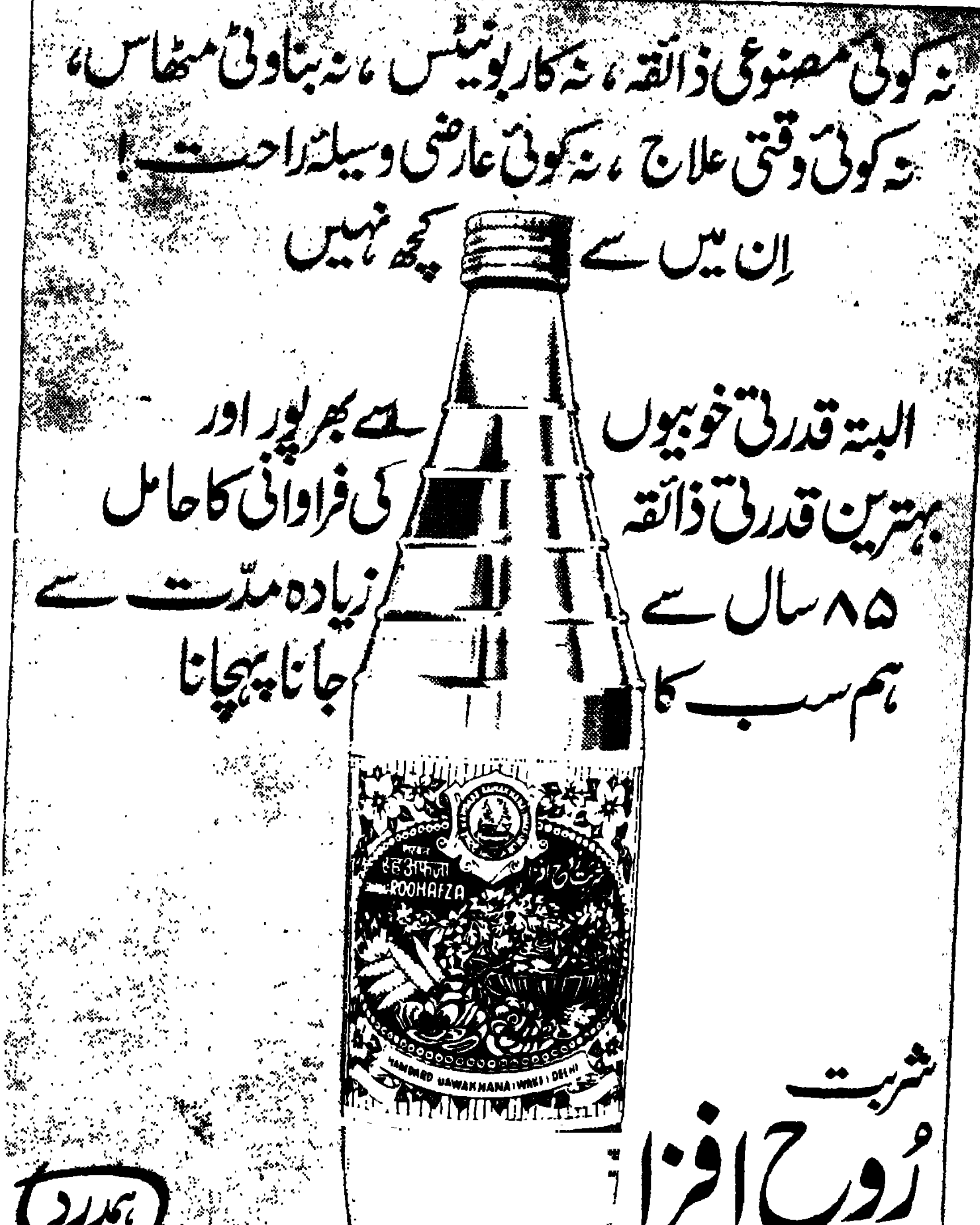
سات میں کمی

مگر افسوس کی بات ہے کہ باقی سات اسکولوں میں اسی سطح پر مسلم بچوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ یعنی مسلم بچوں کی تعلیم کو کوئی فروغ حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ان اسکولوں میں مجموعی طور پر آٹھویں کلاس کے امتحان میں شریک ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد ۱۹۹۲ میں ایک سو ستر ۱۷۰ سے گھٹ کر ۱۹۹۳ میں ایک سو چون ۱۵۴ ہو گئی۔ سولہ عدد کی یہ کمی نو فی صد ہے۔ گویا ان اسکولوں میں مسلم بچے آگے بڑھنے کی بجائے الٹے پیچھے کی طرف گئے۔ اب اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ کون سے اسکول میں مسلم بچوں کی تعداد کتنی کم ہوئی۔ یعنی مسلم بچے تعلیم میں کتنے پیچھے گئے تو چارٹ میں ملاحظہ فرمایئے۔

ان اسکولوں میں غیر مسلم بچوں کے اعداد کا چارٹ الگ سے نہیں بنایا گیا ہے۔ تاہم تیرہ اسکولوں میں ملا کر غیر مسلم بچوں کی تعداد آٹھویں کلاس کی سطح پر ۱۹۹۲ میں دو سو بارہ ۲۱۲ سے بڑھ کر ۱۹۹۳ میں دو سو چوالیس ۲۴۴ ہو گئی بتیس عدد کا یہ اضافہ پندرہ فی صد ہے۔ گویا مسلم جونیر ہائی اسکولوں میں بھی غیر مسلم بچے گزشتہ سال کے دوران پندرہ فی صد آگے بڑھے۔ مگر مسلم بچے صرف سات فی صد آگے بڑھے۔ یعنی غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلم بچے آٹھ فی صد پیچھے چلے گئے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ سال بہ سال غیر مسلم پندرہ فی صد آگے بڑھیں اور مسلمان صرف سات فی صد آگے بڑھیں۔ یعنی غیر مسلموں کی بہ نسبت مسلمان ہر سال آٹھ فی صد پیچھے اور پیچھے ہوتے جائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

" سر سید احمد خاں کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں۔ خواہ اس سمت میں نہ ہوں جو سر سید پسند کرتے۔"

خالدہ ادیب خانم


نہ کوئی مصنوعی ذائقہ ، نہ کاربونیٹس ، نہ بناوٹی مٹھاس،
نہ کوئی وقتی علاج ، نہ کوئی عارضی وسیلۂ راحت!
اِن میں سے کچھ نہیں
البتہ قدرتی خوبیوں سے بھرپور اور
بہترین قدرتی ذائقہ کی فراوانی کا حامل
۸۵ سال سے زیادہ مدّت سے
ہم سب کا جانا پہچانا
ROOHAFZA
شربت
رُوح افزا
ہمدرد

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد ۱۲ | شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۹۳ء

بانی ... سرسید احمد خاںؒ

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

: مدیر :

کبیر احمد جائسی

انچارج سرکولیشن ... نائب مدیر ... تزئین

شفیق احمد ... احمد مجتبیٰ قریشی ... سرفراز

Phone : 24827

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

Editor, TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH. 202002

زر سالانہ :

انڈیا Rs. 45.00

بیرونی ممالک ہوائی ڈاک US $ 20.00

عام ڈاک US $ 8.00

مندرجات

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پبلشر: کبیر احمد جائسی۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق
اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مطبع: مسلم یونیورسٹی پریس۔ علی گڑھ

اداریہ

اُن علیگ برادران کو جو آسودۂ ساحل ہیں اور ان کو بھی جو تلاشِ ساحل میں سرگرمِ سفر ہیں، یومِ سرسید مبارک ہو۔

سرسید احمد نے جس دور میں اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی وہ ہندوستانی مسلمانوں کے افلاس، نکبت، توہم پرستی، طرزِ کہن پہ اڑنے اور آئینِ نو سے ڈرنے کا دور تھا۔ مسلمان قوم ایک فکری انتشار اور عملی دو رخی کا شکار تھی۔ منزل کی تلاش تو بہت سے دلوں کو گرما رہی تھی مگر گم کردہ راہی نے منزل تو کیا غبارِ منزل سے بھی بہت دور کر رکھا تھا۔ دین تو پہلے ہی خرافات و اوہام کی نذر ہو چکا تھا رہی سہی دنیا بھی ۱۸۵۷ء کا سیلِ بے اماں اپنے ساتھ بہا کر لے جا چکا تھا۔ قوم کیا تھی مرد و زن کا ایک ہجوم تھا جو بے دست و پا ہو کر وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ خس و خاشاک کی طرح رواں دواں تھا۔ ایسے عالم میں سرسید احمد کی تحریک نے شبِ ظلمات میں امید کا ایک چھوٹا سا چراغ روشن کیا جس کی مدھم روشنی میں گم کردہ راہ ملت نے ایک نئے سفر کا آغاز کیا، سرسید احمد کے خلوص، دل سوزی، قومی ہمدردی، للٰہیت اور گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونے نے بڑی حد تک ذہنوں میں مدتوں کی جمی ہوئی برف کو پگھلایا، چیزوں پر نظر ڈالنے کا ایک معروضی اور سائنسی نقطۂ نظر دیا، جدید طرزِ تعلیم کی اہمیت و معنویت کا احساس دلا کر اس قندیلِ علم و حکمت کو روشن کیا جس کی روشنی پھیلتی ہی چلی گئی۔

سرسید کے بعد ان کے رفقا نے ان کی تحریک کو اسی جوش و جذبے، خلوص اور قومی ہمدردی سے جاری رکھا۔ وقت اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس میں وہ توسیع کی جس کو نافہم افراد انحراف کا نام دیتے ہیں۔ وقت گزرتا رہا اور سرسید احمد کی شروع کی ہوئی تحریک پیچ و خم کا سامنا کرتی ہوئی منزل بہ منزل آگے بڑھتی رہی۔ اِس صدی کے پانچویں دہے میں جب ملک تقسیم ہوا تو اتنا زبردست طوفان آیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا سب کچھ اُڑا

کر لے گیا۔ خاندان بٹ گئے، افراد تتر بتر ہو گئے اور اداروں پر جانکنی کا عالم طاری ہو گیا۔ سر سیّد احمد کی آغاز کردہ تحریک بھی اس طوفان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اس نئے زمین و آسمان کے تلے بڑے ہی صبر، تحمل، بردباری اور ہوشمندی کے ساتھ اس تحریک کو پیش رفت کی راہوں پر گامزن کرنے کی ضرورت تھی۔ ہمارے بڑوں سے اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکا وہ کرتے رہے۔ زمانہ اُن کا مخالف اور اپنے اُن پر زبان طعن دراز کرتے رہے، مگر ہمارے بڑے اپنے کام میں دیوانہ وار مصروف رہے۔ افراد بدلتے رہے، پیش منظر سے ہٹتے رہے، نئے آنے والے مختلف قسم کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس تحریک کو کسی نہ کسی شکل میں زندہ رکھے رہے۔

ملک کی تقسیم اور انتقال آبادی نے ایک بار پھر ہندوستانی مسلمانوں کو پس ماندہ بنا دیا۔ بدلے ہوئے حالات میں علم کی جگہ جہل نے ہوشمندی کی جگہ بے جا و بے مقصد جوش و خروش نے ملّت کی شیرازہ بندی کی جگہ گروہ بندی نے، ایثار و قربانی کی جگہ مفاد پرستی نے لے لی۔ اگر آج کے ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرے پر تجزیاتی نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوگا کہ آج ایک بار پھر ہندوستانی مسلمان انہی مسائل و مصائب سے دوچار ہے جن کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے سر سیّد احمد نے اپنی تحریک شروع کی تھی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ سر سیّد احمد کے معنوی ورثا، خواہ وہ طالب علم ہوں یا استاد، صرف تعلیم ہی کی پیش رفت پر اپنی توجہ مرکوز نہ کریں بلکہ سر سیّد احمد کی تحریک کے اصلاحی پہلو پر بھی نظر رکھیں اور جہاں تک ہو سکے تعلیم کے ساتھ ساتھ اصلاح معاشرہ کا بھی فریضہ انجام دیتے رہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سر سیّد احمد کی آغاز کردہ تحریک صرف تعلیم ہی کے میدان میں محدود نہ تھی، اس کا ایک نمایاں اور اہم پہلو اصلاح معاشرہ بھی تھا جس کو موجودہ زمانے میں ہم نے بڑی حد تک فراموش کر دیا ہے۔

یومِ سر سید احمد کے موقع پر ہم وابستگان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے درخواست کرتے ہیں کہ سر سید احمد کی تحریک کے اس پہلو سے صرفِ نظر نہ کریں اور اس سلسلے میں جو کچھ بھی ہو سکے، کرتے رہیں، اگر معاشرہ ہی بگڑا رہا تو ساری تعلیمی جدّ و جہد، اس کے لیے ساری تگ و دو، پیسے اور وقت کی قربانی سب شجرِ بے ثمر بن کر رہ جائے گی۔

کبیر احمد جائسی

سرسید کا سیاسی موقف

حسن سبحانی *

ہندوستان پر کم و بیش سات سو سال حکومت کرنے کے بعد جب اپنی نا اہلی اور نالائقی کی بنا پر مغلیہ حکومت کا آفتاب لب بام آگیا اور سراج الدین بہادر شاہ ظفر نام کے بادشاہ اور رکام کے فقیر بن گئے تو ملک کے ایک بڑے طبقہ کا اپنے قدیم آقائے نعمت کے ساتھ کیا رویہ رہا؟ ہر موقع شناس، ابن الوقت، خودغرض اور خود مطلب قوم کی طرح انھوں نے بھی انگریزوں کا ساتھ دینا شروع کیا، ان کے ورود پر خوشی کا اظہار کیا اور انھیں اپنی استعانت کا یقین دلایا، ان سے خفیہ تحریری اور زبانی معاہدے کیے، ان کی برتری کو بلا تامل اور تذبذب قبول کر لیا۔ اپنے ہر قدیم ورثے کو بالائے طاق رکھ کر مغرب سے درآمد ہونے والی چیزوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آخر راجہ رام موہن رائے اور انھیں کے سے دوسرے بنگالی اور مدراسی قائدین کون تھے؟ مسلمانوں کو جدید تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کو بلا تردد اور تذبذب کے قبول کرنے میں بجا تکلف تھا۔ اس لیے کہ ان کو جن چیزوں کے حصول کے لیے ہر قسم کی ترغیب و تحریکیں دی جا رہی تھیں وہ ان کی اپنی چیزوں کے مقابلے میں بہت حقیر اور کم تر تھیں۔ درج بالا طبقے کی فکر کا رخ بالکل دوسری جانب تھا۔ وہ تو مغلیہ حکومت کے اختتام اور اتمام کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ دکھانے کے لیے تو وہ شاہان مغلیہ کا ساتھ دیتا رہا لیکن در پردہ تو وارد حکمرانوں کی آمد اسے دل سے پسند تھی اور ان کی حکومت کے استحکام اور استقلال کے لیے اس نے وہ سب کچھ کر ڈالا جو اُن کی حب الوطنی کا تقاضہ تھا۔

جب ۱۸۵۷ء کی یورش ختم ہوگئی جس میں پیش پیش مسلمان تھے اور انھیں ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ چشم سر سے دیکھ رہے تھے کہ حکومت تو جا ہی رہی ہے، وہ چیزیں بھی معرضِ خطر میں ہیں جو ہر علوی اور معنوی زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں دنیاوی زندگی تو بہر حال چند روزہ ہے وہ کسی نہ کسی طرح شاد و ناشاد کٹ ہی جاتی ہے سوال حسین آخرت اور حسنِ انجام کا ہے کہ دوامی زندگی تو وہی ہے۔ حکومتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں، جاہ و جلال آتا جاتا رہتا ہے اور دولت و ثروت جو محض اتفاق کی بات ہے، آج آپ کے پاس ہے، کل دوسرے کے پاس۔ بھلا ایسی آنی جانی چیز کا کیا لحاظ اور کیا پاس۔ اس کے برعکس ایمان و اعتقاد اور اقدار ایسی چیزیں تو نہیں ہیں کہ اگر ایک مرتبہ جاتی رہیں تو انھیں

---

* ۷۔ قدوائی ہوسٹل۔ سلیمان ہال۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ

دوبارہ حاصل کیا جاسکے۔ سارے مصائب و آلام جھیلنے اور مزید آفات برداشت کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کو اس دینی تہذیبی اور علمی ترکے کی فکر تھی جو اُن کے آبا و اجداد نے سیکڑوں سال کی جاں فشانی، جگر کاوی اور عرق ریزی کے بعد اپنی آنے والی نسلوں کی زندگی کو بامعنی اور بامراد بنانے کے لیے چھوڑا تھا۔ ان کے پیش نظر اپنی آل و اولاد کی دنیوی زندگی کی راحت و آسودگی اتنی نہیں تھی جتنی ان کی دینی اور اخروی صلاح و فلاح۔

اگر علم الانسان اور علم النفسیات کے عالموں کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ ہر انسان کی شخصیت کی تشکیل اور سیرت کی تعمیر میں اس کے والدین، اساتذہ، ماحول اور گردوپیش کا بڑا دوررس اور پائیدار اثر پڑتا ہے تو پھر اس لحاظ سے سرسید بہت خوش طالع اور بخت آور تھے۔ انھیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صلبی اولاد ہونے کا شرف و سعادت حاصل تھی۔ وہ حسنی اور حسینی سید تھے۔ ان کے والد میر متقی اسم بامسمیٰ، فقیر منش اور درویش صفت بزرگ تھے اور وہ اپنی گوناگوں صفات کی بنا پر اکبر شاہ ثانی کی ناک کے بال اور معتمد الیہ تھے۔ سرسید کا ننھیال بھی ہر اعتبار سے ممتاز اور منفرد تھا۔ ان کے نانا خواجہ فریدالدین احمد ایک ذی علم اور صاحب فضل تھے۔ علوم ریاضیات میں ید طولیٰ اور آلات ہیئت کی تشکیل اور استعمال میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ علم و فضل کے علاوہ انھیں دنیوی وجاہت بھی حاصل تھی۔ اللہ نے انھیں سب کچھ دے رکھا تھا۔ ایسے جامع الصفات عالم اور متمول فرد کی صاحبزادی عزیز النسا، سرسید کی والدہ ماجدہ تھیں۔ وہ ایک خدا آگاہ، خداترس اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ اپنے ہونہار بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لیے انھوں نے ہر قسم کا انتظام و انصرام کیا تھا۔ باطنی تربیت کے لیے شاہ غلام علی صاحب کی، جن سے ان کے والد بیعت تھے، خانقاہ کام آئی۔ دادیہال اور ننہال کی دینی اور علمی فضا نے سرسید کو اوائل عمر ہی سے علم کا شائق اور تہذیب کا دلدادہ بنا دیا تھا۔

سرسید، سید زادے تھے اور ان کی ذہنی تربیت اور باطنی تہذیب اپنے غیر معمولی ماں باپ اور شاہ غلام علی کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ وہ طبعاً نیک سرشت، نیک طینت اور نیک فطرت شخص تھے۔ وہ دھن کے پکے اور قول کے سچے تھے۔ ان کی طبیعت میں سادگی اور مزاج میں پختگی تھی۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصب سے پاک تھا۔ ان کے دماغ میں وسعت دل میں فراخی اور نظر میں گہرائی تھی۔ وہ خلقاً عافیت کوش صلح کل اور امن پسند شخص تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا ان کی زندگی میں مجموعی طور پر، قول و فعل کی عدم مطابقت کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ ہر موحد کی طرح وہ اللہ سے محبت اس کے بندوں سے اُنس اور اس کی غیر انسانی مخلوق سے بھی شغف رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بنی نوع انسان کی خدمت اور حاجت روائی میں من و تو کی تمیز اور یگانہ و بیگانہ کا فرق نہ ہونا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ جب سے انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا انھوں نے مذہب و ملت کی بنا پر کسی قسم کی بھی عصبیت نہیں برتی۔ وہ ہر ایک کا بھلا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذات سے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ ہر ایک کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ چوں کہ انھوں نے ہندوستان کے باشندوں کا زوال خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لیے ان کا دل اپنے ملک و قوم کی زبوں حالی پر کڑھتا تھا۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا ہے اور دن بہ دن ان کی سلطنت وسیع اور حکومت مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ ساتھ کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ ان کے ہم قوم اپنے تنزل اور انحطاط کی وجہ سے مدافعت اور مسابقت کی سکت

نہیں رکھتے۔ ہر حقیقت پسند شخص کی طرح انھوں نے بھی انگریزوں کی مخالفت اور مخاصمت کو اپنے ہم وطنوں کے لیے مضر سمجھا اور غم و غصے سے کام لینے کے بجائے دوراندیشی اور عاقبت بینی کو راہ دیتے ہوئے باہمی اتحاد و اتفاق اور موالات و مشارکت کی خاطر وہ بات کہنی شروع کی جو علمی اعتبار اور دینی لحاظ سے تو متنازع تھی لیکن جدید اور ناگزیر صورت حال اسی کی متقاضی تھی۔

بدرالدین جی کے سوانح نگار حسین جی طیب جی نے سرسید کے بارے میں جو لکھا ہے، اسے یہ حقیر اپنی بات کی تائید و تصدیق کے لیے نقل کرتا ہے۔

"سید احمد خاں مسلمانوں اور ہندوؤں میں نظری اور عملی اتحاد پیدا کرنے کی انتھک کوشش کر رہے تھے۔ وہ یہ بات ہر موقع پر کہتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی بقا اور فلاح اس بات میں مضمر ہے کہ وہ دونوں خود کو ایک قوم سمجھیں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے کسی کی دل آزاری ہو یا غربت اور اجنبیت کا احساس ہو سکے۔ میرا خیال ہے کہ ذبیحہ گاو کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے ہندوؤں کی دلجوئی زیادہ کارآمد اور مستحسن ہے اور اگر وہ اس پر اصرار کرتے ہیں تو ان کا یہ فعل سراہنے کے قابل نہیں ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک جان دو قالب بننے کی کوشش کرنا چاہیے اور ہر کام کو مل جل کر انجام دینا چاہیے۔ اگر وہ متفق نہ ہوئے اور ایک دوسرے کی مخالفت کرتے رہے تو بیحد نقصان ہوگا۔

سرسید نے اتحاد و یگانگت کی صرف دعوت ہی نہیں دی بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بات بھی کہہ ڈالی جس کی اگرچہ کوئی علمی اساس نہیں تھی مگر ضرورت وقت ان سے کہلا رہی تھی کہ "جن لوگوں نے تواریخ عالم اور قدیم کتابوں کے ترجمے پڑھے ہیں ان کو یہ علم ہے کہ ایک ملک کے سارے باشندے ایک قوم کہلاتے ہیں۔ افغانستان کے مختلف جرگے اور ایران کے مختلف قبائل ایک قوم ہی کہلاتے ہیں۔ اگرچہ مذہب و مشرب کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہوتے ہیں۔ اپنی انفرادیت اور تشخص کے باوصف قدیم زمانے سے ایک ملک کے رہنے والے باشندے مجموعی طور پر قوم ہی کہلاتے رہے ہیں۔ اسی اصول اور نظریے کے تحت میں یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کے سارے مسلمان اور ہندو ایک ہی قوم ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم دونوں ایک ہی ملک میں نہیں رہتے ہو۔ کیا مرنے کے بعد اسی ملک میں پیوند خاک اور جلا نہیں دیے جاتے۔ تمہارا چلنا پھرنا اور رہنا سہنا آخر اسی ملک کی سرزمین پر ہوتا ہے۔ مسلمان اور ہندو کا لفظ تو صرف مذہبی امتیاز کے لیے استعمال ہوتا ہے ورنہ وہ سارے مسلمان ہندو بلکہ عیسائی بھی جو ہندوستان میں رہتے ہیں۔ وطنیت کے اعتبار سے ایک ہی ملک اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملک کا بھلا اسی میں ہے کہ سب مل جل کر رہیں اور اپنی محنت اور کوشش سے اس کو سربلند کر دیں۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سرسید نے کتنے کھلے دماغ اور وسیع دل کے ساتھ برادران وطن کو ملک کی خیر خواہی، خیر سگالی اور خیر اندیشی کی دعوت دی۔ انھوں نے پنجاب کے ہندوؤں کے ایک خطبۂ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ "مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے اپنے لیے 'ہندو' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ 'ہندو' کسی مذہب کا نام نہیں ہے کہ اس کے پیرو ہندو کہلائیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کا ہر باشندہ قطع نظر اس کے کہ اس کا مذہب کون سا اور کیا ہے، 'ہندو' کہلانے کا مستحق ہے۔ مجھے حیرت اور افسوس ہے کہ آپ نے مجھے ہندو کہنے میں تکلف کیا جب کہ میں بھی آپ کی طرح ہندوستان کا باشندہ ہوں۔"

غور کیا آپ نے کہ سرسید کس مزاج، حوصلہ، وسعت قلبی اور وسعت مشربی کے ساتھ ہندوستان کی ترقی و

کے لیے اپنا اصلاحی کام شروع کیا تھا۔ انھیں مسلمانوں کے حال زار کا نسبتاً زیادہ رنج و قلق تھا اور یہ ایک بالکل فطری بات ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہوا کہ انھوں نے ہندوستان کی مجموعی صلاح و فلاح کے خیال کو اپنے دل و دماغ میں جگہ نہ دی ہو۔ انھوں نے روزِ اول ہی سے سارے ملک کی خدمت اور چاکری کو اپنی زندگی کا مدعا بنایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اور ہندو شانہ بہ شانہ اور قدم بہ قدم شاہراہِ حیات پر چلیں اور اپنی اپنی صلاحیتیں اور اہلیتیں اپنے عزیز ملک اور قوم کی تباہی و بربادی کو ختم کرنے اور اسے عزت و توقیر کے عالی مرتبے تک پہنچانے میں صرف کریں تاکہ یہ عظیم الشان اور کبھی کا جنت نشان ملک دنیا کے دیگر ترقی یافتہ، سربلند اور سرفراز ممالک کی صف میں کھڑا ہو سکے اور اپنی عظمت اور ماضی کی بازیافت کرلے۔ ان کی دعوت کے مخاطب مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہو۔

اس بے تعصبی اور غیر جانب داری کی وجہ سے ان کے ہندوؤں اور عیسائیوں سے نہایت گہرے تعلقات تھے ان کی صاف دلی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے راجہ جے کشن کو اپنا معتمد علیہ بنالیا تھا۔ جب وہ اپنی کتاب "خطبات احمدیہ" کی تصنیف کے سلسلے میں انگلستان میں مقیم تھے تو سائنٹیفک سوسائٹی کے سارے کام ان کے سپرد کر دیے تھے۔ راجہ صاحب کو وہ اپنا بھائی سمجھتے تھے اور اپنے پوتے سر راس مسعود سے وہ اُن کو راجہ چچا کہلاتے تھے مرادآباد میں جب سرسید نے قحط کے آفت زدوں کی مدد کے لیے بیڑا اٹھایا تو انھوں نے ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہیں کی۔ غربت و افلاس کی وجہ سے جو مسلمان بچے عیسائی ہو گئے تھے انھیں ان ہی کا غم نہ تھا بلکہ وہ سارے ہندوستانی بچوں کے تبدیل مذہب سے رنجیدہ اور اندوہ گیں تھے۔

سرسید کے رگ و پے میں اسلام سرایت کر گیا تھا۔ سید نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی وجہ سے انھیں اسلام سے فطری طور پر عشق اور امت محمدی سے ایک خاص قسم کا تعلق خاطر تھا۔ ایک سچے اور پکے مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ اسلام کے بڑے ادا شناس تھے اور اس کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اسلام ایک انقلاب آفریں مذہب ہے لیکن وہ انقلاب برپا کرنے کے لیے توڑ پھوڑ، تباہی و بربادی، تاراجی، قتل و غارت گری اور اکھاڑ پچھاڑ کے قائل نہیں تھے۔ سرسلیم الطبع، لطیف المزاج اور کریم النفس مسلمان کی طرح ان کی فطرت، شورہ پشتی، فرقہ بندی اور فتنہ پروری سے ابا کرتی تھی۔ وہ ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ انسان کی طرح سمجھتے تھے کہ محض شور و غوغا، چیخ و پکار، غل غپاڑہ، نفرت و حقارت اور اعتراض و احتجاج سے کسی فرد یا قوم کی قسمت نہیں بدلا کرتی۔ قومی ترقی کے لیے خون بہانے سے زیادہ پسینہ بہانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پتہ ماری اور صبر و شکیب کے ساتھ توجہ اور انہماک سے لگاتار کام کیا جائے۔ نام و نمود کے بجائے اخلاص اور احسان کو سرمایہ سمجھ کر مسلسل سعی و کوشش کی جائے انہام و ادراک کی عادت ڈالی جائے۔ نیک و بد اور نفع و نقصان کو جذباتیت اور لاابالی پن سے بلند و بالا ہو کر ایک دوسرے سے تمیز کیا جائے۔ ہنگامی مزاج بدلا جائے اور زبان سے زیادہ دل و دماغ اور ہاتھ پیر سے کام لیا جائے۔ تب جاکر قوم کے دن پھریں گے اور اس کا تنزل ترقی سے اور اس کا ادبار اقبال سے بدلے گا۔

سرسید کے زمانے میں بہت جلسے جلوس نکلتے تھے آتش بیانی اور شعلہ نوائی سے کام لینے کا رواج چل پڑا تھا اور قومی مفاد سے زیادہ انفرادی مصالح لوگوں کے پیش نظر رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی قوم کو جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے، محض زبانی جمع خرچ سے

نہ کبھی کوئی پائیدار اور فیض رساں کام ہوا اور نہ آئندہ ہونے کی توقع ہے۔ وہ ایک بڑے طبقے کی طاقت لسانی اور چرب زبانی سے تنگ آگئے تھے، ملک کے بے لوث اور بے غرض ملکی اور ملی خدمت کرنے والوں کا بڑا توڑا تھا قوم میں محض قوت گویائی سے کام لینے کی ایک عادت سی پڑگئی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ صرف زبان درازی دریدہ دہنی اور برہنہ گوئی سے کام نہیں چلتا۔ کام کی چیز تو حقیقی دردمندی اور سچی ہمدردی ہے۔ وہ اس خیال کے حامی تھے ؎

زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل

وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

سر سید چوں کہ خود تعلیم یافتہ تھے۔ تعلیم سے شغف رکھتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا انھیں بے پایاں شوق تھا۔ اسلام کے نزدیک علم کا جو مقام اور مرتبہ ہے وہ اس سے واقف اور باخبر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام علم کو خدا کا نور کہتا ہے۔ علم کی تحصیل ہر مومن اور مومنہ کے لیے فرض عین قرار دیتا ہے۔ تحصیل علم کرنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے عالم کی روشنائی کو شہید کے خون سے زیادہ افضل سمجھتا ہے۔ اہل علم اور اہل فکر کی چند لمحاتی صحبت کو زہاد و عابدین کی سو سالہ رفاقت سے زیادہ وقیع و رفیع گردانتا ہے۔

سر سید یہ بھی جانتے تھے کہ علم دنیا میں سب سے بڑی قوت ہے۔ علم کی طاقت کا شمشیر براں بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ علم کے معجزے بے شمار اور کرامات لاتعداد ہیں۔ علم ہی کی بدولت انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں سے اپنی کمتری کا اقرار کیا گیا۔ علم ہی سے عرفان نفس، عرفان ذات الٰہی اور عرفان کائنات حاصل ہوتا ہے۔ علم ہی کے طفیل میں مسلمان اس زمانہ میں معزز و موقر بنے جب اہل مغرب جہالت و نادانی کی تاریکی میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ علم ہی نے مسلمانوں کو ان کے عہد عروج میں ساری دنیا کا مقتدی و پیشوا بنا دیا تھا۔ علم کا یہ کمال بھی سر سید کو معلوم تھا کہ وہ نہ صرف تسخیر اقوام کرتا ہے بلکہ تسخیر کائنات بھی اسی کے بس کی بات ہے۔ علم کی فرماں روائی اور کشور آرائی کا کیا ٹھکانا! علم ہی کی صدقے آدمی کو انسانیت کی لازوال دولت ہاتھ آتی ہے۔ علم کی ہی مسیحائی اور معجز نمائی سے ہر کامیابی و کامرانی سربلندی و سرفرازی، سروری و سرداری اور اعزاز و اکرام کا قفل کھلتا ہے۔ اسی سے عظمت و رفعت ملتی ہے اور اسی سے حقیقی عزت و توقیر کے دروازے وا ہوتے ہیں اور اسی سے ہر قوم کو تاج داری اور تاج وری ہاتھ آتی ہے۔ اس لیے وہ یہ سمجھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے کہ اگر ہندوستان کی شامتِ اعمال، بدکرداری، بدعقلی اور بدنظمی سے ملک پر انگریزوں کا تسلط قایم ہو گیا ہے اور ان کے قدم مضبوطی سے اس بدقسمت اور بدنصیب ملک میں جم گئے ہیں تو اس کا علاج اور مداوا یہ نہیں ہے کہ نو وار حکمرانوں پر لعن طعن کی جائے ان میں کیڑے ڈالے جائیں انھیں ابلیس وقت قرار دیا جائے ان کے سائے تک سے بچا جائے۔ ان کے خلاف تعصب و تنفر کی ایک ناخوشگوار اور ناپسندیدہ فضا پیدا کر کے ان سے الگ تھلگ رہا جائے اور ان سے ترک موالات کر کے ان کو زچ کر دیا جائے۔ سر سید سمجھتے تھے کہ ان منفی حرکات سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ انگریز کچی گولی نہیں کھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں حکومت کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ وہ جدید علوم کے مسلح ہیں، جدید فنون سے واقف ہیں۔ نئی عسکری تنظیم اور آلات حرب سے لیس ہیں — مجتہد و متقنن ہیں۔ انھیں اپنے ملک اور اپنی حکومت کے مفاد اور منافع اور اپنے ذاتی مناصب اور مراتب اور راحت و آرام کے مقابلے میں زیادہ عزیز ہیں۔ وہ حب الوطنی کے معنی جانتے ہیں اور انھیں فرض شناسی کا شدید احساس ہے۔ وہ زیادہ محنتی اور مشقت پسند ہیں مہم جوئی اور مشکل پسندی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے

اور اقبال مندی ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ ہماری نااتفاقی اور باہمی شکر رنجی ان کی معین و مددگار ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ چشم زدن میں انگریزوں کی حکومت ختم اور ہندوستانی دوبارہ برسرِ اقتدار سلطنت ہو جائیں تو یہ خیال

این خیال است و محال است و جنون

اب جب کہ انگریز برسرِ اقتدار ہیں تو حالات کا اقتضاء یہ ہے کہ کہ ہم ان اسباب و علل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں جو ہمارے زوال اور ادبار کا سبب بنے ہیں۔ سرسید کی سمجھ میں قومی انحطاط اور پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ان کی قوم علم و عمل کے میدان میں بہت پیچھے رہ گئی ہے اور ان کے ہم وطنوں میں طرح طرح کے اخلاقی عیوب پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ ماضی پرستی میں گرفتار ہیں۔ بنے بنائے راستے پر چلنے کے خوگر ہیں۔ ہر نئی چیز سے بدکتے ہیں۔ اپنے ماضی کا سارا سرمایہ ان کو اعلیٰ و ارفع نظر آتا ہے۔ ردّ و قبول کے وہ قایل نہیں ہیں۔ اپنے اسلاف کی روش سے سرمو انحراف کرنا انھیں گوارا نہیں۔ قسم قسم کے غلط اور تباہ کن رسم و رواج نے ان کو جکڑ رکھا ہے۔ حالات کے بدلنے کا نہ ان میں احساس ہے اور نہ ادراک۔ وہ اب بھی بے در کے گنبد میں رہتے ہیں اور پچھلوں کی ہر بات کو کتاب و سنت کا درجہ دیتے ہیں۔ ان میں قوت عمل ختم ہو چکی ہے۔ وہ ہاتھ پیر نہیں چلانا چاہتے۔ کاہلی و سستی نے ان کے قویٰ کو بےکار کر دیا ہے۔ عزایم و حوصلوں سے ان کے دل خالی ہیں دماغ میں کوئی اپج اور اختراعی صلاحیت نہیں رہ گئی ہے بلند حوصلگی اور عالی ہمتی سے ان کی زندگیاں عاری ہیں۔ ان میں غلط قسم کا استغنا اور قناعت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ جس حال میں ہیں اسی میں مگن ہیں اور اسی کو معراج اور سدرۃ المنتہیٰ سمجھتے ہیں۔ تدبیر و ترکیب سے زیادہ تقدیر اور قدرت کے قایل ہیں۔ اپنی مدد آپ کے اصول سے ناآشنا اور ناواقف ہیں۔ نہ خود بدلنا چاہتے ہیں، نہ دوسروں کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ ان کے حال پر رحم کھا کر ان کی بقا و فلاح کے لیے کچھ کریں۔ غالب کا یہ شعر غالباً ایسے ہی بظاہر زندہ لیکن بباطن مردہ پرست "زندہ افراد" پر صادق آتا ہے کہ:

بے کسی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

بے دلی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

سرسید نے اپنی قوم کے تمام امراض اور اسقام کا صرف ایک علاج تجویز کیا اور وہ علاج یہ تھا کہ اسے جدید علوم و فنون کے فیوض و برکات سے مطلع کیا اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ان سے نفرت کرنا چھوڑ دے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ خالص اسلامی خیال ہے کہ کسی قوم سے تو کسی بنا پر نفرت کی جا سکتی ہے لیکن ان کے پاس حکمت و دانائی کا جو خزانہ ہے اس سے گریز کرنا اسلام کی تعلیم اور عقل کے فتوے کے خلاف ہے۔ علوم و فنون کسی خاص ملک یا قوم کی ملکیت نہیں ہوا کرتے۔ ان پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ ان پر سارے انسانوں کا حق ہے اور سب ان سے یکساں طور پر مستفید اور مستفیض ہو سکتے ہیں نیکی و تقویٰ اور حسن و جمال کی طرح علوم و فنون کا بھی کوئی وطن نہیں ہوا کرتا ـــــ وہ زمان و مکان کی قیود سے بھی بالاتر ہوتے ہیں۔ وہ ہر اس شخص کی خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں جو ان کا جویا اور طالب ہوتا ہے۔ اسلام نے تو یہاں تک کہا ہے کہ حکمت مومن کی گم شدہ شے ہے۔ جہاں اسے ملے وہ لے لے۔ ان کا خیال بلکہ ایمان تھا کہ اگر ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں نے تنگ دلی اور تنگ نظری کو بالائے طاق رکھ کر نئے علوم و فنون کو اپنا لیا تو پچیس پچاس برس میں ان کی حالت کچھ سے کچھ ہو جائے گی اور وہ اپنے شاندار ماضی کی تمام عظمت و مرتبت کی بازیافت کر لیں گے۔

جدید ناسازگار اور نامساعد حالات اور واقعات۔

پیش نظر رکھ کر سر سید نے اپنی قوم کے سارے عوارض اور آلام کے لیے جو علاج تجویز کیا تھا اس کو برادران وطن ایک عرصے سے برت رہے تھے۔ راجہ رام موہن رائے اور ان کے ہم خیال اور ہم نوا رفقا کی مساعی اس کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ سر سید دیکھ رہے تھے کہ ان کے ابنائے وطن جدید علوم و فنون کے میدان میں فراٹے بھر رہے ہیں اور ان کے ہم مذہب اب بھی اسی پس و پیش میں ہیں کہ جدید تعلیم حاصل کی جائے یا نہ کی جائے۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جدید تعلیم کے خلاف تھا اور اس کے اختلاف کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سارے ہندوستان میں عیسائی مبلغین حکومت کے ایما اور اشارے اور استقامت کے بل بوتے پر عیسائیت کی تعلیم و تلقین اور توسیع و ترویج کے لیے کھلّم کھلّا کوشاں تھے۔ مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ ان کے بچے جدید تعلیم حاصل کر کے اپنے مذہب سے بے گانہ، اپنے اسلاف سے ناواقف اور اپنی تہذیب و تمدن سے بے بہرہ ہو جائیں گے۔ اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں کہ ان کا اندیشہ اور خوف ایک حد تک صحیح ثابت ہوا اور سر سید کے بعد جدید تعلیم حاصل کرنے والے بعض مسلم نوجوانوں کو 'نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم'۔ انھوں نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی برباد کی اور طمع کے سنہری حرفوں کی طرح وہ خالی خولی رہے۔

عرض یہ کر رہا تھا کہ سر سیّد نے صحیح یا غلط جدید تعلیم کو مسلمانوں کے ہر درد کا درماں سمجھا۔ وہ ارادے کے مضبوط شخص تھے۔ جب ان پر یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ جدید تعلیم ہی الٰہ دین کا چراغ ہے اور مسلمانوں کی زندگی میں اسی سے ضیا باری اور ضو فشانی سے پیدا ہو گی۔ تب وہ پورے عزم و ارادے کے ساتھ مسلمانوں کو ہر طرح سے بقول حالی پیروی مغرب پر آمادہ کرنے کے لیے اپنے شب و روز صرف کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی ساری خداداد صلاحیتیں اپنے مقصد پر نثار کر دیں۔

وہ دن رات اسی ادھیڑ بن میں رہتے کہ مسلمانوں کو مغربی تعلیم و تہذیب سے جو تعصب و تکدّر ہے اسے کیوں کر دور کیا جائے۔ انھوں نے خاصے غور و فکر کے بعد اپنے مقصد کی تکمیل اور اپنے جذبۂ اصلاح کی تسکین کے لیے ایک تحریک شروع کی جو اردو ادب کی تاریخ میں علی گڑھ تحریک کہلاتی ہے۔ یہ تحریک اگرچہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی لیکن اس کا اصل مرکز و محور تعلیم اور صرف تعلیم تھی۔ بقیہ ساری چیزیں فروع کی حیثیت رکھتی تھیں۔

سر سیّد نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز مراد آباد سے کیا۔ جہاں وہ ملازمت کے سلسلے میں قیام پذیر تھے۔ وہاں انھوں نے ایک مدرسہ قایم کیا۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے مزین کرنے کے عظیم الشان کام کی ابتدا تو ہو جائے۔ چاہے وہ شروع میں کتنی ہی حقیر اور ناقابل لحاظ کیوں نہ ہو۔ ہر بڑے کام کی ابتدا عام طور سے چھوٹی ہی ہوتی ہے۔ سر سیّد قدیم علوم کی جسے ہم آپ دینی علوم کہتے ہیں، تحصیل کے خلاف نہیں تھے سچ پوچھیے تو وہ بہ یک وقت دو کام کرنا چاہتے تھے۔ ایک تو یہ کہ قدیم علوم کو جس حد تک ممکن ہو جدید بنایا جائے یعنی ان کے نصاب پر نظر ثانی کر کے انھیں زیادہ کارآمد اور بامقصد کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بھی پڑھائے جائیں جیسا کہ یہ حقیر عرض کر چکا ہے۔ وہ جدید تعلیم کو ہر مرض کی دوا سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان مہذب اور باعمل بنیں۔ ان کی خواہش تھی کہ دین کی صحیح و حقیقی تعبیر و تشریح کی جائے۔ وہ آرزومند تھے کہ دین کی راہ سے اسلام میں یعنی قرآن و حدیث کی تفسیر میں اسرائیلی خرافات اور عجمیات نے جو دخل و فصل کیا ہے اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ ان کی تمنا تھی کہ جن رسوم و

رواج کو دین و مذہب کا جزو سمجھ کر کیا جاتا ہے ان کو ترک کر دیا جائے اور صحت مند و فیض رساں قسم کی روایات کی داغ بیل ڈالی جائے۔ فقہی اختلافات اور موشگافیوں نے جو ستم ڈھا رکھا ہے اس کا قلع قمع ہو۔ آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ ان سب آرزوؤں اور تمناؤں کا بر آنا آخر تعلیم ہی کی بدولت تو ممکن تھا۔ اگر کوئی قوم یا ملت اپنے مزاج و مذاق دین و مذہب اور تاریخ و روایات کے مطابق مناسب و موزوں اور درست و صحیح تعلیم پا جائے تو وہ سارے آلام و مصائب اور مشکلات و موانعات سے نجات پا جائے گی۔ اس میں نیک و بد کی تمیز پیدا ہو جائے گی۔ اس کا نقطۂ نظر زیادہ حقیقت پسندانہ ہو جائے گا۔ وہ صرف جذباتیت اور شیفتگی سے واسطہ نہ رکھے گی بلکہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت یعنی عقل و خرد سے بھی وقت وقت پر کام لے گی اور اس کی روشنی میں اپنے سفرِ حیات کی منزلیں کامیابی اور ظفر مندی کے ساتھ طے کرے گی۔ دین بھی عقل، شعور اور وجدان کو دلیل راہ اور شمع ہدایت بنانے کی دعوت دیتا ہے بنی نوع انسان کا طویل اور متنوع تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ عقل سلیم کو اپنا رہبر و رہنما بنائے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

سر سید جب مراد آباد سے بجنور تبدیل ہو کر پہنچے تو یہیں کے قیام کے دوران مسلمانوں کے سر سے وہ موج خون گزری جسے عرف عام میں ۱۸۵۷ء کی شورش یا بغاوت اور حصول آزادی کے بعد اولین تحریک یا جنگ آزادی کہتے ہیں۔ یہ بغاوت مسلمانوں کے لیے قیامت صغریٰ ثابت ہوئی۔ جب یہ غیر منظم اور بے مقصد وقتی ہل چل اور ہنگامہ ختم ہو گیا تو انگریزوں نے انتقام و احتساب کی نیت سے مسلمانوں کی طرف توجہ کی اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کی فطرت کے مطابق اور ان کے بس میں تھا ظلم و ستم جور و استبداد، سنگدلی و سفاکی، جفا پروری اور چیرہ دستی بھی ان کے مظالم کو دیکھ کر چیخ اٹھی جو مسلمانوں پر روا رکھے گئے تھے چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے ان کو ایسی عبرت ناک سزا دینا چاہتے تھے کہ وہ صدیوں سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ قصوروار اور خطاکار تو دوسرے لوگ بھی تھے بلکہ وہ پیش پیش تھے اور سرغنہ و سرخیل سمجھے جاتے تھے۔ کچھ نادان اور ناسمجھ اور ضرورت مند فاقہ مست مسلمانوں نے دو چار روپیے اور سیر دو سیر غلّہ کی خاطر ان کی ہم نوائی ضرور کی تھی۔ انگریزوں نے مذکورہ لوگوں کی سابقہ خدمات اور مصلحت پسندی کی بنا پر انھیں تو معاف کر دیا اور مسلمانوں کو ان جرائم کی بھی سزا دی جن کا ارتکاب ان سے نہیں ہوا تھا۔

جب حاکم وقت کے ہاتھوں مسلمانوں کی مار دھاڑ قتل و غارت گری تحقیر و تذلیل اور رسوائی و بدنامی کا یہ دردناک اور عبرتناک دور کسی حد تک ختم ہو گیا تو سر سید نے ہجرت کے باوجود اپنے ستم رسیدہ اور غم زدہ بھائیوں کے ساتھ بقیہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ بغاوت ہند کے تمام اسباب و وجوہ پر غور و خوض کرنے کے بعد سر سید اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی بقا اور ان کی صلاح و فلاح صرف دو چیزوں پر منحصر ہے۔ ایک تو یہ کہ انگریزوں کو ان سے جو آزردگی بے سبب پیدا ہو گئی ہے، اسے دور کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو جدید حکمرانوں سے ان کے افعالِ شنیع کی بنا پر جو توحش و تعصب پیدا ہو گیا ہے اسے ختم کیا جائے۔ ایک طرف تو انھوں نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر انگریزوں کی غلط فہمیاں دور کیں اور دوسری طرف مختلف انجمنیں قائم کر کے انگریزوں کو مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلایا۔ ان کا یہ خیال کہ مسلمان جدید تعلیم حاصل کر کے بڑے فائدے میں رہیں گے اور پختہ ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب وہ ۱۸۶۳ء میں بہ سلسلۂ ملازمت غازی پور پہنچے تو انھوں نے وہاں بھی جدید طرز کا ایک اسکول کھولا جو آج بھی موجود ہے۔ وہیں سرسید کو ایک ایسی انجمن کے قیام کا خیال بھی پیدا ہوا جو علمی اور فنی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کردے اس انجمن کا نام سائنٹیفک سوسائٹی تھا دس پندرہ کتابوں کا ترجمہ بھی کروایا۔ وہ اس کام کو مزید ترقی دینا چاہتے تھے کہ انھیں سر ولیم میور کی کتاب کا جواب دینے کے لیے انگلستان جانا پڑا قیام انگلستان میں انھوں نے مغرب کی ترقی و عروج کو بہ چشم خود دیکھا۔ جدید تہذیب و تمدن کے معنی سمجھے۔ ابداع و اختراع کی کارفرمائیاں دیکھیں ایک زندہ اور فعال قوم کے روز و شب کا مشاہدہ کیا اہل علم اور ارباب علم و عقل بھی ملے اور وہیں ان کو جدید طرز کی صحافت کے مطالعے کا بھی موقع میسر آیا۔ انگلستان کی شدید مصروفیات کے باوجود بھی وہ سائنٹیفک سوسائٹی کو نہیں بھولے اور راجہ جے کشن اور محسن الملک کو اس کار خیر کو جاری رکھنے کی تاکید کرتے رہے۔ جب وہ انگلستان سے بہت کچھ سمجھ اور سیکھ کر ہندوستان واپس پہنچے تو ان کو یہ احساس ہوا کہ مغرب میں علم کی رفتار بہت تیز ہے اور اس برق رفتاری کا ساتھ غریب مسلمان نہیں دے سکتا انھوں نے سوچا کیوں نہ مغربی تعلیم کی تحصیل کے لیے ایک درسگاہ قایم کر دی جائے جس سے براہ راست تحصیل علم ممکن ہو سکے ان کا یہی احساس مدرسۃ العلوم کی تاسیس کا سبب بنا یہ درس گاہ تحریک علی گڑھ کی دوسری شکل تھی۔

سرسید نے دن رات کی کوشش کے بعد اسی علی گڑھ میں ۱۸۷۵ء میں ایک معمولی سے مدرسے کی بنیاد سمیع اللہ خاں مرحوم کی کوٹھی میں رکھی۔ مسلمانوں نے جدید درس گاہ کی سخت مخالفت کی اور اس اندیشے کا بار بار اظہار کیا کہ سرسید کے مدرسے میں مسلمان بچے تعلیم پاکر اگر عیسائی نہیں بن جائیں گے تو مسلمان بھی نہیں رہیں گے اس نقطۂ نظر کی درستی یا نادرستی کی بحث خاصی طویل ہے اور یہ حقیر وقت کی تنگی اور موضوع کی عدم مطابقت کی وجہ سے اس میں پڑنا بھی نہیں چاہتا لیکن اتنا کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتا کہ وہ مسلمان جو تاسیس مدرسہ کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان کے خلوص نیت پہ شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک ایسے عہد کے پروردہ تھے جو تاملات سے عبارت تھا۔ اسی وجہ سے اس کے بہت سے افراد کو سرسید کا ساتھ دینے میں تامل تھا۔

مدرسۃ العلوم کے قیام کے ٹھیک دس برس کے بعد ایک اور شگوفہ کھلا انگریزوں اور ان کے ہم نوا اور ہم خیال لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ سرسید کی تحریک کی وجہ سے جسے علی گڑھ تحریک بھی کہتے ہیں، مسلمان جدید علوم کی تحصیل کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں تو ان کو خدشہ ہوا کہ اگر ان میں علم دوستی اور فن نوازی کی قدیم روایت زندہ ہو گئی، اگر وہ قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی واقف ہو گئے، اگر ان کو اپنے مذہب کا صحیح عرفان حاصل ہو گیا اور اگر وہ ایک بار پھر بیدار ہو گئے اور فعال بن گئے تو کار زار حیات میں ان کا مقابلہ کرنا کار دارد ہوگا۔ اگر سرسیّد کی پیہم اور لگاتار کوششوں سے وہ تعلیمی چراغ ایک بار پھر ملک اُٹھا جو ماند پڑ چکا تھا مگر اب بھی لو دے رہا تھا تو ان کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ اگر مسلمان علم کی طاقت سے مسلح، اتحاد و اتفاق کی دولت سے مالا مال اور دین کی حیات بخش اور روح پرور تعلیم سے مرصع اور مکمل ہو کر صف آرا ہو گئے تو ان کو ایک بار پھر اس ملک کی کشور آرائی اور فرماں روائی کے حصول سے باز رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اس اندیشے میں انگریز اور ابنائے وطن دونوں ہی مبتلا تھے۔

اسی اندیشے اور خوف کے تحت انگریزوں نے

مسٹر ہیوم آئی سی ایس کو ایک ہندوستان گیر تنظیم کی بنیاد رکھنے کی خدمت سپرد کی۔ یہ تنظیم ۱۸۸۵ء میں عالم وجود میں آئی اور اسے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے نام سے موسوم کیا۔ اس کی تاسیس اور تنظیم میں بنگالی پیش پیش تھے ایک طبقے نے اس کو ہاتھوں ہاتھ اس لیے لیا کہ ان کی حمایت سے "آقائے نامدار" خوش ہوں گے اور دوسری طرف یہ ایک دام ہم رنگ زمین ثابت ہوگی اور اس تنظیم کے قیام کا ایک بڑا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔

سرسید حالات کا مشاہدہ انتہائی گہرائی و گیرائی سے کر رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی اور سیاسی پسماندگی سے بخوبی واقف تھے اور وہ اس بات سے بھی باخبر تھے کہ اگر مسلمانوں نے اپنی تعلیمی اور معاشی پسماندگی پر سیاسی بیداری کو ترجیح دی تو ۲۸ سال پیشتر جس دور سے وہ گزر چکے ہیں اور جس کی تباہی و بربادی سے ابھی تک وہ سنبھلے بھی نہیں ہیں یہ سیاسی بیداری مسلمانوں کی مزید بربادی کا سبب بنے گی۔ اس لیے سرسید نے نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کی عملی سیاست کو ان کے لیے نقصان دہ تصور کیا۔ سرسید کا سب سے اولین مقصد مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنا تھا۔ تاکہ وہ تعلیم کے میدان میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ چل سکیں۔

سرسید کو اندازہ ہو گیا تھا کہ انگریزوں کو اس ملک سے بالآخر جانا ہی ہے اور آئندہ وہی قومیں کامران ہوں گی جو دولت علم سے مالا مال ہوں گی ورنہ مسلمان نہ اپنے مذہب کو بچا سکیں گے اور نہ اپنی زبان کو، نہ ان کی تہذیب محفوظ رہے گی اور نہ تمدن۔ اسی طرح ان کی روایات اور فلسفۂ حیات باقی رہے گا۔ بلکہ ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ ان کے اسلاف کے کارناموں اور ان کی خدمات کی نشانیوں اور علامتوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کی کوشش کی جائے گی۔

سرسید نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ارتباط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اپنی تقاریر میں اپنے مضامین میں انھوں نے دونوں قوموں سے باہمی ارتباط اور ایک دوسرے سے ہمدردی اور رواداری برتنے کی کوشش کی۔ وہ مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھ کر تعلیم کے میدان میں قدم بڑھانے پر زور دیتے رہے۔ سرسید سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو سیاسی ہنگامہ آرائی سے اعراض اور اور اپنا وقت اور اپنا پیسہ مفید اور کارآمد کاموں پر صرف کرنا چاہیے۔ وہ ابھی اتنے ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ اپنے برادران وطن کی طرح سیاست کو سمجھ سکیں۔ ان میں سیاسی شعور کی بھی کمی ہے۔ اس لیے وہ اس کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے نیشنل کانگریس کے قیام سے مسلمانوں کو دو طرح کا نقصان ہوگا۔ ایک تو یہ کہ انگریز ان سے دوبارہ بدگمان ہو جائیں گے اور ان کی بدگمانیوں کو دور کرنے کے لیے اب تک جو کوششیں کی گئی ہیں وہ جھوٹی ثابت ہوں گی۔ دوسری طرف ان کی توجہ ایک پائیدار اور دور رس نتائج پیدا کرنے والے کام سے ہٹ جائے گی۔ ہنگامہ پرور اور ضرر رساں چیزوں کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو جائے گا چوں کہ سیاسی لہو و لعب ان کے لیے قاتل اور زہر ہلاہل ہے اس لیے ان کو پوری سنجیدگی اور متانت اور انہماک و استغراق سے تعلیم کے حصول میں لگ جانا چاہیے کہ اس کی برکات سے ان کے بہت سے بگڑے کام بن جائیں گے۔ انھوں نے نیشنل کانگریس کی مخالفت کو اپنا فرض منصبی سمجھا اور یہ ضروری جانا کہ مسلمانوں کو اس میں شرکت کی مضرتوں سے بار بار آگاہ کیا جائے اور انھیں یہ یقین دلایا جائے کہ وہ ان کے مفاد کے لیے نہیں قائم کی گئی ہے۔ سرسید کو کانگریس کے زعما سے کوئی ذاتی

عداوت نہیں تھی۔ وہ تو پوری دیانت داری سے یہ سمجھ رہے تھے کہ کانگریس میں مسلمانوں کی عدم شرکت ہی ان کے لیے ہر اعتبار سے مفید ہے۔ انھوں نے مختلف شہروں میں اس مقصد کے لیے تقریریں کیں اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ کانگریس میں شرکت نہ کریں۔ لکھنؤ، دہلی، میرٹھ اور لاہور میں انھوں نے اپنا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ بدرالدین طیب جی سے ان کی اس سلسلے میں خط و کتابت بھی ہوئی۔ انھوں نے کوشش کی کہ طیب جی ان کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر اور ان کی نیک نیتی اور خلوص کو جان کر خود بھی کانگریس میں شرکت نہ کریں اور مسلمانوں کو بھی اس سے باز رکھیں۔ ذیل میں ان کی وہ تقریر درج ہے جو انھوں نے اس سلسلے میں ۱۶ر مارچ ۱۸۸۸ء کو میرٹھ میں کی تھی۔ تقریر کا موضوع تھا "قوم کو بہ نسبت پولیٹکل امور سلطنت سے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔"

"آج جس مطلب کو آپ صاحبوں کی خدمت میں عرض کرنے کو میں کھڑا ہوں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ہمارے بنگالی دوست پولیٹکل معاملات میں نہایت گرم جوشی ظاہر کر رہے ہیں تین برس ہو گئے کہ انھوں نے ایک بہت بڑی مجلس قائم کی ہے جس کا جابجا اجلاس ہوتا رہتا ہے اور انھوں نے اس کا نام نیشنل کانگریس رکھا ہے۔ ہم کو اور ہماری قوم کو اس طرف کچھ خیال بھی نہ تھا بلکہ ہم نہایت خوش تھے۔ اگر ہمارے بنگالی دوستوں نے اپنی تعلیم اور طاقت میں ایسی ترقی کر لی ہے کہ وہ ان چیزوں کے دعوے کرنے کے لائق ہو گئے ہیں جن کا وہ دعویٰ کرتے ہیں تو ہماری نہایت خوشی ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوں اگرچہ وہ تعلیم میں ہم سے زیادہ ہیں، مگر ہم نے یہ کبھی نہیں سمجھا کہ وہ اس درجے پر پہنچ گئے ہیں جس درجے پر پہنچنے کے وہ دعویدار ہیں۔ تاہم ہم نے کبھی کسی آرٹیکل یا اسپیچ میں یا کسی مقام پر زبانی بات چیت میں ان کے کاروبار میں جو وہ کر رہے ہیں، ہرج نہیں ڈالا اور نہ ہرج ڈالنے کا ارادہ کیا۔ ہمارا کبھی یہ مقصد نہیں ہے کہ جو لوگ یا کوئی قوم جو ترقی کرنا چاہتی ہے یا اس نے اپنے آپ کو اس درجے میں پہنچا دیا ہے جہاں تک وہ پہنچنا چاہتی ہے اور جس کے وہ لائق تھے اس کی مخالفت کریں۔ لیکن ہمارے بنگالی دوستوں کی طرف سے قوم پر بے جا اور ناواجب دست اندازی ہوتی ہے اور اس لیے ہمارا فرض ہے کہ اس بے جا دست اندازی کو ظاہر کریں اور ہم اپنی قوم کو اس کی مضرتوں سے محفوظ رکھیں۔ یہ خیال کرنا کہ ہم نے اپنے بنگالی دوستوں کی مخالفت پر کمر باندھی ہے، بالکل غلط ہے بلکہ ہم کو اپنی قوم کے حق میں جو بات بہتر معلوم ہوتی ہے اس کو اپنی قوم کو سمجھانا منظور ہے اور جو نقصانوں کہ ہماری

بنگالیوں کو رائے کے ساتھ شامل
ہونے میں منظور ہے اس کا سمجھا دینا
مقصود ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔"

اس تقریر کے دس برس بعد سر سید اللہ کو پیارے ہو گئے اور ان کے انتقال کے تقریباً پچاس سال بعد ہندوستان آزاد ہو گیا۔ ایک مدت مدید کے بعد اپنی پسند کا نظم و نسق قایم کرنے کے واسطے قدرت نے ایک زریں موقع دیا۔ حصول آزادی کے بعد ملک کے ہر باشندے اور خصوصاً مسلمانوں کو یہ امید تھی کہ ان کی قسمت بدل جائے گی۔ ملک میں ایک مساویانہ اور عادلانہ نظام حکومت قایم ہوگا۔ ہر ایک کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ تمام باشندگان ملک کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ خاص طور سے ان اقلیتوں کا لحاظ رکھا جائے گا جنھوں نے حصول آزادی کے لیے عظیم الشان قربانیاں دی تھیں۔ ملک میں اتحاد و اتفاق کو فروغ ہوگا۔ زندگی امن و چین سے بسر ہوگی۔ ایک ایسی ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی قومیت بروئے کار آئے گی جس میں ہر تمدن اور ہر تہذیب کے صحت مند اجزا کو جگہ دی جائے گی۔ ہر زبان اور ہر تہذیب کو ترقی کرنے کی آزادی ہوگی۔ کسی خاص مذہب یا دین کی بنیاد پر کسی فرقے کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے پر اپنا مذہب، اپنی زبان اور اپنی تہذیب نہیں تھوپے گا۔ عدل و انصاف کا بول بالا ہوگا اور معقولیت اور موزونیت کا دور دورہ ہوگا اور سب کی کوششوں سے ایک ایسا طاقت ور اور متحدہ ہندوستان تعمیر کیا جائے گا جس کے ثمرات سے ہر چھوٹا بڑا متمتع ہو سکے گا۔

حصول آزادی کو رفتہ رفتہ چھیالیس برس گزر گئے۔ ایام گزشتہ میں ہندوستان میں جو حالات رہے ہیں ان سے ہم سب واقف ہیں۔ ان کا اعادہ کر کے میں آپ کی طبیعت کو مکدر کرنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس صدی کے واقعات اور حادثات کے تناظر میں اگر سر سید کے خدمات کا دوبارہ جائزہ لیں تو وہ لفظ بہ لفظ اور حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوں گے۔ انصاف چاہتا ہے کہ ہم سر سید کی مردم شناسی، حقیقت بینی اور دوراندیشی کا کھلے دل سے اقرار کریں اور یہ بھی اعتراف کریں کہ ان کے سارے خیالات اور اشغال کا مقصد دین و ملت کی ترقی، سربلندی اور سرفرازی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان کی کسی سے ذاتی مخاصمت کبھی نہیں تھی۔ انھیں ہر وہ چیز عزیز تھی جو ان کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے لیے اکسیر ثابت ہو۔ ہم آپ اُن کے خیالات اور تصورات کے کچھ گوشوں سے تو اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کا اخلاص ان کی نیک نیتی، ان کی ملی ہمدردی اور قومی دردمندی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اصل شے خیالات اور افکار کی درستی نہیں بلکہ اس دل و دماغ کی طہارت اور پاکیزگی ہے جس کے وہ پیداوار ہوتے ہیں۔ کوئی شخص اپنے عزائم کی تکمیل سے بڑا نہیں بن جاتا۔ اصل عظمت تو اعلیٰ و ارفع مقاصد کو اپنی زندگی کا مطلوب و مقصود بنا لینا ہے چاہے وہ اس کی زندگی میں پورے ہوں یا نہ ہوں۔ جو شخص حق و صداقت کی قربان گاہ پر اپنا سب کچھ بھینٹ چڑھا دیتا ہے وہی خود بھی حیات جاویداں پا جاتا ہے اور اس کا مشن بھی حق و باطل کی جب تک جنگ ہوتی رہے گی وہ لوگ فراموش نہ کیے جا سکیں گے جنھوں نے

صداقت کا دم واپسیں تک دم بھرا اور باطل سے لڑتے لڑتے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

سر سید نے ۱۸۸۸ء میں مسلمانوں کو گندی اور ناپاک سیاست سے الگ تھلگ رہنے کا جو مشورہ دیا تھا وہ آج بھی اتنا ہی صحیح اور درست ہے جتنا سو برس پہلے تھا۔ آج کے حالات بھی ہم سے تقاضا کرتے ہیں کہ ہم ہر قسم کے ہنگاموں اور منکرات و خرافات سے کنارا کش اور دست بردار ہو کر اپنی ہمہ گیر تعمیر تشکیل میں لگ جائیں۔ جب ہم ہر اعتبار سے ترقی یافتہ ہو جائیں گے تب سیاست میں ہمارا حصہ لینا کار آمد ثابت ہوگا۔ اس وقت تو عملی سیاست ہمارے لیے خودکشی کے مرادف ہے۔ اس خاکسار کو امید ہے کہ دانشگاہ علی گڑھ میں زیر تعلیم نونہالان ملت اس کے مرحوم بانی کے اس زریں مشورے پر عمل کریں گے۔

"اے مسلمانو! دیکھو وقت چلا جاتا ہے۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ تم سب پر فرض ہے کہ مدرسۃ العلوم کی تکمیل پر توجہ کرو۔ صرف اس کو روپیہ کی مدد درکار ہے، محنت کرنے والے موجود ہیں۔ بس ہمت کرو اور چندے سے امداد کرو۔ دیکھو کہاں تک اس نے ترقی کی ہے اور کس درجہ تک اس کو پہنچا دیا ہے۔ صرف تھوڑی سی مدد سے وہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ گو تم نے مدد نہ کی اور وہ تکمیل کو نہ پہنچا تو تمہاری قوم پر یہ شعر کسی شاعر کا بالکل صادق آوے گا۔

قسمت کی خوبی دیکھو کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا"

سر سید احمد

سرسیّد کا طرزِ فکر

ذوالفقار احمد *

سرسید ۱۷، اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ والدہ صاحبہ سے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ اپنے زمانے کے مروجہ علوم عربی، فارسی، ریاضی، وغیرہ مختلف اساتذہ سے حاصل کیے۔ حصولِ تعلیم کے بعد فرنگی حکومت کی ملازمت سے منسلک ہو گئے۔ مگر قدرت ان کو ایک کار اہم کے لیے منتخب کر چکی تھی اور وہ کار عظیم تھا ان کا تعلیمی اور اصلاحی کارنامہ جس کے لیے وہ مرتے دم تک سرگرم رہے۔

سرسید کسی ایک حیثیت کا نام نہیں ہے۔ ان کے اندر اتنی حیثیتیں جمع تھیں کہ سب کو الگ سمجھنا مشکل کام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو سمجھنا مشکل تھا جس کی وجہ سے ان کی تنقید بھی ہوئی اور تعریف بھی۔ وہ ایک نہایت باعمل انسان تھے۔ اپنی ملازمت کی مصروفیت اور پابندیوں کے باوجود انھوں نے آثار الصنادید جیسی اہم کتاب لکھی۔ ۱۸۶۴ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۶۹ء میں تعلیمی اور اصلاحی پروگرام کے تحت انگلستان کا سفر کیا۔ ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اسی زمانے میں تعلیمی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کی بنیاد ڈالی جس کے وہ پہلے سکریٹری ہوئے۔ اسی کمیٹی کی کوششوں کے نتیجے میں ۱۸۷۵ء میں ایک ابتدائی مدرسہ کی بنیاد پڑی جو ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ کالج بنا اور ۱۸۸۱ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کے نام سے موسوم ہوا اور آج وہی کالج ایک ممتاز یونیورسٹی کی شکل میں سامنے ہے ۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اس کے باوجود انھوں نے اردو زبان کے لیے قابل تعریف خدمات انجام دیں اور علمی تصانیف بھی پیش کیں۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں وفات پائی وہ بہت ہی جامع اور پُروقار شخصیت کے مالک تھے انھوں نے مذہب، سیاست، تعلیم، اخلاق، معاشرت، ہر میدان میں اپنی فکر کے اثرات چھوڑے ہیں جن کو زمانہ عرصے تک بھول نہیں سکتا۔

ویسے تو ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے فلسفے کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو یا کسی خاص فلسفی سے یا خاص فلسفے سے بہت زیادہ متاثر رہے ہوں۔ فلسفیانہ اندازِ فکر ان کی اپنی شخصیت میں تھا۔ البتہ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ عقلیت کو مانتے تھے اور ایک طرح معتزلہ سے

* شعبۂ فلسفہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

متاثر تھے مگر اس اثر کا انداز دوسرا تھا۔ عقل رہنمائی کرتی ہے مگر ایک حد تک۔ ان کے یہاں Reasoning کا اثر بخوبی ملتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر اسلام کی نئے زاویوں سے توجیہہ و تفسیر کی جائے۔ نئے مذہبی فکر کی تشکیل کی جائے۔ کوئی ان کے اجتہاد کے نظریے سے اتفاق کرے یا نہ کرے مگر ان کی کوششوں کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے خیالات میں ان کے کارناموں میں فلسفیانہ فکر کا عنصر تلاش کیا جائے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ وہ کس طرح نیچری ہوئے اور کس طرح عقلیتی۔ کیوں کہ سرسید تمام تر معاملات میں چاہے وہ علمی ہوں، معاشرتی ہوں، سیاسی ہوں یا مذہبی کوئی فلسفہ تحریر نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے ان تمام علمی کارناموں میں ایک خاص فکر تھی جس کو ہم فلسفیانہ فکر کہہ سکتے ہیں جس میں عقلیتی Rationalistic approach ہے۔ اس مضمون میں ان کے خیالات و نظریات کو اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کسی بھی بڑی شخصیت یا نامور انسان یا کسی فلسفہ کا جائزہ لینے سے پہلے اس کے تاریخی پس منظر کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ ہر مفکر رہنما فلسفی یا فلسفہ پر اس کے گرد و پیش کا لازمی اثر ہوتا ہے جس کو ہم تاریخی پس منظر کہتے ہیں۔ سرسید کا زمانہ بھی کچھ عجیب تغیرات سے متاثر تھا جس لازمی اثر ان کے خیالات پر پڑا۔

مسئلہ عقلیت سے کیا مراد ہے، نیچری کا کیا مقصد ہے اور فلسفہ سے کیا مراد ہے فلسفی ہونے کا کیا مطلب ہے۔ فلسفہ کی تعریف Definition مختلف انداز سے کی جاتی رہی ہے۔ افلاطون کے زمانے فلسفہ کو لفظ حیرت اور تعجب سے موسوم کیا گیا یعنی جب کوئی انسان کسی شے کو دیکھ کر عبرت میں پڑ جائے اور طلب ہو اس کی حقیقت جاننے کو تب فلسفہ شروع ہو جاتا ہے۔ غزالی اور اس کے بعد ڈیکارٹ تک یہ شک (Doubt) سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ اور اس کے بعد یہ تنقید اور تجزیے کی شکل اختیار کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ تمام معاملات زبان سے سمجھے اور سمجھائے جاتے ہیں تو زبان کو سمجھنا ضروری ہے ——— یہ سب خالص فلسفے کے مدارج ہیں۔ اس کے علاوہ فلسفے کو عام زبان میں یوں سمجھایا گیا کہ جس طرح تمام عالم اس کائنات اور انسان کو سمجھنے کے لیے اپنے اپنے محدود دائرے میں کوشش کرتے ہیں۔ فلسفہ اس کائنات اور انسان کو مجموعی اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے اس کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ بھی کہا گیا کہ فلسفہ ایک عمل Free Inquiry ہے ایک Activity ہے آزاد تحقیق ہے جس کی وجہ سے اختلاف کی گنجائش ہے فلسفہ کی بنیادی غور و فکر یہ ہے۔ غور و فکر بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر سب فلسفی نہیں ہوتے ہیں۔ جب یہ سوچ یا غور و فکر با مقصد اور بہت منظم ہو جاتی ہے وہیں بات فلسفے کی آ جاتی ہے۔ وہ عمل ایک فلسفی کا عمل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر اب فلسفے کے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ ہم فلسفے کو پڑھتے ہیں، دوسروں کی فلاسفی کو پڑھتے ہیں پڑھاتے ہیں اس کو بہت ممکن ہے مانتے ہوں یا ہو سکتا ہے نہ مانیں یا تنقید کریں مگر فلسفی ہونے کے لیے اپنی کوئی فلاسفی ہونی چاہیے۔ اس پر خود پابند عمل ہوں تو وہ ہے عملی فلسفہ جس کو Philosophy in action کہتے ہیں۔ فلسفے کا یہ رخ بہت متاثر کن ہوتا ہے۔ سرسید کا مقام یہی ہے۔ مفکر وہ ہے جو اپنے خیالات کو عمل میں ڈھال سکے۔ اس کو صرف Theory making اور Speculation تک ہی محدود نہ رکھے۔ اس پر عمل کر سکے اور یہ کام ایک ریفارمر ہی کر سکتا ہے ایک سائنٹسٹ Social Scientist ہی کر سکتا ہے۔ اس

لیے سرسید ایک سوشیل سائنٹسٹ — Social Scientist کارل مارکس کا اثر اس سے زیادہ ہوا کہ اس نے فلسفے کو عملی بنایا۔ ایک بند کمرے میں بیٹھ کر تمام مسایل کو محض خیالی اُڑان سے حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کمرے سے باہر عملی دنیا کچھ اور ہے۔ میں سرسید اور مارکس کا موازنہ نہیں کر رہا ہوں۔ مارکس بھی ایک Social Philosopher تھے۔ وہ ریفارمس لانا چاہتے تھے اور بڑی حد تک لائے۔ یہ الگ پہلو ہے کہ کمیونزم آج ٹوٹ گیا مگر سچ تو یہ ہے کہ مارکس کے بعد لوگوں نے اس کی اصل روح کو بھلا دیا یہاں تک کہ اس کو بالکل بدل دیا۔ مارکس کے مطابق کہ نیا آرڈر پرانے آرڈر کو بدل دیتا ہے، تبدیلی یا change کی طرف ایک اشارہ ہے۔ سرسید نے بھی تبدیلی کو مانا اور ریفارمس کی ضرورت کو محسوس کیا۔ مذہبی معاملات میں بھی اجتہاد کی کمی کو مانا جس پر ان کو بہت سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ کوئی عام انسان نہ تھے، وہ غیر معمولی انسان تھے، اس لیے بھی ہمت نہ ہاری۔

جہاں تک سرسید کی فکر کا سوال ہے وہ عقلیتی (Rationalists) تھے اور وہ یقین رکھتے تھے کہ انسانی عقل یا Reason کی طاقت سے اس کائنات کی سچائی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ معتزلہ کے ہم خیال تھے اور عقل Reason سے سماجی اور مذہبی معاملات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے تھے۔ یہ اُن کا طرز فکر تھا مگر ایسا نہیں کہ اُن کے نظریے میں معتزلہ کے خیال کا تسلسل ہو ایسا ہرگز نہیں۔ یہ بات اور واضح ہونی چاہیے کہ سرسید کا مقصد کوئی نیا فلسفہ لکھنا نہیں تھا وہ ایک ریفارمر تھے اور ان ریفارمس کے لیے کچھ باتوں کا سہارا لیا جو بہت اہم اور عملی تھیں۔ ہر فکر کا ایک محور ہوتا ہے۔ اس کا کوئی اصول ہوتا ہے جس کو ہم فلسفیانہ طریق (Philosophical Method) کہتے ہیں لہٰذا سرسید کا طریق (Method) بڑی حد تک تجرباتی empirical تھا مگر وہ مسایل کے حل کرنے میں عقل یا REASON کو ہی مانتے تھے۔

جہاں تک ان کے نیچری ہونے کا سوال ہے انھوں نے اس فلسفے کو عقل سے ہی سمجھا کسی کتاب میں نہیں پڑھا۔ جب ان پر نیچری ہونے کا فتویٰ لگا تو عام طور پر لوگوں کو علم نہیں تھا کہ اس سے کیا مراد ہے عام لوگوں کے دماغ میں یہی بٹھایا گیا کہ نیچری (Naturalists) ہونے کا مقصد یہ ماننا ہے کہ قوانین قدرت ہیں اور تمام کائنات اس کا ذرہ ذرہ ان قوانین کا پابند ہے۔ سب کچھ ان ہی قوانین قدرت Laws of Nature کے تحت ظہور پذیر ہوتا ہے اور ایک طرح سے اس کے واضح ثبوت بھی سامنے ہیں مگر یہ خیال مادہ پرست نظریے کی نہ صرف غمازی کرتا ہے بلکہ اس کی بنیاد ہے اور سائنسی ترقی کا جزء لاینفک مادہ پرست یہ مانتے ہیں کہ قوانین قدرت ہی جس کی ہر شے غلام ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قوانین قدرت آئے کہاں سے۔ کیا یہ خود سے ہیں یا ان کا کوئی بنانے والا ہے۔ جس طبقے نے یہ مانا کہ ان کا الگ سے کوئی بنانے والا نہیں ہے یہ خود بخود ہیں وہ باقاعدہ مادہ پرست تھے جیسے کارل مارکس۔ جہاں تک ایجابیت یا واقعیت یا اثباتیت کا سوال ہے اس نے بھی قوانین قدرت کو اپنا خالق مانا ہے جہاں تک Positive Science[۲۱] یا Natural Science کا سوال ہے اس نے بھی قوانین قدرت کو اسی طرح مانا کہ الگ سے ان کا کوئی خالق نہیں ہے، وہ خود بخود ہیں ان کا کوئی بنانے والا یا Designer نہیں ہے مگر سرسید کا

خیال اس سے مختلف ہے۔ وہ قوانین قدرت کو مانتے ہیں کہ تمام نظام کائنات ان اصولوں کے تحت چلتا ہے فرق یہ ہے کہ سرسید کے خیال کے مطابق یہ قوانین قدرت خود بخود یا اپنے آپ سے نہیں ہیں۔ ان کا خالق ہے ان کا بنانے والا ہے اور وہ خدا ہے۔

ایک طرح دیکھا جائے تو سرسید کے یہاں عقلیت کا تصوّر تھوڑا مختلف ہے۔ عقل سے سرسید کی مراد وہی ذہنی قوت ہے جس سے سائنس اور عملی زندگی میں علم حاصل کرنے اور نتائج تک پہنچنے کا کام لیا جاتا ہے مگر کچھ لوگ سرسید کو نظریۂ عقلیت (Rationalism) کا پرستار سمجھ لیتے ہیں وہ غلط ہے۔ وہ زیادہ تر تجرباتی عقل (Empirical Reason) کو مانتے تھے۔

سرسید کے یہاں نیچر کا مفہوم وہی ہے جو سائنس اور منطق استخراجی میں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام عالم میں واقعات ایک نظم اور ضابطے کے تحت رونما ہوتے ہیں۔ ہر چیز مقررہ قوانین پر عمل کر رہی ہے۔ نیچر سے سرسید کی مراد ایک تو خارجی کائنات اور اس کے قوانین اور دوسرے انسانی زندگی اور اس کے ضابطے خارجی نیچر اور انسانی نیچر میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ یہ نظام فطرت اور قوانین قدرت سب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ سرسید کا یہ عقیدہ ہے کہ ان قوانین کو ان ضابطوں کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔ اللہ بھی ان کو نہیں توڑتا ہے۔ اس ضابطے کے دو اصول ہیں۔ ایک یہ کہ نیچر میں یکسانیت یعنی نیچر کا ایک سا ہونا جس کو Laws of uniformity of nature کہتے ہیں اور دوسرا قانون علت Laws of causation ہے۔ یعنی بنا سبب کچھ نہیں ہوتا ہے یا ہر بات یا ہر چیز کی وجہ یا علت cause ہوتی ہے۔ سرسید جادو ٹونے توہمات جیسی تمام چیزوں کو نہیں مانتے تھے۔ کیوں کہ وہ عقل اور قوانین قدرت کے مطابق نہیں ہیں۔

اس طرح سرسید اسلام اور نیچر کی ہم آہنگی کے قایل ہیں وہ سائنس سے متاثر تھے اور اس کی تعلیم مسلمانوں میں عام ہو اس کے بہت خواہش مند تھے۔ قوانین قدرت سائنس کے جزو لاینفک ہیں۔ سرسید کا کہنا تھا کہ ہم ان قوانین کو عقل کے ذریعے معلوم کرتے ہیں۔ عقل ہی ہمیں فطرت انسانی کے ضابطوں سے آگاہ کرتی ہے۔ یعنی کہ عقل اور نیچر میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ اس لیے اسلام اور عقل میں ہم آہنگی ہونا ضروری ہے۔ سرسید کا یہ یقین کامل تھا کہ اسلام عقل کے خلاف نہیں بلکہ عین مطابق ہے۔

سرسید کوئی باضابطہ طور پر فلسفی نہیں تھے۔ وہ ایک نہایت ذہین جہاں دیدہ انسان تھے۔ ان کے سوچنے کا انداز عام روش سے مختلف تھا۔ وہ کوئی فلسفہ لکھنے نہیں جا رہے تھے بلکہ ان کے خیالات و نظریات تھے ان میں فلسفہ تھا۔ وہ ایک سوشل رفارمر تھے۔ جو بھی مسایل معاملات چاہے وہ سماجی ہوں یا سیاسی ہوں یا مذہبی ہوں ان کو وہ عقل Reason سے حل کرتے تھے اور بہت سے مسایل کو عقلی سطح سے ہی سمجھایا۔ جب کوئی نظریہ یا فلسفہ سامنے آتا ہے تو اس میں اختلاف کی پوری گنجایش ہوتی ہے اور لوگوں نے اختلاف بھی کیا۔ کیونکہ کوئی بھی فلسفہ، کوئی بھی نظریہ فائنل یا آخری نہیں ہوتا ہے کیوں کہ دنیا کی صورت حال کبھی مستقل نہیں اس میں ہر چیز تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ تبدیلی اپنا کام کرتی رہتی ہے چاہے آپ اس سے باخبر ہوں یا بے خبر۔ اس لیے ہر ایک فلسفہ یا نظریہ وقت اور حالات کی دین ہے۔ فلسفہ حالات سے متاثر ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ سرسید کے زمانے میں جو حالات تھے جو قوم کی صورت حال تھی اس کی فکر سرسید کو بدرجۂ اتم تھی اور وہ اس میں بہتری لانا چاہتے تھے اور یہ تغیر اعلیٰ تعلیم سے ہی لایا جا سکتا تھا جس کے لیے انھوں نے اس ادارے کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمان

ترقی کے راستے Main Stream سے ہٹے ہوئے ہیں
اس سے پوری قوم پستی میں چلی جائے گی۔ ان کو آگے لانے کے لیے تعلیم ضروری ہے اور اس تعلیم میں بھی سائنس کی تعلیم پر بہت زور دیا۔ کیوں کہ انھوں نے محسوس کیا کہ غزالی کے فلسفے سے متاثر ہو کر مسلمان سائنس کی تعلیم سے بہت دور ہوتے جا رہے تھے اور بنا سائنس کے نہ کوئی ملک ترقی کر سکتا ہے اور نہ کوئی قوم۔ سماجی برائیوں توہمات، کرامات اور اسی طرح کی بہت سی چیزوں کو انھوں نے عقل Reason کے سہارے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔

ہندو مذہب بھی اصلاح کے دور سے گزرا ہے راجہ رام موہن رائے، رویندر ناتھ ٹیگور اور کشیب چندر سین کی اصلاحی تحریک میں اس کے نقوش ملتے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وقتاً فوقتاً مذہبی اصلاح کی تحریکیں رونما ہوتی رہی ہیں۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ابن خلدون بہت بڑے مفکر فلسفی، سائنس داں فلسفۂ اجتماع یا فلسفۂ تمدن Social Philosophy کے عالم جغرافیہ داں دنیا کے نقشہ (World Map) کے موجد۔ انھوں نے کئی مذہبی اصلاحیں کیں۔ ایک مشہور اصلاح انھوں نے یہ کی کہ ان سے پہلے قرآن مجید کو صرف ہاتھ سے لکھا جاتا تھا اس کو چھاپہ خانے میں چھاپہ نہیں جا سکتا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے قرآن مجید کی بے حرمتی ہوگی۔ سخت مخالفت اور تنقید ہوئی مگر ابن خلدون نے سب سہتیں سہیں اور کہا کہ کب تک اور کہاں تک آپ ہاتھ سے لکھیں گے۔ اس کی ضرورت بڑھتی جائے گی اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس کو مشین سے چھاپنا ہی پڑے گا اور آج ان کی بات سچ ثابت ہوئی اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مغلوں کے عہد زوال میں اس کا مظہر ولی اللہی تحریک تھی۔ ایک طرف شاہ ولی اللہ نے یہ پتہ لگایا کہ اسلام میں کس طرح غیر اسلامی عناصر مختلف راستوں سے ہو کر داخل ہو گئے ہیں دوسری طرف اجتہاد پر زور دیا۔ اس دور میں مختلف تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں مگر علی گڑھ تحریک کے رہنما سرسید، اس کا نام بھی علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی وجہ سے علی گڑھ تحریک پڑا جو سرسید ۱۸۷۵ء میں قایم کر چکے تھے اور سوسائیٹیوں کی بنیادیں رکھ چکے تھے۔ کیوں کہ وہ بدلی ہوئی فضا کا اندازہ لگا رہے تھے مگر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان کے ساتھ نہایت مخلص علم پرور، پرجوش کام کرنے والے بھی موجود تھے جو وقت کے تقاضوں کا احساس رکھتے تھے۔ سرسید کی زندگی کے ابتدائی چالیس سال بڑی بڑی عملی کامیابیوں سے خالی ضرور رہیں مگر ان میں علمی کاموں کی کمی نہیں ہے آثار الصنادید کی تصنیف آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح خود اپنی جگہ پر اہم کارنامے ہیں لیکن وہ سرسید جو علی گڑھ تحریک کے روح رواں بنے۔ وہ رسالہ اسباب بغاوتِ ہند، تبیین الکلام، مضامین تہذیب الاخلاق مجموعہ لکچر خطباتِ احمدیہ اور تفسیر قرآن کے سرسید ہیں ان کا ابتدائی علمی ذوق ہی ان کی بعد کی تصانیف میں کام آیا۔ سید احمد شہید کے مذہبی تصورات سے وابستگی نے ان کے ذوق ہی کو پروان چڑھایا اور اشاعت تعلیم او رخدمتِ خلق نے ان سے علی گڑھ کالج قایم کرایا۔ پھر بھی غدر اور غدر کے عام اثرات کو نظر انداز کر کے سرسید کے ارتقاء ذہن کو سمجھنا مشکل کام ہے۔ سرسید نے اپنی زندگی میں بڑے اتار چڑھاو دیکھے جن کا ان کے اوپر اثر بھی ہوا۔ مغل حکومت کا چراغ بجھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مسلمانوں کا زوال ان کی بدحالی انھوں نے خود دیکھی تھی ان تمام باتوں نے ان کے ذہن پر گہرے اثرات چھوڑے۔

سرسید نے یہ سمجھ لیا تھا اور صحیح سمجھا کہ ان کی قوم کو جدید تعلیم کی ضرورت ہے۔ اس لیے اپنی تمام صلاحیت اور قوت اس کام کے لیے لگا دی انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کی قوم اس پر رضامند نہیں ہوگی انھیں اس کا احساس تھا مگر انھوں نے کبھی ہمت نہ ہاری اور اس خواب کو پورا کر دکھایا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کو اسلام کی صداقت کا یقین کامل تھا۔ وہ قرآن مجید کے کتاب الٰہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوتِ کاملہ پر سچے دل سے یقین رکھتے تھے اور پھر وہ نہایت 'بے خوف' 'بہادر' بھی تھے۔ ان کی بابت یہ کہنا کہ وہ بعض باتیں محض انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے یا کسی ذاتی مفاد کی خاطر کرتے تھے غلط ہے۔ سید مہدی علی خاں سرسید کے بڑے بے تکلف دوست تھے۔ ایک خط میں سرسید ان کو لکھتے ہیں:

"میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں
اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کو
گمراہی سے نہ نکلتا اور میں خود تحقیقات
حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقیناً
مذہب کو چھوڑ دیتا۔"

(حیات جاوید۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص۲۴۲)

وہ یہ مانتے تھے کہ اسلام ہی دین حق ہے اور اس کی تمام تعلیمات عقل اور فطرت کے مطابق ہیں۔ اسلام کے مابعد الطبیعاتی

حقایق مثلاً وجود ابلیس و ملائکہ، جن، جنت، دوزخ، حشر و نشر، عذاب قبر وحی اور اس کی بعض تعلیمات مثلاً استرقاق (غلام باندی بنانا) تعداد ازدواج، معجزات، ان سب امور کی تشریح و توضیح اگر جمہور علماء کی تقلید سے ہٹ کر کی جائے تو وہ نہ خلاف عقل و قیاس رہتے ہیں اور نہ ان میں کوئی بات عہد حاضر کی تہذیب و شائستگی کے خلاف کہی جا سکتی ہے۔

یہ جو اُن کا انداز تھا وہ معتزلہ کے نظریے کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ یہ اتفاق تھا مگر یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ سرسید نے معتزلہ سے متاثر ہو کر عقل کی روشنی میں مذہبی مسایل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی یا خود لینے سے۔ اسلام کے مابعد الطبیعاتی حقایق مثلاً وجود ابلیس و ملائکہ، معراج وحی، جنت، دوزخ معجزات وغیرہ دین کا جزو نہیں ہیں۔ اس لیے اگر ہم ان کی تاویل اس طرح پر کریں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کے تصور سے الجھن نہ ہو تو اس میں مضایقہ نہیں۔

سرسید کے مکتوبات پڑھنے سے جو چیز بار بار اثر انداز ہوتی ہے وہ ان کے جوش ایمانی اور حب اسلامی کی کیفیت ہے۔ اسلام کے دین فطرت ہونے پر وہ پورا یقین رکھتے تھے۔ وہ اس کی کسی تعلیم کو فطرت یا نیچر کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔ مذہبی مسایل پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد یہی تھا کہ اسلام کو عقل اور فطرت کا مذہب ثابت کر کے دکھائیں۔

مغربی تعلیم سے نوجوان مسلمانوں کے مذہبی عقاید پر جو اثر پڑ رہا تھا، سرسید اس سے باخبر تھے۔ مذہب کے تحفظ کے لیے دینیات کی تعلیم بھی لازمی قرار دی تھی لیکن جو کتابیں دینیات میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کے خیال میں وہ اس مسئلے کا سدباب کرنے کے لیے ناکافی تھیں جو انگریزی تعلیم سے پیدا ہو رہا تھا۔ ایک خط میں نواب عماد الملک کو لکھتے ہیں:

"دینیات کی تعلیم کا سوال نہایت مشکل ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ

کتب سنی تھا اور شیعہ اس قابل نہیں ہیں
کہ بعد تعلیم علوم جدید کسی مسلمان کا اعتقاد
قلبی مذہب اسلام پر رہے صرف
معتزلیوں کے اصول مذہب اور کتابیں
کسی قدر عمدہ معلوم ہوتی ہیں مگر موجود نہیں
ہیں۔ یہی خیال مجھ کو باعث ہوا کہ میں نے
قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے۔"

یہاں اس خط سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سرسید پر معتزلہ کا کافی اثر تھا اور وہ ان کے عقلیتی فلسفے سے کافی متاثر تھے اور انھوں نے اس چیز کو اپنی عملی زندگی میں باضابطہ طور پر استعمال کیا۔ اسی سے متعلق ایک واقعہ اور پیش آیا کہ جب سر ولیم میور کی کتاب چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان آئی جس کا نام "لائف آف محمد" تھا۔ اس وقت جو حال سرسید کا تھا وہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ بہت بے چین تھے۔ اکثر ولیم میور کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس سے کہتے تھے کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔

بات غور طلب ہے اور موجودہ حالات میں اس سے بھی روشنی مل سکتی ہے۔ سرسید خود انگلینڈ گئے ۱۸۶۹ء میں۔ تاکہ وہاں کی لائبریری میں بیٹھ کر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھ سکیں۔ نواب محسن الملک کو خط لکھتے ہیں کہ:

"کتابیں اور میرا اسباب فروخت کرکے
مجھے ایک ہزار روپے بھیج دو..... میں
یہاں مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے
رسالے لکھ رہا ہوں اور اس کا نام "مواعظ
احمدیہ" رکھا ہے۔ پہلا وعظ تیار ہوگیا ہے
جس کا مضمون یہ ہے کہ مسلمانوں کی کتابوں
میں معتبر و غیر معتبر اور صحیح و غلط روایتیں
شامل ہیں اور وہ اس قابل نہیں ہیں
کہ ان کو ہر ایک بات کو اصلی مذہب
سمجھا جاوے۔ پس جن لوگوں نے ہماری
کتابوں کی روایتوں سے ہمارے مذہب
پر یا جناب پیغمبر خدا صلعم کی نسبت الزام
اتہام دیا ہے وہ حماقت ہے۔ کیونکہ اول
یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ روایت صحیح اور معتبر
بھی ہے یا نہیں... اس کے مصنف کے
دل میں بجز مذہب اسلام کی محبت
اور کسی کی محبت نہیں ہے۔ اس نے
اس طرح یہ وعظ لکھا ہے جیسے کہ مولوی
اسمعیل صاحب نے محبت توحید میں
"تقویۃ الایمان" لکھی ہے۔ ایک جگہ
لکھا ہے کہ ائمہ مجتہدین کے مسائل اجتہادیہ
اور قیاسی اصلی مسلمان مذہب کا نہیں
ہے۔ وہ صرف ایک قانون داں کی رائے
ہے۔ پس کسی مجتہد کی رائے پر اعتراض
کرکے مذہب اسلام کو غلط قرار دینا
بجز حماقت کے اور کچھ نہیں ہے۔"

۳۰ر اگست خط میں لکھتے ہیں:

"ان دنوں میرے دل میں ذرا سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا..." ..... مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جاوے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہوجاوے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہوجاؤں تو بلا سے

قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ
اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد
صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مرگیا حاضر کرو۔"

یہ محض چند جملے نہیں ہیں، لکھنے والے کے دل کے ٹکڑے ہیں محبت رسول کی اس سے زیادہ بہتر مثال قرون اولیٰ کے بعد کم ملے گی۔ سرسید کی باتوں کو آج بھی مثال بنایا جا سکتا ہے۔ اب یہ محبت کہاں۔ سلمان رشدی نے "سیٹنک ورسس" لکھی۔ عالم اسلام میں اس بات کا چرچا ہوا مگر کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اس کتاب کو بیٹھ کر سرسید کی طرح مطالعہ کیا ہو اور ان کی طرح دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا ہو۔ آج تو پیسے کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہی ایسی جماعتیں ہیں جن کو اسلام کے فروغ کے لیے پیسہ ملتا ہے اور وہ اپنے فروغ پر استعمال ہوتا ہے اس لیے سرسید نے اخلاقی تعلیم پر بھی اتنا ہی زور دیا جتنا مذہبی تعلیم پر اور تمام معاملات کو چاہے وہ مذہبی ہوں، سماجی ہوں، اخلاقی ہوں یا تعلیمی، ان میں ایک Rational approach ہو وہ بہت جذباتی بھی تھے مگر جذبات کو عقل پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ ضرورت ہے آج ایسے باعمل بندوں کی جن کی حیات مبارک سے ہم سبق لیں اور ان کو یاد کریں جس سے ہماری زندگی کا مقصد کچھ تو خدمت خلق، خدمت قوم و ملک ہو سکے۔
اور آج تو اس کی اور بھی ضرورت ہے سلمان رشدی نے بھی ایک طرح وہی کیا جو ولیم میور نے کیا تھا اور اس کا پہلا سدباب وہی ہونا چاہیے تھا جو سرسید نے ولیم میور کی کتاب کے لیے کیا۔ ایک بات قابل غور ہے۔ ایسے حملے ہمیشہ غیر مسلموں نے اسلام پر کیے مسلمانوں نے اس طرح کبھی بھی کسی مذہب یا اس کے رہنما کی شان میں گستاخی نہیں کی۔ سلمان رشدی کیا ہیں آپ جانتے ہیں وہ باعمل مسلمان تو نہیں۔ کسی مسلک کو نہ ماننا الگ بات ہے۔ کسی مذہب سے ہمدردی نہ رکھنا، اس پر کیچڑ اچھالنا دوبھی
دنیاوی اغراض و مقاصد کے لیے غیر اخلاقی بات ہے، ذلالت ہے۔

سرسید کے خیالات بہت واضح عملی اور عقلی ہیں ایک خط میں انھوں نے اسی دور میں لکھا ہے کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے پر تو ہنگامہ کرسکتے ہیں مگر ان سے کسی مذہبی کام کے لیے چندہ مانگا جائے تو سب جوش ختم ہو جاتا ہے۔

خطبات احمدیہ کی تصنیف کے علاوہ جو حمایت اسلام میں سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے انھوں نے قیام لندن کے دوران دو اور کتابوں کی اشاعت کا انتظام بھی کیا جو انگریز مصنفوں کی لکھی ہوئی تھیں۔ ان مصنفوں نے اسلام کو انصاف کی نظر سے دیکھا اور اس کی حمایت کی تھی۔ ان مصنفوں کے جذبے سے متاثر ہو کر سرسید محسن الملک کو لکھتے ہیں۔

"ایک انگریز جس کا نام مسٹر جان ڈیون پورٹ ہے، حمایت اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے اور جس قدر اتہام اور بالزام انگریزوں نے آں حضرت صلعم پر اور قرآن پر اور مذہب اسلام پر لگائے ہیں اس کا جواب دیا ہے چونکہ یہ کتاب انگریزوں کے بالکل مخالف تھی اس لیے اس کا چھاپہ جانا اور فروخت ہونا مشکل تھا میں نے کل لاگت چھاپہ کی دینی قبول کی۔ وہ کتاب تیار ہو گئی ہے اور آئندہ میل میں روانہ کروں گا۔"

"تصویر مسٹر ڈیون پورٹ کی بھیجتا ہوں نہایت تعظیم، ادب اور محبت رکھنے کے لائق آدمی ہے۔ وہ مسلمان نہیں ہے انگریز ہے جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے [illegible]

کہ وہ انگریز ہزار درجہ مسلمانوں سے بہتر ہے"

ڈیون پورٹ کی کتاب کا نام "اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن ہے یہاں اس کے دو اردو ترجمے ہوئے ایک مولوی عنایت الرحمن نے کیا اور دوسرا مولوی ابوالحسن نے دوسری کتاب گاڈفرے ہیگنز کی تھی۔ اس کے متعلق ۱۶ نومبر ۱۸۶۹ء کے خط میں نواب محسن الملک کو سرسید لکھتے ہیں

"نہایت مشکل ہے میں نے ایک کتاب
اور مسٹر ہیگنز کی تلاش کی ہے۔ وہ صرف
ایک مرتبہ چند نسخے چھاپے ہوئے تھے۔ وہ
کتاب ایسی عمدہ ہے کہ مسٹر ڈیون پورٹ
کی کتاب اس کے آگے آفتاب او
ستارہ کی نسبت رکھتی ہے"

مولانا حالی کا بیان ہے کہ گاڈفرے ہیگنز کی کتاب جو کسی زمانے میں انھوں نے حمایت اسلام میں لکھی تھی نایاب ہو گئی تھی۔ ایک جرمن کتب فروش کی دوکان سے جہاں ہر زبان کی نایاب کتابیں ملتی ہیں سرسید نے دس گنی قیمت دے کر لندن میں خریدی۔ اصل مقصد اسے خریدنے سے یہ تھا کہ "خطبات احمدیہ" کی تصنیف میں اس سے مدد لی جائے۔"

سرسید کے دل میں صرف اسلام اور پیغمبر اسلام کا جذبہ نہ تھا بلکہ انگریز مورخوں نے جو مسلمان بادشاہوں اسلامی حکومتوں اور مسلمانوں کے حالات بیان کرنے میں جو تعصب سے کام لیا ہے، اس کا بھی ان پر بڑا اثر تھا اور اس میں بھی بڑی Rational approach رکھتے تھے کہ اس کا جواب بھی Reason کی بنیاد پر دیا جائے جو معتزلہ کا اصول تھا۔

ایک اور خط میں سرسید نے محسن الملک کو لکھا ہے کہ اب ایک اور کام باقی ہے۔ دو بہت بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کا بہت بڑا تعلق ہے۔ ایک واقعہ فتح اندلس کا ہے جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی انگریزوں پر حکومت رہی جو تعلیم تربیت مسلمانوں نے اس قوم کی کی وہ قابل فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں سے اور تمام عیسائی لوگوں سے بیت المقدس پر ہوئیں۔ سرسید لکھتے ہیں کہ ڈیون پورٹ سے اس سلسلے میں بات ہوئی ہے کہ وہ انصاف سے تمام سچائی کو سامنے رکھیں۔ وہ ایک بڑے عالم ہیں کئی زبانوں کے ماہر گہرا مطالعہ ہے۔ وہ اس کام کو بخوبی اعلیٰ سطح پر انجام دے سکتے ہیں۔ ان کو انگریز مصنفوں پر بھروسہ نہیں ہے

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب "پریچنگ آف اسلام" جب شائع ہوئی تو سرسید کو بہت خوشی ہوئی۔ اس کا ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب سے کرا کے اسے بڑے اہتمام سے چھپوایا وہ چاہتے تھے کہ مسلمان طالب علموں میں اسے مفت تقسیم کیا جائے جس سے انگریزوں کے زہر کا کچھ تو تدارک ہو۔ اسی طرح ہر مسئلہ کو انھوں نے Rationally حل کرنے کی کوشش کی۔ مضمون طویل ہو جائے گا۔ اس لیے اس کو یہاں یہیں ختم کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے معاملات اور مسایل ہیں جس سے ان کے فلسفیانہ ذہن کا عندیہ ملتا ہے انشاءاللہ اس کا ذکر اگلے مضمون میں کروں گا۔ مختصر یہ کہ نہ تو اپنی تاریخ کو بھولنا چاہیے اور نہ ہی ان بزرگوں کے کارناموں اور خدمات کو جو سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج مصروفیت کا دور ہے کہاں فرصت کہ موٹی موٹی کتابوں کو پڑھا جائے مگر مختصر مضامین سے بھی ہم ان بزرگوں کے کارناموں کو یاد کر سکتے ہیں اور بہت کچھ روشنی پا سکتے ہیں۔ سرسید اپنے زمانے سے بہت آگے تھے ان مسایل کو بخوبی محسوس کیا جو آج درپیش ہیں۔ اس لیے سرسید قدیم اور جدید کا بہترین امتزاج ہیں ان سے وابستگی آج بھی بہت سے مسایل کو حل کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوگی۔

آپ کا تعلیمی مزدور

سرسیّد

عقیلہ شاہین *

سرسید کے ایک سوانح نگار نے ان کو "تعلیم کا پیغمبر" لکھا ہے لیکن ہمارے لیے تو الفاظ کے استعمال میں ذرا احتیاط ہی بہتر ہے۔ اس لیے صحیح اظہار حقیقت کی غرض سے سرسید کے اہم رفیق کار اور اہم قوم سوانح نگار حالی کی رائے کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے حالی فرماتے ہیں:

"اگرچہ قوم میں لائق آدمی روز بروز بڑھتے جاتے ہیں مگر مزدوروں کا گھاٹا ہوتا جاتا ہے۔ جوہریوں سے بازار بھرا پڑا ہے مگر کان کھودنے والے مفقود ہیں ..... ان خیالات سے میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس قومی فرض کو پورا کرنا چاہیے (سرسید کو سوانح لکھنے کا فرض)

اور حیات جاوید کے واقعات سے جابجا یہ معلوم ہوتا بھی ہے کہ سرسید اور ان کے رفقا دراصل اپنے آپ کو قومی تعمیر کی بنیاد ڈالنے والے مزدوروں ہی کی طرح شمار کرتے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں جو کالج بننے سے دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ سرسید لاہور شہر میں ہزاروں کے مجمع میں تقریر کر رہے تھے۔ تقریر حسب دستور سادہ تھی مگر احساس کی خاکساری دلوں میں اترتی جاتی تھی۔ تقریر کچھ یوں تھی۔

"اے بزرگانِ پنجاب میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، جو بڑے چمار، تعلیہ، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدور کہتے ہیں مگر آپ نہ مجھ اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں۔ نہ مجھ اس مسجد کو منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ سو مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم

* جنرل سکریٹری حلقۂ ارباب ذوق، ٹورنٹو، کنیڈا۔

کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کر لیجیے اور میری محنت مشقت سے اپنے لیے گھر بنتے دیکھیے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے، اپنے گھر کو ست ڈھائیے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت نامۂ سیاہ کی شامتِ اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ ڈبونا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔"

ان جملوں میں ادیبانہ حسن تو نہیں ہے لیکن خلوص اور سچائی کے چاند ستارے روشن ہیں۔ اسی خلوص کا کشکول لے کر وہ قوم سے چندوں کی بھیک مانگنے نکلے مگر اس شان سے کہ پہلے اپنا سب کچھ کالج کی نذر کر چکے تھے۔ لاکھوں (اندازاً دس لاکھ) روپیہ جمع کیا پھر ایک ایک پائی بڑی احتیاط اور توجہ سے خرچ کی اور نہایت دانائی کے ساتھ شاندار ترین عمارتیں بنوانی شروع کیں لیکن پیسہ بچانے کے لیے نقشے خود ہی بنا لیتے تھے اور جلتی دوپہر، تیز لوؤں میں نگرانی اور اٹھائی دھری کے لیے مزدوروں کے ساتھ ہی لگے رہتے تھے۔

پچیس سال بعد ۱۸۹۸ء میں ان کے انتقال کے وقت کا نقشہ حالی کی زبان میں یوں ہے:

"ہر دو جماعت کے مسلمان ہندو عیسائی اس کثرت سے جنازے کے ساتھ تھے کہ غالباً علی گڑھ میں اس نوعیت کا اژدحام کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ جو راج مزدور بڑھئی اور سنگ تراش پچیس چھبیس برس سے کالج میں کام کرتے تھے ان کے بچے اور عورتیں دیہات سے یہ خبر سن کر آئے تھے اور گزرگاہ کے ایک جانب کھڑے حسرت سے اپنے مربی کے جنازے کو تک رہے تھے"

اس ذکر کے ساتھ اب یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کی وفات دو شدید صدمات کے ساتھ ہوئی۔ ایک یہ کہ کالج کے کلرک شام لال نے کالج کا فنڈ جو ایک لاکھ پانچ ہزار کے قریب تھا غبن کر کے ضائع کر دیا۔ دوسرا یہ کہ سید محمود کی طرف سے ناامیدی جو شراب نوشی اور قومی خدمات سے مکمل بے نیازی کی صورت میں ظاہر ہو چکی تھی۔

برسبیل تذکرہ یہ بھی سن لیجیے کہ سرسید کی ذاتی زندگی بھی بہت سے صدمات سے دوچار رہی تھی، جواں سال ہم عمر بھائی کی رحلت کے سوا رفیقۂ حیات کی جوانی کے زمانے میں رحلت اور ایک جوان بیٹی اور بیٹے کا ایک سال کی مدت میں وفات پانا بھی شامل ہے۔ یہ دونوں اولادیں سرسید کے مشاغل میں بھی پوری طرح ان کی قوت بازو بنی ہوئی تھیں، اس لیے بھی یہ ان کے لیے بہت بڑا دھکا تھا لیکن اس کے سوا بھی قوم کی تباہی کا جو پورا دور اُن کی آنکھوں کے سامنے گزرا اس کے بہت سے پہلو کسی بھی حساس انسان کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ ۱۸۵۷ء کے آس پاس غالب کے دوستوں اور عزیزوں پر دلی میں جو کچھ گزری اور جس قسم کی شکایاتِ خون چکاں سے غالب کے خطوط اشک فشاں نظر آتے ہیں وہی سب سرسید پر بھی گزری تھی۔ ان کے ہم عصر صحافی پہلے اردو اخبار کے ایڈیٹر

مولوی محمد باقر (والد محمد حسین آزاد) کو دلی کے چاندنی چوک میں بطور سزا گولی ماری گئی۔ مولانا امام بخش صہبائی جیسے فاضل وقت درویش استاد دلی کالج کو بائیس اہل خاندان اور دوسرے اکابر شہر کے ساتھ جمنا کے کنارے کھڑا کر کے گولیوں کی باڑیں ماری گئیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے فاضل وقت کو ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ مقبوضہ جزیرے مالٹا میں قید کیا گیا اور بڑھاپے میں ان سے قید بامشقت لی گئی۔ ہزاروں محبان وطن اور شرفا کے خاندان کے خاندان تباہ و برباد کر دیے گئے۔ محلے کے محلے اور آبادیاں کی آبادیاں بے نام و نشان کر دی گئیں۔ شہر دلی اور اس کے مضافات کو بطور سزا پنجاب میں شامل کر دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر کتنا ہی بے دست و پا بادشاہ سہی جب وہ انتہائی ظلم، اہانت اور بے دردی کے ساتھ رنگون میں قید کیا گیا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت کی نشانی اور مشترکہ ہندو مسلم تہذیبی ورثے کا عکس ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے باشندے اس پر خون کے آنسو بہاتے تھے لیکن بقول ظفر ؎

"جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے"

اس زمانے میں سرسید نے اسباب بغاوت ہند تصنیف فرمائی اور اپنے خرچ سے انگریزی میں ترجمہ کر کے چھپوائی اور وزیر ہند کو لندن بھیجی جن لوگوں نے یہ مختصر کتاب پڑھی ہے وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس زمانے میں ان حقائق پر مواد پیش کرنا سر سے کفن باندھ کر مقتل میں اترنے کے برابر تھا۔ اس کتاب میں حقائق و دلائل کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں سارا سیاسی انتشار پیدا کرنے کی ذمہ داری دراصل کمپنی کی حکومت کے اہل کاروں پر ہے جنھوں نے تمام مذہبی، تعلیمی، معاشرتی اور معیشتی اداروں کو برباد کر کے ہندوستانیوں کے قلب و ذہن کو فگار کر دیا تھا (اسباب سرکشی ضلع بجنور بھی اسی سلسلے کی دوسری کتاب ہے)۔ اسباب بغاوت ہند اس وقت ہندوستان میں شائع ہی نہیں ہوئی لیکن لندن کی پارلیمنٹ میں لفظ بہ لفظ پڑھی گئی کیوں کہ اس معمار قوم نے ذاتی طور پر تمام مصارف برداشت کر کے تمام جلدیں برٹش گورنمنٹ کو بھجوا دی تھیں صرف اس لیے جان کا خطرہ مول لیا کہ مسلمانان ہندوستان کے مزید ظلم و ستم سے محفوظ رہنے کی ایک صورت پیدا ہو جائے۔

اب اس معمار قوم کی دوسری تصویر بھی قابل توجہ ہے کہ وہ شخص جس کا اپنا مکان لٹ گیا تھا مرادآباد بجنور اور قرب و جوار کے علاقوں کے مسلمانوں کی جائیدادیں واپس دلانے کی تگ و دو کو اپنا فرض سمجھتا تھا اور بیشتر علاقے انھوں نے واپس دلا کر بھی چھوڑے۔ خود کو لٹے ہوئے مکان کا جو معاوضہ ملا اس کو لندن جا کر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب لکھنے اور انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کرنے پر خرچ کر دیا۔ مکان کا جو کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی فروخت کر کے اس کتاب پر لگا دیا۔ اس کے ساتھ ایک انگریز جان ڈیون پورٹ کی کتاب "اپالوجی فار قرآن" جسے کوئی انگریز پبلشر اس لیے ہاتھ نہیں لگاتا تھا کہ اس میں قرآن کی صداقت اور اہل تثلیث کی زیادتیوں کا اظہار کیا تھا، سرسید نے وہ بھی اپنے خرچ سے چھپوا کر شائع کی۔

ادھر ملکی محاذ پر جلاء القلوب بذکر المحبوب (محبوب کون؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) راہ سنت در رد بدعت، پیری مریدی کے خلاف ایک رسالہ بائیبل اور توراۃ کی تفسیر، تفسیر القرآن، رسالہ ابطال غلامی

تحریک ہے۔ اگرچہ ان کی فکر کو خلاف اسلام قرار دیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرسید مذاہب اور فرقوں کے اعتقادات کو صداقت کے معیار پر ایک دوسرے سے قریب لانے کے حق میں تھے اور وہ صداقت اسلام کے بنیادی ارکان کے سوا دوسری نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی صداقت کے اظہار نے ان کو تمام عمر بے چین رکھا۔ وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہی نہیں بلکہ حضور صلعم کے سچے عاشق اور پیروکار تھے۔ ۳۸ ویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ ادھر تصوف کے سلسلے میں ان کا تعلق مرزا مظہر جان جاناں سے بھی ہے اس لیے انھوں نے اسلام پر جو کچھ لکھا محرم راز درون کی حیثیت سے لکھا اور جن لوگوں نے ان کے خلاف لکھا یا اب بھی لکھ رہے ہیں وہ محرم راز صداقت نہیں ہیں۔

سرسید نے جن لوگوں سے دین سیکھا یا پڑھا تھا وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے مصلحین اور علماء تھے ان میں شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ شاہ عبدالعزیزؒ کے جانشین محمد اسحاق، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاد مولانا مملوک علی تھے (اور مولانا مملوک علی دہلی کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل تھے اور مولانا قاسم نانوتوی نے مدرسۂ دیوبند کی بنیاد رکھی) یہ تمام حضرات شاہ ولی اللہ کے اصلاحی اور سیاسی سلسلۂ خیال سے تعلق رکھتے تھے اور اسی سلسلے کی ایک کڑی سید احمد شہید (شہادت ۱۸۳۰ء) تھے۔ جن کی تحریک کو انگریز اپنے مفادات کا دشمن سمجھتے تھے اور نجد کے مذہبی اور سیاسی رہنما مولانا عبدالوہابؒ سے متعلق جان کر وہابی کہتے تھے اور پھر وہابیوں پر تعزیر و تعذیب کا تازیانہ بے دریغ استعمال کرتے تھے لیکن سرسید تمام سزاؤں سے ڈرے بغیر برملا کہتے تھے کہ میں وہابی کی تیسری قسم ہوں یعنی کریلا اور نیم چڑھا۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرسید نے جو کچھ کہا بڑے اعتماد سے کہا اور جو نظریات قائم کیے اپنی آزاد رائے سے بے لاگ قائم کیے۔ ان کی فکر کی رہنمائی ان کے دلی خلوص کے ہاتھ تھی۔ اس لیے جلد یا بدیر تمام قوم کو ان کے اصول تسلیم کرتے ہی بن پڑی۔

سرسید کے مخالفین

سرسید کے قائم کیے ہوئے نظریات بیشتر اسلامی دنیا میں رائج ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کے مخالفین کا ذکر کرنا ہی تضییع اوقات ہے لیکن بطور ایک تجزیے کے یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ سرسید پر جو کفر کا فتویٰ کچھ نادانوں کی طرف سے لگایا گیا تھا اس کے محرکات کیا تھے؟ اس ضمن میں شیخ محمد اکرام مصنف موج کوثر کا ایک اقتباس قابل غور ہے۔

> "جن لوگوں نے سرسید کے حالات بغور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت ان علماء نے کی جو سرکار انگلشیہ اور انگریزی کے مخالف تھے، حقیقت اس کے برعکس ہے مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے اور دونوں معزز سرکاری ملازم۔ مولوی امداد علی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج حالی نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع ان ہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے مخالف تھے اور ان میں سے بعض کے

ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق
تھا۔ اس لیے سرسید کو مخالفت
کو انھوں نے ایک ذریعہ ان کی
خوشنودی اور اپنی سرفرازی کا
سمجھا۔"

مولوی امداد علی اپنی کتاب "امداد الآفاق" میں سرسید کی وفاداریٔ حکومت پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افسوس کسی مقام پر باغیوں کے
مقابلے میں بھاگنے کے وقت تک کوئی
لاٹھی اپنی پشت مبارک پر نہ کھائی
زخم تلوار یا بندوق کی گولی تو چیز ہی
دوسری ہے۔"

پھر اپنی جاں نثاری کی نسبت یوں لکھا ہے۔

"جو شخص سینہ سپر ہو کر بہ لحاظ نمک
حلالی اپنے آقا کے سینہ پر گولی کھاوے
اور ہزار ہا کا مال ان سے چھڑاوے
اور وہ گولی چھ مہینے بعد ڈاکٹر Rean
صاحب بہادر نکالیں اور جس کا خون
جناب لورنس صاحب داماد جناب
لفٹننٹ گورنر بہادر اور بنٹ
صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ متھرا پونچھنے
جاویں۔"

امپریلسٹوں کے نمک حلالوں کی طرف سے یہ کفر کے فتوے مسلمانوں کی نئے سرے سے جد وجہد کی راہ میں ایک اور پتھر تھا۔ اس سلسلے کے پہلے پتھروں کی چوٹیں وہ تھیں جب ملازمت کے دوران قحط کے زمانے میں ہندو مسلمانوں کے وہ چھوٹے چھوٹے بچے جن کے ورثا سے سرسید یہ وعدہ کر چکے تھے کہ ان کو ان کے دین پر رکھا جائے گا۔ زبردستی سرسید سے چھین کر عیسائی مشنریوں کو دے دیے گئے۔ آگرہ میں دربار ہوا اور ہندوستان کے شرفا کے لیے اس قدر توہین آمیز کلمات کہے گئے کہ سرسید نے وہاں شریک ہونا قبول نہیں کیا۔ سرکاری اسکولوں میں سرہنری ایلیٹ کی تاریخ کی کتابیں جن میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا دشمن اور ظالم بتایا جاتا تھا، پڑھائی جانے لگیں۔ اردو کے مقابلے میں ہندی کی ہمت افزائی ہونے لگی۔ بنارس کہ جہاں سے سرسید کے نام پر ایک وظیفہ ہندو اور مسلمانوں کی متفقہ رائے سے قائم کیا گیا تھا مگر وہیں سے بنارس ہندو یونیورسٹی کی بنا اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس میں مکمل طور پر حکومت کا ہاتھ تھا۔ ۱۸۸۱ء میں پنجاب اور الٰہ آباد میں یونیورسٹیاں کھولنے کا فیصلہ ہوا لیکن ان میں صرف مختلف زبانیں پڑھانے کی بابت طے کیا گیا۔ اس وقت سرسید نے بغیر کسی فرقہ وارانہ احساس کے ان یونیورسٹیوں میں سائنس کے مضامین پڑھانے پر زور دیا مگر سرکاری حلقوں اور ان کے دیسی نمک حلالوں کی طرف سے سرسید کی انگیزیا کا مذاق اڑانا شروع ہو گیا اور اس تحمل کی چٹان کی طرف سے صرف یہ جواب آیا:

"جی تو کہتا ہوں کہ ہمارے بچوں
کو ہائی ایجوکیشن دی جائے۔"

(سائنس کے مضامین کو اس زمانے میں یہی کہا جاتا تھا)۔

یہ سب امور اس بات کا ثبوت معلوم ہوتے ہیں کہ سرسید ناداں نہیں تھے۔ نہ ہی انگریزوں کی نقالی کی تحریک اور تائید کر رہے تھے بلکہ اس زمانے کے ملکی، معیشتی، ملی اور سیاسی حالات پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے

اپنی شکست خوردہ قوم کی معیشتی، معاشرتی، علمی اور نفسیاتی خوداعتمادی کی تعمیرِ نو کا فریضہ پورا کر رہے تھے۔ اس مہم کی ادائیگی میں ایک مزاحمت تو ان قدامت پسندوں کی طرف سے ہوئی جو سیاسی اور فوجی طاقت کی جنگ ہارنے کے باوجود نئی حکومت کو جائز طور اپنا دشمن تصور کرتے تھے اور اس کی لائی ہوئی ہر تبدیلی سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ دوسری طرف ایک درپردہ مخالفت اور مخاصمت حکومتِ وقت کے اہلکاروں کی جانب سے بھی موجود تھی جو مسلمانوں کو خاص طور سے اپنا دشمن جانتے ہوئے ان کے لیے کسی علمی اور معیشتی تحریک کو سیاسی شعور بیدار ہونے کا سبب بنتے دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے کمپنی کی حکومت کے ملازموں اور ملکۂ برطانیہ (یعنی امپیریلسٹوں) کے عاملوں کے حملے سرسید پر جا و بے جا دباؤ کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک دباؤ ان الٹے سیدھے فتووں کا بھی تھا جو سرکاری ملازمین کے توسط سے اور اکثریت غلط طریقوں سے کچھ اہلِ علم اور کچھ غیر اہلِ علم سے حاصل کیے جاتے تھے۔ سرسید ان تمام محرکات کو پہچانتے تھے لیکن ان بڑے شاطروں کا مقابلہ کرنا جو چھوٹے چھوٹے مہرے آگے بڑھاتے رہتے تھے، نہ اس وقت کی مصلحت تھی نہ کسی اقدام کی صورت میں قوم سے کچھ تعاون کی توقع تھی جیسا کہ ولیم میور کی "لائف آف محمد" کا جواب اور 'اسبابِ بغاوتِ ہند' لکھنے کی صورت میں ہوا۔ پھر بھی انھوں نے بہت سے حملوں کا توڑ کیا اور بہت سے حربوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا لیکن چوں کہ قوم کا تعلیمی منصوبہ ان کا اہم ترین مطمحِ نظر تھا، اس لیے اکثر اوقات وہ بعض جا و بے جا دباؤ چپکے سے اپنے دل پر جھیل

کر اپنی قوم کی قسمت کا بوجھ
اٹھائے لیے
جاتے تھے۔

مکتوباتِ سرسید بنام محسن الملک

کی روشنی میں

سرسید

ابوسفیان اصلاحی *

سرسید احمد خاں (۱۸۹۸۔ ۱۸۱۷ء) کو اپنی زندگی میں جہاں بے پناہ عداوتوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا وہیں ان کے کچھ احباب ایسے بھی تھے جو دل سے درمے سخنے ان کے لیے ہمہ آن تیار رہے۔ اللہ کے فضل، سرسید کے خلوص اور دوستوں کی اعانت ہی کا نتیجہ ہے کہ انھیں اپنے مقاصد میں غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی۔ سرسید کے دوستوں میں ایک نمایاں نام محسن الملک (۱۹۰۷۔ ۱۸۳۷ء) کا ہے۔ آپ سرسید کے دکھ درد میں شامل رہے۔ سرسید اپنے تمام مسایل کو محسن الملک کے روبرو پیش کرتے۔ انگلستان میں قیام کے دوران سرسید نے ان سے برابر رابطہ قایم رکھا۔ لندن سے اور ہندوستان میں رہ کر سرسید نے محسن الملک کو متعدد خطوط لکھے۔ ان خطوط سے سرسید کے متعدد پہلو منظر عام پر آتے ہیں۔ بہت سے علمی مسایل کا ذکر ملتا ہے۔ مختلف جگہوں پر وہ محسن الملک کی رائے جاننا چاہتے تھے۔ محسن الملک ایک پایہ کے عالم تھے۔ قرآن وحدیث اور دیگر اسلامی علوم پر ان کی گہری نظر تھی۔[۱] ۱۸۳۷ء میں اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ حیدر آباد میں نظام کے سیاسی مشیر تھے۔ نام مہدی علی خاں تھا۔

نظام حیدر آباد کی طرف سے محسن الملک کا خطاب دیا گیا اور یہ خطاب اس قدر مشہور ہوا کہ بہت کم لوگ ان کے نام کو جانتے ہیں۔ سرسید کے انتقال کے بعد علی گڑھ کالج کے سکریٹری ہوئے اور عمر کے آخری لمحات تک موصوف کالج سے وابستہ رہے ۱۹۰۷ء میں شملہ میں اپنے خالق سے جا ملے اور انتقال کے بعد موصوف کے جنازے کو شملہ سے علی گڑھ لایا گیا اور سرسید کے مزار کے پہلو میں سپرد خاک[۲] کر دیا گیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کا غم

محسن الملک کے نام لکھے گئے خطوط کی روشنی میں سرسید کا ایک خاکہ پیش کیا جائے گا۔ ان خطوط کے آئینے میں سرسید کا حقیقی عکس نظر آتا ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ سرسید کو ملّت اسلامیہ اور وطن عزیز کا غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ ملّت اسلامیہ اور وطنِ عزیز کو ہر طرح سے مرفہ حال اور آسودہ دیکھنے کے آرزومند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوں۔ سول سروس کے باب میں ایک جگہ محسن الملک کو لکھتے ہیں:

"دو ہندو واسطے امتحان سول سروس کے

* شعبۂ عربی۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ

بمبئی سے اور آئے ہیں۔ افسوس ہے مسلمان
پیچھے رہے جاتے ہیں۔"

ایک بار [illegible] اخبار میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں یہ بتایا گیا کہ روز بروز ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ بنگال کے ملازمین میں معدودے مسلمان ہیں وہ بھی رٹائرڈ ہوتے جارہے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے لیتے جارہے ہیں۔ آئندہ مسلمان صرف کلرک اور چپراسی کے سوا کچھ نہیں ہوں گے۔ سرسید کو یہ مضمون پڑھ کر شدید غم ہوا اور محسن الملک کو لکھا کہ:

"دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا
اب سب لوگ یہی کہتے ہیں۔"

آگے ایک خط میں سرسید فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو تقلید جامد سے کنارہ کشی اختیار کرنی ہوگی اور انھیں علوم جدیدہ کو حاصل کرکے مذہب کا دفاع کرنا چاہیے اگر یہاں کے مسلمانوں نے ایسا نہ کیا تو ہندوستان سے مذہب اسلام معدوم ہوجائے گا۔ تحقیق ضروری ہے اور تقلید لاحاصل۔ آگے سرسید اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے سلسلے میں تعصب سے احتراز کرنا چاہیے۔ آج مسلمانوں پر ادبار چھایا ہوا ہے۔ وہ جھوٹے اور لغو تعصب میں مبتلا ہیں۔ وہ اپنے مفادات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہندوؤں کے مقابلے میں وہ زیادہ حاسد ہیں۔ وہ شیخی مارنے میں ماہر ہیں جب کہ ان کی مفلسی خود عیاں ہے۔ آگے سرسید لکھتے ہیں کہ سلطان محمود و سلطان عبدالحمید اور سلطان عبدالعزیز کو صرف تعصبات سے سبکدوش ہونے کی بنا پر کامیابی ملی۔ مذہب اسلام میں تعصب کا گزر نہیں ہے۔ آج دنیا کی بیشتر زبانوں میں مسلمانوں کا جو حال بیان کیا جارہا ہے وہ صد درجہ افسوس ناک ہے۔

وطن عزیز کا غم: سرسید کو جس طرح ہندوستانی مسلمانوں کے افلاس کا غم تھا، اسی طرح انھیں وطن عزیز کی تنزلی کا بھی دکھ تھا۔ وہ اپنے ملک میں ہر طرح کی خوشحالی دیکھنا چاہتے تھے۔ انگلستان میں قیام کے دوران سرسید نے دیکھا کہ وہاں کے امرا و سلاطین با اخلاق و سادہ مزاج اور بے غرور ہیں۔ ان کا یہ سلوک صرف ان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ عام ہے۔ سرسید کو اس پر رشک آیا اور کہا کہ کاش ہمارے ملک میں یہی فضا عام ہوتی۔ انگلستان کے ایک جلسے میں سرسید نے دیکھا کہ وہاں کے لوگوں میں کس قدر خلوص اور محبت ہے، وہ کتنی پیاری پیاری باتیں کرتے ہیں اور مرد و عورت پر تکلف پوشاک میں ملبوس ہیں۔ اس کا سرسید پر ردعمل یہ ہوا کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کے متعلق متفکر ہوگئے۔ لکھتے ہیں:

"یہاں کا حال دیکھ کر اپنے ملک اور
اپنی قوم کی حماقت اور بے جا تعصب
اور تنزل موجودہ اور ذلت آئندہ کے
خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا اور کوئی
تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی
نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جس کو وہ سمجھتے
ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہے اس میں
بھی وہی حماقت و نالائقی اور گمرہی ہے
جو اور تمام کاموں میں ہے۔ بس کوئی
کیا کرے۔ بد اقبالی اور بدنصیبی کا کچھ
علاج نہیں۔"

سائنٹیفک سوسائٹی

۱۸۶۳ء میں سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی کو اس لیے قایم کیا تھا تاکہ انگریزی اور دوسری زبانوں سے مفید کتب کو اردو میں مسلمانوں کے استفادے کے لیے منتقل کیا جاسکے اس کی مخالفت شروع ہوگئی ولایت جاتے ہوئے عدن سے محسن الملک کو

ما کر عقل کے دشمن ہر طرح سائنٹیفک سوسائٹی کو ختم
کرنے کے درپے ہیں اس لیے آپ اس پر خصوصی توجہ
دیں اور ممبروں کو بڑھانے میں کوشش کریں۔ انگلستان
ہی سے محسن الملک کو لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی فلاح
کے لیے ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے اور میرا کہیں
سے نام نہ آنے پائے کہ میرا ابھی اس سے کوئی واسطہ ہے۔

کتب خانہ انڈیا آفس

ولایت میں سرسید کو مختلف لائبریریوں میں جانے
اور علمی مراکز کے دیکھنے کے مواقع ملے۔ کتب خانہ انڈیا
آفس کے متعلق فرماتے ہیں:

"کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا ہوش
جاتے رہے۔ کتب خانہ نہیں کتابوں کا
شہر ہے۔"

آگے کتب خانہ آفس کے حوالے سے فرماتے ہیں

"کتب خانہ انڈیا آفس کی کوئی چھپی ہوئی
فہرست نہیں ہے۔ کتب خانہ ایشیاٹک
سوسائٹی میں عربی و فارسی کی نہایت
قلیل معدود کتابیں ہیں۔ کتب خانہ برٹش
میوزیم ایک نہایت بڑا جنگل کتابوں کا
کا ہے۔ کتب الماریاں صرف فہرست
کی ہیں۔ اس میں سے تفسیر یاقوت التاویل
کا حال دریافت کر کر آئندہ میل میں
لکھوں گا۔"

انگریزوں کا تعصب:

انگریزوں نے مسلمانوں کی ہر سطح سے مخالفت
کی۔ سرسید نے اس کا اپنی کتابوں میں مختلف جگہوں پر
نوٹس لیا ہے۔ خطوط میں بھی اس پر اظہار خیال کیا ہے
محسن الملک کو لکھتے ہیں کہ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں
اور حکومتوں کی تاریخ نہایت تعصب سے لکھی ہے۔ ان ہی

انگریزی کتب کو ہمارے بچے پڑھتے ہیں اور اسے واقعی
تصور کرتے ہیں۔ اس لیے تاریخ کے موضوع پر ایسی انگریزی
زبان میں کتب کا ہونا ضروری ہے جس میں انصاف سے
کام لیا گیا ہو۔

انگریزوں کی حقیقت پسندی

جان ڈیون پورٹ ایک حقیقت پسند انگریز
مصنف ہے۔ اس کی کتاب "اپالوجی فور محمد اینڈ قرآن"
کو سرسید نے اپنے پیسوں سے چھپوایا۔ پورٹ نے
یونانی اور رومی تاریخوں سے ثابت کیا ہے کہ کتب خانہ
مصر کے جلا دینے کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر الزام بے بنیاد
ہے۔ یہ کتب خانہ جولیس سیزر کے عہد میں جلایا گیا۔

جان ڈیون پورٹ نے مذکورہ بالا کتاب میں
انگریزوں کی طرف سے قرآن کریم اور آں حضور صلی اللہ
علیہ وسلم پر کیے گئے الزامات کے جوابات دیے کہ قرآن
اور آپ کی ذات ان الزامات سے پاک ہے۔

سرسید نے ایک خط میں مسٹر ہگنز کی کتاب کا نام
لیے بغیر محسن الملک کو لکھا کہ اس نے اپنی کتاب میں یاتی
من بعدی اسمہ احمد پر زبردست بحث کی ہے اور ایسی
دلیلیں دی ہیں کہ مولویوں کے ہوش اڑ جائیں۔

سرسید کو انگلستان میں مسٹر ہگنز کی ایک کتاب
اسلام کے موضوع پر دستیاب ہوئی۔ اس کتاب میں
انھوں نے اسلام کا نہایت سچا خاکہ پیش کیا تھا۔ اس
کتاب کے سلسلے میں سرسید کا خیال ہے کہ پورٹ
کی کتاب اس کے سامنے ویسی ہی ہے جیسے آفتاب کے
سامنے ستارہ۔ ہندوستان آکر سرسید نے اسے
اردو میں ترجمہ کروا کے شائع کروایا۔ "حمایت اسلام"
کے نام سے مولوی محمد احسن نے اس کو اردو میں منتقل
کیا۔

حجر اسود: حجر اسود سے متعلق جو احادیث ہیں کہ یہ

بہشت کا یاقوت اور قیامت میں اس کی دو آنکھیں ہوں
گی وغیرہ۔ سرسید نے ان احادیث کو ضعیف قرار دیا۔ نیز
اس سلسلے میں محسن الملک کی رائے جاننا چاہی۔ سرسید
نے اسے ابوقبیس پہاڑ کا پتھر بتایا۔ ان کا خیال ہے کہ قدیم
زمانے میں یہودی رسم کے مطابق اسے نصب کیا گیا۔ یہ
بھی ممکن ہے کہ اسے حضرت ابراہیمؑ نے نصب کیا ہو۔[1]
بوسہ دینے اور اس کی طرف رخ کر کے بوسہ دینے پر
جو اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس کا سرسید نے نہایت عالمانہ
جواب تحریر کیا ہے۔[2]

تہذیب الاخلاق کا خاکہ

رسالہ تہذیب الاخلاق کا خاکہ سرسید نے لندن
ہی میں بنا لیا تھا اور اپنے خاکے کے مطابق محسن الملک
کو لکھا ہے کہ مسلمانوں کو دینی اور دنیوی بھلائی پر مضامین
اس میں شائع کیے جائیں گے۔ لکھنے والے ہم دونوں ہوں
گے۔ ضرورت پڑنے پر منشی ذکاء اللہ کی بھی خدمت حاصل
کی جائیں گی۔ فارسی میں اس رسالے کا نام تہذیب الاخلاق
ہوگا۔ انگریزی میں اس کا نام "محمڈن سوشل ریفارمر" ہوگا
تہذیب الاخلاق کے سرنامہ کا ٹائپ سرسید لندن سے
بنوا کر لائے تھے۔ ایک سال کے لیے نہایت عمدہ کاغذ کا
انتظام بھی انھوں نے اس رسالے کے لیے لندن ہی سے کر لیا
تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو منظر عام پر
آیا۔ اس کے ایڈیٹر اور مینیجر سرسید رہے۔ اس کی آخر
جلدوں کی پیشانی پر یہ لکھا ہوا ہوتا:

> "حب القوم من الایمان فمن یسعی
> فی اعزاز قومہ انما یسعی فی اعزاز
> دینہ"

> [قوم سے محبت ایمان کی علامت ہے۔ جو
> شخص اپنی قوم کی برتری کے لیے کوشش کرتا
> ہے گویا وہ اپنے دین کے استحکام کے
> لیے کوشاں ہے]

خطبات احمدیہ

"خطبات احمدیہ" سرسید کی تصانیف میں ایک
نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب سرسید نے سر ولیم
میور کی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں لکھی تھی۔ یہ
کتاب چار جلدوں میں ہے۔ اس میں میور نے آنحضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لرزہ خیز گستاخیاں کی
ہیں۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد ان کے دل پر کیا گزری
محسن الملک کو لکھتے ہیں:

> "ان دنوں میں ذرا قدرے دل کو
> سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو
> کتاب آں حضور کے حال میں لکھی ہے اس
> کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو
> جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات
> دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔"

سرسید نے پہلے اسے تفصیل سے نہ پڑھنے اور مالی
منفعت کے پیش نظر اس کے کچھ الزامات کا جواب چھوٹے
چھوٹے رسالوں کی صورت میں دینے کے لیے سوچا تھا
لیکن جب اس کی بے بنیاد بدتمیزیوں کو تفصیل سے پڑھا
تو اس کا جواب تفصیل سے لکھنے کو ٹھانی اور کہا کہ انشاء اللہ
میں اس کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچاؤں گا خواہ مجھے بھیک
ہی کیوں نہ مانگنا پڑے۔[3] سرسید انگلستان میں بیٹھ کر
شب و روز اس کا جواب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک
جگہ لکھتے ہیں کہ

> "لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگی ہے"

اسی خط میں اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں
کہ:

> "مسلمان البتہ آستینیں چڑھا کر اس
> باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے کہ انگریزوں

کے ساتھ کھانا مت کھاو مگر جب کہو کہ
مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان
بچادیں گے"[۳۰]

محسن الملک کے دیگر خطوط میں بھی سرسید نے خطبات کی اہمیت اور اس کے مضامین پر روشنی ڈالی ہے لیکن اسے یہاں نظرانداز کیا جارہا ہے۔

قرآنیات

سرسیّد نے ایک خط میں محسن الملک کو لکھا کہ:

"قصۂ عاد و ثمود کو میں نے اپنی کتاب میں
اختصار سے بیان کیا ہے۔ مخالفین ان
قصوں سے انکار کرتے ہیں اور قصۂ باغ
ارم پر ہنستے ہیں"

آگے فرماتے ہیں کہ

"میں نے لکھا ہے کہ باغ ارم۔ عمارات
ذات عماد غلط محض ہے اور
ارم ذات العماد اللتی لم یخلق مثلہا فی البلاد
سے ایک محل یا چوکھٹہ یا ہزار کھنبہ سمجھنا غلط
ہے۔ یہ صرف ایک قوم کا ذکر ہے جو اولاد
ارم سے تھی اور جو کہ وہ دراز قد تھی جیسا کہ
بعض قوم کے آدمی دراز قد ہوتے ہیں۔ صرف
ان کو تشبیہاً ذات العماد کہا گیا ہے۔ جیسا
کہ ایک جگہ تشبیہاً فرمایا ہے
"کانھم اعجاز نخل خاویہ"

سرسیّد نے اور بھی جگہوں پر قرآنیات سے بحث کی ہے اور بہت سے خطوط میں مثلاً معجزات وغیرہ کے سلسلے میں محسن الملک سے کچھ چیزیں دریافت کیں ہیں۔ معراج اور شق صدر کے متعلق بھی کچھ وضاحت محسن الملک سے چاہی ہے۔[۳۲]

تفسیر القرآن: سرسید کی تصانیف میں "تفسیر القرآن" کو بڑی تنقیدی نظر سے دیکھا گیا ہے تفسیر کی وجہ سے ان پر اعتراضات کی بوچھار ہوگئی کیوں کہ انھوں نے معجزات اور بہت سی آیات کی اس انداز سے تفسیر بیان کی کہ علمائے کرام کے حلقوں میں ایک اضطراب پیدا ہوگیا اور کیوں نہ ہوتا کیوں کہ ان کے خیالات اجماع امت کے برعکس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دست راست محسن الملک نے بھی ان کے تفسیری خیالات سے اتفاق نہ کیا اور ان کی تفسیر کے متعلق فرمایا:

تفسیر القول بما لا یرضی بہ قائلہ
[کسی قول کی ایسی تفسیر کرنا جو اس کے قائل
کا مقصد نہ ہو]

اور لکھا کہ:

"میں آپ کی تفسیر کے بعض مضامین کا
مخالف ہوں اور مخالف بھی ایسا کہ اس
مخالفت کو نہ آپ کی وہ عظمت و وقعت جو
میرے دل میں ہے روک سکی۔ نہ وہ
محبت و ارادت جو مجھے آپ سے ہے اس
کی مانع ہوئی نہ آپ کی جادو بھری تحریر نے
اثر کیا نہ آپ کی پرزور تقریر نے"[۳۱]

محسن الملک اور سرسید کے مابین "تفسیر القران" کے سلسلے میں جو خط و کتابت ہوئی وہ آٹھ خطوط پر منحصر ہے۔ محمد عثمان مقبول نے ان خطوط کو کتابی صورت میں جمع کر دیا ہے۔ ان خطوط کو پڑھنے سے جہاں ایک طرف سرسیّد کی علمیت کا پتہ چلتا ہے، وہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ محسن الملک کی قرآن و حدیث اور علم کلام پر گہری نظر تھی۔ ان خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ محسن الملک خود کو سرسید کا شاگرد تصور کرتے ہیں۔ وہ سخت سے سخت انداز اختیار کرتے ہیں لیکن احترام کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان خطوط کے متعلق مرتب

"مکاتبات الخلان" نے بجا طور پر کہا ہے کہ
"سرسید کے عقاید متن اور نواب صاحب
کے مخلوط ہو متن کو تفسیر" ۲۱
محسن الملک نے سرسید کی تفسیر پڑھنے کے بعد جب انھیں لکھا کہ قرآن کی تفسیر کے لیے سیاق کلام و الفاظ قرآنی اور کلام عرب سے مدد لینا ضروری ہے اور آپ کی تفسیر ان سے خالی ہے ۲۲ محسن الملک کے اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے سرسید نے لکھا کہ:

قرآن کریم کی کوئی بات عقل سے ماورا نہیں ہے. اب تمہارے دل میں بہت سے شبہات ہوں گے اور تم خیال کروگے کہ مذہب اسلام اور قرآن مجید میں تو بہت باتیں مافوق عقل ہیں مگر یہ تمہاری سمجھ کا قصور ہے۔ قرآن مجید اس نقصان سے پاک ہے۔"

سرسید نے اپنے اسی خط میں محسن الملک کو لکھا کہ اب

"آپ میری تفسیر کو اس لیے مالا یرضیٰ بہ قائلہ قرار دیتے ہیں کہ آپ دو چیزوں میں اس طرح گھر گئے ہیں کہ اس سے نکلنا مشکل ہے. اول بچپن کی تربیت، بچپن سے باتوں کو سنتے سنتے ان کا نقش کالحجر دل میں ہو جاتا ہے اور دوسرے علما کے اقوال اور تفاسیر کے رطب و یابس روایتیں اور قصے۔" ۲۳

سرسید کے اس خط کے جواب میں محسن الملک لکھتے ہیں کہ:

"بہت سے بچپن کے خیالات و اعتقادات جن کو میں صحیح سمجھتا تھا لیکن اب انھیں غلط سمجھتا ہوں اور بہت سی آرا جن کو غلط سمجھتا تھا آج صحیح سمجھتا ہوں۔ دوسرے رہی علما کے اقوال کی بات تو میں سوائے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کو خطا اور غلطی سے محفوظ نہیں سمجھتا ہوں خواہ صحابی اور امام ہی کیوں نہ ہو۔" ۲۴

سرسید نے محسن الملک کے اس خط کا جواب دیتے ہوئے اپنے خیالات ان کے روبرو پیش کیے جو اس طرح ہیں۔

۱- خدا خالق کائنات ہے
۲- انبیا، ہدایت بنی نوع آدم کے لیے مبعوث کیے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم برحق و خاتم المرسلین ہیں۔
۳- قرآن بلفظہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل ہوا یا وحی کیا گیا۔
۴- قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔
۵- قران مجید بالکل سچ ہے کوئی بات اس میں غلط یا خلاف واقع مندرج نہیں ہے۔
۶- صفات ثبوتی اور سلبی ذات باری کے جس قدر قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں سب سچ اور درست ہیں۔
۷- صفات باری عین ذات ہیں اور وہ مثل ذات کے ازلی و ابدی ہیں اور مقتضائے ذات ظہور صفات ہے۔
۸- تمام صفات باری کی نامحدود اور مطلق عن القیود ہیں۔
۹- قرآن مجید میں کوئی امر ایسا نہیں ہے جو قانون فطرت کے برخلاف ہو۔
۱۰- قرآن مجید جس قدر نازل ہوا ہے تمام موجود ہے۔ نہ اس میں ایک حرف کم ہوا ہے نہ زیادہ ہوا ہے۔
۱۱- ہر ایک سورہ کی آیات کی ترتیب میرے نزدیک منصوص ہے۔

۱۲- قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے۔ یعنی اس کی کوئی آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہے۔

۱۳- قرآن مجید دفعتاً واحدہ نازل نہیں ہوا ہے بلکہ نجماً نجماً نازل ہوا ہے۔

۱۴- موجودات عالم اور مصنوعات کائنات کی نسبت جو کچھ خدا نے قرآن میں کیا ہے وہ سب ہو بہو یا بحیثیۃ من الحیثیات مطابق واقع ہے۔

۱۵- باوجود اس بات کے تسلیم کرنے کے کہ قرآن مجید بلفظہ کلام خدا ہے مگر جب کہ وہ عربی میں اور انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے تو اس کے معنیٰ اس طرح لگائے جائیں گے جیسے ایک نہایت فصیح عربی زبان میں کلام کرنے والے کے لگائے جاتے ہیں[۳۵]

سرسیّد کے ان خیالات کو یہاں نہایت اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے ان خیالات کی وضاحت قرآن کی روشنی میں کی ہے۔ ان کے ان خیالات سے اختلاف کی بہت گنجایش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ... علماء میں ان کی تفسیر کے خلاف زبردست ردّ عمل ہوا۔ سرسیّد کے ان خیالات سے محسن الملک نے بھی اختلاف کیا۔

سرسید نے سورہ فاتحہ میں دعا پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دعا عبادت کا نام ہے۔ دعا سے مطلب کا حاصل ہونا اور استجابت سمجھنا غلط ہے۔ بلکہ عبادت کا جو نتیجہ ہے وہ موعود ہے۔ دعا کے ساتھ کبھی مطلب کا حاصل ہو جانا اتفاقیہ بات ہے جو اس کے اسباب جمع ہونے سے حاصل ہو جاتا ہے[۳۶] سرسیّد نے اپنے اس مفہوم کو رسالہ "الدعاء والاستجابۃ" میں بھی بیان کیا ہے[۳۷]

دعا اور اس کی قبولیت کے سلسلے میں سرسید کے خیالات کو محسن الملک نے بڑی تفصیل سے قرآن کریم اور حدیث کی روشنی میں تردید کی اور اس سلسلے میں انھوں پانچ خطوط لکھے۔ ایک جگہ محسن الملک رقم طراز ہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دعا مذہبی زندگی کی جان ہے اور اہلِ مذہب کے نزدیک مذہب کے عملی زندگی کا فیصلہ بہت کچھ اس پر منحصر ہے اور دعا سے مسئول عنہ کا حاصل ہونا اور انبیائے کرام علیہم السلام کا خاص خاص مطلب کے لیے دعا مانگنا اور اس کا قبول ہونا کتب سماوی سے ایسا ثابت ہے کہ نہ اس سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی تاویل کی جا سکتی ہے۔

"مکاتبات الخلان" میں دونوں صاحبان کے مابین سخت سے سخت باتیں اپنے اپنے نظریے کی تائید میں ہوئیں لیکن دونوں حضرات کی باہمی دوستی پر کوئی حرف نہیں آیا کیوں کہ وسیع الذہن اور عالی ظرف تھے۔ ان کے یہاں تنگ نظری کا گزر نہیں تھا محسن الملک ہزاروں اختلاف کے باوجود انھیں مسلمانوں کا ہمدرد، اسلام کا سچا داعی اور قائد ملت تصور کرتے رہے۔ محسن الملک کے ایک دوست نے جب ان سے سوال کیا کہ:

"آپ سیّد صاحب کو مجتہد سمجھتے ہیں اور کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود ان کو مخرب دین سمجھتے ہیں اور ان کی تفسیر کو تفسیر بالرائے خیال کرتے ہیں۔ اس لیے برائے مہربانی ذرا صاف صاف فرما دیجیے کہ آپ کا اصلی خیال سیّد صاحب کی نسبت کیا ہے"[۳۹]

محسن الملک نے اس موضوع پر تین خطوط لکھے جس میں سرسید کی پوری شخصیت سمٹ کر آ گئی ہے۔ دوست کے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میں ان کو (سرسید کو) نہایت عالی دماغ، عالی خیال، پاک دل اور روشن ضمیر

مسلمان سمجھتا ہوں۔ وہ خدا کے دل سے معتقد
رسول کے دل سے عاشق، اسلام پر دل
سے شیدا اور مسلمانوں کے دل سے خیر خواہ
ہیں۔ اسلام کو وہ سچا مذہب سمجھتے ہیں نہ
صرف سچا بلکہ اسی کو تمام دنیا کی ہدایت
کا وسیلہ اور ہر قسم کی دماغی و اخلاقی و
دینی اور دنیاوی ترقی کا ذریعہ جانتے ہیں۔"

ان کی تفسیر پر اعتراضات کا انبار ہے لیکن محسن الملک نے کس قدر مناسب تبصرہ کیا ہے۔ اپنے دوست کو جواب میں لکھتے ہیں:

" ان کی تفسیر کو اٹھا کر دیکھیے بعض جگہ ان کے
خیالات ایسے روشن اور پاک نظر آتے ہیں
کہ گویا ایک صاف دریا ہے کہ بہتا چلا
جا رہا ہے اور خدا کی زمین یعنی مسلمانوں کے
دلوں کو شاداب کر رہا ہے اور بعض مقامات
پر وہ آیات قرآنی کی ایسی تفسیر کرتے ہیں کہ
قرآن ایک کلام مہمل اور لوچ معلوم ہوتا
ہے اور اس کا مقصود اور مطلب فوت
ہو جاتا ہے۔ کہیں ان کے دلایل ایسے مستحکم
اور مضبوط ہیں جو ہندسی دلیلوں کے موافق
دل پر اثر کرتے ہیں"

آگے لکھتے ہیں کہ:

" سرسید کے تمام خیالات مختلف مسلم فرقوں
میں سے کسی نہ کسی کے یہاں ضرور ملتے
ہیں۔ اس پر ان پر کفر کا فتویٰ عاید کرنا
عبث ہے"

لیکن سرسید کو معصوم عن الخطا قرار دینا بھی عبث ترین ہے۔ سرسید پر علمی بحث کرنے سے ان کا مرتبہ اور بلند ہوتا ہے۔ وہ خود مسلمانوں کو تقلید محض سے نکالنے کے لیے زندگی بھر جد و جہد کرتے رہے۔ اسی لیے انھوں نے محسن الملک کے بے شمار علمی اختلافات کے باوجود انھیں سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا۔

محسن الملک لکھتے ہیں کہ

" اگر وہ شخص جس کو میں جانتا ہوں کہ اس
نے اپنی ساری زندگی اسلام کی تائید میں
گزاری اور جس کی نسبت میرا یقین ہے کہ
اس کا ایمان ہزاروں کے ایمان سے سیکڑوں
درجہ بڑھ کر ہے اور جس پر میرا دل شہادت
دیتا ہے کہ خدا اور رسول پر اسے ایسا اعتقاد
ہے کہ اس کا ہر بن مو لو کشف الغطام
یقیناً پکارتا ہے اور جسے سوتے جاگتے اٹھتے
بیٹھتے، مذہب کی ہی تائید اور مسلمانوں
ہی کی ترقی کا خیال رہتا ہے۔ اگر وہی کافر
اور اسلام سے خارج ہو تو میں نہیں سمجھتا
کہ پھر دنیا میں کون مسلمان ہوگا اور اسلام
کی تصویر کہاں نظر آوے گی"

سرسید کی تحریک اور خیالات کی مختلف حیثیتوں سے مخالفت کی گئی لیکن ان کی پرواہ کیے بغیر اپنی دھن میں لگے رہے۔ رسالہ شحنۂ طور کانپور نے جب آپ کو تنقید کا نشانہ بنایا تو محسن الملک اس پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" آج تک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہیں
ہوا جس کے مقابل کوئی نہ کوئی دشمن مخالف
نہ کھڑا ہوا ہو۔ آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ
عیسیٰؑ محمد صلی اللہ علیہ وسلم و خلفائے اربعہ
محی الدین جیلانیؒ، مجدد الف ثانیؒ، محمد
اسماعیل دہلویؒ اور علیٰ ہذا القیاس۔ بس
میں تو ان کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں ہیٹا

میری مخالفت پر کمر باندھنی کچھ بُری بات نہیں
ہے۔“
سیّد نے لوگوں کی تنقیدوں اور طعنوں کو کبھی قابل نہ سمجھا بلکہ اسے بخوشی سنتے رہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

”میرے تئیں جس قدر طعنے دوگے میری
جان خوش ہوگی۔“ [۵]

سرسید نے جس بات کو صحیح سمجھا اسے برملا اعلان وہ دنیا کی ملامت اور طعنہ زنی سے قطعاً ہراساں نہ۔ کیوں کہ انھیں خدا پر کامل یقین تھا۔ لکھتے ہیں:

”ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس
کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں
کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے
ہیں وہ دیکھتا ہے، جو بات کہتے ہیں وہ
سن لیتا ہے، جو دل میں لاتے ہیں
جان لیتا ہے۔ ایسا پیچھا ہے کہ نہ
جہاز میں چھوڑے نہ زمین پر چھوڑے
نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو الگ ہو۔“ [۱۱]

سرسید کے خطوط بنام محسن الملک کی روشنی میں اوپر ہم نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انھیں ملّت اور وطن کا غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ اسلام کی سربلندی کے لیے کس قدر متفکر تھے جس کی ایک مثال خطبات احمدیہ کی ترتیب ہے تہذیب الاخلاق کا اجرا اور سائنٹفک سوسائٹی کا قیام بھی قوم کی ترقی کے لیے عمل میں آیا۔ ان خطوط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے تفسیر کن مقاصد کے پیش نظر لکھی۔ محسن الملک کو القرآن کی تفسیر کے متعلق کہا کرتے کہ سرسیّد نے خود اپنی تفسیر کے متعلق فرمایا کہ

”میں نے یہ تفسیر عیسائیوں اور غیر مسلموں
کے لیے لکھی ہے نہ کہ مسلمانوں کے لیے“
اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس تفسیر کو پبلک
میں شائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔“

ان خطوط سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ کس قدر صابر، ثابت قدم اور مستقل مزاج تھے۔ وہ دھن کے اتنے پکے تھے کہ لوگوں کی تنقیدوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور آخری دم تک اپنی منزل کی طرف معروفِ سفر رہے۔

...~.~.~.~...

حوالے

دیکھیے مکاتبات الخلان پر محمد عثمان مقبول کا مقدمہ۔ مطبع احمدی علی گڑھ۔ (بدون تاریخ) ص ۵-۶
وضاحت کے لیے دیکھیے، حیات محسن۔ محمد امین زبیری۔ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۴ء ص ۲۴۶
مکتوباتِ سرسیّد۔ مرتبہ اسماعیل پانی پتی۔ کریم احمد خاں معتمد مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء ص ۴۳

ایضاً	ص ۶۳	۵ ایضاً	ص ۸۶
ایضاً	ص ۱۰۵، ص ۱۰۳	۷ ایضاً	ص ۴۴
ایضاً	ص ۶۷	۹ ایضاً	ص ۴۰
ایضاً	ص ۹۹	۱۱ ایضاً	ص ۴۴

۱۱ مکتوبات سرسید۔ مرتبہ اسماعیل پانی پتی۔ کریم احمد خاں۔ معتمد مجلس ترقی ادب لاہور ص ۵۹

۱۲ ایضاً ص ۵۴ ۱۳ حیات جاوید

۱۴ حیات جاوید۔ الطاف حسین حالی۔ اکادمی پنجاب۔ لاہور۔ ۱۹۵۴ء ص ۵۴۷

۱۵ مکتوبات سرسید ص ۵۷ ۱۶ ایضاً ص ۶۹

۱۷ ایضاً ص ۹۲ ۱۸ ایضاً ص ۷۹

۱۹ حیاتِ جاوید ص ۵۴۷ ۲۰ ایضاً ص ۸۸

۲۱ ایضاً ص ۱۱۴ ۲۲ ایضاً ص ۲۱۸

۲۳ مکتوباتِ سرسید ص ۶۲ ۲۴ ایضاً ص ۹۵

۲۵ ایضاً ص ۶۲ ۲۶ ایضاً ص ۶۷

۲۷ ایضاً ص ۹۱ ۲۸ ایضاً ص ۴۵-۴۶

۲۹ مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر (علوم القرآن) مرتبہ محمد عثمان مقبول۔ مطبع احمدی علی گڑھ (ت ا) ص ۱۰

۳۰ مقدمہ مکاتبات الخلان ص ۵ ۳۱ ایضاً ص ۲

۳۲ ایضاً ص ۷ ۳۳ ایضاً ص ۳

۳۴ ایضاً ص ۹-۱۱ ۳۵ ایضاً۔ وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو۔ ص ۲۰ — ۶۲

۳۶ ایضاً۔ وضاحت کے لیے دیکھیے: تفسیر القرآن۔ سرسید احمد خاں۔ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ علی گڑھ۔ ۱۳۱۰ھ ص ۱۰-۱۱

۳۷ دیکھیے: الدعاء والاستجابہ۔ السید احمد۔ مطبع مفید عام۔ آگرہ ۱۸۹۲ء ص ۱۱

۳۸ وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو مکاتبات الخلان ص ۷۵-۱۴۸

۳۹ ایضاً ص ۱۴۹

۴۰ ایضاً ص ۱۵۱-۱۵۲

۴۱ ایضاً ص ۱۵۶

۴۲ ایضاً ص ۱۵۷

۴۳ ایضاً ص ۱۶۱

۴۴ مکتوباتِ سرسید ص ۱۰۲

۴۵ ایضاً ص ۱۰۸

۴۶ ایضاً ص ۵۸

۴۷ ایضاً ص ۵

"سول ڈویژن مانک پور گنج ضلع ڈھاکہ میں ایک مسجد بنانے کی ضرورت ہے اور اس مسجد کی تعمیر کے لیے روپیہ جمع کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں نے شامل ہو کر کمیٹی بنائی اور ہندو مسلمان مل کر اس کی تعمیر کے لیے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان زیادہ غریب اور زیادہ ذلیل ہیں۔ اس لیے ہندو اس مسجد کی تعمیر کے لیے زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس محبت اور ہمدردی اور باہمی بھیّا چارہ پر جو ہندوؤں نے ظاہر کی ہے دونوں قوموں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں جس طرح کہ اختلاف مذہب جیسا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہے، سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہو سکتا۔"

——— سر سید احمد خانؒ

"کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا! آہ وقت گزر گیا! آہ وقت گزر گیا! اب پچھتائے کیا ہوتا ہے؟ — افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے۔"

——— سر سید احمد خانؒ

"اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گزرتا جاتا ہے تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے کہ افسوس ہم نے یہ نہ کیا اور وہ نہ کیا؛ اور اس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے کیوں کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا اور لاعلاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں۔"

——— سر سید احمد خانؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۹۳ء)

سرسیّد کا سوزِ دروں

محمد اسلم صدیقی *

انگریزوں کے ہندوستان میں تسلط اور اقتدار کے نتیجے میں سب سے زیادہ تباہی و بربادی مسلمانوں کے حصے میں آئی اور ان کی زندگی کے تمام شعبے اور ادارے، اس تباہی کا شکار ہوئے۔ تعلیمی، معاشی و اقتصادی، معاشرتی اور ملازمتوں ان سب میدانوں سے ان کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بے دخل کر دیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کا دین بھی خطرے میں تھا کیوں کہ ملک کے گوشے گوشے میں عیسائی مبلغین کا جال بچھا ہوا تھا اور حکومت ان کی سرپرستی کرتی تھی۔

سقوطِ بغداد کے بعد اس قدر پریشان کن صورتِ حال پیش نہیں آئی تھی بلکہ صورت حال اس سے زیادہ تشویش ناک اور پُرخطر تھی۔ منگولوں نے تباہی و بربادی تو مچادی تھی لیکن ان کے پاس کوئی نئی تہذیب و کلچر نہیں تھا۔ علوم و فنون کا تو ذکر ہی کیا، خود اُن کا دامن جملہ اقدارِ حیات سے خالی تھا۔ سوائے بربریت و وحشت اور ظلم و تعدی کے مگر اب صورتِ حال کی نوعیت، اس کے امکانات اور اثرات مختلف تھے۔ انگریزی اقتدار کے پہلو بہ پہلو نئے علوم و افکار، نئے زاویۂ فکر اور سائنسی انکشافات دروازے پر دستک دے رہے تھے۔

جو حالات درپیش تھے ان واقعات کی مستند اور معتبر روئیداد، سرسید کی مشہور کتاب 'اسباب بغاوت ہند" اور مشہور فاضل ولیم ہنٹر کی "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس مختصر مضمون میں چند باتیں بطور واقعہ و مثال پیش کی جاتی ہیں۔ اس سے مسئلہ کی اہمیت اور سنگینی کا پورا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عیسائیت کا فروغ اور عیسائی بنانے کی مہم

سرسید جیسے مخلص اور معتبر بزرگ ارشاد فرماتے ہیں:

"سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبان کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری صاحبان تنخواہ پاتے ہیں۔ گورنمنٹ اور حکام انگریزی ہر طرح ان کے مددگار و معاون ہیں۔ اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی

* غازی پور لاج۔ سرسید نگر۔ علی گڑھ

میں پادری صاحبان کا وعظ سنو اور ایسا ہی
ہوتا تھا۔ غرض یہ کہ اس بات نے ایسی تسلی
پکڑی تھی کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی
عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب
قایم رہے گا۔" (اسباب بغاوت ہند)

پادری صاحبان کی اور بہت سی بے جا کارروائیوں اور زیادتیوں کا ذکر بھی سرسید نے کیا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کو کھلے عام برا کہتے ہیں اور زبردستی لوگوں کو ان کا وعظ سننے پر مجبور کرتے تھے۔ مشنری اسکولوں میں جو غیر عیسائی بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں وہاں جو بچے عیسائی مذہب کے مطابق جواب دیتے تھے ان کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمبر دیے جاتے تھے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور عیسائیت کو اچھا سمجھیں اور اس کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ سرسید اس صورت حال سے اس درجہ متاثر اور کبیدہ خاطر تھے کہ انھوں نے ایک لکچر میں یہ فرمایا کہ:

"مسلمانوں کو شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم
گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں۔
ان کو جوش نہیں پیدا ہوتا ان کو غیرت
نہیں آتی۔" (لکچروں کا مجموعہ)

اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ کا دارالسلطنت کلکتہ سے ایک خط شایع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ

"اب تمام ہندوستان میں ایک حکومت
ہو گئی ہے۔ لہٰذا مذہب بھی سب کا ایک
ہونا چاہیے۔ اس لیے اپیل کی گئی ہے
کہ سب لوگ عیسائی ہو جائیں۔"

اس خط کے متعلق سرسید فرماتے ہیں کہ

"میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے
آنے سے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی
سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس کے منتظر تھے وہ وقت
اب آگیا اب جتنے سرکاری ملازم ہیں ان کو کرسٹان ہونا پڑے
گا اور پھر تمام رعیت کو۔ سب لوگ بیشک سمجھتے ہیں کہ یہ
چٹھیاں حکومت کے حکم سے آئی ہیں۔" (اسباب بغاوت ہند)

ان تمام کوششوں کی براہ راست زد مسلمانوں پر پڑ رہی تھی۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"مسلمانوں کو ان تمام باتوں کا بہت دکھ
تھا۔ کیوں کہ ہندو اپنے مذہب میں ملامت
پر زیادہ برا نہیں مانتے تھے بمقابلہ مسلمانوں
کے کہ اپنے عقاید اور احکام الٰہی کو ماننے
میں ہی اپنی نجات سمجھتے ہیں۔" (ایضاً)

یہ تاثرات جو حقیقت واقعی پر مبنی تھے اور جس پر آہ و زاری کی گئی تھی وہ مسجد یا مکتب کے کسی کوتاہ اندیش اور دقیانوسی ملا کے نہیں تھے جس کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ یہ سرسید جیسے ہوش مند و مدبر اور دوراندیش کا تاثر اور فرمایا ہوا ہے۔ اس سے مسئلہ کی شدت اور سنگینی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور اس اندیشے اور خوف کا جواز فراہم کرتا ہے جو انگریزوں اور ان کی تعلیم گاہوں کو عیسائیت کے فروغ اور اپنے مذہب سے برگشتہ کرنے سے متعلق اس زمانے کے علمائے کرام نے ظاہر کیے تھے۔ جس پر انھیں ہدف ملامت اور طرح طرح کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

افلاس و غربت

مذہب جو مسلمانوں کو گئی گزری حالت میں بھی ہمیشہ بہت عزیز رہا ہے اس کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ کس طرح اس کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ مذہب کے ساتھ مالی اور اقتصادی طور پر بھی ان کو خصوصاً اور

کے لیے نئے نئے ہتھکنڈے اختیار کیے گئے۔ ڈھاکے کی مشہور عالم ململ کے دست کاروں کے ہاتھ قلم کیے گئے' ان کی اور دوسری مصنوعات کو بھی برباد کیا گیا تاکہ انگلینڈ کے کارخانوں کے تیار کردہ کپڑوں کی کھپت کے لیے اس ملک میں منڈی ہاتھ آئے۔ زراعت اور زمین داری کے نئے نئے قوانین بنائے گئے' یہ مسلمانوں پر نوکریوں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ملازمتوں سے بے دخلی کے متعلق سر ولیم ہنٹر اپنی مشہور کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں برملا اعتراف کرتے ہیں کہ جب یہ ملک انگریزوں کے زیر تحت آیا تو مسلمان عموماً علم سیاست اور حکمت عملی اور عہدہ و وقار اور حیثیت میں ایک اعلیٰ درجہ و مقام رکھتے تھے۔ لیکن اب ان پر ہر قسم کی ملازمتیں بند تھیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھے۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی میں ہی برتر نہ تھے بلکہ سیاست اور حکمت عملی میں بھی سب سے زیادہ افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے۔ غیر سرکاری ذرایع میں بھی ان کو کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں ہے۔"

(الکتاب مذکور۔ ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین ص ۲۴۹)

یہ معاملہ یہیں تک بس نہیں کرتا تھا بلکہ دلی نفرت و بغض اور دشمنی جو انگریزوں کو مسلمانوں سے ابتدا ہی سے تھی اس نے نوبت یہاں تک پہنچا دی تھی کہ:

"اگر کچھ اسامیاں خالی ہوتی تھیں تو اشتہار میں یہ وضاحت کر دی جاتی تھی کہ ہندوؤں کے علاوہ یہ کسی کو نہ دی جائیں۔ یعنی جہاں [illegible]

اہلیت یا نا اہلیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔" (کتاب مذکور)

یعنی اشتہاروں میں یہ صاف صاف لکھا جاتا تھا کہ اس کے لیے مسلمان درخواست گزار بھی نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کو ہر طرح تباہ و برباد کرنے کی پالیسی انگریزوں نے ۱۸۵۷ء سے قبل ہی اپنالی تھی تاکہ ان کو پوری طرح دبا دیا جائے۔ حالانکہ مسلمان انگریزوں کے ابتدائی دور میں حکومت کے تمام محکموں میں اپنی استعداد و صلاحیت اور قابلیت و تجربے کی بنیاد پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ محکمے ان کی دولت اور آمدنی کے سب سے بڑے ذرایع تھے۔ چونکہ شروع ہی سے انگریزوں کا مقابلہ ہر سطح پر مسلمانوں سے ہوا تھا۔ فوجی نقطۂ نظر سے پلاسی، بکسر اور میسور اور بالآخر دہلی ہر جگہ ان کی مزاحمت اور مقابلہ مسلمانوں سے ہوا تھا۔ اس لیے ہدف اور نشانہ بھی نفرت و انتقام کی صورت میں مسلمان ہی بنائے گئے۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے جس کے معترف منصف مزاج انگریز بھی ہیں۔ افلاس کا شکار بنائے جانے کے سلسلے میں سر سید رقم طراز ہیں:

"اکثر اضلاع میں ہر ایک بندوبست سخت ہوگیا۔ زمین داروں کاشت کاروں کو نقصان عاید ہوئے۔ رفتہ رفتہ وہ بے سامان ہوگئے۔ زراعت کا سامان بہت کم ہوگیا۔ ادائے مال گزاری کے لیے وہ قرض دار ہوئے۔ سود قرضہ زیادہ ہونے لگا۔ بہت سے زمین دار جو بہت اچھا سامان اور معقول خرچ رکھتے تھے، مفلس ہوگئے۔" (اسباب بغاوت ہند)

حکومت کے جبر و غضب کے آگے سب دم بخود اور حیران و برگشتہ تھے مگر کوئی زبان نہیں ہلا سکتا تھا۔ بقول سر سید:

"اس کا رفع کرنے والا، اس کی خبر کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس قسم کے امور میں کوئی غم خوار رعایا نہ تھا۔ بجز ان کے لہو کے، جو مل مل کر ان کے بدن میں رہتا تھا اور بجز ان کی بے کسی کے جس پر وہ آپ رو رو کر چپ ہو رہے تھے۔" (ایضاً)

کیسا جبر و غضب اور گھٹن تھی۔ سر سیّد کے الفاظ خود بول رہے ہیں جو اس داستان جور و ستم کا کھلا ثبوت ہیں حالانکہ یہ مشہور بات ہے کہ سر سیّد نے یہ کتاب "اسباب بغاوت ہند" جس میں یہ باتیں بیان کی گئی ہیں، انگریز حکمرانوں کی خیر خواہی اور بہبود کے جذبے کے تحت لکھی تھی اور احباب کے مشورے کے خلاف اس کو چھاپا تھا۔ اس سے ان کو اندیشہ جان کا بھی تھا لیکن سر سیّد نے حق گوئی کے سامنے جان کی پروا نہ کی اور کتاب چھاپی اس اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب کا جو مقصد تھا وہ بے اثر نہ رہا۔ اس سے قدرے بہتری پیدا ہوئی مگر محض اشک شوئی کی حد تک۔ غرضیکہ عوام میں مفلسی دن بہ دن بڑھتی رہی خاص طور پر مسلمان اس سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ کیونکہ مسلمان زیادہ تر نوکری پیشہ تھے ان کے مقابلے میں ہندو زیادہ تر زراعت پیشہ و تاجر اور ساہوکار تھے اور یہ ان کی ضروریات کو پورا کرنے کا بہت بڑا وسیلہ تھا لیکن مسلمانوں پر نوکریوں کے دروازے بند ہونے سے بہت برا اثر پڑا ورنہ مسلمانوں کی آسودہ حالی کی یہ کیفیت تھی کہ ان کی تعلیم کے لیے مدرسے اور مکاتب، صرف بنگال اور بہار کے علاقے کے قصبات اور دیہات میں ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ مدارس اور طلبا کی پوری کفالت قصبے کے خوش حال لوگ کرتے تھے لیکن ان درس گاہوں کو بھی مختلف تدابیر سے ختم کیا گیا۔ یہ خونچکاں داستان بہت طویل اور دردناک ہے جن کی تفاصیل سر ولیم ہنٹر کی معروف مذکور کتاب اور دوسرے اہلِ علم کی تصانیف میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

ہندوستانی ذلیل و خوار کیے جاتے تھے

انگریزوں کے دورِ اقتدار سے پہلے مسلمان اس ملک میں حکمراں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مسلمانوں نے یہاں کے باشندوں سے میل و محبت، رواداری، خوش اخلاقی، بھائی چارہ و مساوات، ان کے دکھ درد اور خوشی و مسرت میں شریک و غم خوار بن کر ان کے دلوں میں قدر و منزلت اور اعتماد و بھروسہ حاصل کر لیا تھا۔ ایک دوسرے کا احترام و ادب کا سلوک کرتے تھے حکومت اور رعایا کا فرق نہیں کرتے تھے اور دونوں خوش اور مطمئن تھے۔ عام باشندوں کا یہی حال تھا۔ اس کے برعکس انگریزوں کا رویہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ ان میں انانیت و کبر و غرور کا عفریت ہر وقت مسلط رہتا تھا۔ آپس میں میل و محبت، تعلق و ہمدردی اور غم گساری تو خیر بڑی دور کی بات ہے وہ ہندوستانیوں کو موقعہ بے موقعہ ذلیل و خوار کرتے رہتے تھے ان کو انگریزوں نے ادنیٰ مقام دیا۔ ان کی کوئی عزت و توقیر باقی نہ رہی۔ مفلسی اور بے عزتی یہ دونوں چیزیں ہی ہندوستانیوں کو انگریزوں سے ملیں۔ بقول سر سید:

"بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقر کر دیا ہے ہندوستان کے اشراف آدمی کی، ایک چھوٹے یورپین کے سامنے ایسی قدر نہیں جیسی کہ ایک چھوٹے یورپین کی ایک بڑے ڈیوک کے سامنے ہوتی ہے۔ بطل العموم کیا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جنٹل مین (شریف انسان) نہیں۔" (اسباب بغاوت ہند)

سرسید نے حکام کی بدتمیزی اور کبر و رعونت کا
بہت دردناک نقشہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ :

" دوسری طرح کے افسران بھی تھے مگر بہت
قلیل۔ اکثر حکام ہندوستانیوں کو مثل
جانور سمجھتے تھے اور کوئی عزت ان کی نہ
کرتے تھے بلکہ الٹا بے عزت کرنے کے بہانے
تلاش کرتے رہتے تھے۔ ان کی بدمزاجی
اور بے پرواہی کی حکومت نے مطلق خبر نہ
لی۔"

سرسید سوال کرتے ہیں کہ

"کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم کہ بڑے
سے بڑے ذی عزت ہندوستانی حکام سے
لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے لرزاں
تھے؟ اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک
اشراف، اہلکار کے سامنے مسل پڑھ رہا
ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے کہ
صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام
دہی سے دل ہی دل میں روتا جاتا ہے اور
کہتا ہے کہ ہائے افسوس! روٹی اور
کہیں نہیں ملتی۔ اس نوکری سے تو گھاس
کھودنی بہتر ہے۔" (ایضاً)

یہ تمام بے عزتیاں اور ذلتیں گو کہ عام ہندوستانیوں
کے لیے اذیت ناک تھیں مگر چونکہ مسلمان ایک طویل مدت
تک اس ملک کے حکمراں رہے تھے۔ اس لیے ان
کو اپنی عزت زیادہ محبوب تھی اور اپنی عزت اور عزت نفس
اور فطرت کے پیش نظر اس کو گوارا کرنا ان کے لیے از بس
دشوار و محال تھا۔ اس کے آگے وہ کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتے
تھے۔ سرسید فرماتے ہیں:

"یہ باتیں ہر ایک قوم کے لوگوں کو ناگوار
تھیں مگر مسلمانوں کو زیادہ گراں گزرتی تھیں
مگر اس کا سبب بہت روشن ہے کہ صدہا
سال سے مسلمان ہندوستان میں بھی
باعزت چلے آتے تھے۔ ان کی طبیعت اور
جبلت میں ایک غیرت ہے۔ دل میں روپے
کا لالچ بہت کم ہے۔ کسی لالچ سے عزت
کا جانا نہیں چاہتے۔ بہت تجربہ ہوا ہوگا کہ اور
قومیں جو باتیں بغیر کسی رنج کے اٹھا لیتی
ہیں، مسلمانوں کو اس سے بھی ادنیٰ بات
کا اٹھانا نہایت مشکل ہوتا ہے۔" (ایضاً)

سرسید کے اس تجزیہ پر کسی اضافے کی گنجائش نہیں
ہے بلکہ یہ ایک امر واقعی ہے اور جو آج بھی برقرار ہے۔
اسی لیے مسلمان ان ناگوار حالات سے نہایت درجہ رنجیدہ
اور دلگیر تھے۔ اوپر جو اقتباسات دیے گئے ہیں وہ عمومی
حالات سے متعلق تھے لیکن سرسید نے چند ایک
خاص واقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں
مختلف مقامات پر یکے بعد دیگرے چھ ہندوستانیوں
کے قتل کیے جانے کے افسوس ناک واقعات رونما ہوئے
تو سرسید نے اپنے اخبار "سینٹیفک سوسائٹی" میں
پرزور صدائے احتجاج بلند کی۔ لکھتے ہیں:

" یہ چھ خبریں قتل کی ہیں جن میں چھ غریب
ہندوستانی مقتول ہوئے اور چھ صاحب
بہادر قاتل ہیں۔ ان جملہ مقدمات میں
اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ قاتلوں سے کیا
مواخذہ ہوا؟ کیا غریب ہندوستانی اسی
طرح کام آویں گے کہ ہمیشہ صاحب لوگوں
کے گھونسوں اور لاتوں اور بید لوں (ڈنڈوں)
سے پٹ کر جان دیں گے۔ اگر ایسا ہی ہے
تو پھر گورنمنٹ انگریزی میں جان کی حفاظت

کا دعویٰ شاید صحیح نہ ہوگا۔"

اسی اخبار کی ایک دوسری اشاعت میں انگریزوں کی زیادتی کا شکوہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"ہمارے اخبار مطبوعہ ۱۲ر اپریل ۱۸۶۶ء میں ہمارے ناظرین اخبار نے اس خبر کو پڑھا ہوگا جن میں مسٹر بنوجنٹ صاحب اسسٹنٹ مجسٹریٹ سیتامڑھی (بہار) اور اس امیدوار بے چارے کا ذکر ہے جس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر صاحب نے اس سے کہا تھا "اگر تم آئندہ سے ہم کو دیکھ کر گھوڑے سے نہ اترو گے تو تم کو سخت سزا دیں گے۔" اگر یہ شریف ہندوستانی ہندوستانی نہ ہوتا بلکہ بجائے اس کے ایک یوروپین ہوتا، گو وہ کیسا ہی کم رتبہ ہوتا تو شاید اسسٹنٹ صاحب موصوف کو اس سے ایسی گفتگو کرنے کا منصب نہ ہوتا۔"

آگے فرماتے ہیں کہ

"اس بے چارے امیدوار کے ساتھ ایک اور غریب معزز آدمی پالکی میں سوار تھا اور اس نے صاحب کو سلام بھی کیا تھا مگر صاحب نے اس کا سلام نہیں لیا اور اس سے یہ بھی یہی کہا کہ "اگر تم پالکی سے نہ اترو گے تو تم کو سخت سزا دیں گے۔" علاوہ اس قصے کے، بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ گو کیسا ہی معزز اور شریف ہندوستانی ہو اور گو وہ بگھی یا ٹم ٹم پر ہی کیوں نہ جاتا ہو اور اگر ادنیٰ صاحب بہادر تشریف لے جاتے ہوں اور وہ ہندوستانی، صاحب کو سلام کرے تو صاحب ہرگز اس کا سلام نہیں لیتے اور ان کی اس بے پروائی سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ صاحب کی کج خلقی اور تند مزاجی بھی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی نہایت ذلیل سمجھے جاتے ہیں اور شاید وہ کسی عزت کے اس وقت تک مستحق نہیں، جب تک کہ وہ ہندوستانی ہونے کا سیاہ ٹیکا اپنی پیشانی سے نہ چھٹا دیں۔ کیا ہماری گورنمنٹ جس کی بیدار مغزی نہایت شہرہ آفاق ہے کیا وہ اس بات کو نہ جانتی ہوگی کہ ہندوستانیوں کو اپنی اس ذلت سے کیا صدمہ ہوتا ہے؟"

اخباروں میں ان تحریروں کی اشاعت سے بخوبی یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرسید خود بھی ان توہین و تذلیل آمیز رویوں سے انگریزوں سے شاکی تھے اور ان کے ان بیانات سے ان کی بے باکی و بے خوفی اور حق گوئی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

الغرض! کبر و نخوت اور غرور، جور و تعدی، جبر و غضب اور خون آشامی انگریزوں کی عادت اور رسم قدیم ہے جس کے یہ عادی تھے اور اس کا مظاہرہ برابر ہوتا رہتا تھا چنانچہ ۱۸۵۷ء میں بے شمار ناکردہ گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بطور نمونہ مشتے از خروارے، چند کے نام آپ بھی پڑھ لیں۔ ان میں کسی کو یا تو پھانسی دی گئی یا گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ نواب عبدالرحمن خاں والی جھجر، نواب مظفر الدولہ، نواب میر خاں، نواب اکبر خاں بنگش، احمد مرزا، میر محمد حسین، حکیم عبدالخالق، قاضی فیض اللہ کشمیری، میر پنجہ کش خوشنویس، استاد امام بخش صہبائی، نواب احمد علی خاں (انھوں نے جیل میں ہی وفات پائی) نواب

محمد حسین خاں، نظام الدین خاں، نواب محمد علی خاں، عبداللہ خاں، صوفی حسن عسکری، نواب محمد خاں رئیس فرخ نگر، نواب مختار الدولہ، خواجہ وحید الدین اور خواجہ محمد ہاشم۔ اول الذکر مختار الدولہ سرسید کے بڑے ماموں اور دوسرے ان ماموں زاد بھائی تھے جو سرکاری فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے اور ان کا مکان و سامان لوٹ لیا گیا۔ سرسید کا مکان و سامان بھی سرکاری فوج نے لوٹ لیا تھا اور ان کی بوڑھی ماں نے بے سروسامان و بے آسرا ہو کر ایک غریب بڑھیا کی کوٹھری میں پناہ گزیں ہوئیں۔ یہ وہی بوڑھی عورت تھی جس کی کفالت موصوفہ کیا کرتی تھیں۔ اس کے یہاں خود گزارے کا کچھ سامان نہ تھا اس لیے وہ اس کے ساتھ وہاں کئی دن بے آب و دانہ رہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ منیر شکوہ آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا ولایت علی صادق پوری، ان تمام حضرات کو سزائے بعبورِ دریائے شور (انڈمان) ہوئی۔ اس کے علاوہ مقدمہ ہائے سازش کا ایک نہایت ناپاک سلسلہ شروع کیا گیا چنانچہ

۱۔ مقدمہ پٹنہ ۱۸۶۵ء اس میں بہت سے لوگوں کے علاوہ مشہور شخصیت مولانا احمد اللہ صادق پوری جن کو سزائے موت سنائی گئی جو بعد میں عمر قید میں تبدیل ہوئی اور انڈمان میں وفات پائی۔

۲۔ مقدمہ انبالہ ۱۸۶۶ء اس مقدمے کی روئیداد بے حد مضحکہ خیز ہے کہ اس مقدمے میں مولانا محمد یحییٰ علی صادق پوری کو سزائے موت تجویز کی گئی لیکن انگریزی حکام کو جب یہ معلوم ہوا کہ مولانا اس سزا پر بے حد خوش اور شاداں و فرحاں ہیں کہ اس کے ذریعے درجۂ شہادت پر فائز ہوں گے تو اس ضد کر [illegible] نہ ہو ان کی موت کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر کے ان کو اذیت پہنچائی گئی۔ ان کے علاوہ مولوی عبدالرحیم صادق پوری، قاضی میاں جان، میاں عبدالغفار مولانا محمد جعفر تھانیسری وغیرہ اس مقدمے میں گیارہ ملزم قرار پائے تھے ان میں صرف ایک وعدہ معاف گواہ بنا اور باقی سب کو سزا دی گئی۔

۳۔ مقدمہ راج محل ۱۸۷۰ء۔ اس مقدمے میں مولانا ابراہیم منڈیل کو سزائے عمر قید ہوئی۔

۴۔ مقدمہ مالدہ ۱۸۷۰ء اس میں مولوی امیر الدین کو سزائے عمر قید ہوئی مگر گیارہ برس بعد رہا کر دیے گئے۔

۵۔ مقدمہ پٹنہ۔ ۱۸۷۱ء یہ دوسرا مقدمہ پٹنہ ہے جس میں سات افراد ملزم قرار دیے گئے ان میں سے مولانا مبارک علی اور مولانا تبارک علی کو سزائے عمر قید ہوئی۔ مولانا مبارک علی نے جیل ہی میں وفات پائی۔ دو کو رہا کر دیا گیا اور باقی کو مختلف میعاد کی سزائیں ہوئیں۔ ان تمام سزا یافتگان مذکور کی جائدادیں اور مکانات ضبط ہوئے گھر اجاڑ ڈالے گئے سامان لوٹ لیا گیا باعزت اور شریف خواتین کو گھر سے بے گھر کیا گیا۔ علمائے صادق پور کے خاندانی قبرستان کی بے حرمتی کی گئی اور ان کو اکھاڑ کر زمین بوس کر دیا گیا۔ ان مقدموں کی جو تاریخی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

ان کے علاوہ جگہ جگہ ایسے مقدمے قایم ہوئے اور قتل گاہیں بنائی گئیں اور پھر دار و رسن کی خوب خوب رونق بڑھی۔ کیسے کیسے جیالے فرزانے، جاں فروش و کفن بدوش ہنستے کھیلتے تختۂ دار پر چڑھ کر سرخرو ہوئے۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

بظاہر ان واقعات کا اس مضمون سے کوئی ربط نہیں لیکن سر سید کے سوز دروں کے پس منظر میں اس کا اظہار بے محل نہیں ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۹۴۱ء میں اپنی وفات سے تین ماہ قبل کہا تھا:

"قسمت کے پہیے کسی نہ کسی دن انگریز کو مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنی ہندوستانی سلطنت سے دست بردار ہو جائے لیکن کس قسم کا ہندوستان وہ چھوڑیں گے اور وہ کتنا نکبت زدہ ہوگا؟ اس کے نظم و نسق کے سوتے جب خشک ہو جائیں گے تو کتنا بیکار کیچڑ اور گندگی وہ یہاں چھوڑ جائیں گے۔"

(جدید ہندوستان: ڈاکٹر بپن چندر)

اور بالآخر نوے برس کے بعد ۱۹۴۷ء میں وہ جیسا فلاکت زدہ، مفلس و قلاش، زخموں سے چور اور خون میں لت پت ہندوستان جنت نشان چھوڑ کر جانے پر مجبور ہوا اس کی حکایت خونچکاں بیان کرنے سے اپنا قلم خوں فشاں اور فنکار انگلیاں معذور ہیں۔ اس سانحہ سے دو چار نسل ابھی موجود ہے، ان کی زبانوں سے سنا جا سکتا ہے۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

"سرسید کے کردار کا ایک نمایاں پہلو تھا، ان کی بے خوفی، ان کی صاف گوئی بعض اوقات تشویش ناک ہو جاتی تھی۔ ان کا مخاطب خواہ وائسرائے ہو یا کوئی مغضوب الغضب ملا۔ عیسائی مشنری یا اخباری نمائندہ وہ وہی کہتے تھے جو واقعی ان کے دل میں ہوتا تھا۔ بدنامی، مخالفت، گالیاں، جان لینے کی دھمکیاں کوئی چیز بھی ان کو اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔"

ایچ۔ جی۔ الن

سرسیّد احمد خاں

ایک سچے مسلمان

شبنم پروین *

سرسیّد کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھائی گئی کہ ان کو مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور ثبوت میں ان کی تفسیر اور بعض دوسری تحریروں کے وہ حصّے نقل کیے گئے جن میں انھوں نے عقلی توجیہات اور بعض پرانی تفسیروں کی مدد سے عام روش سے انحراف کرتے ہوئے اپنے پیرایہ میں کچھ بیان کیا تھا لیکن ان پر الزام لگانے والوں نے ان حالات اور خیالات کا بنظر غائر مطالعہ نہیں کیا جو اس دور میں عام مسلمانوں کو درپیش تھے اور جو لوگوں کو گمراہی کے غار میں ڈھکیلتے جا رہے تھے۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ زیادہ تر لوگوں نے سرسیّد کی تحریروں کو پڑھے اور سمجھے بغیر محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے ان پر لعن طعن کی اور ان کو کفر و ضلالت میں مبتلا قرار دیا۔

سرسیّد کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے اس زمانے کے مسلم سماج کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قوم کی پستہ حالی اور بے راہ روی اپنے عروج پر تھی، لوگوں میں آگے بڑھنے کی جدوجہد کی فقدان اور شکست خوردگی کا احساس تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے ان کی ہمت کو پست اور جذبات کو کچل دیا تھا۔ انگریزوں کی پالیسی اور مسلمانوں کی کم علمی ہر ہر جگہ ان کے آڑے آتی تھی اور ہر میدان میں ان کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑتا تھا۔ اس کی وجہ غفلت، عظمت رفتہ کا نشہ، ظاہری رکھ رکھاؤ اور نمود و نمایش کا جذبہ احساس زیاں کا فقدان تھا۔ مذہبی معاملات میں بھی بڑی بے اعتدالیاں اور کوتاہی پیدا ہو گئی تھی۔ مذہبی فرائض کی ادائیگی محض رسمی اور دکھاوے کی بات تھی۔ قرآن کو محض برکت کے لیے گھروں میں رکھتے تھے۔ اس کو پڑھنا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہ تھا۔ تعلیمی میدان میں بھی مسلمان بہت پیچھے تھے۔ رسمی تعلیم کے علاوہ جدید علوم، انگریزی زبان اور سائنس کی ترقیوں کی طرف ان کی توجہ بالکل نہ تھی بلکہ ان علوم کو سیکھنے کی کوشش کرنے والوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور ان پر عیسائی ہونے کا الزام لگایا جاتا تھا۔

سرسیّد حساس اور دردمند دل رکھتے تھے۔ ذہین اور بیدار مغز تھے۔ ان کو اپنی قوم کی اس حالت سے بہت تشویش تھی۔ ان سے خاموش نہ رہا گیا اور قوم کی اصلاح اور ترقی و بہبود کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ انھوں نے دو باتوں کی طرف خصوصی توجہ کی۔ ایک اپنی قوم کو انگریزی اور علوم جدیدہ کی طرف مایل کرنے کی اور

---

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

دوسری ان کو مذہب کی سچائیوں اور حقائق کو سمجھانے کی
یہ دونوں کام ایسے تھے جن سے ایک مخصوص ڈھرے پر
چلنے والے متقی اور آسانی سے اپنی بالادستی سے دستبردار
نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی مخالفت شروع ہوئی
اور ہر طرح کے الزام لگائے گئے مگر وہ اپنے فیصلے پر اٹل
رہے اور ساری زندگی انھیں کاموں کے لیے وقف
کر دی۔

سر سید کو مسلم قوم کی پستی اور جہالت دیکھ کر بڑا
رنج ہوتا تھا اور اس کے لیے وہ ساری زندگی کوشاں و
کمربستہ رہے کہ مسلمانوں کو اس اندھیرے سے نکالا
جائے۔ سر سید کا یہ خواب تھا کہ مسلمان قوم دنیا میں
اپنا ایک مقام اور وقار قایم کرے اور انھوں نے اس
کے تئیں کافی کوششیں اور جدوجہد بھی کی۔ ان کی ساری
زندگی ان طاقتوں کے خلاف ایک جنگ اور جدوجہد
تھی جو مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی تھیں۔

سر سید نے اپنی ایک تحریر میں قوم کی غفلت اور
بدمستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی
گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے
بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات
ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کون
سی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں
جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند
تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے، جب زاہد
خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے جب
صوفی تھے تو روحی سے بر تر تھے۔ اب
خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غم خوار"۔

قوم کی محبت اور وطنیت اور قومیت کا خیال اس شخص
میں ہرگز نہیں ہو سکتا جس کے پاس ایمان نہ ہو اور ایمان والا
بے شک ایک اچھا اور سچا مسلمان کہا جا سکتا ہے۔

سر سید احمد خاں بھی ایک سچے مسلمان تھے ان کے دل
میں ہمیشہ مسلم قوم کا درد چھپا رہتا تھا اور ان کے ہر
ایک عمل اور ہر ایک اصلاح کے پیچھے اسلام اور ہند
کے مسلمانوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ رہتا تھا۔ اسلام کے
بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے انھوں نے قوم اور وطن
کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ انھوں نے رسول
خدا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں پر چلتے ہوئے
"حب الوطن من الایمان" کو اپنا مقصد حیات
بنایا۔

صلاح الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

"وہ زندگی کی پچاسویں منزلیں طے کر چکے
تھے اور سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں اور
پابندیوں کے باوجود بڑے بڑے اہم ملک گیر
امور خیر انجام دے چکے تھے۔ انھیں اپنی اس
دھن میں شب و روز محنت کرنی پڑتی
تھی اور ان کی زندگی کٹھن مہمات کا ایک
سلسلۂ طویل بن کر رہ گئی تھی لیکن جب
اپنی قوم کی فنا و بقا کا مسئلہ اپنی پوری
وسعت اور شدت کے ساتھ ان کے
سامنے آیا تو ان کے لیے ایک نئی زندگی
اور نئی توانائی کا پیغام بھی ساتھ لایا اب
سے ان کی زندگی کا ہر لمحہ مسلم قوم کے لیے
وقف ہو گیا۔ وہ راتوں کو اٹھ کر ٹہلتے اور
سوچتے اور دن بھر مختلف النوع مشاغل
میں مصروف رہتے تھے۔ اب ان کی ساری
توجہ صرف ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی
تھی اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا
یہ مرکزی نقطہ اسلامیان ہند کی ساکھ

اور ان کی فلاح تھی۔

سرسیّد کے دل میں کبھی غیر مذہب کے لیے کوئی تعصب نہ رہا۔ انھوں نے کبھی ہندوؤں کی ترقی پر ناگواری کا اظہار نہ کیا لیکن اس کے باوجود اسلام کی محبت اور طرف داری ان کے اندر بہت پائی جاتی تھی۔ جب بھی کوئی بیجا حملہ اسلام یا مسلمانوں پر غیر مذہب والوں کی طرف سے ہوا تو سرسیّد فوراً اسلام کی حمایت میں سرگرم ہو جاتے تھے اور اس امر میں وہ کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس بات کی صاف دلیل وہ کتابیں اور مضمون ہیں جو سرسید نے عیسائی مصنفوں کی اسلام کے خلاف کتابوں کے جواب میں لکھے ہیں۔ سرسیّد کی تصنیف "خطبات احمدیہ" کو پڑھنے سے جس کو انھوں نے ڈاکٹر ولیم میور کی تصنیف کے جواب میں لکھا ہے۔ مصنف کی محنت اور لیاقت اور اسلام اور بانی اسلام کی محبت کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں سر ولیم میور کی اور دیگر عیسائی مصنفوں کی ہر بات کا جواب لکھا ہے جو کہ اسلام کے خلاف کہی گئی ہوں یا جن سے دین اسلام اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت پر دھبہ لگتا ہے۔ ولیم میور نے اسلام کو کمزور و مجبور جان کر اس پر وار کیا تھا لیکن انھیں یہ نہیں پتہ تھا کہ دین اسلام کا سچا حامی اور ایک سچا مسلمان بھی ہے جو ان کے الزام کو سن کر حمایت اسلام کے لیے اُٹھ کھڑا ہوگا اور ہر طرح سے اسلام اور رسولؐ اکرمؐ کی خوبی، سچائی اور پاکی کو ثابت کرنے کے لیے اپنے آپ کو اپنے گھر بار اور اپنی ہر چیز کو داو پر لگا دے گا۔ لیکن سرسیّد ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے یہ کام کر دکھایا کہ اسلام پر الزام لگانے والے اور اس پر حملہ کرنے والے کا ایک مسلمان ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے۔ سرسیّد نے عیسائی مصنفوں کی الزام تراشی اور اعتراضات کا جواب دے کر وہ کام انجام دیا جو کہ کسی بڑے عالم یا حامیٔ دین سے نہ ہو سکا جو اپنے آپ کو مذہب کا ٹھیکیدار اور سچا مسلمان مانتے تھے اور سرسیّد کے لیے کفر کے فتوے جاری کرتے تھے۔

سرسیّد نے سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کا جواب لکھنے کے لیے لندن کا سفر کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسی کتاب لکھیں جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوم پر ظاہر ہو اور جو الزامات سر ولیم میور نے اسلام پر الزام لگائے ہیں اور عیسائی مصنفوں نے اور خصوصاً ولیم میور نے اسلام اور بانی اسلام محمدؐ کے کیریکٹر کو ظاہر کرنے میں جان بوجھ کر سوچی، سمجھی اسکیم کے تحت یا انجانے میں جو غلطیاں کی ہیں انھیں دفع کیا جائے۔ سرسید نے یہ محسوس کیا کہ یہ کتاب نہ صرف عیسائیوں کو اسلام اور رسول پاک صلعم کی طرف سے گمراہ کرنے والی ہے بلکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف سے شک میں ڈالنے والی ہے۔ اسی وجہ سے سرسید کو بے حد فکر تھی کہ اس کتاب کا کوئی معقول جواب لکھا جائے۔ اس کے لیے انھیں بہت سی ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جو برٹش میوزیم یا انڈیا آفس کے کتب خانوں میں مل سکتی تھیں۔ اس کے لیے ان کا لندن جانا ضروری تھا۔

نواب محسن الملک اپنی ایک تحریر میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کو لکھتے ہیں کہ

> "سیّد احمد خان ولایت گئے مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کی حالت جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے انھیں کے گھروں میں اور انھیں کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے واپس

آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت
میں جاکر تماشہ گاہ، تھیٹر، پارک، میوزیم
اور عمارات کی سیر کرتے ہیں اور یہ
حامیٔ دین اسلام کتب خانے میں بیٹھا
ہوا خطبات احمدیہ کی تصنیف میں
منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں
کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص
کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا،
رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم
کے واسطے۔"

سرسید یہ چاہتے تھے کہ مذہبی تعلیم لوگوں کو ضرور دی جائے اور مسلمانوں میں مذہب کا پختہ یقین ہو جائے چنانچہ انھوں نے اکثر یہ کوشش کی کہ مسلمانوں میں مذہب اور اللہ اور اللہ کے رسول صلعم کی عقیدت اور اس پر یقین کامل پیدا ہو۔ ایک دفعہ سرسید نے ایک تقریر میں خاص طور سے مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ:

"یاد رکھو سب سے سچا کلمہ" لا الٰہ
الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے۔ اسی پر
یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے
اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر
یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے
پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو
کیا؟ پس امید ہے کہ اگر تم ان
دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام)
کے نمونے ہو گے اور جب ہی ہماری
قوم کی عزت ہو گی۔"

سرسید احمد خاں کو کلمۂ طیبہ پر پختہ یقین تھا اور وہ اسلام کو ایک حقیقی مذہب قرار دیتے تھے ان کے دل میں اسلام کے بانی حضرت محمد صلعم کی محبت اور عقیدت بہت زیادہ تھی۔ وہ اسلام کو خدا کا عطا کیا ہوا ایک سچا اور خاص مذہب ہونے پر پختہ یقین رکھتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو یہ بھی یقین تھا کہ دنیا کے تمام مذہبوں سے اعلیٰ اسلام مذہب ہے۔

سرسید کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید نے ہر قدم پر اور ہر معاملے میں مذہب کو اپنا رہبر بنایا اور ہر کام اسی کے مطابق اور اسی کی حدود کے اندر کیا۔ ۔ انھوں نے اپنی ہر بات کا جواب مذہب سے ہی پوچھا اور جو جواب مذہب سے ملا اسے ہی اپنایا۔ وہ دین اسلام کو سچا دین سمجھتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی انھیں اپنے مسلمان ہونے پر بڑا فخر و ناز تھا۔ جب وہ اپنے کام کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے تو ان کے کسی دوست نے انھیں ایک خط بھیجا جس میں ان کے لیے نصیحت تھی کہ وہاں جاکر مذہب اسلام کو نہ بھول جانا اور عیسائی مذہب نہ اختیار کر لینا۔ سرسید نے اس خط کے جواب میں لکھا تھا کہ:

"حامد نے آپ کا عنایت نامہ
مجھے دیا تھا۔ میں نے خیال کیا تھا
کہ جب ولایت سے پھر کر آؤں
گا اور آپ سے انشاء اللہ تعالیٰ
ملوں گا، اسی وقت جواب دوں
گا۔ حقیقت میں وہ عنایت نامہ
محبت آمیز ہنسی کی بات تھی نہ
جواب لکھنے کے لائق۔ اگرچہ میں

سمجھتا تھا کہ آپ کے خیالات وہی قدیم
پرانے دقیانوسی ہندوستانیوں کی طرح
سے ہیں۔ حال کے زمانے کی جو باتیں
ہیں وہ نہ ذہن میں آتی ہیں نہ پسند
ہوتی ہیں مگر خاص جس امر کی نسبت
آپ نے مجھے لکھا ہے اس کا نہایت
تعجب ہے اس لیے کہ میری نسبت اس
قسم کے خیالات کی البتہ جاہل اور
ناواقف آدمی کو گنجائش ہو سکتی ہے
یا دشمن یا حاسد جو کچھ چاہیں خیال کر سکتے
ہیں مگر آپ کو اس قسم کا خیال کیوں
ہوا؟ شاید بمقتضائے محبت ایسا خیال
ہوا ہو۔ اس لیے کہ دوست کو ہمیشہ
بُرے بُرے خیالات گزرتے ہیں جیسا
کہ میں خود اپنی تحقیق سے نہ تقلید سے
دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں۔ اس
قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے
لمبی داڑھی والوں کو اور ہزار ہزار دانہ
تسبیح والوں کو اور جو مکہ و مدینہ سے
پیر و خلیفہ و مرشدی کا جبہ و دستار
لے کر آئے ہیں ان کو بھی نہیں ہے۔"

مذہب اسلام کے وہ ایک مکمل اور آخری مذہب ہونے میں پورا یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک لکچر میں کہا تھا کہ:

"میں نے خالی الذہن ہو کر اسلام
پر بہت کچھ غور کیا ہے اور مناسب
غور و فکر کے بعد میرے دل میں اس
بات کا یقین ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی
مذہب سچا ہے تو وہ اسلام ہی ہے

اور میں اس دلی یقین پر اس
کی تائید کرتا ہوں نہ اس وجہ سے
کہ میں مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہوں
اور مسلمان ہوں۔"

سرسید کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور قرآن و حدیث پر پختہ یقین تھا لیکن چوں کہ ان کے سوچنے کا طریقہ تھوڑا الگ تھا اس لیے وہ عام مسلمانوں کے خیالات سے قدرے مختلف تھا اور ان کا یہی منفرد انداز لوگوں کو غلط فیصلہ پر آمادہ کرتا تھا اور اسی وجہ سے ان کو کافر یا ملحد قرار دیا گیا۔

"حیاتِ جاوید" میں حالی لکھتے ہیں کہ:

"جہاں تک کہ سرسیّد کے اقوال
افعال اور خیالات سے استدلال
ہو سکتا ہے ان کو دینِ اسلام
حقیقت پر ایسا یقین معلوم ہوتا ہے
کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں
آسکتا۔ اگرچہ ان کے مذہبی خیالات
اور مذہبی عقاید مسلمانوں کے کسی
خاص فرقے کے خیالات اور عقاید کے
تابع نہ تھے مگر ان کا ایک عقیدہ بھی
شاید ایسا نہ نکلے گا جو اصولاً کسی نہ
کسی اسلامی فرقہ کے عقاید سے
مطابقت نہ رکھتا ہو۔ ان کو اہلِ سنت
کی قدیم اصطلاح کے موافق زیادہ سے
زیادہ مبتدع کیا جا سکتا ہے جیسا
کہ اکثر اکابر اسلام کو کہا گیا ہے
لیکن ان کی نسبت کافر یا ملحد یا نیچری
کہنا اسی قسم کا بہتان ہے کہ جو ہر
زمانہ، ہر ملک اور [illegible] کے

معتقدوں اور مصلحوں پر کیا گیا ہے۔"

ایک سچا مسلمان ہونے کے لیے توحید، رسالت اور قرآن پر یقین کرنا اور انھیں دل سے ماننا اور اس کی اطاعت کرنا لازم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام عقاید پر سرسید کا بڑا پختہ یقین تھا۔ توحید کے بارے میں سرسید کا کہنا تھا کہ:

"وہ چیز جس پر یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جا سکتا ہے وہ خدا کی توحید ہے جو شخص خدا کو برحق جانتا ہے اور اس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔"

اس کے علاوہ فرماتے ہیں کہ

"خدا کو واحد مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ اس پر یقین کرنا اسلام ہے اور جو اس پر یقین کرے وہ مسلم ہے۔"

اس کے علاوہ انھوں نے اللہ کی ذات و صفات پر بھی یقین رکھنے پر زور دیا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ:

"جو شخص اس طرح خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔ ہاں ایسے شخص کی نسبت جو صرف خدائے واحد کو مانتا ہے، میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں..... محمدی ہونے کے لیے ضرور ہے کہ ہم اس شخص پر بھی جس نے ہمیں توحید کی نعمت دی... جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو جانا اور اس کی صفات کو پہچانا، یقین کریں۔"

اس کے علاوہ ایک کامل مومن کی طرح سرسید کا یہ بھی خیال تھا کہ:

"وحدانیت اور رسالت کی تصدیق کے بعد اور چیزیں بھی اسلام کے ساتھ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ ان فرائض کے ادا نہ کرنے والے کو ہم گنہ گار اور ان کے منکر کی نسبت وہی کہیں گے جو رسالت کے منکر کی نسبت کہا ہے کہ وہ محمدی نہیں یعنی بمعنی مرادف مسلمان نہیں۔"

اسی طرح سرسید نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا اور کسی کی تائید کرنا اور اس کو باعث نجات یا ثواب سمجھنا بھی ایک قسم کا شرک بتایا ہے۔

اسی طرح قرآن کے آسمانی کتاب ہونے پر ان کا پختہ ایمان تھا اور اس کے معجزہ ہونے کا وہ یقین رکھتے تھے اور اسے ویسا ہی فصیح و بلیغ سمجھتے تھے جیسا کہ قدما نے سمجھا کہ کوئی شخص اس کے جیسی کلام کی عمدگی اور فصاحت والی دوسری کوئی آیت نہیں لکھ سکتا لیکن اس یقین کے علاوہ قرآن کے معجزہ ہونے کی وہ ایک دلیل دیتے تھے جسے وہ زیادہ صحیح اور مضبوط دلیل سمجھتے تھے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی ہدایتیں رہتی دنیا تک کے لیے ہیں اور جس سے صحرا میں اونٹ چرانے والا بدّو اور ایک اعلیٰ درجے کا حکیم دونوں برابر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ:

"قرآن مجید ہی صرف ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے اور جس سے مختلف درجوں بلکہ متضاد حیثیتوں کے لوگوں کو یکساں ہدایت

ہوتی ہے، ایک جاہل بدّو ایک مقدس
مولوی اس کے لفظی معنوں سے جس
طرح ہدایت پاتا ہے۔ ایسا ہی ایک
فلاسفر انہیں الفاظ کے معنوں سے
ویسی ہی ہدایت پاتا ہے اور کسی لفظ
کو نیچر یا فلسفہ سے خلاف نہیں پاتا۔"

وہ کہتے تھے کہ:

"قرآن مجید ہی ایسی کتاب ہے جس
میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں اور یہی
اس کا اصلی اور سچا اور واقعی
معجزہ ہے۔"

سرسید احمد خاں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی لیکن وہ مکمل نہیں ہو پائی تھی۔ لوگوں نے تفسیر کی وجہ سے ان کی بہت مخالفت کی اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات کیے لیکن سرسید کا کہنا تھا کہ:

"میری تفسیر ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو خدا
کی وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت
پر، حشر و نشر اور عذاب و ثواب اور
بہشت و دوزخ اور جو کچھ قرآن میں
قیامت کی نسبت بیان ہوا ہے، سب
پر یقین رکھتے ہوں۔ وہ صرف ان لوگوں
کے لیے ہے جو مذکورہ بالا عقاید پر
پختہ یقین نہیں رکھتے یا ان پر معترض
یا ان میں متردد ہیں۔"

سرسید کا اپنا خیال تھا کہ:

"جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجت کے
اسلام پر یقین رکھتے ہیں ان کا ایمان
اور ان کا یقین بہ نسبت ان لوگوں
کے جو دلیل و حجت سے اپنے عقیدے
کو مستحکم کرتے ہیں، بہت زیادہ مستحکم
ہے۔ کیوں کہ ان کے دل میں کسی قسم
کے شک و شبہ نے راہ نہیں پائی
اور نہ ہی راہ پانے کی اس میں
گنجائش ہے..... میں تم سے سچ
کہتا ہوں کہ میں ان کے ایمان کو
(میں اور کسی سے کیوں کہوں) اپنے
ایمان سے تو بہت زیادہ مستحکم جانتا
ہوں۔ خدا کے ماننے اور رسولؐ پر
یقین کرنے کے لیے ان کو کسی منطقی
دلیل اور فلسفی برہان کی حاجت
نہیں۔ کیسی ہی کوئی بات خارج از
عقل و ناقابلِ یقین ہو یا غلط ان
کے سامنے یہ کہہ کر کہ "خدا و رسولؐ
نے فرمایا ہے" بیان کی جاوے تو وہ
فوراً اس پر یقین کریں گے۔ پس
ایسے لوگ ہماری بحث سے بالکل
خارج ہیں۔ میں ان کو یقین کا ستارہ
اور اسلام پر یقین کرنے کا نمونہ
سمجھتا ہوں اور ٹھیک مسلمان جانتا
ہوں۔"

سرسید احمد خاں کی زندگی کا مطالعہ کر
اور ان کی ہر سوچ و فکر کو سمجھنے کے بعد کوئی شخص ا
لامذہب یا کافر قرار نہیں دے سکتا۔ کیوں
ایک کافر میں وہ خوبیاں اور اچھائیاں ہرگز نہیں
جو ہم سرسید مرحوم میں پاتے ہیں۔ یہ شخص مذ
اسلام کا اور مسلم قوم کا سچا حامی تھا اور وہ
خوبیاں اس کے اندر موجود تھیں جو کہ ایک مو
اندر ہونی چاہییں۔

سر سید نے مسلمانوں اور اسلام کے لیے جو کیا وہ شاید ہی کسی مسلمان سے ہو پایا ہو۔ اس کا اندازہ ریورنڈ ہوپر کے خیالات سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے سر سید کے لیے ظاہر کیے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ:

"مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سیّد احمد خاں کو کافر ملحد اور بد مذہب سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو کام سر سیّد احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے ۔۔۔ اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے۔ ان کے ملکوں میں جا کر انھیں کی زبان میں وعظ کہتے اور انھیں کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے، میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔"

. . . . .

"آپ میں جو حضرات محقق و باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔"

مولانا محمود حسن

خطبۂ افتتاحیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۲

شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۹۳ء

بانی ... سرسید احمد خاںؒ

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

انچارج سرکولیشن ... شفیق احمد

نائب مدیر ... احمد مجتبیٰ قریشی

تزئین ... سرفراز

ترسیل زر کا پتہ :

Phone : 24827

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

Editor, TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH. 202002

زر سالانہ :

انڈیا	Rs. 45·00
بیرونی ممالک ہوائی ڈاک	US $ 20·00
عام ڈاک	US $ 8·00

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: کبیر احمد جائسی۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت، اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ۔ پریس: اے۔ ایم یو پریس۔ علی گڑھ

اداریہ

لیجیے ایک بار پھر سیاسی مداری اپنا اپنا پٹارہ لے کر سڑکوں اور گلیوں کوچوں میں اپنا کرتب دکھانے نکل آئے ہیں۔ یہ کرتب ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد سے جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہندوستان کے عوام عقل و خرد اور ہوش و حواس سے کام لے کر پیشہ ور سیاسی مداریوں کو دھول نہ چٹا دیں گے۔ ایک بار پھر نئے نئے وعدوں کے دلکش اور خوشنما پھول سیاسی بازی گروں کے ہاتھ میں دکھائی دینے لگے ہیں جو الکشن ختم ہوتے ہی نہ صرف کُملا جائیں گے بلکہ ان ہی بازیگروں کے پیروں تلے کچلے جائیں گے۔ ایک بار پھر وہی سب کچھ ہوگا جو گذشتہ تقریباً نصف صدی میں ہو چکا ہے، ایک بار پھر عوام اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ان لوگوں کے دام فریب میں آجائیں گے جن کے فریب مسلسل سے وہ واقف ہی نہیں شاکی بھی ہیں۔

ایک جمہوری مملکت میں الکشن کا ہونا اور رائے دہندگان کا بےخوفی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرنا لازمی ہے۔ ہم آج کی صحبت میں اس بات سے کوئی بحث نہیں کریں گے کہ ہندوستانی عوام کس حد تک بےخوفی سے اپنی رائے کا اظہار کر پاتے ہیں اور کس حد تک ہمارے ملک کے انتخابات ماردھاڑ، دھینگا مشتی، ووٹروں پر جبر و ظلم، گنڈہ گردی اور بے ایمانی سے عاری ہیں۔ یہ وہ معلوم و معروف حقائق ہیں جن پر اظہار خیال کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے چند صاف صاف باتیں کرلی جائیں۔

اب تک جتنے بھی الکشن ہوئے ہیں اُن میں ووٹ ڈالتے وقت مجموعی طور پر مسلمانوں نے ہمیشہ دھوکا کھایا ہے۔ ہر سیاسی پارٹی کے ساتھ ایک قابل لحاظ تعداد میں بےضمیر، بےشرم، ملّت ناآشنا، کاٹھ کے پتلے مسلمان موجود ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کا شکار کرنے کے لیے چارہ کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان ہر الکشن کے موقع پر ان نام نہاد مسلمانوں کو ووٹ دے کر اپنے ووٹ ضایع کرتے رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں جیسا نام رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں کو بےوقوف بنانے میں اکثر کامیاب ہو جاتے ہیں اور جب اقتدار کے ایوانوں میں قدم رکھتے ہیں تو اس بات کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ جب بھی کوئی حکومت قایم ہوتی ہے تو ہر وزیراعظم اور ہر وزیراعلیٰ اپنی کابینہ میں اپنی پارٹی کے چند مسلمان ممبروں کو ضرور شامل کرتا ہے اور ان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ کابینہ میں رہ کر مسلمانوں کے مسایل و مصائب سے حکومت کو آگاہ کراتے رہیں گے۔ یہ وہ مسلمان ہوتے ہیں جن سے زیادہ لائق و فائق، قابل اور مدبّر غیر مسلم حضرات اس پارٹی میں موجود

ہوتے ہیں مگر ان کم تر لائق، کم تر فائق اور کم تر قابل افراد کو صرف اس لیے کابینہ میں شامل کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہیں۔

گزشتہ تجربات کی روشنی میں اب یہ لازم ہو گیا ہے کہ حالیہ انتخابات میں مسلمان سیاسی مداریوں کو دھول چٹا دی جائے اور ان سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ "اب ہم مزید بیوقوف بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سیاست تمہاری روزی روٹی ہے، اگر تم اس پیشے کو چھوڑ دو گے تو فاقہ کشی کی نوبت آ جائے گی، تم اپنے پیشے کو ضرور جاری رکھو مگر اب ہم تمہارے دامِ فریب میں آنے والے نہیں ہیں"۔ مسلمانوں کو اپنے ایک ایک ووٹ کا استعمال کرنا چاہیے۔ اہتمام کے ساتھ ووٹ ڈالنا چاہیے اور سیکولر، منصف مزاج، انسانی درد رکھنے والے امیدوار کو اپنا ووٹ دینا چاہیے، چاہے وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔

آزاد ہندوستان میں سیکولر کردار رکھنے والے غیر مسلموں کی کمی نہیں ہے۔ اس الکشن میں ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ نام نہاد مسلمانوں کے دام تزویر سے بچا جائے، ان کے نام سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنا ایسا نمائندہ چنا جائے جو بے خوفی اور بے جگری کے ساتھ دن کو دن اور رات کو رات کہہ سکے۔ اگر اس بار بھی مسلمانوں نے عقل و خرد اور ہوش سے کام نہ لیا اور بے ریڑھ کی ہڈی والے افراد کو اپنا نمائندہ چنا تو اس میں کسی دوسرے کا نہیں خود مسلمانوں کا قصور ہوگا۔

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اپنے طرزِ عمل سے ایک نئے باب کا اضافہ کیجیے۔ ایک ایسی پارلیمنٹ اور چند ہی سہی ایسی اسمبلیاں بنائیے جن میں نام نہاد مسلمانوں کا کوئی وجود نہ ہو۔ اگر ایک بار بھی آپ ایسی پارلیمنٹ اور ایسی اسمبلیاں بنانے میں کامیاب ہو گئے تو اس کے دور رس اثرات ظاہر ہوں گے، واقعی اور حقیقی سیکولر کردار رکھنے والے غیر مسلم حضرات نام نہاد پیشہ ور مسلمان سیاست دانوں کے مقابلے میں آپ کے دکھ درد میں بھی شریک ہوں گے اور آپ کے مسائل بھی حل کریں گے۔ ایک بار تو یہ تجربہ کر کے دیکھیے، ایک بار تو فریب کھانے سے بچیے، ایک بار تو جذباتیت کو ترک کر کے ہوش و خرد کے مطابق فیصلہ کیجیے۔

یاد رکھیے جان اور رزق دونوں ہی کا مالک اللہ ہے۔ دنیا کا کوئی فرد و بشر اللہ کے حکم کے بغیر نہ تو آپ کی جان لے سکتا ہے، نہ ایک لقمہ دے سکتا ہے نہ ہی آپ کا کوئی ایک لقمہ چھین لینے کی طاقت رکھتا ہے۔ جب حقیقت حال یہ ہے تو ہم جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت کی راہ پر کیوں گامزن کریں، صرف اس لیے کہ مسلمانوں جیسا نام رکھنے والے ہم کو بے وقوف بنا کر ایوانِ اقتدار میں گھس جائیں اور اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر ہمارا ہی استحصال کرتے رہیں؟

الکشن میں جم کر حصہ لیجیے، ووٹ ڈالنے جانے کا اہتمام کیجیے، سیکولر اور انصاف پسند امیدواروں کا انتخاب کیجیے۔ وہ غلطی مت کیجیے جس کا بھگتان آپ گزشتہ تقریباً نصف صدی سے بھگت رہے ہیں، انسانیت کے مستقبل سے مایوس مت ہوئیے۔ انسانیت زندہ تھی، زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گی مگر شرط یہ ہے کہ آپ خود اپنی انسانیت یعنی عقل و خرد اور ہوش و حواس کا ثبوت دیجیے۔

کبیر احمد جائسی

لالہ مہیشور دیال

سید حامد★

میں نے سدا انھیں مسکراتے ہوئے دیکھا "مسکراتے ہوئے" ____ اگر مسکرانے میں ابتسام کی وہ روشنی بھی شامل سمجھی جائے جس کا سرچشمہ طمانیت اور رعایت ہوتا ہے جو ہونٹوں پر سمٹ جانے کے بجائے سارے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔ وہ مسکراتے اس لیے تھے کہ قدرت ان پر مسکرائی تھی۔ ان کا تعلق پرانی دلی کے ایک بہت قدیم اور خوش حال گھرانے سے تھا۔ وہ سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ زندگی انھوں نے بڑے انضباط کے ساتھ گزاری۔ زندگی میں تربیت اور سلیقہ ہو تو انسان، جیسا کہ میں صرف قیاس کر سکتا ہوں، بہت سی فکروں اور گھبراہٹوں سے بچا رہتا ہے۔ جو دل نواز سکون ان کے چہرے پہ کھیلتا تھا، اس کی ڈھلائی خود انھوں نے کی تھی۔

لالہ مہیشور دیال دلّی پر استناد کا درجہ رکھتے تھے۔ شاہ جہاں کے دور سے اب تک شاہ جہاں آباد جس گنجہائے گراں مایہ کو منظر عام پر لایا اور جن مصائب اور حوادث سے گزرا، جن خاناوں کو اس نے پروان چڑھایا اور امتیاز بخشا ان سب کی روداد مہیشور دیال صاحب کو ازبر تھی۔ دلی کی زمین کیسے کیسے آسمانوں کو کھا گئی، اس کی داستان کوئی ان سے پوچھتا۔ اہلِ علم، اربابِ فن، اہلِ ہنر کے جھرمٹ ان کے بخیل حافظہ کو خراج ادا کرتے ہوئے پیجنٹ کی طرح گزرا کرتے تھے۔ کل (۲۶ جون ۱۹۹۳ء) ہی کی بات ہے لالہ صاحب کا ذکر آیا تو قرۃ العین حیدر صاحبہ نے بتایا ان کی ایک عزیزہ کو ایک پینٹنگ کے سن وسال معلوم کرنا تھے۔ انھوں نے مہیشور دیال صاحب کو ٹیلی فون کیا اور تصویر کے خدوخال زبانی کھینچے انھوں نے بتایا کہ دورِ جہاں گیری کے شہرۂ آفاق مصور منصور (جن کا شاہ کار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری کا سب سے گراں قدر سرمایہ ہے) کے اخلاف میں سے ایک صاحب فیروز دلّی میں فلاں محلے میں رہتے ہیں، ان سے رجوع کیجیے۔ ایسا ہی کیا گیا اور گتھی سلجھ گئی دلی پر بیرون ہند، خاص کر مغرب سے جو لوگ تحقیق یا تدقیق کرنے آتے تھے لالہ مہیشور دیال سے استصواب ضرور کرتے مرکزی حکومت بھی ان کی دلی شناسی کا فائدہ حسبِ توفیق اٹھاتی رہی۔ عاشقوں، سائلوں اور معلومات کنشوں کا یہ ہجوم خود لالہ صاحب کے لیے بھی فیض رساں ثابت ہوتا تھا۔

★ سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ تعلیم آباد، ہمدرد نگر، نئی دہلی۔

باوجود آسان روی اور خوش اخلاقی اور کشادہ روئی کے ہمارے ممدوح ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ دلی کے رکوچوں) اوراق مصوّر اور ان کی تاریخ پر انھوں نے ایک ضخیم، دیدہ زیب اور دل کش کتاب "عالم میں انتخاب" لکھی اس کی ایک کاپی ازراہ کرم مجھے بھی عنایت کی۔ اس بات کو شاید چھ سات سال ہو گئے ہوں گے۔ دلی کلاتھ مل کے لالہ بنسی لال نے اپنے خط کے ساتھ یہ کتاب مجھے بھیجی۔ میں نے اس پر چند ستائشی سطور لکھ کر کتاب کی رسید بھیج دی۔ پاکستان سے جمیل الدین عالی آئے۔ لالہ بنسی لال کے یہاں ٹھہرے۔ شاید مہمان کی ایما پر مجھے ڈنر پر مدعو کیا گیا۔ لالہ مہیشور دیال صاحب، خود جن کا تعلق شاید اسی (شاد و شنکر کے) گھرانے سے ہے، تشریف رکھتے تھے۔ شعر و شاعری ہوتی رہی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری مختصر سطور سے زیادہ مطمئن نہ تھے لیکن جملۂ معترضہ کو چھوڑ کر اب نفس مضمون پر آتا ہوں۔ کتاب کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے لالہ مہیشور دیال نے اسے ناگری رسم خط میں چھپوایا۔ دلی، ہندی اکیڈمی میں اس کی رونمائی ہوئی۔ مجھے بھی یاد کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ مصنف کے ایما پر۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ اس وقت تو کنی کاٹ گیا لیکن یہاں پر تو اسے صدر کی حیثیت سے بہت کچھ کہنا پڑے گا۔

به دور گردئ من از غرور می خندد
حریفِ سخت کمانے که در کمین دارم

[وہ سخت کمان حریف مجھے دور دور پھرتے ہوئے دیکھ کر غرور سے ہنس رہا ہے]

لفٹننٹ گورنر مارکنڈے سنگھ کتاب کے اجرا کے لیے آئے۔ منچ پر نامور سنگھ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے لیکن نہ آیا تو کتاب کا مصنف۔ وجہ؟ ہندی اکیڈمی والوں نے ان سے پوچھے بنا تاریخ طے کر دی اور جب انھوں نے اپنی مشغولیت کا عذر کیا تو انھوں نے کہا کہ مجوزہ تاریخ کو لفٹننٹ گورنر کی منظوری حاصل ہے اور دوسرے مہمانوں کو بھی، بہ شمول اس خاکسار کے، بلایا گیا ہے۔ پھر کیا تھا، وہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہیں ہوا انوکھی بات یہ ہے کہ مجھے انھوں نے بلوایا، خود مجھے پہلے سے آہٹ دے دی اور دوسرے سارے مہمان بھی ان ہی کی کشش سے وہاں جلوہ افروز ہوئے۔ برات دلہن کے گھر پہنچ گئی اور دولہا غائب۔ غیبِ غیب کا تجربہ مجھے ایک بار پہلے بھی ہو چکا ہے لیکن اس بار دولہن غائب تھی جو ہندی کے ایک بڑے لیکھک کی پوتی تھی۔ براتیوں میں چہ می گوئیاں ہوتی رہیں۔ دلہن کے پتاجی تو پریشان تھے ہی، ہم باراتی بھی اداس تھے کہ خالی ہاتھ جائیں گے تو کشتی نگر والوں کو کیا منھ دکھائیں گے، کھلی اڑے گی، یہ کیسے براتی ہیں کہ خالی ہاتھ واپس آرہے ہیں۔ حسرت سے ہم نے اس زمانے کو یاد کیا جب زورِ بازو سے دلہن اغوا کی جاتی تھی۔ گویا یہ بات واضح کر دی جاتی تھی کہ اگر بازوؤں میں بل نہیں ہے، جانگر نہیں رکھتے تو تم اس لائق نہیں ہو کہ ہماری بیٹی تمہارے گھر جائے۔ اگر یہ موقع ہمیں میسر آتا تو ہم کیا کر پاتے، بڑے تیر مار لیتے۔ یہ بات مشتبہ ہے لیکن دلِ ناتواں مقابلہ تو کرتا۔ چاہے براتیوں کو اس ندی میں ڈبو دیا جاتا جو منجھولی کے پاؤں دھوتی ہے۔ اس وقت تو براتیوں نے منھ لٹکا لیا تھا، دولہا میاں پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خاندان کی جگ ہنسائی ہوئی تو ہوئی لڑکی نے اپنی شخصیت کو مٹنے نہیں دیا۔ اس نے اس مبنی بر انصاف اصول کو منوا کے چھوڑا کہ سماج شادی کو جو چاہے کہے، چاہے وہ لڑکی کو بطور دان ایک اجنبی کو دینے پر تل جائے، پرکھوں کی ریت چاہے یہی رہی ہو

لیکن بیسویں شتابدی کی پڑھی لکھی لڑکی کسی کے گلے نہیں باندھی جائے گی۔ وہ اپنی مرضی کے بغیر شادی نہیں کرے گی۔ برا اچھا ہو یا برا، اس کے لیے یہ مسئلہ زیر بحث ہے ہی نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ سماج کو یہ اختیار کس نے دے دیا کہ لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے بنا کر دے وہاں تو خدا خدا کرکے دلہن کو برآمد کر لیا گیا منا لیا گیا لیکن تب ہی جب اس نے اپنے والدین اور اپنے معاشرہ سے اپنے جیون ساتھی کو منتخب کرنے کا حق کو منوا لیا۔ مگر اس دوسری برات کے دولہا کو منا لینا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ لالہ مہیشور دیال نہیں آئے پر نہیں آئے اس زمانے میں جو خلطِ مبحث کا دور ہے۔ دلی ہندی اکیڈمی والے یہ نہ سمجھ پائے کہ برات کے دولہا لالہ مہیشور دیال ہیں، تیری مارکنڈے سنگھ نہیں ہیں۔ علمی تقریبوں میں دعوت دینے والے جنھیں احترام کے ساتھ بلاتے ہیں ان کے ساتھ اکثر زیادتی کرتے ہیں۔ ان سے بغیر پوچھے ان کا نام صدر یا مہمان خصوصی یا منجملہ ممتاز شریکوں کے چھاپ دیتے ہیں۔ تاکہ ان کا نام دیکھ کر خلقت شریک ہو جائے۔ وہ بیچارے اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اگر نہیں آپاتے تو رسوائی ان ہی کی ہوتی ہے۔ حاضرین کہتے ہیں کہ "وعدہ کیا ہوگا جبھی تو نام چھپا"، ان بڑے آدمیوں سے خدا بچائے، دیکھیے وقت پر دھوکا دے دیا نا؟ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بلانے بھی نہیں اور نام چھاپ دیتے ہیں۔

ہماری برات کے دولہا نے ان لوگوں کو سبق سکھا دیا لیکن جہاں ہر شخص اپنے کو افلاطون سمجھتا ہو وہاں سبق کون سیکھتا ہے؟

بعد میں ایک روز دیال صاحب نے فون کرکے جلسے کی روداد پوچھی۔ میں نے کہا آپ کی جگہ خالی رہی لیکن آپ کے نہ آنے سے ہمارا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ آپ کے متعلق کھل کر بات کر سکے۔ آپ ہمارے سامنے ہوتے تو منہ پر تعریف کرتے ہوئے حجاب آتا۔ دولہا ساتھ نہ ہو تو براتی کھل کھیلتے ہیں۔ پھر کہاں کی بندشیں اور کیسی پابندیاں۔ کسے اندیشہ تھا کہ جس دولہا کی برات کا ذکر ابھی مزے لے لے کر کیا جا رہا تھا وہ اتنی جلدی لکڑی کے گھوڑے پر سج بن کر شمشان گھاٹ کی طرف رہسپار ہو جائے گا۔

آں کہ بر اسپ طرب شاہ صفت می دیدی
بین کہ بر مرکب چوبین بہ چہ سان می گذرد

[جس شخص کو ابھی تم خوشی اور نشاط کے گھوڑے پر شاہانہ انداز سے سوار دیکھ رہے تھے، دیکھو تو اب وہ لکڑی کے گھوڑے پر کس طرح سے جا رہا ہے]۔

ہر آں کہ زاد بہ ناچار بایدش نوشید
ز جام دہر مے کل من علیہا فان

[جو شخص بھی پیدا ہوا ہے اسے زمانے کے جام سے ناچار فنا کی شراب پینی پڑے گی]۔

لالہ مہیشور دیال کچھ بھی ضائع کرنے کے قائل نہ تھے نہ زر کو نہ وقت کو۔ ٹیلی فون پر بات کیجیے تو اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ گفتگو کو بے مصرف طول دینا نہیں چاہتے۔ مالی اور قانونی گتھیوں کو وہ تدبیر اور تجربے کے ناخنوں سے بڑی رسانیت اور خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھا دیتے تھے۔

ایک فاؤنڈیشن ہم لوگ چلا رہے ہیں جو ضرورت مند اہل قلم اور اہل فن اور صحافیوں کے آڑے وقت میں ان کی مدد کرتی ہے۔ مزید یافت کا دروازہ اس انجمن پر بند ہو گیا ہے۔ لہٰذا اب اس کی بیٹھک بہت کم ہوتی ہے۔ ابھی دو ماہ ہوئے، رفقا کم باغ میں

جو قرۃ العین حیدر صاحبہ کا دولت کدہ ہے، اس کی ایک میٹنگ ہوئی۔ چلتے وقت میں نے کہا کہ اب چھ ماہ کے بعد پھر ملیں گے۔ مہیشور دیال صاحب نے کہا اتنے دنوں بعد نہیں جلد جلد ملنا چاہیئے۔ ان سے یہ آخری ملاقات تھی۔ کیا پتہ تھا کہ اب ان سے ملنے کے لیے اسی راہ سے جانا ہوگا جو انھوں نے اچانک اختیار کرلی۔

جن لوگوں کی عمر، کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے ان پر اپنے احباب، کرم فرماؤں اور رفیقوں کی رحلت کا کچھ زیادہ ہی اثر ہوتا ہے۔ ایک تو ان کی جدائی دوسرے یہ خیال کہ اب ہماری باری ہے اور اگر احباب اور آشناؤں میں سے کوئی بغیر اطلاع یعنی بغیر طویل علالت کے چلا گیا تو اور دھکہ لگتا ہے کہ یہ تام جھام سب دھرا رہ جائے گا، سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا۔ بلاوا آئے گا تو ایک پل کی مہلت نہ ملے گی۔ کوچ کی گھنٹی بجنے نہ پائے گی اور سفر شروع ہو جائے گا۔

دو باتیں اکثر اوقات رسمًا یا اخلاقًا کہہ دی جاتی ہیں۔ زندوں کے لیے کہ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہے؛ جو لوگ چلے گئے ہیں ان کے لیے کہ ان کی جگہ اب پُر نہ ہوگی۔ لالہ مہیشور دیال کے لیے کہ دونوں باتیں رسمًا اور اخلاقًا نہیں لفظًا اور معنًا صحیح ہیں۔ ان کی حیثیت ایک پُل کی تھی۔ یہ پل ایک طرف ہندوستان اور اس کے دارالسلطنت کے ماضی اور حال کو ملاتا تھا۔ دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو جوڑتا تھا۔ ان کو دیکھ کر دلّی کی گنگا جمنی تہذیب اور اس کی لطافتوں، شرافتوں، رواداریوں، رافتوں، پاسداریوں اور شائستگیوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ خدا ان کی روح کو سکون عطا فرمائے۔ وہ اس برات کا نوشہ تھا۔ اس کے مرنے سے مر گئی دلّی۔ یعنی وہ عالم میں انتخاب دلّی یہ دلّی نہیں جو اژدہام کدہ اور عجایب گھر بن گئی ہے۔

لالہ مہیشور دیال سے مجھے شرفِ نیاز تو بہت پہلے حاصل ہو چکا تھا لیکن ربط وضبط مذکورہ فاونڈیشن میں آنے کے بعد بڑھا۔ اس انجمن نے ماہ وانجم جمع کر لیے تھے۔ اس کی طرف آج اشارہ ہو گیا ہے۔ تفصیل سے اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ صد حیف سال بھر کے اندر کئی ستارے ٹوٹ گئے:

۱۔ جناب عابد علی خاں

۲۔ پروفیسر حکم چند نیّر

۳۔ لالہ مہیشور دیال۔

مسلم یونیورسٹی کے سائنٹسٹ کو ایوارڈ

ہمیں یہ اعلان کرنے میں انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر محمد کامل کو جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری کے ڈرگ اسٹینڈرڈائزیشن ریسرچ یونٹ سے منسلک ہیں، انڈین کیمیکل سوسائٹی کی جانب سے ۱۹۹۳ء کا کنوینشن ایوارڈ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس سے قبل بھی متعدد انعامات حاصل کر چکے ہیں جن میں دو بار کامن ویلتھ ایوارڈ (۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۳ء) اور ینگ مسلم سائنٹسٹ ایوارڈ ۱۹۸۹ء خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت ڈاکٹر محمد کامل کو ان کی اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہے اور دعاگو ہے کہ آئندہ بھی وہ اپنی مادرِ علمی کا نام روشن کرتے رہیں گے۔

کردار کشی

محمد مختار اصلاحی *

کسی شخص پر غلط اور بے بنیاد الزامات لگاکر یا کچھ کمزوریوں کو اچھال کر اس کی عزت کو بٹہ" لگانا اور وقار کو مجروح کرنا" کردار کشی" ہے۔ یہ بُری عادت کچھ نہ کچھ تو ہر زمانے میں پائی جاتی رہی ہے لیکن موجودہ دور میں اخلاقی گراوٹ اور غیر معیاری سیاست کے طفیل اب ہر جگہ اس کا چلن عام ہوگیا ہے۔ ہمارے دیس میں جہالت، غربت، خود غرضی، فرقہ پرستی اور گھٹیا سیاست کی وجہ سے "کردار کشی" کا زور نسبتاً کچھ زیادہ ہی ہے۔ ہنگامی حالات، لڑائی جھگڑے اور الکشن کے وقت ایک فریق دوسرے فریق کو اور ایک لیڈر دوسرے لیڈر کو رسوا و بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ آج کل سیاسی بازی گروں کا یہ ایک عام مزاج بن گیا ہے کہ کسی مقصد کے تحت یا کسی جماعت میں ایک ساتھ برسوں کام آتے رہیں گے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک لیکن جہاں کہیں کسی مسئلے میں اختلاف ہوا یا اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہوئی تو پھر دفعتاً ایک دوسرے کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی کمزوریاں اور برائیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر باہر نکالی جائیں گی اور ایک فریق دوسرے سے اس طرح پیش آئے گا جیسے ان میں کبھی کوئی رسم و راہ ہی نہ تھی۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں کردار کشی کا فن اس درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے کہ بڑے بڑے عہدے داروں اور مملکت کے صدور تک کو اس کے استعمال میں کوئی جھجک و شرم محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارے ملک میں ابھی تمسکات گھپلے کے سلسلے میں کردار کشی کا جو شرم ناک ڈرامہ کھیلا گیا جس میں بڑے بڑے نیتا اور وزیر اعظم تک اس کی لپیٹ میں آئے۔ اسے دیکھ کر ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ اس برائی نے اب ایسی بھیانک اور خطرناک شکل اختیار کرلی ہے کہ نیچے سے اوپر تک کوئی بھی اس کے بُرے اثرات سے محفوظ نہیں۔ کچھ دوسرے ملکوں میں بھی کردار کشی و الزام تراشی کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور اب تو یہ مرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ نچلی اور سیاسی سطح کے لوگوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ہمارے علما و فضلا، مذہبی رہنما، اساتذہ اور اہل قلم جن کے بارے میں کل تک یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کبھی کبھی اس طرح کی عادت بد میں مبتلا ہوسکتے ہیں اب ان میں سے بھی کچھ لوگ اس موذی مرض میں

---

* اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ۔ بمبئی، مہاراشٹر

مبتلا نظر آتے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے بہت سے مذہبی و تعلیمی ادارے بھی اس گندگی و لعنت سے پاک و صاف نہیں۔

اسی طرح بعض کنبے اور خاندان میں بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب تک گھر میں ایک ساتھ رہتے ہیں تو اس وقت تک محبت و یگانگت کی ساری مٹھاس ان کے اندر بھری رہتی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ ان میں سے کسی کو بھی ترچھی نظر سے دیکھ سکے لیکن جہاں کسی وجہ سے علیحدگی ہوئی تو پھر نہ پوچھیے جو کل تک سب سے میٹھا تھا وہی اب سب سے کڑوا ہو جاتا ہے۔ کل جس کی ایک ایک ادا پسند تھی اب کوئی ایسی خرابی نہیں جو اس میں نہ پائی جاتی ہو۔

انسانی زندگی میں کردار کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ایک مضبوط کردار ہی انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس لیے جب کوئی شخص انسانیت کے اس مستحکم قلعہ کو منہدم کرنے کی جرأت کرتا ہے تو یقیناً وہ ایک سنگین جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ دانش وروں کا کہنا ہے کہ کردار کشی کرنے والا صرف ایک ہی کو نہیں بلکہ بیک وقت تین آدمیوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ سب سے پہلے اپنے آپ کو۔ دوسرے جس کی کردار کشی کرتا ہے تیسرے اس شخص کو جو اس کی باتوں پر یقین کرتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس کے نقصانات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے۔ ذیل کے نقصانات خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں:

۱۔ جو شخص کسی کی کردار کشی کرتا ہے سب سے پہلے وہی عوام کی نظروں سے گر جاتا ہے اور سماج میں اس کی کوئی عزت اور وقعت باقی نہیں رہتی۔

۲۔ کبھی لگائے گئے الزامات جب ثابت نہیں ہوتے تو ہتکِ عزت کے جرم میں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی ہے۔

۳۔ جس کی کردار کشی کی گئی ہے اگر وہ زیادہ طاقت ور ہے تو بسا اوقات مارپیٹ اور قتل و خوں ریزی کی بھی نوبت آجاتی ہے۔

۴۔ بہت سے حساس و غیور اشخاص اپنے اوپر لگائے گئے الزامات سے بددل ہو کر اپنی اہم ذمہ داریوں سے الگ ہو جاتے ہیں جس سے ایک اہم مقصد کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۔ کردار کشی کی لعنت صرف افراد ہی میں نہیں اچھے بھلے معاشرے میں بھی ایسی خرابی پیدا کر دیتی ہے جو بالآخر اسے نکما و کمزور کر کے رکھ دیتی ہے۔

۶۔ قوم و ملک کے بہت سے اہم ادارے بھی کردار کشی کے خطرناک زہر کا شکار ہو کر اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی کارکردگی و ترقی بری طرح متاثر ہو جاتی ہے۔

تدارک کیجیے:

جس گھر اور ماحول میں تعلیم و تربیت کا صحیح طور سے بندوبست نہیں ہوتا اور اخلاقی قدروں کا احترام نہیں کیا جاتا زیادہ تر وہیں یہ اخلاقی کمزوری پائی جاتی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس طرح کی کمزوریوں اور خرابیوں کو پیدا ہونے کا موقع ہی نہ ملے تو سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ گھر میں تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زیادہ زور دیا جائے اور ماحول کو پاک و صاف رکھا جائے۔

کردار کشی جب کسی کی عادتِ ثانیہ بن جائے تو

بڑی مشکل سے دور ہوتی ہے لیکن دینی و اخلاقی کتابوں کے مطالعہ اور نیک و صاحب کردار لوگوں کی صحبت اختیار کرکے اس بُری عادت سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس بُرائی سے بچنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان خود اپنا جائزہ لیتا رہے اور کسی پر الزام لگانے سے پہلے اسے بار بار یہ سوچنا چاہیے کہ اگر لگائے گئے یہ الزامات ثابت نہ ہوسکے تو خود اس پر کتنا بُرا اثر پڑے گا۔ کمزوریاں تو ہر ایک میں کچھ نہ کچھ پائی جاتی ہی ہیں۔ اگر دوسرا بھی اس کی کمزوریوں کو ظاہر کرنے پر آمادہ ہوجائے تو اس کی عزت بھی خاک میں مل سکتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ نہ کسی پر گندگی اچھالی جائے اور نہ دوسروں کو اپنے اوپر اچھالنے کا موقع دیا جائے۔ فارسی کی مثل مشہور ہے " چاہ کن راہ چاہ درپیش" یعنی جو کسی کے لیے کنواں کھودتا ہے خود اس کے سامنے بھی کنواں آتا ہے۔ اس لیے عقل مندی یہی ہے کہ نہ کسی کے لیے کنواں کھودا جائے اور نہ کسی دوسرے کو اپنے لیے کنواں کھودنے کا موقع دیا جائے۔ اس خرابی کو روکنے میں حکومت وقت، با اثر شخصیتیں اور اخبارات سبھی اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ اس بڑھتی ہوئی وبا کے پیش نظر اب بعض ممالک نے الیکشن کے موقع پر کردار کشی کو غیر قانونی قرار دیا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ صرف الیکشن ہی کے موقع پر نہیں بلکہ اس لعنت کو ہر حالت میں ممنوع قرار دیا جائے تاکہ اس کے خطرناک نقصانات سے بچا جاسکے۔

" سر سید اعتراضات کی آندھیوں میں بھی ثابت قدم رہے اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، امام غزالیؒ، شیخ احمد سرہندیؒ مجدد الف ثانیؒ اور دوسری ان تمام متبرک اور پاک ہستیوں سے روحانی قوت حاصل کرتے رہے جو اپنے زمانوں میں کفر و الحاد کے فتووں سے نوازے گئے۔"

——— ایس۔ کے۔ بھٹناگر۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۱۱ (نومبر ۹۳ء)

احمد رشید شیروانی اور ان کے نونہال

ریاض الدین احمد ★

عین اس وقت جب ملک میں یہ ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں ہی کے اسکول کوڑا خانہ ہیں اور مسلم طلبا ہی ناکارہ ہیں۔ احمد رشید شیروانی اعداد و شمار کی روشنی میں یہ اعلان کر رہے ہیں کہ کوڑہ خانے میں موتی چھپے ہوئے ہیں اور نا اہلوں میں باصلاحیت بچوں کی کمی نہیں ہے مگر ہے کوئی جو ریاض کر کے انھیں زینت قوم و ملت بنا دے۔ ٹیلنٹ (Talent) کی تلاش کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ مغربی ممالک میں اس تلاش پر ہزاروں ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ یہاں ایک شخص واحد ملت سے کوئی مطالبہ کیے بغیر ہونہار طلبا کی ایک فہرست سالہا سال سے پیش کیے جا رہا ہے اور اچھے تعلیمی اداروں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس عظیم خام مواد کو جو ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے کسی عظیم تعلیمی منصوبے کا نشانہ ہم نہیں بنا سکے اور نہ ہم نے گزشتہ نصف صدی میں کبھی ملت کے تعلیمی حالات اور ان کی مشکلات کا کوئی جائزہ لیا۔

ہم ان کو صرف مشورے دیتے رہتے ہیں کوئی منصوبہ نہیں پیش کرتے اور مشوروں کی بہتات ہے۔ مرلی منوہر جوشی سے مولانا عبد الوحید خاں تک مشوروں کو اکٹھا کیا جائے تو تضاد فکر کی ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ ملت کیا قبول کرے اور کیا نہ کرے یہ اہم سوال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انتشار سے زیادہ ہم سازش کا شکار ہیں۔ سازش یہ ہے کہ مسلمانوں کو، ان کی کتاب کو، ان کے مذہب کو، ان کی ہر چیز کو بُرا کہتے رہو اور اتنا بُرا کہو کہ بُرائی اُن پر چپک کر رہ جائے۔ آج آپ کوئی قومی اخبار ملاحظہ فرمائیں تو دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے ہر ہر گوشۂ زندگی پر تنقیصی مضامین کا ایک سلسلہ جاری ہے۔ ہمیں یہ تمنا رہ گئی کہ کوئی مضمون کسی اسلامی شعار کی مدح میں پڑھنے کو ملتا۔ غضب یہ ہے کہ خود مسلمان مفکر بھی قلم اٹھاتا ہے تو ملت کی خود ساختہ پسماندگی کا رونا روتا ہے اور اسی دھارا میں بہنے لگتا ہے جو یارانِ وطن اور قومی میڈیا نے بہا رکھی ہے۔ درحقیقت وہ انہی کے تصور کی ہم نوائی کرتا ہے۔

لیجیے ایک زندہ مثال پیش کر رہا ہوں۔ دہلی کے چند منچلوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا ایک جائزہ لیا اس جائزے کی رپورٹ شاہ سرخیوں کے ساتھ ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوئی۔ اس میں صرف ایک تصور ابھارا

★ 822 A/2 نور اللہ روڈ، الہ آباد۔

گیا تھا کہ ان کی پسماندگی کا اصلی سبب اردو میڈیم ہے اور اسی نا عاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے کہ ۱۹۹۳ء کے ہائر سکنڈری امتحانات میں کل ہند سطح پر مسلمانوں کی ناکامی ۷۰ رفیصد اور اتر پردیش میں ۴۷ رفی صد آئی ہے۔
محترم مفکرین کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اتر پردیش میں تو عرصہ ہوا اردو میڈیم نے دم توڑ دیا اور یہاں تعلیمی بورڈ کے امتحانات میں اردو میڈیم کا ذکر ہی نہیں ہے۔ رہا جنوبی ہند کا معاملہ تو وہاں اردو پھل پھول رہی ہے اور وہاں کے مسلمان بھی کچھ ایسے پس ماندہ نہیں ہیں جتنے یہاں ہندی بیلٹ کے۔ بلکہ حکومت کی اصل پریشانی یہ ہے کہ ایک جنوبی ہند کے طالب علم نے اردو میڈیم لے کر آئی۔ اے ایس کے امتحان میں ٹاپ کیا۔ دوسری پریشانی عربی فارسی سے تھی کہ ان کی مدد سے مسلمان امیدواروں کو مقابلے کے امتحانات میں میرٹ حاصل کرنے میں آسانی ہو جاتی تھی تو یہ ناقص راستہ فوراً بند کر دیا گیا اور دونوں مضامین سول امتحانات کی فہرست سے نکال دیے گئے۔
اب یو۔پی کے مسلمانوں کی ۴۷ رفی صد ناکامی کو خود ان کی نا عاقبت اندیشی سے جوڑا جا رہا ہے۔ اخبارات میں مضامین اور اداریے شایع ہو رہے ہیں لیکن اسی سال انٹرمیڈیٹ بورڈ کے ہائی اسکول امتحانات میں فیل ہونے والے کل لڑکوں کی تعداد ۸۳ رفی صد تھی۔ بین السطور اسی اخبار نے ایک دن قبل شایع کر دی تھی۔ ان کی ناکامی کو حکومت کی ناقص تعلیمی پالیسی سے جوڑا جا رہا ہے۔ پورا میڈیا حکومت کو مورد الزام قرار دے رہا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مسلمان اپنی نا عاقبت اندیشی سے فیل ہو رہے ہیں اور دوسرے حکومت کی غلط تعلیمی پالیسی کا شکار ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ مسئلہ صرف سازش کا نہیں ہے بلکہ سازش کو توڑنے کا ہے۔ اگرچہ ہم سازش کا شکار ہیں تو اکثریت بھی بالکل آزاد نہیں ہے۔ فرق یہ ہے کہ سازش سے نکلنے کے لیے وہ کچھ سوچ رہے ہیں کچھ کر رہے ہیں ہمیں بھی کرنا ہوگا۔ خالی مشوروں سے کام نہیں بنتا۔ لہٰذا اس بارے میں میں ملت کو حسب ذیل نکات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ انھی حالات میں وہ کیا کر رہے ہیں، ہم کیا کریں۔

۱۔ وہ اپنے فرقے کی تعلیمی کمزوریوں کو برسر میڈیا اچھال کر ان کی ہمت شکنی نہیں کرتے ہمارا عمل اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمیں اپنے طریقے میں تبدیلی کرنا ہوگی۔ تنقیص کے بجائے تدبیر کی بات کرنا ہوگی۔

۲۔ انھوں نے اپنے ذہین طلبا کے لیے الائٹ (ELITE) اسکول قایم کر دیے ہیں۔ پورے اتر پردیش میں زیادہ سے زیادہ ایک درجن الائٹ اسکول ہیں بورڈ کے امتحانات کی پوری میرٹ لسٹ (Merit List) انھی کے درمیان گھومتی ہے۔ ان بارہ کی بنیاد پر وہ پوری اکثریت کو اچھالتے رہتے ہیں۔

۳۔ الائٹ اسکول عام طور پر سرکاری گرانٹ کے تابع نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں اساتذہ ڈسپلن کی حدود میں رہتے ہیں اور معیار تعلیم کو برقرار رکھنے کی پوری ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ کرسچین اسکول تو زیادہ تر گرانٹ کے پنجۂ غصب سے باہر ہیں۔

مگر ہم لوگ گرانٹ سے چپکے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ استاد بے لگام ہیں۔ ایک مقامی اسکول میں برسوں سے ۴ر۵ اساتذہ نے کلاس نہ جانے

کا فیصلہ پرنسپل کی تقرری کے خلاف احتجاج کے طور پر کر دیا ہے۔ وہ پرنسپل ۱۲ یا ۱۵ سال کی مدت ملازمت ختم کر کے ریٹائر ہو گیا، احتجاج جاری ہے۔ اب دوسرا پرنسپل مقرر ہوا اس کے خلاف بھی وہی احتجاج جاری ہے بلا کام کیے پوری تنخواہ مل رہی ہے۔ مینجمنٹ کتنا ہی احتجاج کرے کوئی سننے والا نہیں۔ تنخواہ تو بابو دیتا ہے۔ اس افسر بالادست کو خوش رکھو، پھر آزاد ہو جاؤ۔ اکابرین ملت اسکول کو برا بھلا کہتے ہیں، اسکول کے مسایل حل نہیں کراتے سرپرستوں کے کسی حلقے نے افسروں سے یہ نہیں پوچھا کہ ان ٹیچروں کو مفت تنخواہ کیوں دی جا رہی ہے اور ان کے بچوں کے تعلیمی بحران کا ذمہ دار کون ہے؟

بمبئی کی ایک حالیہ اقلیتی تعلیمی کانفرنس میں اکابر ماہرین تعلیم، ہائی کورٹ کے سابق ججوں اور اقلیتی کمیشنوں کے سابق ممبروں نے مل کر اقلیتی حقوق کی پامالی کا ایک بھرپور جائزہ لیا اور بالآخر اقلیتی اداروں کو یہ مشورہ دیا کہ سرکاری گرانٹ کے چنگل سے نجات حاصل کریں کیونکہ اس کی حیثیت سائنائیڈ کیپسول (Cy nide capsule) کی ہے۔

اس کانفرنس نے اقلیتی اداروں کے منتظمین کو یہ انتباہ دیا کہ

"دشمن ہمارے دروازے پر نہیں ہے بلکہ گھر کے اندر داخل ہو چکا ہے اگر ہم نے باہمت مزاحمت نہ کی تو وہ ہمیں لقمۂ اجل بنا لے گا۔"

۴- چوتھا کام ٹیلنٹ کی تلاش ہے وہ اپنے ٹیلنٹ تلاش کرنے پر فکر اور دولت صرف کر رہے ہیں۔ ہمیں کوئی ٹیلنٹ تلاش کر کے دے بھی دیتا ہے تو ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ امریکہ کی ڈیوک یونیورسٹی یہ کام نچلی سطح سے کرتی ہے صرف ریاست ٹکساس میں ساتویں درجے کی سطح کے پچاس ساٹھ ہزار بچے بچیاں ٹیلنٹ کے ابتدائی امتحان میں شریک ہوتے ہیں۔ ان میں سے جو چن لیے جاتے ہیں ان کی ہمت افزائی اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہے۔ ایسے بچوں کو میرٹ کا سرٹی فیکٹ صدر جمہوریہ کے دستخط خاص سے جاری ہوتا ہے اور ان بچوں کو ریاستی دار الحکومت آسٹن (Austin) میں بلا کر شاندار استقبالیہ پیش کیا جاتا ہے اور انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔

قطر کے دار السلطنت دوحہ میں ان بچوں کی ہمت افزائی کا ایک بہت سادہ اور کم خرچ طریقہ یہ تھا کہ درمیان سال کے امتحانات کے بعد میرٹ لانے والے بچوں کو مع ان کی ماؤں کے کسی ریکریئیشن ہال (Recreation Hall) میں بلا کر استقبالیہ دیا جاتا ہے۔ مائیں اس موقع کے لیے تحائف اور مرغوب کھانے کی چیزیں تیار کر کے لاتی ہیں اور وہ بچوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔

اس پس منظر میں ایک ترقیاتی تعلیمی منصوبہ ملت اسلامیہ کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ مفکرین تعلیم اور ماہرین تعلیمات غور فرمائیں۔

۱- والدین، طلبا اساتذہ اور منتظمین میں ہمت افزائی کی روح پھونکی جائے، خوبیوں کو ابھارا جائے اور کمزوریوں کے ساتھ ہمدردانہ روش اختیار کی جائے۔ احمد رشید شیروانی کے اعداد و شمار میں طنز بھی ہے، تنقید بھی ہے مگر دامن توصیف کو لپیٹ کر الگ نہیں رکھ دیا گیا ہے۔

۲۔ مسلم تعلیمی تنظیموں اور اداروں کے مسایل کا ایک جائزہ لیا جائے اور ان مسایل کو حل کرنے کے لیے سیاسی، علمی اور مالی تعاون کو پوری طرح استعمال کیا جائے۔

۳۔ مسلم یونیورسٹی سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ احمد رشید شیروانی کے ہزاروں نونہالوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کر کے ایک ٹیلنٹ ٹیسٹ (Talent Test) نظم قایم کرلے اور ان میں سے اعلیٰ صلاحیت کے بچوں کو چنا جائے

۴۔ ہر ضلع میں نہیں تو کم از کم ہر مرکزی مقام پر ایک ٹیلنٹ اسکول (Talent School) کھولا جائے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ٹیلنٹ ٹیسٹ میں جو بچے کامیاب ہو گئے ہوں وہ کسی نہ کسی قریبی مرکزی ٹیلنٹ اسکول (Talent Schools) میں داخل کیے جائیں۔ غریب طلبا کے لیے اہلِ خیر سرپرست تلاش کیے جائیں جو ان کے پورے اخراجات کی ذمہ داری لیں۔

۵۔ ایڈیڈ (Aided) مسلم اسکول اور کالجوں کی اصلاح کے لیے صرف دو راستے ہیں:

(الف) والدین کی ایک زندہ جماعت ہر شہر میں ہو وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے پس منظر میں استاد اور منیجمنٹ سے مواخذہ کرتی رہے۔ ہر چند کہ اساتذہ اور منتظمین دونوں کے لیے ایسی جماعت باعثِ تشویش ہو سکتی ہے۔

(ب) تنخواہوں کے نام جو زبردست دفتری کرپشن پھیلا ہوا ہے۔ اس کے خلاف مضبوط محاذ قایم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر داخلی اصلاح اور اساتذہ کی ڈسپلن پر قابو پانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۱۸۸۲ء میں جب کہ لوکل سیلف گورنمنٹ بل کونسل میں پیش ہوا تھا تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے اور مختلف رسم و رواج کے لوگ آباد ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ بورڈ کی کچھ نشستیں، اس طریقے پر پُر کرنی چاہییں تاکہ ایسے آدمیوں کو حکومت منتخب کرکے کچھ پوری کر دے تاکہ جو کسی مخصوص فرقے کے نمائندے تو ہیں لیکن انتخاب میں نہیں آسکے ہیں۔

——— ڈاکٹر راجندر پرشاد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲ - شمارہ ۱۱ (نومبر ۱۹۹۳ء)

آغاز فلسفۂ اسلامی

اور مسئلہ جبر و قدر

ذوالفقار احمد*

تہذیب الاخلاق کے مارچ ۱۹۹۱ء کے شمارے میں ایک مضمون "مسلم فلاسفی کا سرچشمہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا بہت ہی جامع اور معلوماتی مضمون تھا۔ مضمون نگار نے ALIGARH JOURNAL OF ISLAMIC THOUGHT کے شمارے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئے مضمون POST IBN RUSHD کا حوالہ دے کر اس کے کچھ پہلوؤں پر اعتراض کرتے ہوئے بڑی خوبی سے مضمون کو آگے بڑھایا ہے میں یہاں علم کلام کے آغاز و ارتقا پر دوسرے رُخ سے روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

ہر مہذب قوم زندگی اور کائنات کے عقدہ ہائے سربستہ کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ چند خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے جو اس قوم کا فلسفہ کہلاتا ہے۔ اہلِ عرب اور دوسری مسلمان قوموں نے بھی اپنی تمدنی ترقی کے دور میں فلسفیانہ مسایل پر غور کیا ہے۔ اختلاف کے باوجود ان کے خیالات میں اتنا اتحاد ضرور پایا جاتا ہے کہ سب نے اسلام کو ایک اہم حقیقت جان کر اسے اپنی اپنی فہم کے مطابق اپنے نظام فلسفہ میں جگہ دی ہے۔ ان تمام فلسفیوں کے خیالات کو ایک سلسلہ قرار دے کر اسلامی فلسفے کے نام سے موسوم کیا ہے۔

ایک عجیب صورت حال پیدا ہوئی کہ مسلمان حکمت کو مذہب کا مخالف سمجھ کر اسے چھوڑ بیٹھے۔ یوروپ کے مستشرقین نے اپنی بساط کے مطابق دادِ تحقیق دی ہے لیکن ان کی تحقیق ابھی بالکل ابتدائی ہے۔

ابتدا میں یونانی فلسفہ اور مذہب کی کتابوں کے ترجمے عربی، فارسی زبانوں میں ہوئے۔ اس سے بھی فلسفہ کی ابتدا مسلمانوں میں ہوئی۔ مسلمانوں میں تعلیم کا رجحان بھی بڑھا۔ ارسطو کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ شامی اور عرب ارسطو کو بہت دن تک محض منطقی کی حیثیت سے جانتے تھے۔

مترجمین میں زیادہ کام ابوزید حنین ابن اسحاق ۸۰۹ تا ۸۷۳ء، اس کے بیٹے اسحٰق ابن حنین اور اس کے بھتیجے ابن الحسن نے کیا ہے۔ ان مترجموں کو بہت بڑا فلسفی نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ ان میں زیادہ تر خلیفہ وزیر یا کسی اور جلیل القدر شخص کے حکم سے انھیں تصنیف

---

* شعبۂ فلسفہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تالیف کا اتفاق ہوتا تھا۔

علمی حلقوں میں اور شاہی دربار میں ہمیشہ ارسطو کی تصانیف کو ترجیح دی جاتی رہی جو ابتدا میں محض کتاب منطق کے چند رسالوں تک محدود سمجھی جاتی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ صرف منطق ایک نئی چیز ہے جو ارسطو نے دریافت کی۔ باقی چیزوں میں سقراط اور افلاطون سے بھی اتفاق تھا۔

ابتدا میں مسلمان علما، یونانی علمی تصانیف کرتے تھے اور اپنے پیش روؤں کی تقلید میں ڈوبے ہوئے تھے ان میں جدّت خیال کم تھی۔ ابتدائی مسلم حکما، یونانیوں کے علم کی برتری کے بہت قائل تھے۔ اِسلامی فلسفے کی تاریخ قطع نظر اور باتوں کے اس سبب سے قابل قدر ہے کہ اس میں ذکر ہے اس پہلی کوشش کا جو یونانی افکار کے نتائج کو قبول کرنے کے لیے اس سے بڑے پیمانے پر کی گئی جیسی قدیم مسیحی علمائے کلیسا نے کی تھی۔ یونانی فلسفے سے اس قدر متاثر ہونے کے باوجود مسلمانوں میں غور و فکر کا عنصر خاصا واضح رہا ہے جس سے ان کی الگ پہچان بھی بنی۔

محترم غوری صاحب نے اپنے مضمون مسلم فلسفے کا سرچشمہ جو مارچ ۱۹۹۱ء کے تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا تھا اس میں جن امور پر بہت گہرائی سے روشنی ڈالی ہے وہ بہت معلوماتی ہیں۔ ان کا کہنا درست ہے کہ چار مسایل یا موضوع زیادہ زیر بحث تھے۔

امامت۔ ارجا و وعید۔ جبر و قدر
مسئلہ صفات باری اور قرآن کے مخلوق یا
غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ

فلسفہ کے لحاظ سے مسئلہ جبر و قدر، مسئلہ ذات و صفات اور قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ خاص طور سے زیر بحث رہے اور ان کو فلسفہ کے قوانین کی رُو سے زیر بحث لایا گیا۔ دیگر مسایل خالص مذہبی تھے۔ ان کو اسی نقطۂ نظر سے زیر بحث لایا گیا۔

ان میں جبر و قدر کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل رہا۔ جیسا کہ غوری صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ جبر و قدر کا مسئلہ عہد صحابہ کے آخر میں پیدا ہوا کہ آیا بندہ خود اپنے افعال کا خالق ہے یا اللہ تعالیٰ۔ پہلی شق 'قدر' کہلاتی ہے اور دوسری "جبر"۔ بالکل درست لکھا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مسئلے پر سرسید احمد خاں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میرا مقصد اس پر کچھ روشنی ڈالنے کا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ جبر و قدر کا مسئلہ اِسلامی فلسفے میں خاص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ بنو امیہ کے زمانے میں ظلم و ستم کا بازار گرم ہوا تو بعض بادشاہوں نے اور ان کے ہوا خواہوں نے اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اور اپنے مظالم اور کوتاہیوں کا جواز تلاش کرنے کے لیے مسئلہ جبر کا سہارا لیا۔ یعنی ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس میں مجبور ہیں۔ خدا ہم سے یہ افعال کرا رہا ہے۔ اس عقیدے کی جن لوگوں نے تائید کی وہ جبریہ کہلائے بعض صوفیوں نے بھی اس عقیدے کو اختیار کر لیا۔ رفتہ رفتہ عام مسلمانوں پر بھی اس عقیدے نے اثر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے عملی اور زندگی سے فرار کی ذہنیت عام ہونے لگی۔

اس عقیدے کے مقابل ایک اور عقیدہ جواب دینے کے لیے اسی دور میں یعنی بنو امیہ کے زمانے ہی میں اُبھر کر سامنے آیا جو قدریہ یا عدلیہ کہلایا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ خدا نے قرآن میں سزا و جزا کا وعدہ کیا ہے

اور خدا عادل بھی ہے۔ اس لیے اگر انسان کو اپنے فعل اور ارادے کا مختار نہ مانا جائے تو خدا پر ظلم کا الزام آئے گا کہ وہ مجبوروں کو ان کے فعل کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے آگے چل کر معتزلہ نے اس عقیدے کو اپنا لیا۔ چنانچہ انسان کا اپنے ارادے میں مکمل با اختیار ہونا ان کے بنیادی عقاید میں سے ہے۔

ان دونوں انتہا پسند نظریوں کے درمیان ایک تیسرا نظریہ وجود میں آیا اور وہ اشاعرہ کا نظریۂ بین الجبر والاختیار تھا۔ یہ تینوں گروہ اپنے نظریوں کی موافقت میں قرآن کریم سے استدلال کرتے ہیں۔

اشاعرہ کے نظریے کو اہمیت اس لیے ملی کہ وہ دونوں انتہا پسند نظریوں کے بیچ ایک اعتدال پسند نظریہ ہے جیسا کہ بین الجبر والاختیار سے ظاہر ہے۔

سرسید نے بھی اس مسئلہ کو اپنے غور و فکر کا مرکز بنایا۔ وہ بنیادی طور پر معتزلہ کے ہم خیال تھے لیکن ان کے خیالات کو معتزلہ کے نظریات کا تسلسل سمجھنا غلط ہے۔ اس سلسلے میں سرسید کا خاص اضافہ یہ ہے کہ وہ اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ عقیدہ جبر یا اختیار بین الجبر و اختیار کے متعلق قرآن سے استدلال کرنا اور اس کو ایک منزل من اللہ سمجھنا غلطی ہے۔ یہ ایک تمدنی طبعی اور عقلی مسئلہ ہے جس انسان کی فطرت اور خلقت کے لحاظ سے غور ہونا چاہیے۔ وہ آیات قرآنی جن سے عقیدۂ جبر کے متعلق استدلال کیا جاتا ہے ان کے متعلق سرسید کا یہ کہنا ہے کہ اس سے ان کی عظمت پر اثر پڑتا ہے۔ انسان کے مجبور یا مختار ہونے سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنے نظریۂ فطرت کی روشنی میں اس مسئلہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ وہ سائنسی تحقیقات کی رو سے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ماحول، صحبت اور تربیت وغیرہ کا انسانی افعال اور کردار پر اثر پڑتا ہے، وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ انسان کی خلقت یا جبلت سے بعض اعمال کے کرنے پر مجبور کرتی ہے لیکن ان سب کے باوجود وہ انسان میں ایک اور چیز بھی پاتے ہیں جو نیک و بد میں تمیز کر سکتی ہے جو انسان کو تمدنی ماحول رسم و رواج اور تربیت وغیرہ کے اثرات سے نکل آنے پر قادر بناتی ہے۔ وہ اس کو ایک روشنی بخشتی ہے۔ اس کو نور قلب یا نور فطرت سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کو ایک فکری قوت بھی مانتے ہیں۔ یہی قوت انسان کے با اختیار ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے ثبوت میں ایک دلیل تو وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حال اور اپنی فطرت پر غور کر کے سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اندر یہ قوت موجود ہے جس کو ہم ایک طرح انسانی فطرت کا نفسیاتی تجزیہ Psycho-analysis of human Nature کہتے ہیں۔ اس امر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سرسید کو اس نفسیاتی تجزیے کا بھی بہتر علم تھا یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسرے ایسے لوگوں کی مثالیں ہمارے علم میں آتی ہیں جو تمدنی و آبائی رسم و رواج کے بوجھ کو اپنے کاندھوں سے اُتار پھینکتے ہیں اور اپنے نورِ فطرت سے تاریک ماحول کو روشن کر دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو عرف عام میں پیغمبر یا ریفارمر کہا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ نیک و بد حق و باطل میں تمیز کرنے کی یہ قوت ہر شخص میں ہوتی ہے، کسی میں کم کسی میں زاید۔ اس کی وجہ سے ہر انسان مکلف ہے۔ اگر بالفرض کسی میں یہ قوت بالکل معدوم ہو تو وہ مرفوع القلم ہوگا۔ سرسید انسان کو مختار اور مکلف مان کر قضا و قدر کی یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ انسانی عمل تین سلسلوں کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔ ایک تو خارجی علل و اسباب کا سلسلہ دوسرے ہمارے نظامِ جسمانی کی مختلف کیفیتوں اور حالتوں کا سلسلہ۔ تیسرے ہمارے ارادوں کا سلسلہ۔ ان تینوں سلسلوں کے مجموعی اثر سے کوئی فعل ظاہر ہوتا ہے اسی کا نام قضا و قدر ہے۔ یہ خیال ہی مسئلہ جبر و قدر کے سلسلے میں سرسید کا Contribution ہے۔

(پہلی برسی کے موقع پر)

حکیم عبدالقوی دریابادی — کچھ یادیں کچھ باتیں

مفتی محمد خبیب ندوی *

اب سے چند سال پہلے کی بات ہے کہ جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بغرض تعلیم داخل ہوا تو لکھنؤ میں اس وقت جن صاحب کمال شخصیتوں سے ملاقات اور ان کے شرف دیدار کا متمنی تھا ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء، مولانا منظور احمد نعمانی، ڈاکٹر محمد آصف قدوائی اور محسن و مربی جناب حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی جنھیں اب رحمۃ اللہ کہنا پڑ رہا ہے، کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

میں نے داخلے کی تکمیل کے بعد سب سے پہلے حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ملاقات کی اور اس کے بعد خاتون منزل روانہ ہوگیا جہاں حکیم عبدالقوی صاحب قیام پذیر تھے۔ اگرچہ صدق جدید کے دفتر اور حکیم صاحب کے مطب کی بابت مجھے کچہری روڈ لکھنؤ پر واقع ہونے کا پتہ تھا لیکن خصوصی ملاقات گھر پر ہوا کرتی تھی۔ ۸۶ء میں پہلی بار جب میں نے حکیم صاحب سے ملاقات کی تو میں پہلی ملاقات ہی میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور حکیم صاحب سے ملاقات کے بعد مجھے واقعتاً ایسا محسوس ہوا کہ آج میں صحیح معنوں میں کسی صاحب علم اور اردو کے عظیم استاد سے مل کر آیا ہوں۔ پھر ندوہ میں قیام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے حکیم صاحب سے اور قریب کر دیا اور میں نے یہ معمول بنا لیا کہ ہفتہ میں تین بار عصر کے بعد حکیم صاحب سے ضرور ملاقات کرتا۔ اس بار بھی جب اکتوبر کے پہلے ہفتے میں رضوان لائبریری کے کام سے لکھنؤ جانا ہوا تو میں قیصر باغ سے اترتے ہی سب سے پہلے حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا گھر جا کر معلوم ہوا کہ بیماری شدید ہونے کے باعث ہاسپٹل میں زیر علاج ہیں۔ میں ہسپتال گیا اور بس معمولی سلام دعا کے بعد میں کچھ دیر تک وہیں رہا اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے کہ حکیم موصوف جلد شفایاب ہو جائیں، سلام کر کے وہاں سے رخصت ہوا (یہ ۷ر اکتوبر ۱۹۹۲ء کی بات ہے) پھر میں لکھنؤ سے واپس آکر اپنے لائبریری کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ میں ۱۱ر اکتوبر کا قومی آواز دیکھ رہا تھا۔ ابھی اخبار پر مکمل نظر بھی نہیں ڈالنے پایا تھا کہ یہ اندوہ ناک خبر پڑھنے کو ملی "حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا" یہ خبر کیا تھی ایک قیامت سے کم نہیں تھی۔ ویسے بھی موت کو قیامت صغریٰ سے احادیث میں تعبیر کیا گیا ہے۔

* جنرل سکریٹری، رضوان لائبریری، تمبور، سیتاپور۔

یہ دنیا فانی ہے یہاں جو بھی آیا ہے اسے جانا ہے اور انسانوں کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری و ساری ہے۔ چنانچہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس سال کتنے برگزیدہ اشخاص اور بزرگ ہستیاں ہم سے رخصت ہوگئیں مگر ان رخت سفر باندھنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ صرف مشکل سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ ان کی جگہ بھی مدت طویل تک خالی رہتی ہے حکیم صاحب مرحوم بھی ایسے ہی یگانۂ روزگار انسانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے ہمیشہ کے لیے جدائی اختیار کرلی۔ چنانچہ ان کے انتقال پُر ملال سے علم و ادب، صحافت و حکمت اور کھیل کے شیدائی کا نصف صدی سے زائد چمکتا ہوا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ اللہ رب العزت حکیم صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ حکیم صاحب نے اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ کر ہی وفات پائی لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی ان کی ضرورت ہم کو تھی کیوں کہ وہ آخر تک ایک متحرک زندگی کے مالک رہے۔ جوانوں کے مثل حوصلہ اور ہمت مندوں جیسی تازگی اور طراری ان کا امتیاز رہی۔ جہاں تک صحافت کا تعلق ہے تو حکیم صاحب مرحوم کو واقعتہً ایک کامیاب ادیب اور بے باک صحافی ہونا ہی چاہیے تھا کیوں کہ تربیت بھی ایسی شخصیت نے کی تھی جو ہر لحاظ سے معیاری اور مکمل تھی۔ چنانچہ پیدائش کے بعد ہوش سنبھالنے سے لے کر ایک مدت تک مولانا عبدالماجد دریابادی نے تربیت فرمائی تھی اور یہ قدرت کا کرشمہ ہی تھا کہ حکیم صاحب بھی اپنے چچا سے اتنا مانوس ہوگئے تھے کہ اپنی جائے پیدائش کے مقابلے میں چچا کی رہائش گاہ کو ترجیح دے کر مسلسل اپنے چچا کے پاس ہی اقامت اختیار کی۔ تربیت کی صورت یہ ہوئی کہ جب حکیم صاحب مرحوم ذرا بڑے ہوئے اور عقل نے خیر و شر کی تمیز پیدا کرنی شروع کردی تو مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے بھائی (حکیم صاحب کے والد محترم) جو اس وقت ڈپٹی کلکٹر تھے، سے کہا کہ بھائی جان! میں عبدالقوی کو حافظ قرآن بنانا چاہتا ہوں، اس زمانے میں حفظ قرآن کا آج کل کی طرح ماحول نہ تھا۔ پھر بھی حکیم صاحب کے والد محترم نے اپنے چھوٹے بھائی کو اجازت دے دی اور پھر دریاباد رہ کر ہی حکیم صاحب نے حفظ قرآن کی تکمیل کی۔ حفظ قرآن کے بعد لکھنو تشریف لائے اور یہاں طب اور عربی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو نوازتا ہے تو مشہور کہاوت کے مطابق چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ حکیم صاحب کے ساتھ بھی تقریباً یہی معاملہ ہوا کہ تربیت کے لیے مولانا عبدالماجد دریابادی جیسی شخصیت منتخب فرمائی تو عربی کی تعلیم کے لیے اپنے وقت کے نامور عالم دین مولانا خلیل عرب کا انتخاب فرمایا اور اس پر مزید یہ خاص فضل فرمایا کہ ممتاز عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسا رفیق منتخب فرمایا اسی لیے حکیم صاحب ان تمام عناصر کا مجموعہ سمجھے جاتے تھے۔ عربی کی تعلیم سے فراغت کے بعد جب حکمت کی تعلیم شروع کی تو اس وقت حکمت کی تعلیم کے مشہور اطبا حکیم عبدالحسیب، حکیم خواجہ شمس الدین اور حکیم عبدالعلی جیسے چیدہ چیدہ اطباء سے حاصل کی اور آخر میں حکمت کی پیاس بجھانے کے لیے حکیم محمد اجمل خاں مسیح الملک کے قائم کردہ طبیہ کالج دہلی سے فاضل الطب و الجراحت کی ڈگری حاصل کر کے ہی دم لیا۔

حکیم صاحب مرحوم نئی دہلی طبیہ کالج میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں بھی ہمیشہ کامیاب اور مثالی طالب علم کی حیثیت سے جانے اور پہچانے گئے اور اپنی تعلیم کے زمانے میں اس وقت کے اپنے تمام اساتذہ کی آنکھ کا تارہ اور منظور نظر بنے رہے ہر استاد آپ کو دل سے چاہتا تھا۔ حکیم صاحب نے پنجاب یونیورسٹی نیز لکھنؤ یونیورسٹی سے مختلف امتحانات دے کر امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔

سنہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ جب حکیم عبدالقوی صاحب دہلی طبیہ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ ان کے والد محترم اس وقت سہارن پور میں تعینات تھے۔ حکیم صاحب جب

کبھی سہارن پور تشریف لے جاتے تو اس وقت تازہ تحریکوں کے متعلق مکمل معلومات ضرور لے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۰ء میں جب تحریک سول نافرمانی چلی تو حکیم صاحب مرحوم اس سے بے حد متاثر ہوئے اور اس کا اچھا خاصا مواد اپنے ساتھ لیے پھرتے تھے۔

اخبار بینی :

حکیم صاحب مطالعۂ کتب اور اخبار بینی کے بہت زیادہ شوقین تھے حتیٰ کہ صبح جب تک اخبار دیکھ نہ لیتے چین نہ آتا اور اخبار پر مکمل نظر رہتی تھی اور ایک نظر پورے اخبار پر ڈال کر بعد میں تفصیل سے جو چیزیں ہوتی تھیں وہ پڑھا کرتے خود اپنا ذاتی مشاہدہ ہے کہ کئی بار ایسا ہوا کہ قومی آواز ہاتھ میں لیا اور سرسری مطالعے کے بعد مجھے عنایت فرمادیا لیکن صرف ایک سرسری نظر ڈالنے کے باوجود وہ اخبار کے تمام جزئیات پر مکمل عبور رکھتے۔ کیا مجال تھی کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی خبر ان سے رہ جائے یا چھوٹ جائے۔ اخبار بینی کے اتنے شوقین تھے کہ راستہ چلتے اخبار پڑھتے اور اس میں اتنا منہمک ہو جاتے کہ پاس پڑوس کی خبر نہ رہتی۔ انگریزی کی تعلیم بذات خود انھوں نے اپنی کوشش سے حاصل کی تھی اور وہ اپنی کوشش میں اتنا زیادہ کامیاب تھے کہ انگریزی کا مشہور اخبار اسٹیٹ مین (State man) ان کا بہت پسندیدہ اخبار تھا اس کو دیکھے بغیر چین نہ آتا۔

عقیدت و سلوک

حکیم صاحب اپنے کو نہایت کم تر سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے وقت کے مختلف بزرگوں سے عقیدت قایم کر رکھی تھی۔ چنانچہ حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، قطب الاقطاب حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا سہارن پوری رحمہم اللہ جیسے حضرات سے ان کو صد درجہ عقیدت تھی اور صرف عقیدت

ہی نہ تھی بلکہ محبت و عقیدت کے ساتھ فدائیت کی شان تھی۔ دار العلوم دیوبند کے مایہ ناز اور عظیم مہتمم حضرت مولانا حافظ و قاری محمد طیب صاحبؒ سے تو بہت زیادہ لگاو تھا۔ کیوں کہ دیوبند ان کا اپنا مسکن تھا اور حکیم صاحب دیوبند صرف قاری طیب صاحب سے ملنے کی غرض سے تشریف لے جاتے۔ اسی لیے حکیم صاحب قاری صاحب سے بہت زیادہ مانوس تھے اور ان کو اپنے دل میں بسائے ہوئے تھے۔ ان بزرگوں کا کرشمہ ہی تھا کہ وہ اس درجے مقبول ہوئے کہ بچہ بچہ حکیم صاحب سے مل کر فخر محسوس کرتا اور ملاقات کرکے اپنے کو خوش نصیب سمجھتا۔ نیز حکیم صاحب کا مسلم لیگ سے تعلق اور اس کی حمایت حضرت تھانویؒ کا اثر تھا جو انھوں نے اخیر تک قایم رکھی۔

اخلاص و للّٰہیت :

حکیم عبد القوی مرحوم ایک بہت مخلص، نیک دل، پاک باز، راسخ العقیدہ، دین دار، پرہیزگار اور بہت ہی زیادہ جفاکش انسان تھے۔ بے نفسی کا تو یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اوپر دوسرے کی خاطر بڑی سے بڑی تکلیف نہایت خندہ پیشانی سے برداشت فرما لیتے۔ ان کی پوری کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان کی ذات کی وجہ سے کسی کو کبھی کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ خود غرضی اور مفاد پرستی تو ان کے پاس سے بھی نہ گزری تھی۔ مروت اور غم خواری تو ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کتنے مریض ایسے تھے جو بے وقت آجاتے مگر کیا مجال تھی کہ مریض کو بغیر دیکھے لوٹا دیں۔ بعض اوقات تو خود کسی کو ساتھ لے کر مریض کے گھر تشریف لے جاتے اور مریض کو دیکھ کر آتے۔ مزاج میں بے نفسی، قناعت، سادگی اور بے طمعی اس درجے تھی کہ بعض اوقات ان پر درویش ہونے کا گمان ہونے لگتا تھا۔ لباس، طعام، بود و باش میں بھی بہت زیادہ سادگی

تھی، جو مل گیا سامنے آگیا بس کھالیا اور جو میسر آگیا، پہن لیا عام شیوہ تھا۔ بہت سی چیزیں جو خلاف طبع ہوتی تھیں، اس کو نہایت صبر و سکون سے اس طرح برداشت کر لیتے تھے کہ کسی کو اس کی ہوا تک بھی نہ لگتی تھی۔

اسلامی حمیت

حکیم صاحب صرف ایک سچّے، پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور اسلامی حمیت بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی شعائر کا بھی وہ بہت زیادہ خیال فرماتے تھے اور وہ اپنی اسلامی شناخت و اسلامی شعائر پر کسی بھی طرح کے حملے کو برداشت نہیں کرتے تھے خواہ کچھ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جولائی ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ اور کانگریس میں زبردست اختلافات رونما ہوئے اور بالآخر مسلم لیگ نے ملک کی تقسیم چاہی اور اپنے اس مطالبے میں شدت اختیار کی تو حکیم صاحب صرف اسلامی حمیت اور اسلامی جوش کی خاطر پورے طور سے مسلم لیگی ہو گئے اور صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ مسلم لیگ کے ترجمان روزنامہ "تنویر" کی ادارت قبول کی اور اس کے بعد "سیاست" اور "حق ڈیلی" کے ایڈیٹوریل بھی مسلم لیگ کی تائید میں لکھتے رہے جو ایک رائے عامہ ہموار کرتے تھے لیکن ان سب کے باوجود حکیم صاحب نے کسی کی ذات پر نہ تو کیچڑ اچھالی اور نہ ہی کبھی کچھ فرمایا، نہ ہی مضامین میں ان کو جگہ دے کر کانگریسی یا قوم پرور مسلم رہنماؤں کے خلاف سخت سست لکھا، جیسا کہ آج کل پریس کا دستور ہے کہ وہ اپنی ذاتی لڑائی کو بھی قومی لڑائی تصور کر کے رائے عامہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے کہ اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ حکیم صاحب ان باتوں کو بہت پست سمجھتے تھے۔

خدمت خلق

حکیم صاحب مرحوم اگرچہ اس صدی کے مشہور ترین حکیم شفاء الملک عبد الحبیب دریابادی کے خاص شاگرد تھے پھر بھی حکیم شفاء الملک ان کی تشخیص کے بہت زیادہ قایل تھے اور بہت کم ایسا دیکھا گیا کہ استاد اپنے شاگرد کی رائے یا تشخیص سے اختلاف کرتا یا اس کے نسخوں میں ترمیم و تبدیل کرتا۔ ۱۹۳۶ء میں جب حکیم مرحوم نے لکھنؤ میں اپنے مطب کا آغاز کیا تو اس وقت سے لے کر تادم آخر تقریباً ساٹھ برس تک مخلوقِ خدا کی جی جان سے خدمت فرماتے رہے اور اس خدمت کو سعادت سمجھ کر فرماتے یہی وجہ تھی کہ حکیم صاحب کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے شفا بھی بہت رکھی تھی اور یہ خدمت خلق کا جذبہ ہی تھا کہ اپنی ساٹھ سالہ پریکٹس کے دوران چالیس سال تک لکھنؤ سے دریاباد ہر جمعہ کو تشریف لے جاتے اور یہ خدمت اس وقت تک انجام دی جب تک کہ صحت سے معذور نہ ہو گئے دریاباد میں مریضوں کو دیکھتے اور نماز جمعہ پڑھاتے مگر مریضوں سے کبھی کوئی فیس نہیں مانگی۔ بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ فیس کی کوئی پرواہ بھی نہ فرماتے اور کیا مجال تھی کہ کبھی فیس کے بارے میں کسی سے کوئی اشارہ کریں مریضوں کے گھر گھر جانا ان کا عام شیوہ تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

تصنیف و تالیف:

حکیم صاحب، مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے صاحب قلم کے تربیت یافتہ تھے اس لیے ان کی خداداد صلاحیتوں کے جوہر حکیم صاحب میں منتقل ہونا لازمی تھے نیز حکیم صاحب کو مولانا عبدالماجد دریابادی کے بھتیجے ہونے کے ساتھ ساتھ دامادی کا شرف بھی حاصل تھا جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ یہی وجہ تھی کہ حکیم صاحب، مولانا دریابادی کی دینی، علمی اور صحافتی سرگرمیوں میں ان کے دست راست تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی مشہور زمانہ تفسیر قرآن موسومہ "تفسیر ماجدی" کی تیاری کے ہر ہر مرحلے، نظر ثانی

کتابت کی پروف ریڈنگ سے لے کر طباعت واشاعت
تک کے تمام مراحل میں پیش پیش رہے اور اس کی اشاعت
میں مولانا کا زبردست حصہ تھا۔ نیز اسی کے ساتھ ساتھ حکیم
صاحب مرحوم نے طب پر مختلف قسم کی کتابیں بھی لکھیں۔ خود لکھنو
کے ادارۂ فروغ اردو نے ان کی تصانیف شائع کیں۔ مرحوم
کی ایک تصنیف جو کلام اقبال کی شرح تھی اس کو ادارۂ فروغ
اردو لکھنؤ اور راجستھان اکیڈمی دونوں نے شائع کیا۔ جو
بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ حکیم صاحب وسیع المطالعہ ہونے کے
ساتھ ساتھ معلومات بھی ایک بیش بہا خزانہ تھے۔ حکیم صاحب
کے اسلوب میں مولانا دریابادی کا رنگ جھلکتا تھا۔

حکیم صاحب مرحوم اپنی ۹۰ برس کی عمر میں ملک اور
بیرون ملک کے بہت سے سیاسی اُتار چڑھاؤ، تحریکوں،
انقلابات، ترقیوں اور علم و ادب کے میدانوں اور اس
کے رجحانات کو بہت قریب سے دیکھ چکے تھے، جن کو اکثر وہ
دلچسپ اور حسین پیرایہ میں ہم لوگوں سے بیان بھی کرتے رہتے
تھے۔

صحافت:

حکیم صاحب نے چوں کہ لکھنے پڑھنے کا سلیقہ مولانا
دریابادی سے ہی سیکھا تھا اس لیے لامحالہ وہی معیار ہونا
چاہیے جو مولانا دریابادی کا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حکیم
صاحب کو شروع ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔
آزادی سے قبل لکھنؤ، کان پور، بمبئی وغیرہ سے شائع ہونے
والے مختلف اخباروں سے نہ صرف وابستہ رہے بلکہ
بہت سے اخباروں کے ایڈیٹر بھی رہے۔ شروع میں "تنویر"
کے ایڈیٹر ہوئے۔ اس کے بعد کان پور سے "سیاست جدید"
نکلنا شروع ہوا تو ایک مدت دراز تک اس کی ادارت کی
ذمہ داری نبھائی، پھر جب لکھنؤ سے ڈاکٹر فریدی مرحوم نے
۱۹۶۰ء میں روزنامہ 'قائد' شائع کیا تو ڈاکٹر فریدی صاحب کی طلب
تھی کہ حکیم عبدالقوی صاحب اس کی ادارت سنبھالیں مگر حکیم مرحوم نے انکار
کرنے کے باوجود ان کی دل شکنی نہ فرماتے ہوئے اداریہ لکھنے کی ذمہ داری قبول
اور پھر اداریے کے ساتھ ساتھ قائد کے لیے جب کبھی مختلف خبروں کے
ترجمہ کرنے کے لیے بیٹھتے تو بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ اداریہ
اور مختلف خبریں لکھتے لکھتے پورا اخبار ہی تیار کر ڈالتے تھے
تقسیم سے پہلے روزنامہ حق آپ ہی کی ادارت میں نکلتا تھا
آپ نے اپنی زندگی کے زیادہ تر اوقات علم و ادب ہی کے کام
میں صرف کیے۔ صحافت سے تعلق اتنا زیادہ تھا کہ ۱۹۵۰ء
میں جب صدق جدید کا اجرا ہوا تو مولانا عبدالماجد دریابادی
نے اس کی تمام تر ذمہ داری حتی کہ انتظامی امور کی ذمہ داری
بھی حکیم صاحب کے سپرد فرما دی۔ پھر جب ۱۹۷۷ء میں مولانا
عبدالماجد دریابادی کا انتقال ہو گیا تو اس وقت سے لے کر
۱۹۸۷ء تک جب تک حکیم صاحب کی صحت نے جواب نہ دے
دیا اور آنکھ سے معذور نہ ہو گئے وہ برابر اس کی ادارت
فرماتے رہے اور تقریباً ساٹھ سال تک صحافت کی خدمت
کی۔ اُن کے مضامین ہندوستان کے مختلف رسالوں،
میگزینوں اور ماہناموں میں ویسے تو بکثرت شائع ہوتے
رہے لیکن ان میں معارفؒ، سیاست جدید اور ندائے
ملت و تجلی میں بے شمار مضامین شائع ہوئے اور اُن
کے یہ مضامین اکثر علمی و ادبی ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم
صاحب کا کوئی مضمون جب کسی رسالے یا اخبار میں آتا تو
قاری اس مضمون کو پڑھنے کے لیے بے چین ہو جاتا اور پھر
بغیر ختم کیے اس کو نہ چھوڑتا تھا۔ آپ ایک بہت ہی بااصول
صحافی تھے آپ جیسے صحافی اس دور میں مشکل سے ملیں
گے۔ نیز انھوں نے آج کل کی موجودہ صحافت کی طرح صحافت
کو تجارت اور مال کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ ہی

صحافت سے انھوں نے مالی منفعت حاصل کی۔ اسی لیے یہ حقیقت کہ ان کی اس طرز کی وجہ سے حکیم صاحب کو بحیثیت ایک کامیاب انشاپرداز کے وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ ہر لحاظ سے بجا طور پر مستحق تھے۔ ان کی صحافت اور نثر نگاری معلومات کا ایک بیش بہا خزینہ ہوتی تھی بلکہ بسا اوقات ایک صفحہ میں پوری تاریخ بیان کر دیتے تھے آپ کی صحافتی قابلیت کا اندازہ صحافتی دنیا میں اس وقت ہوا جب ۱۹۷۵ء میں کلکتہ میں منعقد اردو نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانفرنس میں شرکت کرنے گئے اور اس میں مقالہ پڑھا مقالہ کیا تھا صحافت کا ایک اعلیٰ نمونہ کہ اس کی مثال نہیں جس کی وجہ سے آپ کی وہاں زبردست پذیرائی ہوئی۔

تحریکات سے وابستگی:

آپ ہندوستان کے متعدد علمی اداروں سے نہ صرف وابستہ تھے بلکہ دیگر ذمہ داروں کی طرح وہ ان تمام تحریکوں میں برابر حصہ لیتے رہتے تھے جو ملک وقوم کے یا اجتماعی فائدے کے لیے وجود میں آئی ہو۔ چنانچہ تحریک ندوۃ العلماء، مسلم لیگ وغیرہ سے تادمِ حیات منسلک رہے اور اخیر عمر میں تو باقاعدہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو، دارالمصنفین اعظم گڑھ، دینی تعلیمی کونسل اترپردیش لکھنؤ، انڈین بورڈ آف یونانی میڈیسن، انجمن اصلاح المسلمین کی مجالس انتظامیہ کے بھی ممبر رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو اکاڈمی اترپردیش کی جنرل کونسل کے ممبر بھی رہے۔ اس طرح سے تمام ملی، ملکی، ذمہ داریوں سے بھی آپ اپنے آپ کو تادمِ حیات منسلک کر کے صدقۂ جاریہ میں اپنا نام لکھوا گیا۔

ان کی وفات سے علم وادب، صحافت و حکمت کا جو آفتاب غروب ہوگیا ہے جسے اب طلوع نہیں ہونا ہے اور جن کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے کہ بظاہر جس کا پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ آپ یگانۂ روزگار میں سے تھے۔ آپ نے اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ کر وفات پائی اور حرکت قلب کے آخری جھٹکے کو برداشت نہ فرما سکے لیکن بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ابھی آپ کے جانے کے دن نہ تھے کیوں کہ آپ آخر تک ایک متحرک نظامِ زندگی کے مالک رہے۔ جوانوں کے مثل حوصلہ، صحت مندوں جیسی تازگی اور چہرے پر سکون کے آثار آخر تک ظاہر ہوتے تھے اور اس طرح سے سادگی کا پیکر، پاک باز و پاک دل فرشتہ صفت انسان ہم سے جدا ہو کر ایک دوسری دنیا میں منتقل ہوگیا، جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ اس لیے اگر ان کے انتقال کو اس صدی کے علم وادب کے رخصت ہو جانے سے تعبیر کیا جائے تو بھی کم ہے۔

حواشی

لہ خاتون منزل وہ عمارت ہے جو قبر ماموں بھانجے کے پیچھے کونے میں حضرت مولانا علی میاں صاحب اور ان کے اعزا کی رہائش گاہیں ہیں۔ اسی بلڈنگ کے ایک حصے میں حکیم صاحب مرحوم مقیم تھے۔

ٹہ گھر سے مراد خاتون منزل ہے۔

تہ نسائی شریف۔

۴ یعنی تربیت حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی نے فرمائی تھی

۵ مولانا عبدالماجد دریا بادی۔

۶ یہ ایک پرانی کہاوت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے، یعنی بہت زیادہ اور بے حساب وکتاب دیتا ہے۔

۷ مشہور تحقیقی اور معیاری ماہنامہ ہے جو دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے اور اسلامی فکر کا واحد ترجمان ہے۔

۸ مشہور روزنامہ کانپور سے شائع ہوتا ہے۔

۹ مشہور علمی و دینی وتحریکی ہفت روزہ جو گوئن روڈ لکھنؤ سے جناب ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کی نگرانی میں ہر ہفتہ پابندی سے شائع ہوتا ہے۔

۱۰ آپ کا سب سے آخری مضمون ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہ نومبر ۹۲ء میں شائع ہوا ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ جلد ۱۲۔ شمارہ ۱۱۔ (نومبر ۹۳ء)

ابلاغ عامہ کے مضر اثرات

سید ارشد اسلم *

بلاشبہ موجودہ سائنسی دور میں ابلاغ عامہ نے ہمارے معاشرے میں بہت اہمیت حاصل کرلی ہے۔ ٹیلیفون ریڈیو، فلمیں، اخبارات و رسایل یہ ایک بڑی طاقت بن کر ابھرے ہیں، ان سے بے شمار فائدے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری دنیا ان ہی کی مٹھی میں ہے۔ ہم جب اور جس وقت چاہیں اس طویل و عریض دنیا کے کسی گوشے سے لمحوں میں بات کرسکتے ہیں دنیا کے کسی حصے میں بھی کوئی اہم واقعہ ہوا ہو یا ہو رہا ہو ہم اپنے کمرے میں بیٹھے ٹی۔ وی پر دیکھتے رہتے ہیں۔ غرض اس دور میں ہمارے لیے ہر طرح کی سمعی و بصری سہولیات فراہم ہیں۔ لیکن اس کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اگر اس کا استعمال صحیح طریقے سے نہیں کیا جائے تو یہ ابلاغ عامہ ایک بڑی تخریبی طاقت بن کر ہمارے سامنے آسکتی ہے جو ہمارے معاشرے کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے خیال کے طول پر ٹی۔ وی اور سینما کے بعض بڑے مضر اثرات سامنے آئے ہیں۔ بعض حلقوں کی طرف سے اس کے خلاف آواز بھی بلند ہوتی ہے۔ ان تخریبی وسایل میں اخبارات، فلم اور ویڈیو کیسٹ کے مضر اثرات کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ اس نے اپنے آغاز کے دن سے ہی عوام کی توجہ بہت تیزی سے اپنی طرف مبذول کرلی۔ وی۔ سی۔ پی اور وی۔ سی۔ آر بڑی خاموشی سے ہمارے ملک میں داخل ہوا تھا لیکن اب تو عالم یہ ہے کہ یہ ایک وبا کی شکل میں شہروں سے نکل کر دور دراز کے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی پھیل گیا ہے۔ ٹی۔ وی کا نظام الاوقات تو کچھ حد تک مقرر بھی ہے لیکن وی سی آر تو اس قید سے پوری طرح آزاد ہے۔ اس وقت لاکھوں کی تعداد میں ہمارے یہاں طرح طرح کے سمعی و بصری کیسٹ دستیاب ہیں۔ ان فلموں اور کیسٹوں نے لوگوں کے مذاق کو تباہ و برباد کر دیا ہے بلو فلم کے کیسٹوں نے جنسی لذت اندوزی کے ذوق کو بڑھاوا دیا ہے۔ آج بجائے اس کے کہ لوگ علمی و ادبی کتابوں کے ذریعے ذہنی روحانی، اخلاقی اور علمی فیض حاصل کریں ان فضولیات میں اپنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ آج سے کچھ ہی دنوں قبل تک ٹی۔ وی کا نظام الاوقات عموماً شام سے لے کر رات کے اس حصے تک پر محیط ہوتا تھا جو طالب علموں کے مطالعے کا وقت ہوا کرتا تھا۔ اس سے طالب علموں پر بڑے خراب اثرات مرتب ہوتے تھے اور ان کی پڑھائی

---

* شعبۂ اردو، بی پی کے کالج بندو، راکچی (بہار)

کمائی کا بہت نقصان ہوتا تھا. لیکن معاملہ یہیں تک نہیں رکا بلکہ اس تخریب کاری نے ایک قدم اور آگے بڑھایا چنانچہ اب ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے دیہاتوں تک 'ڈش اینٹینا' کے اسٹار ٹی.وی اور کیبل جیسے پروگراموں نے اپنا جال بچھا رکھا ہے۔ اب یہ پروگرام نظام الاوقات سے بے نیاز ہیں. جس وقت آپ نے ٹی-وی کا بٹن دبایا، طرح طرح کے پروگرام حاضر ہیں، بس چینل تبدیل کرتے جائیں اور طرح طرح کے انگریزی نئی اور پرانی ہندی فیچر فلمیں، فلمی گانوں اور کئی دوسرے طرح کے پروگراموں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ جب یہ پروگرام ہو رہا ہوتا ہے اور آپ کسی ایسے گھر میں چلے گئے جہاں لوگ آپ سے زیادہ بے تکلف نہ ہوں تو بس سمجھ لیجیے کہ آپ جتنی دیر وہاں بیٹھے رہے لوگوں کے دلوں پر ایک بارِ گراں بنے رہے۔ بھلے ہی اس کا اظہار آپ سے الفاظ میں نہ ہوا ہو لیکن لوگوں کے حرکات و سکنات سے آپ کو اس کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ غرضیکہ اس نے لوگوں کے مذاق، اخلاق، خلوص و محبت کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔

آج کل لوگوں کی سب سے زیادہ دلچسپی فلم میں اس کے بعد ٹی-وی کے دوسرے پروگراموں میں پھر ریڈیو نشریات میں ہے۔ اس کے بعد حرفِ مطبوعہ والے ذرائع ابلاغ آتے ہیں۔ یعنی پہلے اخبارات، پھر جرائد اور سب سے آخر میں کتابیں ہیں۔ ان تمام ذرائع ابلاغ میں ٹیلی ویژن نے سب سے اول مقام حاصل کیا ہے۔ ملک میں ٹی-وی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور پھر اس کی جدید ترین صورت یعنی اسٹار ٹی-وی اور کیبل کے پروگراموں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے اور گلی گلی میں وی-سی-پی اور وی-سی-آر کے اہتمام نے سینما گھروں میں فلم دیکھنے کے رواج کو کم کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود فلمی اداکاری کی اہمیت اپنی جگہ بہت زیادہ ہے۔ اتنی مقبولیت ٹی.وی کے اداکاروں کو حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا مجبوراً لوگوں کو یا تو سینما ہال کا رُخ کرنا پڑتا ہے یا پھر ویڈیو کیسٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے اس کے علاوہ فلمی گانوں کے کیسٹوں کی فروخت کو ہمارے ملک میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، شاید اس لیے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ گانوں کی اس قدر بڑھتی ہوئی مقبولیت نے معاشرے میں رومان اور عامیانہ جذبات کو عام کر دیا ہے۔ جوں جوں لوگوں کا مذاق بدل رہا ہے، گانوں میں فحاشی اور سطحیت عام ہوتی جا رہی ہے۔ آج کل کے زیادہ تر گانے سوز و گداز کی لذتوں سے عاری ہیں۔ ٹی-وی پر اکثر انگریزی فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ان فلموں میں ایک طرف تو انگریزی تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے، دوسری طرف عموماً اس میں تشدد اور اشتعال کے ایسے مناظر دکھائے جاتے ہیں جو غیر شعوری طور پر ناپختہ ذہن والوں کے لیے بڑے ہی مہلک ثابت ہوتے ہیں ان میں بہت سی ایسی فلمیں ہیں جن میں چوری ڈکیتی عیاشی اور بد معاشی کے نئے نئے طریقے دکھائے گئے ہیں چنانچہ جدید تحقیقات کے بعد اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ جرم کے ارتکاب کے بعد سزا بھگتنے والے قیدیوں نے یہ بتایا کہ انھوں نے جرم کی فلاں فلاں وارداتیں فلاں فلاں انگریزی اور ہندی فلموں سے متاثر ہو کر کی تھیں غرض ان تمام باتوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ذرائعِ ابلاغ انسان کے اندازِ فکر و عمل، فیشن، معاشرت اور زندگی کے کئی دوسرے پہلوؤں کو متاثر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں کئی قومیں اپنے ذرائع ابلاغ سے وہ کام لے رہی ہیں جو کبھی فوجوں سے لیا جاتا تھا لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ذرائعِ ابلاغ کا استعمال زیادہ سے زیادہ مثبت اور تعمیری ہو۔ چونکہ موجودہ دور میں ابلاغِ عامہ میں ٹی-وی-سب سے زیادہ مقبول ہے اس لیے

اس سے بڑے اہم کام انجام دیے جا سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے حکومت کو مضبوط بنانے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ سہل پسندی کے بجائے جاں فشانی کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ آج کی بننے والی فلموں پر توجہ دی جائے اور ان کو تن آسانی اور بدترین تاجرانہ بے امتدائی کے دائرے سے نکالا جائے جس میں وہ اب تک محدود رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے طریقے ہیں جس سے اس مقبول ترین ابلاغ عامہ سے بڑے اچھے مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ابلاغ عامہ کے مضر اثرات میں دوسرا نمبر اخبارات کا آتا ہے، اخبارات میں جرائم پیشہ خبروں کی اشاعت کا مسئلہ آج ایک اہم مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے۔ آج جب ہم اخبار اٹھاتے ہیں تو ہمیں اُن میں عام طور پر چوری ڈکیتی اغوا، زنا بالجبر اور دیگر جرائم پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اگر ہم صحیح معنوں میں اخبار کو معاشرے کا آئینہ قرار دیں۔ ایسی صورت میں اس آئینے میں ہمارا پورا معاشرہ عریاں نظر آئے گا۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے مدیر شاید اپنے اعلیٰ صحافتی معیار کو برقرار رکھنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پائے ہیں۔ آج کل بہت سے اخبارات تو اپنی سنسنی خیز اور غلط خبروں کی بنا پر عجوبۂ روزگار بنے ہوئے ہیں۔ سرسید احمد خاں نے ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کے سائنٹیفک سوسائٹی میں لکھا ہے کہ:

"اخبارات جو ضروری تصدیق کا ذریعہ ہے
افسوس کہ اس سے اب بیہودہ اور بے اصل
خبروں کا کام لیا جاتا ہے۔"

چنانچہ سرسید کا یہ بیان آج کل کے کئی اخبارات پر صادق آتا ہے۔ اخبارات ایک ذریعۂ اظہار ہیں جو مثبت اور منفی دونوں طریقوں پر استعمال ہو سکتے ہیں۔ یعنی اخبارات سے جہاں قومی ترقی، ملکی بہبود، عوام کی رہنمائی اور حکام کی ہدایت کا کام لیا جا سکتا ہے، وہیں یہ بگاڑ کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں۔ اخبارات و رسایل کو محض کمائی و نفع خوری کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ قوم و ملک کی خدمت کا ذریعہ بھی ہونا چاہیے۔ اخبارات کے معاشی خود کفالتی کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن محض پیسوں کی خاطر انھیں غارت گر اخلاق و ایمان نہیں بن جانا چاہیے۔

ہندوستان میں اب تک جرائم کی بیشتر خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں ہماری صحافتی برادری نے بہت کم توجہ دی ہے۔ اخبارات بلکہ دوسرے ذرایع ابلاغ تو اب دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں۔ کئی ممالک تو ایسے ہیں جہاں جرائم کی خبریں شایع کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ اخبارات حکومت یا جماعت کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں اور جرائم کی خبروں کی اشاعت سے حکومت یا جماعت بلکہ پورے نظام میں خرابیوں کی نشان دہی ہوتی ہے اور یہ بات اس ملک کے علمبرداروں کو منظور نہیں ہے۔ چنانچہ اس قسم کی خبروں کی اشاعت ممنوع ہے۔ جن ممالک میں اخبارات آزاد ہیں وہاں مختلف اخبارات جرائم کی خبروں کی اشاعت میں مختلف معیار رکھتے ہیں۔ بعض اخبارات ان کو سنسنی خیز بناتے ہیں اور بعض ان کو بالکل معروضی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ گویا جرائم کی خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں ہر اخبار کے متعلقین کا اپنا ایک الگ نقطۂ نظر ہوتا ہے لیکن اس ضمن میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جرائم کی خبریں شایع ہونی بھی چاہییں یا نہیں۔ اگر ہونی چاہییں تو کس انداز سے کیوں کہ جرائم کی خبروں سے صرف نقصان ہی ہو ایسی بات نہیں ہے۔ جہاں اس سے بہت سارے نقصانات ہیں وہاں بہت سے فائدے بھی ہیں۔ مثلاً اس قسم کی خبروں سے جرائم کی شرح اور نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ قوانین کے موثر یا غیر موثر ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجرموں کو ملنے والی سزاؤں کی خبریں اپنے اندر دوسروں کے لیے عبرت کا سامان رکھتی ہیں۔ قانون

کے نفاذ کے ذمہ دار افراد اور ادارے مستعد ہیں یا غیر مستعد انصاف پسند ہیں یا غیر انصاف پسند چاق چوبند ہیں یا نا اہل اور سست ہیں - ان سب کا پتہ چلتا ہے۔ ان باتوں سے قارئین یعنی عوام کو ان افراد اور اداروں کے محاسبے اور ان کی اصلاح کے لیے آواز بلند کرنے کا موقع ملتا ہے جرائم کی خبروں سے معاشرے کی عام اخلاقی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان خبروں سے مجرموں کے طریقۂ واردات کا پتہ چل جاتا ہے اور ہم اپنے تحفظ کا بہتر انتظام کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اگر ہم جرائم کی خبروں کی اشاعت کے نقصان دہ پہلوؤں کی طرف غور وفکر کریں تو اس کا دائرہ زیادہ وسیع معلوم ہوتا ہے۔ جرائم کی خبروں سے جہاں ایک طرف لوگ مجرموں کے طریقۂ جرم کا پتہ لگاتے ہیں وہیں بہت سے مجرمانہ ذہن رکھنے والے لوگوں کو بھی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کس طرح اور زیادہ کامیابی کے ساتھ یہ کام کیا جاسکتا ہے۔ ملزم مجرم ہے یا بے گناہ اس کا فیصلہ تو بعد میں عدالت میں ہوتا ہے لیکن جب تک بہت سے ایسے ملزموں کی تشہیر ہوچکی ہے جو آخر میں بے گناہ ثابت ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر ہم یہ مان لیں کہ اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی کہ " ایک لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہوگئی، وہ فلاں کی بیٹی اور فلاں کی بہن تھی۔" اب یہ تشہیر نہ صرف اس لڑکی کے لیے بلکہ اس لڑکی کے بھائی بہن، ماں باپ اور پورے خاندان کے لیے کئی اعتبار سے سوہانِ روح بن جاتی ہے اور افسوس تو یہ کہ بعد میں یہ پتہ چلا کہ وہ بھاگی نہیں بلکہ اس سے جبراً اغوا کر لیا گیا تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کا خاندان ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نظروں سے گر گیا۔ ہمارے ہندوستانی معاشرے میں اس قسم کے خاندان کی وقعت گر جاتی ہے۔ حالانکہ اس میں اس کے خاندان کا کیا قصور ہے۔ قصور تو صرف ایک فرد کا ہے۔ بہر کیف وہ مظلوم تھی لیکن ایک مظلوم کی اس طرح تشہیر ہوئی کہ وہ زندہ درگور ہوگئی۔ ہمارا معاشرہ اور ہماری تہذیب مغربی ممالک کی تہذیب سے بالکل الگ ہے۔ ہمارے یہاں خواتین کی اس قسم کی تشہیر اسے معاشرے میں دوبارہ بحالی کے قابل نہیں رکھتی۔

دیگر ممالک کی طرح ہمارے ملک میں معاشرے پر مادیت کا غلبہ ہے۔ عام طور پر لوگ جائز اور ناجائز ہر طرح سے دولت حاصل کرنے میں لگے ہیں۔ ان حالات میں جب چوری، ڈکیتی، منشیات کی اسمگلنگ کی وارداتوں میں لاکھوں اور کروڑوں روپیہ کا ذکر ہوتا ہے تو بہت سے مجرمانہ ذہن رکھنے والے دلوں میں یہ خواہشیں کروٹیں لینے لگتی ہیں کہ کاش وہ بھی اسی طرح چند دنوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کا مالک بن جاتیں۔ خواہ اس کا نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ اس طرح اس قسم کی تشہیر سے مجرمانہ ذہن رکھنے والے ذہنوں کی تربیت ہوتی ہے اور اس کے اندر جرم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مجرم زیادہ تر جاہل ہوا کرتے تھے، یا وہ سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی شرفا اور پڑھے لکھے لوگ جرم کا ارتکاب نہیں کرتے تھے لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ آپ اخبار و رسایل اٹھا کر دیکھیں تو قومی املاک میں ہیرا پھیری، بینکوں کے بڑے بڑے گھوٹالے، رشوت، ڈکیتی، بدعنوانی اور غبن کی وارداتوں میں زیادہ تر بڑے بڑے عہدوں پر فائز لوگ، ان کی اولادیں اور اونچے گھرانے کے افراد بیش تر ان وارداتوں میں ملوث پائے گئے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم غور کریں تو اس حقیقت سے انکار مشکل ہوجائے گا کہ جرائم کو مزید بڑھانے میں ابلاغ عامہ کا ہاتھ ہے اور ابلاغِ عامہ میں زیادہ تر اخبار و رسایل کا۔ ہندوستانی معاشرے میں جرائم کے واقعات کی اہمیت اس قدر بڑھا دی گئی

ہے کہ "جرائم" اور "بھیانک جرائم" کے عنوان سے باقاعدہ ماہانہ رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ اس میں بغیر یہ سوچے ہوئے کہ جرائم کی یہ خبریں کون سے مقاصد پورے کریں گی، اغوا چوری، ڈکیتی اور آبرو ریزی کے تمام واقعات اور تمام تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے دلچسپ چیز بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ خبریں اوپر بیان کی گئی باتوں کی روشنی میں ہمارے معاشرے کے لیے سماجی اور اخلاقی لحاظ سے زہر قاتل نہیں ثابت ہوں گی؟ کیا ان خبروں سے ناپختہ ذہنوں پر برا اثر نہیں پڑے گا؟ کیا اس سے مجرمانہ ذہن رکھنے والوں کی تربیت نہیں ہوتی ہے؟ کیا ان خبروں سے خواتین ہی کی نہیں بلکہ اس کے پورے خاندان کی تشہیر نہیں ہوتی ہے؟

صرف مذہب اسلام ہی نہیں، دنیا کا ہر مذہب برائیوں کو روکنے اور اسے چھپانے کی تعلیم دیتا ہے دوسروں کے عیوب کی تلاش میں رہنے سے منع کرتا ہے عیوب کی پردہ پوشی میں اور برائیوں کو چھپانے میں بڑی بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں لیکن ہماری نگاہیں ان اچھائیوں کی جانب نہیں اٹھتیں۔ جرائم کی خبریں ضرور شائع ہونی چاہیں لیکن اس میں یہ خیال ہمیشہ مقدم رہنا چاہیے کہ یہ خبریں اشاعت کے بعد کون سے مقاصد پورے کریں گی۔ اگر یہ خبریں اور واقعات وہ مقاصد پورے کریں گے جو ان کی اشاعت کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں تو یقیناً یہ خبریں شائع ہونی چاہیں۔ یہ اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے درست ہوں گی لیکن اگر ان کی اشاعت سے وہ مقاصد پورے ہو رہے ہیں جو اس کے عدم جواز میں بیان کیے گئے ہیں تو انھیں بہت سوچ سمجھ کر شائع کرنا چاہیے ان کی تفصیلات و جزئیات کو تو بالکل شائع نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو شاید یہ ہمارے معاشرے کے لیے مہلک ثابت ہو۔ ہمارے معاشرے کا ایک ضابطۂ اخلاق ہے لہٰذا یہ خبریں بھی اسی ضابطۂ اخلاق کی پابند ہونی چاہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس طرح خبریں شائع کردیں کہ برائیاں اچھائیوں پر غالب آجائیں۔ اسی طرح جب ہم ابلاغ عامہ کے ہر پہلو پر اسی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالیں گے اور کوشش کریں گے کہ ہمارا ہر قدم تعمیری ہو تو بلاشبہ ہم اپنے معاشرے اپنے ملک کے بگڑتے اور بدلتے ہوئے نظام میں بڑا تغیر پیدا کر سکتے ہیں اور اسے تعمیر نو کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔

"سر سید احمد خان کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں۔ خواہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں، جو سر سید پسند کرتے۔"

—— خالدہ ادیب خانم

سیلاب

سید شفیق النبی ٭

ہمیشہ کی طرح آج بھی ہم لوگ سیلاب کی زد میں ہیں۔ دنیا کے تمام حصوں میں ہر سال سیلاب سے جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔

سائنس اور انجینرنگ اس سلسلے میں کیا کر رہی ہے اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس میں جو کام اب تک ہوا ہے وہ تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔

۱۔ سیلاب کا اندازہ لگانا۔
۲۔ سیلاب سے بچنے کے لیے ممکن قدم اٹھانا۔
۳۔ سیلاب سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔

۱۔ سیلاب کے اندازہ لگانے میں بارش کا اہم حصہ ہے۔ ہمارے ملک میں جب کہ سالانہ اوسط بارش ۱۰۰ سینٹی میٹر ہوتی ہے، برسات کے زمانے میں بعض اوقات ایک روز میں ۲۵ سے ۴۰ سینٹی میٹر تک بارش ہو جاتی ہے۔ اس مشکل کام کے لیے تین طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ پہلے طریقے میں فارمولے کے ذریعے اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے لیے پچاس سے زیادہ فارمولے موجود ہیں۔ دوسرے طریقے میں تعداد و شمار کے اوسط سے اندازہ لگاتے ہیں۔ اس کے لیے بھی کئی طریقے ہیں۔ تیسرے طریقے میں دریا کے پچھلے ریکارڈ سے اندازہ لگاتے ہیں ان تمام طریقوں کے باوجود یہ اندازہ کبھی غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کاسگنج کے پاس کالی ندی میں جہاں برسات میں تقریباً ۶۰ مکعب میٹر فی سکنڈ پانی بہتا ہے، وہاں دریا پر نہر کے لیے ایک پل کو بنانے میں دریا کا نکاس ۳۵۰ مکعب میٹر فی سکنڈ مان کر پل بنایا گیا۔ ایک سال اس دریا میں ۳۰۰۰ مکعب میٹر فی سکنڈ پانی گزرا۔ نہر کا یہ پل سیلاب کی نذر ہو گیا اور اس کا ملبہ کئی کلومیٹر نیچے سیلاب کے بعد نظر آیا۔ آج کل کالی ندی پر نہر کا تیسرا پل بن رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ جو پل نذر سیلاب ہوا وہ کافی مضبوط بنا ہوا تھا جس کی مثال آج بھی دی جاتی ہے۔ سیلاب کے اندازہ لگانے میں جہاں ایک طرف غیر یقینی قدرتی عنصر شامل ہے وہیں اوسط سیلاب کے مقابلے میں سیلاب کی ممکن تعداد مقرر کرنے میں مالی رکاوٹ بھی آتی ہے تاکہ اگر کوئی بہت بڑا سیلاب واقعی نہ آجائے۔ مثال کے طور پر اب کالی ندی کے پل کے لیے سیلاب کا [illegible]

٭ سابق پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف سول انجینرنگ، اے ایم یو علی گڑھ۔

۳۰۰ مکعب میٹر فی سکنڈ سے زیادہ لے کر تیسرا پل تلہ ہے۔

۲۔ سیلاب سے بچنے کے لیے ممکن تکنیکی قدم مندرجہ ذیل ہیں:

(الف) باندھ بنا کر پانی کو روکنا

(ب) دریا کے کناروں کو پختہ بنانا

(ج) دریا کو بہتر بنانا۔

(د) دریا کے راستے کو سدھارنا

(ھ) دریا کے راستے کو بدلنا

(و) دریائی علاقے کی مٹی کو بہنے سے بچانا۔

الف: سیلاب سے بچاؤ کے لیے باندھ بنا کر پانی کو روکنے کا طریقہ سب سے بہتر ہے۔ ہندوستان میں بڑے باندھ کئی مقاصد سے جن میں سیلاب سے بچنا ایک مقصد ہے، بنائے گئے ہیں۔ ان میں ہیراکُد باندھ، دامودر گھاٹی کے باندھوں کے سلسلے، بھاکرا باندھ، رہینڈ باندھ، چمبل باندھ، نگرجونا ساگر باندھ، تنگا بھدرا باندھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ٹیڑھی باندھ اور نرمدا ساگر باندھ کے سلسلے پر کام ہو رہا ہے۔

(ب) دریا کے کناروں کو پختہ بنانا سیلاب سے بچنے کا ایک اچھا طریقہ ہے۔ ہندوستان میں جن دریاؤں کے کنارے بڑی مقدار میں پختہ ہوئے ہیں، ان میں گنڈک، دامودر، مہاندی، گوداوری، کرشنا، کاویری اور برہم پتر ہیں لیکن سب سے بڑے پیمانے پر یہ کام دریائے کوسی پر ہوا ہے۔ ہندوستان کے باہر یہ کام سندھ، ارادوی، نیل، پو اور مس سیس پی دریاؤں پر ہوا ہے۔

(ج) دریا کو بہتر بنانے سے مراد اس کے نکاس کو بڑھانے کے لیے ضروری قدم اٹھانا ہیں۔ اس میں دریا سے ریت نکالنا، دریا کو چوڑا کرنا، دریا کے گھماؤ کو سیدھے راستے سے لے جا کر اس کی لمبائی کو کم کرنا، دریا میں مصنوعی استر لگا کر اس میں پانی کی رفتار بڑھانا اور بعض جگہ دریا کو گہرا کرنا شامل ہیں۔ اس قسم کے اقدامات بہت مہنگے ہیں اور بہت کم جگہوں پر کیے گئے ہیں یہ اقدام جہلم ندی اور مس سیس پی ندی پر ہوئے ہیں۔ مس سیس پی کی ۲۰۵ کلومیٹر کی لمبائی کو ۱۳ جگہ سیدھا کرکے ۲۱۵ کلومیٹر کر دیا گیا ہے۔

(د) دریا کے راستے کو سدھارنا انجینئرنگ کے مشکل کاموں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ کام قیمتی ہونے کی وجہ سے باندھ اور پل، بڑے شہروں کی حفاظت کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ ان کاموں میں گھماؤ دار کنارے کے باندھ، کنارے کی پختگی اور دریا کے اندر جانے والے باندھ شامل ہیں۔ جہاں جہاں یہ باندھ بنے ہیں آج تک بڑے سے بڑا دریا اس جگہ اپنا راستہ نہیں بدل سکا ہے لیکن پورے دریا کی ان طریقوں سے حد بندی کرنے کے لیے بہت سرمایے کی ضرورت ہے۔

(ھ) دریا کے راستے کو بدلنے سے مراد دریا کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد مصنوعی راستے سے دوسرے راستے میں داخل کرنا ہے۔ ان دریاؤں میں اگر سیلاب کم ہے تو پہلے دریا کے سیلاب کے اثر کو کم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس قسم کے کام ہوئے ہیں لیکن ایک بڑی اسکیم گنگا کاویری ملاپ کی اسکیم ہے جس کے تحت گنگا کا پانی کاویری میں داخل کیا جائے گا۔ جہلم پر چھوٹے پیمانے پر یہ کام ہوا ہے

اس کے علاوہ امریکہ میں ایک دریا کو تین حصوں میں بانٹ کر دوسرے دریاوں میں پانی داخل کیا گیا ہے۔

(د) دریائی علاقے میں مٹی بہہ کر اگر دریا میں جاتی ہے تو اس کا نکاس کم ہوجاتا ہے۔ اس مٹی کو روکنے کے لیے جھاڑی اور درخت لگانا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑی کے ڈھال کو زینے کی شکل میں تراش کر مٹی کو بہنے سے روکا بھی جاتا ہے اور اس طرح ہموار زمین پر کاشت بھی کی جاتی ہے۔

۲- سیلاب سے لوگوں کو آگاہ کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس سے بچاو کے مکمل اقدامات ابھی نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کام کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں یہ ضروری ہے کہ سیلاب کے سلسلے میں جو کام ہوے ہیں ان کو مستعدی اور وقت پر استعمال کیا جا سکے۔ دوسرے حصے میں آدمی، جانور اور جو مال نکل سکے اس کو نکالنے کے لیے اقدامات شامل ہیں۔ سیلاب سے خبردار کرنے کے لیے اب دریا کے ہر پل اور باندھ وغیرہ پر خطرہ کے نشان موجود ہیں۔ جہاں ضروری ہوتا ہے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، وائرلیس، ٹیلی فون اور اخبار کے ذریعے خبردار کر دیا جاتا ہے۔ سیلاب ان فطری واقعات میں سے ایک ہے جن میں بجلی گرنا، بادل پھٹنا اور زلزلہ آنا شامل ہیں۔ اس کی تکنیکی روک صرف ایک حد تک ممکن ہے۔

"اگر کوئی مذہب سچ ہے اور معتقد اس کو خدا کی طرف سے جانتے ہیں تو ان کو یقین کرنا چاہیے کہ اس میں باہم انسانوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کرنا سب سے بڑا فرض ہے۔ پس اگر اس فرض کو ہمیشہ خیال میں رکھیں تو کسی مذہب سے انسان کے دل میں بغض و حسد کینہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہمارا تو یہی یقین ہے اور اسی پر برتاؤ ہے"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۱۱ (نومبر ۹۳ء)

شہد کی مکھی اور مکڑی

احمد مجتبیٰ قریشی ★

اللہ تعالیٰ نے اس دُنیا میں جو چیزیں بھی پیدا کی ہیں وہ سب کی سب کسی خاص مقصد سے پیدا کی ہیں۔ کائنات کی کوئی بھی چیز چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی ہو اس کا اپنا ایک مقصد ہے اور اس کے ذمہ ایک کام ہے جو وہ انجام دیتی رہتی ہے زمین پر چلنے والے جاندار چاہے وہ کیڑے مکوڑے ہوں یا جنگلی جانور، اُڑنے والے پرندے ہوں یا پانی میں زندگی گزارنے والی مخلوق اس کی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہیں۔ سائنس دالوں نے تحقیق کرنی شروع کی تو وہ اب تک جن کو تلاش کر چکے ہیں ان کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ چکی ہے اور ابھی کتنی مزید مخلوقِ خدا اس زمین پر زندگی گزار رہی ہے اس کی کھوج ہم نہیں کر پائے ہیں اُس کے بارے میں ہمارا علم ابھی تک ناقص ہے۔

اگر ہم مخلوقِ خدا میں سے بہت معمولی چیزوں پر ہی غور کریں تو ہمیں ان کی صناعی حیرت میں ڈال دیتی ہے مثلاً چیونٹی، شہد کی مکھی، مکڑی، مچھر وغیرہ وغیرہ۔ تو ہمیں یہ چیزیں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ اُن کا بہت ہی معمولی سا جسم اپنے اندر کسی طرح پورا نظام سمائے ہوئے ہے۔ شہد کی مکھی کا حقیر سا جسم ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس چھوٹے سے جسم میں کس طرح پھولوں سے رس نکالنے کی طاقت، چھتہ بنانے کی قدرت اور چھتے میں کس طرح کاریگری سے اسے جمع کرنے کی ذہانت موجود ہے۔

مکڑی کی ذہانت آپ اس کے جال بُننے، اس کے اپنے شکار کو پکڑنے اور خود کو اپنے دشمن سے بچانے کی صلاحیت سے سمجھ سکتے ہیں۔

شہد کی مکھی

شہد کی مکھیاں سنہرے رنگ کی اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ ان کے جسم پر جگہ جگہ سیاہ رنگ کی بُندکی ہوتی ہے شہد کی مکھی کو غور سے دیکھا جائے تو سر، سینہ اور پیٹ تین حصے مکھیوں کے جسم کے نمایاں ہوں گے۔ ان حصوں کے بھی کئی کئی حصے ہوتے ہیں۔ جیسے سر میں سینگ، آنکھ اور منھ۔ مکھیوں کے سر کے بیچوں بیچ دو سینگ ایک ہی جگہ سے نکلتے ہیں اس کا استعمال مکھیاں کئی کاموں میں کرتی ہیں۔ مثلاً مکھیوں کو کہیں جانا ہو تو اپنی رہنمائی کے لیے اس کا استعمال کرتی ہیں۔ اسی کی رہنمائی سے چھتے کی کوٹھریوں کی شکل، مختلف قسم کے بچوں کی رہائش گاہ کے لیے ٹھیک ہے یا نہیں، نر مادہ اور رانی مکھیوں میں فرق

★ اسسٹنٹ ایڈیٹر تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اور اس کی مدد سے بات چیت کر سکتی ہیں۔ یوں تو اُن مکھیوں کی دو آنکھیں ہوتی ہیں مگر خوردبین سے اگر دیکھا جائے تو دونوں آنکھیں بے شمار چھوٹے چھوٹے لینس کا زخیرہ دکھائی دیں گی۔ ان کی مدد سے مکھیاں بہت دور تک دیکھ کر چیزوں کا پتہ لگا لیتی ہیں لیکن پاس کی چیزوں کو دیکھنے کے لیے دونوں آنکھوں کے اوپر تین چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہوتی ہیں جس کی مدد سے پاس کی چیزوں کو دیکھتی ہیں۔ منھ میں لچک دار اور لمبی زبان ہوتی ہے۔ نچلی سونڈ یا ہونٹ بڑا ہوتا ہے جس سے چاٹنے اور چھتہ بنانے کے لیے موم کو نرم کرنے کا کام بھی لیتی ہیں۔ رانی مکھی اور نر مکھی کے جبڑوں میں دانت ہوتے ہیں۔ یہ اس کا استعمال کوٹھریوں کو بنانے اور چکنا کرنے میں کرتی ہیں۔

شہد کی مکھیوں کے چار بازو اور پانچ ٹانگیں ہوتی ہیں۔ ان اعضا کا بھی دوسرے اعضا کی طرح مختلف کاموں میں استعمال کرتی ہیں۔ ہلکے اور لچک دار دو بازو آگے کی طرف اور دو پیچھے کی طرف ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑے چھوٹے ہوتے ہیں۔ آگے کا بازو بڑا اور پیچھے کا چھوٹا ہوتا ہے۔ دونوں بازووں پر باریک باریک بال ہوتے ہیں۔ اُڑتے وقت آگے کا بازو پچھلے بازو کے بال سے چپک جاتا ہے جس سے اُڑنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں پیش آتی ہے۔ بال ہونے کی وجہ سے ان کو ٹھنڈک اور گرمی کا احساس زیادہ نہیں ہوتا۔ بازووں پر دُہری جھلی ہوتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی بھی لسدار یا چکنی چیز سے محفوظ رکھتی ہے۔ جب گرمی شدت سے پڑتی ہے تو کام کرنے والی مکھیاں کوٹھریوں کے فرش کو خوب اچھی طرح جکڑ کر پھڑپھڑاتی ہیں اس عمل سے کافی ہوا نکل کر چھتے کے اندر پہنچتی ہے اور گرمی کی شدت میں کمی ہوتی ہے۔ بازووں میں باریک کمانی دار رگیں اور ہوا کے آنے جانے کے لیے چھوٹے چھوٹے سوراخ بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے مکھیاں بآسانی اُڑتی رہتی ہیں۔

دوسرے اعضا کی طرح شہد کی مکھی کی ٹانگیں بھی مختلف ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ یہ ٹانگیں صرف رینگنے اور چلنے پھرنے تک ہی محدود نہیں ہوتیں۔ بلکہ اپنی حیرت انگیز بناوٹ کی وجہ سے وہ ان ٹانگوں کا استعمال الگ الگ موقعوں پر کرتی ہیں۔ ٹانگوں کے ہر ایک جوڑ پر بال ہوتے ہیں جو پھولوں کے اندر کا زیرہ (زرگل) کو اکٹھا کرنے میں مدد کرتے ہیں اور پنجوں کے ذریعے چھتوں میں ایک دوسرے میں چمٹ کر لٹکتی ہیں۔ آخری جوڑ میں دوہرے پنجے ہوتے ہیں اور ران کے بیچ ایک خالی گدی پائی جاتی ہے جس کی شکل پیالے جیسی ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے مکھیاں چکنی سطح پر بغیر دشواری کے چل پھر سکتی ہیں۔ یہ کہنا کہ ان کے اعضا میں سے کچھ اعضا استعمال میں نہیں آتے یہ بالکل غلط تصور ہے۔

پیٹ کے اندر کی تھیلی جس میں کھانا رہتا اور ہضم ہوتا ہے اسے معدہ کہتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں ان سے اپنی بہت سی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ مثلاً انڈے دینا، کھانے کو ہضم کرنا، سانس لینا اور موم بنانا اس کا اہم کام ہوتا ہے۔ ڈنک لگانے والے حصے کو ڈنک ہی کہتے ہیں جو شہد کی مکھی کے پیٹ میں پیچھے کی طرف اور اندر کی آنتوں سے جڑا ہوتا ہے۔ اس کے آس پاس ایک سخت قسم کا سینگ ہوتا ہے اور اوپر والی ایک تھیلی میں زہر کی کچھ مقدار ہوتی ہے۔ اس زہر کو مکھیاں کاٹتے وقت استعمال کرتی ہیں۔ جب مکھیاں اپنے بچاو میں کسی کو کاٹتی ہیں تو زہر ڈنک کے ذریعے جسم کے اندر پہنچ جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈنک نکلنے کے بعد نکالنے کی کوشش میں ٹوٹ جاتا ہے۔ اس وقت مکھی مر بھی جاتی ہے۔ ڈنک کا استعمال مکھی اپنے

بچاو کے لیے کرتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بچے ان کے چھتے کو پتھر سے چھیڑ دیتے ہیں تو وہ غصے میں اپنے چھتے سے نکل کر ایک ساتھ دشمن پر حملہ آور ہوتی ہیں اور جو بھی ان کو نظر آتا ہے ان پر ڈنک مارتی ہیں۔ غصے کی حالت میں ڈنک اتنا شدید لگاتی ہیں کہ اکثر ٹوٹ جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ادھر سے راستے کو بند بھی کر دینا پڑتا ہے جس طرف سے مکھیاں حملہ آور ہوتی ہیں۔

چھتے کی تمام مکھیاں اپنی رانی مکھی کی فرماں بردار اور جاں نثار ہوتی ہیں۔ مکھیاں اپنے فرائض سے کبھی کتراتی نہیں۔ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انڈوں اور بچوں کی حفاظت اور پرورش کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے، بچاو کے راستے ڈھونڈنے اور خوراک اکٹھا کرنے میں چست ہوتی ہیں۔ ان کی قابلیت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ جن چیزوں کی مکھیوں کو ضرورت ہوتی ہے، اسی وقت اس کو حاصل کرنے کے لیے نکل پڑتی ہیں۔ یہ جدوجہد بہت سرگرمی اور ہوشیاری کے ساتھ کرتی ہیں۔ مکھیاں اپنا کوئی بھی کام بغیر سوچے سمجھے نہیں کرتیں بلکہ ذمہ داریوں کو سوجھ بوجھ سے اچھے ڈھنگ اور سلسلہ وار طریقے سے مقررہ وقت پر کرتی ہیں۔ یہ اپنے فرائض سے کبھی مکرتی نہیں بلکہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتی ہیں ان میں بہت اتحاد ہوتا ہے۔ یہ جب اپنے دشمن پر حملہ کرتی ہیں تو ایک ساتھ مل کر انتہائی منظم طریقے پر کرتی ہیں شہد کی مکھیوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مکھیاں ہوا اور صفائی کا خاص طور پر انتظام رکھتی ہیں اور بہت سی مکھیاں صفائی ستھرائی کے کام میں مصروف ملیں گی۔ ان کے چھتوں کی کوٹھریوں میں کچھ کیڑے چوری سے انڈے دے جاتے ہیں ان کی نگرانی یہ مکھیاں کرتی ہیں اور جب ان انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو ان کی خدمت اپنے بچوں کی طرح کرتی ہیں۔ ان کو بغیر کسی دشواری کے غذا دیتی ہیں۔ ان میں ایک بہت اچھی عادت یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی بھلائی پر دوسروں کو ترجیح دیتی ہیں اور اپنے گروپ کے فائدے اور بھلائی کے لیے جان تک قربان کرنے کو تیار ہوتی ہیں۔ یہ صفت اگر ہم انسانوں میں پیدا ہو جائے تو بہت سی بے کار باتوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور تمام انسانوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مکھیاں رس چوسنے کے لیے جاتی ہیں تو اس کی دوری کیا ہوتی ہوگی اور وہ کم از کم کتنی بار آتی جاتی ہیں۔ اس طرح سے وہ کتنی دوری طے کر لیتی ہیں اور کتنا شہد بنا لیتی ہیں، یہ بات قابل غور ہے — چھتے سے پھولوں تک (رس چوسنے کے لیے) آنے جانے میں کم از کم آدھا میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مطابق ایک مکھی کو ایک پونڈ شہد اکٹھا کرنے کے لیے بیس ہزار میل کا سفر کرنا پڑے گا۔ چھتے سے پھولوں تک آنے جانے کے لیے بیس ہزار چکر لگانے پڑیں گے لیکن ہوتا کچھ اور ہے۔ چونکہ شہد میں آدھے سے زیادہ موم ہوتا ہے اس لیے خالص شہد کی مقدار کے لیے (یعنی ایک پونڈ شہد کے لیے) کم از کم چالیس ہزار چکر لگانے ہوں گے۔

شہد کی مکھی کا وزن بہت کم ہوتا ہے۔ ایک اونس کا تین سوواں حصہ۔ وزن معلوم ہونے پر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے اندر کتنا شہد رکھ سکتی ہیں۔ جو شہد اس کے اندر موجود ہوگا اس کا وزن ایک اونس کا ایک ہزار دو سو پچاسواں حصہ ہوگا۔ مکھی کے وزن کا چوتھائی وزن کے برابر ہوتا ہے۔

جو شہد مکھیاں پھولوں سے اکٹھا کرتی ہیں ان میں سے سرسوں کے پھول سے جمع کیا گیا شہد بہت اچھا ہوتا

مفید مانا جاتا ہے۔ یہ صحت کے لیے بہت فائدے مند ہوتا ہے اور یہ کافی دنوں تک رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ٹیسٹ (Taste) میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اس لیے اس کا استعمال بہت سی دواوں میں بھی کیا جاتا ہے۔

ہزاروں میل کا سفر کر کے مکھیاں اتنی زیادہ تعداد میں شہد اکٹھا کرتی ہیں، یہ سوال ذہن میں آئے گا اور آنا بھی چاہیے۔ چوں کہ شہد کی مکھیاں برسات اور ٹھنڈ کے موسم میں شہد بنانے کا کام نہیں کرتیں اس لیے یہ اس موسم میں جمع شدہ شہد کو اپنے استعمال میں لانے کے لیے محفوظ رکھتی ہیں۔ شہد کی مکھیاں صرف گرمی اور موسم بہار میں ہی شہد بناتی ہیں اس لیے گرمیاں اور برسات کے موسم میں شہد کے لیے بھاگ دوڑ تیز رکھتی ہیں

مکڑی

مکڑی بھی شہد کی مکھی طرح انتہائی سمجھ دار اور دور اندیش کیڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ شہد کی مکھی کی طرح اس کا ذکر بھی قرآن کریم میں کیا ہے اور ایک پوری سورت کا نام (عنکبوت) اس کے نام پر رکھا ہے۔ مکڑی دنیا کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے اور ہر جگہ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ الگ الگ ہے انسان کے لیے یہ زیادہ فائدہ مند تو نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر ان کو مکمل آزادی دے دی جائے تو پورے گھر کو جالوں سے بھر دیں گی اور مکھیوں سے نجات دلا دیں گی۔ مکھیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے مکڑیاں ہمارے لیے ایک نعمت ہیں تو دوسری جانب اگر ہم اپنے گھروں کی صفائی ستھرائی نہ کریں تو ہمارے گھروں میں مکڑیوں کی صناعی کے دلکش نمونے دیکھنے کو ملیں گے۔ آپ اگر غور کریں تو سب ہی مکڑیاں اس طرح کی نہیں ہوتیں۔ ان کی ایسی قسمیں بھی ہوتی ہیں جو گھروں کو خراب نہیں کرتیں۔ یہ مکڑیاں مکھیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے کیڑے مکوڑوں کا بھی شکار کرتی ہیں۔ بہت سے کیڑے مکوڑوں سے نجات تو دلاتی ہیں مگر بعض کیڑوں کے شکار کے اثرات انسان پر بھی پڑتے ہیں جو مُضر ہوتے ہیں۔ دوسرے کیڑے مکوڑوں کے مقابلے میں مکڑیوں کی طرف شروع ہی سے کم توجہ دی گئی ہے اس لیے یہ شہد کی مکھی یا چیونٹی وغیرہ کی طرح مقبولیت حاصل نہ کر سکی

مکڑی کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو کاٹتی ہے اور دوسری جو کاٹتی نہیں۔ زہریلی مکڑیاں چمکیلی اور خوب صورت ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس عام مکڑیوں کا رنگ ایسا نہیں ہوتا۔ عام مکڑیوں میں کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انسان کے جسم کے کسی حصے پر رینگ جائیں تو اس جگہ چھالے پڑ جاتے ہیں اور اس کی تکلیف کچھ دنوں تک رہتی ہے۔ مکڑی اپنے اندر بے شمار دھاگے رکھتی ہے اور اس کا استعمال جالے بنانے میں کرتی ہے۔ یہ جسم کے اندر کی وہ گانٹھ ہے جو پیٹ میں موجود ہوتی ہے۔ اس میں ایسا سامان ہر وقت موجود رہتا ہے جو ضرورت کے مطابق جب چاہے باریک سے باریک دھاگا نکال کر استعمال کر سکتی ہے یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے وہ اپنے دشمن اور شکار پر فتح اور قابو حاصل کر لیتی ہے۔

مکڑی اپنے جسم کی تقسیم کے اعتبار سے تین حصوں میں منقسم ہے۔ اگلا حصہ، پچھلا حصہ اور سر۔ اس کی آٹھ آنکھیں اور آٹھ ٹانگیں ہوتی ہیں۔ سر جسم سے ملا ہوا ہوتا ہے اور ٹانگوں میں بہت باریک نظر نہ آنے والی ایک کنگھی ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے وہ جسم اور جالوں کو صاف کرتی رہتی ہے۔ نئے بال بھی نکلتے رہتے ہیں۔ اگر اس کی

کوئی ٹانگ ٹوٹ جائے تو بال جھڑنے کے بعد نئے بال نکلتے وقت اس جگہ سے ایک شگوفہ سا نکلتا ہے جو اتنا زیادہ بڑھتا ہے کہ ٹانگ بن جاتا ہے جو بعد میں جال بننے اور دوسرے کام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مکڑی انڈے دیتی ہے۔ ایک وقت میں ان انڈوں کی تعداد تقریباً پانچ سو ہوتی ہے۔ بعض ایسی مکڑیاں بھی پائی جاتی ہیں جن کے انڈے دینے کی تعداد دو ہزار تک ہوتی ہے۔ ان انڈوں میں سے تین چوتھائی ضائع ہو جاتے ہیں اور ایک چوتھائی بچتے ہیں۔ ان ایک چوتھائی میں جو پہلے ہوتے ہیں وہ باقی ماندہ انڈوں کو کھا جاتے ہیں۔ اس طرح ایک چوتھائی سے بھی کم بچتے ہیں۔ ان کے بچے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں جو آسانی سے نظر نہیں آتے۔ جب تک بچے خود اپنی ضرورت پوری کرنے کے لائق نہیں ہو جاتے مکڑیاں ان کو اپنے اوپر بٹھائے پھرتی ہیں۔ کچھ مکڑیاں جھولا بنا کر اپنے بچوں کو کسی ٹہنی یا پتے سے لٹکا دیتی ہیں، جو ہوا کی مدد سے جھولتا رہتا ہے۔ وہ کبھی کبھی جھولے میں انڈے دے کر اوپر سے اُن کو اچھی طرح ڈھک دیتی ہیں تاکہ دوسرے کیڑے مکوڑے ان کو نہ کھا جائیں۔

مکڑی کے اندر بہت ہی باریک رگ ہوتی ہے جس سے باریک دھاگے نکل کر اکٹھا ہوتے رہتے ہیں مکڑی ان ہی کو بٹ کر جالا بنتی ہے۔ جب وہ جالا بننا شروع کرتی ہے تو وہ ایک سرے کو کسی نہ کسی چیز کے سہارے سے چپکا دیتی ہے یا پھر دھاگے کو ہوا میں لٹکا دیتی ہے۔ ہوا اس کو کسی نہ کسی چیز سے چپکا دیتی ہے۔ جب ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ دھاگا کہیں نہ کہیں چپک گیا ہے تو وہ اس چپکے ہوئے دھاگے کے سہارے آتی ہیں اور اسی طرح کے قریب ۲۰ دھاگے اور چپکا دیتی ہیں۔ ہر ایک دھاگہ ایک دوسرے کو ایک جگہ پر کاٹتا ہے اور سبھی کی دوری ایک دوسرے کے برابر ہوتی ہے۔ اس عمل کو کرنے کے بعد مکڑی نئے دھاگے نکال کر اس کے اوپر چاروں طرف اس طرح بُنتی جاتی ہے کہ دائرے کے اندر دائرہ بنتا جاتا ہے۔ یہ بھی تعداد میں بیس ہوتے ہیں اور ان کی بھی دوری برابر ہوتی ہے اور سبھی ایک دوسرے کے اندر ہوتے ہیں۔ تب کہیں مکڑی اپنا جالا بُن کر تیار کرتی ہے۔

مکڑی کی خوراک کیڑے مکوڑے ہیں۔ بعض انسان کا گوشت بھی کھاتی ہیں۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق کوئی مکڑی ایسی نہیں پائی گئی جو ساگ پات پر زندگی بسر کرتی ہو۔ ان کے اندر جو خصلت پائی جاتی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مکڑی فریبی، سنگ دل اور بہت زیادہ چالاک ہوتی ہے۔ چالاک ہونے کی وجہ سے وہ اپنی عیاری اور مکاری کا شکار کیڑے مکوڑوں کو بنا لیتی ہے اور اپنا پیٹ پالتی ہے۔ دوسرے کیڑے مکوڑوں کی نسبت یہ ڈیل ڈول میں زیادہ اور طاقت ور ہوتی ہے۔ اپنا پیٹ پالنے کے لیے یہ سخت محنت و مشقت بھی کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ادنیٰ ترین مخلوق اپنی ذہانت فطانت اور ذکاوت میں اعلیٰ ترین مخلوق یعنی انسان کی بھی مختلف انداز سے خدمت کرتی رہتی ہے۔ شہد مختلف بیماریوں میں انسان کی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر فکر و تدبّر سے کام لے تو اس حقیر ترین مخلوق سے بہت کچھ انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے یعنی نظم و نسق، محنت و مشقت، ذہانت و فطانت ہمدردی اور دل جوئی اور سب سے بڑی چیز الفت و محبت جو آج انسان سے بالکل ناپید ہو چکی ہے۔

سر شاہ محمد سلیمان

محمد مصعب فیروز *

چیف جسٹس الٰہ آباد ہائی کورٹ کی عدالت کے باہر ماربل ہال سے گزرتے وقت نگاہیں بے ساختہ دیوار میں نصب ماربل کی اس تختی پر ٹھہر جاتی ہیں، جس پر لکھا ہے:

سر شاہ محمد سلیمان کے۔ ٹی
ایم۔ اے، ایل ایل ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا
کی یاد میں

جونیئر جج	۱۹۲۳ء
چیف جسٹس	۱۹۳۲ء
جج فیڈرل کورٹ	۱۹۳۷ء
وصال	۱۲ر مارچ ۱۹۴۱ء

۱۹۱۴ء کے بعد اگلے تیس سالوں میں بڑے بڑے مایہ ناز جج ہوئے ہیں، ان میں سے ایک ہستی جس نے اپنی اعلیٰ قانونی صلاحیتوں اور علمیت کی بنا پر خوب نام کمایا، سر شاہ محمد سلیمان تھے۔ انھوں نے علمی دنیا میں کم وبیش جسٹس محمود کے برابر شہرت پائی۔ جسٹس محمود الٰہ آباد ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی جج تھے۔

شاہ محمد سلیمان ۳ر فروری ۱۸۸۶ء کو جون پور میں پیدا ہوئے ان کے والد مولوی محمد عثمان کا شمار جون پور میں بیرسٹران کی انجمن کے قابل لوگوں میں ہوتا تھا۔

شروع سے ہی ان کے عالمانہ جوہر غیر معمولی تھے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ میں فرسٹ ڈویژن پاس ہونے کے بعد انھوں نے میور سینٹرل کالج سے الٰہ آباد یونیورسٹی کے تحت ہونے والے امتحانات میں ۱۹۰۶ء میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن کے ساتھ بی اے پاس کیا اسی سال سید فضل علی جنھوں نے آگے چل کر قانون کی دنیا میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے بھی بی۔ ایس سی میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ سلیمان نے مجموعی طور پر فضل علی سے پانچ نمبر زیادہ حاصل کیے تھے۔ اس لیے انھیں لندن میں اعلیٰ تعلیم کے لیے صوبۂ متحدہ کا سرکاری وظیفہ عنایت کیا گیا۔ اس وظیفے نے انھیں کیمبرج تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دی۔ اس طرح شروع سے لے کر آخر تک ایک ذہین طالب علم کی حیثیت سے چمکنے والے شاہ سلیمان نے اپنی قابلیت کے بل بوتے پر کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹۰۹ء میں حساب اور ۱۹۱۰ء میں قانون کے آخری امتحانات پاس

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ قانون، ۲۲ر جوبلی ہوسٹل۔ وی۔ ایم ہال، اے ایم یو علی گڑھ

کیے۔ فضل علی کو بھی اپنے والدین سے مالی تعاون حاصل تھا
لندن پہنچے اور انھوں نے شاہ سلیمان کے ساتھ ساتھ اپنے
کیریر کا آغاز کیا۔ ۱۹۰۹ء میں دونوں حضرات آئی سی۔ ایس
میں بیٹھے اور دونوں ناکام ہوئے۔ تب انھوں نے وکالت
کے پیشے کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ فضل علی ہندوستان
لوٹ آئے جب کہ شاہ سلیمان ڈبلن یونیورسٹی سے قانون
میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے وہیں ٹھہر گئے۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد انھوں نے
اپنے والد کے ساتھ جون پور میں وکالت شروع کی، لیکن
ان کی سیاسی طبیعت اور پُر شباب آرزوؤں نے یہ گوارا
نہیں کیا کہ وہ اپنی وکالت کی پریکٹس کو محض ایک ضلع تک
محدود رکھیں۔ لہٰذا انھوں نے ۱۹۱۲ء میں الٰہ آباد ہائی
کورٹ کا رخ کیا۔ ان کی ہندوستان واپسی کا ذکر پروفیسر
رشید احمد صدیقی نے مضمون "سر شاہ محمد سلیمان
چند یادیں" میں اس طرح کیا ہے۔

"میں اسکول کے ابتدائی درجوں میں
پڑھتا تھا اور گورنمنٹ اسکول کے بورڈنگ
ہاؤس میں جو شہر کے عین وسط میں واقع
ہے، رہتا تھا۔ سامنے لوہے کی مضبوط
سلاخوں کا جنگلا بورڈنگ ہاؤس اور
شاہراہ کے درمیان حدِّ فاصل تھا۔ تھوڑی
دیر میں ایک جلوس گزرنے لگا۔ پھولوں
سے لدی اور سجی ہوئی اور گھوڑوں کی ایک
پُر تکلف گاڑی گزر رہی تھی جس میں چند
بزرگوں عزیزوں کے ساتھ ایک معمولی
جسامت لیکن نمایاں ذکاوت کا ایک
خوش رو نوجوان بیٹھا ہوا تھا جس کو کسی
پہلو قرار نہ تھا۔ کبھی جھک کر دائیں بائیں
دیکھتا، کبھی ہار پھولوں سے الجھ جاتا، کبھی
پاس والوں سے جلد جلد باتیں کرنے لگتا
کبھی گاڑی کے تکیے سے پیٹھ لگا لیتا، لیکن فوراً
ہی آگے جھک کر کچھ دیکھنے لگتا اور کبھی ایسا
معلوم ہوتا کہ جیسے اکتا کر جلوس کو چیرتا پھاڑتا
کودتا پھاندتا سب سے آگے نکل جائے گا
ہر چھوٹا بڑا جوان بوڑھا یہ سمجھتا تھا کہ یہ خوشی
اسی کے گھر اتری ہے اور خوشی کے اظہار میں
ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش
کرتا۔ یہ جون پور کے مشہور گھرانے
اور سب سے مشہور وکیل حافظ محمد عثمان
صاحب کے بڑے لڑکے شاہ محمد سلیمان تھے
جو ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس
کر کے وطن واپس ہوئے تھے۔"[1]

اپنے پیشے کے ابتدائی سالوں میں انھوں نے بے شمار مقدموں کی پیروی کی۔ انھوں نے اس قانون سے بھی اپنا تعلق بنائے رکھا جو کہ کتابوں میں درج ہے اور اس قانون سے بھی اپنے روابط رکھے جو کہ اس دور کی ضرورت تھی۔ ان کی انتھک لگن اور جہدِ مسلسل نے عدالت کے ججوں اور بیرسٹروں کی انجمن میں ان کے سینیروں کو بہت متاثر کیا۔ وہ اکثر دوسرے دن کی بحث کے لیے اختصاریہ تیار کرنے کی غرض سے اپنے دفتر میں دیر رات تک کام کرتے رہتے تھے اور اس کام میں وہ ایسا گم ہو جاتے تھے کہ انھیں کھانے کے وقت کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ جب ان کی اہلیہ انھیں کھانے کے لیے اٹھنے کی درخواست کرتے کرتے تھک جاتیں تھیں تو وہ جھنجھلا کر گھر کے بجلی کے مین سوئچ کو آف کر دیا کرتی تھیں تاکہ ان کا دفتر اندھیرے میں ڈوب جائے۔[1]

الٰہ آباد بار میں پریکٹس کرنے والے بیرسٹر حضرات اس وقت تک عام طور پر صرف فوج داری کے مقدموں کو ہی

دیکھتے تھے۔ شاہ سلیمان پہلے شخص تھے جنھوں نے اس روایت کو توڑا۔ جلد ہی ان کی طلب ہائی کورٹ میں بلکہ دور دراز کے اضلاع میں بھی ہونے لگی اور ان کا نام اس قدر شہرت پا گیا کہ وہ جلد ہی بیرسٹروں کی انجمن میں لیڈر کی حیثیت سے جانے جانے لگے۔ قانون پر ان کی زبردست گرفت اور ان کی موثر اور تفریقی ذہانت نے لگاتار دو چیف جسٹسوں سر ہنری رچرڈس (Sir Henry Richards) اور سر گریم ووڈ میرس (Sir Grimwood Mears) کی توجہ ایک کے بعد ایک اپنی جانب مبذول کرائی۔ جب وہ فقط ۳۳ سال کے تھے تو انھیں منصف حضرات کی بنچ پر قایم مقام افسر کی حیثیت سے تقرری کی پیش کش کی گئی۔ انھوں نے ۵ اپریل ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۱ اگست ۱۹۲۰ء تک الہ آباد ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے کام کیا اور اس حیثیت سے ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں بھی مختصر مدتوں کے لیے کام کیا۔ اس کے بعد وہ انجمن بیرسٹران میں لوٹ آئے اور بیرسٹری کرنے لگے مگر ان کی واپسی کی مدت بہت تھوڑی تھی۔ ان کی منصفانہ صلاحیت اور ذہانت جس نے قایم مقامی کے دوران ان تمام لوگوں پر اپنا سکہ جما لیا تھا جو ان کے دور منصفی میں ان کے سامنے حاضر ہوتے تھے، نے جلد ہی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کے لیے عدالت میں ایک مستقل جگہ کی پیش کش کرے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۲۳ء کو انھیں عدالت میں معاون جج کی حیثیت سے ترقی دے دی گئی۔ الہ آباد لا جرنل نے رپورٹنگ کرتے ہوئے اس موقع کو اس تعریف نامے کے ساتھ ریکارڈ کیا ہے:

"ہائی کورٹ میں ڈاکٹر سلیمان کی زندگی ذہانت اور قابلیت کا مینار ہے اور یہ یقینی طور پر ان کا بہت بڑا ایثار ہے کہ انھوں نے اعلیٰ عدالت کی جج شپ کو قبول کیا۔ ایسا کرتے ہوئے انھوں نے بیرسٹروں کی نفیس روایات کو برقرار رکھا کہ جس کے تحت ایک کامیاب وکیل ملک کے اخلاقی ضابطوں کے تحت اس بات کا پابند ہے کہ جب اسے شہنشاہ و قوم کی جانب سے بلایا جائے تو وہ جج کی کرسی پر بیٹھ کر خدمت انجام دے۔ دو دفعہ قایم مقام جج کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اخلاق، تحمل اور انصاف کی بے پناہ آرزو کے ذریعے انجمن بیرسٹران کے سبھی طبقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔"

شاہ سلیمان نے عدل و انصاف کے منظر پر ان خصوصیات کو لا کھڑا کیا کہ جلد ہی ان کا شمار عدالت کے عظیم ججوں میں ہونے لگا۔ درحقیقت وہ پورے ملک میں مایہ ناز شخصیت تھے جیسا کہ بعد میں تیج بہادر سپرو نے انھیں پہچانا:

"قدرت نے انھیں غیر معمولی کردار کے عطیہ سے نوازا تھا۔ وہ ایک ایسے تشریحی اور تجزیاتی دماغ اور زیرک فراست کے حامل تھے کہ جو بہت ہی کم لوگوں کی تقدیر تھا۔ جب وہ عدالت کی کرسی پر بیٹھتے تھے تو لوگ فوراً یہ محسوس کرنے لگتے تھے کہ ان کے سامنے ایک غیر معمولی قابلیت اور بے مثال ذہانت والا جج بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی علمیت کی گہرائی، ذکی الفہمی اور جلدی فیصلہ کرنے کی قوت کی وجہ سے انھیں لوگوں سے بڑی تکریم نصیب ہوئی۔"

آپ کے مزاج میں ایسی شگفتگی تھی کہ آپ جونیئر وکلا کی مقدمے کی پیروی میں حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہ عام روایت تھی کہ عدالت میں حاضری دینے والا کوئی بھی جونیئر محض اس وجہ سے خود کو نروس نہیں محسوس کرتا تھا کہ مشہور و معروف سینئر وکلا اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

۱۹۲۹ء میں حاکمِ وقت کے ذریعے انھیں اعزاز دیا گیا
ان سے سرگرم ووڈ میرس Sir Grimwood
Mears کی غیر موجودگی میں چیف جسٹس کی حیثیت سے
کام کیا اور اس کے بعد پشاور انکوائری کمیٹی میں بحیثیت کارکن
خدمت کی۔ یہ کمیٹی ۱۹۳۰ء میں پشاور میں ہونے والے فسادات
کی تفتیش کے لیے قایم کی گئی تھی۔

۱۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو چیف جسٹس سرگرم ووڈ میرس
رٹائر ہو گئے اور سر شاہ محمد سلیمان کی اس اعلیٰ منصب پر
تقرری کی گئی۔ یہ اس وقت کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ تھا
اور صوبے کے لیے انتہائی اہم بات تھی۔ سر سلیمان الٰہ آباد
ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی چیف جسٹس تھے۔

بحیثیت چیف جسٹس ذمّہ داری سنبھالتے ہی
ان کا تقرر انگلینڈ میں کیپیٹیشن ریٹس ٹریبونل Capita
tion Rates Tribunal کی خدمت کے لیے کر دیا گیا
سر رابرٹ گارن Sir Robert Garran
جو کہ آسٹریلیا کے رہنے والے تھے اس خصوصی عدالت کے
صدر تھے اور لارڈ ڈیونیڈن Lord Dunedin
ٹوملن (Tomlin) اور سر شادی لال دیگر معاونین تھے۔
کچھ دنوں بعد اس عدالت کے سامنے فوجی مالیات جیسے
مشکل مسایل آئے جنھیں سر شاہ سلیمان نے اس حسن و خوبی
سے حل کیا کہ انگلینڈ میں انجمن بیرسٹران کی نظروں میں ان
کی وقعت میں اضافہ ہو گیا۔

سر شاہ سلیمان نے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں قانون
کی ترویج و ارتقاء کے لیے جو جو کوششیں کی ہیں قلم کے ذریعے
ان کا تفصیلی جائزہ لینا انتہائی مشکل ہے۔ ان کی اعلیٰ ذہانت
اور تجدیدی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی دقت
نہیں ہے کہ وہ قانون کی ہر شاخ میں برابر کی دسترس رکھتے
تھے۔ وہ اور ان کے ساتھی جج جسٹس ینگ Justice
Young نے مشہور ترین "میرٹھ کے سازشی مقدمے"
کو جلدی جلدی نبٹانے میں کل ہند ریکارڈ قایم کیا تھا۔ اس
مقدمے میں ۱۸ لوگوں پر الزامات تھے جن میں تین برطانوی
اور ۱۵ دوسرے ہندوستانی سیاست داں تھے جو کہ کمیونسٹ
پارٹی کے ارکان تھے۔ ان حضرات پر ہندوستانی حکومت
کے تختہ پلٹنے کی مجرمانہ سازش کا الزام تھا۔ اس مقدمے
کی ۱۵ ماہ تک ایک مجسٹریٹ کے روبرو مسلسل وضاحت
کی گئی اور پورے دو سال تک اس کی سیشن عدالت
میں یومیہ سماعت ہوئی۔ اس پورے قضیے کا جو ریکارڈ
تیار کیا گیا وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ عدالت کے قابل
جج صاحبان نے اپنے فیصلے کی تیاری میں ۶ مہینے سے زیادہ
کا وقت لیا اور یہ فیصلے تقریباً ۸۰۰ بڑے سائز کے صفحات
پر مشتمل تھے۔ حکومت نے سیشن جج کے سامنے مقدمے
کو پیش کرنے کے لیے بمبئی سے ایک بیرسٹر مسٹر کیمپ
(Mr. Kemp) کو خصوصی وکیل کی حیثیت سے طلب
کیا جو ہائی کورٹ میں بھی حاضر ہوئے اور ان کا خیال
تھا کہ ہائی کورٹ میں اس پورے مقدمے کی اپیل کی
سماعت میں کم از کم ۳ ماہ کا عرصہ لگے گا۔ درخواست
کنندگان کی جانب سے ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو مع اپنے
کچھ ساتھیوں کے حاضر ہوئے، جنھوں نے اپنے دلایل کو
۵ دنوں میں عدالت میں ختم کیا۔ جواب میں مسٹر کیمپ
نے ۲ دن لیے اور آٹھویں دن جسٹس شاہ سلیمان نے
عدالت میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے کی طوالت کا
اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے
تقریباً ۶ گھنٹے تک اس کا املا کرایا تھا۔

ڈاکٹر شاہ سلیمان کی ذہانت کی شہرت جو اس
وقت پورے ملک میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، کو
دیکھتے ہوئے مئی ۱۹۳۷ء میں انھیں ہندوستان کے
فیڈرل کورٹ (مرکزی عدالت) کا جج مقرر کیا گیا۔
مرکزی عدالت کی تاریخ کے تقریباً ابتدائی دنوں

سے ہی اور خاص کر اس وقت سے جب کہ عدالت میں سب سے پہلا مقدمہ "سی پی موٹر اسپرٹ ایکٹ (C.P. Motor Spirit Act) پیش ہوا ایک جج کی حیثیت سے ان کی قابلیت لوگوں کے سامنے اجاگر ہوگئی۔ یہ مقدمہ مرکزی عدالت کو گورنر جنرل کی جانب سے دیا گیا اشاریہ تھا جس میں حکومت ہند اور مرکزی صوبوں کی حکومتوں کے بیچ پیدا ہو جانے والے تنازعہ سے متعلق آرا کو واضح کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا گیا تھا۔ اس میں اس بات کا احترام کیا گیا تھا کہ صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کو موٹر کی اسپرٹ اور گاڑیوں میں استعمال ہونے والی چکنائی پر سیل ٹیکس عاید کرنے کا اختیار ہے لیکن کھرجی دماغ کا استعمال کرتے ہوئے سر شاہ سلیمان نے ایک طرف تو کسٹم اور داخلی محصولات کو الگ الگ کیا اور دوسری جانب چنگر سیل ٹیکس کو ان دونوں ٹیکسوں سے ممیز کیا۔ انھوں نے بالواسطہ اور بلاواسطہ محصولات کی اصطلاح کو صرف اقتصادیات کے ماہر اور قومی مالیات کے طالب علم کی حیثیت سے دیکھتے ہوئے اس کے تاریخی پس منظر میں اس کا جائزہ لیا۔ ان کی رائے کو ایک مشہور برطانوی وکیل جے۔ ایچ۔ مورگن (J. H. Morgan) نے مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے:

> "ابھی میں فیڈرل کورٹ دہلی کے ان فیصلوں کو پڑھ رہا تھا جو صوبہ جات کے اختیار محصول ساخت کے اہم مقدمے میں دیے گئے ہیں ان میں سے ایک تجویز نہایت اہم اور درخشاں ہے اور اس قانون کو یہ ایک اعلیٰ درجے کی نظیر ثابت ہوگی۔ یہ ایسی تجویز ہے جو دارالامرا اور عدالت عالیہ انگلستان نیز پریوی کونسل کی اعلیٰ ترین روایات کے شایان ہے۔ میرا اشارہ مسٹر جسٹس سلیمان کی فاضلانہ تجویز کی طرف ہے۔ یہ فیصلہ دقت نظر، وسعت خیال اور تحلیل و تشریح کی قدرت میں اور انداز بیان کی دلاویزی و خوش نمائی میں ایسا فاضلانہ اور معرکہ آرا ہے کہ مجھے اس پایہ کے بہت کم فیصلے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہندوستان کے ہر اس شخص کو جو آئندہ آئین کے نشو و نما سے دلچسپی رکھتا ہے اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔"[۶]

بے مثال قابلیت، غیر معمولی ذہانت اور عمدہ اخلاق جو کہ ان کے نام کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، کی صفات کے علاوہ سر شاہ سلیمان ایک بہت ہی پُر لطف شخصیت کے حامل تھے۔ مسٹر آنند سروپ مشرا جو لکھنو ہائی کورٹ بینچ میں وکیل تھے، نے اپنی کتاب "قانونی پیروی کے اصول و عمل Principles and Practice of Judicial Profession" میں ایک واقعہ جس کا تعلق خود مصنف سے ہے نقل کیا ہے[۷]

یہ واقعہ ۱۹۳۲ء سے پہلے کا ہے۔ اس دوران میں نے الٰہ آباد کی ضلعی عدالت میں منشی نول کشور کے جونیر کی حیثیت سے دو سال گزارے تھے۔ ان کی رہنمائی میں میں نے عدالتی فیس کی دفعہ اور عدالتی چارہ جوئی کی قیمت کی دفعہ پر ایک مختصر تبصرہ شائع کروایا۔ میں اس کتابچہ کی ایک کاپی چیف جسٹس سر شاہ سلیمان کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ صبح کے وقت چھٹی کے دن ان کی رہائش گاہ پر پہنچ کر میں نے اپنا ملاقاتی کارڈ اندر بھجوایا۔ جس کا جواب ان کا چپراسی فوراً لایا اور یہ اطلاع دی کہ صاحب جلد ہی

آپ کو بلائیں گے۔ کچھ منٹ کے بعد میں نے یہ آواز سنی کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہو "کم ان" (come in) جیسے ہی میں اندر داخل ہوا سر سلیمان نے معذرت خواہانہ لہجہ میں فرمایا کہ میں چند منٹ تک انتظار کروں تاکہ اس بیچ میں وہ اپنے املا کو مکمل کرلیں۔ اس پر میں نے وضاحت کی کہ لفظ "کم ان" میری سماعت سے ٹکرایا تھا۔ اس پر انھوں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایک تصدیق نامہ کا املا کرا رہے تھے جس میں انھوں نے لفظ "کم ان" استعمال کیا تھا جس کا مفہوم تھا کہ امیدوار ایک ذمہ دار فرد ہے جو ایک قابل احترام خاندان سے آیا ہے۔ اس غلط فہمی نے ہم دونوں کو خوب مسرور کیا۔ چند منٹوں کے بعد سر سلیمان نے مجھے بلالیا اور جیسے ہی میں اندر داخل ہوا وہ نشست پیش کرنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ میں نے انھیں کتاب کی ایک نقل پیش کی جسے انھوں نے بڑی مسرت سے قبول کیا، میری کوششوں کو سراہا اور کچھ ذاتی نوعیت کے سوالات کیے۔ کچھ دنوں بعد ۲۴ مئی ۱۹۳۲ء کو ان کا ایک خط موصول ہوا جس میں انھوں نے میری حلیمانہ کوششوں کی خوب تعریف کی۔ اس واقعہ کے کچھ سال بیت جانے کے بعد ہائی کورٹ کی گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میں نے سر سلیمان کو شام کے وقت نینی تال میں دیکھا۔ اس وقت وہ تنہا تھے اور اس پرسکون مقام پر کھڑے ہوکر کسی چیز کا بلا ارادہ نظارہ کر رہے تھے میں نے انھیں سلام کیا جس کا انھوں نے بڑی ملائمیت جانی پہچانی مسکراہٹ اور ہلکا سا سر کو خم کرکے جواب دیا جیسے ہی میں جانے لگا وہ میرے قریب آئے اور انھوں نے مجھ سے میری خیریت دریافت کی۔ ساتھ ہی ساتھ میری کتاب کا بھی حوالہ دیا۔ یہ میرے لیے انتہائی حیرت و استعجاب کی بات تھی کیوں کہ میں اُن سے اپنی کتاب

کو پیش کرنے کی خاطر فقط ایک بار ملا تھا اور اس وقت سے اب تک کئی سال بیت چکے تھے۔ فی الواقعہ مجھے اس پر حیرت زدہ نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ ان کی شاندار یادداشت اور مزاج کی نرمی ان کی بے شمار خصوصیات کا حصہ تھی۔

قانون کے پیشے میں زبردست مشغولیت کے باوجود سر سلیمان نے حساب اور فلکیات کے میدانوں میں اپنا تحقیقی شغل جاری رکھا۔ وہ فطرۃً ایک سائنس داں تھے۔ لہٰذا وہ ہر شام اپنی رہائش گاہ کے اس حصّے میں گزارنا پسند فرماتے تھے جہاں پر مختلف طرح کے سائنسی آلات اور مشینی کل پرزے رکھے رہتے تھے۔ سر سلیمان خود کو آئن سٹائن (Einstein) کے ذریعے پیش کیے گئے "اصول تفاوت" کے اطلاق کو کلّی طور پر ماننے کے لیے کبھی آمادہ نہ کرسکے۔ انھوں نے اپنا ایک منفرد نظریہ پیش کیا جو کہ روشنی کی آگے کی رفتار (Forward Velocity of light) اور الکٹران کی گردشی رفتار Rotational Velocity of electron) کے اصولوں سے اخذ کیا گیا تھا۔ یہ اصول نہ صرف نیوٹن کے کششِ ثقل کے قانون ۔ Newton's law of Gravitation سے ہٹ کر تھا بلکہ اس کے ذریعے آئن سٹائن کے اصول کے اطلاق میں جو پیچیدگی باقی رہ گئی تھی اس کی بھی تشریح ممکن تھی۔ ان کے اس کارنامے نے ہندوستان اور ہندوستان کے باہر ہر جگہ امتیاز حاصل کیا اور بڑے بڑے سائنس دانوں جس میں ہارورڈ کے ڈاکٹر ہارلو شاپلے Dr Harlow Shapley جیسی استفادی (Applied Mathematics) حساب کی دنیا کی اہم شخصیت بھی شامل ہے، نے ان کے کارناموں کو دیکھ کر ان کی تعریف کی۔

وقت کا عظیم سائنس داں اور ماہر قانون زندگی کی

نغمگی اور اس کے مزاج سے بھی پورا پورا آشنا تھا۔ اردو اور فارسی شاعری نے ان کے شستہ اور تمدن دماغ کو اپنی طرف کھینچا اور وہ اکثر و بیشتر ایسی ادبی مجالس کی صدارت فرمایا کرتے تھے، جہاں پر اس قسم کی تخلیقات پیش کی جاتی تھیں۔

تعلیم کی دنیا سے بھی انہیں گہرا شغف تھا اور ابتدائی سالوں سے ہی وہ کئی ایک تعلیمی اداروں کی امداد کیا کرتے تھے۔ وہ کئی سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر رہے۔ انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کی کونسل عاملہ میں بھی شرکت فرمائی۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے اجمیر میں منعقد کل ہند محمڈن تعلیمی کانفرنس کی صدارت کی اور پھر دہلی میں ہونے والی کل ہند تعلیمی کانفرنس برائے بالغان کی صدارت فرمائی۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۰ء کو اودے پور میں سولہویں کل ہند تعلیمی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

" ہمارے پرائمری تعلیم کے گرتے ہوئے معیار کا بڑا سبب عام والدین کی غربت اور ناخواندگی ہے جس کی وجہ سے رہائشی حالت گندی اور طریقۂ زندگی غلیظ ہے اگر ہم ناواقف والدین تک پہنچنے کے لیے فکر مند ہیں تو اس کے لیے سماجی خدمت کے ایک ایسے بڑے پروگرام کی ضرورت ہے جس کے چلانے والے خادمین حوصلہ مند اور بے لوث ہوں اور جو ملک کے طول و عرض میں گھر گھر جانے کے لیے آمادہ ہوں اگر اس مقصد کو حاصل کرنا ہے تو کام کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ملکی پیمانے پر کوشش کی ضرورت ہے اور یہ سرگرمیاں پورے ملک میں پھیلائی جائیں۔"[2]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خاص طور سے ان کی خدمات کے لیے ان کی احسان مند ہے۔ کیوں کہ وہاں پر انھوں نے بحیثیت شیخ الجامعہ وہاں کی تعلیمی اور انتظامی زندگی کی از سر نو تنظیم فرمائی۔ اس کے لیے انھوں نے آکسفورڈ اور دوسری یونیورسٹیوں کا دورہ کیا۔[1] انھوں نے بحیثیت وائس چانسلر یونیورسٹی میں طلبا کے سامنے جو سب سے پہلے خطاب کیا اس کی روداد مسلم یونیورسٹی گزٹ یکم ستمبر ۱۹۳۸ء کا شمارہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

" وائس چانسلر نے اپنی گفتگو کا آغاز نوجوانوں اور بزرگوں کے مابین ہونے والے اختلافات کے حوالے سے کیا انھوں نے فرمایا کہ بزرگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ زیادہ تجربہ ہونے کی بنا پر مشورہ دینے کا حق رکھتے ہیں جب کہ نوجوان اس طرح کی خواہ مخواہ کی پیش کش پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ طلبا سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے مزید فرمایا کہ وہ اب ایسی زندگی میں قدم رکھنے والے ہیں جو کہ مسابقتوں اور زبردست جدوجہد سے بھری ہوئی ہے اور ان کی موجودہ تربیت اس طرح کی مشکلات کا سامنا کرنے کی غرض سے کی جا رہی ہے جو ان کے اندر مقابلہ کامیابی کی صلاحیت پیدا کرے گی۔ شیخ الجامعہ نے طلبا سے بڑے لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کی فرمائش کی اور اس جانب بھی ان کی توجہ مبذول کرائی کہ ان حضرات کی نمایاں اور قابل رشک خوبی سخت محنت تھی اس طرح یونیورسٹی کے طلبا کا نصب العین

...نا، مزید کام کرنا اور کام کرتے رہنا ہے۔" اگر وہ واقعی عظمت و بلندی کے خواہاں ہوں۔"

الحاج عبیدالرحمٰن خاں شیروانی مرحوم نے اپنے مضمون "یادیں سر شاہ سلیمان کی" میں تفصیل سے ان کے علی گڑھ قیام کے بارے میں لکھا ہے:

"عبداللطیف صاحب مرحوم و مغفور کا بیان ہے کہ ممدوح ہر ہفتے دہلی سے جمعہ کے دن تشریف لاتے۔ آنے سے قبل ایک پوسٹ کارڈ اپنے قلم سے تحریر فرماتے کہ ہم بعد نماز جمعہ میل سے روانہ ہوں گے اور چار بجے کے بعد پہنچیں گے۔ آپ موٹر لے کر اسٹیشن آجائیں اور تمام فائلیں ہمارے دفتر میں میز کے اوپر رکھ دیں تاکہ ہم پہنچتے ہی کام شروع کر دیں۔ راستے میں اس ہفتے کے تمام اہم واقعات ہمیں سنا دیں۔ چنانچہ دفتر پہنچتے ہی کام شروع کر دیتے۔ فرماتے سر سید ہال کے ڈائننگ ہال سے ہمارے لیے چار چپاتی، دو شامی کباب ایک پلیٹ قورمہ اور ایک پلیٹ چاول منگوائیں۔ وہیں دفتر میں کھانا تناول فرماتے۔ رات کو وہیں آرام کرتے مچھر دانیاں دو لگتے۔ ایک مسہری پر اور دوسری اس کے باہر جس میں کرسی میز بھی ہوتی تاکہ مچھروں سے حفاظت ہو سکے۔ اتوار کی دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد عبداللطیف صاحب سے فرمائش ہوتی کہ ہمارے کھانے کا بل ڈائننگ ہال سے منگوائیں۔ بل آتا۔ جیب سے بٹوا نکال کر اس سے پیسے نکال کر ان کے حوالے کرتے اور فرماتے کہ ہماری جانب سے یونیورسٹی کے آفس میں جمع ہو جائے اور ہمیں رسید مل جائے۔ دوران قیام میں جو بجلی وائس چانسلر ہاؤس میں جلتی اس کا حساب کرتے۔ لیڈی سر سلیمان مرحومہ اور ان کی صاحبزادی بچے اور ان کے ملازمین جن کمروں میں رہتے ان کی جو بجلی جلتی اس کا حساب لگا کر اپنی جیب سے ادا کرتے اور جن کمروں میں خود کام کرتے، میٹنگ کرتے ان کا حساب لگا کر مجھے لکھتے (میں اس وقت ٹریژرار تھا) کہ حساب لگا کر اتنی رقم یونیورسٹی سے ادا کر دو۔ چنانچہ اس کی ادائگی کی جاتی۔ یونیورسٹی سے جو سواری ملتی اسے یونیورسٹی کے کاموں میں استعمال کرتے تو اس میں جتنا پٹرول جلتا اس کا حساب لگا کر ٹریژرار کو یونیورسٹی سے ادا کرنے کا حکم دیتے اور لیڈی صاحبہ یا صاحبزادی کی سواری میں جو پٹرول خرچ ہوتا اس کا حساب لگا کر اپنی جیب سے ادا فرماتے، چائے خود پلاتے۔ یہ تھی دیانت، یہ تھی امانت۔[۱۱]"

۱۴ر نومبر ۱۹۳۸ء کو آگرہ یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

"اگر ہمارے آباو اجداد کو سنگ مرمر کا تاج محل تعمیر کرنے کی صلاحیت دی گئی تھی تو ہمیں اس سے سبق لینا چاہیے۔ اور آگرہ میں عقلی تاج محل تعمیر کرنے کی

کوشش کرنی چاہیے جو اپنی روشنی کو طول
عرض میں بکھیر دے اور ہر علم کے متلاشی
کو خواہ وہ کہیں کا ہو، اپنی جانب متوجہ
کرے۔"

اپنے افتتاحی کلمات میں انھوں نے فرمایا:
"آپ ایک ایسی زندگی میں داخل
ہونے والے ہیں جو اس سے زیادہ بکھری
ہوئی اور گنجلک ہے، جیسی زندگی آپ
کے بزرگوں نے گزاری ہے کیوں کہ ذریعہ
معاش کا سوال ماضی کے مقابلے میں آج
زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ زندہ
رہنے کے وسایل کا حصول دن بدن
دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ وہ حمایت و
تعاون جو آپ کے گھر کے بڑے اور
یونیورسٹی کے اساتذہ اس وقت آپ
کو دے رہے ہیں۔ اسے زیادہ دیر تک
قایم نہیں رہنا ہے۔ کیوں کہ زیادہ تر سرکاری
ملازمین کا تقرر مقابلے کے امتحانات کے
ذریعے ہوتا ہے جس میں فقط اہلیت ہی
شمار کی جاتی ہے۔ اگر آپ نے اپنی اہلیت
میں اضافہ کی کوشش نہ کی تو اس کے
نتایج کامیابی کے بجائے ناکامی اور
مایوسی کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ آپ
کے راستے کی دشواریاں اس بات کی متقاضی
ہیں کہ آپ انتہائی صبر اور استقامت کا
مظاہرہ کریں جس کی میں آپ سے امید
کرتا ہوں کہ یونیورسٹی میں آپ کی تربیت
نے آپ کو تعلیم اور تمدن سے لیس کر دیا ہے
اور آپ کو ایک ایسا انسان بنا دیا ہے
کہ جسے زندگی کی جس ڈگر پر بھی ڈالا جائے
اسے یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس کی زندگی
کا اہم ترین کام اس علم میں اضافہ کرنا ہے
جسے اُس نے اپنے کالج میں حاصل کیا
تھا۔ بالفاظ دیگر اسے یہ محسوس کرنا چاہیے
کہ ابھی اس کی طالب علمی کی زندگی ختم نہیں
ہوئی ہے بلکہ باضابطہ تعلیمی زندگی کی نہج
اور اس کی حدوں سے گزرنے کے بعد
اس کا آغاز ہوا ہے جس شخص کے اندر
ایسا جذبہ پیدا ہو جائے وہ اپنی تعلیم اور
مطالعہ کو جاری رکھے گا اور ہر طرح کے
حالات سے نپٹ لے گا۔ چاہے وہ روزگار
سے ہو یا بے روزگار ہو چاہے وہ تاجر
کاروباری یا سرکاری ملازم ہو اور چاہے
وہ غریب ہو یا مالدار۔ اس کے لیے یہ
زندگی اپنی تمام تر تلخیوں کے باوجود قیمتی ہوگی
اور ایسا ہی میں اس یونیورسٹی کے ہر طالب علم
سے بننے کی امید کرتا ہوں۔" [۱۱]

گرچہ ابھی وہ زندگی کی پچپن بہاریں دیکھ پائے
تھے۔ تاہم تقدیر کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۱۲ر مارچ ۱۹۴۱ء
میں جب کہ وہ اپنے کیریر کے عروج پر تھے ان کے
دماغ کی نس پھٹ گئی اور کچھ گھنٹے کے اندر اندر ان
کی موت واقع ہو گئی۔ ان کی موت ایک ناقابل تلافی
نقصان تھا۔ اس واقعہ کو پروفیسر رشید احمد صدیقی نے
اس طرح بیان کیا ہے:

"نئی دلی سے نظام الدین اولیا کی
طرف ایک خاموش جلوس جا رہا تھا
ہر طرح کے لوگ ملول و محزون کشاں کشاں
چلے جا رہے تھے میں ذرا دیر سے نظام الدین

اولیاء پہنچا۔ ایک تازہ قبر نظر آئی۔ آس پاس کی زمین روندی ہوئی تھی۔ جس پر پانی چھڑکا گیا تھا۔ قبر پر پھول کا انبار تھا۔ یہاں الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور فیڈرل کورٹ کے جج، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ریاضیات کے ماہر، اردو شعر و ادب کے شیدائی اور ماہر ملنے ہوئے شریف النفس انسان، سر شاہ محمد سلیمان نظام الدین اولیاء کی سنسان پر اسرار بستی میں ایک سکوت کا مزید اضافہ کرکے آسودۂ خاک تھے۔[۱۲]

حواشی

۱۔ جسٹس آر۔ ایس پاٹھک۔ "سر شاہ محمد سلیمان"۔ (الہ آباد ہائی کورٹ سوسالہ رپورٹ) ۱۹۶۶ء۔۱۸۶۶ء
صفحہ ۲۹۳ ــــ ۳۰۵

۲۔ ایضاً

۳۔ ۱۹۳۳ء۔ اے ایل جے آر۔ ۷۹۹

۴۔ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو۔ "چند جج حضرات اور وکلاء جنھیں میں جانتا ہوں" (الہ آباد ہائی کورٹ سوسالہ رپورٹ) (۱۹۶۶ء ـــ ۱۸۶۶ء) صفحہ ۴۹۷ ــــ ۵۱۸

۵ اے۔ آئی آر۔ ۱۹۳۹ء۔ ایف سی آئی۔

۶۔ The Statesman 18th March 1939

۷ Anand Sawarup Mishra Principles and Practice of Judicial Propriety," First edition 1986. PP. 122 – 124.

۸۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ۔ یکم جنوری ۱۹۴۱ء

۹۔ ایضاً ۱۵ر جولائی ۱۹۳۹ء

۱۰۔ الحاج عبید الرحمن خاں شیروانی "یادیں سر شاہ سلیمان کی"۔ سلیمان ہال میگزین، ۱۹۸۹ء، صفحہ ۲۱ ــــ ۲۲

۱۱۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ ۲۴ر دسمبر ۱۹۳۸ء

۱۲۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ "سر شاہ محمد سلیمان ـ چند یادیں" سلیمان ہال میگزین ۱۹۹۲ء صفحہ ۱۶

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۱۱- (نومبر ۹۳ء)

پانی — ایک بیش بہا نعمت

محمد زکی باورک *

ہمارے بزرگ آبا، و اجداد کو کاکولا، پیپسی یا کینڈا ڈرائی جیسی "نعمتوں" سے فیض یاب نہیں ہوئے تھے وہ لوگ صرف پانی مہیا کرتے تھے اور ہم سے زیادہ صحت مند تھے پانی یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ ہے ہماری زمین کا تین چوتھائی حصّہ پانی سے بھرا ہوا ہے اور انسانی جسم میں ۷۵ فی صد پانی ہے درحقیقت اس کرۂ ارض پر ہماری زندگی ہی پانی کی مرہون منت ہے۔ دوسرے سیاروں یعنی چاند، مریخ پر جو ہمارے space crafts جاتے ہیں تو پہلی بات ہم یہی جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا وہاں پانی کے آثار ہیں یا نہیں؟ انسان خوراک کے بغیر تو کئی روز تک زندہ رہ سکتا ہے مگر پانی کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے پانی کے اجزاء میں آکسیجن شامل ہے اور اس آکسیجن کے بغیر ہمارا دماغ ایک منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے گویا "برین ڈیڈ" ہونے کے لیے صرف ایک سے دو منٹ کا عرصہ کافی ہوتا ہے۔

اللہ کی پیاری کتاب قرآن مجید میں پانی کا ذکر بطور نعمت جگہ جگہ مختلف سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ "ھو الذی انزل من السماءِ ماءً"۔ تمام جاندار اشیاء کا منبع اور ماخذ یہی پانی ہے۔

زندگی کے بدلنے کے ساتھ ساتھ لوگ چائے اور کافی پی کر پانی جیسی نعمت کو فراموش کرتے جا رہے ہیں لیکن نارتھ امریکہ میں سافٹ ڈرنک کی انڈسٹری کھربوں ڈالر کا بیوپار ہر سال کرتی ہے جوں ہی اسٹور میں داخل ہو کوکا کولا اور دوسرے مشروبات کی بوتلیں آپ کو خوش آمدید کہتی ہیں۔ بچپن سے ہی بچوں کو "کوکا کولا" پیپسی اور میکڈانلڈ ریستوراں جیسے ناموں کے ساتھ برین واشں کر دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے ہمارا جسم ساٹھ سے ستر فی صد پانی سے بنا ہوا ہے اور بہت سے عوامل جیسے بلڈ فلو، پٹھوں کا عمل کرنا (Muscle contraction) اور صحت مند خوب صورت کھال کا دار و مدار اس پانی کی نعمت پر ہے۔ پانی پینے کے بہت سے طبی فوائد ہیں ہمارے جسم کے تمام اعضاء اور جوڑوں کو لبری کیٹ (lubricate) کرتا ہے کوئی بھی چیز جو جسم میں حرکت کرتی ہے اس کے لیے پانی اشد ضروری ہے حتیٰ کہ پھیپھڑوں کے لیے بھی پانی ضروری ہے۔ ہمارے جسم میں ہر وقت ہزار ہا

---

* کنگسٹو، کنیڈا۔

کیمیکل ری ایکشن (Chemical Reaction) عمل پاتے ہیں ان سب کے لیے پانی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ پانی ہی درحقیقت خوراک میں سے نکلے ہوئے۔ نیوٹری (Nutrient) اور آکسیجن کو ہمارے جسم کے مختلف خلیوں کو ٹرانسپورٹ کرتا ہے۔ پانی ہمارے جسم میں سے فضلے کے اخراج میں بھی معاون ہوتا ہے۔ پانی پینے کی وجہ سے ہمیں پسینہ آتا ہے نیز پیشاب کے ذریعے ہمارے جسم کا درجۂ حرارت برقرار رہتا ہے۔ پانی ہمارے نظام ہضم میں بھی ممد ثابت ہوتا ہے۔ نیز یہ وہ قدرت کا بے مثال تحفہ ہے جو ہمیں بلیڈر انفیکشن (Bladder Infection) سے محفوظ رکھتا ہے۔

ہمارے خون کا ۹۰ فی صد حصہ پانی سے بنا ہوا ہے۔ ہمارے جسم کے ۵۰ ٹریلین سیل ہر وقت پانی میں محفوظ پڑے رہتے ہیں۔ اس لیے ہر دانا انسان کے لیے دن میں آٹھ سے دس گلاس تک پانی پینا اشد ضروری ہے۔ چائے، کافی، کوک پانی کا متبادل نہیں ہیں۔ روزہ افطار کرنے کے بعد اگر انسان زیادہ چائے پیے تو جسم ڈیہائیڈریٹ (Dehydrate) ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ پیشاب اور دوسرے ذرائع سے ہر روز ہمارے جسم میں سے تین کوارٹ (3 Quarts) پانی ضائع ہو جاتا ہے۔ پانی پینے کے علاوہ پانی کا ایک کثیر حصہ ہمارے جسم میں غذا کے ذریعے آتا ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق غذا کے ذریعے ایک کوارٹ پانی جسم میں داخل ہوتا ہے۔

نارتھ امریکہ میں ایک عام آدمی ۴۵ گیلن سافٹ ڈرنک ہر سال پیتا ہے جب کہ یہی شخص پانی صرف ۱۵ گیلن پیتا ہے۔ بچوں، حاملہ عورتوں، دودھ پلانے والی ماؤں اور بوڑھے لوگوں کو پانی قدرے زیادہ پینا چاہیے۔ اگر ایک شخص ۹۰ منٹ تک ورزش کرے تو اسے ایک کوارٹ پانی پینا چاہیے۔

نارتھ امریکہ میں ایک وبا (Diets) کے نام سے بہت پھیلی ہوئی ہے۔ برصغیر ہندوستان و پاکستان سے لوگ نارتھ امریکہ آتے ہیں تو وافر مقدار میں غذا ملنے پر ہندوستانی طریقے کے کھانے کھاتے ہیں مگر ورزش زیادہ نہیں کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وزن بے حساب بڑھ جاتا ہے اور وزن اتارنے کے لیے پھر Diet شروع کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو وزن گھٹانا پسند کرتے ہیں ان کے لیے پانی پینا ایک بہترین علاج ہے۔ کھانے سے پہلے ایک یا دو گلاس پانی نوش فرمالیں تو بھوک جاتی رہے گی۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ اگر ایک شخص مناسب مقدار میں پانی نہ پیئے تو اس کا جسم ضرورت کے مطابق پانی جسم کے اندر Retain کرے گا۔ ضعیف العمر لوگوں کے لیے پانی اکسیر کا رنگ رکھتا ہے کیوں کہ بڑھاپے میں اکثر لوگ غذا کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے ہیں اور نشہ کے طور پر کافی زیادہ پیتے ہیں اور یوں De-Hydration کا خدشہ زیادہ ہو جاتا ہے۔

موسم گرما میں ٹھنڈا پانی پینا نہایت مناسب ہے جب کہ موسم سرما میں نیم گرم پانی نوش کرنا مناسب ہوتا ہے۔ اگر آپ چائے کے نشے میں مبتلا ہیں تو صبح کے وقت ایک کپ پی لیں، مگر دوپہر کے بعد پانی ضرور پیئیں، اپنے پیشاب کا رنگ ہمیشہ دیکھتے رہیں۔ اگر اس کا رنگ زرد ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جسم کو مزید پانی درکار ہے اگر رنگ صاف ہو تو آپ پانی مناسب مقدار میں پی رہے ہیں۔

اتر پردیش کے پانچ انٹر کالجوں اور سات ہائی اسکولوں میں

چھیالیس ہونہار طالبات کو شیروانی انعامات ۱۹۹۳ء

بیگم نصرت شیروانی *

اتر پردیش کے قریب بیس گرلز انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں سے ۱۹۹۳ء کے بورڈ امتحانات کے نتائج اگست کے اخیر تک موصول ہوئے۔ الحاجہ بیگم تلا رشید شیروانی (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ وجیب انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمٹیڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے اپنے کالج یا اسکول میں بورڈ امتحان میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پوزیشن لانے والی چھیالیس ہونہار طالبات کے لیے انعامات بھیجے گئے جن کے نام پیش ہیں:

نسواں گرلز انٹر کالج - اعظم گڑھ

(ہائی اسکول)

۱۔ کماری صنوبر مونا سلمہا

۲۔ کماری سمیتا راے سلمہا

۳۔ کماری سمیرا خاتون سلمہا

۴۔ کماری شبانہ ناز سلمہا۔

(انٹر)

۱۔ کماری عارفین سلمہا۔

۲۔ کماری روض بانو سلمہا

۳۔ کماری زینب سلمہا

گورنمنٹ گرلز انٹر کالج، قلعہ۔ رام پور۔

(ہائی اسکول)

۱۔ کماری روچی سکسینہ سلمہا۔

۲۔ کماری ارچنا مین سلمہا

۳ کماری عابدین سلمہا

(انٹر)

۱۔ کماری ابھیلاشا سلمہا

۲۔ کماری سپنا بہوگنا سلمہا

۳ کماری شبنم گپتا سلمہا

گورنمنٹ خورشید گرلز انٹر کالج۔ قلعہ۔ رامپور

(ہائی اسکول)

۱۔ کماری کلپنا سلمہا

۲۔ کماری شیلا گپتا سلمہا

۳۔ کماری سویتا شرما سلمہا

* سکریٹری مسلم گرلز ایجوکیشن کمیٹی۔ A-51/3 ڈی ایل ایف قطب انکلیو۔ ضلع گڑگاؤں (ہریانہ) 122002

(انٹر)

۱- کماری انجو گپتا سلمہا

۲ کماری سُرمی اگروال سلمہا

۳- کماری ریتا گنگوا سلمہا

فتح پور گرلز انٹر کالج۔ ضلع مئو۔

ہائی اسکول

۱- کماری پشپا یادو سلمہا

۲- کماری رئیسہ خاتون سلمہا

۳- کماری پشپا لتا سنگھ سلمہا

(انٹر)

۱- کماری ثمینہ خاتون سلمہا

۲- کماری عظمیٰ جبیں سلمہا

تعلیم گاہِ نسواں۔ انٹر کالج۔ لکھنؤ۔

(ہائی اسکول)

۱- کماری مہ پارہ جہاں سلمہا

۲- کماری لبنیٰ رئیس سلمہا

۳- کماری افشاں سنبل سلمہا

انٹر میں کوئی فرسٹ نہیں

محمدیہ بنکر نسواں ہائی اسکول۔ کانپور

۱- کماری صبیحہ شاہینا سلمہا

۲- کماری راشدہ بانو سلمہا

۳- کماری رخسانہ پروین سلمہا

دار العلوم نسواں ہائی اسکول۔ مئو ناتھ بھنجن

۱- کماری ام سلیم سلمہا

۲- کماری سیما کوثر سلمہا

۳- کماری رضیہ پروین سلمہا

عالیہ گرلز ہائی اسکول۔ مئو ناتھ بھنجن

۱- کماری اصغری بانو سلمہا

۲ کماری آمنہ خاتون سلمہا

۳- کماری ناہید اختر سلمہا

مسلم فرقانیہ گرلز ہائی اسکول۔ بسواں ضلع سیتاپور

۱- کماری سلطنت فاطمہ سلمہا

۲- کماری صفیہ خاتون سلمہا

۳- کماری نجمہ خاتون سلمہا

شمسی گرلز ہائی اسکول۔ دو محلہ روڈ رام پور

۱- کماری عائشہ پروین سلمہا

۲ کماری نکہت بی سلمہا

۳ کماری فوزیہ رفیق سلمہا

فیاض بیگم مسلم گرلز ہائی اسکول بلند شہر۔

۱- کماری سلمیٰ رخسار سلمہا

۲- کماری شبنم جہاں سلمہا

حافظ محمد صدیق اسلامیہ گرلز ہائی اسکول اٹاوہ۔

۱- کماری کہکشاں شاہد سلمہا

۲ کماری شیبا ناز سلمہا

ابھی اور انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں کی ہونہار ترین طالبات کے لیے انعامات بھیجے جا رہے ہیں جن کے نام آئندہ پیش کیے جائیں گے۔

اتر پردیش کے ہمارے جن گرلز انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں کی محترمہ پرنسپل صاحباوں نے ابھی تک ۱۹۹۳ء کے بورڈ امتحانات کے رزلٹ نہیں بھیجے وہ براہ کرم جلد از جلد بھیج دیں۔ مزید تاخیر نہ کریں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خبریں

ایس۔ ایف۔ اے۔ فردوسی۔ پی۔ آر۔ او

تعلیم بالغان سینٹر کی اصلاحی سرگرمیاں

گاندھی جینتی کے موقع پر مسلم یونیورسٹی کے تعلیم بالغان سینٹر کی جانب سے جمال پور میں ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے شعبۂ رابطۂ عامہ کے ممبر انچارج ڈاکٹر آر۔ پی سنگھ نے کہا کہ گاندھی جی کی زندگی خدمتِ خلق کے لیے وقف تھی اور انھوں نے نمک کی ایک مٹھی سے عدم تشدد کے راستے پر چلتے ہوئے ملک کو آزاد کرالیا۔

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ ہمیں گاندھی جی کے ساتھ ساتھ لال بہادر شاستری کو بھی یاد کرنا چاہیے جنھوں نے کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اہم رول ادا کیا۔

مسلم یونیورسٹی تعلیم بالغان سینٹر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ابصار مصطفیٰ نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی نے عوامی تعلیم پر بہت زور دیا۔ ہماری کوشش ہے کہ تعلیم کی روشنی گھر گھر پھیلے۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقے میں خواندگی کی مہم کے ساتھ ساتھ طبی کیمپ بھی لگائے جائیں گے تاکہ یہاں کے عوام کو صحت اور صفائی کے بارے میں بتایا جاسکے۔

دھرم سماج ڈگری کالج کے استاد ڈاکٹر اے۔ کے۔ سنگھ نے اس موقع پر ماحولیات کے تحفظ پر زور دیا اور کہا کہ ہمیں ضرورت سے زیادہ پانی کو برباد نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے مہاراشٹر کے زلزلے کی تباہی پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں فرقہ واریت سے گریز کرنا چاہیے اور اپنے شہر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن و سکون کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے کام کرنا چاہیے۔ سنی دینیات کے استاد مولانا مفتی زاہد نے گاندھی جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات سے متاثرہ علاقوں میں جاکر امن و بھائی چارے کا پیغام دیتے تھے اور تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ناخواندہ شخص بے سہارا ہوتا ہے جو دوسروں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ لہٰذا ہمیں تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

سید محمد احمد۔ اسسٹنٹ پی آر او

اسسٹنٹ پی آر او جناب راحت ابرار نے کہا کہ تعلیم کے بغیر سماج کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ مسلمانوں کی بے توجہی کی وجہ سے ہی وہ تعلیم کے میدان میں سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں۔ انھوں نے تعلیم کو روزگار کا ذریعہ سمجھنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم ذہنی نشو و نما کا ایک وسیلہ ہے اور بچہ مزدوری کو ختم کرکے ہی ناخواندگی کو دور کیا جاسکتا ہے۔

اس موقع پر تعلیم بالغان سینٹر کے پراجیکٹ آفیسر مسٹر ناظم جعفری نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے تعلیم بالغان سینٹر کی سرگرمیوں سے عوام کو روشناس کرایا۔

اس علاقے کے لوگوں نے جمال پور میں نئے اسکول قایم کرنے، بچوں کو ٹیکے لگوانے اور پانی بجلی اور سڑکوں کی تعمیر و مرمت کی اپیل کی۔ جلسے کے اختتام پر گاندھی جی پر ویڈیو فلم دکھائی گئی۔

ایم۔فل کی ڈگریاں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جن طلبا و طالبات کو ایم۔فل کی ڈگریاں تفویض کی گئی ہیں ان کے نام اس طرح ہیں۔ جیوتش چندر باسک (فلسفہ)، فریدا احمد خاں (سماجیات)، سید طارق امام (کامرس) فتح محمد امین محمد اقرا، و شکیل احمد شاہ (کیمسٹری) عبدالبشیر و ی دلاکری و محمد عارف خاں (جیولوجی) و بلقیس آرا صدیقی (اپلائڈ کیمسٹری)

میڈیسن فیکلٹی کے نئے ڈین کی تقرری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے شعبۂ پیتھالوجی کے پروفیسر کے۔ این احمد کو میڈیسن فیکلٹی کا ڈین دو سال کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ وہ ۱۵ ر اکتوبر کو پروفیسر مہدی حسن سے چارج سنبھالیں گے۔ زولوجی ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر شمیم جیراج پوری جو ایگری کلچر سینٹر کے کوآرڈینیٹر بھی ہیں کو تا احکامات تک ایگری کلچر انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔

اپلائیڈ فزکس کی جانب سے نیشنل سمپوزیم کا انعقاد

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اپلائیڈ فزکس کی جانب سے سولڈ اسٹیٹ نیوکلیر ٹریک ڈیٹکٹر پر آٹھویں نیشنل سمپوزیم کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر ایم۔ این۔ فاروقی نے کہا کہ نیوکلیائی کے میدان میں ہو رہی تحقیق نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے انھوں نے کہا کہ تحقیق کے لیے وقت یا عمر کی قید نہیں بلکہ کام کے تئیں جذبے اور لگن کی وجہ سے ہی نئی کھوج جنم لیتی ہے۔ انھوں نے کوسمک ریز کی تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک نوجوان سائنس داں ڈی۔ اے کلینر نے اپنی اس نئی تحقیق سے نیوکلیائی کے میدان میں نیا اضافہ کیا ہے۔

نیوکلیر ٹریک سوسائٹی آف انڈیا کے صدر پروفیسر ایس۔ بسواس نے دنیا بھر کے ترقی یافتہ ملکوں میں نیوکلیائی اور خلائی تحقیق پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ۱۹۶۷ء میں انگلینڈ میں یورینیم کی پیداوار شروع ہوئی تھی اور ۱۹۶۵ء کے بعد سے شمسی توانائی کو نیوکلیائی پروگراموں میں استعمال کیا جانے لگا۔ انھوں نے امریکہ کی اسکائی لیب پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی۔

اس تین روزہ نیشنل سمپوزیم میں ملک بھر کے پچاس سے زائد مندوبین حصّہ لے رہے ہیں جن میں بھابھا ایٹامک ریسرچ سینٹر، ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامینٹل ریسرچ، سہاے انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیر فزکس، گوہاٹی یونیورسٹی، نارتھ ایسٹ ہل یونیورسٹی شیلانگ، گرونانک دیو یونیورسٹی امرت سر کے سائنس داں اپنے مقالے پیش کریں گے۔

پروفیسر ڈی۔ ایس شری واستو نے حاضرین کا استقبال کیا اور پروفیسر راجندر پرشاد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

این۔ایس۔ایس۔ طبی کیمپ کا افتتاح

مسلم یونیورسٹی کے این ایس ایس کی جانب سے

گلشن آباد، جیون گڑھ میں دس روزہ مفت طبی کیمپ کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر ایم۔ این فاروقی نے کہا کہ بچوں اور عورتوں کی صحت کے لیے یونیورسٹی کے رضاکاروں نے خدمت خلق کے جذبے سے جو کام شروع کیا ہے اس سے اس علاقے کے لوگوں کی حالت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور یونیورسٹی کے بارے میں ایک اچھا تاثر پیدا ہوگا۔

پروگرام کے مہمان خصوصی چیف میڈیکل آفیسر ڈاکٹر ایم۔ اے۔ حق نے کہا کہ بہت سی بیماریوں کی روک تھام کے لیے اگر احتیاطی اقدامات کیے جائیں تو جان لیوا بیماریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بچوں کو وقت پر ٹیکے لگوانے اور حاملہ عورتوں کو مناسب خوراک مہیا کرائی جانی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ دس روزہ طبی کیمپ میں تمام دوائیں اور ٹیکے ان کے محکمے کی جانب سے فراہم کیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ صحت سے متعلق بیداری پیدا کرنے میں اس طرح کے کیمپ بہت ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس علاقے کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ سماج اور معاشرے کی ترقی کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر عمل کریں۔

مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار جناب قاضی عبدالخالق نے علاج و معالجہ کے ساتھ ساتھ صحت مند ماحول کے لیے صفائی پر توجہ دینے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ خدمت خلق کے جذبے سے متاثر ہو کر یونیورسٹی کے رضاکاروں نے جو کیمپ منعقد کیا ہے اس کے لیے ڈاکٹر راؤ خاص طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

این ایس ایس کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر لیاقت علی خاں راؤ نے بتایا کہ اس دس روزہ طبی کیمپ میں بیس ڈاکٹر موجود رہیں گے جو بچوں کو ٹیکے لگانے، حاملہ عورتوں کی دیکھ بھال اور ٹی۔ بی جیسی بیماریوں کی روک تھام کے لیے اس علاقے کے لوگوں کو طبی معلومات فراہم کریں گے۔

افتتاحیہ جلسے کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر شکیل احمد نے این ایس ایس کی سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر راؤ لیاقت کی فعّال قیادت میں اس فلاحی تنظیم نے اپنے سو دن میں تعلیم، صحت اور شجرکاری سے متعلق بہت سے پروگرام منعقد کیے ہیں اور یونیورسٹی کا نام روشن کیا ہے۔

اس طبی کیمپ کی انچارج ڈاکٹر شگفتہ علیم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ میڈیکل کالج کے شعبۂ کمیونٹی میڈیسن کے سربراہ پروفیسر محمد یونس نے اپنے شعبے کی جانب سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اس دس روزہ طبی کیمپ میں تقریباً ڈیڑھ سو رضاکار حصہ لے رہے ہیں۔

گرلز اسکول میں نئے او ایس ڈی کی تقرری

مسلم یونیورسٹی کے ویمنز کالج میں فزکس کی ریڈر ڈاکٹر انور رضوی کو گرلز ہائی اسکول کا او ایس ڈی مقرر کیا گیا ہے۔ ان کی یہ تقرری اسکول کی پرنسپل ماہ لقا شفیق کے مستعفی ہو جانے کے سبب کی گئی ہے۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ۱۲ — جلد ۱۲

دسمبر ۱۹۹۳ء

بانی ۔۔ سرسید احمد خاںؒ

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

انچارج سرکولیشن	نائب مدیر	ترتیب
شفیق احمد	احمد مجتبیٰ قریشی	سرفراز

زر سالانہ :

انڈیا Rs. 45·00

بیرونی ممالک US $ 20·00 ہوائی ڈاک

سادہ ڈاک US $ 6·00

ترسیل زر کا پتہ : Phone : 24827

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Editor, TAHZEEBUL AKHLAQ & NISHANT,

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH. 202002

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

مالکہ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر و پبلشر: کبیر احمد جائسی۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات، علی گڑھ۔ پریس: اے۔ ایم۔ یو۔ پریس، علی گڑھ

اداریہ

لیجیے ۱۹۹۳ء بھی اپنی تمام تلخ و شیریں یادوں کے ساتھ ہم سے رخصت ہونے والا ہے۔ جانے والے اس سال میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا اس کا حساب تو بعد میں ہوتا رہے گا۔ سوچنا یہ ہے کہ آنے والا سال ہمارے لیے کیا کیا مصائب و مسائل لے کر آنے والا ہے۔ ۱۹۹۳ء کے اواخر کے اسمبلی الکشن سے یہ امید تھی کہ وہ ہمارے سمت سفر کا کوئی واضح اشارہ پیش کرے گا لیکن تادم تحریر جو اطلاعات موصول ہو چکی ہیں اُن کی بنا پر یہ کہنا مشکل ہے کہ آئندہ کیا ہوگا۔ اگرچہ ہندوستان کے عوام نے اس الکشن میں اپنی زبان بند رکھ کر اور بغیر کسی خاص ہنگامے اور غارت گری کے سیاسی پارٹیوں کے حق میں جو فیصلہ کیا ہے وہ ہندوستانی عوام کی "ستم ظریفی" کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اب ہندوستان کا ووٹر خواہ وہ ناخواندہ ہی کیوں نہ ہو اتنا بیدار ہو چکا ہے کہ وہ کسی بھی پارٹی کو مطلق العنانیت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ پارٹی پر بھی اپنی آہنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتا ہے اور اس کو صرف اتنی اکثریت سے کامیاب بناتا ہے کہ وہ حکومت تو بنا لے مگر اپنی مدتِ حکومت میں من مانی نہ کرنے پائے یعنی نہ تو آئین میں من مانی ترمیم ہونے پائے اور نہ ہی اس ملک میں ۱۹۷۵ء جیسی ایمرجنسی کا منحوس اور بدنما عفریت اپنا سر اُبھار سکے۔

موجودہ الکشن کے نتائج نے تمام سیاسی مبصرین کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ شکست خوردہ پارٹیاں اپنی شکست کے تجزیے میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ بے بنیاد مفروضوں پر اپنی شکست کے اسباب کو تلاش کر رہی ہیں۔ کامیاب پارٹیاں نتائج کے اعلان کے بعد ہی سے حکومت بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو چکی ہیں اور اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کے لیے دوسری پارٹیوں سے سودے بازی

میں مصروف ہیں۔ جب تک یہ تحریر آپ تک پہنچے گی سودے بازی ہو چکی ہوگی۔ نئی حکومتیں بن چکی ہوں گی اور وزرا اپنے اپنے منصب پر فائز ہو کر اپنی اپنی وزارتوں کا کام دیکھنا شروع کر چکے ہوں گے۔

آنے والا سال ہندوستان کے عوام کے لیے ایک ایسا سال ہوگا جب وہ اپنی ساری طاقت اپنے چنے ہوئے نمائندوں کو منتقل کر کے بے دست و پا ہو چکے ہوں گے۔ مارچ ۱۹۹۴ء کے آنے کا اب زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ مارچ ۱۹۹۴ء آتے ہی عوام پر سب سے پہلی بجلی بجٹ کی شکل میں گرے گی۔ ہر نئی حکومت پرانی حکومت کو جملہ خرابیوں کی ذمّہ دار قرار دیتے ہوئے کمر توڑ ٹیکس لگائے گی۔ ہمارے معاشرے میں بے ایمانی، بدعنوانی، رشوت ستانی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے اربوں نہیں سنکھوں بلکہ مہا سنکھوں کی جو رقم افراد کی جیبوں میں جا رہی ہے، قومی خزانے میں اس رقم کی بھرپائی کے لیے اندھادھند ٹیکس لگا کر مذکورہ رقم کی کمی پوری کی جائے گی۔ ملازمت پیشہ افراد اور متوسط اور چھوٹے تاجر اور کارخانے دار مزید شکنجے میں کسے جائیں گے۔ اس کے برعکس بڑے بڑے سرمایہ دار، کروڑوں روپے کا انکم ٹیکس داب بیٹھنے والے کارخانے دار، بلیک مارکیٹرز قومی ترقی کے نام پر مختلف چھوٹ سے نوازے جائیں گے اور ان کے انکم ٹیکس کے بقایہ جات کی رقم متوسط طبقے کے افراد سے وصول کی جائے گی۔ علاوہ بریں ہارے ہوئے سیاسی افراد مذہب، زبان اور قومیت کے نام پر فتنہ و فساد برپا کر کے نوتشکیل حکومتوں کو بلیک میل کرنا شروع کریں گے اور جہاں بھی اُن کا بس چلے گا وہ فرقہ وارانہ فساد کروانے سے بھی باز نہ آئیں گے۔ یہی وہ مصائب و مسائل ہیں جن سے ہم کو دو چار ہونے کا خطرہ ہے۔

اگر ہندوستان کے عوام اسی دانشمندی، مستقل مزاجی اور تحمّل کا ثبوت دیں گے جس کا ثبوت وہ حالیہ الکشن میں دے چکے ہیں تو ہمارا سماج بہت سے متوقع مصائب سے بچ جائے گا۔ جہاں تک مسائل کا سوال ہے اُن سے مفر نہیں وہ تو آتے رہیں گے اور ہندوستانی عوام اُن کو کامیابی سے حل کرتے رہیں گے۔

خدا کرے نوتشکیل حکومتیں خواہ وہ کسی پارٹی کی ہوں ہندوستانی عوام کو راحت کا سبب بنیں اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہوں۔ خدا وہ دن نہ لائے جب یہ حکومتیں پانچ سال کے لیے عذابِ الٰہی بن کر ہندوستان کے عوام پر مسلط ہو جائیں۔

کبیر احمد جائسی

۲۹ر نومبر ۱۹۹۳ء

موجودہ تعلیم

سرسید احمد خان

قوم کی تعلیمی ترقی کے متعلق اب تک مختلف جلسوں میں بہت سے ریزولیوشن پاس ہوئے اور بہت سے لکچر دیے گئے، جو ہنسانے والے بھی تھے اور رُلانے والے بھی تھے۔ فصاحت و بلاغت میں بھی بے نظیر تھے اور اپنے مضامین کے لحاظ سے بھی بے مثل تھے۔ وہ لیکچر ہمارے دل پر مختلف قسم کے اثر پیدا کرتے تھے۔ جب ان لکچروں یا نظموں میں ہمارے بزرگوں کی شان و شوکت، ان کی اولوالعزمی، ان کی جاہ و حشم، ان کی قابل قدر سویلزیشن ان کی علمی لیاقتیں اور مختلف علوم و فنون میں ان کا کمال بیان ہوتا تھا تو ہمارا دل پھولتا تھا اور ہم اپنے جاموں میں پھولے نہیں سماتے تھے اور ایک قسم کا فخر و غرور ہم میں پیدا ہوتا تھا کہ ہم ایسے آدمیوں کی اولاد ہیں مگر جب ہمارے موجودہ ماحول کا بیان ہوتا تھا تو ہمارے دل مردہ اور غمگین ہو جاتے تھے اور افسوس کرتے تھے کہ ہم ایسے اسلاف کے ایسے ناخلف فرزند ہیں مگر افسوس ہے کہ یہ پچھلا اثر بہت ہی تھوڑی دیر ہم میں رہتا تھا۔ ہاں ہمارے آنسو بھی نکلتے تھے مگر وہ اپنے ساتھ ہمارے اس رنج کو بہا لے جاتے تھے۔ مجھ میں نہ ایسی فصاحت ہے اور نہ طاقت کہ میں اپنے ان مخدوم لیکچراروں کی پیروی کروں میرا تو اس رنگریز کا سا حال ہے جس کو صرف اسوا رنگ آتا تھا اور وہ سب رنگوانے والوں سے گو کہ وہ کوئی رنگ رنگوانا چاہیں یہی کہتا تھا کہ تم پر اسوا رنگ ہی کھلتا ہے پس میں اپنی قوم کے موجودہ حال پر نظر کروں گا اور آپ سے پوچھوں گا کہ اس کی ترقی اور فلاح دارین کیوں کر ہو سکتی ہے۔

گزشتہ زمانے میں ہمارے بزرگوں کی حالت نہایت عمدہ اور بے نظیر تھی۔ گزشتہ زمانے کی سویلزیشن جسے یاد کر کے ہم کو رونا چاہیے ہمارے بزرگوں کو نصیب تھی۔ اخلاق، محبت، مروت، دوستی کا برتاؤ، دوستی کا پاس، دلی نیکی، فیاضی، متانت، چھوٹوں کے ساتھ الفت، بڑوں کا ادب، غریبوں کے ساتھ ہمدردی، قومی یگانگت سب اُن میں جمع تھیں، قومی تعلیم دینی یا دنیوی کا ایسا مستحکم اور قابل ادب سلسلہ تھا جس کی نظیر تمام دنیا کی کسی قوم میں پائی نہیں جاتی۔ ایک بزرگ مقدس عالم دن رات بلا خیال دنیوی فائدہ کے خدا کی رضا مندی اور اپنی قوم اور اپنے مذہب کے لوگوں کی تعلیم کے لیے ایک مسجد کے کونے یا خانقاہ کے حجرہ یا اپنے مکان کی کوٹھری میں بیٹھا پڑھاتا تھا۔ پھر غریب سے غریب آدمی پڑھنے کو آوے یا بادشاہ شہنشاہ کا بیٹا سب کی تعلیم میں مساوی برتاؤ کرتا تھا۔ اخیر زمانے میں بھی مگر اس زمانے سے

پہلے کثرت سے ایسے بزرگ ہر قصبے یا ہر شہر میں پائے جاتے تھے جس نے اس کو دیکھا ہے آدمی نہیں ان کو فرشتہ پایا ہے اس کی صحبت کی برکت سے طالب علموں کے اخلاق درست ہوتے تھے، نیکی ان کے دل میں پیدا ہوتی تھی شاید اب بھی دو ایک بزرگ ایسے ہوں مگر وہ ایسے شاذ و نادر ہیں جو تمام قوم کو فائدہ پہنچانے کے لیے ناکافی ہیں۔

سب سے بڑا مقصد تعلیم و تربیت سے انسان میں نیکی اور اخلاق اور انسانیت اور آدمیت پیدا کرنا ہے وہ ہم کو اپنے بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتا تھا۔ پشت در پشت بطور ورثہ کے ہمارے بزرگوں کو پہنچتا تھا اور ان سے ہم کو ہمارا ملک جو خاص ہندوستان یا متوسط ہندوستان کہلاتا ہے۔ ایک امر کیا علم کیا معاشرت و تہذیب میں کیا زبان میں دوسرے ملک کے لیے نظیر تھا۔ انقلابات زمانہ سے نہ اب وہ زمانہ ہے اور نہ اب وہ لوگ جن کی صحبت سے ہم تربیت پاتے ہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء نے جس کا الزام بدقسمتی سے مسلمانوں پر لگایا گیا۔ رہا سہا جو کچھ تھا سب برباد کر دیا۔ ہمارا ملک ہی برباد نہیں ہوا بلکہ جیسا اس کا اثر تمام ہندوستان پر پہنچتا تھا۔ اسی طرح اس کی بربادی کا اثر بھی تمام ہندوستان میں پہنچا۔

اس وقت تم ملک کے مختلف حصوں اور متعدد خاندانوں اور متعدد تیلیوں کے یہاں تشریف فرما ہو۔ آپ مجھ کو معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں کہ ہم سب سوچیں اور اپنے اپنے کنبہ اور خاندان میں خیال کریں اور دیکھیں کہ اب ایسے بزرگ کس مقام پر اور کس خاندان میں باقی ہیں جن کی نیک صحبت کے اثر سے ہمارے نوجوان اور بچے تعلیم و تربیت پاویں ہماری مثال ان تیلیوں کی ہے جو بہ ترتیب ایک بندش میں بندھی ہوں اور وہ بندش ٹوٹ جاوے اور تمام تیلیاں متفرق و پریشان ہو جاویں اور ان کا کچھ انتظام نہ رہے۔ اگر اب ہم پھر اپنی قوم کو قوم بنانا چاہتے ہیں تو پھر ان متفرق تیلیوں کو جمع کر کے ایک بندش سے باندھنا ہم کو ضرور ہے۔ افسوس کہ پرانا ڈورا جس سے وہ بندھی ہوئی تھیں وہ ٹوٹ گیا اور ایسا پرانا اور بودا ہو گیا جس سے اب وہ متفرق تیلیاں بندھ نہیں سکتیں اور اس لیے ہم کو ضرورت ایک نیا ڈورا پیدا کرنے کی اور ان متفرق تیلیوں کو جمع کرنے کی اور بہ ترتیب دوبارہ باندھنے کی ہے۔ اے دوستو! اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو نہ قوم کو قوم بنا سکیں گے اور نہ ان میں انسانیت، آدمیت اور قومیت پیدا کر سکیں گے۔

یہ حال ہماری قوم کا ہے اور یہ کچھ ہم کو ان کے لیے کرنا ہے اب جو نہایت نازک اور قابل غور سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کیوں کر ہو۔ اور بھی ایک مسئلہ ہے جو قوم کو اس پر غور کرنی لازم ہے اور اے دوستو آپ جو دور و دراز فاصلوں سے اس مقام پر جمع ہوئے ہو اس سے مقصد اس مسئلہ پر غور کرنا اور اس کے لیے کسی تدبیر کا سوچنا ہے۔

انسان کے قویٰ جب ضعیف ہو جاتے ہیں اور اعتدالِ مزاج درہم برہم ہو جاتا ہے تو وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی حال قوم کا ہوتا ہے جب اس کو تنزل ہوتا ہے تو کسی ایک چیز میں تنزل نہیں ہوتا بلکہ مذہب اخلاق، تعلیم، راست بازی، دیانت داری، سویلزیشن، دولت تمکنت، متانت سب چیز میں تنزل ہوتا ہے اور جو لوگ اس کی اصلاح کے در پے ہوتے ہیں وہ حیران ہو جاتے ہیں کہ کس کس چیز کا علاج کریں گے۔

"دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

مگر جب غور کی جاتی ہے تو بجز تعلیم و تربیت کے اور کوئی اس کا علاج نظر نہیں آتا۔

تعلیم میں جو مشکلات ہیں نہ آپ پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہم کو بہ حیثیت مسلمان قوم ہونے کے قوم کو قوم بنانے

مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے کیوں کہ مسلمانوں میں
ملام کی رو سے قوم کا لفظ نسل کے متحد ہونے پر
جاتا ہے بلکہ جس نے کلمہ پڑھا اور اسلام لایا گو
تبار نسل کے کوئی ہو وہ سب ہمارے بھائی اور
میں داخل ہیں اسلام کی رو سے اخوت اور اتحاد
ب اسلام پر منحصر ہے۔ قال اللہ تعالیٰ "انما
ون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا
لکم ترحمون ۔ پس جب کہ مدار قومیت اسلام
ہم کو اپنی قوم کو مذہبی تعلیم دینا اول درجہ جہاں تک
ائنس سے متعلق ہے ضرور ہے ۔
دنیوی علوم سے ہم اپنی قوم کو محروم نہیں رکھ سکتے ۔
اگر اس سے محروم رکھیں تو وہ دنیا میں رہنے کے
ں ہوتی۔ ہم قبول کرتے ہیں کہ دنیا میں رہنے کے
ا چند روزہ ہے مگر کم بخت وہ چند روز ہی
ہیں جن میں جب تک کہ ہم ان میں رہنے کے
ہوں رہ نہیں سکتے

یا الٰہی فکر معیشت ہے دہالہ دغدغہ حشر
آسودگی فرصت یہاں ہے نہ وہاں ہے

ہنا تو بہت خوش آئند ہے معلوم ہوتا ہے کہ علوم
ں سے یورپ گئے ہوں اور ہمارے ہی بزرگوں
ں کو علوم میں تعلیم دی ہے، مگر جب ہم غور کرتے ہیں
م کو کیا منطق و فلسفہ، کیا ہیئت و ہندسہ، کیا
ت، کیا سیاست و انتظام مدن، کیا ریاضی علمی و نظری
کو ایسے اعلیٰ درجے پر ترقی یافتہ پاتے ہیں کہ پہچان
تے کہ یہ وہی علوم ہیں جو ایشیا سے یورپ میں گئے
ں طرح کہ ایک دانہ زمین میں پڑا ہوا ایک عالی نشان
ہو جاتا ہے، اسی طرح اُن علوم نے ترقی کی ہے جو اُن پر
ہے یہ اس کے علاوہ ہے ۔
سے دنیوی علوم عملی و نظری علمی و عملی کی کتابیں تقویم
پارینہ کی مانند ہوگئی ہیں جو کسی کام آنے کے لائق نہیں ہیں اور
اس لیے ہم کو بہ مجبوری اُن علوم کو موجودہ یورپ کی کتابوں
سے حاصل کرنا پڑتا ہے جن کو ہم بوعلی وفارابی، ابن رشد،
رازی اور ارسطو اور ساہ زی غیوس اور سالاناؤس اور
دیگر علماء یونانی کی تصنیفات سے جو عربی میں ترجمہ ہوگئی ہیں
حاصل کرتے ہیں ۔

لٹریچر ایک ایسا علم ہے جو ہر ایک زبان کے ساتھ مخصوص
ہے مگر اس زمانے میں اس میں بھی طریق بیان اور طرز
ادائے مضمون نے ایسی ترقی کی ہے کہ ہم اپنی قدیم طرز تحریر
اور طریق ادائے مضمون کے چھوڑنے اور اس جدید طرز کے
اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ لفاظی اور ہجر و وصل کی شاعری
مبالغہ اور ان نیچرل مدح سرائی صنائع و بدائع جو ایک زمانے
میں حسن تحریر سمجھے جاتے تھے اب حد سے زیادہ معیوب ہیں ۔

تجارت جس میں جاہل عرب ایک زمانے میں مشہور
تھے اور خدا نے بھی ہم کو اس میں مصروف رہنے کی ہدایت کی
ہے جہاں فرمایا ہے یا ایھا الذین آمنوا اذا نودی
للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ
وذروا البیع ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ۵
فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا
من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون ۔
وہ ہماری قوم سے بالکل چھوٹ گئی ہے مگر سمجھو کہ ہم اس کے
لائق یا وہ ہمارے لائق نہیں رہا ہے ۔

اس زمانے میں تجارت جاہل بدوؤں کا کام نہیں
رہا وہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا فن ہوگیا ہے جس میں تعلیم و
تربیت، علم و عمل دونوں کی ضرورت ہے۔ غیر ملک کے
لوگوں سے واقفیت ان لوگوں اور ان ملکوں کے حالات
سے آگاہی، بحر و بر کے سفر کی عادت، دلیری اور جرأت اس
کے لیے درکار ہے مگر ہماری قوم سے یہ سب چیزیں معدوم
ہوگئی ہیں۔ ان کا تو اس مقولہ پر عمل ہے کہ ع

"حب وطن از ملک سلیمان خوشتر"

اس کے علاوہ اس زمانے میں شخصی تجارت کا کام نہیں رہا ہے۔ متفقہ تجارت کی جس کو کمپنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گرم بازاری اور سرسبزی ہے جس کی بنا اتفاق پر ایک دوسرے کی معاونت پر اور سب سے زیادہ راست معاملگی اور اس سے بھی زیادہ دیانت اور راستی پر مبنی ہے مگر ہماری قوم میں یہ مقولہ مشہور ہے اور اس پر عمل درآمد بھی ہے کہ "سانجھے کی ہنڈیا چوراہے میں"۔ مجھ کو کوئی نظیر ایسی معلوم نہیں ہے کہ ہماری قوم کے دو چار آدمیوں نے بھی مل کر کوئی تجارت کا کام کیا ہو اور اس میں خیانت اور آپس میں بدگمانی اور آخر کو باہمی تنازعہ و تکرار نہیں ہوئی ہو۔ ان رذائل کا قوم سے دور کرنا اور فضائل کا ان میں پیدا کرنا نہایت اعلیٰ درجے کی تعلیم اور تعلیم سے زیادہ تربیت پر منحصر ہے۔ نہ کوئی ٹوٹی پھوٹی انگریزی جاننے سے اور یونیورسٹی کی ڈگریاں حاصل کرنے سے۔ مدراس میں ہزاروں آدمی انگریزی جانتے ہیں۔ میں نے خود ایک مدراسی بی اے کو دیکھا جو انگریز کے ساتھ تھا اور بیرا کا کام کرتا تھا۔ یہ اس امر کا نتیجہ تھا کہ تعلیم تھی مگر تربیت نہ تھی۔

سب سے بڑا جوہر انسان میں ایک بہادر سپاہی کی سی جرأت اور دلیری اور دل چلاپن ہے اور مستعدی اور اپنے کام کو ایمان داری سے کرنا اس کا لازمہ ہے۔ یہی چیز ہے جس کے سبب انسان سے ایسے کام ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر دنیا تعجب کرتی ہے۔ ہماری قوم کے نوجوانوں میں ان سب چیزوں کی بہت کمی ہو گئی ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ سپاہیانہ جرأت اور دلیری ان میں نہیں رہی۔ اگر کسی میں کچھ ہے تو نامہذب اکھڑپنا ہے۔ سیلف ریسپکٹ کا بہت کم خیال ہے۔ ضعیف و ناتواں ہو گئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سے ضعف بصر کے شاکی ہیں۔ دوڑ دھوپ کی ان میں طاقت نہیں ہوتی۔ خراماں خراماں چند قدم چلنا ان کی معراج ہوتا ہے۔ پس ان کی ان عادتوں کو بدلنا، ان میں سپاہیانہ دلیری مہذب بہادری، شائستہ جرأت پیدا کرنا، محنت و مشقت کا عادی کرنا، ریاضت جسمانی میں ان کو ڈالنا، ان کی صحت کو درست کرنا۔ یہ سب وہ کام ہیں جو ایک باعزت قوم کے لیے ہونے چاہییں۔ جیسا کہ ہم اپنی قوم کو بنانا ضرور سمجھتے ہیں۔ اگر ہماری یہ خواہش ہو کہ ہم تعلیم سے اسی قدر مطلب سمجھیں کہ "چار پاے بر او کتابے چند"
صاف کہیے میں نے غلط کہا۔ بر دو پاے بود کتابے چند
تو ہم نے اپنی قوم کے ساتھ کچھ سلوک نہ کیا ہوگا۔

مسلمان تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگرچہ گورنمنٹ نے اپنی مہربانی سے اور مشنریوں نے اپنے خیال مذہبی سے جابجا مدرسے قائم کیے ہیں اور ان میں کچھ مسلمان پڑھتے ہیں مگر ان مدارس میں مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل ہے اور دیگر اقوام کی زیادہ کثرت ہے۔ دیگر اقوام کی کثرت سے مسلمانوں کی قومی فیلنگ دبی رہتی ہے ان میں مل کر تعلیم پانے سے کبھی ان میں قومی فیلنگ پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ تعلیم میں بھی ایک دوسرے سے اعانت نہیں پہنچتی۔ ایں ازاں دور و آں ازیں نفور طرز معاشرت باہم مختلف ایک کی ضروریات دوسرے کی ضروریات سے مباین اور اسی سبب سے مسلمانوں کو ان کالجوں میں کوئی ذریعہ اپنی تعلیم کو ترقی دینے کا اور اپنی قومی فیلنگ کو بڑھانے کا بلکہ اس کو قائم رکھنے کا نہیں ہے۔ پس اُن مدارس میں تعلیم پانے سے کبھی توقع نہیں ہو سکتی کہ ہماری قوم قوم بن سکے گی۔ دیکھو ان طالب علموں کی فیلنگ کو جو اور قوموں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ان طالب علموں کی فیلنگ کو جو اپنی قوم کے طالب علموں کے ساتھ ملے ہوئے پڑھتے ہیں اور اپنی قوم کے نوجوانوں کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہم تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک جگہ یا کالج میں جمع نہیں کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا

ہے (جس کو میں صحیح نہیں سمجھتا) کہ ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ مختلف صوبوں میں ایسے اعلیٰ درجے کے کالج بنا سکیں جو مسلمانوں کی ضروریات اور ان میں قومی فیلنگ پیدا کرنے کے لیے مناسب ہوں مگر ان خیالات کے سبب ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ رہنا قوم کے قوم بنانے کی تدبیر کو چھوڑ دینا نہایت بزدلی اور جوش قومی نہ ہونے کی دلیل ہے۔

اگر ہم ایک کالج بھی ایسا بنا لیں جس میں ہم اپنی قوم کے بچوں کو اس طرح پر تعلیم و تربیت دے سکیں جیسی دینی چاہیے تو بلا شبہ اس میں ایک محدود تعداد ہوگی مگر اس محدود تعداد کا اس قسم کی تربیت پانا قومی فلاح کی نشانی اور قومی ترقی کے ستارۂ اقبال کے طلوع ہونے کی علامت ہوگی۔ یہی محدود تعداد جب اس قسم کی تعلیم پا کر نکلیں گے اور ملک کے مختلف حصوں میں پھیلیں گے تو وہ قومی ترقی کے لیے بہ منزلہ خمیر کے ہوں گے اور قومی باغ کے لیے بہ منزلۂ تخم کے اور امید ہے کہ ان سے ایسے سرسبز و بارآور درخت پیدا ہوں گے جس کی نسبت مجھ کو قرآن مجید کے چند الفاظ تلاوت کر دینے کافی ہیں۔ کزرعٍ اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستویٰ علیٰ سوقہ یعجب الزراع (یا اللہ ارجو منک ان یکون ھکذا)

اس موقع پر میں دو الفاظ اپنے کالجوں کے لڑکوں کو مخاطب کر کے کہنا چاہتا ہوں - اے طالب علمو! جو تم اس ہال میں جمع ہو سن لو اور سمجھ لو کہ مجھ کو تم سے کیا توقع ہے اگر تم نے میری توقعوں کو پورا نہ کیا تو افسوس تم پر اور افسوس مجھ پر افسوس قوم پر۔

لوگ شکایت کرتے ہیں کہ انگریزی تعلیم سے طالب علموں کی عادات اور اخلاق خراب ہو جاتے ہیں اور آزادی ان میں سما جاتی ہے، بڑوں کا ادب، ماں باپ کا ادب، ان کی عزت ان کی فرماں برداری ان میں سے جاتی رہتی ہے، اگرچہ مجھ کو ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا کیوں کہ میں اپنے کالج کے طالب علموں کو ایسا نہیں پاتا۔ وہ نہایت مہذب اور بزرگوں اور استادوں کا ادب کرنے والے ہیں لیکن بالفرض اگر یہ شکایت صحیح ہے تو یہ اس حالت میں کہ چار مسلمان بچے لاہور میں اور چار کلکتہ میں اور چار بمبئی میں اور چار مدراس میں اور کچھ اور مشنری کالجوں میں پڑھتے ہوں۔ اگر ان کے استاد مہذب و تربیت یافتہ بھی ہوں اور یہ بھی فرض کرو کہ وہ استاد ان کی تربیت پر بھی خیال رکھتے ہوں تو ایک دو گھنٹہ ان کو استاد کے سامنے شیکسپیئر یا ناول یا ہسٹری یا فلسفہ پڑھ لینا اور اس کے بعد شہر کے بازاروں اور گلیوں میں پھرنا جن میں سامان بدتہذیبی بہ نسبت زمانہ سابق کے کثرت سے موجود اور بہ نسبت سابق کے سہل الوصول و ارزاں ہے اور کسی مہذب سوسائٹی کا ان کو میسر نہ آنا۔ اس نقصان کو جس کی شکایت کی جاتی ہے رفع نہیں کر سکتا۔ پس اے دوستو! اگر یہ شکایت حقیقی ہے تو آپ کو جو فلاح قومی اور اپنے بچوں کے مہذب ہونے کے خواہاں ہو غور کرنا لازم ہے کہ یہ شکایت کیوں کر رفع ہو سکتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ وہ خطرناک اور ناسمجھی بلکہ نادانی کی آزادی ہے جو میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے کالج کے طالب علموں نے نہیں مگر دوسرے کالج کے طالب علموں نے خواہ وہ گورنمنٹ کالج کے ہوں یا مشنری کالجوں کے اختیار کی ہے۔ اس سے میری مراد وہ پولیٹکل ایجی ٹیشن جو انگریزی خواں طالب علموں نے گورنمنٹ کے مقابل میں جس کے سایۂ عاطفت میں ہم با آرام زندگی بسر کرتے ہیں اور جس کے پرامن زمانے میں ہم اپنی قوم کو ہر طرح سے ترقی دے سکتے ہیں، اختیار کیے ہیں۔ یہ نوجوان انگریزی خواں ایک ہلدی کی گرہ پا کر پنساری ہونے کے مدعی ہیں نہ پالیٹکس کے اصول سے واقف ہیں۔ نہ اس پر غور کی ہے نہ دوسرے ملکوں کے حالات سے واقف ہیں نہ ان کو کبھی

دیکھا ہے اور بے سود باتوں اور گورنمنٹ کی پالیسی کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے ہیں اور میں کامل یقین سے کہتا ہوں کہ ایسے ایجی ٹیشن ملک کے لیے اور اگر مسلمان اس میں شریک ہوں تو بالتخصیص مسلمانوں کی قوم کے لیے نہایت مضر بلکہ قوم کو برباد کرنے والے ہیں۔ ہمارے نوجوان مسلمانوں کے لیے نہ کوئی ایسی سوسائٹی ہے جو اُن کو اس غلطی سے آگاہ کرے نہ اُن کو کوئی نصیحت کرنے والا اور سمجھانے والا ہے۔ پس آپ نے کیا تدبیر سوچی ہے اور کیا طریقہ اختیار کیا ہے اور کیا طریقے اختیار کر سکتے ہیں جس سے ہماری قوم کے بچے اس وبا سے محفوظ رہیں۔ کیا قوم کو متفرق رکھنے اور متفرق جگہ تعلیم دینے سے ایسا ہو سکتا ہے حاشا و کلا۔

اس سے بھی زیادہ ایک اور خطرناک امر ہے جو مسلمان انگریزی خواں طالب علموں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ انگریزی پڑھ کر عقاید مذہبی سے برگشتہ یا ان میں مذبذب اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے میں سست ہو جاتے ہیں۔ پچھلی بات اگرچہ افسوس کے قابل ہے مگر میں اس کی خصوصیت انگریزی خواں مسلمانوں کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ جو نوجوان مسلمان انگریزی خواں نہیں ہیں وہ بھی فرائض مذہبی ادا کرنے میں کچھ چست نہیں ہیں۔ خیر اس کا کچھ ہی سبب ہو مگر زیادہ خطرے کی بات پہلا امر ہے۔ یعنی عقاید مذہبی سے برگشتہ ہونا یا اُن میں مذبذب ہو جانا اس کا اصلی سبب علوم جدیدہ کا شایع ہو جانا اور چوں کہ انگریزی خواں طالب علموں کو ان علوم جدیدہ سے زیادہ واقفیت کا موقع ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ انگریزی پڑھنے سے عقاید میں فرق آجاتا ہے کچھ بے جا نہیں ہے مگر اتنی بات میں ضرور کہوں گا کہ بہ نسبت دیگر مدارس کے ہمارے مدرسۃ العلوم میں یہ بیماری بہت کم ہے۔

لیکن اے دوستو! اس معاملے میں کمی و بیشی پر خیال کرنا نہ چاہیے بلکہ ہماری قوم کو اس کے جڑ سے اکھاڑنے کی تدبیر کرنی واجب بلکہ فرض ہے یہ آفت کچھ نئی نہیں ہے بلکہ جب فلسفہ یونانی مسلمانوں میں پھیلا تھا۔ اس وقت بھی یہ مشکل پیش آئی تھی، جس کے سبب اس زمانے کے علما نے علم کلام ایجاد کیا تھا۔ پس ہم جو اس کا الزام اپنے نوجوان انگریزی خواں طالب علموں کو دیتے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے بلکہ دراصل وہ الزام اس زمانے کے علما پر ہے جو فلسفۂ جدیدہ کے مقابلے میں کوئی علم کلام پیدا نہیں کرتے۔ حال میں یعنی اس ربیع الاول گزشتہ کے مہینے میں بہ موقع مجلس بہ میلاد شریف ایک بہت بڑے عالم مصری محمد روحی آفندی نے پیرس کے مقام میں اُن مسلمان طالب علموں کے سامنے جو یورپ میں اور خصوصاً فرانس میں تعلیم پاتے ہیں ایک اسپیچ دی ہے جس کے چند فقرے میں آپ کے سامنے پڑھتا ہوں۔

انھوں نے بیان کیا کہ جس امر ضروری کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور جس کے لیے یہ سب کچھ بطور مقدمہ اور تمہید کے تھا وہ یہ ہے

اول تو یہ کہ بلاد اسلامیہ کے رہنے والوں نے جن کو اس انیسویں صدی کے حالات اور سویلیزیشن کی حقیقت پر اطلاع نہیں ہے ان طلبا کا ممالک یورپ کو جانا پسند نہیں کیا اور ان ملکوں میں جو اسلامی نہیں ہیں ان کا تحصیل علم کرنا ان کو ناگوار ہوا اور ان کو حقارت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھنے لگے حتی کہ بعض نے تو معاذاللہ ان پر کفر کے فتوے لگائے۔ یہ لوگ مسلمانوں کی ترقی اور موجودہ تحریک کے سد راہ ہو گئے، اور انھوں نے ذرا بھی نہیں سوچا کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے جو آں حضرت سے منقول ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ علم کی تلاش کرو اگرچہ وہ چین میں ہو۔ ملک چین تو اس وقت اہل کتاب کا ملک بھی نہ تھا بلکہ محض بت پرستوں اور مشرکوں کا ملک تھا۔ اور ایک حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ جہاں اس کو پاؤ حاصل کرو اور اسی طرح بہت سی احادیث نبوی و آثار شرعی مروی و منقول ہیں جو میرے دعوے کے ثبوت میں گواہ ہیں۔

دوم یہ کہ بعض طلبا دین اسلام کے حقایق سے آگاہ نہیں
ہیں نہ ان حکمتوں اور باریک معانی کو سمجھتے ہیں جو مذہبی الفاظ
کی تہہ میں پوشیدہ ہیں۔ نہ ان علما سے دریافت کرتے
ہیں جو ان کے ذہنی شہادت کو رد کرنے اور ان کی غلطیوں
اور کم زور خیالات کو دور کرنے پر قادر ہیں۔ بلکہ انھوں نے
صرف ایسے چند قصوں اور کہانیوں پر قناعت کی ہے جو
ان لوگوں سے سنی سنائی ہیں جن کو چوڑی آستینوں اور
بڑے بڑے عماموں کے لحاظ سے تو البتہ علما سے مشابہت
ہے مگر حقیقت میں وہ تعصب اور جہالت میں گرفتار ہیں۔
انھیں لوگوں نے اسلام کے دائرے کو تنگ کیا ہے اور
اس میں چند در چند مشکلات پیدا کر دی ہیں اور کتب
دین کے مطالعہ کرنے اور علماے دین کی پند و نصیحت سننے
سے اُن کو نافر اور بے توجہ کر دیا ہے جس سے معاذ اللہ
یہ گمان فاسد پیدا ہوا ہے کہ اسلام حقایق ادلہ کے
برخلاف ہے اور ترقی تمدن کا مخالف ہے اور عام مسلمان
محض مقلد ہے جو نقل پر کفایت کرتا ہے اور عقل سے ذرا
بھی کام نہیں لیتا۔

پھر انھوں نے کہا کہ میں اُن طلبا کو جن کا میں
نے ذکر کیا معذور حکمتیں اُن کو سمجھاے اور ان کے عقلی و فلسفی
شبہات کو رفع کرے نہ اُن کو ایسی کتابوں کے مطالعے کی
قدرت ہے جو خاص اس مضمون پر لکھی گئی ہیں کیونکہ ان کتابوں
کا مضمون مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اور ان کے سمجھنے کے لیے برسوں
کی محنت درکار ہے اور سب سے ادنیٰ بات تو یہ ہے
کہ ان کو عربی زبان اور علمی اصطلاحات سے بھی آگاہی
نہیں ہے۔" انتہیٰ

میں نے ابتدا سے یعنی جب سے کہ زبان انگریزی و
علوم جدیدہ کے مسلمانوں میں رائج ہونے کی کوشش کی
اس بات کی خواہش کی کہ ہمارے زمانے کے علما اس
مشکل امر پر متوجہ ہوں اور علوم جدیدہ کے اہتمام کو ایک
جزو تعلیم کا قرار دیں جیسے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ مدرستہ العلوم
میں ان تمام امور کا اہتمام جیسا کہ ممکن ہے ہوتا ہے۔

ایک خط لکھا اُس کے فقرے آپ کے سامنے پڑھتا ہوں
اس میں میں نے لکھا کہ " ایک اور امر جو سب سے ضروری اور
مقدم ہے۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ
ایک زمانہ مسلمانوں پر ایسا گذرا ہے جس میں بجز تحصیل علوم
دین کے اور کسی علم سے سروکار نہ تھا جس کے سبب دین کی
ہزاروں کتابیں حدیث، تفسیر، فقہ، اسماء الرجال، اصول
حدیث، اصول فقہ وغیرہ موجود ہو گئیں۔ اس کے بعد ایک
زمانہ آیا جس میں حکمت و فلسفہ یونان کا مسلمانوں میں
رواج ہوا اور اس کے سبب سے عقائد مذہبی میں بہت
کچھ خلل واقع ہوا یا واقع ہونے کا اندیشہ ہوا۔ اس وقت
علماء نے مذہب اسلام کی تائید پر کمر باندھی اور علم کلام
ایجاد کیا اور اسلام کی نصرت کی مگر اب وہ زمانہ بھی گیا
اور جدید فلسفہ اور جدید حکمت اور جدید علوم حکمیہ پیدا ہو گئے
اور اس کے مسایل اور جو جو تحقیقات علوم طبعی کی اس میں
ہوئی ہے۔ وہ بہت زیادہ مخالف مسائل موجودہ اسلام کی
ہے اور ان جدید علوم کا روز بروز زیادہ شیوع ہوتا جاتا
ہے اور کسی کے بند کرنے سے بند نہیں ہو سکتا۔ اگلے
زمانے کے عالموں نے بھی حکمت اور فلسفہ یونان بلکہ منطق
پڑھنے کو بھی حرام قرار دیا تھا مگر اس سے کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔
ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے اس کو پڑھا اور لاچار خود علماء
نے اس کی تحصیل کی اور علم کلام ایجاد کیا۔

جو مسائل حکمت و فلسفہ و طبیعیات کے علوم جدیدہ کے
ذریعے پیدا ہوے ہیں ان کے لیے وہ علم کلام جو یونانی فلسفہ و
حکمت کے مقابل بنایا گیا تھا کافی نہیں ہے اور تفاسیر قرآن
مجید اور تفاسیر حدیث شریف، اور دیگر کتب مصنفہ اہل اسلام
میں اُس کے متعلق کچھ پایا نہیں جاتا اور اس سبب سے الحاد و
زندقہ مسلمانوں میں پھیلتا جاتا ہے۔

مقابلے میں علم کلام پیدا کریں مگر افسوس ہے کہ کسی نے اس پر توجہ نہیں کی ہے۔ تھوڑے دن ہوئے کہ ایک بڑا مجمع علمائے دین کا کانپور میں جمع ہوا تھا جو ندوۃ العلماء کے نام سے مشہور رہے ہے میں نے اس مجلس متبرکہ کے سکریٹری کو جو نہایت سخت وبا ہے جس کی روز بروز ترقی ہونے کی امید قوی ہے بس اس کا کیا علاج ہے۔ امید ہے کہ آپ میرے اس عریضے کو ندوۃ العلما کے سامنے پیش فرماویں گے اور جو ہدایت علماء کی اس باب میں ہو اس کو مشتہر فرماویں گے۔ تاکہ مسلمان اس آفت سے جس کی پناہ کسی جگہ نہیں معلوم ہوتی محفوظ رہیں۔ والسلام

مگر میں سمجھتا ہوں کہ کسی مصلحت سے یہ خط علماء کرام کے سامنے پیش نہیں ہوا۔ ان امور کے بیان کرنے سے میرا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جو حالات قوم کے ہیں وہ آپ کے سامنے بیان کروں اور یہ ظاہر کروں کہ اس باب میں آپ یا ہم یا ہماری قوم جب تک کہ ہمارے زمانے کے علماء بھی اس پر متوجہ نہ ہوں کچھ نہیں کر سکتے مگر بایں ہمہ ہم کو سوچنا چاہیے کہ جو ہم کر سکتے ہیں وہ کیا ہے۔ وہ بجز اس کے اور کچھ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ ہم ان طالبعلموں پر نماز پڑھنے کی، روزہ رکھنے کی تائید کریں، ان کے زمانہ روزہ کے لیے جو ضروریات ہیں اس کو مہیا کریں۔ اس سے بڑھ کر یہ کر سکتے ہیں کہ ہم کسی لائق عالم کو ان کی نصیحت اور ان کے عقائد اور ان کے خیالات فاسد کو اگر وہ درست کر سکتا ہے درست کرے۔ مذہبی تعلیم کو جس قدر ہو سکے ان کے کورس تعلیم میں داخل کر دیں۔

قوم کو اگر قومی ترقی اس طرح کی منظور ہو تو یہ بھی آپ کے سامنے پڑھتا ہوں۔ اس میں میں نے لکھا کہ "ایک امر جو سب سے ضروری اور مقدم ہے میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک زمانہ مسلمانوں پر ایسا گزرا ہے جس میں بجز تحصیل علوم دین کے اور کسی علم سے سروکار نہ تھا جس کے سبب دین کی ہزاروں کتابیں حدیث، تفسیر فقہ، اسماء الرجال، اصول حدیث، اصول فقہ وغیرہ موجود ہو گئیں۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا جس میں حکمت وفلسفہ یونان کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور اس کے سبب سے عقائد مذہبی میں بہت کچھ خلل واقع ہوا یا واقع ہونے کا اندیشہ ہوا۔ اس وقت علماء نے مذہب اسلام کی تائید پر کمر باندھی اور علم کلام ایجاد کیا اور اسلام کی نصرت کی۔ مگر اب وہ زمانہ بھی گیا اور جدید فلسفہ اور جدید حکمت اور جدید علوم حکمیہ پیدا ہو گئے، اور اس کے مسائل اور جو جو تحقیقات علوم طبعی کی اس میں ہوئی۔ وہ بہت زیادہ مخالف مسائل موجودہ اسلام کی ہے اور ان جدید علوم کا روز بروز زیادہ شیوع ہوتا جاتا ہے اور کسی کے بند کرنے سے بند نہیں ہو سکتا۔ اگلے زمانے کے عالموں نے بھی حکمت اور فلسفہ یونان بلکہ منطق پڑھنے کو بھی حرام قرار دیا تھا مگر اس سے کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے اس کو پڑھا اور بالآخر خود علماء نے اس کی تحصیل کی اور علم کلام ایجاد کیا

جو مسائل حکمت وفلسفہ وطبیعیات کے علوم جدیدہ کے ذریعے پیدا ہوئے ہیں ان کے لیے وہ علم کلام جو یونانی فلسفہ و حکمت کے مقابل بنایا گیا تھا کافی نہیں ہے اور تفاسیر قرآن مجید اور تفاسیر حدیث شریف اور دیگر کتب مصنفہ اہل اسلام میں اس کے متعلق کچھ پایا نہیں جاتا اور اس کا سبب ہوگا کہ جو مسلمان نوجوان کالج میں رکھے جاویں وہ عمدہ ہوں۔ اگر عمدہ نہ ہوں تو متوسط حالت میں رکھے جاویں۔ ان کے رہنے کے لیے مکانات صاف اور درست ہوں۔ ان کو پاکیزہ اور صاف لباس پہننے کی عادت ڈالی جائے۔ سلیقے سے رہنا اپنے رہنے کے مکان کو درست رکھنا ان پر لازم کیا جائے سب کو اگر ممکن ہو ایک سی حالت میں رہنے کی تدبیر کی جاوے کھانے کا انتظام ایسی طرح پر ہو کہ جس سے ان کو کھانے کا آپس میں دوستانہ اور برادرانہ طریقہ سے مل کر کھانا آجاوے

جو ایک بڑی مدبر قومی مؤانست قومی یگانگت کی ہے۔

مگر بعض لوگوں کی رائے اس کے برخلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسی مہذب عادتیں طالب علموں میں نہ ڈالی جائیں کیونکہ جب وہ کالج سے نکلیں گے تو اُن کی قسمت میں تو ایک قلی کے طور پر رہنا ہے۔ وہ ایسی اچھی طرح پر کیوں کر رہ سکیں گے۔

وہ لوگ ان تمام تدبیروں سے جو اُن نوجوان مسلمانوں کو مہذبانہ طریق سے رہنے کی سکھائی جاویں اس بات کو زیادہ پسند کرتے ہیں کہ غریب مفلس آدمیوں کو جس طرح کہ مسجدوں یا خیرات خانوں میں یا خیراتی اسکولوں میں رہتے ہیں یا جس طرح مدرسہ عالیہ جامع ازہر مصر میں طالب علموں کو ایک گلی میں کھڑا کر کے ان کے ہاتھوں میں دو دو یا تین تین قیمری روٹیاں رکھ دی جاتی ہیں۔ اس طرح یا اس کی مثل سستا آسان طریقہ اخراجات تعلیم کا اختیار کیا جاوے تاکہ کثرت سے غریب آدمی بھی تعلیم پا جاویں۔

اگر اس طریقے سے قوم قوم بن سکتی ہے، اگر اس طریقے سے مسلمان بچوں میں آدمیت 'غیرت' سلف ریسپکٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ تمہارے بچے اسی طرح پر تعلیم پاویں اور تعلیم کے ساتھ ذلت کی زندگی وہ کمانے جاویں تو بہتر۔ مگر میری رائے میں تو اس طریق سے کوئی قوم معزز قوم نہیں بن سکتی۔ جو لوگ اس طرح پر تعلیم دینا چاہتے ہیں ان کو مناسب ہے کہ خیراتی اسکول و کالج کھولیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ جو بچے قوم کے قوم بننے کے لائق ہیں ان کو بھی ان کے ساتھ ملا کر جن سے کچھ توقع نہیں ہے، برباد کر دیا جاوے۔

اخراجات تعلیم کی شکایت کرنے کی لوگوں کو جب قومی جتانے کی غرض سے عادت پڑ گئی ہے۔ طالب علم کے مربیوں کو اپنی اولاد کی تعلیم پر روپیہ خرچ کرنے کی عادت نہیں ہے۔ ورنہ وہ ایسے مفلس نہیں ہیں کہ اولاد کی تعلیم پر روپیہ خرچ نہ کر سکیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی جن پر اولاد کی تعلیم پر روپیہ خرچ کرنا گراں گزرتا ہے۔ دیگر رسمیات اور فضول باتوں میں کس قدر روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ فضول اخراجات اور بے ہودہ رسوم میں روپیہ قرض لیتے ہیں۔ جائدادیں گروی کرتے ہیں مگر اولاد کی تعلیم پہ خرچ کرنا نہیں جانتے۔ اے دوستو! وہ زمانہ گیا جب طالب علم مسجدوں کے حجروں میں رہ کر اور فاتحہ درود کی یا کسی لنگر خانہ کی روٹیاں کھا کر عالم ہوتے تھے۔ اب تجب تک ان کے مربی اپنے فضول اور لغو اخراجات بند نہ کریں اور اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پہ خرچ نہ کریں اس وقت تک ان کی اولاد کو نہ تعلیم ہو سکتی ہے نہ تربیت۔

میں نے آپ کے سامنے قوم کا واقعی اور مفصل حال بیان کیا ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کو اپنی قوم کی ترقی تعلیم اور عمدہ تربیت کی خواہش ہے۔ میں آپ سے یہ نہیں چاہتا کہ آپ اس وقت کوئی تدبیر بتاویں بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ آپ ان حالات پر غور کریں اور اپنی فرصت کے گھنٹوں میں سوچیں کہ قوم کو ایک معزز قوم بنانے اور ان کی تعلیم و تربیت کی کیا صورت ہے اور جو بہتر سمجھیں ویسا کریں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ جدی محمد رسول اللہ الذی ھدانا الی الایمان واخرجنا من الظلمات الی النور و رفعنا من قعر الذلۃ الی اعلی الدرجۃ فی الدنیا والدین والاخرۃ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

نہ جیتے بنتی ہے نہ مرتے

سید حامد ★

جینا کتنا مشکل ہو گیا ہے، اس کا اندازہ کسے نہ ہوگا؟ نہ ایک پل سکون، نہ ایک آن عافیت، ہر چہار طرف خطرے ہر وقت جان کا جوکھم، شاید ہی کوئی گھڑی فکروں سے خالی ہو۔ زندگی کی دوڑ کا مطلب یہ رہ گیا ہے کہ موقع ملتے ہی کونے کاٹنا، ساتھیوں کو ٹنگڑی مار کر یا دھکہ دے کر گرا دینا اور آگے نکل جانا۔ ان سب پر مستزاد خون خشک کر دینے والی، جان لینے والی مہنگائی۔ رفاقت اور ہمدردی بھی میسر نہیں کہ تقویت ہو، غم غلط ہو، جی بہلے۔ دفتر یا کاروبار کے ساتھیوں اور ہم پیشہ رفیقوں کو دیکھیے، ان میں سے بیشتر خود غرض اور بے حس نکلیں گے۔ روزمرہ کے معاملات میں جن لوگوں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے وہ ہوس پیشہ ہیں، اپنی غرض کے بندے ہیں، ان کے دل میں رحم اور ہمدردی ڈھونڈنے جایئے گا تو وہاں ذاتی منصوبے اور حساب کو سریر آرا پایئے گا۔ ایسے ماحول میں کون انسان ہوگا جو بے فکری اور خوش دلی کے ساتھ جی سکے، جو بے نیازی اور زندہ دلی کو پہلو سے لگا سکے جسے دیکھیے اسے افسردہ اور مرجھایا ہوا پایئے گا۔ شادماں وہی نظر آئیں گی جن کی طبیعت میں کجی اور خشونت ہے اور جنھوں نے جلب منفعت اور ہوس رانی کو مقصدِ زندگی بنا لیا ہے شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل۔ چھوٹی طبیعتوں والے ٹھگنے اسٹیج پر اکڑ اکڑ کر چل رہے ہیں۔ زندگی کی قدر و قیمت اب یہ رہ گئی ہے کہ قیمتیں چڑھتی جا رہی ہیں، قدریں گرتی جا رہی ہیں۔ کوالٹی آف لائف یا اعلیٰ شائستگی جس کے بار بار چرچے ہوتے ہیں، معدوم ہو چکی ہے۔ ذوقِ زندگی کجلا گیا ہے، گہنا گیا ہے۔ جینے کا لطف سادگی، سلامتی قناعت اور فراغت کے ساتھ چلا گیا، مشینوں کے ساتھ چلا گیا۔ بوڑھے وضع زمانہ سے بیزار ہیں کہ ہم یہ دن دیکھنے کے لیے جیے کیوں۔ جوان یا تو ناانصافی کے نظام سے برسرِ پیکار یا دورِ دیوانگی میں سرشار، خرمستیوں میں گرفتار، بچے جبیں پر شکن لیے ہوئے ہیں، ہوتے ہیں کہ اس وادیٔ غم اور صحرائے ستم میں ہم آئے ہی کیوں۔ بیشتر انسان یہ سوچتے ہیں کہ یہاں سے جتنی جلد نکل جائیں اتنا ہی اچھا لیکن مرنے کے ساتھ کون کم جھنجھٹ لگے ہوئے ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مر کے جائیں گے کدھر یہ منزل ہی سنگلاخ ہو گئی ہے مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ اور سنگین بنتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی خو

★ سابق وائس چانسلر، اے ایم یو، علی گڑھ ____ تعلیم آباد، نئی دہلی۔

کہ مادرِ وطن کی زمین کو مضبوطی سے پکڑیں، مرنے کے بعد بھی اسے نہ چھوڑیں، کسی حال میں اس پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کریں لیکن ادھر آبادی اور اموات کی کثرت سے یہ نوبت آگئی ہے کہ دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں۔ قبرستانوں میں جگہ ملنی دشوار ہو گئی ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ جس طرح مغرب اور مشرقِ بعید کے بڑے بڑے شہروں میں کاروں کو ایک پارکنگ لاٹ سے دوسرے، تیسرے چوتھے پارکنگ لاٹ تک لے جاتے ہیں اور جگہ نہیں ملتی، اسی طرح میت کو ایک قبرستان سے دوسرے قبرستان لے جائیں گے، اٹھائے اٹھائے پھریں گے اور جگہ نہ ملے گی۔ زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے، دیکھیں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے اٹھانا تو خیر ایسا دشوار نہیں، مرنے والے کو دیر تک گھر میں کون رکھنا چاہے گا؟ ادھر اس نے آنکھیں موندی ادھر گھر والوں نے آنکھیں پھیریں لیکن دشواری تو اس وقت پیش آتی ہے جب مرنے والے کو گاڑنے چلتے ہیں قبرستان میں جگہ حاصل کرنے کے لیے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ تدفین کا مسئلہ دن بدن سنگین ہوتا جارہا ہے۔ مسلمان ایک جرأت پیشہ قوم ہیں۔ ۴۵ سال ہونے کو آئے۔ ہزاروں لاکھوں تہ تیغ ہوئے تھے، اسی دلی اور اس کے نواح میں لیکن اس قیامت صغریٰ کو ۲۰ سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ تلاش معاش میں دلی لوٹ آئے۔ ان کے دم قدم سے بہت سی بستیاں آباد ہو گئیں اور بہت سے قبرستان بھی۔ نتیجہ ظاہر ہے، نہ بستیوں میں جگہ رہی، نہ قبرستانوں میں۔ جواب دیجیے زندے اب کہاں رہیں، مردے اب کہاں جائیں۔ ان سوالوں کے جواب نہ سرکار کے پاس ہیں نہ میونسپل کارپوریشن کے پاس۔

ابھی کل کی بات ہے جامعہ ہمدرد میں جو غیاث الدین تغلق کے قلعے کے زیرِ سایہ تعلیم و تحقیق کے فرائض انجام دے رہی ہے، وہاں کے ایک خدا رسیدہ بزرگ کا جن کا نام وقار خاں تھا اور پیشہ پلمبری، انتقال ہو گیا۔ پڑوس میں ایک قبرستان ہے جو لبالب بھر چکا ہے۔

خاک را ہے کہ بر آں می گزری ساکن باش
کہ عیون است و جفون است و خدود است و قدود

[جس راہ سے گزر رہے ہو وہاں
توقف کرو کہ تمہارے قدموں
تلے آنکھیں ہیں، ٹھوڑیاں ہیں
گال ہیں اور کشیدہ قامتیں ہیں]

وقار خاں مرحوم کو سپردِ خاک کرنے کے لیے گورکن نے قبر کھودنا شروع کی تو اس کا پھاوڑا کسی پرانی میت کے ڈھانچے سے ٹکرایا۔

یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

اسی قسم کی شکست پیکر جستجو کے بعد بالآخر ایک جگہ ہاتھ آئی، جہاں مرنے والے کو پناہ مل سکی، جس دو گز زمین پر ہمارا پیدائشی حق ہے اس کا ملنا بھی کتنا دشوار ہو گیا ہے۔

اور یہ ہڈیاں جو بچ جاتی ہیں وہ مرنے والے کی آرزوئے بقا کی نشانی ہیں۔ جسم اور جان کا ناتہ کیا ٹوٹتا ہے اور بھی کئی ناتے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ جلد اور جسم اور گوشت اور استخوان کا ناتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ گوشت گل کر الگ ہو گیا تو ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ باقی رہ گیا۔ گویا اصلی جسم یہی تھا۔ اس پر گوشت پوست کا غلاف چڑھا دیا گیا تھا جسے پہلی فرصت میں زمین نے اتار دیا۔ جس طرح انسان زمین پر جان دیتا ہے اسی طرح زمین بھی فرطِ محبت میں انسان کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتی ہے

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر

[اگرچہ میں بوڑھا ہوں تاہم تم ایک
رات مجھے اپنی آغوش میں
کھینچ لو]

اس گرم آغوشی سے بالآخر ہڈیاں بھی پگھل جاتی ہیں۔ جلد ہی گرمیٔ آغوشِ لحد لے باعث ع

شمع ساں قامتِ ممتاز پگھل جاتی ہے

آں پیر لاشہ را کہ سپردند زیر خاک
خاکش چناں بخورد کز و استخواں نماند

[اس بوڑھے لاشے کو جسے زمین کے نیچے لٹا دیا گیا، زمین اس طرح کھا گئی کہ ہڈیاں بھی باقی نہ رہیں]۔

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں صبحِ حشر کی بشارت ہے:

کز صبح گہ کنارِ تو جواں برخیزم

[تاکہ صبح کے وقت تمہاری آغوش سے جوان اٹھوں]۔

دلّی کو چھوڑیے، دیدۂ دل وا کیجیے تو یہی نقشہ سارے ہندوستان کا ہے یا ہونے والا ہے۔ قبرستان دونوں طرف سے فشار میں آگئے ہیں۔ ایک طرف آبادی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، دوسری طرف مسلمانوں نے قبرستان بیچنا شروع کر دیے ہیں:

ہو گئے نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

یہ بھی ان کی بے حسی اور نفس پرستی کی ایک مثال ہے۔ بعض قبرستانوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا گیا۔

آبادی بڑھی تو قبروں کی ضرورت بھی بڑھتی چلی گئی۔ حفظانِ صحت اور طبی امداد کے پروگراموں نے موت کی شرح کو گزشتہ چالیس سالوں میں کم کر دیا ورنہ اب تک سارے قبرستان چھلک چکے ہوتے۔

قبرستانوں کے بکنے یا ہتھیائے جانے اور تعداد اموات کے بڑھنے کا سلسلہ دلّی کی طرح ہندوستان کے بیشتر شہروں میں ابھی تک جاری ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ ابنائے وطن مسلمانوں کو کدورت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ایودھیا کے تنازعے نے فضا کو مسموم کر دیا ہے اور اس کا خمیازہ مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں بھگتنا پڑ رہا ہے ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

ہمارے اہلِ وطن کو یہ بات دراصل بہت ناگوار گزر رہی ہے کہ "مسلمان کارآمد اور بار آور زمینوں کو قبرستان بنا کر بیکار اور بے ثمر بنا دیتے ہیں۔" انھیں کیا پڑی ہے یہ سوچنے کی کہ بعض باتیں حساب سے ماورا ہوتی ہیں

ہمیں ٹھنڈے دل اور دوربین آنکھوں سے صورتِ حالات کا جائزہ لینا چاہیے۔ کیا یہ بے غیرتی کی بات نہیں کہ ہم ان جگہوں کو جہاں ہمارے بزرگ آرام کر رہے ہیں، صاف ستھرا، سرسبز شاداب رکھنا درکنار محفوظ بھی نہیں رکھ سکے۔ جس قبرستان میں جائیے خاک اڑتی نظر آئے گی، بہت سے قبرستان تو نجس جانوروں کی جولانگاہ بنے ہوئے ہیں۔

تہذیب کی ایک پہچان ہے مرنے والوں کا احترام۔ ہم زمین سے اٹھے ہیں۔ یہ بات برحق ہے کہ بالآخر ہم زمین میں واپس چلے جائیں گے۔ خدارا زمین کی آغوش کو ہم پر تنگ نہ ہونے دیجیے۔ زندگی میں زمین کے جھگڑے کیا کم تھے کہ مرنے والے بھی زمین کے پیچھے ٹکرایا کریں۔ انھیں احترام عافیت اور کشادگی کے ساتھ سپردِ خاک کر دیجیے۔ اس کی فکر نہ کیجیے کہ آپ جب ہم پر فاتحہ پڑھنے آئیں گے تو پتہ ہی نہ چلے گا کہ ہم کہاں ہیں۔ امتیازِ من و تو کو زندگی کے ساتھ ختم ہونے دیجیے۔ مغفرت کی دعاؤں کو موقع دیجیے کہ ان سب لوگوں کو جو قبرستان میں آرام کر رہے ہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ موت ان اقربا پروریوں، خود غرضیوں، تنگ نگاہیوں اور کوتاہ عملیوں

کو تسلیم نہیں کرتی جو بد قسمتی سے زندگی کے ساتھ منسوب ہو گئی ہیں اور نہ امیر اور غریب کے درمیان امتیاز کرتی ہے۔ امیروں کو بعد مرگ نمائشِ زر سے روکیے۔ داورِ محشر کے حضور جانے کے یہ انداز نہیں ہوتے۔

اب تک کی گفتگو سے نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نا کہ کافی یا ناکافی جتنی بھی زمین مختلف شہروں اور دیہاتوں میں ہمارے پاس ہے اس کو محفوظ کر لیا جائے۔ سارے قبرستانوں کے گرد چندہ کر کے مضبوط چار دیواری کھینچوا دی جائے۔ اس کے بعد قبرستانوں کی صفائی اور سرسبزی کا اہتمام کرنا چاہیے انگلستان میں قبرستان دیکھے، جی چاہا[لہ] کہ یہیں کے ہو رہیں وسیع سبزہ زار کیاریاں، خیاباں، گل و گلزار، یہی حال غالباً دوسرے مغربی مسیحی ملکوں کا ہو گا۔ زندگی میں تو ہم غفلت اور مصائب کا شکار رہے۔ مرنے کے بعد تو ہمیں چین سے رہنے دیجیے۔ یہ سب کچھ مقامی سطح پر ہی ہو سکتا ہے۔ ہم دعوا کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ احترام کرنے کے کیا یہی انداز ہوتے ہیں کہ انھیں بھیانک ویرانہ میں جا کر ڈال آئے۔

اس کے علاوہ ہمیں طرزِ تدفین کو بھی عصرِ حاضر میں آبادی کے اژدہام کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ پختہ قبریں بنانے کی غیر شرعی مسرفانہ اور زمین آشام رسم کو ترک کر دیجیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جگہ بچانے کے لیے ہر قبرگاہ میں پہلی تدفین بہت گہرائی میں کی جائے، دوسری تدفین اس سے کچھ اوپر اور تیسری تدفین اس سطح پر جہاں میتیں بالعموم دفن ہوتی چلی آئی ہیں۔ اس کے علاوہ جیسا کہ بعض قبرستانوں میں دستور ہے، قبرستان کو دو حصوں میں بانٹ دینا چاہیے۔ پہلے ایک حصے کو مرنے والوں سے آباد کیا جائے اور ایک طویل وقفے کے بعد دوسرے حصے کو اور پھر ایک طویل وقفے کے بعد پہلے حصے کو اور آگے اسی طرح۔

ظاہر ہے کہ اب کام "قلم برداشتہ" نہیں چلے گا۔ ہر شہر میں متعلقہ انجمن پر واجب ہے کہ تدفینات کے لیے منصوبے بنائے اور شہریوں کو (اور گورکنوں کو) نئے طریق تدفین پر رضامند کرے۔ جہاں ضرورت ہو وہاں قبرستانوں کی توسیع، نئی زمینیں خرید کر کی جائے۔ اگر ہر شہر میں دو ایک دردمند اور انتظام آشنا افراد اُٹھ کھڑے ہوں تو قبرستانوں کی حفاظت اور سرسبزی اور تدفین کی ضروریات کے مسایل بخیر و خوبی حل ہو جائیں۔ اس باب میں اگر تساہل یا غفلت برتی گئی تو حالات بے قابو ہو جائیں گے۔ ویران قبرستانوں کی شکستہ قبروں سے کان لگائیے تو صاف یہ دردبھری آواز سنائی دے گی۔

> " زندگی میں سکون نہ ملنا تھا نہ ملا، زندگی میں عزت حاصل نہیں ہوئی کہ عزت اور ذلت کے پیمانے بدلے ہوئے تھے۔ مرنے کے بعد تو ہم غریبوں کو سکون اور احترام کے ساتھ رہنے دیجیے۔"

مرنے والوں کی اس خاموش التجا کو آپ نہ سنیں گے تو کون سنے گا؟

لہ ہماری طالب علمی کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کا قبرستان بھی ایسا ہی تھا۔

قرآن حکیم کا انگریزی مترجم

محمد مارمڈیوک پکتھال — زندگی اور کارنامے

عبدالغنی فاروقی

مترجم قرآن، مفکر اسلام، ادیب، محقق، صحافی اور مبلغ و خطیب محمد مارمڈیوک پکتھال بلاشبہ ان شخصیات میں سے ہیں جو صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں اور صدیوں کو متاثر کرتی ہیں وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نابغہ انسان تھے ان پر قدرت خداوندی کا سب سے بڑا کرم یہ تھا کہ اگرچہ وہ کفر و شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں پیدا ہوے مگر ان کی عقل سلیم انھیں اسلام کی سیدھی اور روشن شاہراہ پر لے آئی اور بہت سی دیگر تصانیف کے علاوہ انھوں نے خصوصًا ترجمۂ قرآن کی صورت میں انگریزی خواں طبقے کو ایسا انمول تحفہ عطا کیا جو قیامت تک رہ روان شوق کی رہنمائی کرتا رہے گا اور خود پکتھال مرحوم کے لیے بھی بے بہا صدقہ جاریہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ مارمڈیوک ولیم پکتھال، ۷ اپریل ۱۸۷۵ء کی صبح انگلستان میں سفک (Suffolk) کے قریب ایک گاوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چارلس پکتھال مقانی گرجا گھر کے پادری تھے۔ چارلس کی پہلی بیوی سے دس بچے تھے وہ وفات پا گئی تو انھوں نے دوسری شادی میری ایلزبتھ ڈی۔ ایچ۔ اوبرائن کی بیٹی میری سے کی۔ اس کی بیوی سے چارلس کے یہاں مارمڈیوک پکتھال تولد ہوئے۔ موصوف چھ برس کے تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے، چنانچہ یہ خاندان گاوں سے ترک مکانی کر کے لندن کے محلہ کنگسٹن میں آگیا اور ننھے مارمڈیوک کو نارفوک کے اسکول میں داخل کرایا گیا، جہاں شروع میں انھوں نے اپنی ذہانت کا سکہ جما لیا۔ خصوصًا ریاضی میں اپنی قابلیت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد وہ سخت بیمار ہو گئے اور ڈاکٹروں نے ایک سال کا آرام تجویز کیا۔

مکمل صحت یابی کے بعد پکتھال کو ہیرو کے مشہور و معروف پبلک اسکول میں داخلہ دلایا گیا، جہاں انھوں نے جغرافیہ اور لسانیات میں امتیاز حاصل کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں ونسٹن چرچل سے ان کی گہری دوستی تھی جو آخر وقت تک قایم رہی۔ چرچل نے آگے چل کر برطانوی سیاست میں غیر معمولی نام پیدا کیا۔

ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد مارمڈیوک پکتھال فرانس گئے جہاں انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور پھر اٹلی کے مشہور شہر فلورنس سے اطالوی زبان میں دستگاہ حاصل کی۔ واپس لندن آکر جرمن اور ہسپانوی زبانوں پر عبور

حاصل کیا۔ اس کے ساتھ انھیں ادب و تاریخ سے بھی گہرا شغف تھا اور اس حوالے سے انھوں نے مشرقی زندگی اور معاشرتی روایات سے بھی اچھی خاصی شناسائی حاصل کرلی اور اس سے گہرے اثرات قبول کیے۔

تعلیم سے فارغ ہوکر انیس برس کی عمر میں مارمڈیوک امور خارجہ کے امتحان میں شریک ہوئے اور اگرچہ امتحان میں اول آئے مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر انھیں ملازمت نہ دی گئی جس سے وہ بہت بد دل ہوئے۔ اس زمانے کے تاثرات وہ یوں قلم بند کرتے ہیں۔

" میں ناامیدی اور افسردگی کا شکار ہوگیا۔ مجھے لندن کا ابر آلود گھٹا گھٹا اور دردناک ماحول بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ میری سوچوں پر مشرقی ممالک کی وہ فضا چھائی رہتی جہاں سورج پوری آب و تاب سے چمکتا تھا اور جہاں کھجوروں کے نخلستان اور اونٹوں کی قطاریں دل و دماغ کو نئی فرحت اور سکون سے آشنا کردیتے تھے۔ اگرچہ میری عمر کچھ زیادہ نہ تھی لیکن میرے دل میں ان ملکوں کے لیے بے پناہ کشش تھی جو مجھے اس طرف کھینچتی رہتی تھی اور خوشی کی بات یہ ہے کہ میری والدہ نے بھی مجھے خوابوں کی اس سرزمین میں جانے کی اجازت دے دی۔"

اگرچہ ان کے عزیزوں کی طرف سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تجویز بھی تھی مگر انھوں نے شرق اوسط کی سیاحت کو ترجیح دی اور اپنے ایک دوست فیونگ کے ساتھ مصر پہنچ گئے۔ مصر پہنچ کر مارمڈیوک نے یہاں کی تہذیب ثقافت کا مطالعہ شروع کردیا اور کچھ عرصے قیام کے بعد شام چلے گئے۔ وہاں وہ ایک پادری ہینوز سے ملے جو آثار قدیمہ کا مطالعہ کررہا تھا۔ انھوں نے پادری سے گہرے تعلقات استوار کیے اور اس سے عربی سیکھنا شروع کی۔ پھر وہ ایک ترجمان اور گائیڈ کو ساتھ لے کر صحرا عبور کرکے شہران، رملہ اور غزہ پہنچے۔ دوران سفر انھوں نے عرب سارانوں اور دیہاتیوں کی معاشرت اور مسائل سے بھی واقفیت حاصل کی اور عربی کی استعداد میں اضافہ کیا۔ دوسری جانب انھوں نے اونٹ پر سوار ہوکر کوہ جودی (ترکی) تک کا سفر کیا۔ وہ شرق اوسط کی سادہ اور فطری زندگی سے بہت متاثر ہوئے اور یوں لگا جیسے انھیں ان کے پسندیدہ خواب کی تعبیر مل گئی ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

" مجھے یہاں کی زندگی میں عجیب قسم کا سکون ملا۔ یورپ میں رہتے ہوئے میں نے کسی شخص کو بھی خوشی سے ہمکنار نہیں دیکھا لیکن عربوں میں بیشتر لوگ مجھے خوش نظر آئے ان کی زندگی سادہ تھی اور وہ فطرت کی آغوش میں مطمئن زندگی گزارتے تھے حالانکہ اکثر عرب ممالک مغربی اقوام کے غلام تھے اور یہ قومیں ان پر بہت برے طریقے سے حکومت کرتی تھیں۔ اہل یورپ کو یہاں حکومت کرتے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انسان انسان کا کس طرح دشمن ہوسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یورپی قوموں نے اپنے مفادات کے لیے ان معصوم انسانوں کا خوب استحصال کیا۔"

زندگی کے اس تضاد اور سامراج کے اصل کردار نے نوجوان پکتھال کے حساس دل و دماغ میں ہنگامہ برپا کردیا۔ انھیں یورپ کی استحصالی قوتوں سے نفرت ہونے لگی اور مشرق کے مظلوم انسانوں سے ہمدردی ان کے رگ و پے میں سرایت کرگئی۔ اس ماحول میں انھوں نے

اپنا پہلا ناول "سعید ایک مچھیرا" لکھا، جسے یورپ کے بیشتر ناشروں نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ البتہ میسرز میتھین نے اسے شایع کر دیا اور پھر فرانسیسی، جرمن اور دیگر یورپی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوے۔

شرق اوسط کی سیاحت کے بعد پکتھال انگلستان واپس چلے گئے اور کئی سال لندن، سفک اور سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہے۔ اس دوران پڑھنا اور غور و فکر کرنا ان کے محبوب مشاغل تھے مگر ان کی بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی اور یورپ کا ماحول انھیں سچا سکون اور اطمینان فراہم کرنے سے قاصر تھا۔ اسی دوران برطانوی سفیر لارڈ کرومر نے انھیں مصر بلوایا تاکہ اہل مصر کی نفسیات کے سلسلے میں ان سے رہنمائی حاصل کرے۔ یہ وہ دور تھا جب مصر میں سخت بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ برطانوی سامراج اپنے پورے عروج پر تھا مگر مصر کے لوگ اس کی قاہرانہ سطوت کو خاطر میں لائے بغیر بغاوتوں اور شورشوں میں مصروف تھے۔ ۱۹۰۴ میں پکتھال مصر پہنچے تو بعض حلقوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ برطانیہ کی خفیہ سروس سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا پکتھال نے مصر کے تعلیمی اداروں کے تفصیلی دورے کیے جن سے اہل مصر کی معاشرت کے نئے گوشے ان پر وا ہوے اور عربی زبان کی استعداد میں اور اضافہ ہوا۔ اپنے تجربات اور مشاہدات پر مبنی انھوں نے دو کتابیں مرتب کر کے شایع کیں۔ "دریاے نیل کے بچے" اور "پردے دار خاتون"۔

مصر سے پکتھال اپنی اہلیہ کے ساتھ بیروت گئے، وہاں سے شام پہنچے اور پھر بیت المقدس میں خاصا عرصہ قیام کیا۔ اس سفر میں انھوں نے عربی کی تحصیل مکمل کی، اسلام کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کیا اور مشہور علما سے طویل گفتگوئیں ہوئیں۔ اس زمانے میں وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ مسجد اقصیٰ میں شیخ الجامعہ سے عربی پڑھتے پڑھتے انھوں نے قبول اسلام کا ارادہ ظاہر کیا۔ شیخ معمر تھے اور جہاں دیدہ بھی۔ انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ایک نوجوان آدمی کا یہ جذباتی فیصلہ نہ ہو، انھیں مشورہ دیا کہ اپنے والدین سے صلاح کر لیں اور خوب سوچ سمجھ لیں۔ پکتھال لکھتے ہیں:

> "اس مشورے نے میرے دل پر عجیب اثر کیا۔ میں تو عام یورپینوں کی طرح یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مسلمان کرنے پر تلے رہتے ہیں مگر اس گفتگو نے میری راے بدل دی اور میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ مسلمان تو بڑے روادار اور حقیقت پسند ہیں ان پر متعصب ہونے کا خواہ مخواہ الزام لگایا جاتا ہے۔"

اسلام کے بارے میں پکتھال کا براہ راست مطالعہ جاری رہا اور وہ شدت کے ساتھ اس کا اثر قبول کرتے رہے مصر و شام کے علاوہ انھوں نے عراق اور ترکی کی بھی سیاحت کی۔ ترکی زبان بھی سیکھی اور ان ملکوں کے مسلم معاشروں کا انھوں نے قریب سے مشاہدہ کیا اور ساری چیزوں نے مل کر ان کے دل و دماغ کا یوں احاطہ کیا کہ انھوں نے عربی لباس پہننا شروع کر دیا اور اسلام کی حقانیت ان کی روح میں اترتی چلی گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت عثمانیہ میں اندرونی خلفشار پیدا ہو رہا تھا اور یورپی طاقتیں خلافت کی قوت کو توڑنا چاہتی تھیں۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں خلافت عثمانیہ کو شکست ہو چکی تھی۔ پکتھال کا خیال تھا کہ یورپی طاقتیں محض مذہبی تعصب اور اسلام دشمنی کے سبب خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں۔ ۱۹۱۲ میں وہ شرق اوسط سے واپس انگلستان گئے اور اینگلو عثمانیہ سوسائٹی قایم

کی۔ اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترکوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کا تدارک ہو مگر شدید مخالفانہ اور متعصبانہ فضا میں یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور غیر معمولی ذہنی دباؤ کے تحت پکتھال بیمار ہو گئے۔

بقول پکتھال

"فروری ۱۹۱۳ء میں، میں نے چند ماہ کے لیے ترکی جانے کا ارادہ کیا تاکہ اس فضا سے چھٹکارا پا سکوں جس نے مجھے بیمار کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے ان ایام میں برطانوی اخبارات اور عوام ترکوں کے خلاف اس صلیبی جنگ کے نعروں کی پُرجوش حمایت کر رہے تھے جو بعض عیار بلقانی حکمرانوں نے بلند کیے تھے، ایک مسلم طاقت کے خلاف عیسائیوں کی اس یک جہتی اور اتحاد کو بہت سے لوگوں نے سراہا لیکن اس سے ان انگریزوں کے دل ٹوٹ گئے جو مشرق سے پیار کرتے تھے۔ اس وقت مجھے یوں لگتا تھا جیسے عیسائیت دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کی خیر اندیشیاں اور فیض رسانیاں صرف عیسائی اقوام تک محدود تھیں اور دوسری وہ جو ساری دنیا کو بلا لحاظ مذہب و نسل عدل و انصاف اور سخاوت کا مستحق سمجھنے کی دعوے دار ہے۔ مگر روس، انگلستان اور بلقانی ریاستوں میں پہلی قسم کی عیسائیت کا دور دورہ تھا یہ مذہبی جنون اور تعصب و تنگ نظری کی وہی کیفیت تھی جو اگر کم علم جاہل مسلمانوں میں نمودار ہوتی ہے تو ہم اس کی مذمت کرتے نہیں تھکتے مگر خود اس کا بار بار مظاہرہ کرتے ہیں۔"

پکتھال ترکوں سے پہلے ہی متاثر تھے مگر اب انھیں کئی ماہ تک یک سوئی کے ساتھ وہاں قیام کا موقع ملا تو ترکوں کی سماجی اور طبعی خوبیوں نے انھیں مکمل طور پر اپنا اسیر بنا لیا۔ چنانچہ غازی طلعت بک اور دوسرے ترک رہنماؤں کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں۔

"ایک روز میں نے طلعت بک سے کہا آپ یوں ہی غیر مسلح پھرتے رہتے ہیں آپ کو اپنے ساتھ اسلحہ بردار محافظ رکھنے چاہیں، جواب میں انھوں نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر میرا کوئی محافظ نہیں۔ مجھے اسی پر اعتماد ہے اور موت کا ایک وقت مقرر ہے، اسلام کی یہی تعلیم ہے۔"

پکتھال، غازی انور پاشا، شوکت پاشا، غازی رؤف بک اور دوسرے ترک رہنماؤں کا تذکرہ بھی بڑی عقیدت اور والہانہ محبت سے کیا کرتے ان کا تاثر تھا کہ لوگ ناحق ترکوں پر آزاد خیالی اور لادینی کا الزام دھرتے ہیں۔ میں نے انھیں ہمیشہ خدا سے ڈرنے والا مسلمان پایا۔

قیام ترکی کے دوران پکتھال نے قبول اسلام کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ انھوں نے غازی طلعت بک سے کہا:

"میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔"

اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ قسطنطنیہ میں قبول اسلام کا اعلان نہ کیجیے۔ بہتر ہے کہ اس کا اعلان لندن سے ہو یورپ میں اس کے تبلیغی نتائج زبردست رہیں گے۔ اسی مشورے کا نتیجہ تھا کہ پکتھال صاحب نے لندن جا کر دسمبر ۱۹۱۴ء میں اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا جس سے وہاں کی علمی اور سیاسی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ عیسائی دنیا کا عمومی تبصرہ یہ تھا کہ جس مذہب کو پکتھال جیسا شخص قبول کر رہا ہے اس میں یقیناً بہت سے اچھائیاں ہوں گی۔

قبول اسلام کے موقع پر پکتھال کے تاثرات یہ تھے:

"میں اپنے زور مطالعہ سے مسلمان
ہوا ہوں اور میرے دل میں اس کی
بے حد قدر ہے۔ مسلمانوں کو اسلام ورثے
میں ملا ہے اس لیے وہ اس کی قدر نہیں
پہچانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن و
عافیت کا گہوارہ ہے اور اس نعمت پر
میں خدائے بزرگ و برتر کا جس قدر شکریہ
ادا کروں کم ہے۔"

جنگ عظیم شروع ہوئی تو انھوں نے پوری کوشش کی کہ انگریزوں اور ترکوں کے درمیان صلح ہو جائے جنگ ختم ہو جانے پر انھوں نے خلافت کی بقا کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا، مگر افسوس انگریزوں کے تعصب اور غرور کے سامنے پکتھال کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں لیکن جب چند سال بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے خود ہی خلافت کا قلع قمع کر دیا تو ترکی کے ساتھ پکتھال کی دلچسپیاں مدھم پڑ گئیں۔

جنگ عظیم کے دوران محمد مارماڈیوک پکتھال لندن میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ وہ جمعہ کا خطبہ دیتے امامت کرتے عیدین پڑھاتے اور نماز میں تراویح کے امام ہوتے رسالہ "اسلامک ریویو" کی ترتیب و تدوین بھی انھی کے سپرد تھی۔ اس دوران وہ "ادارۂ معلومات اسلامی" سے بھی منسلک رہے، ترکی کے حق میں متعدد مضامین کے علاوہ ان کی تین کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ یعنی "ٹیلز فرام فائیو چمنیز" (۱۹۱۵ء) "دی ہاؤس آف وار" (۱۹۱۶ء) اور "نائٹس آف عربیا" (۱۹۱۷ء)

۱۹۲۰ء میں جناب عمر سبحانی کی دعوت پر پکتھال بمبئی آ گئے اور وہاں کے مشہور اخبار "بمبئی کرانیکل" کی ادارت سنبھال لی اور ۱۹۲۴ء تک یہ ذمہ داری نبھاتے رہے۔ انھوں نے شذرات اور اداریوں میں یہ بات کھل کر لکھی کہ خلافت عثمانیہ کی تباہی میں عیسائی دنیا کا کردار کیا تھا اور یہ کہ عالم اسلام کے خلاف انگریز کس انداز کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ غرض اس دوران انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کے مسائل میں گہری دلچسپی لی۔ ہندوستان کی مقامی سیاست میں جزوی طور پر حصہ لیا اور ناگپور اور بھڑوچ میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔ ہندوستانی طرز معاشرت پر انھوں نے کہانیاں بھی لکھیں اور ایک انسائیکلوپیڈیا کے لیے بمبئی اور گجرات کے بارے میں دو بھرپور مقالے بھی قلم بند کیے۔

۱۹۲۴ء میں انھوں نے "بمبئی کرانیکل" کی ادارت ترک کر دی اور مغربی گھاٹ میں کچھ دن آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ یہیں انھیں نظام حیدرآباد کی جانب سے دکن کے وزیراعظم سر اکبر حیدری اور ناظم تعلیمات سر راس مسعود کے خطوط ملے جن میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ پکتھال اپنی خدمات حیدرآباد دکن کے سپرد کر دیں چنانچہ موصوف نے نظام کے حکم پر چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی قبول کر لی اور یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو نئی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

پکتھال حیدرآباد دکن کے ماحول اور معاشرت سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"حیدرآباد ایک شاندار جگہ ہے
ناقابل بیان حد تک خوبصورت، یہ
آفتاب مغلیہ کی ایک ضوفشاں کرن ہے
تہذیب و ثقافت میں اس کا مشرق
میں کوئی جواب نہیں۔"

دکن اور اس کی تہذیب سے پکتھال کا گہرا قلبی لگاؤ آخر وقت تک قائم رہا۔ انھوں نے چادر گھاٹ کالج

کو ترقی دینے کے لیے خوب محنت کی۔ طلبا کی کردار سازی کے لیے ادارہ بنا دیا۔ ان خدمات کی قدر کرتے ہوئے حضور نظام نے انھیں ریاست کے سول سروس ہاؤس کا منتظم اعلیٰ بنا دیا۔ اس ادارے میں حیدرآباد سول سروس کے تمام اعلیٰ عہدے دار تعلیم و تربیت حاصل کیا کرتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے "اسلامک کلچر" کے نام سے ایک سہ ماہی انگریزی رسالے کا اجرا کیا جس کے سرپرست اعلیٰ حیدرآباد کے وزیر سر اکبر حیدری تھے۔ اس رسالے میں علمی اور تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے جن میں اسلامی تعلیمات کا اثبات دلایل و براہین کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اس رسالے کو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ بنانے کے لیے سخت محنت کی۔ ایک ایسا علمی جریدہ جو ہر پہلو سے اسلامی ثقافت اور روایات کا آئینہ دار ہو۔ اپنے عہد ادارت میں انھوں نے متعدد مستشرقین کو اس رسالے میں لکھنے پر آمادہ کیا اور دنیا بھر کی تقریباً ستر یونیورسٹیاں اس کے خریداروں میں شامل ہو گئیں۔ اشاعت کے لیے آنے والے مضامین کو وہ اکثر دوبارہ لکھتے اور رسالے کے اعلیٰ علمی معیار کو کسی صورت میں بھی کمزور نہ ہونے دیتے۔ چوں کہ پکتھال دنیا کی بہت سی زبانیں جانتے تھے اس لیے وہ ان زبانوں کے علما اور محققین کے مقالات کا آسانی سے ترجمہ کر لیتے۔ تازہ ترین کتابوں پر تبصرہ بھی خود کرتے اور یوں انگریزی خواں طبقہ دنیا بھر میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے چھپنے والی کتابوں سے باخبر ہو جاتا۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے مدراس میں مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد لیکچر دیے۔ سالانہ لیکچروں کا یہ اہتمام اسی شہر کے ایک دین دار اور علم دوست تاجر جمال محمد کرتے تھے اور ان میں مختلف ماہرین اپنے ترشحاتِ فکر پیش کرتے تھے۔ ان لیکچروں کے موضوعات میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلو شامل تھے جو بعد میں "کلچرل سائیڈ آف اسلام" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ تعلیم یافتہ سنجیدہ طبقے میں یہ لیکچر بہت پسند کیے گئے۔

پکتھال کا سب سے بڑا، سب سے لازوال اور عظیم کارنامہ ان کا ترجمۂ قرآن ہے اس سے قبل انگریزی زبان میں قرآن حکیم کے جتنے ترجمے ہوئے تھے وہ غیر مسلم مستشرقین اور علما نے کیے تھے اور مختلف مواقع پر موصوف نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ ان مترجمین کا رویہ اسلام اور قرآن کے بارے میں معاندانہ اور تعصب پر مبنی ہے۔ اس لیے وہ قرآن کے مطالب سے انصاف نہیں کر سکے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ترجمے کا فریضہ انجام دے۔ حیدرآباد میں انھوں نے اس مبارک کام کا ارادہ کیا اور یہ خبر نظام تک پہنچی تو انھوں نے اس منصوبے پر خوشنودی کا اظہار کیا اور پوری تنخواہ کے ساتھ انھیں دو سال کی رخصت عطا فرمائی تاکہ ترجمے کا کام کامل سکون، توجہ اور یک سوئی کے ساتھ مکمل ہو۔ جب ترجمہ مکمل ہو گیا تو نظام نے اپنے خرچ پر پکتھال کو مصر بھیجا تاکہ علمائے ازہر سے ضروری نکات پر مشورہ کیا جا سکے چنانچہ موصوف نے قاہرہ میں کئی ماہ قیام کیا اور جامعۂ ازہر کے ریکٹر شیخ مصطفیٰ المراغی اور علامہ محمد احمد الغمراوی سے طویل ملاقاتیں اور مشورے کیے اور بعض دیگر علما و فضلا سے بھی قرآن حکیم کے مشکل مقامات پر بحث مباحثہ کیا اور جہاں ضروری سمجھا ترجمے پر نظر ثانی کی۔ بالآخر تین سال کی محنت شاقہ رنگ لائی اور ۱۹۳۰ء میں یہ ترجمہ "دی گلوریئس قرآن" کے نام سے بیک وقت لندن اور نیویارک سے شائع ہوا۔ یہ نسخہ دو جلدوں میں حیدرآباد دکن سے بھی شائع ہوا اور اس کے جملہ اخراجات حضور نظام نے ادا کیے۔ محمد مارماڈیوک پکتھال ترجمہ قرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

" اس ترجمے کا مقصد انگریزی خواں طبقے کے سامنے یہ بات پیش کرنا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ہیں۔ اس کا مقصد قرآن کی ماہیت کو موزوں الفاظ میں سمجھانا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت پورا کرنا ہے یہ دعویٰ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے کہ کسی الہامی کتاب کو ایک ایسا شخص بڑی عمدگی سے پیش کرسکتا جو اس کے الہامات اور پیغامات پر ایمان رکھتا ہو ۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا ہے جو مسلمان ہے جبکہ بعض تراجم میں ایسی تعبیریں کی گئی ہیں جو مسلمانوں کے لیے دل آزار ہیں اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ یہ قدیم علما کا اور میرا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لیے کوشش کی گئی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی جائے لیکن بہرحال یہ ترجمہ قرآن نہیں ہوسکتا کہ قرآن تو بے مثل وبے عدیل ہے۔ قرآن میں تو اتنی ہم آہنگی ہے کہ اسے سنتے ہی رونے لگتے ہیں اور وجد میں آجاتے ہیں یہ تو قرآن کے مفہوم کو انگریزی زبان میں پیش کرنے کی محض ایک کوشش ہے اور اس کے سحر کی قدرے عکاسی کی گئی ہے یہ عربی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا اور نہ میرا یہ مقصد ہے۔"

چنانچہ یہ پہلا انگریزی ترجمہ قرآن ہے جس میں بائبل کے ترجمے کا لطف آتا ہے اور نہ صرف صحت، سلاست اور فصاحت کے اعتبار سے مقبول ترین ہے بلکہ پُرشکوہ اور بے پناہ اثر آفریں ہے۔ محترمہ مریم جمیلہ نے اس ترجمے کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

> " مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں مل سکا کسی ترجمے میں وہ فصاحت وبلاغت اور دل نشیں انداز بیاں نہیں جو اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لیے "گاڈ" کے لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے لیکن پکتھال صاحب کی اس عظیم دینی اور علمی خدمت کو پورے عالم اسلام میں سراہا گیا اور حضور نظام نے انھیں پہلی گول میز کانفرنس میں سلطنت آصفیہ دکن کے وفد کا سکریٹری نامزد کیا۔"

جنوری ۱۹۳۵ء میں محمد مارماڈیوک پکتھال حیدرآباد ایجوکیشنل سروس سے مستعفی ہوگئے۔ سرکار نظام نے تاحیات پنشن مقرر کر دی اور پکتھال واپس لندن چلے گئے اور وہاں ہمہ تن تبلیغ دین میں مصروف ہوگئے۔ "اسلامک کلچر" جو پہلے حیدرآباد سے چھپتا تھا اب لندن سے چھپنے لگا۔ رائل سنٹرل ایشین سوسائٹی لندن کی طرف سے ان کے سلسلہ وار مضامین "جدید دنیا میں مسلمانوں کا کردار" بھی شائع ہونے لگے۔ اس طرح بقیہ حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ دین حق کی تبلیغ واشاعت میں صرف کرتے ہوئے یہ عظیم الشان، بے مثل عالم اور مفکر و مبلغ ۱۹ رمئی ۱۹۳۶ء کی صبح حرکت قلب بند ہونے سے وفات پاگئے۔ ۱۸ رمئی کی رات سونے سے پہلے انھوں نے ایک کاغذ پر قرآن پاک کی یہ آیت اور اس کا انگریزی ترجمہ تحریر کیا۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ

عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

[حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت
میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر
چلے۔ اس کے لیے اس کے رب کے پاس
اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی
خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں]

(البقرہ۔ آیت ۱۱۲)

گویا اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں محمد مارمڈیوک پکتھال کو کامیابی اور خوشنودی کا مژدہ سنایا۔ یہ نصیب اللہ اکبر۔ انھیں لندن میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا اگرچہ ان کی دیرینہ تمنا تھی کہ ان کی موت اسپین میں ہو اور وہیں دفن ہوں۔ اسپین کے اسلامی دور سے انھیں بے حد محبت تھی۔ پکتھال، یورپی ہونے کے باوجود مکمل طور پر اسلامی اخلاق سے آراستہ تھے۔ پنجگانہ نمازوں اور رمضان کے روزوں میں کبھی ناغہ نہ ہونے دیتے۔ قدم قدم پر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتے اللہ پر ان کا ایمان بڑا مستحکم تھا۔ ہر کام اس کی رضا کے مطابق انجام دیتے، بے حد شریفانہ جذبات کے مالک تھے۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران غریب اور نادار طلبا کی دل کھول کر مالی امداد کرتے۔ بے تعصب اور بے ریا انسان تھے اور ان سے ملنے والے ایمان میں تازگی محسوس کرتے تھے۔ مشہور مصنف شیخ عطاء اللہ لکھتے ہیں:

"مجھے علی گڑھ میں ان کے چند شاگردوں
سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ ان میں
ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی لیکن ہر ایک
ان کے خلوص اور ان کی شفقت پدرانہ
کا مداح تھا۔"

(ماخوذ)

"آپ یقین کریں گے جس طرح میں
یورپین سائنس و لٹریچر اپنی قوم میں اعلیٰ
درجے کی ترقی پر ہونے کی کوشش کرتا
ہوں، اس سے زیادہ میری کوشش اس
پر ہے کہ وہ اسلام کو برحق سمجھیں اور
لا الہ الا اللہ پر ثابت قدم رہیں۔"

سرسید احمد خاں

فلسفہ ـــــــ ایک جائزہ

ذوالفقار احمد *

فلسفہ کیا ہے؟ بظاہر یہ بہت آسان سوال لگتا ہے مگر اس کا جواب دینا بہت مشکل کام ہے۔ اس کی ٹھیک ٹھیک تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ دراصل فلسفی کے معنی عاشق حکمت کے ہیں۔ اس کی شروعات سقراط کے اس مشہور جواب سے ہوتی ہے کہ جب اس کو حکیم، کہا گیا تو اس نے کہا کہ اس کی حکمت کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ نادان ہے اسے کچھ نہیں آتا، اس لیے اسے حکیم کے بجائے عاشق حکمت کہا جانا زیادہ مناسب ہوگا۔

لفظ حکمت صرف فکر، تک محدود نہیں، بلکہ فلسفے میں وہ چیز بھی داخل تھی جس کو اب سائنس کہا جاتا ہے۔ جوں جوں کسی خاص دائرے میں مخصوص علم کا ذخیرہ جمع ہوتا گیا۔ اس دائرے کا علم فلسفہ سے علیحدہ ہوتا گیا۔ افلاطون اور ارسطو کے زمانے میں سیاسیات قانون، فزکس، کیمسٹری غرضیکہ تمام مروجہ علوم فلسفے میں شامل تھے اور فلسفے کی حیثیت مرکزی تھی، اسی لیے فلسفے کو Root بھی کہا گیا ہے مگر رفتہ رفتہ تمام علوم اس سے الگ ہوتے چلے گئے، اس کی شاخیں زیادہ پھل پھول گئیں۔ سب سے آخر میں نفسیات اور اجتماعیات فلسفے سے جدا ہوئے۔ اس طرح فلسفہ کا یہ حال ہوگیا کہ جوں جوں علم کا دائرہ وسیع ہوتا گیا فلسفہ محدود ہوتا گیا۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ فلسفہ معدوم ہوجائے گا ایسا نہیں۔ ایک بات بہت مشکل رہی ہے کہ فلسفی متفق نہیں ہوسکے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اگر کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہوسکا تو اس کے حصول کی کوشش بھی بیکار گئی۔ یہ بات ممکن ہے کہ دو فلسفی آپس میں متفق نہ ہوں ان میں سے ہر ایک کوئی نہایت قیمتی اور قابل قدر چیز سامنے رکھے جسے وہ ابھی ہر کسی سے محفوظ نہ کرسکا ہو اور وہ چیز جو اس کے مقابلے میں پیش کی گئی ہے وہ اس کی تکمیل کرسکے اس لیے یہ بات اس چیز کے جواب میں بڑی حد تک درست ہے کہ فلسفیوں میں اتفاق کم ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مختلف فلسفیوں کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بیان کی تکمیل کرسکیں۔

فلسفے کا ذکر سن کر جو سوال کیا جاتا ہے وہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ فلسفہ کیا ہے؟ اس کا کیا فائدہ

---

* ڈپارٹمنٹ آف فلاسفی، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

انسان دوسری تمام جاندار اشیاء کی طرح اپنے وجود کو قایم رکھنے کے لیے جا۔جہد کرتا ہے مگر انسان کو دوسری جاندار اشیاء پر فوقیت ہے تو عقل کی سطح پر۔ انسان اپنی زندگی اپنی عقل اور اس سے حاصل کردہ علم جو اس نے اپنے بارے میں اور دنیا کے بارے میں حاصل کیا ہے اس کی روشنی میں گزارتا ہے۔علم حاصل کرنے کی خواہش انسان کی فطرت میں ہے۔ کوئی اس کو استعمال کرے یا نہ کرے وہ الگ بات ہے۔ فلسفہ اس خواہش کو پورا کرنے کی ایک علمی کوشش ہے۔ یہ ایک ضرورت ہے۔ ایک مشہور انگریز فلسفی کے بقول کہ ہر ایک انسان اپنے فلسفے کے مطابق زندگی گزارتا ہے اسی کے مطابق وہ دنیا کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہ بات اُن پر بھی صادق آتی ہے جو لفظ فلسفے سے واقف بھی نہیں۔

اس لیے فلسفے کے جو لفظی معنی ہیں وہ عشق حکمت کے ہیں۔ یہ ان تمام چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو انسان کو فوراً یا دیر سے متاثر کریں اور ایسے سوالات پیش کرتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ اس کی فطرت کیا ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اس کا انجام کیا ہے؟ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں اس کا مقصد کیا ہے اور اس کی فطرت کیا ہے؟ اس کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں۔ انسان اس دنیا کو اور خدا کو اپنے علم کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کچھ سوالات ہیں جو فلسفہ میں زیر بحث آتے ہیں۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ فلسفے کا کیا فائدہ ہے تو اس سے اس بات کی امید نہیں کی جاسکتی کہ فلسفہ مادی دولت جمع کرنے میں براہ راست مدد کرسکتا ہے لیکن جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ صرف مادی دولت ہی ایک قیمتی شے نہیں فلسفے کا اس غرض کی تکمیل نہ کرنا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ وہ کوئی عملی قیمت نہیں رکھتا۔ کاغذات کا ایک ڈھیر جس کو ہم کرنسی نوٹ کہتے ہیں خود اپنی ذات میں کچھ نہیں۔ وہ اچھی چیز اس معنی میں ہے کہ وہ مسرت کے حصول میں کارآمد ہے۔ جو لوگ اس سے مسرت پاسکتے ہیں ان کے لیے یہ ایک ذریعہ ہے مگر ایک فلسفی کا نصب العین تلاش اور حقیقت پر غور و فکر ہے۔ فلسفہ اس کو زندگی کی ضروریات سے نہیں روکتا بلکہ ایک صحیح اور بامعنی زندگی کا سبق سکھاتا ہے جنہوں نے فلسفے کی عطا کردہ لذت کو چکھا ہے وہ اس کو اکثر لذتوں سے اعلیٰ مانتا ہے لیکن فلسفے کی موافقت میں صرف اتنا کہنا سب کچھ نہیں۔ اگر ہم اس کو بھی نظر انداز کردیں کہ فلسفہ لوگوں پر اثر کرتا رہا ہے تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ فلسفہ ان لوگوں کی زندگی پر بھی بالواسطہ اثر کرتا رہا ہے۔ جنہوں نے اس کے متعلق کچھ سنا بھی نہیں تھا۔ عیسائی مذہب جو کچھ ہے وہ بڑی حد تک فلسفے سے ہی ڈھالا گیا ہے مثلاً یہ خیال کہ کسی شخص کو اپنے مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ نہیں سمجھنا چاہیے یا یہ خیال کہ حکومت کا انحصار اپنی رعایا کی رضامندی پر ہونا چاہیے۔ یہ سب دراصل فلسفیوں سے ہی ملے ہیں۔ ہندوستانی فلسفے پر وید اور اپنیشد کا اثر رہا ہے۔ گوتم بدھ اور گیتا کے فلسفے کا اثر برابر رہا ہے۔ سیاسی دائرے میں فلسفیانہ تصور کا اثر کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ —— —— امریکی دستور پر بڑی حد تک جان لاک کے سیاسی تصورات کا اثر پڑا۔ انقلاب فرانس پر روسو کے اس تصور کا اثر پڑا کہ موروثی بادشاہ کی بجائے صدر کا انتخاب کیا جائے۔

یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے کہ سیاسیات پر فلسفے کا اثر بعض دفعہ اچھا نہیں رہا۔ انیسویں صدی کے جرمن فلسفے کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔ نطشے کا اثر رہا اور نازی تحریک اسی فلسفے کی دین تھی۔ نطشے کے فلسفے سے متاثر ہوکر قومیت کا تصور اُبھرا

بہت ہی مبالغہ آمیز تھا۔ سیاسیات کو بعض فلسفیانہ تصورات سے متاثر ہونے سے روک نہیں سکتے۔ لہٰذا یہ نہایت اہم اور ضروری ہو جاتا ہے کہ فلسفے کا مطالعہ بہت توجہ سے کیا جائے تاکہ جو تصورات عمدہ اثر پیدا کرتے ہیں وہی قائم رہیں نہ کہ وہ تصورات جو بُرا اثر پیدا کرتے ہیں دنیا ایک دہشت ناک انجام سے محفوظ رہتی اگر جرمن قوم نازی خیالات کے بجائے ایک بہتر فلسفے کے اثرات سے متاثر ہوتی۔ نطشے کا فوق البشر، مرد کامل، حصول طاقت وہ کسی بھی شکل میں ہو کہ حدوں سے گزر نہ جائے چوں کہ انسان آزاد ہے تو بے لگام نہ ہو جائے جس پر مذہب اور اخلاقی قدروں کی کوئی لگام نہ ہو تو نتیجہ بربادی ہی بربادی ہے۔ اس طرح کے فلسفے کا جب جب جہاں جہاں اثر ہوا ہے انسانیت کو نقصان پہنچا ہے۔ اچھا فلسفہ سیاسیات پر پسندیدہ اثر ڈال کر ہمیں خراب فلسفے کے برخلاف زیادہ صحت مند سماج دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس کی عظیم ترقی اور اس سے پیدا ہونے والے فوائد اپنے امکانِ وجود کے لیے فلسفے کے پس منظر کے محتاج رہے ہیں۔

بڑی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ تہذیب کے تمام تر ارتقا کا پتا علّیت کے بدلتے ہوئے تصوّر سے لگایا جا سکتا ہے اور علّیت یقیناً فلسفے کا مسئلہ ہے یہاں تک کہ سائنسی نقطۂ نظر خود ایک فلسفہ ہے اور ابتدًا اس کا وجود بڑی حد تک فلسفے کا پیدا کردہ ہے بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ پُر امید دعوٰی فلسفے کے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ فلسفہ بصیرت بھی ہے اور پیش بینی بھی فلسفہ زندگی کی قدر و قیمت کا شعور رکھتا ہے۔ زندگی کی وہ اہمیت ہر قوم میں ایک قوت پیدا کر دیتی ہے۔ ایک مشہور فلسفی کا خیال ہے کہ:

"جب تہذیب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتی ہے تو زندگی کے ہم پلہ فلسفے کا فقدان تمام معاشرے میں زوال، طبیعت کی بے زاری پیدا کرتا ہے۔ انسان کے لیے فلسفے کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اُن بنیادی سوالات کو صاف اور روشن کرنے کی کوشش کرتا ہے جو بالآخر ہماری اس توجہ کو قوت عطا کرتے ہیں جو ہماری سیرت کی اساس ہے"

یہ بات بڑی حد تک یقینی ہے کہ تہذیب کی اخلاقی طاقت اس نظریے سے متاثر ہوتی ہے جو وہ زندگی اور حقیقت کے متعلق رکھتی ہے۔ اکثر یہ بات مذہبی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے لیکن مذہبی خیالات بھی زیادہ تر فلسفے سے متاثر ہوے ہیں مگر تجربہ کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی خیالات بے عملی کی وجہ سے بے معنیٰ ہو سکتے ہیں جب تک کہ عقل انسانی اس کی مسلسل نگرانی نہ کرے مگر وہ لوگ جنھوں نے مذہب کو پورے طور پر چھوڑ دیا ہے ان کو کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ وہ ایک جدید نقطۂ نظر کی تلاش کر لیں جو مذہبی ضرورت کو پورا کر سکے مگر اس کے بعد ان کو زیادہ وقت فلسفے کے مطالعے میں گزارنا ہوگا ورنہ مذہب اور دنیا دونوں سے ہٹنے کا احتمال ہے۔ سائنس کبھی بھی فلسفے کی جگہ نہیں لے سکتی وہ تو خود مسایل پیدا کرتی ہے۔ سائنس کے لیے یہ بتانا ممکن نہیں کہ اشیاء کے سارے نظام میں ان واقعات کا جن سے وہ بحث کرتی ہے کیا مقام ہے۔ ذہن انسانی جو ان کا مشاہدہ کرتا ہے اس کا کیا تعلق ہے۔ سائنس اس بات کا ثبوت پیش نہیں کر سکتی کہ کس معنی میں روح ہوتی ہے، سائنس یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ کائنات کا کوئی مقصد بھی ہے، کیا انسان کو ارادہ کی آزادی ہے یہ دعوٰی تو نہیں کیا جا سکتا کہ فلسفہ ان مسایل کو حل کر سکتا

ہے مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر فلسفہ ان کو حل نہ کر سکے تو کوئی علم ان کا حل پیش نہیں کر سکتا۔ ایسے تمام مسایل جن کو سائنس صرف فرض کر کے چلتی ہے حقیقت میں فلسفے کے مسایل ہیں۔ دوسری اہم خدمت جو فلسفہ انجام دیتا ہے وہ تنقید کا کام ہے۔ مثلاً جمہوریت کی کامیابی اس بات پر زیادہ منحصر ہے کہ لوگوں میں اچھے برے کی تمیز پیدا ہو جائے اور وہ الجھ کے نہ رہ جائیں کہ کیا صحیح ہے کیا غلط۔ اس لیے تنقیدی فلسفہ صحیح طور پر فکر کرنے کا ایک طریقہ مقرر کرتا ہے اور جو بات غیر واضح ہے اس کو واضح کرنا سکھاتا ہے۔ جمہوری معاشرہ اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک کہ تعلیم عام نہ ہو اور اس سے ایک فلسفیانہ نظر حاصل نہ ہو۔

یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ ہر انسان کا اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے اس دنیا کے لیے، خدا کے متعلق اور خود اپنے لیے۔ کچھ لوگ اس فلسفے کے لحاظ سے ہی اپنی زندگی گزارتے ہیں، جس پر ان کو یقین ہوتا ہے انسانی غلطیوں کا زیادہ تر دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس نے بہترین تصورات پر کہاں تک عمل کیا ہے یا پھر وہ انسان کے جہل اور غلط رویے کا نتیجہ ہے

بظاہر فلسفے کو ایک غیر عملی امر مانا جاتا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کوئی عملی پہلو نہیں ہے فلسفے کا مطالعہ جس میں عملی فائدہ نظر نہیں آتا اور بالکل غیر عملی معلوم ہوتا ہے مگر گہرائی سے دیکھا جائے تو اس کا بھی عملی پہلو ہے۔ فلسفہ دنیوی نقطۂ نظر کو بہت زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اخلاقیات اور ہمارے مذہبی نقطۂ نظر کو لازمی طور پر متاثر کرتا ہے۔ فلسفے کو اس بات سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی عملی قیمت کیا ہے؟ فلسفے کی قدر و قیمت اس کے بالواسطہ عملی نتائج کی بنا پر نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ خود اس کی خاطر، اچھے عملی اثرات کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فلسفہ کا خود اس کی خاطر مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ صداقت کے حصول کے لیے اس کی تلاش ایک دم غیر جانبدارانہ طور پر کی جانی چاہیے یہ بات حاصل ہو جائے تو یہ عملی طور پر بھی مفید ہو سکتی ہے، اس طرح اس کا عملی پہلو بھی نکل آتا ہے۔

فلسفے کے ماخذ اور افادیت سے ہی جڑا ہوا دوسرا پہلو فلسفے کی اقسام کے متعلق ہے۔ فلسفے کی اہم اقسام کا یہاں سرسری ذکر نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ فلسفے کے مختلف اقسام ہیں جو ہم کو مختلف مسایل سمجھنے میں مدد دیتے ہیں جس سے فلسفے کی افادیت کا دائرہ متعین ہوتا ہے۔ وہ اقسام یہ ہیں:

۱۔ مابعد الطبیعات۔

یہ حقیقت کی ماہیت کا اس کے نہایت عام پہلوؤں کے لحاظ سے مطالعہ ہے یہ قسم اس طرح کے سوالات سے بحث کرتی ہے کہ مادّے اور ذہن کا تعلق کیا ہے، اس میں اولیت کس کو حاصل ہے، کیا انسان آزاد اور خود مختار ہے؟ کیا نفس ایک جوہر ہے یا صرف تجربات کا ایک سلسلہ، کیا کائنات لامتناہی ہے؟ کیا خدا کا وجود ہے؟ کس حد تک کائنات ایک وحدت ہے اور کس حد تک کثرت، کس حد تک وہ ایک عقلی نظام ہے، اس طرح کے تمام مسایل فلسفہ مابعد الطبیعات کے زیر بحث آتے ہیں۔

۲۔ منطق

علم کا وہ حصّہ جس کو عملیات سے الگ کرنا مشکل ہے مگر وہ ایک جدا شعبہ ہے یہ مختلف قسم کے قضایا اور ان کے باہمی تعلقات

کو صحیح ثابت کرتے ہیں۔ اس کے بعض حصے ریاضیات
ت کافی تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ علمیات

یہ اس قسم کے سوالات سے بحث کرتا ہے کہ ہمیں صداقت کی کس طرح تعریف کرنی چاہیے۔ علم اور یقین میں کیا فرق ہے؟ کیا ہم کسی بھی چیز کو یقین کے ساتھ جان سکتے ہیں؟

۴۔ اخلاقیات یا فلسفۂ اخلاق

اقدار اور چاہیے سے بحث کرتا ہے یہ اس قسم کے سوالات پر غور کرتا ہے کہ خیر اعلیٰ کیا ہے، کیا کسی فعل کے صحیح یا غلط ہونے کا تعلق اس کے نتائج پر ہے؟ سزا کا کیا مقصد ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ سیاسی فلسفہ کا تعلق ان سوالات سے ہے کہ جیسے کیا فرد کو ریاست کے خلاف حقوق حاصل ہیں؟ کیا جمہوریت حکومت کی سب سے اچھی شکل ہے؟

۶۔ جمالیات فن اور حسن پر فلسفہ کا جو اطلاق ہے اس میں جو سوالات زیر بحث آتے ہیں، جیسے کیا حسن مفروضی ہے یا موضوعی، فن کیا ہے؟ انسانی فطرت کی کن کن چیزوں پر حسن کی اقسام اپنا اثر ڈالتی ہیں وغیرہ وغیرہ

۷۔ نظریہ قدر

عام طور پر یہ لفظ قدر و قیمت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مگر اس کو فلسفۂ اخلاق میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب فلسفے کے ماخذ یا افادیت کی بات ہو تو اس کے اقسام کا ذکر لازم ہو جاتا ہے جس سے اس کے دائرے اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اسے کہاں کہاں اور کیسے کیسے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلسفہ دوسرے علوم مخصوصہ سے مختلف ہے۔ یہ زیادہ عام یا کلی ہے۔ یہ ان تصورات کی تحقیق کرتا ہے جن کو دیگر علوم فرض کر لیتے ہیں یا صرف مان کر چلتے ہیں۔ علوم مخصوصہ یا کسی خاص علم کی تحقیق سے جو مسایل پیدا ہوتے ہیں، وہ فلسفیانہ بحث کے محتاج ہوتے ہیں۔ اب ہم اس پہلو کو لیتے ہیں جس سے فلسفے کی اہمیت کچھ کم نظر آنے لگی ہے۔ یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے جس سے فلسفے کی اہمیت کو ٹھیس پہنچی ہے اس کے بہت سے وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ سائیکلوجی، سوشیالوجی جیسے قریبی علوم کا الگ ہو جانا۔ دوسرے بہت سے علوم جیسے سیاسیات، معاشیات، تاریخ، ادب وغیرہ جن میں فلسفے کے بہت سے مسایل بغیر فلسفے کی بیک گراونڈ کے پڑھائے جاتے ہیں۔ دوسرے فلسفے کے ان پہلوؤں کو باقاعدہ فوقیت نہ دیا جانا جن سے بہتر افراد اور سماج کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں فلسفۂ اخلاق کی تعلیم کو عام کیا جانا چاہیے۔ آج اس کی سخت ضرورت ہے اور اس میں کوشش یہ ہو کہ اس کو بہت سادہ طریقے سے پیش کیا جائے۔ ایسی باریکیاں اور پیچیدگیاں پیدا نہ کی جائیں جس سے کسی کو بے زاری کا احساس ہونے لگے۔ کچھ ممالک جیسے انگلینڈ اور امریکہ، جہاں اب فلسفۂ اخلاق کی ضرورت اور اہمیت کو اولیت دی جانے لگی ہے اور فلسفۂ اخلاق کے ایسے کورس شروع کیے گئے ہیں جو ڈاکٹروں، وکیلوں، انجینیروں اور تجارت پیشہ لوگوں کو پڑھنا ضروری ہیں۔ اس سے کچھ تو ان کی اخلاقی ٹریننگ ہو سکتی ہے۔ یہی سلسلہ یہاں ہمارے ملک میں بھی شروع ہونا چاہیے کیونکہ یہاں جھوٹ، فریب، بے ایمانی ہر شعبے میں ہے۔

فلسفے کے اور اقسام پر تو کافی کام ہو چکا ہے

اور اس میں ایک ٹھہراو آگیا ہے۔ جو بھی کام یورپ اور امریکہ میں گزشتہ دو دہائی کے اندر ہوا ہے، اس میں چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب لوگوں نے صرف نئے الفاظ کا سہارا لیا ہے اور کچھ نے تو وہی جدید شاعری والا انداز اختیار کیا ہے اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔ وقت بدل چکا ہے اور سب جانتے ہیں کہ لاکھ ترقی کے بعد بھی آج سب سے زیادہ خطرہ اخلاقی قدروں کو ہے آج انسانیت کو خطرہ اس لیے ہے کہ اخلاقی قدروں میں بہت زیادہ گراوٹ آگئی ہے۔ ہر سطح پر گراوٹ آچکی ہے آج اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس بڑھتے ہوئے خطرے کو کیسے روکا جائے اور اس کا روکا جانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی ملک کے لیے دیگر تمام شعبوں میں ترقی کرنا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ضروری ہے۔ یہ تمام ترقیاں اور زیادہ ہو سکتی ہیں اگر اخلاقی قدروں کو کسی طرح پھر شروع کیا جا سکے۔ ورنہ سب ترقی بیکار ہے۔ آج دنیا جس دور سے گزر رہی ہے وہ سب سامنے ہے۔ ہر طرف بربادی اور افراتفری، بے ایمانی، بے اصولی کا بازار گرم ہے۔ انسانیت دم توڑ رہی ہے۔ سیاسی رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف چار پانچ سال سے زیادہ کا نہیں سوچتے ہیں اور وہ بھی صرف اپنے لیے ملک کی کس کو فکر ہے۔ عوام کی تکالیف کا کس کو احساس ہے۔ وہ سوچتے ہیں تو اپنی بقا کے لیے، پارٹی کے لیے جس کے ذریعے بے حساب پیسہ اور سستی شہرت کمائی جا سکے۔ اس کے لیے ان کو چاہے کتنا ہی انسانیت اور اخلاقی قدروں کا خون کرنا پڑے اور یہ بات صرف سیاسیات تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں گھر کر چکی ہے، شریف بیوقوف اور بزدل کہلائے جانے لگے۔ دنیا اور ملک فاشزم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر ایک کو اپنا مفاد ہی اول

نظر آرہا ہے۔ انسانیت اور ملک کی کون سوچ رہا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ برسر اقتدار آتے ہیں ان میں زیادہ تر متوازن شخصیت کے مالک نہیں۔ فلسفہ آتا ہے تو صرف فلسفہ۔ مذہب آتا ہے تو صرف مذہب سیاسیات تو صرف سیاسیات ایسی بات نہیں کہ ہمارے ملک میں ایسے متوازن مذہبی اور سیاسی رہنما نہیں، خوب ہیں۔ جن کو دوسرے مذاہب اور ان کے ماننے والوں کی یکساں قدر و قیمت ہے وہ خود مذہبی ہوں یا نہ ہوں مگر ان کو اخلاقیات اور اخلاقی قدروں کا علم ہو۔ دوسرے جو ذرائع ابلاغ ہیں، خاص طور سے آج کے دور میں ٹی-وی، وہ ایک ایسا میڈیا ہے کہ آپ اس کے ذریعے گھر گھر پہنچ سکتے ہیں۔ فلم کا اب بھی اثر ہے اگر اس کے ذریعے اچھی باتوں کو دکھایا جائے تو ذہن پر اچھا اثر پڑے گا۔ یا تو فضول باتوں کو دکھایا جاتا ہے یا پھر جو اچھی باتیں ہیں جس سے اچھے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں ان کو نہیں دکھایا جاتا ہے یا دکھایا جاتا ہے تو اس قدر کمزور انداز میں کہ اس کی قدر اور اہمیت کے بجائے وہی چیز معمولی اور حقیر لگنے لگتی ہے لب لباب یہ ہے کہ اخلاقی قدروں میں خطرناک حد تک گراوٹ آچکی ہے۔ اس کو روکا نہ گیا تو افراتفری کا عالم ہوگا۔ اخلاقی قدروں کا تعلق شروع سے ہی مذہب سے رہا۔ جب ہر جگہ مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی، اخلاقی زوال تیزی سے شروع ہونے لگا جو کسی اور نے نہیں کیا۔ ہم نے اور آپ نے کیا ہے اور ہمیں اور آپ کو ہی درست کرنا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہر مذہب بنیادی طور پر انسانیت کو مانتا ہے۔ اچھی باتوں کو سکھاتا ہے اخلاقی قدروں کو سکھاتا ہے اور جہاں غلط باتیں شامل ہوئیں وہ ناپختہ اور کوتاہ ذہنوں کی

ملتی نہیں اور جہاں مذہب نہیں وہاں بھی اخلاقی قدروں پر زور دیا گیا ہے۔ وہاں اس کی رہنمائی کے لیے کوئی روحانی طاقت نہیں، اس کے اپنے ضمیر کی آواز ہے جو اس کو صاف سنائی دیتی ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ وہ اس کو کسی لالچ یا ڈر اور خوف کی وجہ سے سننا نہ چاہے۔ آج سب محسوس کر رہے ہیں کہ آج پوری دنیا کو ضرورت ہے سیاسیات میں تجارت میں، مذہبی معاملات میں ڈاکٹری پیشے میں اور تمام شعبوں میں اخلاقی قدروں کو بحال کرنے کی۔ فلسفے کے ذریعے اخلاقیات کی تعلیم عام کی جا سکتی ہے اور اخلاقی قدروں کی جو تعلیم فلسفے کے ذریعے ملتی ہے وہ زیادہ پائیدار ہے کیوں کہ اس میں سیکولرازم موجود ہے۔ اس میں مذہب کی قید نہیں کوئی کسی مذہب کا ہو کسی مذہب کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ایک اچھا بااخلاق انسان بن سکتا ہے اور بننا چاہیے اور تمام فلسفوں میں اتنا زور نہ دے کر ان میں وقت خراب نہ کر کے فلسفۂ اخلاق پر زور دیا جانا چاہیے۔ اس کی تعلیم عام ہو اور تمام لوگ اس پر غور کریں کہ اس کو کس طرح قابلِ قبول بنایا جائے سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے اس ملک کا ہر شخص ایک بہتر اور عزت کی زندگی گزار سکتا ہے اس ملک کا اب بھی دنیا میں بہت اونچا مقام ہو سکتا ہے اگر یہاں کی بڑھتی ہوئی بے ایمانی کو روکا جا سکے اور اخلاقی قدروں کو بحال کیا جا سکے۔ اس ضرورت کو محسوس کیا جائے اچھے فلسفے اور فلسفۂ اخلاقیات کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ ہمارا کلچر اور ہماری تہذیب ایسی رہی ہے کہ فلسفہ کا اثر برابر رہا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک پر خراب فلسفہ کا اثر ہے۔ فلسفہ اخلاق پر فاشسٹ نظریہ کا اثر بڑھ رہا ہے اس لیے اور بھی اچھے فلسفے کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ میں مضمون کے شروع میں کہہ چکا ہوں کہ فلسفے سے کسی کو مفر حاصل نہیں، ہر شخص کا اپنا ایک فلسفہ ہوتا ہے چاہے اس نے فلسفے کا مطالعہ باقاعدہ کیا ہو یا نہ کیا ہو اس کے بھی فلسفیانہ خیالات ہوتے ہیں اور وہ ان ہی خیالات کے تحت زندگی گزارتا ہے۔ ان خیالات کا اثر اس پر تو کسی خاص ماحول کی وجہ سے پڑتا ہے یا خاص حالات کی وجہ سے یا پھر کسی استاد یا گائڈ کی رہنمائی سے۔ چوں کہ فلسفہ اچھا بھی ہے اور خراب بھی اس لیے اچھے فلسفے کو اپنانا چاہیے، خراب فلسفہ اس کو برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ تخریب کاری کی طرف لے جاتا ہے اور اچھا فلسفہ اس کو ایک اچھا انسان بننے میں مدد کرتا ہے، اس کو ایک اچھا شہری بننے میں مدد کرتا ہے، جس کی آج اشد ضرورت ہے۔ جو حالات ہیں آج کہ نہ مذہبی خیالات درست ہیں نہ سیاسی، نہ سماجی اس کی وجہ یہی ہے کہ اچھے فلسفے کو نہ اپنانا۔ فلسفہ تو ہے مگر خراب۔ اکثر لوگ فلسفے کے اس قدر عملی پہلو کا اعتراف کم کر پاتے ہیں۔ فلسفے کا اثر تو ہر شخص پر تاحیات رہتا ہے جو اخلاقی قدروں کا لحاظ نہیں کرتا ہے وہ اسے ہی اچھا سمجھتا ہے، جواز تلاش کرتا ہے جس کا مقصد شرافت نیکی، زندگی کو اچھے اصولوں کے تحت گزارنا ہے۔ وہ ان خیالات کو پسند کرتا ہے۔ زندگی کے تحت فلسفہ اچھا ہے تو زندگی اچھی بنتی ہے۔ اس لیے فلسفے کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر واضح رہے کہ اچھا فلسفہ بھی ہے اور برا بھی، مگر ہمیں اچھا فلسفہ اپنانا چاہیے، اسی سے ایک متوازن شخصیت بن سکتی ہے۔ اس لیے فلسفے کی اہمیت اس پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ فلسفہ مکمل اور مسلسل عمل ہے مگر اس پر غور کم کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی افادیت کا اندازہ بھی کم ہو پاتا ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۱۹۹۳ء)

"خدا کا کوئی حکم تحریری نہیں آتا"

خورشید احمد*

۱۸۵۷ء کا انقلاب مملکت ہند کا اقتدار مغلوں سے انگریزوں کو منتقل کر گیا۔ مغل نظام انتظامیہ کو پوری طرح ری پلیس کرنے کے لیے انھوں نے ایسا نظام تعلیم اور تربیت رائج کیا جس نے ان کے پبلک ایڈمنسٹریشن کو نافذ کرنے کے لیے ہر کیڈر میں معاون فراہم کیے۔ اس کے براہ راست اثرات مسلمانوں پر مرتب ہوئے۔ ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر اپنی کتاب "دی انڈین مسلمانز" میں اس کی عکاسی کرتے لکھتے ہیں:

"باوجودیکہ مسلمان نسلاً اعلیٰ ہیں، دلوں کے دلیر، بازو کے قوی، مضبوط سیاسی تنظیم کے مالک اور عملی حکومت کا علم اور تجربہ بھی رکھتے ہیں، پھر بھی سچائی یہ ہے کہ ملک کی زمامِ حکومت ہمارے ہاتھوں میں آتے ہی ان پر سرکاری ملازمت اور غیر سرکاری اونچے پیشوں میں ان کے داخلے کا دروازہ بند ہوگیا۔"

"ان کی دولت کا پرانا سرچشمہ سوکھ چکا ہے۔"[4]

"حقیقتاً کلکتہ میں شاذ و نادر کوئی ایسا سرکاری دفتر ہوگا جس میں مسلمان یہ امید کر سکتا ہے کہ حمالی، ہرکارا، قلم تراشی، قلم میں روشنائی بھرنے والا سے اونچا عہدہ اسے مل سکے۔"[5]

"ان کے پاس ایسا نظامِ تعلیم تھا جو اس وقت ملک میں موجود دوسرے ایجوکیشن سسٹم میں بہترین تھا۔ اگرچہ ہمارے رائج کردہ سسٹم سے کم تر تھا، پھر بھی ان کے انٹیلکچولس کو تربیت دینے کو کافی تھا، مادی برتری دلانے میں بھی اور ذہنی برتری دلانے میں بھی۔"[6]

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس اعلیٰ ٹریڈیشنس ہیں مگر کیریر نہیں۔"[7]

کتاب اور حکمت سکھانے والے نبی کی پاکیزہ زندگی اور سنت، صحابہ کرام کے انقلاب حیات اور سلف کے اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد اور کارناموں سے بھرپور زندگی محفوظ تاریخ اور روایات

---

* آئی۔پی۔ایس (ریٹائرڈ) سابق ایس۔ایس۔پی۔ ۵/۴ بھولا، علی گڑھ

کے عظیم ورثے اور ٹریڈیشن کے باوجود کت اور مقابلے میں پروگریس کے موٹیویشن سے خالی زندگی نہ تو اس سطح کی عقل اس مخزن سے استفادہ کرسکنے والی راہم کرسکی نہ حاصل "سیاسی اور انٹیلکچول قوت" کو برقرار رکھ سکی کیونکہ تعلیم اور تربیت کے لیے ہمالہ سے کین تک اور کلکتہ سے پشاور تک کوئی نظم موجود نہ تھا" جو برتری کو قایم اور برقرار رکھنے میں اسے ہر سم کے علم اور فن کی نہ صرف تحصیل کی اہل بلکہ ضرورت کے مطابق استعمال کی صلاحیت بھی عطا کرسکے۔ سرسید احمد خاں نے محسوس کرلیا " خدا کا کوئی حکم تحریری نہیں آتا مگر زمانے میں پایا جاتا ہے" اس ادراک نے ان کی سوچ کو ایک رخ اور تحریک عطا کی جو علی گڑھ تحریک کے نام سے جانی گئی۔ پھر انگریز قوم کے بے گناہ بچوں اور عورتوں کی جان بچاتے اور لوگوں کو تشدد سے باز رکھنے کی کوشش کے صلے میں اپنے لیے اپنوں کے لیے اور اپنی انا کے لیے بڑی جاگیر کی پیش کش قبول نہ کرتے ہوئے سرسید احمد خاں نے " مایوسی سے بھری اپنی قوم کی تعلیم اور تربیت کے لیے ایک نظم کے قیام میں تعاون مانگ لیا جو ان کی جاں گسل جدوجہد اور موٹیویشن کے بعد مدرسۂ عالیہ اور پھر ایم۔ اے۔ او کالج کی شکل میں وجود میں آیا۔" اس کے خاکے میں سرسید احمد نے اپنے انداز میں رنگ بھرا" عمدہ خاندان، عمدہ اخلاق، عمدہ تعلیم کے معلم اور پروفیسر اور لڑکے جو آپس میں ساتھ رہتے اور پڑھتے ہوں، اسی طرح اچھے خاندان اور اچھی عادتوں کے خوگر ہوں۔

" بورڈنگ ہاؤس ایک کل ہے قوم
بنانے کی... پرزے چلتے ہیں تو اپنا کام
کرے گی ورنہ کسی کام کی نہیں.... اس
کے کل پرزے.... درست اور کام کے
قابل رہنا سب سے مقدم ہے.....
کھانا پینا، رہنا سہنا، آپس میں ہر وقت
ملنا سوسائٹی میں شریک رہنا.... آپس
میں محبت اور دوستی ایک دوسرے
کی ہمدردی.... بنیاد ہے قوم بننے کی۔"

سرسید احمد خاںؒ کی زندگی میں ہی کالج کا جذباتی، رہائشی، تدریسی، تعلیمی، نظم و ضبط اور اخلاقی ماحول علم اور عمل کا ایک معجزہ بن گیا اور قوم کی ضرورت کے مطابق ہر سطح، ہر کیڈر، ہر میعار، پروفیشن اور اسٹیٹس کے وہ دست و بازو اور ہمدرد فراہم کرنے شروع کردیے جو قوم کی آبرو اور وقار کے ضامن بن گئے۔ مولانا حالی نے کالج کو خزاں رسیدہ قوم کے ریاض کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کالج پر لکھی گئی ان کی نظم اس کے اس وقت کے بانکپن کا مظہر ہے جہاں

"مہر مادری، آرنلڈ اور میرس کے رویے
میں موج زن نظر آتی ہے۔ اطاعت
گزار شاگردوں کے جھرمٹ میں بک کی
مجسم شفقت جلوہ فگن نظر آتی ہے"۔

علم کی پیاس بجھاتے ہوئے پروفیسر چکرورتی، نہ ماتھے پہ بل نہ ابرو میں شکن اس پہ وائس کا وقت درس انداز سخن دل کو موہ لیتا ہے۔ یک جان تن، ہندو اور مسلم اور باہم شیر و شکر شیعہ سنی اور یونین کلب میں کرسیٔ صدارت کی زینت صدر یونین، مکمل یونین (اتحاد) کا منظر روح افزا ہے۔ شبلی مشرقی تاریخ و ادب کا مخزن اور عباس جیسا محیط علم و فن اپنی ذات میں موٹیویشن نظر آتے ہیں۔

اس پہ بھی بہر کیف، بچوں کا سرپرست اور ریاض کا مالی سرسید احمد اپنی ساری شخصیت اور ذاتی سرمایہ

کالج کے فروغ کے لیے صرف کرتا رہا اور جب داعیٔ اجل کو
لبیک کہتا ہے تو اپنے کفن کے لیے بھی کچھ نہیں چھوڑتا
اور کچھ چھوڑتا ہے تو قوم کے لیے اثاثہ اپنی تحریر کا۔ روپیہ کا
اور ارادہ کا۔

ایک عجیب بات ہے کہ اس محسن کے:

"کفن کے لیے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں
کے خادم علی احمد کو جو سر سید کی وفات
کے وقت موجود تھے، محسن الملک سے سید
کے کفن کے لیے پچاس روپیہ ادھار
لینا پڑا۔"

ابھی سر سید کے انتقال کو پچاس سال بھی نہ
گزرے تھے کہ ملک کی تقسیم کا حادثہ گزر گیا اور ساتھ
ہی ملت پر سخت دور بھی۔ کانسٹی چوانٹ اسمبلی میں
مسلمانوں کو حاصل شدہ ریزرویشن کی رعایت برکت
رہی تھی اور مولانا آزاد نے منقسم ہندوستان میں
اسے جاری رکھنے کے پرزور دلایل دیے اور وکالت
کی مگر ایک مسلم خاتون ممبر کی ناعاقبت اندیشانہ جوابی عدم
جواز کی دلیل کے نتیجے میں یہ رعایت ختم کر دی گئی پھر ان
کی تعداد سرکاری محکموں، اونچے غیر سرکاری پیشوں میں
صفر کے قریب تر ہوتی گئی اور پے در پے پیش آمدہ حالات
نے دو بنیادی ضرورتوں، تن کی ضرورت اور تحفظ کو اولیت
دے دی۔ مسلم ملت کی معاشی، معاشرتی اور تعلیمی
میدان میں بتدریج پستی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔

سر سید کی علی گڑھ تحریک، قربانی، تحریر و
تقریر اور ان کے ساتھیوں کے رویے کی روشنی میں
مسایل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ محسن الملک
کا تعزیتی جلسے میں کہا ہوا ایک جملہ:

"سر سید۔ آپ ہم میں نہیں مگر آپ کا
بنایا ہوا راستہ سامنے ہے۔"

آج بھی اتنا سچ ہے جتنا اس دن تھا۔ بشرطیکہ سر سید
نے جس سی نیریو میں کام کیا اور جس سی نیریو میں ہم ہیں
اس کا پورا ادراک ہو جائے اور سر سید کے چھوڑے
اثاثے اور تحریک سے وہی عقیدت ہو جو علامہ شبلی
نعمانی کو تھی۔

"اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی
قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی
نشو و نما، اس کی ترقی، اس کی نمود۔
اس کا جو کچھ ہوا، اس کالج سے ہوا
اور یہ کالج جلوہ ہے اس بڑے شخص
کا۔"

پھر اس تحریک، اثاثہ، ادارے کے نقصان کا تصور
ہی اپنے مفاد کے خاطر، اپنوں کے مفاد کی خاطر، اپنی انا
کی خاطر بڑا جانکاہ ہو گا کجا کہ حقیقی نقصان۔

حوالے

۱ سر سید احمد خاں۔ ۲ شایع کردہ انڈو لاجکل ہاؤس وارانسی
ری پرنٹ، جون ۱۹۶۹ء، ۱۸۷۱ء کے ایڈیشن کی نقل۔ ۳ ایضاً صفحہ ۱۹۳-۱۹۲
۴ ایضاً صفحہ ۱۴۹۔ ۵ ایضاً ص ۱۶۹۔ ۶ ایضاً ص ۱۷۰۔ ۷ ایضاً ص ۱۴۸
۸ ایضاً ص ۱۷۰۔ ۹ ایضاً سر سید احمد کی تقاریر اور تحریر سے۔ ۱۰ ایضاً
۱۱ ایضاً۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۲ شمارہ ۱۲ - (دسمبر ۹۳ء)

ڈاکٹر ممتاز علی خاں کچھ یادیں کچھ تاثرات

سید عبد الباری ★

ڈاکٹر ممتاز علی خاں کی وفات سے ملّتِ اسلامیہ اور علی گڑھ برادری ایک انوکھی شخصیت سے محروم ہوگئی ہے۔ وہ شخصیت جو علی گڑھ کی تہذیب اور مشرقی آداب کا مرقع تھی۔ زندگی کو اس ضابطہ بند انداز سے گزارنے والے لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ بات کے دھنی، قول کے پکے"، اپنے اصولوں اور زندگی کی بلند قدروں کو نبھانے کے لیے ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کرنے والے اب خال خال ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز علی خاں اپنی روایات کی پاسداری اور تہذیبی ضوابط کے معاملے میں سخت گیری کے باوجود مرنجا مرنج اور انتہائی انسان دوست انسان تھے۔ ایک خاص جاگیردارانہ پس منظر کے باوجود انھوں نے اپنے اسلاف سے، اپنے عقاید و اقدار کا ایک پختہ شعور حاصل کیا تھا اور زندگی کے آخری لمحات تک ان پر سختی سے کاربند رہے۔

میرے لیے زندگی کے وہ لمحات باعث فخر ہیں جو ڈاکٹر ممتاز علی خاں کی رفاقت میں گزرے اور ان سے مختلف ملّی اور اسلامی مسایل پر خط و کتابت کا جو ایک سلسلہ ان کے عہد پختہ سالی میں رہا وہ میرا ایک قابل قدر سرمایہ ہے۔ میں نے ان کی زندگی کا وہ دور دیکھا جب وہ طبقۂ اشراف کی تمام بندشوں اور حد بندیوں کو توڑ کر اور تحریکِ اسلامی کے ایک عام کارکن کی حیثیت سے علی گڑھ میں اپنی جملہ علمی و تدریسی مشاغل کے ساتھ اسلام کی دعوت بندگان خدا تک پہنچانے اور عام انسانوں کے سامنے حق و راستی کا پیغام پیش کرنے میں مصروف تھے۔ اس عہد میں طلبا، نوجوان، بوڑھے، خواہ وہ دانش ور ہوں یا عام محنت کش ان سب کے دلوں کے دروازوں پہ دستک دینے کے لیے ڈاکٹر ممتاز علی خاں ہمہ آن تیار تھے۔ مسلم یونیورسٹی میں اشتراکیت و الحاد کی آندھی اب تھم چکی تھی اور اسلامی فکر و فراست کی خوش گوار ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ نجات اللّٰہ صدیقی، سید انور علی، عرفان احمد خاں، سیّد زین العابدین احمد سورتی، فضل الرحمٰن فریدی غرض ذہین و درّاک نوجوانوں کا ایک مضبوط حلقہ فکر و تحقیق اور ترسیل و ابلاغ حق اور تعمیر و اصلاحِ ماحول کے ولولے سے سرشار علم و ادب، تصنیف و تالیف اور تربیت و تزکیہ کے ایک وسیع دائرہ میں سرگرم عمل تھا۔ میں یوں تو اسی وقت سے اس ادبی و علمی حلقہ سے منسلک تھا جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ۵۷-۱۹۵۶ء میں گریجویشن کر رہا

★ لالہ کا پُروا - سلطان پور، یو۔ پی

تھا لیکن ڈاکٹر ممتاز سے اس وقت زیادہ قریبی روابط پیدا ہوئے. جب ۱۹۶۸ء میں ٹانڈہ (فیض آباد) سے ماہنامہ "دوام" جاری ہوا اور علی گڑھ میں اس کے قدرداں اور قلمی معاونین کا ایک بڑا حلقہ بن گیا. اس زمانے میں مجھے تحقیقی کام کے سلسلے میں بھی علی گڑھ بار بار جانا پڑا اور رفیق مکرم ڈاکٹر ابن فرید صدیقی سے جو اس وقت شعبۂ عمرانیات (سوشیالوجی) میں استاد تھے، استفادہ کی کشش علی گڑھ کے سفر اور وہاں قیام کی محرک بنتی رہی. اس زمانے میں ڈاکٹر ممتاز علی خاں صاحب سے تحریک اسلامی اور دوام کے رشتے سے گہرا قرب پیدا ہوا. مجھے ان کے دولت خانے (بیت الغزل) میں کئی بار قیام اور ان کی مہمان نوازی سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوا اور ان کی خانگی زندگی اور روزانہ کے مشاغل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا. ان کے دن و رات اس طرح گزرتے جس طرح گھڑی کی سوئی لگے بندھے طریقے سے گردش کرتی ہے. ان کے ملازمین اور متوسلین سے ان کا برتاو حیرت انگیز حد تک شریفانہ اور مومنانہ تھا. ان کی زبان خلوت ہو کہ جلوت بے تکلفی کی محفل یا باوقار مجمع، ہر جگہ شائستگی، تہذیب اور عزت نفس کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی جس پر کبھی بازاری یا عامیانہ مذاق کی پرچھائیں بھی نہیں پڑتی تھی. کھانے پینے آرام و استراحت اور سیر و تفریح کے ہر موقع پر وہ ہمیں اپنی انفرادیت و شناخت کو محسوس کرنے پر مجبور کر دیتے. دوستوں کی مہمان نوازی کے معاملے میں اس قدر حساس تھے کہ یہ محسوس ہوتا کہ یہ شاید ان کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہے لیکن وہ اپنی علمی مصروفیات اور فرائض منصبی کی ادائیگی میں اس کی وجہ سے خلل نہ آنے دیتے اور کوشش کرتے کہ خود مہمان کے مشاغل میں ان کی وجہ سے کوئی خلل نہ واقع ہو. ہمارے تعلقات اس حد تک گہرے ہو گئے تھے کہ ایک بار انھوں نے میری درخواست پر محض اس وجہ سے کہ مجھے یہ نہ محسوس ہو کہ وہ مجھے مساوی درجہ اس معاملہ میں نہیں دے رہے ہیں علی گڑھ سے فیض آباد کا سفر کیا اور میری ٹوٹی پھوٹی ضیافت کی اس قدر مدتوں اپنے خطوط اور ملاقاتوں میں تعریف کرتے رہے کہ میں ان کی شرافت، وضع داری، ذرہ نوازی اور دوسروں کی عزت نفس کا غیر معمولی لحاظ رکھنے کے معاملے میں ان کی عظمت کا مداح ہو گیا تھا.

ڈاکٹر ممتاز علی خاں فکری و عملی دونوں اعتبار سے ہمہ آن متحرک، حساس اور سیماب صفت انسان تھے. اس صدی کی آٹھویں دہائی میں جیوں جیوں ملازمت سے سبکدوشی کی منزل کے قریب آتے جا رہے تھے. ان کے اندر اپنے ملت اور اسلام کے فروغ کے لیے کام کرنے کا ولولہ اور بڑھ رہا تھا. وہ اس کام کے لیے ملازمت سے پہلے ہی اعزازی طور پر ریٹائر ہونے کی سوچ رہے تھے. انھیں اپنے ہم سفروں اور رفیقوں سے سست گامی اور لگے بندھے طور پر کام کرنے اور اجتہاد فکر و عمل اور قرآن سے نوع بہ نوع مسائل میں بھرپور استفادہ اور جرأت عمل کے معاملے میں کوتاہی کا شکوہ تھا. انھوں نے اسی زمانے میں مجھے طویل طویل خطوط لکھے. ان کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ ہمیں ملت کے اندر صدیوں کے جمود کو توڑنے کے لیے اور اسلام کے بارے میں ہماری جو اپروچ ہے اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے. انھوں نے اس زمانے میں اپنی فکر تازہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا تھا.

> "ادھر کچھ عرصے سے پوری امت مسلمہ شدید قسم کے فکری و معاشرتی بحران سے دوچار ہے اور اس پریشان کن صورت حال نے ہر خطے میں مسلم دانشور و علماء اور ذمہ داروں

کے اندر دورِ جدید کی گمبھیر چنوتیوں سے نبٹتے ہوئے
امت کی کشتی کو مذکورہ منجدھار سے نکالنے
کے لیے اسلام کے بارے میں فکرِ تازہ کی
ضرورت کے احساس کو خاصا اُبھار دیا ہے
جہاں تک اسلام کے بارے میں نئے سرے
سے سوچ بچار کی ضرورت کا تعلق ہے تو
وہ بلاشبہ ہم مسلمانوں کے سیاق و سباق
میں وقت کی سب سے بڑی پکار ہے اور
اس بنا پر کسی بھی صحیح انداز پر سوچنے والے کو
اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن
صد افسوس کہ ہم روایتی ڈھنگ سے ہٹ
کر موضوعِ متعلقہ پر غور کرنے کے لیے بالکل
تیار نہیں۔ ہمارا حال کولہو کے بیل کا سا ہو کر
رہ گیا ہے کہ ہم فکری دائرے میں پیہم گردش
کے باوجود وہیں کے وہیں رہتے ہیں اور
اپنی جگہ سے ذرا بھی آگے نہیں بڑھتے۔ اس
المیہ کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ سمجھ میں
نہیں آتی کہ ہم نے فرسودہ روایات اور
اسلاف کے افکار و استنباطات -infe
rences کو وحیِ الٰہی کا درجہ دے
دیا ہے اور اس بنا پر ان سے چمٹے رہنے
ہی میں ہم اپنی ذاتی و اجتماعی عافیت خیال
کرتے ہیں۔ ہمارے اس تاسف انگیز
ملی تناظر کا میرے خیال میں سبب دوسری
قوموں سے علمی اور اس کے نتیجے میں صنعتی
ترقی میں بہت پیچھے رہ جانے کی وجہ سے
ہمارا احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جانا ہے
جب تک ہم واقعی معنی میں ذہنی طور پر بلند
ہو کر اور اس کے وسیلے سے اسلامی تعلیمات

کی روشنی میں ضروری حد تک ہر جگہ اجتماعی
پیمانے پر مادی و معنوی ترقی کر کے متذکرہ
احساسِ کمتری سے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیں
گے اس وقت تک ہماری فکر خواہ ہم اسے
کتنا ہی کیوں نہ مانجھیں دوسروں کو تو
کیا فائدہ پہنچائے گی خود ہمارے لیے بےسود
رہے گی جیسا کہ اب تک کے تجربات سے
ثابت ہوتا ہے اور ذہنًا اوپر اُٹھنے اور
وسیع تر ملی سطح پر اسلام کے اصولوں
کی بنیادوں پر اطمینان بخش حد تک اپنے
معاشی و معاشرتی حالات سدھارنے
کے لیے اسلام کے نزول کے منشا کے بارے
میں ازسرِنو غور و خوض ناگزیر ہے۔ لہٰذا
آغازِ کار کے طور پر میں یہ عرض کرنا چاہوں
گا کہ ہم اول و آخر اسلام کو آخرت کی
نجات و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دنیوی
زندگی سے ہم نے اسے برائے بیت ہی
جوڑ رکھا ہے، جب کہ حقیقت اس کے
برعکس معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اسلام اصلاً
زمین پر متعینہ اقدار کے حامل انسانی
مساوات پر مبنی ایک عادلانہ سماجی نظام
کے قیام اور اس کے مسلسل تحفظ کے لیے
نازل ہوا ہے اور آخرت کی فلاح اس
سب سے عظیم کام میں نیک نیتی کے
ساتھ بھرپور تعاون کا صلہ ہے، اسلام
کے آنے کی اصل غایت نہیں۔ بات اگر
یہ نہ ہوتی تو نہ تو بدر و حنین اور خیبر و تبوک
کے معرکے برپا ہوئے ہوتے اور نہ ایمان
پر اس درجہ اصرار کے باوجود حکمت (یعنی

فہم و فراست) کو خیر کثیر یعنی بے پناہ خداوندی
انعامات کا وسیلہ باقاعدہ طور پر قرار دیا
گیا ہوتا اور نہ یہ بالکل شروع ہی میں ایک
پہلو دار سیاسی و انتظامی ڈھانچے کی داغ
بیل ڈالی گئی ہوتی بلکہ معاملہ عبادات و
اذکار تک محدود رہتا۔ کیونکہ محض آخرت
کی کامرانی کے لیے اس سے زیادہ قطعاً
ضرورت نہیں تھی۔"

اِسلام کے وسیع تر امکانات اور ہماری معاشرتی و تمدنی زندگی سے اس کا گہرا رشتہ استوار کرنے کی ڈاکٹر ممتاز کو بڑی فکر تھی۔ تقریباً اسی طرح کے احساسات کا اظہار اس عہد کے دیگر مسلم مفکرین نے بھی کیا ہے اس موقع پر ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوان کی تحریر کا حوالہ کافی ہوگا۔ مشہور تصنیف "کیف نتعامل مع القرآن" کے مقدمے میں وہ شکوہ سنج ہیں کہ قرآنی فکر اور قرآنی نقطۂ نظر ہماری زندگی میں سمٹ کر مختصر ہو گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"قرآن تہذیب مراکز اور زندگی کی
مصروفیات سے نکل کر جامد اور پژمردہ
ہو کر تاریخ کے ان صفحات تک محدود ہو گیا
ہے جو ایسے وقت لکھے گئے تھے جب کہ
ہم پر تقلید اور انحطاط کے بادل چھا رہے
ہوئے تھے۔ قرآنی تعلیمات کو ہر دور اور
ہر مقام کے حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت
ہم کھو چکے تھے۔ قرآن صرف ہمارے
ہونٹوں کو چھوتا رہا اور دماغ کے تاروں
کو چھیڑ نہیں سکا۔"

اسی طرح کے خیالات شیخ محمد غزالی اور شیخ عقاد نے بھی ظاہر کیے ہیں جن کے مطابق اسلام استغنا سے زیادہ عملی تجربہ کو اہمیت دیتا ہے۔ اس نے مادہ کے احترام کی خاطر انسا[ن]

ہے۔ قرآن میں مادہ کا خالق مادہ کی قسم کھاتا ہے اس نے مادی کائنات میں اپنے اسرار پوشیدہ کر رکھے ہیں۔ اِس مادی کائنات کی پکار کا جواب ہے جو کائنات میں خالق کائنات کی عظمت کا اعتراف ہے۔ غرض عقل انسانی کو طوق و سلاسل سے آزاد کرنے کی ضرورت کا اس صدی میں بارہا اظہار کیا گیا مگر امور میں ایک بڑے طبقے کے اندر یہی رجحان موجود کہ ہم اپنی عقل کو معطل کر دیں اور فہم و ادراک اور تفکر کو اسلاف کے لیے مخصوص کر دیں۔ شاید یہی کمی ممتاز بڑی بڑی تحریکوں اور اداروں کے اندر بھی محسوس کر رہے تھے مگر کبھی کبھی وہ تدریج کے بجائے چھلانگ کا اپنے ماحول سے مطالبہ کرنے لگتے تھے جس کی وجہ اپنے قدیم رفیقوں اور دوستوں کے درمیان خود کو محسوس کرنے لگتے تھے۔ وہ اپنی ملّت کے رہنماؤں سیاست کے میدان کے ماہروں کے طرز عمل سے بھی غیر مطمئن تھے۔ ان کو حقوق کے مطالبوں اور ان کے ہونے والے مظالم پر چیخ پکار سے سخت وحشت ہوتی تھی۔ ایک بار انھوں نے تحریر فرمایا:

"ہم اپنے حقوق کے حصول کے لیے
تو خوب زور باندھتے ہیں اور ایسا کرنے
میں کوئی حرج نہیں) لیکن ملک کی تعمیر و
ترقی کے تعلق سے ہماری جو ذمہ داریاں
ہیں ان کا خیال ہمیں کم ہی آتا ہے اور
یہ صورت حال خاصی توجہ طلب ہے کیونکہ
حقوق کا مطالبہ اور ذمہ داریوں سے
اعراض افراد اور گروہوں کو خود غرض اور
اس کے نتیجے میں تنگ نظر اور پست
ہمت بنا دیتا ہے جس کے بعد وہ بے وقعت
او[ر] [illegible]

ایک ایسا کلیہ ہے جس کا کشتی ڈھونڈھنے
سے بھی انسانی تاریخ میں نہیں ملے گا۔"

ڈاکٹر ممتاز علی خاں کے لیے یہ قال نہیں بلکہ حال تھا ۔ فرض شناسی اور ادائیگی فرض کی انھوں نے ایک روشن مثال قایم کی تھی۔ حقوق کے معاملے میں وہ ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے ۔ اپنے حق کو قربان کرنے اور دوسروں کے حقوق کے پاس و لحاظ کے معاملے میں وہ بے مثال تھے ۔ ڈاکٹر ممتاز جیسے عملی اور فعّال انسان مجھے کم نظر آے ۔ وہ پیچ در پیچ فلسفیانہ بحثوں کے قایل نہ تھے ایک بار جب اسلامی بنیادوں پر مسلم معاشرے کی تنظیم نو کی ضرورت کا اظہار ایک ممتاز تحریک کے سربراہ نے کیا تو انھوں نے افسوس ظاہر کیا کہ

"سماج کی اسلام کی بنیادوں پر تنظیم نو
کی بات صرف قال کے مرحلے میں ہے
اور لوگ تلقین و نصیحت سے آگے نہیں بڑھنا
چاہتے یا شاید پیش نظر مقصد کے سلسلے
کی داخلی و خارجی آزمایشوں اور رکاوٹوں
سے نپٹنے کا اپنے اندر حوصلہ نہیں رکھتے
اس لیے وہ بات کو سرسری طور پر بیان
کرکے رہ جاتے ہیں۔"

انھوں نے مزید واضح کیا :

"اسلام کی بنیادوں پر سماج کی تشکیل
کا مطلب ایک ایسے معاشرے کی تعمیر
ہے جو ہر طرح کے استحصال سے پاک
ہو اور جس میں تمام اہل معاشرہ کے
ساتھ اپنے پرائے کی تفریق کے بغیر ہر
سطح پر معاملہ عدل و انصاف اور انسان
دوستی کا ہو۔ ظاہر ہے ایسے معاشرہ کا
قیام کھیل نہیں ہے ۔ یہ بڑے جان جوکھوں
کا کام ہے۔ لہذا جو لوگ زیر بحث
مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں اس
کے سارے مقتضیات کو اچھی طرح
ذہن نشین کر لینا چاہیے اور اسلامی
تنظیم نو دھن سے عمل پیرا ہونا چاہیے۔"

ممکن ہے کچھ لوگوں کے لیے ڈاکٹر ممتاز کی یہ کھری باتیں ناگوار خاطر ہوئی ہوں مگر وہ اپنی صاف گوئی سے باز آنے والے نہ تھے اور شاید اسی سبب وہ عمر کے آخری دور میں یکہ و تنہا رہ گئے تھے۔ خود مجھ سے ۸، ۹ سال سے خط و کتابت کا سلسلہ ہوتو تھا۔ ایسے گوشہ گیر تھے کہ کسی محفل کسی اجلاس یا اجتماع میں دکھائی نہ دیتے تھے ۔ انھوں نے اسلامیات اور ملّی مسایل کے علاوہ فارسی زبان و ادب کے سلسلے میں اور مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں اور جس طرح اپنے طلبا و طالبات کی راہنمائی فرمائی وہ ایک تحقیق کا موضوع ہے۔ اس مختصر تحریر میں ان کی شخصیت کی گہرائیوں کا ایک مختصر تعارف اور اپنے ایک بہترین دوست، مخلص رفیق اور کرم فرما کی یادوں کی ایک جھلک پیش کرنا میرا مقصود تھا۔

مولانا آزاد کا نظریۂ تعلیم مذاہب

قومی نظام تعلیم کے پس منظر میں

محمد فاروق عظام ★

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے ایک عظیم مفکر، مدبر اور قومی رہنما تھے ۔ ان کی شخصیت اور خدمات پر جس قدر رشک اور فخر کیا جائے کم ہے۔ کیوں کہ ایک ایسی شخصیت جس کی خدمات شش جہات میں پھیلی ہوئی ہوں بڑی مشکل سے پیدا ہوا کرتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا ابوالکلام آزاد جیسی دیدہ ور شخصیت گرچہ اب ہمارے بیچ نہیں ہے تاہم ان کے چھوڑے ہوئے نقوش اور ان کے بتائے اور سکھائے ہوئے رہنما اصول و قوانین ہمارا استقبال کرنے کے لیے ہمہ دم تیار ہیں جن کو اپنا کر ہم اپنے ملک کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو جہاں یہ خود ہمارے لیے کامیابی کی ضمانت ہوگا وہیں دوسری جانب مولانا مرحوم کے حق میں ہماری طرف سے ایک اہم خراج عقیدت بھی ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد یوں تو ملک و قوم کو درپیش تمام معاملات و مسائل میں دلچسپی لیتے تھے اور ان پر نجی غور و فکر کے علاوہ اجتماعی طور پر بھی تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے لیکن تعلیمی شعبے میں وہ کافی دل چسپی لیتے تھے۔ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت اور اس کی نوعیتوں پر ان کی تحریریں اور خطبات بکھرے پڑے ہیں۔ تعلیم اور تعلیمی معاملات و مسائل میں اُن ان کی خاصی دل چسپی اور اہلیت ہی کی وجہ سے حصولِ آزادی سے چند مہینے قبل یعنی ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء میں ہی عبوری حکومت میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے شرکت کی اور حصول آزادی کے بعد پہلے وزیر تعلیم منتخب ہوئے اور پھر دس سال تک اس عہدے پر مسلسل فائز رہتے ہوئے تعلیم اور سائنسی تحقیقات کی وزارت کو اپنے خونِ جگر سے سینچتے رہے۔

عبوری حکومت میں وزارت تعلیم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ۳۱ر جنوری ۱۹۴۷ء کو مولانا نے اپنے ایک اخباری بیان میں فرمایا تھا:

★ کھیری باندہ - بھاگل پور - بہار

"میو نے محکمۂ تعلیم کا انتخاب اپنے ذوق —
اور اپنی دلچسپی کی وجہ سے کیا ہے۔ میں
سمجھتا ہوں کہ تعلیم کو از سر نو تنظیم ہماری قومی
زندگی کی بنیاد رکھنے کا موجب ہوگی۔"

۲۸ فروری کے ایک اور خطاب میں انھوں نے ہندوستان میں تعلیم کی کیفیت اور مستقبل کی ضروریات اور موجودہ پروگراموں پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ:

"ہمارے قومی بجٹ میں تعلیم کو اعلیٰ ترین
ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔"

بعد ازاں انھوں نے امید ظاہر کی کہ اگر ہم کامل عزم و ارادے کے ساتھ مل کر کوشش کریں تو ہم اپنی خامیاں دور کرسکیں گے اور ہندوستان کو اعلیٰ تعلیم کے ذریعے دنیا کے ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں کی صف میں لا کھڑا کریں گے۔

مولانا آزاد کے نزدیک یہ خامیاں کیا تھیں؟ ؟
دین و دھرم کی اندھی تقلید اور گھسی پٹی مذہبی تعلیمات یہ دونوں باتیں ملک و ملت کی صحیح تعمیر و ترقی کی راہوں میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ مولانا آزاد اگرچہ ایک بڑے عالم دین تھے۔ دینی اور مذہبی تعلیمات کو انسانی فلاح و بہبود کا ضامن خیال کرتے تھے لیکن اس کے باوجود جب انھوں نے وقت اور حالات کے تحت تعلیم کی ضرورت و اہمیت اور اس کے جدید تقاضوں پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا تو اپنے منصب کا حق ادا کرتے ہوئے انھوں نے سرکاری مدارس کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو داخل ہونے سے باز رکھا کیوں کہ انھوں نے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ ایک سیکولر ریاست میں جہاں رنگا رنگ اور مخلوط سماج ہو نہ یہ مناسب ہے اور نہ ہی ممکن کہ کسی قسم کی فرقہ وارانہ مذہبی تعلیم کو روا رکھا جائے انھوں نے اس سلسلے میں نہایت محتاط رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی تاکہ بے جا مذہبیت کا زور نہ بڑھنے پائے لیکن یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ مولانا آزاد زندگی اور تعلیم دونوں میں مذہبی اقدار کو بڑی اہمیت دیتے تھے وہ قومی تعلیم میں اخلاقی اقدار (Moral Values) کی آب یاری دل کی گہرائی سے چاہتے تھے اور سیرت سازی کے لیے انھیں ضروری خیال کرتے تھے۔

مولانا آزاد مسلمان تھے اور اپنے مسلمان ہونے پر انھیں کافی فخر تھا۔ چنانچہ وہ دین اسلام اور دینی تعلیمات کو اپنے لیے، اپنے ملک و ملت کے لیے اور ہندوستان کے ایک مشترک سماج کے لیے کس حد تک مفید خیال کرتے تھے؟ اور خود مذہب کے بارے میں وہ کیا رائے رکھتے تھے؟ ان دونوں سوالوں پر غور کرنے سے یہ خود بخود واضح ہو جائے گا کہ قومی نظام تعلیم کے سلسلے میں مذہبی تعلیم کے بارے میں ان کا نظریہ کیا تھا؟

مولانا آزاد نے اسلامی فکر اور مشرق و مغرب کے فلسفے سے اپنا فلسفۂ حیات مرتب کیا تھا جس سے ان کی اخلاقی اقدار کا تعین ہوتا ہے۔ یوں تو انھوں نے اپنے ضابطۂ اخلاق کے بارے میں جا بجا اظہار کیا ہے لیکن "مشرق و مغرب میں انسان کا تصور اور فلسفۂ تعلیم" کے عنوان پر یونسکو کی طرف سے ۱۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو دہلی میں منعقد ہونے والے سیمینار کے افتتاحی خطبے میں ان کے تاثرات بخوبی یکجا بیان ہوئے ہیں۔ وہ 'رواداری' کی تعلیم و ترغیب پر زور دیتے ہیں اور اسے مذہب کی ایک بنیادی قدر گردانتے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ مذہب کا مقصد آپس کا نفاق نہیں اتفاق ہے۔ وہ فصل نہیں وصل کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ہمارے دل میں تمام مذاہب کا احترام ہونا چاہیے اور ہمیں ان کی عظمت کا پاس ہونا چاہیے۔ انھیں مذہبی تعلیم سے بیر نہیں تھا بلکہ وہ بے جا مذہبیت سے دور رہنا چاہتے

تھے اور ایسی تعلیم چاہتے تھے جو اخلاقی اور روحانی قدروں کو فروغ دے سکے اور تمام ادیان عالم کی آگاہی اور احترام سکھائے۔ انھوں نے 'رواداری' کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے بدی اور بد کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ ان کا ارشاد ہے کہ بُرائی کو دور کیا جائے لیکن بُرائی کرنے والے سے بیر نہ ہو۔ ان کے نزدیک استاد کا منصب یہی ہے کہ وہ شاگردوں کی زندگی سے بداعمالیوں کو دور کرے لیکن انھیں عزیز ہی رکھے۔ اس رویے کو وہ عین مذہبی فعل مانتے تھے اور ایک اچھے انسان یا مردِ مومن کا تصور بھی کچھ ایسا ہی رکھتے تھے۔

جیسا کہ مذکورہ بالا سطور سے واضح ہو گیا کہ مولانا آزاد دین اور مذہب سے نفرت نہیں کرتے تھے بلکہ دینی و مذہبی تعلیمات کو بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے کسی بھی مخصوص مذہب کی تعلیم کو قومی نصاب تعلیم میں شامل نہیں کیا لیکن وہ چاہتے تھے کہ لوگ اپنے مذہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری رکھیں اس کی تعلیمات پر عمل کریں اور دوسروں کے مذاہب کا بھی احترام کریں۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم اور سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم کو بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کی یہ کوشش ہمیشہ رہی کہ جہاں صرف مذہبی تعلیم کا ہی انتظام ہے وہاں جدید علوم کا بھی انتظام کیا جائے کیوں کہ اس کے بغیر وہ دنیا میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

مذہبی تعلیم اور دیگر علوم جدیدہ کے متعلق مولانا آزاد کے نظریوں کو سمجھنے کے لیے دو باتیں پیش نظر رکھنا مفید ہوگا۔ ایک دینی مدارس، مکاتب اور دارالعلوم کے سربراہوں کی وہ کانفرنس تھی جو انھوں نے لکھنؤ میں طلب کی تھی یہاں ان کا زور تھا۔ ان درس گاہوں میں پڑھائے جانے والے دینی نصاب کو جدید بنانے کا مقصد یہ تھا کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی فلسفہ اور سماجی علوم میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں وہ اس نصاب میں شامل ہوں تاکہ دینی و دنیاوی فکر کا سنگم ہو جائے۔ وہ دینی تعلیم سے روگرداں نہیں تھے مگر یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان ہی کے ساتھ ساتھ ایسے علوم بھی شامل کیے جائیں جو آج کے دور کی پیداوار ہیں۔ صرف یونانی دور کے علوم تک نہ تو خود کو محدود رکھا جائے اور نہ ان علوم میں جو جدید تحقیقات اور ترقیاں ہوئی ہیں ان سے آنکھیں بند کی جائیں۔

مذکورہ کانفرنس سے مولانا آزاد کے اس رویے کا صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ کلاسیکی مشرقی اور دینی علوم اور مغربی اور جدید سیکولر علوم کو ملا کر ایک علمی تسلسل کو تعلیم کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ دوسرا اہم واقعہ ہے رادھا کرشنن کی مرتبہ کتاب ''مشرق و مغرب میں فلسفے کی تاریخ''۔ (History of Philosophy : Eastern & Western) جس کا خاصہ طویل دیباچہ مولانا آزاد نے لکھا تھا۔ اس دیباچے میں صرف یہی نقطۂ نظر کارفرما نہیں ہے کہ مشرق اور مغرب کی مشترک آگہی سے صحیح علم حاصل ہوتا ہے اس کے ساتھ فرد اور معاشرے کے ہمہ جہت ارتقا کا تصور بھی کارفرما ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات بالکل صاف تھی کہ تعلیم محض کاروباری یا معاشی مسئلہ نہیں ہے کہ دو حرف پڑھ کر آدمی روزی روٹی کمانے لگے۔ یہ تو محض اس کا ایک رُخ ہے اصل چیز تو انسانیت کی تعمیر کرنا اور حقوق انسانی کا احترام کرنا سکھانا ہے۔

مولانا آزاد نے جس زمانے میں آنکھیں کھولی تھیں اس سے تقریباً نصف یا پون صدی پہلے ہی ہندوستان میں تعلیمی نظام ٹوٹ کر بے جان ہو چکا تھا۔ یعنی دین و دنیا کی تفریق پیدا ہو چکی تھی۔ مذہبی اور دینی تعلیمی ادارے اور غیر مذہبی اور آزاد تعلیمی ادارے معاشرے کو دو علیحدہ

علیحدہ محور بن چکے تھے۔ مولانا آزاد کی ابتدائی تعلیم و تربیت دینی اور مذہبی طریق پر ہوئی تھی کیونکہ ان کا خاندانی پس منظر مذہبی تھا لیکن وہ اس طریقۂ تعلیم سے مطمئن نہیں ہوئے۔ لہٰذا انھوں نے پہلے اسی میں اصلاح اور تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ بعدازاں معاشرے کے عام حالات اور سیاسیات سے جب وہ دوچار ہوئے اور انگریزی زبان اور جدید نظامِ تعلیم کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوئے تو ان کی خلاّقی اور منفرد تعلیمی بصیرت نے اس کی خامیاں بھی ٹٹول لیں اور اس میں بھی زبردست اصلاح اور تبدیلیاں پیدا کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو مدرسہ عالیہ کلکتہ کی افتتاحی تقریب میں اس وقت کی سرکاری تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے مولانا آزاد نے بجا فرمایا تھا کہ

> "ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل و اعمال کو پہنچائے ہیں ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیلِ علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ہے۔ علم خدا کی ایک پاک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈھنا چاہیے کہ وہ علم ہے لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ دکھائی ہے۔ وہ علم کا اس لیے شوق دلاتی ہیں کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ پس اب ہندوستان میں علم کو علم کے لیے نہیں بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔"

مذکورہ بالا تقریر میں مولانا آزاد کا یہ ایک فقرہ کہ علم خدا کی ایک پاک امانت ہے، کس قدر اہم اور اپنی معنویت میں بے پناہ ہے۔ فلسفۂ معرفت و علوم (Epistinology)، فلسفۂ اخلاق یا چاہے جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے اس کی صداقت دل میں اترتی چلی جائے گی۔

یہاں ایک اہم بات جو بہت صاف ہو جانا چاہیے وہ ہے مولانا آزاد کا تصورِ قومیت۔ مولانا آزاد کو اپنے ملک اور اپنی قوم کے لوگوں سے بڑی محبت تھی۔ ملک اور قوم کے لیے وہ سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار تھے۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ کسی مخصوص مذہب اور فرقے کے لوگوں کی دل جوئی کرتے اور کسی خاص مذہب کی تعلیم پر زور دیتے۔ مولانا آزاد اپنے مخصوص تصورِ قومیت کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں سے دو ٹوک انداز میں باتیں کرتے تھے ان کے اس مخصوص طرزِ فکر پر ایک سرسری نگاہ ڈال لینا توہی نظامِ تعلیم کے سلسلے میں مذہبی علوم کے متعلق ان کے نظریے کو سمجھنے میں سہولت پیدا کر دے گا۔

> "میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا

ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Inevitable Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیب کے دھاروں کا میلان تھا یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح ایک ہندو فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگانِ ہند کے ایک مذہب

یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔
ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے۔۔۔
ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے
تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں
ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت
ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج
ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں اکوئی
گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک
زندگی کی چھاپ نہ لگی ہو۔ ہماری بولیاں الگ
الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے
ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ
تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ
پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس ہماری تاریخ کی
پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر
اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں دیکھا جا سکتا
یہ تمام مشترکہ سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی
ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس
زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔ جب ہماری
یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی ہم میں اگر
ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک
ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو
انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ
رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔
اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو
چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب
اور معاشرت کو پھر تازہ کریں جو ایک ہزار
برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے
تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب
سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے
کیوں کہ یہ غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت
کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔۔۔
ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک
زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال
دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے
وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں
خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا
ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے ہم پسند
کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی
قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن
چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے
اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا ہمیں
قدرت کے فیصلے پر رضامند ہو جانا چاہیے
اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔"
(خطبات آزاد۔ مرتبہ مالک رام)

دیکھا آپ نے! وہ ہندوستانی باشندوں، اُن کے
مختلف مذاہب اور ہندوستان کی ایک متحدہ قومیت
کے بارے میں کیسی صاف ستھری رائے رکھتے تھے۔ ایسی
رائے رکھنے والے لوگ اگر وزارت تعلیم جیسے اہم عہدے
پر فائز ہو جائیں گے تو وہ قومی نظام تعلیم میں مذہبی تعلیمات
کے متعلق کیا نظریہ رکھیں گے۔ مولانا آزاد تو علوم کی تخصیص
(Specialization) کے قائل بھی نہیں تھے اور نہ ہی کسی
خاص مذہب کی تعلیم پر زور دیتے تھے۔ وہ تو چاہتے تھے
کہ ملک کا ہر باشندہ ہر قسم کے علوم سے بہرہ ور ہو اور
اس کے دل میں ہر مذہب کا یکساں احترام موجود ہو۔
یہاں میں ایک بار پھر کہوں گا کہ مولانا آزاد زندگی
اور تعلیم دونوں میں مذہبی اقدار کو بڑی اہمیت دیتے تھے
وہ قومی تعلیم میں اخلاقی اقدار (Character Building)
کی آبیاری چاہتے تھے اور سیرت سازی (Moral Values

کے لیے انھیں ضروری خیال کرتے تھے۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۵۱ء کو انھوں نے وشوبھارتی (شانتی نکیتن) کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دیے جانے کے موقع پر اپنے ان خیالات کا واضح طور پہ اظہار کیا ہے اور ٹیگور کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بین الاقوامی مفاہمت International Comp-romising اور مسلک انسانیت کی پُر زور تائید کی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم اخلاقی اور روحانی قدروں کو فروغ دے اور تمام ادیانِ عالم کی آگاہی و احترام سکھائے انھیں تعلیم کا جوہر "قومی ذہن کی تشکیل" نظر آتا ہے جو اپنی روایات کا حامل، اپنے ورثے کا امین، عصری حیثیت کا مالک اور عہدِ نو کا نقیب ہو۔

آیئے اب ایک نظر قومی تعلیمی نظام کے اس ڈھانچے پر بھی ڈال لی جائے جو مولانا آزاد ہی کا بنایا ہوا ہے۔

مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسی کا ایک رُخ تھا اعلیٰ تعلیم کا فروغ۔ چنانچہ اسی مقصد سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قایم ہوا اور اس کے تشکیلی دور میں چنتامنی دیش مکھ کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ یو جی سی نے ملک میں یونیورسٹیوں کا جال سا بچھا دیا اور اعلیٰ تعلیم کو نہ صرف مالی امداد کے ذریعے بڑھاوا دیا بلکہ نظریاتی طور پر سمت و رفتار کا تصور بھی بخشا اور ان سبھی اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں ایک ضابطہ بندی اور معیار بندی پیدا کی۔

سائنسی تعلیم و ترقی کے لیے شانتی سروپ بھٹناگر جیسے سائنس داں کی سربراہی میں سائنس کا اعلیٰ تحقیقاتی ادارہ بنایا گیا۔ ایٹمی ترقی کا ادارہ الگ وجود میں آیا اور صنعت اور ٹکنالوجی میں کام کرنے والے سائنسی اداروں کے لیے ایک طرف تو انڈین کاؤنسل فار انگیری کلچرل اینڈ سائنٹیفک ریسرچ قایم ہوئی تو دوسری طرف زراعت اور دیہی ترقی کے لیے انڈین کاؤنسل فار ایگری کلچرل ریسرچ کا قیام عمل میں آیا۔ اسی طرح انڈین کاؤنسل فار میڈیکل ریسرچ بنائی گئی۔ گویا ملک میں اعلیٰ ترین سائنسی ریسرچ کی داغ بیل پڑ گئی۔

سماجی علوم کے لیے انڈین کاؤنسل فار ہسٹاریکل ریسرچ اور انڈین کاؤنسل فار سوشل سائنسز ریسرچ قایم ہوئی جن کا دائرہ تاریخ سے لے کر اقتصادیات، معاشیات اور سماجیات تک پھیلا ہوا تھا اسی سلسلے کو مکمل کر رہے تھے دو اور ادارے۔ ایک انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز جو ہندوستان کے تہذیبی روایات کا امین تھا اور دوسرا انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز جو مولانا آزاد کی سرپرستی میں سپرو ہاوس میں قایم ہوا اور بعد کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی کا ہیولیٰ بن گیا۔

مولانا آزاد محض وزیر تعلیم ہی نہیں تھے بلکہ حکومت کی کابینہ کے ایک نہایت اہم رکن بھی تھے۔ اس لحاظ سے وہ پورے ملک کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ آزادی کے بعد مغربی ایشیا کے مسلم ممالک سے تہذیبی اور سیاسی رابطوں کی اہمیت کے پیش نظر مولانا آزاد نے عربی مجلہ ثقافۃ الہند اپنے رفیق کار عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں جاری کیا اور تعلیمی نظام میں اس علاقے سے ہندوستان کے تعلقات کو بڑی اہمیت دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ادارہ علوم اسلامیہ اور حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں ادارہ علوم اسلامی کا فروغ بھی مولانا آزاد کا مرہون منت ہے۔

سنسکرت اور ہندوستان کے قدیم اثاثے کی بازیافت اور اس کی تعلیم و تدریس پر بھی مولانا نے زور دیا کیوں کہ یہ علوم بھی ہماری عظیم الشان وراثت کا اہم حصہ ہیں۔ کئی ادارے قایم ہوئے۔ یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے مراکز خاص اس مقصد سے بنائے گئے اور یہ سب کچھ اس زمانے میں ہو رہا تھا جب ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کی آندھیاں چل رہی تھیں اور

پورا برصغیر ان کی زد میں تھا۔ کدورتیں اور رنجشیں ہمارے مشترکہ ورثے کو تنکے کی طرح طوفان میں بہا لے لیے جا رہی تھیں لیکن مولانا آزاد کی بصیرت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ ان کی نگاہ مستقبل پر جمی ہوئی تھی اور وہ صاف طور پر دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کا اگر کوئی مستقبل ہے تو وہ وسیع تر یک جہتی کے تصور ہی سے وابستہ ہے۔

مولانا آزاد قومی تعلیم کے حصے کے طور پر مذہبی تعلیم کو اس وسیع تر قومی یک جہتی اور متحدہ قومیت کے تصور کو عام کرنے کے لیے بقدر ضرورت ضروری خیال کرتے تھے۔

"اے ایمان والو! انصاف پر پختگی سے قایم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو۔ چاہے وہ تمہارے یا (تمہارے) والدین اور عزیزوں کے خلاف ہی ہو۔ وہ امیر ہو یا مفلس اللہ (بہرحال) دونوں سے زیادہ حق دار ہے تو خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کج کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب خبردار ہے۔"

(النساء ۱۳۵)

اترپردیش کے پندرہ انٹر کالجوں اور دس ہائی اسکولوں میں

ایک سو پانچ ہونہار طالبات کو شیروانی انعامات ۱۹۹۳ء

بیگم نسرت شیروانی*

اترپردیش کے قریب تیس گرلز انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں سے ۱۹۹۲ء کے بورڈ امتحانات کے نتائج ستمبر کے اخیر تک موصول ہوئے۔ الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ و جیپ انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے اپنے کالج یا اسکول میں بورڈ امتحان میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پوزیشن لانے والی ایک سو پچاس ہونہار طالبات کے لیے شیروانی انعامات بھیجے گئے۔ بارہ اداروں میں سے شیروانی انعامات جیتنے والی چھیالیس ہونہار طالبات کے نام پہلے پیش کیے جاچکے ہیں۔ مزید تیرہ اداروں میں شیروانی انعامات جیتنے والی اُنسٹھ ۵۹ ہونہار طالبات کے نام اب پیش ہیں

حمیدیہ گرلز انٹر کالج - الہ آباد۔

ہائی اسکول

۱۔ کماری راحت چاند سلمہا ۲۔ کماری طلعت فاطمہ سلمہا۔ ۳۔ کماری تبسم سلمہا۔ ۴ کماری عرشی خانم سلمہا ۵۔ کماری ثمینہ نثار سلمہا۔ ۶۔ کماری فہمیدہ خلیل سلمہا ۷۔ کماری شہلا انصاری سلمہا۔

(انٹر)

۱۔ کماری نور بانو سلمہا ۲۔ کماری نجمہ بی بی سلمہا۔ ۳ کماری شبانہ سلمہا ۴۔ کماری شمراز سلمہا ۵۔ کماری سیّدہ خاتون سلمہا۔

اسمٰعیل نیشنل گرلز انٹر کالج میرٹھ

(ہائی اسکول)

۱۔ کماری رشمی اگروال سلمہا ۲۔ کماری ناظمہ سلمہا۔ ۳۔ کماری پریا گوئل سلمہا۔

(انٹر)

۱۔ کماری صابرہ خاتون سلمہا۔ ۲۔ کماری نرگس جہاں سلمہا۔ ۳۔ کماری مہناز سلمہا۔ ۴۔ کماری شاہ بانو سلمہا۔

مسلم جوبلی گرلز انٹر کالج۔ رام پور

(ہائی اسکول)

۱۔ کماری نیلم کوثر سلمہا۔ ۲۔ کماری سیمین اختر سلمہا۔ ۳۔ کماری سیما نقوی سلمہا۔

---

* سکریٹری مسلم گرلز ایجوکیشن کمیٹی۔

(انٹر)
۱۔ کماری عطیہ خواجہ سلمہا۔ ۲۔ کماری نفیس
ناظم سلمہا۔ ۳۔ کماری سعدیہ عرفان سلمہا۔

بیگم خیر گرلز انٹر کالج۔ بستی
(ہائی اسکول)
۱۔ کماری ارجمند شاہین سلمہا۔ ۲۔ کماری
سودامنی مشرا سلمہا۔ ۳۔ کماری انجم اگرہری
سلمہا ۴۔ کماری ممتا شکلا سلمہا
(انٹر)
۱۔ کماری کنیز فاطمہ سلمہا۔ ۲۔ سریتا شرما سلمہا

بھدوہی گرلز انٹر کالج۔ بھدوہی۔ وارانسی
(ہائی اسکول)
۱۔ کماری شیبا نصرت سلمہا۔
(انٹر)
۱۔ کماری رخشاں انصاری سلمہا ۲۔ کماری ستّو
بانو سلمہا۔

آل احمد گرلز انٹر کالج۔ امروہہ۔ مرادآباد
(ہائی اسکول)
۱۔ کماری شائستہ ناظم سلمہا۔ ۱۔ کماری نغمہ
ناہید سلمہا۔ ۳۔ کماری شازیہ بانو سلمہا
(انٹر)
۱۔ کماری زاہدہ بانو سلمہا۔

نجیب الدولہ گرلز انٹر کالج۔ نجیب آباد۔ بجنور۔
(ہائی اسکول)
۱۔ کماری بشریٰ خاتون سلمہا۔
(انٹر۔)
۱۔ کماری عشرت جہاں سلمہا۔

نہرو گرلز انٹر کالج۔ رام پور
(ہائی اسکول) ۱۔ کماری سریتا کپور سلمہا۔

۲۔ کماری شیریں افغان سلمہا۔
(انٹر)
۱۔ کماری منورما چوہان سلمہا۔

نیشنل گرلز انٹر کالج۔ شاہ جہاں پور
(ہائی اسکول)
۱۔ کماری ساجدہ بانو سلمہا ۲۔ کماری فوزیہ
جلیل سلمہا۔ ۳۔ کماری نزہت شکیل سلمہا۔
انٹر میں کوئی فرسٹ ڈویژن نہیں۔

ابوالکلام آزاد گرلز انٹر کالج۔ لکھیم پور کھیری۔
(ہائی اسکول)
۱۔ کماری نازنین سلمہا۔ ۲۔ کماری عذرا پروین
سلمہا۔ ۳۔ کماری عائشہ صدیقی سلمہا۔
انٹر میں کوئی فرسٹ ڈویژن نہیں

شریمتی صغریٰ بیگم گرلز ہائیر سکنڈری اسکول۔ فیروزآباد
۱۔ کماری کوثر بانو سلمہا ۲۔ کماری کہکشاں
سلمہا۔ ۳۔ کماری فرح اقبال سلمہا

گورنمنٹ گرلز ہائیر سکنڈری اسکول
حاتم سرائے، سنبھل
۱۔ کماری رحمت جہاں سلمہا ۲۔ کماری زینت
پروین سلمہا۔ ۳۔ کماری عذرا پروین سلمہا

قدوائی گرلز انٹر کالج، انجمن شہید
اعظم گڑھ
۱۔ کماری انجنا سلمہا۔
۲۔ کماری فرحانہ خاتون سلمہا
۳۔ کماری ارم زہرہ سلمہا۔

ان کے علاوہ جن مسلم گرلز اداروں سے ۱۹۹۳ء
کے نتائج آئے ہیں ان کی ہونہار ترین طالبات
کے لیے انعامات بھیجے جارہے ہیں جن کے نام آئندہ

رپورٹوں میں پیش کیے جائیں گے۔ البتہ اب بھی اترپردیش میں قریب پندرہ مسلم ہائی اسکول و انٹر کالج ایسے ہیں جن کی محترمہ پرنسپل صاحباؤں نے ابھی تک ۱۹۹۳ء کے نتائج نہیں بھیجے۔ ان سب سے التماس ہے کہ اب مزید تاخیر نہ کریں اور اپنے اپنے اسکول یا کالج کے ۱۹۹۳ء کے نتائج جلد از جلد بھیج دیں تاکہ ہونہار ترین طالبات کو انعام پیش کیے جا سکیں۔

انعامات سے بھی زیادہ اہم ہے نتائج

کا تجزیہ کرنا اور پھر یہ جائزہ لینا کہ کہاں یعنی کون سے ضلع یا مقام کے کن کن مسلم ہائی اسکولوں و انٹر کالجوں میں دونوں بورڈ امتحانات کی سطح پر مسلم طالبات کی تعلیم کو گزشتہ سترہ سال میں کتنا فروغ حاصل ہوا۔ یہ جائزہ نامکمل رہے گا جب تک اترپردیش کے سب مسلم گرلز ہائی اسکولوں اور انٹر کالجوں سے ۱۹۹۳ء کے نتائج نہ آجائیں۔

"عزیزو! تعلیم اگر اس کے ساتھ تربیت نہ ہو اور جس تعلیم سے قوم قوم نہ بن سکے وہ تعلیم درحقیقت کچھ قدر کے لائق نہیں ہے۔ پس انگریزی پڑھ لینا اور بی اے اور ایم۔ اے ہو جانا جب تک کہ اس کے ساتھ تربیت اور قومیت کی فیلنگ نہ ہو ہم قوم کو قوم اور ایک معزز قوم نہیں بنا سکتے۔"

سر سید احمد خاںؒ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خبریں

ایس۔ این۔ اے۔ فردوسی *

جشن سرسید ۹۳ء

اے۔ ایم۔ یو۔ کے اسٹریچی ہال میں ایس ایس ہال نارتھ کے زیر اہتمام ایک انٹرویسٹی ثقافتی و ادبی تقریب 'جشن سرسید ۹۳ء' کا افتتاح پرو وائس چانسلر پروفیسر ابوالحسن صدیقی نے کیا۔

چہار روزہ تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے پرو وائس چانسلر نے کہا کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھانا ہی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ تعلیم ہی ملک کی ترقی کا وسیلہ ہوتی ہے۔ سرسید نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی اور ہر علاقے میں اسکول کھولنے کے لیے چندہ فراہم کیا۔

انھوں نے طلبا سے اپیل کی کہ وہ ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے سرسید کے خوابوں کو عملی تعبیر سے ہمکنار کریں۔ انھوں نے کہا کہ ۷ نومبر کو گورکھپور میں ایک تعلیمی کانفرنس کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ تاکہ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا ہو جائے۔

سرسید ہال (نارتھ) کے پرووسٹ پروفیسر ایم شبیر نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرز پر اس دانش گاہ کی بنیاد رکھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی مسلمان جدید تعلیم حاصل کریں۔

شعبۂ انگریزی کے پروفیسر فرحت اللہ خاں نے کہا کہ سرسید کے مشن کی نشر و اشاعت ہی ہمارا بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید احمد خاں کا شمار جدید ہندوستان کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔ اور ان کی پوری زندگی تعلیم کے لیے وقف تھی۔ سٹی ہائی اسکول کے پرنسپل مسٹر بدر الاسلام نے کہا کہ ہمیں آپسی میل جول اور مذہبی رواداری کا ماحول پیدا کرنا چاہیے اور نفرت اور تعصب کا جواب محبت اور خیر سگالی سے دینا چاہیے۔

نعت خوانی کے اس مقابلے میں خان محمد فاروق، ثاقب احمد، محمد طارق، افضل حسین اور عبدالرؤف نے حصہ لیا۔

تقریب کی نظامت کے فرائض ایس ایس ہال کے کلچرل سکریٹری محمد محب الحق نے انجام دیے۔

کیریر پلاننگ سینٹر اور کوچنگ اینڈ گائیڈنس سینٹر میں نئے ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر نے شعبۂ فزکس کے ریڈر ڈاکٹر فرمان مجیب کو کیریر پلاننگ

---

* پی۔ آر۔ او۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سینٹر (ویمنز کالج) کا ڈائرکٹر مقرر کیا ہے۔
سول انجینرنگ کے پروفیسر محمد جمیل کو کوچنگ اینڈ گائڈینس سینٹر کا اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔

این آر ایس سی کلب میں وائس چانسلر کے ہاتھوں تقسیم انعامات

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایم این فاروقی نے آج یونیورسٹی کے غیر رہائشی طلبا کے کلب میں منعقدہ ایک سادہ مگر پروقار تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت فرماکر کامیاب طلبا کو انعامات تقسیم فرمائے۔

مسلم یونیورسٹی بنیادی طور پر ایک رہائشی تعلیمی ادارہ ہے جو گیارہ اقامتی ہالوں پر مشتمل ہے۔ این آر ایس سی کلب غیر رہائشی طلبا کے اسپورٹس اور دوسری غیر تدریسی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ کلب کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے این آر ایس سی کے پرووسٹ پروفیسر آر کے گپتا نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں بتایا کہ کلب کے ممبران یونیورسٹی کی تمام سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں اور اس کلب کے تقریباً ۵۲ ممبران یونیورسٹی کی مختلف ٹیموں میں شامل ہیں اور اسپورٹس کے انٹر ہال مقابلوں میں کلب نے پانچویں بار لگاتار چیمپین شپ حاصل کی ہے۔ یونیورسٹی کی مختلف ۱۰ ٹیموں میں سے ۷ کپتانوں کا تعلق اسی کلب سے ہے اور کلب کے ایک ممبر مسٹر رضوان شمشاد نے رنجی ٹرافی میں اتر پردیش کی نمائندگی کی۔

آپ نے بتایا کہ اسپورٹس کے علاوہ اس کلب کے ممبران دوسری سرگرمیوں میں بھی کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ مسٹر اسرار احمد اسٹوڈینٹس یونین کے سینیر کیبنٹ اور مسٹر نوید شفیق یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔

اس موقع پر این آر ایس سی کلب (اے) کے سکریٹری مسٹر حمید رحمن نے کلب کی گزشتہ دوسالہ سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کلب نے جو کامیاب فنکشن منعقد کیے انھیں کلچرل پروگرام "کاروان ۹۲" عمر علی صدیقی اوپن ٹیبل ٹینس میموریل ٹورنامنٹ کا انعقاد بھی شامل ہے۔ کلب کے ممبران کی انفرادی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ مسٹر خالد صلاح الدین اور مسٹر فرخ ملک یونیورسٹی میوزک کلب کے بالترتیب سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے اور مسٹر ملک نے دوردرشن کی ایک ٹیلی فلم میں گلوکاری بھی کی ہے۔

مسٹر افتخار سیفی نے این آر ایس سی (بی) کلب کے ممبران کے حاصلات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ کلب نے ضلعی سطح پر ایک انڈور ٹورنامنٹ کا انعقاد کیا جس میں ضلع کے تعلیمی اداروں سے کافی شرکا شریک ہوئے۔ مختلف انٹر ہال مقابلوں میں کلب کے ممبران نے بیش قرار کامیابیاں حاصل کیں۔ مسٹر شمشاد احمد نے چنڈی گڑھ کے کلچرل مقابلے میں چیمپین ٹرافی حاصل کی۔

سینٹرل اسپورٹس کلب کے سکریٹری مسٹر وی کے بنسل نے اپنی رپورٹ میں کلب کی اسپورٹس سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کلب کے ممبران کی ان انفرادی کامیابیوں اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا جن کو پروفیسر گپتا اجمالاً بیان کرچکے تھے۔

وائس چانسلر پروفیسر ایم۔این فاروقی نے کلب اے کے کامیاب طلبا کو ٹرافی تقسیم کیں جب کہ کلب بی اور سی کے انعامات پرو وائس چانسلر پروفیسر ابوالحسن صدیقی اور ڈائرکٹر اکیڈمک پروگرامس پروفیسر فرید غنی نے تقسیم فرمائے۔

اس موقع پر پروفیسر گپتا نے وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور ڈائرکٹر اکیڈمک پروگرامس کو کلب کی طرف سے یادگاری تحفہ (مومینٹو) پیش کیے۔

اس کے علاوہ وائس چانسلر نے ہال کے پرووسٹ پروفیسر آر کے گپتا اور ہال کے دوسرے وارڈن صاحبان کو جن

میں پروفیسر کے۔ جی وارشنی، کیپٹن طارق مختار، ڈاکٹر آر۔ سی۔ شرما، ڈاکٹر پی۔ کے وارشنی، ڈاکٹر نفیس احمد، ڈاکٹر علی محمد اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن شامل تھے، یادگاری تحفے پیش کیے۔
مسٹر نوید شفیق نے پروگرام آرگنائزر کے فرائض انجام دیے۔

لکچرر اور جونیئر ریسرچ فیلوشپ کے امتحان میں مسلم یونیورسٹی کے ۱۹ طالب علم کامیاب

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے سوشل سائنس اور آرٹس فیکلٹی میں لکچرر کی تقرری کے لیے اہلیت کے امتحان اور جونیئر ریسرچ فیلوشپ کے امتحان میں مسلم یونیورسٹی کے ۱۹ طالب علم کامیاب قرار دیے گئے ہیں۔
لکچررشپ کے لیے کامیاب امیدواروں میں محمد آفتاب عالم، کرشن گوپال، محمد شمیم، محمد ناصر حسین، رانا انجم، اظہار احمد اور محمد عرفان شامل ہیں۔ جب کہ جونیئر ریسرچ اسکالرشپ کے امتحان میں کامیاب امیدواروں کے نام ہیں۔ محمد طارق، محمد اعظم خاں، سید احسن رضوی، اعجاز احمد، ناز بیگم، ابوبکر امداد، نوشاد عالم، محمد حبیب الرحمٰن، محترمہ تسنیم کوثر قریشی، نور جہاں خاتون، محمد مسعود عالم اور نیتا سکسینہ۔

"ہند کی مسلم خواتین دنیا میں سب سے زیادہ ناخواندہ"
پروفیسر نسیم فاروقی

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد نسیم فاروقی نے کہا کہ مسلمانوں کو تعلیم نسواں اور پیشہ ورانہ تعلیم پر ہی توجہ دینی چاہیے تاکہ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی دور ہو سکے۔
پروفیسر فاروقی ''ہندوستانی مسلمانوں کے سماجی اقتصادی مسائل'' پر دو روزہ کنونشن کے افتتاحیہ جلسے کو خطاب کر رہے تھے۔ اس پہلے قومی کنونشن کا اہتمام مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آف انڈیا نے کیا ہے۔ جس میں ملک بھر کے ممتاز ماہرین تعلیم اور سماجی کارکن حصّہ لے رہے ہیں۔
پروفیسر فاروقی نے کہا کہ ہندوستان کی مسلم خواتین دنیا میں سب سے زیادہ ناخواندہ ہیں اور کوئی بھی فرقہ اپنی نصف آبادی پر توجہ دیے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ ہم خود مسلم خواتین کے ساتھ تیسرے درجے کے شہری جیسا سلوک کرتے ہیں جو اسلام مذہب کے اصولوں کے خلاف ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ ہمیں اپنی سماجی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے آرٹ یا سوشل سائنس میں داخلہ دلانے کے بجائے پیشہ ورانہ تعلیم پر توجہ دینی چاہیے۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو اکیسویں صدی ہمیں برداشت نہیں کرے گی۔
شہر مفتی مولانا عبدالقیوم نے اپنے افتتاحیہ خطبے میں کہا کہ مسلم نوجوانوں کو نوکری کے بجائے تجارت اور صنعت حرفت پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ کیوں کہ شریعت میں تجارت کی فضیلت زیادہ بیان کی گئی ہے اور تجارت کے ذریعے ہی معاشی حالت کو مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت ادریسؑ نے کپڑا بننے کی تجارت کو اپنایا جب کہ حضرت نوحؑ نے لکڑی کی تجارت کی اور حضرت داودؑ نے لوہے کی اور حضرت موسیٰ نے بکریوں کو چرانے کی خدمت انجام دی۔
انھوں نے کہا کہ علم کو علم کی خاطر ہی سیکھنا چاہیے اسے روپے بٹورنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔ انھوں نے امریکہ کے یہودیوں کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ صرف ڈھائی فیصد یہودیوں کی آبادی پورے امریکہ پر چھائی ہوئی ہے اور ۳۲ فی صد یہودی تجارت کرتے ہیں۔
مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر ابوالحسن صدیقی

نے کہا کہ مسلمانوں کو بدلتے ہوئے حالات کے تحت جدید تعلیم پر زور دینا چاہیے اور مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئے نئے اسکول قائم کرنے چاہیں۔ انھوں نے کہا کہ محض ایک مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے ہمیں تعلیمی محاذ پر سب سے زیادہ زور دینا چاہیے۔

ایم ایس او کے جنرل سکریٹری مسٹر ابوبکر نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ ان کی یہ تنظیم علماء اور مسلم دانشوروں کے درمیان ربط قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہے اور ہم تعلیمی محاذ اور اقتصادی میدانوں میں بھی کام کر رہے ہیں۔

کیرالہ وقف بورڈ کے رکن مسٹر اے کے اسمعیل وفا نے کہا کہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے اور صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان منصوبہ بند طریقے سے کام نہیں کر پا رہے ہیں۔

اس دو روزہ کنونشن میں ملک بھر کے ممتاز دانشور اور علماء حصہ لے رہے ہیں۔

موسم سرما کی تعطیلات ۲۰ دسمبر سے ۲ جنوری تک

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موسم سرما کی تعطیلات مورخہ ۲۰ دسمبر ۹۳ء سے ۲ جنوری ۹۴ء تک ہوں گی۔ موسم سرما کی تعطیلات میں اسکولوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔

وائس چانسلر نے تمام ڈین اور شعبہ جات کے سربراہوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ۱۸ دسمبر تک باقاعدہ کلاسوں کو جاری رکھیں اور ۳ جنوری کو پھر سے کلاسیں شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے اعلانیہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو بھی طالب علم ان مقررہ تاریخوں کے علاوہ غیر حاضر رہتے ہیں ان کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

ڈین اسٹوڈینٹس ویلفیر سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ موسم سرما کی تعطیلات سے متعلق طالب علموں کے سرپرستوں کو مطلع کر دیں، تاکہ وہ اپنے بچوں کو مقررہ وقت پر علی گڑھ بھیج دیں تاکہ ان کی پڑھائی کا حرج نہ ہو۔

شعبۂ فائن آرٹس کے نئے سربراہ

پروفیسر اشفاق ایم رضوی کو مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فائن آرٹس کا سربراہ تین سال کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

جمال الرحمٰن مرحوم کو خراج عقیدت

مسلم یونیورسٹی میں تدریسی و غیر تدریسی عملے اور طلبا کے ایک جلسے میں مسلم یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار جناب جمال الرحمٰن مرحوم کو جن کا انتقال گزشتہ یکم نومبر کو ہوا تھا، خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جلسے کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر محمد نسیم فاروقی نے فرمائی۔

تلاوت قرآن پاک سے جلسے کے آغاز کے بعد مرحوم کو ایصال ثواب کے لیے فاتحہ خوانی ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی کے ڈپٹی فائنانس آفیسر مسٹر خورشید احمد خاں نے جذبات سے مملو لہجہ میں مرحوم کی خدمات اور ان کے مخصوص طریقوں سے کام کرنے پر روشنی ڈالی۔

جناب عبدالخالق قاضی رجسٹرار مسلم یونیورسٹی نے فرمایا کہ جمال صاحب کیونکہ ہر سطح پر کام کرتے ہوئے انتظامیہ کے اس اعلیٰ مقام تک پہنچے تھے اس لیے وہ مسائل کو سمجھتے تھے اور ان کے حل کرنے کی سعی کرتے تھے۔

آخر میں حاضرین نے ۲ منٹ خاموش کھڑے ہو کر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔
